احیائے دین میں ائمہ اہلبیت علیہم السلام کا کردار - ۲

علامہ محقق سید مرتضیٰ عسکری

رسول اللہ

علی

ولی

وصی

وخلیفتہ بلافصل

مجمع علمی اسلامی تہران ○ کراچی ○ بمبئی

شاید کہیں پسماندہ حقیقت تجھے مل جائے
تاریخ کی پھر از سرِ نو چھان پھٹک کر

نقش ائمہؑ در احیائے دین

اِحیائے دِین

میں

ائمہ اہلبیتؑ کا کِردار

علامہ محقق سید مرتضیٰ عسکری

مجمع علمی اِسلامی

تہران ۰ کراچی ۰ بمبئی

تحقیق و تالیف

علامہ مرتضیٰ عسکری

ترجمہ

محمد حسن جعفری

تہذیب و تصحیح

رضا حسین رضوانی

انتساب

نبیؐ خاتم حضرت محمد مصطفیٰؐ کے وصیؑ خورسند

حضرت ابوطالبؑ کے فرزند ارجمند

امام علیؑ مرتضیٰؑ کے نام

اس اعتراف کے ساتھ کہ

اے امیرالمؤمنینؑ!

آپ کی مساعیٔ جمیلہ کے طفیل

آج ہم حق سے آشنا اور

قُرآن وسُنّت سے وابستہ ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمْ
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ
وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَسَلَّمْ

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقدّمہ

سیرتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مخصوص گوشوں کی تحقیق سے قبل ہم **مُقَدِّمَہ** میں ان دو امور پر بحث کریں گے۔

(۱) انسانی خواہشوں اور قوتوں کے ضمن میں وہ اسباب جن کے تحت "انسان کو دین کی ضرورت ہے۔"

(۲) قبلِ اسلام کا اور عہدِ رسالت کا عرب معاشرہ۔

سیرت رسول مقبولؐ کے دقیق نکات جاننے کے لئے مذکورہ مباحث کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ ان مباحث کی تفہیم سے ہمیں اصل موضوع کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

(۱) انسانی خواہشیں اور قوتیں

انسان میں مادی اور معنوی یا جسمانی اور نفسانی قوتوں کے علاوہ حیوانی خواہشات کے پہلو بہ پہلو اعلیٰ انسانی خواہشات بھی پائی جاتی ہیں۔ مذکورہ دونوں قوتوں اور خواہشوں کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ پس انسان کو جس چیز کی بھی ضرورت ہو سکتی تھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس کو زمین پر پیدا کر دیا جیسا کہ ارشاد ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ جَمِيعًا. ہم نے آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ (سورۂ جاثیہ: آیت ۱۳)

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ان تمام مسخر کی گئی چیزوں سے استفادہ کرنے کے لئے رہنمائی کی ضرورت ہے تا کہ وہ ان سے صحیح طور پر فائدہ اٹھا سکے۔

مثلاً انسان کو اپنے معدے کے لئے رہنمائی کی ضرورت ہے تا کہ وہ یہ جان سکے کہ کون سی غذائیں اس کے لئے مفید اور کون سی مضر ہیں۔ اسی طرح جنسی خواہشات کے لئے بھی انسان کو رہنمائی کی ضرورت ہے تا کہ وہ جائز طریقوں سے جنسی تسکین حاصل کرے اور بے راہ روی اور ہم جنس پرستی کے تباہ کن اثرات سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔ باقی قوتوں کی طرح انسان کو خودخواہی کی خواہش کے لئے بھی رہنمائی کی شدید ضرورت ہے تا کہ وہ خودخواہی کی اس منزل پر قدم نہ رکھے جو دوسروں کے لئے نقصان دہ ہو۔

ان سارے معاملات میں انسان کو رہنمائی کی اس لئے ضرورت ہے کہ وہ حدِّ اعتدال میں رہے اور اِفراط وتفریط کی حدود میں قدم نہ رکھے اور کمالِ انسانی کی سرحد تک اس کی رُشد کا سفر مکمل ہو سکے۔

اسی فطری ضرورت کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرامؑ کو مبعوث فرمایا جنہوں نے دینِ اسلام کی طرف انسان کی رہنمائی کی یہاں تک کہ یہ سلسلہ حضرت خاتم الانبیاءؐ پر منتہی ہوا جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ. آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۳)

آئندہ مباحث میں ہم آپ کو تفصیل سے بتائیں گے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے وہ کون سے وسائل فراہم کئے تھے جن کی وجہ سے آپؐ کے لئے دینِ اسلام کی تبلیغ ممکن ہوئی۔ اور پھر یہ کہ اس دین کی بقا کے لئے آپؐ نے کیا جدوجہد کی تھی البتہ اس تحقیق سے پہلے مناسب ہے کہ ہم ظہورِ قدسی سے قبل کے عرب معاشرے کا جائزہ لیں۔

(۲) ظُہورِ قدسی سے پہلے کا عَرب معاشرہ

ظہورِ قدسی سے پہلے کے عَرب معاشرے کو سمجھنے کے لئے ان تین امور کو سمجھنا اشد ضروری ہے۔

۱۔ عربوں کی اَصل ونسل

۲۔ قبل از اسلام عرب کے دینی، ثقافتی، اقتصادی اور سماجی حالات

۳۔ قبل از اسلام مکہ اور مدینہ کے حالات

—۱—

عربوں کی اصل ونسل

عربوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سام بن نوحؑ کی اولاد ہیں۔ تمام عربوں کا شجرہ بنیادی طور پر نسل عدنان یا نسلِ قحطان میں سے ایک نہ ایک سے جا کر مل جاتا ہے۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے:

(۱) عدنانیوں کا سلسلۂ نسب حضرت اسماعیلؑ بن حضرت ابراہیمؑ سے جا کر ملتا ہے۔ یہ نسل مکہ، پھر نجد اور اس کے بعد تمام جزیرۂ عرب میں پھیل گئی۔ ان لوگوں کی بود و باش بعثت سے پہلے ہی مکہ میں تھی۔

(۲) قحطانیوں کا سلسلۂ نسب یَعرُب بن قحطان پر منتہی ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ یمن کے باشندے تھے۔ پھر ان میں سے دس قبائل نے شام، عراق اور مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ ان میں سے اَوس اور خَزرج نامی دو قبیلے مدینے میں آ کر آباد ہوگئے۔[۱]

۱۔ تفصیل کے لئے ابن کلبی کی مُختَصَر جَمْہَرۃ اَنسابِ العَرَب (اس کتاب کی فوٹو کاپی مجمع علمی اسلامی تہران کی لائبریری میں موجود ہے) کے علاوہ ابن حزم کی الانساب اور اماکن عرب کے متعلق عمر رضا کحالہ کی قبائل العَرَب دیکھئے۔

—۲—

قبل از اسلام عرب کے دینی، ثقافتی، اقتصادی اور سماجی حالات

جزیرۂ عرب کی دینی حالت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل جزیرۂ عرب اور اس کے اطراف و اکناف میں خدا نے تین شریعتیں نازل فرمائی تھیں اور ان کے پیروکاروں نے تمام شریعتوں میں تحریف کر کے ان کو مسخ کر دیا تھا۔

(۱) شریعتِ ابراہیمی

قرآن و حدیث کے الفاظ میں اس شریعت کے پیروکار کو حنیف کہا گیا ہے جس کی جمع ''احناف و حنفاء'' ہے۔ ''حَنَفَ'' کے لفظی معنی باطل سے رخ پھیر کر حق کی طرف منہ کرنے کے ہیں۔[1] قرآن مجید میں لفظ ''حنیف'' کو لفظ ''مسلم'' کی ردیف میں بیان کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا. ابراہیمؑ یہودی اور نصرانی نہیں تھے۔ وہ ''حنیف'' اور ''مسلم'' تھے۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۶۷)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام اور پھر ان کی اولاد ابراہیمی شریعت کے پابند تھے اور ''حنفاء'' کہلاتے تھے۔ ابراہیمی شریعت میں سب سے پہلے عمرو بن لحی نے تحریف کی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ نسل اسماعیلؑ کے ایک شخص عمرو بن لحی نے سفر شام کے دوران ''بلقا''[2] کے شہر ''مآب'' سے گزرتے ہوئے قوم عمالقہ کو پوجا کرتے دیکھا تو ان سے پوچھا کہ تم کس چیز کو پوجتے ہو؟

۱۔ حَنَفَ، جَنَفَ کا متضاد ہے اور جَنَفَ کے معنی حق کو پست کر کے باطل کی طرف منہ کرنے کے ہیں۔ (مفردات راغب)

۲۔ ''بلقا'' شام اور وادی القریٰ کے درمیان ایک شہر تھا جو کہ نسبتاً مدینہ کے زیادہ قریب تھا۔ ''بلقا اور مآب'' کی تفصیلات کے لئے معجم البلدان دیکھئے۔

انہوں نے کہا: ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم ان سے بارش طلب کرتے ہیں تو یہ بارش برساتے ہیں اور ہم ان سے دشمن کے خلاف مدد مانگتے ہیں تو یہ ہماری مدد کرتے ہیں۔

عمرو نے یہ سن کر کہا: ان میں سے ایک بت مجھے بھی دیدو۔ میں اسے اپنے ساتھ مکّہ لے جاؤں گا۔

انہوں نے عمرو کو "ہُبل" نامی بُت دیا۔ وہ ہُبل کو لے کر مکّہ آیا اور اسے یہاں نصب کردیا۔ اس نے لوگوں کو ہُبل کی عبادت کی دعوت دی۔ بُت پرستی کے علاوہ اس نے اور بھی بہت سی بدعات دینِ ابراہیمی میں داخل کی تھیں۔[1] اس کے بعد قریش اور نسلِ اسماعیلؑ کے دیگر قبائل میں بُت پرستی عام ہوئی۔ بدقسمتی سے یہ بُت پرست افراد کائنات کے عظیم بُت شکن حضرت ابراہیم خلیلُ الرحمٰنؑ کی اولاد تھے۔ بُت گری اور بُت پرستی کے باوجود چونکہ قریش کعبہ کے مجاور اور حاجیوں کے مہمان دار تھے اس لئے وہ اپنے آپ کو شریعتِ ابراہیمؑ کا وارث سمجھتے تھے اور اس حوالے سے خود کو باقی عربوں سے ممتاز سمجھتے تھے۔

عرب قبیلوں میں سے چند قبائل نے یہودیت یا نصرانیت قبول کرلی تھی لیکن ان کی غالب اکثریت بت پرست ہی تھی۔ تمام بُت پرست سال میں ایک مرتبہ حج کے لئے مکّہ آتے اور دینِ ابراہیمی کے مناسکِ حج کو تحریف شدہ شکل میں ادا کرتے تھے۔

عرب قبائل چار مہینوں کو اشہرالحرام کہتے تھے اور ان مہینوں میں جنگ سے گریز کرتے تھے۔ ذیقعدہ، ذی الحج اور محرّم، حج اور سفرِ حج کے لئے مخصوص ہوتے تھے جبکہ ماہ رجب میں وہ عمرہ بجا لاتے تھے۔ ان چار مہینوں میں جزیرۂ عرب میں امن و امان قائم رہتا تھا۔ اگر کوئی عرب ان مہینوں میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھتا تو اس سے انتقام نہ لیتا تھا۔ ان چار مہینوں میں خوب تجارت ہوتی تھی اور خصوصی بازار لگائے جاتے تھے۔

قریش اور دیگر قبائل دینِ ابراہیمؑ کی تحریف پر کبھی توجہ نہیں دیتے تھے۔ البتہ ایک بار مکہ کے چار آدمیوں نے اس حسّاس مسئلے پر توجہ دی اور ابراہیمؑ شریعت کو زندہ کرنے کا عہد کیا۔ ان کے نام یہ تھے (۱) ورقہ بن نوفل (۲) عبیداللہ بن جحش (۳) عثمان بن حُوَیرِث (۴) زید بن عمرو بن نُفَیل۔

یہ چاروں آدمی ایک دفعہ ایامِ حج میں اکٹھے ہوئے اور انہوں نے ایک دوسرے سے کہا: ہماری قوم گمراہ ہوچکی ہے اور اس نے اپنے مُورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ آخر یہ اندھے بہرے پتھر کیا ہیں جن کے گرد یہ لوگ طواف کرتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔ ہمیں گم گشتہ دینِ ابراہیمی کو تلاش کرنا چاہئے اور اس کے لئے دوسرے شہروں میں جانا چاہئے۔

نتیجتاً ورقہ اور عثمان عیسائی ہوگئے اور عبیداللہ نے اسلام قبول کرلیا مگر بعدازاں وہ بھی مرتد ہوگیا اور

۱۔ ابن ہشام، سیرت، ج ۱، ص ۸۱ و ۸۲۔ قصہ عمرو بن لحی وعبادۃ الاصنام۔

عیسائی بن گیا۔ زید بن عمرو بن نفیل نے بت پرستی اور قریش کی دوسری بدعات کو ترک کر دیا اور کعبے میں کھڑے ہو کر علی الاعلان قریش سے کہا: ''تم دینِ ابراہیمی پر نہیں ہو۔''[۱]

مذکورہ چاروں افراد نے کسی نہ کسی حد تک قریش کے سامنے آوازِ حق بلند کر کے لوگوں کے ذہنوں کو خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کے لئے تیار کیا تھا۔

(۲) شریعتِ موسوی

کوہِ طُورِ سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت شریعت عطا ہوئی جب وہ اپنی قوم کو مصر سے نکال کر بیت المقدس لے جا رہے تھے۔ اس شریعت کے مخاطب صرف بنی اسرائیل تھے۔ ملک شام کا شہر بیت المقدس بنی اسرائیل کا مذہبی مرکز تھا۔

ظہورِ اسلام سے قبل کچھ یہودی دوسری قوموں سے برسرِ پیکار رہنے کے بعد یمن میں گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ کچھ اور یہودی شام میں انتہائی ذلّت کے دن گزار رہے تھے البتہ یہودیوں کی ایک معقول تعداد شام سے نزدیک مدینہ اور اس کے نواح — خیبر، وادی القریٰ اور تیما — میں بھی آباد تھی۔

جس طرح حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے ان کی شریعت میں تحریف کی تھی، اسی طرح حضرت موسیٰ کی قوم نے بھی موسوی شریعت کو بدل دیا تھا۔ پھر عجیب بات یہ تھی کہ وہ تحریف شدہ توراۃ بھی عام یہودیوں کی دسترس سے باہر تھی۔ توراۃ کے چند ابواب یہودی علماء کے پاس تھے جو حضرت ہارونؑ کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ توراۃ کے اکثر احکام چھپاتے تھے اور موسوی شریعت کی بجائے چند رسومات کی پابندی پر زور دیتے تھے مثلاً بیت المقدس کا قبلہ ہونا، ہفتہ کے دن چھٹی کرنا اور اولادِ ہارونؑ کی روحانیت کا قائل ہونا۔

علمائے یہود کے پاس توراۃ کے جو بچے کھچے نسخے تھے، ان میں رسولِ اکرمؐ کی بعثت اور آپؐ کی صفات کا تذکرہ موجود تھا اور توراۃ کی بشارتوں سے تمام اہلِ کتاب واقف تھے۔ وہ لوگ ذہنی طور پر رسولِ اکرمؐ کی آمد کے منتظر تھے اور انہیں آنحضرتؐ کی جملہ صفات یاد تھیں کیونکہ مدینے کے یہودی علماء وہاں کے لوگوں کو رسولِ اکرمؐ کے ظہور کی خبر دیا کرتے تھے اور اوس و خزرج کے سامنے عالمانہ پیش گوئیاں کیا کرتے تھے۔

(۳) شریعتِ عیسوی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کافی عرصے بعد بیت المقدس میں مبعوث فرمایا۔ حضرت عیسیٰؑ کا تعلق اسرائیلی خاندان سے تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان پر اٹھا لیا تو ان کی

۱۔ ابن ہشام، سیرت، ج ۱، ص ۲۴۲ تا ۲۴۷ میں زید کے تفصیلی حالات مذکور ہیں۔

شریعت بھی مسخ ہوگئی اور ان کے ماننے والے تین اقنوم — باپ، بیٹا اور روح القدس— پر ایمان لے آئے۔ انہوں نے ہفتے کی چھٹی کو اتوار سے بدل ڈالا— اور یوں آہستہ آہستہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات دنیا سے رخصت ہوتی گئیں اور نصرانیوں کے پاس چند ظاہری باتوں مثلاً بیت المقدس کے قبلہ ہونے اور صلیب کے نشان کو گلے میں لٹکانے کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا۔

عیسوی شریعت میں تمام تر تحریفات کے باوجود رسول اکرمؐ کی آمد کے متعلق سابقہ انبیاء اور حضرت عیسیٰ کی بشارتیں موجود تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے ان بشارتوں کو لوگوں کی دستبرد سے محفوظ رکھا اور نصرانی علماء جہاں بھی جاتے رسول اکرمؐ کی بعثت کی پیش گوئی کیا کرتے تھے۔

نصرانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد شام میں جبکہ کچھ تعداد یمن اور عراق میں بھی رہائش پذیر تھی۔ مکہ اور شام کے راستے میں راہبوں کے چند عبادت خانے بھی موجود تھے۔ وہاں رہنے والے راہب کبھی کبھار جب عرب تاجروں سے ملتے تو اثنائے گفتگو میں رسول اکرمؐ کی بعثت کا ذکر بھی کیا کرتے تھے۔

یہود و نصاریٰ کو قدیم الایام سے ایک دوسرے سے شدید دشمنی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے سخت کینہ رکھتے تھے۔ قرآن مجید نے ان کی گفتگو نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّ قَالَتِ النَّصَارٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتَابَ.... یہودیوں نے کہا کہ نصاریٰ حق پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ یہودی حق پر نہیں ہیں جبکہ وہ سب (اہل کتاب ہیں اور) کتاب پڑھتے ہیں۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۱۳)

اس دور کے بت پرست اپنے آپ کو اور اہل کتاب کو حق پر جانتے تھے لیکن وہ نصاریٰ کی بجائے یہودیوں کا زیادہ احترام کرتے تھے اور انہیں "اہل کتاب اول" کہہ کر پکارتے تھے۔

عقیدۂ معاد

حضرت رسول اکرمؐ کی بعثت سے قبل صابئیوں، مجوسیوں، یہودیوں اور نصرانیوں کا روزِ آخرت پر کوئی خاص ایمان نہیں تھا۔ عرب کے بت پرست بھی معاد کے منکر تھے۔ قرآن مجید نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ۝ اس دنیاوی زندگی کے سوا ہمارے لئے اور کوئی زندگی نہیں ہے۔ بس ہم یہاں مرتے اور زندہ رہتے ہیں اور ہمیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ (سورۂ مومنون: آیت ۳۷)۔

اہلِ عرب کی اکثریت بت پرست تھی۔ وہ بتوں کو خدا کا شریک جانتے تھے۔ وہ اپنے شرک میں اس

قدر پختہ تھے کہ اُنھیں سے دنیاوی حاجات، دشمنوں پر فتح اور بارش کی دعا مانگتے تھے حتی کہ اپنے بیماروں کی شفا اور جانوروں کے دودھ اترنے کی دعا بھی انھیں بتوں سے مانگا کرتے تھے۔

بت پرستی کا ان کی عملی زندگی پر یہ اثر ہوا تھا کہ وہ ناحق قتل کرنے، لوٹ مار کرنے، اذیتیں دینے اور گالیاں بکنے الغرض کسی بھی فعلِ بَد کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ البتہ اگر کسی فعلِ بَد کے متعلق اندیشہ ہوتا کہ اس کی سزا اُنہیں دنیا میں ہی ملے گی تو پھر وہ اس سے ڈرتے تھے۔ مثلاً جب انہیں یہ یقین ہوتا کہ اگر ہم نے فلاں شخص کو قتل کیا تو اس کی قوم انہیں زندہ نہیں چھوڑے گی اور وہ انتقاماً قاتل کے قبیلے کے ایک فرد کو قتل کرے گی تو وہ قتل کرنے سے باز رہتے تھے اور یہ کہ جن کاموں کے متعلق انہیں یقین ہوتا کہ یہ کام ان کی بدنامی کا باعث ہوں گے تو وہ ایسے کاموں سے بھی پرہیز کرتے تھے۔

عرب ثقافت

اسلام سے قبل عرب تہذیب وثقافت کے دو اہم شعبے علمِ اَنساب اور شعرِ بلیغ تھے۔

عربوں کو اپنا شجرۂ نَسَب یاد رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کے شوق کا یہ عالَم تھا کہ دوسری صدی ہجری کے اگر کسی عربی کا تعلق عدنانی نسل سے ہوتا تو وہ اپنے سے لیکر حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ تک کے تمام بزرگوں کا نام یاد کرتا تھا اور اگر کسی کا تعلق قحطانی نسل سے ہوتا تو وہ یَعرب بن قحطان تک تمام ناموں کو یاد کرتا تھا۔

اپنے شوق کی وجہ سے عرب اپنے شجروں کے سوا گھوڑوں کے نسب نامے بھی یاد رکھتے تھے۔ ہشام بن محمد کلبی کی کتاب ''اَنسابُ الخیل'' جس میں گھوڑوں کے نَسَب تحریر ہیں، آج بھی موجود ہے[۱] مگر اس کے باوجود آج ہمیں جو نَسَب نامے دکھائی دیتے ہیں وہ بڑی حد تک مشکوک ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی قبیلے کا ایک گروہ اپنے قبیلے سے جدا ہو کر دوسرے قبیلے سے الحاق کر لیتا تھا۔ ابن کلبی نے اس موضوع پر ''النواقل'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے ان قبائل کی تفصیل دی ہے جنہوں نے اپنے حقیقی قبائل سے ناطہ توڑ کر دوسرے قبائل سے الحاق کر لیا تھا۔

اس کے علاوہ عربوں میں متبنّٰی گیری کا رواج عام تھا۔ لوگ کسی دوسرے کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا لیتے تھے۔ پھر علم الانساب میں متبنّٰی اپنے حقیقی والد کی بجائے دوسرے شخص کے نام سے منسوب ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں عصرِ جاہلیت کے اَنسابِ عرب میں ایسے نمونے بھی موجود ہیں جو مذکورہ اَنساب کی صحت کو مشکوک بناتے ہیں۔ بطورِ مثال مندرجہ ذیل نَسَب ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ اس کتاب کا ایک عکسی نسخہ مجمع علمی اسلامی تہران کی لائبریری میں موجود ہے۔

ابن ابی الحدید، زمخشری کی ربیع الابرار سے نقل کرتے ہیں:

عمرو بن عاص کی ماں مکہ کی ایک بدکار عورت تھی۔ اسے عبداللہ بن جدعان نے آزاد کیا تھا اور وہ نابغہ کے نام سے مشہور تھی۔ ایک طہر میں پانچ افراد نے اس سے زنا کیا جن کے نام یہ تھے: (۱) ابولہب بن عبدالمطلب (۲) امیہ بن خلف (۳) ہشام بن مغیرہ (۴) ابوسفیان بن حرب (۵) عاص بن وائل۔

مذکورہ افراد کے ملاپ سے نابغہ حاملہ ہوئی اور نتیجے میں ''عمرو'' پیدا ہوا۔ ان پانچوں افراد نے اس کا باپ ہونے کا دعویٰ کیا۔ بعدازاں نابغہ کو فیصلے کا اختیار دیا گیا۔ عمرو اگرچہ شکل وصورت میں ابوسفیان کے مشابہ تھا مگر نابغہ نے اپنے بیٹے کو عاص بن وائل سے منسوب کیا۔ اس کے بعد عمرو کو عاص بن وائل کا بیٹا تسلیم کرلیا گیا اور عاص کے قبیلے ونسب سے اس کا استلحاق کیا گیا۔ جب نابغہ سے پوچھا گیا کہ اس نے اپنے بیٹے کو عاص کا نطفہ کیوں قرار دیا تو اس نے کہا کہ عاص مجھ پر کافی رقم لٹاتا ہے۔[1]

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انساب عرب کی کتابوں میں عمرو کو عاص بن وائل کا بیٹا لکھا جانے لگا۔ انساب قریش میں اس طرح کی کئی اور مثالیں موجود ہیں۔[2]

طائف کے قبیلۂ ثقیف کے متعلق بھی اس طرح کی کئی داستانیں تاریخ کے اوراق پر ثبت ہیں جبکہ اس کے برعکس علمائے انساب نے مدینے کے قبائل اوس وخزرج اور یمن کے قبائل ہمدان کے متعلق کوئی قابل اعتراض روایت نقل نہیں کی۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں عرب معاشرے میں باقاعدہ علمائے انساب موجود تھے جن سے لوگ نسب نامے یاد کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عقیل بھی ماہر انساب شمار ہوتے تھے۔

یعقوبی اپنی تاریخ، جلد اول، صفحہ ۲۶۲ پر رقم طراز ہیں کہ:

عرب شعر وشاعری کو علم وحکمت اور دیگر متداول علوم کی جگہ پر سمجھتے تھے۔ اگر کسی قبیلے میں کوئی قادرالکلام شاعر ہوتا تو اہل قبیلہ اس پر ناز کرتے اور اسے اپنی پلکوں پر بٹھاتے تھے۔ شاعر اپنے قبیلے کی اچھی روایات کو نظم کرتے اور مخصوص بازاروں کے مجمع ہائے عام میں سناتے تھے۔ اس کے عوض وہ اہل قبیلہ سے داد پاتے اور انعامات حاصل کرتے تھے۔ قبائلی تفاخر پر مبنی اشعار صرف مقامی بازار تک ہی محدود نہ رہتے بلکہ اہل

۱۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۶، ص ۲۸۳۔ شرح خطبہ ۸۳ میں عمرو بن عاص کے نسب کی تفصیل موجود ہے۔

۲۔ زیاد اور معاویہ کے نسب کے حالات شرح ابن ابی الحدید، ج ۱، ص ۳۳۶، ج ۱۶، ص ۱۸۷ پر دیکھئے۔ علاوہ ازیں امیہ کے غلام ابوعمر ذکوان کو اس کے آقا ولید نے متبنٰی بنایا تھا۔ ولید بن عقبہ بن ابی معیط بن ابی عمر اسی کا پوتا تھا اور یہ ولید ماں کی طرف سے حضرت عثمانؓ کا بھائی تھا۔ اس داستان کی تفصیل ابوالفرج اصفہانی کی اغانی، ج ۱، ص ۲۴ میں موجود ہے۔ ولید کی داستان کیلئے نقش عائشہؓ در تاریخ اسلام، ج ۱، ص ۱۵۲ دیکھیں۔

قبیلہ اپنے شاعر کو مکے کے مشہور سالانہ میلے میں — جو کہ ایامِ حج میں منعقد ہوتے تھے — شرکت کے لئے اپنے ساتھ لاتے تھے جہاں وہ تمام قبائل عرب کے سامنے دادِ سخن دیتا تھا۔ ان لوگوں کے ہاں اشعار گوئی کے علاوہ اور کوئی تہذیب نہیں تھی۔ ان کے ہاں کبھی ایک شعر سے دشمنی کے شعلے بھڑک اٹھتے تھے تو کبھی ایک شعر سے دشمنی کی آگ بجھ جاتی تھی اور صلح صفائی ہو جاتی تھی۔

اہل عرب اپنی روز مرہ گفتگو میں شعر کو ہی بطور مثال لایا کرتے تھے اور شعر و شاعری کے ذریعے ایک دوسرے پر افتخار کیا کرتے تھے۔ اپنے قبیلے کی اچھائیوں اور مخالف قبیلے کی برائیوں کا مضمون بھی شعر ہی میں باندھا جاتا تھا بالفاظ دیگر ان کے ہاں قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کا رواج بھی عام تھا۔ وہ جنگ کے میدان میں بھی تلوار کے جوہر دکھانے سے پہلے زوردار رزمیہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

عرب چار قسم کے مفاہیم کے لئے شعر کہا کرتے تھے:

(۱) افرادِ قبیلہ کی بہادری نیز آلات حرب مثلاً شمشیر، نیزہ، تیر کمان اور گھڑ سواری کا تذکرہ کرنے کے لئے۔ ان کے اشعار فردوسی کے اشعار کی طرح ہوتے تھے جن میں اس نے رستم، اس کے گھوڑے اور ہتھیاروں کا ذکر کیا ہے۔ البتہ عربی شعراء کے ہاں سواری کے اونٹوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو فردوسی کے ہاں مفقود ہے۔

(۲) اپنی اور اپنے قبیلے کی سخاوت بیان کرنے کے لئے۔ فارسی میں اس مفہوم کی شاعری دکھائی نہیں دیتی۔

(۳) عشقیہ شاعری میں اپنی محبوبہ اور اس سے وابستہ چیزوں کا ذکر کرنے کے لئے۔ عشقیہ شاعری دنیا کی ہر زبان میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ اس صنف میں عبید زاکانی جیسی مبتذل شاعری بھی دکھائی دیتی ہے۔

(۴) قبائلی عصبیت پر مبنی شاعری۔ شاعری کی یہ صنف جتنی اہل عرب میں دکھائی دیتی ہے اتنی دنیا کی کسی زبان میں دکھائی نہیں دیتی۔

عرب کے بعض قصائد میں کچھ اشعار حکمت سے لبریز بھی دکھائی دیتے ہیں اور بعض اشعار میں حکمت عملی یعنی اخلاقِ عالیہ کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ شاعری کے علاوہ عرب میں اخلاقِ حمیدہ کی دعوت کے لئے بلیغ خطبات کا رواج بھی تھا اور شاعری کی طرح یہ بلیغ خطبات بھی میلوں میں دیئے جاتے تھے۔ اسلام سے قبل حضرت ابوطالبؑ مکے کے اور حضرت حسان بن ثابت مدینے کے بڑے شاعر شمار ہوتے تھے۔

اسلام سے قبل عربوں کی اقتصادی حالت

مدینہ، یمن، عراق اور شام میں رہنے والے قبائل زراعت اور باغبانی کیا کرتے تھے جبکہ مکے میں رہنے والے قبائلِ قریش تجارت سے وابستہ تھے اور ایک سال میں ان کے دو سفرِ تجارت ہوا کرتے تھے۔ سردی

میں ان کا تجارتی قافلہ مکے سے یمن اور حبشہ جبکہ گرمیوں میں مکے سے شام، ایران اور عراق جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کے گرمی اور سردی کے قافلوں کے متعلق سورۂ قریش نازل فرمائی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ○ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ○ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ○ الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ○ یعنی عظیم اور دائمی رحمتوں والے خدا کے نام سے۔ قریش کے انس و الفت کی خاطر، جو انہیں سردی اور گرمی کے سفر سے ہے۔ لہذا انہیں چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں، جس نے انہیں بھوک میں سیر کیا ہے اور خوف سے محفوظ رکھا ہے۔

جزیرۂ عرب کے چند قبائل دولت مند شمار ہوتے تھے مگر تجارت کی وجہ سے پورے عرب میں قریش سے زیادہ کوئی دولت مند نہیں تھا۔ عربوں کی اکثریت ریگستانوں میں رہتی تھی۔ ان پر سخت غربت اور خشک سالی کا راج تھا۔ عرب کے طبعی حالات کی وجہ سے وہاں اونٹ سب سے کارآمد جانور تصور کیا جاتا تھا کیونکہ اونٹ باقی جانوروں کی نسبت زیادہ دیر تک پیاس کو برداشت کرسکتا ہے۔ رزم آراء قسم کے جوانوں نے جنگ اور شکار کے لئے گھوڑے بھی پال رکھے تھے۔ اُس وقت کے عرب بدّو ـــ آج کے متمدن اہل مغرب کی طرح ـــ ہر قسم کے جانور اور کیڑے مکوڑے بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے۔

عرب بڑے مغرور، تنگ مزاج اور جھگڑالو تھے۔ وہ کبھی کبھی ایک دوسرے پر حملہ بھی کرتے تھے جس کے نتیجے میں ایک قبیلہ مغلوب اور دوسرا غالب آجاتا تو غالب قبیلے کے جوان مغلوب قبیلے کے تمام مال واسباب اور حیوانات لوٹ لیا کرتے تھے۔ بعض اوقات معاملہ صرف لوٹنے تک ہی محدود نہ رہتا بلکہ مغلوب قبیلے کے باقی ماندہ مرد و زن غلام اور کنیز بنالئے جاتے جنہیں بعدازاں بازارِ غلاماں میں فروخت کردیا جاتا۔

عرب کے ان دشوار گزار حالات میں مرد ہی کنبے کا واحد کفیل ہوتا تھا۔ گھریلو معیشت میں عورت کا کوئی کردار نہیں ہوتا تھا اس لئے بعض سفاک قسم کے باپ اپنی نوزائیدہ بیٹیوں کو زندہ درگور کردیتے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِیَّاهُمْ ۔ یعنی اپنی اولاد کو تنگدستی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی رزق دیتے ہیں۔ (سورۂ انعام: آیت ۱۵۱)

وہاں کے معاشی حالات کے تحت غلاموں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی کیونکہ غلام اپنے مالکوں کے لئے کمائی کا مستقل ذریعہ ہوتے تھے جبکہ مالکوں کو ان پر بہت کم خرچ کرنا پڑتا تھا۔ ان کی جملہ کمائی پر انہیں تصرف حاصل ہوتا تھا اور جب وہ کسی غلام سے اکتا جاتے تو اس کو بازار میں فروخت کرکے اچھا خاصا منافع کمالیتے تھے۔ کنیزیں بھی مالکوں کے لئے کمائی کا ذریعہ ہوتی تھیں۔ اکثر مالک ان سے جنسی آسودگی حاصل کرتے تھے

اور بعض مالک ان سے پیشہ کروا کر کمائی کرتے تھے۔ اگر کوئی کنیز بچے کو جنم دیتی تو وہ بچہ بھی اپنی ماں کی طرح مالک کا مال ہوتا تھا اور یہ کنیزوں کا دوہرا فائدہ تھا۔[۱] اور اگر کوئی کنیز آزاد ہو جاتی تو وہ آزاد رہ کر بھی فحاشی و بدکاری جاری رکھتی تھی۔ اگر اس سے کوئی بچہ ہوتا تو تمام زانی مرد اس بچے کو اپنی طرف منسوب کرتے تھے۔ اگر ان میں باہمی فیصلہ نہ ہو پاتا تو پھر بچے کی ماں سے پوچھا جاتا تھا کہ وہ خود بتائے کہ یہ بچہ کس کا ہے اور وہ عورت جب اپنے بچے کو کسی سے منسوب کر دیتی تو وہ بچہ اس شخص کے خاندان سے وابستہ ہو جاتا تھا اور باقی اشخاص اس سے دستبردار ہو جاتے تھے۔[۲]

اس دور میں بدکار عورتیں اپنے گھروں پر مخصوص قسم کا جھنڈا آویزاں کرتی تھیں جو اس بات کی علامت ہوتا تھا کہ اس گھر کی مالکہ ہر شخص کو خوش آمدید کہنے پر آمادہ ہے۔[۳]

اسلام سے پہلے تمام قبائل میں بازار لگانے کا مخصوص سیزن ہوا کرتا تھا۔

عرب کے بازار

عرب میں زمانۂ امن میں بازار لگانے کا رواج تھا۔ حرمت والے مہینوں میں لوٹ مار ممنوع ہوتی تھی اور تمام قبائل ہر طرف سے سمٹ کر مکے کی طرف جاتے تھے۔ عرب کے بازاروں میں بازار عکاظ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ بازار نجد کے بالائی حصے میں لگایا جاتا تھا۔ یہ جگہ طائف سے ایک دن اور مکہ سے تین دن کی مسافت پر واقع تھی۔

ماہ ذیقعدہ میں قریش اور عرب کے دوسرے قبائل اس بازار میں جمع ہوتے تھے۔ وہاں خرید و فروخت کے علاوہ قبائل کے فخر و مباہات کے لئے ایک جگہ مخصوص ہوتی تھی۔ شعراء اور بُلغاء کے خطبات کے لئے بھی وہاں جگہیں مقرر تھیں جہاں شاعر اور ادیب لوگوں کو اپنا کلام سنا کر داد اور انعام وصول کرتے تھے۔ ان بازاروں میں قبائل کے درمیان باہمی عہد و پیمان بھی ہوا کرتے تھے۔

بازار عُکاظ کے بعد بازار مجنہ شروع ہوتا تھا جو مکے سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔ مجنہ کا بازار ذیقعدہ کے آخر تک جاری رہتا تھا۔ مجنہ کے بعد بازار ذوالمجاز شروع ہوتا تھا۔ یہ بازار میدانِ عَرفات سے ایک فرسخ کے فاصلے پر لگتا تھا۔ آٹھ ذی الحج تک لوگ وہاں رہتے اور نویں کو مناسک حج ادا کرنے عَرفات چلے جاتے تھے۔[۴]

۱۔ طائف کے حالات کی بحث میں عبداللہ بن اُبَی کی داستان کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ عرب ثقافت کے زیر عنوان عمرو بن عاص کی داستان گزر چکی ہے۔

۳۔ المحبر، ص ۳۴۰۔ اس طرح کے گھر مکہ اور طائف میں موجود تھے۔

۴۔ تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ یعقوبی، تاریخ طبری، مروج الذہب اور سیرت ابن ہشام۔

قبل از اسلام عربوں کی سیاسی اور سماجی حالت

انسانی معاشرہ ہمیشہ الٰہی یا بشری نظام کے زیر اثر رہا ہے۔ جس معاشرے میں الٰہی نظام نافذ ہو اس معاشرے کے افراد معارف و جہاں بینی اور احکام زندگی کو انبیائے کرامؑ کے ذریعے رب العالمین سے حاصل کرتے ہیں۔ الٰہی معاشرے کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس میں رہنے والے افراد تمام معاملات میں رضائے الٰہی کے حصول کو پیش نظر رکھتے ہیں جبکہ بشری نظام پر قائم معاشرے کے افراد اپنے معاملات کو اپنی پسند و ناپسند اور ذاتی منفعت کے لئے انجام دیتے ہیں۔ البتہ جب اس معاشرے کے افراد کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ جس معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس معاشرے کے فائدے میں ان کا فائدہ اور اس کے نقصان میں ان کا نقصان ہے تو پھر اس معاشرے کے افراد بعض اوقات معاشرے کے فائدے کے لئے بھی کام کرنے لگ جاتے ہیں اور بعض اوقات اس میں ان کا ذاتی نقصان بھی ہوتا ہے۔

ہر معاشرہ جس میں بشری نظام کارفرما ہو خواہ وہ نظام نسل پرستی پر مبنی ہو — جیسے سابقہ دور میں جرمنی کی نازی ریاست یا موجودہ دور میں صیہونی ریاست جو کہ مقبوضہ فلسطین پر قائم کی گئی ہے — یا قوم پرستی پر مبنی ہو جسے آج کل وطن پرستی کا نام دیا جاتا ہے بہرصورت اس طرح کے معاشروں میں افراد اپنے معاشرے کی سربلندی کے لئے کام کرتے ہیں اور ان کا مقصد صرف اپنے معاشرے کی سربلندی تک محدود نہیں ہوتا بلکہ دوسری اقوام کا استحصال کرنا بھی ان کے مقاصد میں شامل ہوتا ہے۔

بشری نظام کے برعکس جس معاشرے میں الٰہی نظام ہوگا اس معاشرے کے افراد خدا کی رضا کے حصول کے لئے کام کریں گے۔ وہ اپنے ذاتی اور معاشرتی مفاد کے لئے کام کریں گے لیکن ان کی کدّ و کاوش دوسروں کے استحصال پر مبنی نہیں ہوگی۔ اس طرح کے افراد اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ وہ خود پرست، نسل پرست یا وطن پرست نہیں بلکہ خدا پرست ہیں۔

دورِ جاہلیت میں عرب خود پرست اور قبیلہ پرست تھے اور ان کی کاوشوں کا محور ذاتی مفاد یا اپنے قبیلے کا مفاد ہوتا تھا اور وہ اپنے عمل سے دوسرے قبائل اور انسانی معاشروں کو نقصان پہنچاتے تھے۔

قبل از اسلام قبیلہ پرستی کی بنیادیں

زمانۂ جاہلیت میں قبائلی عصبیت کا مکروہ نظام مندرجہ ذیل چار بنیادوں پر استوار تھا:

(۱) قبیلے کا شیخ (۲) قبیلے کا شاعر

(۳) قبیلے کے سورما (۴) قبیلے کی دولت

(۱) قبیلے کا شیخ

عرَب کے قبائلی نظام میں قبیلے کا شیخ طاقت اور جاہ وحشم کی علامت ہوتا تھا۔ شیخِ قبیلہ کو اس معاشرے میں وہی مقام حاصل تھا جو کسی بھی مملکت کے سربراہ کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے لوگوں کے لئے بمنزلہ باپ کے ہوتا تھا۔ تمام افراد اپنے شیخ کے فرمانبردار اور وفادار ہوتے تھے۔ اس کی سرداری محبت اور احترام کی بنیادوں پر قائم ہوتی تھی۔ جنگی غنائم میں سے چوتھا حصہ[۱] شیخِ قبیلہ کو دیا جاتا تھا جس کے بدلے میں وہ پورے قبیلے کی طرف سے مہمان نوازی کرتا، قبیلے کے حقوق کا دفاع کرتا اور افرادِ قبیلہ کی نصرت کیا کرتا تھا۔

اجدادِ پیغمبرؐ مکے میں قبائلِ مکہ کے سردار تھے اور وہ سرداری چلتی ہوئی ہاشم کو ملی۔ ان کے بعد ان کے فرزند عبدالمطلب سردار مکہ بنے اور عبدالمطلب کے بعد وہ سرداری ابوطالبؑ تک پہنچی اور یوں ابوطالبؑ شیخِ مکہ قرار پائے۔ مدینے کے اوس وخزرج قبائل کا نظام بھی شیخِ قبیلہ کے گرد گردش کرتا تھا۔

(۲) قبیلے کا شاعر

عرب معاشرے میں شعروشاعری کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ شاعری کو ایک اعلیٰ ہنر اور قابلِ احترام چیز سمجھا جاتا تھا۔ کسی بھی قبیلے کا شاعر ان کا باقاعدہ ترجمان، قبیلے کے افتخار کا نگہبان اور قبیلے کی عظمت کا پاسبان ہوتا تھا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ ایک قصیدے یا نظم کے چند بیت دشمن کو بے آبرو اور رسوا کردیتے اور کبھی اس کے چند بیت سے دو قبائل کے درمیان جنگ چھڑ جاتی جس میں سیکڑوں افراد مارے جاتے تھے اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ شاعر کے کلام سے دو قبائل پر منڈلانے والے جنگ کے بادل چھٹ جاتے اور ان میں دوستی ہو جاتی تھی۔

ایامِ حج کے قبائلی اجتماعات اور موسمی بازاروں میں اعلیٰ قسم کے شعر پڑھے جاتے تھے۔ یہاں جو شعر پڑھے جاتے وہ لوگوں کی زبانوں پر آجاتے اور پھر پورے جزیرۂ عرب میں پھیل جاتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں شعر ہی اچھے یا برے نظریات کی نشرواشاعت کا ذریعہ تھے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس معاشرے میں شاعری کو دولت اور شمشیر سے بھی زیادہ قوت حاصل تھی اور معاشرے کی تعمیر وتخریب کے لئے شاعری ایک موثر ذریعہ تھی۔

۱۔ مالِ غنیمت میں سردار کا حصہ ''مرباع'' کہلاتا تھا۔ دیکھیں: صحاح جوہری، قاموس المحیط، لسان العرب اور تاج العروس۔ مذکورہ کتبِ لغت کے علاوہ سیرت ابن ہشام میں عدی بن حاتم کی آمد کے واقعات میں بھی مذکورہ لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے۔

(۳) قبیلے کے سورما

انسانیت کے ابتدائی اور صحرائی معاشروں کی طرح عرب میں بھی جسمانی قوت کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس دور میں حمزہؓ بن عبدالمطلب اور عمرو بن عبدوُدّ قریش کے بڑے مشہور جنگجو اور سورما مانے جاتے تھے۔

(۴) قبیلے کی دولت

ہر دور میں دولت ایک مؤثر ترین عامل رہی ہے لیکن عرب کے قبل از اسلام معاشرے میں اسے کچھ زیادہ ہی اہمیت حاصل تھی اور اس کے مقابلے میں تمام معنوی اقدار ہیچ تھیں۔ اس دور کے لوگ کہتے تھے:

مَاھِیَ اِلاَّ حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُھْلِکُنَآ اِلاَّ الدَّھْرُ... اس دنیا کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ ہم یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔ (سورۂ جاثیہ: آیت ۲۴)

اس مادّی زندگی کا ایک مثبت پہلو

عرب میں قبل از اسلام جہالت اور درندگی عام تھی مگر اس درندہ صفت معاشرے میں ایک بڑی خوبی جو اس طرح کے دوسرے معاشروں میں بہت کم دکھائی دیتی تھی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ خوبی آج کے ترقی یافتہ معاشروں میں بھی بہت کم دکھائی دیتی ہے "قول و قرار" کی پابندی تھی۔

قبل از اسلام عرب معاشرے میں قول کی اہمیت

انسانی معاشروں کے اجتماعی امور کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ افرادِ معاشرہ ایک دوسرے سے قول و قرار کے پابند رہیں۔ سامان کی خرید و فروخت اور انسانی زندگی کی تمام ضروریات کی تکمیل، کاروبار میں ساجھے داری اور نکاح وغیرہ کی بنیاد قول و قرار کے اعتماد پر قائم ہے۔

آج کل باہمی معاہدے تحریر کیے جاتے ہیں۔ بعض معاہدے حکومت کے چھپے ہوئے اسٹامپ پر ہوتے ہیں جن کے اجرا کی حکومت پابند ہوتی ہے۔ لیکن عرب معاشرے میں معاہدے کسی اسٹامپ پر لکھنا ضروری نہ تھے۔ وہ لوگ زبان کے بڑے پکّے تھے اور زبانی قول و قرار کو نہایت اہمیت دیتے تھے۔ اپنے قول و قرار پر عمل کرنا عزتِ نفس کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ اگر قبیلے کا کوئی شخص وعدہ کرتا تو پورا قبیلہ اس وعدے کی پابندی کرتا تھا۔

عرب معاشرے میں اگر کوئی کسی اجنبی مرد سے کہتا کہ "آج سے تو میرا بیٹا ہے" تو وہ واقعی بیٹا تصور

کیا جاتا تھا حالانکہ وہ کسی دوسری قوم و قبیلے سے ہوتا تھا۔ جب کوئی شخص کسی کو مُتبنّیٰ بناتا تھا تو اس کے دوسرے بیٹے بھی مُتبنّیٰ کو بھائی ہی سمجھتے تھے اور باقی اولاد کی طرح مُتبنّیٰ بھی باپ سے میراث پاتا تھا۔ علمائے اَنساب بھی مُتبنّیٰ کو دوسرے شخص کا بیٹا کہتے تھے اور آج تک علمائے اَنساب کی کئی کتابوں میں اس طرح کے منہ بولے یا لے پالک بیٹوں کا ذکر موجود ہے جنہیں ان کے حقیقی قبیلے کی بجائے دوسرے قبیلے کا فرد تسلیم کیا گیا تھا۔

جب دو قبیلے ایک دوسرے سے عہد و پیمان کرتے تو دونوں ہی اس پیمان کو باقی رکھنے کے لئے بڑی جدوجہد کرتے تھے اور اپنے ہم پیمان قبیلے کا دفاع اپنی اخلاقی اور انسانی ذمہ داری قرار دیتے تھے۔ اگر کسی قبیلے کا کوئی شخص کہتا کہ ''فلاں قبیلے کے فلاں شخص کو میں نے پناہ دی ہے'' تو پھر پناہ دہندہ کے تمام رشتہ دار اور اہل قبیلہ اس شخص کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہوجاتے تھے اور کسی بھی قیمت پر اسے دشمن کے حوالے نہیں کرتے تھے۔

اسی طرح سے اگر کوئی شخص کسی کام کو انجام دینے کے لئے کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا، جسے اصطلاحاً ''بَیْعَتْ'' کہتے ہیں تو پھر بیعت کرنے والا شخص اپنے معاہدے پر باقی رہنے کو اپنی انسانی ذمہ داری سمجھتا تھا اور جس امر کے لئے اس نے بیعت کی ہوتی تھی اسے پوری تن دہی سے بجالانے کی کوشش کرتا تھا۔

اگر کسی صحرا یا جنگل میں دو دشمن ایک دوسرے کو ہتھیار سجائے مل جاتے جہاں بظاہر کوئی قانون نہیں ہوتا اگر ان میں سے ایک دوسرے کو کہہ دیتا کہ تو میری امان میں ہے تو دوسرا فوراً اس کی بات پر اعتماد کرلیتا اور دونوں اپنے اپنے ہتھیار اتار کر اکٹھے سفر کرتے اور کسی کو کسی کی طرف سے کوئی دھڑکا نہیں ہوتا تھا۔ دونوں بڑے سکون سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو سو سکتے تھے۔ ہر قبیلہ اور فرد اپنے لئے جتنی عظمت و شرافت کا مدعی ہوتا وہ اسی قدر عہد و پیمان کا خیال رکھتا تھا۔ دورِ جاہلیت میں جہاں ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا وہاں قول و قرار کی پابندی کو اس معاشرے کا ایک روشن اور مثبت پہلو شمار کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے دور میں وعدے کی پابندی کی اس قدر مثالیں نہیں ملتیں جتنا کہ دورِ جاہلیت کے عرب معاشرے میں ملتی ہیں۔[۱]

جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ عربوں میں ہر اختلاف کا حل تلوار سے ہی نکالا جاتا تھا۔ ایسا بالکل نہیں تھا۔ دوسرے معاشروں کی طرح عرب معاشرے میں بھی قبائل و افراد کا ایک دوسرے سے اختلاف ہوتا تھا اور عام طور پر ان اختلافات کا فیصلہ وہ سردار اور رؤساء کیا کرتے تھے جنہیں ''حاکم'' تصور کیا جاتا تھا۔ عرب معاشرے میں بھی نظم و نسق چلانے والے حکام ہوتے تھے۔

۱۔ قول و قرار کی پابندی کی مثالوں کے لئے دیکھئے تاریخ یعقوبی، تاریخ طبری، مروج الذہب اور سیرت ابن ہشام۔

عرب حُکّام

انسانی معاشرے میں اختلافات دور کرنے کے لئے حکمران طبقے کا ہونا ضروری ہے تا کہ لوگ اپنے جھگڑوں کا فیصلہ ان سے کراسکیں۔ دورِ جاہلیت میں عرب بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں تھے اور ان میں بھی مُنصِف ہوا کرتے تھے جو دانشمندی میں اپنی مثال آپ ہوتے تھے۔ عرب کے تمام قبائل ان کے فیصلے دل و جان سے قبول کرتے تھے۔ فیصلہ کرنے والے فرد کو "حکَم" کہا جاتا تھا جس کی جمع "حکّام" ہے۔ جب کبھی دو قبیلوں یا دو افراد میں تنازعہ ہوتا تو لوگ اپنے حکام کی طرف رجوع کرتے تھے۔

رسولِ اکرمؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب اپنے وقت میں حاکمِ مکہ تھے۔ ان کے بعد ان کے فرزند حضرت ابوطالبؑ حاکمِ مکہ ہوئے۔[۱]

جزیرۂ عرب اور اس کے اطراف کے یہی شب و روز تھے۔ اب ہم مکہ و مدینہ کے حالات پر بحث پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ابن واضح احمد بن ابی یعقوب کاتب، تاریخ یعقوبی، ج۱، ص ۲۵۸ حکام العرب۔

—۳—

قبل از اسلام مکّہ اور مدینہ کے حالات

اہلِ مکّہ کی ثقافت

اہلِ مکہ تجارت کرتے تھے اور تجارت کے لئے شام، ایران، عراق اور حبشہ جایا کرتے تھے اس لئے وہ اس دوُر کی تمام متمدّن ثقافتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ سے بھی ان کے مراسم تھے اس لئے وہ اہلِ کتاب کی عادات و رسومات کو بھی جانتے تھے۔

مکّہ، جزیرۂ عرب کا روحانی مرکز تھا اور تمام عرب ایامِ حج میں دوُر دراز سے سفر کر کے وہاں آتے تھے۔ قریش ان کی میزبانی کرتے جس کی وجہ سے ان کا تمام قبائلِ عرب سے میل جول قائم تھا۔ عرب کے مشہور بازار بھی مکے کے قریب منعقد ہوتے تھے۔ خاص طور پر بازارِ عکاظ تو مکہ کے بالکل قریب لگا کرتا تھا جہاں قادرالکلام شاعر اور صاحبِ طرز ادیب اپنے اشعار اور نثری شہہ پارے پیش کرتے تھے۔ ان تمام عوامل نے جزیرۂ عرب میں قریش کو فصیح قبیلہ بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اسلام سے قبل مکے کے سترہ افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔[۱]

اہلِ مدینہ کی ثقافت

مدینہ اور اس کے اطراف میں ایک عرصے سے یہودی قبائل آباد تھے۔ اوس و خزرج ان یہودی قبائل کے پڑوسی تھے لہذا ان میں بھی اہل کتاب کے رسوم و رواج در آئے تھے۔

اسلام سے پہلے مدینے میں گیارہ افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان میں سے سات افراد کو ''کامل'' کہا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ افراد لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ تیر اندازی اور تیراکی بھی جانتے تھے۔ جو شخص بھی ان کاموں میں ماہر ہوتا تھا اسے کامل کہا جاتا تھا۔[۲]

۱و۲۔ احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری، فتوح البلدان، باب امر الخط، ص۵۸۰ تا ۵۸۳۔

مکہ و مدینہ میں باقی جزیرۂ عرب کی طرح سے قبائلی نظام قائم تھا لیکن دونوں شہروں کے اجتماعی نظام میں کافی فرق تھا۔

مکہ کی سیاسی و سماجی حالت

مکے میں قبیلۂ قریش آباد تھا۔ وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی اولاد تھے۔ اسی لئے نسلی طور پر وہ اپنے آپ کو دوسرے عرب قبائل سے ممتاز سمجھتے تھے۔ قریش خانۂ کعبہ کے متولّی تھے۔ یہود و نصاریٰ کے علاوہ تمام جزیرۂ عرب کے قبائل حج کے لئے مکہ آتے تھے۔ کعبے کی مُجاوَرت اور تولیّت بھی اہلِ مکہ کے فخر و مباہات کے اضافے کا سبب تھی۔

جب ابرہہ ہاتھیوں کا لشکر لیکر کعبے کو منہدم کرنے مکے آیا تو خداوندِ عالم نے اپنے گھر کی حفاظت کے لئے ابابیل بھیج دیئے، جنہوں نے اس کے لشکر پر سنگ باری کی اور تھوڑے سے وقت میں اس کو اور اس کے لشکر کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس واقعے کے بعد قریش کی عزت و عظمت میں زبردست اضافہ ہوا تھا۔

اہلِ مکہ ایران، شام، عراق اور حبشہ تک بغرضِ تجارت سفر کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ بڑے دولت مند تھے چنانچہ ان میں بھی دولت مند طبقے کی تمام برائیاں در آئی تھیں۔ ان کے سماج میں تکبّر و سرکشی، سُود خوری، جُوا اور زِنا جیسی برائیاں عام تھیں۔ یہ برائیاں باقی جزیرۂ عرب کی بہ نسبت قریش میں بدرجۂ اَتم پائی جاتی تھیں اور یوں مکے کا معاشرہ قرآن حکیم کی اس آیت کا عملی مظہر تھا:

کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰیٓ ۝ اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی ۝ بے شک انسان تب سرکشی کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو خوشحال پاتا ہے۔ (سورۂ علق: آیت ۶ و ۷)

مکے میں اَخلاقی گراوٹ دوسرے علاقوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھی اور سرمایہ دارانہ معاشرے کی تمام خرابیاں وہاں جڑ پکڑ چکی تھیں۔ اس معاشرے کی برائیوں کو ہم ترتیب وار یوں بیان کر سکتے ہیں:

(۱) یہ لوگ روزِ آخرت کے منکر تھے۔ چنانچہ جب تجارت اور دوسرے کاروبار سے فارغ ہوتے تو دل کھول کر فسق و فجور اور ہر طرح کی عیاشی کیا کرتے تھے۔

(۲) قریش کے تاجر اکثر تجارت کی غرض سے کئی کئی مہینے سفر میں رہتے تھے۔ جہاں مرد کئی کئی ماہ گھر سے باہر رہے اور گھر میں پردے کا رواج بھی نہ ہو تو وہاں عورتیں بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یہی بے راہ روی مکے کی عورتوں میں دیکھی جا سکتی تھی۔

(۳) اَشرافِ قریش کے گھروں میں کنوارے غلام اور کنواری کنیزیں عام ہوتی تھیں جس کی وجہ سے بے حیائی کو مزید فروغ حاصل ہوا تھا۔

اہلِ مکہ کے اخلاقی دیوالیہ پن کی وضاحت کے لئے ہم ''اغانی'' سے ایک داستان نقل کرتے ہیں:

ابولہب نے عاص بن ہشام کے ساتھ ایک سو اونٹوں کا جوا کھیلا۔ شرط یہ رکھی گئی کہ وہ ایک چھوٹا سا گڑھا کھودیں اور دور سے بیٹھ کر پتھر یا اخروٹ پھینکیں۔ جس کا پتھر یا اخروٹ گڑھے میں جائے گا وہ جیت جائے گا اور ہارنے والے کو ایک سو اونٹ دینا ہوں گے۔

چنانچہ دونوں نے ایک چھوٹا سا گڑھا کھودا اور دور سے باری باری اخروٹ پھینکے۔ عاص کا اخروٹ نشانے پر نہ لگا جبکہ ابولہب کا اخروٹ نشانے پر جالگا اور یوں عاص ایک سو اونٹ کی شرط ہار گیا۔ عاص نے ایک بار پھر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور ابولہب سے کہا: میں ایک بار پھر تم سے یہ مقابلہ کرنا چاہتا ہوں اور اس بار بھی ایک سو اونٹ کی شرط لگاتا ہوں۔

ابولہب نے کہا: مجھے منظور ہے۔ پھر دونوں نے باری باری اخروٹ پھینکا۔ اس دفعہ بھی عاص کا نشانہ خطا گیا اور ابولہب کا اخروٹ نشانے پر جالگا۔ یوں ابولہب نے ایک سو مزید اونٹ جیت لئے۔

عاص نے جو دو سو اونٹ جوئے میں ہار چکا تھا، ایک اور جوئے کی ٹھانی اور ابولہب سے کہا: میں ایک بار پھر سو اونٹ کی شرط پر تم سے بازی لگانا چاہتا ہوں۔ ابولہب نے کہا: مجھے منظور ہے۔ تیسری بار بھی عاص ہار گیا اور یوں ابولہب دیکھتے ہی دیکھتے تین سو اونٹ جیت گیا۔

جب عاص نے اپنی ساری پونجی جاتے دیکھی تو زندگی کا سب سے بڑا اور خطرناک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ آج قسمت کی دیوی مجھ سے روٹھ گئی ہے اور وہ تجھ پر بڑی مہربان ہے مگر اس کے باوجود میں تجھ سے ایک اور بازی اس شرط پر لگانا چاہتا ہوں کہ اگر تو جیت گیا تو میرا مالک اور میں تیرا غلام بن جاؤں گا اور اگر میں جیت گیا تو تو میرا غلام اور میں تیرا آقا بن جاؤں گا۔

ابولہب نے کہا: مجھے منظور ہے۔ پھر دونوں نے اخروٹ پھینکا۔ اتفاق سے اس بار بھی عاص ہار گیا اور ابولہب جیت گیا۔ اس کے بعد عاص، ابولہب کو سالانہ خراج کی ایک مخصوص رقم ادا کرتا تھا۔

جب جنگِ بدر کے لئے قریش تیاری کرنے لگے تو ابولہب سے کہا گیا کہ اس جنگ کے لئے تم خود چلو یا اپنی طرف سے کوئی آدمی فراہم کرو تو ابولہب نے عاص سے کہا کہ تم میری طرف سے جنگ میں جاؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جیسے ہی تم جنگ سے واپس آؤ گے تو میں تمہیں آزاد کردوں گا۔ عاص آزادی کی لالچ میں جنگِ بدر میں شریک ہوا اور مارا گیا۔[1]

۱۔ ابوالفرج اصفہانی، اغانی، ج۴، ص۱۷۹، در ذکر غزوہ بدر از شرح حسان بن ثابت۔ عاص، ہشام بن مغیرہ بن اسد کا بیٹا تھا اور اس کی کنیت ابوالبختری تھی۔ ابن ہشام، سیرت، ج۲، ص۲۸۱۔۲۸۳۔

طائف — مکے کا ہم مزاج شہر

مکے کی بے حیائی اور برائی نے طائف پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے تھے۔ طائف مکے سے بارہ فرسخ دور ایک پر فضا شہر ہے۔ اس زمانے میں طائف کی سرداری قبیلۂ ثقیف کے پاس تھی اور وہاں قریش کے دولتمند افراد کے مکانات بھی تھے۔ چنانچہ اہلِ طائف پر اہلِ مکہ کے بڑے گہرے اثرات تھے یہی وجہ تھی کہ اہلِ طائف بھی زِنا اور سود خوری میں بڑے مشہور تھے۔[1]

طائف شہر اور ثقیف قبیلے پر قریش کے اثرات بتانے کے لئے ہم ایک روایت نقل کرتے ہیں:

طائف کے ایک شخص حارث بن کلدہ ثقفی کے پاس ایک کنیز تھی۔ اس کا نام سمیہ تھا جس کی شادی اس نے اپنے ایک رومی غلام عبید سے کر رکھی تھی۔ سمیہ جھنڈے والی مشہور تھی اور زنا کی خرچی سے اپنے مالک کو خراج دیا کرتی تھی۔

ایک مرتبہ ابوسفیان کسی سفر سے تھکا ہارا طائف آیا۔ وہاں اس نے خوب کھایا پیا پھر شراب پی کر ابومریم سلولی مے فروش کے پاس گیا اور بولا کہ میں کافی دنوں سے سفر میں ہوں اور عورت سے دور ہوں، کیا تم مجھے آج رات کے لئے کوئی عورت فراہم کرسکتے ہو؟ ابومریم نے سمیہ کو اس کے پاس بھیج دیا۔ اس رات کی بدکاری کے نتیجے میں ۱ھ میں زیاد پیدا ہوا۔

اول اول تو زیاد کو عبید رومی کا بیٹا کہا گیا اور ۴۱ھ یا ۴۲ھ تک تو عبید رومی کا بیٹا ہی کہلاتا رہا لیکن پھر معاویہ نے یہ کہہ کر اسے اپنا بھائی بنالیا کہ وہ ابوسفیان کا نطفہ ہے۔ معاویہ کے دور سے لیکر بنی امیہ کی حکومت کے زوال تک اسے زیاد بن ابی سفیان کہا اور لکھا جاتا رہا۔ جب بنی امیہ کی حکومت ختم ہوئی اور بنی عباس برسراقتدار آئے تو انہوں نے زیاد بن ابی سفیان کی بجائے اسے زیاد بن ابیہ لکھنا اور کہنا شروع کیا۔[2]

اس واقعے سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) قریش کے متمول افراد نے طائف کو بھی اخلاقی طور پر تباہ کیا تھا جن میں بنی ثقیف سرفہرست تھے۔

(۲) قریش کی بدکاری صرف مکے تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ جہاں بھی جاتے وہاں بدکاری کو رواج دیتے۔

اس امر کی مزید وضاحت کے لئے ہم تاریخ سے ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں:

جنگ بدر میں تقریباً ستر قریشی قیدی بنے۔ ان قیدیوں میں کچھ انتہائی دولت مند افراد بھی شامل تھے۔

۱۔ شرح طائف در معجم البلدان، ج ۶، ص ۱۰ تا ۱۶۔

۲۔ ابن اثیر جزری، الکامل فی التاریخ، ج ۳، ص ۲۲۳۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب، ج ۱، ص ۵۴۸۔ ابن حجر عسقلانی، اصابہ، ج ۱، ص ۵۶۳۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَیّ کے پاس دو کنیزیں تھیں۔ اس نے اپنی کنیزوں سے کہا کہ تم دولت مند قیدیوں سے ملاپ کر کے حاملہ ہو جاؤ۔ امید ہے کہ یہ قیدی عنقریب رہا ہو کر اپنے وطن واپس چلے جائیں گے اور کچھ دنوں بعد تم ان کے بچوں کی مائیں بن جاؤ گی اور میں ان بچوں کا مالک بن جاؤں گا۔ جب انہیں پتا چلے گا کہ ان کے بچے میرے ہاں پرورش پا رہے ہیں تو وہ مجھ سے اپنے بچوں کی واپسی کے لئے رابطہ کریں گے اور میں ان سے منہ مانگے دام وصول کروں گا۔

کنیزوں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور جب اس نے انہیں زیادہ مجبور کیا تو دونوں کنیزیں رسول اکرمؐ کی خدمت میں اپنے مالک کی شکایت کے لئے حاضر ہوئیں جس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَلاَ تُكْرِهُوْا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا.

تمہاری کنیزیں جو کہ پاکدامن رہنے کی خواہش مند ہیں مال دنیا کے حصول کے لئے انہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ (سورۂ نور: آیت ۳۳)[1]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دولت مند قریشی نے عبداللہ بن اُبَیّ سے اس طرح کی درخواست کی ہو گی اسی لئے اس نے اپنی کنیزوں کو بدکاری پر مجبور کیا تھا۔

اب ہم ایک اور روایت نقل کرتے ہیں جس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ طائف کے بنی ثقیف شراب اور زنا کے کس قدر رسیا تھے۔

ہجرت کے نویں سال بنی ثقیف کا ایک گروہ طائف سے مدینے آیا۔ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور قبول اسلام کی شرائط دریافت کیں۔ جب رسول اکرمؐ نے اسلام لانے کی شرائط بیان کیں اور ان میں زنا اور شراب نوشی ترک کرنے کی شرط بتائی تو انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں مشورہ کرنے دیں۔ انہوں نے باہمی مشورے کے بعد رسول اکرمؐ سے کہا: بنی ثقیف شراب پینا اور زنا کرنا نہیں چھوڑ سکتے۔

رسول اکرمؐ نے ان کی اس شرط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آخرکار انہیں مجبور ہو کر یہ اقرار کرنا پڑا کہ وہ آئندہ زنا اور شراب سے دور رہیں گے۔[2]

۱۔ جلال الدین سیوطی، تفسیر درمنثور، ج ۵، ص ۴۷۔ اس صفحہ پر سیوطی نے اس آیت کی شان نزول کے متعلق کچھ اور روایات بھی نقل کی ہیں لیکن ہماری نظر میں تمام روایات میں سے یہی روایت زیادہ قابل اطمینان ہے جسے بطور خلاصہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

۲۔ احمد بن علی شافعی مقریزی المتوفی ۸۴۵ھ، امتاع الاسماع، ص ۴۹۲۔ ثقیف کے مدینہ آنے کا بیان دیکھیں۔

مدینے کی سیاسی و سماجی حالت

رسولِ اکرمؐ کی ہجرت سے قبل مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں یہودی آباد تھے جو زراعت پیشہ تھے۔ جو یہودی زراعت سے وابستہ نہیں تھے — خصوصاً مدینے کے یہودی— وہ تجارت کیا کرتے تھے۔ تجارت کے ساتھ ساتھ وہ پرلے درجے کے سودخور تھے۔ ان کے پاس مضبوط قلعے، کافی ہتھیار اور آزمودہ کار جوان تھے۔

یہودی اپنی مُحرّف کتاب کی غلط تعلیمات کی وجہ سے اس مغالطے میں تھے کہ وہ دنیا کی ممتاز قوم ہیں۔ ساری دنیا پر حکومت کرنا ان کا پیدائشی حق ہے اور دنیا کی باقی تمام قومیں ان کی غلامی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اپنی اِنھیں تعلیمات کی وجہ سے یہودیوں کی آج بھی منْ حیثُ القوم یہی نفسیاتی کیفیت ہے کہ وہ جس سماج میں بھی ہوں اپنے آپ کو حاکم اور دوسری اقوام کو حقیر جانتے ہیں۔ یہودی قوم کے پاس دنیا کے سرمائے کا ایک معقول حصہ ہے۔ وہ دنیا کی باقی اقوام کو ہر لحاظ سے اپنے زیرِ تسلط دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس سماج میں اخلاقی قدریں مضبوط ہوتی ہیں وہاں یہودی اپنا مقصد حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں اس لئے ان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ جیسے بھی ہو معاشرے کے اخلاق میں بگاڑ پیدا کیا جائے اور وہاں فتنے کی آگ بھڑکائی جائے۔

مدینے کے یہودیوں کی نفسیات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ان کے پاس بھی دولت کی فراوانی تھی اور وہ لوگوں سے تکبّر کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان میں لکھنے پڑھنے کا ذوق پایا جاتا تھا۔ وہ اسرائیلی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور اہلِ شریعت اور پہلی آسمانی کتاب کے مخاطب تھے۔ اپنی اِنھیں خصوصیات پر وہ ناز کیا کرتے تھے اور عرب کے تمام عوام میں انہوں نے اپنی فضیلت کی داستانیں عام کر رکھی تھیں۔

یہ لوگ اہلِ مدینہ کے سامنے توراۃ کی وہ پیشین گوئیاں بیان کرتے رہتے تھے جن میں بتایا گیا تھا کہ عنقریب آخری نبی کا ظہور ہوگا اور وہ اپنے شہر سے ہجرت کر کے ہمارے اس شہر مدینہ میں تشریف لائیں گے۔ انھیں پیشین گوئیوں کی وجہ سے قبیلۂ اَوس کے ایک شخص عبدِعَمرو نے جس کی کنیت ''ابوعامر'' تھی، زہد و تقویٰ کو اپنا لیا تھا اور اس کا گمان تھا کہ نبیٔ موعود کا شرف اسے ہی ملے گا۔[1]

وہ ٹاٹ کی قسم کا لباس پہنا کرتا تھا اور اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے ابوعامر راہب کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ جب حضرت خاتم الانبیاءؐ نے مدینے ہجرت فرمائی اور اس نے دیکھا کہ اسے منصبِ نبوت نہیں ملا تو اس نے زہد و تقویٰ ترک کر دیا اور آنحضرتؐ کا مخالف ہوگیا۔[2]

یہودی اپنی عادت سے مجبور ہو کر اَوس و خزرج کو آپس میں لڑایا کرتے تھے۔ کئی بار ان کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ان میں خونریز جنگیں بھی ہوئیں۔ اَوس و خزرج نے یہودیوں کے الگ الگ قبائل سے دفاعی

۱۔ بلاذری، انساب الاشراف، ج ۱، ص ۳۴۰۔ ۲۔ ابن ہشام، سیرت، ج ۲، ص ۲۳۴۔ واقدی، مغازی، در ذکر غزوہ احد۔

معاہدے کر رکھے تھے۔ جب کبھی ان کے درمیان جنگ ہوتی تو وہ اپنے حلیف قبیلے سے کرائے پر ہتھیار حاصل کرتے اور یوں ان کی باہمی جنگوں سے یہودی بے تحاشا دولت کماتے جبکہ اوس وخزرج کی مصیبتوں میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔ اوس وخزرج کے علاوہ مکہ اور یمن کے دوسرے قبائل امن و آشتی کی زندگی بسر کر رہے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوس وخزرج کی لڑائیاں یہودیوں کی پیدا کردہ تھیں اور وہی فتنے کو ہوا دیا کرتے تھے۔

اُس دور کے یہودی وہی کردار ادا کرتے تھے جو آج امریکہ اور روس ادا کر رہے ہیں۔ یہ دونوں اپنے حلیف ممالک میں جنگ کے شعلے بھڑکا کر اسلحہ بیچتے ہیں اور یوں جی بھر کر تیسری دنیا کا استحصال کر رہے ہیں۔

اہلِ مدینہ ایک عرصے تک اسی طرح زندگی گزارتے رہے اور آخرکار جنگوں سے تنگ آ گئے۔ حضرت خاتم الانبیاءؐ کی ہجرت سے پہلے انہوں نے آپس میں بیٹھ کر فیصلہ کیا کہ انہیں ان بے سود لڑائیوں کو ختم کر کے امن و آشتی سے رہنا چاہئے اور اپنا ایک بادشاہ چن لینا چاہئے تاکہ دونوں قبیلے اس کی قیادت میں جنگ کے شعلوں سے بچ سکیں۔ تب انہوں نے مدینے کی سلطنت کے لئے عبداللہ بن اُبَیّ کا انتخاب کیا۔ وہ اس کے لئے ایک تاجِ شاہی بنانا چاہتے تھے اور اس تاج کے لئے یہودیوں سے قیمتی اور نایاب نگینے حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن ابھی تک رسمی طور پر عبداللہ بن اُبَیّ کی بادشاہت کا اعلان نہیں ہوا تھا کہ اہلِ مدینہ کی قسمت نے یاوری کی اور ان کے چند افراد کی مکے میں حضرت خاتم الانبیاءؐ سے ملاقات ہوگئی۔

رسولِ اکرمؐ کے متعلق وہ مدینے کے علمائے یہود سے بہت کچھ سن چکے تھے۔ جب وہ آنحضرتؐ سے ملے تو انہیں یقین ہوگیا کہ توریت میں جس نبی کی بشارت دی گئی ہے وہ آپ ہی ہیں اس لئے وہ فوراً آپ کے دستِ حق پرست پر ایمان لے آئے اور انہوں نے آپؐ کو اور آپ کے دوستوں کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔

جب رسولِ اکرمؐ ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو اوس وخزرج نے آپ کی غلامی قبول کر لی اور عبداللہ بن اُبَیّ کو فراموش کر دیا گیا۔ آپ کی ہجرت کے چند دن بعد یہود سے ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ بات طے کی گئی کہ اہلِ مدینہ ایک دوسرے کے ساتھ پیار و محبت سے رہیں گے اور اگر کبھی کوئی تنازعہ ہوا تو اس کا فیصلہ رسولِ اکرمؐ کریں گے اور اگر باہر سے کسی دشمن نے مدینے پر حملہ کیا تو سب مل کر شہر کا دفاع کریں گے۔[1]

اہلِ عرب کے سیاسی و اجتماعی حالات بتانے کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف واپس آتے ہیں اور حضرت رسولِ اعظمؐ کی سیرتِ پاک کے مخصوص گوشوں کی تحقیق کرتے ہیں۔

۱۔ ابن ہشام، سیرت، ج ۲، ص ۱۴۷ و ۱۴۷۔ محمد بن محمد شافعی اندلسی (ابن سید الناس المتوفی ۷۳۴ھ)، عیون الاثر، ج ۱، ص ۱۹۷۔

سیرتِ نبویؐ کا ۳ھ تک اجمالی جائزہ

رسولِ اکرمؐ کے آباؤاجداد کی جتنی تاریخ اہلِ مکہ کو یاد تھی، اس کے مطابق آپ کے اَب وجد اپنے اپنے دَور میں قریش کے سردار رہے تھے۔ جب زائرین مکے کے بے آب وگیاہ پہاڑوں میں مَناسکِ حج کیلئے آتے تو رسولِ اکرمؐ کے آباؤاجداد انہیں کھانا کھلاتے اور پانی پلاتے تھے یہاں تک کہ مکے کی سرداری عبدمناف کو ملی۔

اللہ تعالیٰ نے عبدمناف کو چار بیٹے عطا فرمائے تھے جن کے نام یہ تھے:
(۱) ہاشم (۲) عبدِشمس (۳) نوفل (۴) مُطّلب[1]

ہاشم کی سرداری

عبدمناف کی رحلت کے بعد قریش کی سرداری کے لئے ہاشم اور ان کے بھائی عبدشمس میں شدید نزاع پیدا ہوا۔ ایک طویل نزاع کے بعد ہاشم کامیاب ہوئے اور انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے بڑا نام کمایا اور اپنے آباؤاجداد سے بھی زیادہ مشہور ہوئے۔

ہاشم نے ہی سب سے پہلے قریش کے لئے سردی اور گرمی کے تجارتی قافلوں کی بنیاد رکھی تھی۔ چنانچہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام جاتا تھا جسے "رحلة الصيف" یعنی گرمائی سفر کہا جاتا تھا اور دوسرا قافلہ براستہ یمن حبشہ اور افریقہ جاتا تھا جسے "رحلة الشتاء" یعنی سرمائی سفر کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں جبکہ ہر شخص کو غارتگری کا اندیشہ ہوتا تھا ہاشم نے اس خطرے سے محفوظ رہنے کے لئے شام کا سفر کیا جہاں انہوں نے قیصرِ روم سے ملاقات کی اور اس سے اُس کی قلمرو میں قریش کے کارواں کے لئے امان نامہ حاصل کیا۔

۱۔ ابن ہشام، سیرت، ج۱، ص۱۱۱۔ اور قبیلۂ فہر کے حالات کے لئے ابن حزم کی کتاب الانساب دیکھئے۔

پھر شام سے مکہ آتے ہوئے راستے میں جتنے بھی قبائل تھے ان سب سے عہد لیا کہ وہ اپنی سرزمین سے قریش کے کارواں کو بخیریت گزرنے دیں گے اور ان سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ راہداری کے اس معاہدے کو قرآن مجید میں لفظ "ایلاف" سے تعبیر کیا گیا ہے: لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ... ہاشم کی دانشمندی سے قریش کے قافلوں کو کسی کا ڈر خوف نہ رہا اور وہ اطمینان سے تجارت کرنے لگے۔

قحط اور خشک سالی کے دنوں میں سردار مکہ جناب ہاشم اہل مکہ کو اپنی طرف سے کھانا کھلایا کرتے تھے اور ان کی یہ سخاوت قحط کے خاتمے تک برابر جاری رہتی تھی۔

ایک مرتبہ ہاشم نے شام جاتے ہوئے کچھ دنوں کے لئے مدینے میں قیام کیا۔ یہاں انہوں نے زید خزرجی کی صاحبزادی سلمٰی سے نکاح کیا اور چند دن اپنی بیوی کے ساتھ بسر کئے۔ پھر آپ اپنی بیوی کو ان کے میکے میں چھوڑ کر شام روانہ ہوگئے۔ اس سفر کے دوران ہاشم کا انتقال ہوگیا۔ بعد میں ان کی بیوی سے ایک بیٹا ہوا جس کا نام "شیبہ" رکھا گیا۔

ہاشم کی وفات کے بعد قریش کو اندیشہ ہوا کہ عرب قبائل انہیں اپنی سرزمین سے بخیریت نہیں گزرنے دیں گے۔ چنانچہ اسی خوف کی وجہ سے انہوں نے اپنے تجارتی قافلے بند کردیئے۔

پھر ہاشم کے دو بھائی عبدشمس اور نوفل شاہ حبش نجاشی اور ایران کے بادشاہ کسریٰ کے پاس گئے اور ان سے ازسرنو عہد و پیمان کئے۔ چند دن بعد وہ دونوں بھائی دنیا سے رخصت ہوگئے اور مکے کی سرداری مُطلب بن عبدمناف کو ملی۔ مُطلب مدینے گئے اور اپنے بھتیجے شیبہ کو مکہ لے آئے۔ شیبہ بن ہاشم یہاں مکہ میں آکر عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہوئے۔ مطلب کی وفات کے بعد عبدالمطلب ہی قریش کے سردار بنے۔

حضرت عبدالمطلب کی سرداری

بعض اتفاقات کی وجہ سے عبدالمطلب کی سرداری قبائل قریش سے نکل کر حجاز کے دوسرے علاقوں تک پہنچ گئی کیونکہ ددھیال کی طرف سے وہ عدنانی النسل (قریشی) تھے اور ننھیال کی طرف سے قحطانی النسل تھے۔ اس کے علاوہ عبدالمطلب نے ہی زمزم کا کنواں دوبارہ دریافت کیا تھا۔

ہمارے قارئین کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمزم کا پانی حضرت اسماعیلؑ کے لئے جاری کیا تھا۔ ایک عرصے تک لوگ اس کنوئیں کے پانی سے مستفید ہوتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ کنواں یوں تہہ خاک چھپ گیا کہ کوئی اس کے مقام کو نہیں جانتا تھا۔ عبدالمطلب نے قریش سے کافی کشمکش کے بعد اپنے اکلوتے بیٹے حارث کی مدد سے اس کنوئیں کو خاک کے ڈھیر سے برآمد کر کے صاف کیا اور پھر تمام لوگوں کے لئے وقف کردیا۔

عبداللہ بن عبدالمطلب

چاہِ زمزم کی کھدائی کے وقت عبدالمطلب کے پاس ان کے اکلوتے بیٹے حارث کے علاوہ کوئی مددگار نہیں تھا۔ اس وقت انہوں نے منّت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں دس بیٹے عطا کیے تو وہ ان میں سے ایک بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کردیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا سن لی اور انہیں دس بیٹے عطا ہوئے۔

جب تمام بیٹے کام کاج کے لائق ہوگئے تو انہوں نے اپنی منّت پوری کرنے کے لئے تمام بیٹوں کو جمع کیا اور قرعہ ڈالا۔ قرعہ ان کے چھوٹے بیٹے عبداللہ کے نام نکلا۔

عبدالمطلب جب اپنے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے خانۂ کعبہ کے پاس لائے تو قریش کے تمام بزرگوں نے ان سے درخواست کی کہ آپ ایسا نہ کریں کیونکہ آپ رئیسِ مکّہ اور سردارِ قریش ہیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ قریش میں رسم بن جائے گی اور آپ کے بعد لوگ اپنی اولاد کو ذبح کرنے لگ جائیں گے۔ قریش کے بزرگوں اور عبدالمطلب کی گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ عبدالمطلب ایک مرتبہ پھر ایک سو اونٹ یا اپنے بیٹے عبداللہ کے متعلق قرعہ ڈالنے پر راضی ہوگئے۔ اب کی بار جو قرعہ ڈالا گیا تو قرعہ سو اونٹوں کے نام کا نکلا مگر عبدالمطلب اس پر راضی نہ ہوئے۔ آخرکار تین بار قرعہ ڈالا گیا اور ہر بار قرعہ اونٹوں کے نام کا ہی نکلتا رہا۔ عبدالمطلب نے ایک سو اونٹوں کی قربانی دی اور ان کا گوشت اہلِ مکہ میں تقسیم کیا اور یوں عبداللہ قربان ہونے سے بچ گئے۔

عبدالمطلب کے اس کام نے لوگوں کے اذہان میں ایک مرتبہ پھر حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے واقعات کو تازہ کردیا اسی لئے لوگ عبدالمطلب کو "ابراہیم ثانی" کہنے لگے۔

عبداللہ جوان ہوئے تو عبدالمطلب نے ان کا نکاح آمنہؑ بنت وہب سے کردیا۔ اس نکاح کے نتیجے میں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔[1]

عام الفیل

رسولِ اکرمؐ ابھی اپنی والدۂ ماجدہ کے شکمِ مطہّر میں ہی تھے کہ آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ وفات پاگئے۔ آپ کی ولادت کے سال یمن کا حکمران "ابرہہ حبشی" ہاتھیوں کا ایک بہت بڑا لشکر لیکر خانۂ کعبہ کو منہدم کرنے کے ارادے سے مکّہ روانہ ہوا۔

عبدالمطلب کوہِ مکّہ کی چوٹی پر گئے اور انہوں نے خوب رو رو کر اللہ تعالیٰ سے کعبے کی حفاظت کے لئے

۱۔ ابن واضح احمد بن ابی یعقوب کاتب، تاریخ یعقوبی، ج ۱، ص ۲۴۲ تا ۲۵۲۔

دعا مانگی۔ ان کی دعا مستجاب ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی حفاظت کے لئے غول در غول ابابیل بھیجے جنہوں نے ابرہہ کے لشکر پر اتنی سنگباری کی کہ وہ اور اس کا پورا لشکر ہلاک ہوگیا۔

جب عبدالمطلب کی یہ داستانیں جزیرۂ عرب کے دیگر قبائل تک پہنچیں تو ان کے دل میں عبدالمطلب کا احترام مزید بڑھ گیا۔

اس سال کو عرب ''عامُ الفیل'' یعنی ہاتھیوں کا سال کہتے ہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی اسی سال متولّد ہوئے۔ آپ یتیم پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی کفالت و پرورش کی۔ ابھی آپ کا بچپنا ہی تھا کہ والدہ ماجدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ جب آپ کی عمر آٹھ برس کی ہوئی تو عبدالمطلب بیمار ہوگئے۔ جب انہیں یہ یقین ہوگیا کہ اب وہ داعیٔ اجل کو لبیک کہنے والے ہیں تو انہوں نے اپنے پوتے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حضرت ابوطالبؑ کے سپرد کیا اور اس کے بعد اُن کی بھی وفات ہوگئی۔

حضرت ابوطالبؑ کی سرداری

حضرت عبدالمطلب کی وفات کے بعد قریش کی سرداری ان کے فرزند حضرت ابوطالبؑ کو منتقل ہوئی۔

دوسرے قریش کی طرح اس سال حضرت ابوطالبؑ نے بھی شام جانے کا قصد کیا تو اپنے بھتیجے حضرت محمد مصطفیٰؐ کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ اس سفر کے دوران عیسائی راہبوں نے حضرت محمد مصطفیٰؐ کے شمائل و خصائل دیکھے تو انہوں نے آپ کو پہچان لیا کہ آپ ہی نویدِ عیسیٰ اور خاتم الانبیاءؑ ہیں۔

چنانچہ انہوں نے ابوطالبؑ کو اس کے متعلق بتا دیا اور کہا کہ وہ یہود سے اپنے بھتیجے کی حفاظت کریں اور جتنا جلد ممکن ہو سکے واپس چلے جائیں اور اپنے بھتیجے کو ایک لمحے کے لئے بھی اپنے قوم قبیلے کی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ یہ سن کر ابوطالبؑ تیزی سے مکہ آئے اور اپنے بھتیجے کی حفاظت کے لئے مزید کمربستہ ہوگئے۔

جب حضرت محمدؐ کی عمر پچیس برس ہوئی تو آپ کی شادی قریش کی مالدار خاتون خدیجہ بنت خویلد سے ہوئی جس کی وجہ سے آپ بھی مالدار بن گئے۔ ایک سال مکے میں سخت قحط پڑا۔ حضرت محمدؐ، حضرت ابوطالبؑ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ اپنا چھوٹا بیٹا علیؑ انہیں دے دیں وہ خود ان کی کفالت و تربیت کریں گے۔ ابوطالبؑ نے کمسن علیؑ کو اپنے بھتیجے کے سپرد کردیا۔ تب سے علیؑ رسولِ اکرمؐ کے گھر میں رہ کر پرورش پانے لگے۔[1]

۱۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک، ج ۳، ص ۱۱۶۳، مطبوعہ یورپ۔

خانۂ کعبہ کی تعمیرِ نو

خانۂ کعبہ کی دیواریں عام قد و قامت کے شخص سے تھوڑی سی بلند تھیں، اس کی چھت نہیں تھی اور اس میں ایک کنواں تھا جس میں کعبے کا خزانہ دفن تھا۔

جب نبی کریمؐ کی عمر پینتیس برس ہوئی تو اس سال چوروں نے خانۂ کعبہ کے خزانے پر ہاتھ صاف کئے جس کا تمام قریش کو بڑا قلق ہوا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ خانۂ کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کی جائے۔ چنانچہ تعمیر کا کام قبائل کے درمیان تقسیم کردیا گیا۔ جب خانۂ کعبہ کی عمارت حجرِ اسود تک پہنچی تو قبائلِ قریش میں سخت نزاع پیدا ہوگیا کیونکہ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ حجرِ اسود کو نصب کرنے کا اعزاز اسے ہی حاصل ہو۔ اس نزاع نے اتنا طول کھینچا کہ تلواریں نیاموں سے باہر نکل آئیں اور جنگ کے بادل امڈ آئے ہر قبیلے نے یہی سوچا کہ جو بھی اس جنگ میں غالب آجائے گا وہی حجرِ اسود کو نصب کرے گا۔

اس وقت قریش کا دانا ترین شخص مغیرہ بن عبداللہ مخزومی وہاں آیا اور اس نے شمشیر بدست قبائل کو سمجھایا کہ وہ تلواروں کو نیام میں رکھ لیں۔ پھر اس نے تجویز دی کہ اب جو بھی شخص سب سے پہلے مسجد الحرام میں داخل ہوگا وہی اس جھگڑے کا فیصلہ کرے گا اور اس کا فیصلہ سب کو ماننا ہوگا۔ تمام افراد نے اس تجویز کو سراہا اور سب کی نظریں مسجد کے دروازے کی طرف مرکوز ہوگئیں اور وہ بے تابی سے آنے والے کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ رسولِ اکرمؐ مسجد الحرام میں داخل ہوئے۔ آپ کو دیکھ کر سب لوگ پکار اٹھے: هٰذَا الْاَمِيْنُ، رَضِيْنَا هٰذَا مُحَمَّدٌ. "یعنی یہ محمدؐ امین ہے، ہم اس کے فیصلے پر راضی ہیں۔

جب رسولِ اکرمؐ ان کے پاس تشریف لائے اور انہوں نے اپنی داستان آپ کو سنائی تو آپ نے فرمایا: ایک کپڑا لاؤ۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں ایک کپڑا لایا گیا۔ آپ نے کپڑے کو زمین پر بچھایا اور حجرِ اسود کو اٹھا کر کپڑے پر رکھا۔ پھر قبائل قریش سے کہا کہ ہر قبیلے کے نمائندہ افراد کھڑے ہو کر اس کپڑے کو کونوں سے پکڑیں اور اسے اٹھا کر اس کے مقام تک لائیں۔ قبائلِ قریش کے تمام نمائندے کپڑے کو کونوں سے پکڑ کر اس کے مقام تک لے آئے۔ آپ نے ان سے فرمایا: بس اب تم اسے رکھ دو۔ لوگوں نے کپڑا رکھ دیا تو آپ آگے بڑھے اور حجرِ اسود کو اٹھا کر اس کے مقام پر رکھ دیا۔

آپ کے اس دانش مندانہ فیصلے سے قریش کے درمیان ایک یقینی جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔[1]

۱۔ ابن ہشام، سیرت، (حدیث بنیان الکعبۃ)، ج ۱، ص ۲۰۴ تا ۲۱۰۔

اہلِ کتاب خاتمُ الانبیاءؐ کے اِنتظار میں

اللہ تعالیٰ نے حضرت خاتم الانبیاءؐ کے اوصاف انبیائے کرامؑ کو بتا دیئے تھے اور انہیں آپ کے مقامِ ولادت، جائے سکونت، زمانۂ بعثت و ہجرت، جسمِ اطہر کی ظاہری علامات اور آپ کی شریعت کی خصوصیات وغیرہ بتادی تھیں اور ہر نبی کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی اپنی امت کو آپؐ کے بارے میں خبر دے اور خدا کا یہ حکم پہنچائے کہ جب ان علامات کا حامل پیغمبر نبوت کا اعلان کرے تو وہ اس پر ایمان لائے۔

چنانچہ انبیائے کرامؑ نے حکمِ پروردگار کے تحت اپنی اپنی امتوں کو آخری نبی کی خصوصیات سے آگاہ کیا تھا اور اپنے اوصیاء کو بھی آنحضرتؐ کی بشارت دینے کا حکم دیا تھا۔ آسمانی کتابوں اور انبیائے کرامؑ کے صحیفوں میں آپ کے متعلق پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ انبیائے کرامؑ کی رحلت کے بعد اگرچہ ان کے پیروکاروں نے آسمانی کتابوں میں تحریف کی تھی تاہم خدا کے خصوصی فضل کی وجہ سے آخری نبی کے متعلق جو بشارتیں تھیں وہ ان کی دستبرد سے محفوظ رہیں اور آنحضرتؐ کے زمانۂ بعثت تک یہ کتابیں یہود و نصاریٰ کے علماء کے پاس موجود تھیں۔ یہود و نصاریٰ کے علماء ان بشارتوں کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے اور ان کی تشریح کیا کرتے تھے۔ دونوں اہلِ کتاب علماء نے حضرت عبدالمطلب اور حضرت ابوطالبؑ کے سامنے بھی آخری نبی کی علامات بیان کی تھیں۔

رسولِ اکرمؐ کی بعثت کی بشارتوں کو علماء یہود نے مدینے میں زیادہ فروغ دیا تھا اور وہ لوگوں سے یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے تھے کہ اس نبیٔ موعود کا ظہور قریب ہے اور وہ ہجرت کر کے ہمارے اسی شہر میں آئیں گے۔

حضرت ابوطالبؑ نے اہلِ کتاب کی ان بشارتوں کا تذکرہ اپنے اشعار میں بھی کیا ہے اور جب اہلِ مدینہ نے مکے میں آنحضرتؐ سے ملاقات کی تو انہیں یقین ہوگیا کہ جس نبی کے اوصاف یہودی توراۃ سے بیان کرتے ہیں وہ آپ ہی ہیں اس لئے وہ فوراً آپ پر ایمان لے آئے۔

رسولِ اکرمؐ کی بِعثت

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دستور تھا کہ آپ ہر سال چند دنوں کے لئے غارِ حرا کی خلوت میں پوری یکسوئی سے اپنے پروردگار کی عبادت کیا کرتے تھے اور حضرت علیؑ کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

جب آپ کی عمر مبارک چالیس سال ہوئی تو آپؐ، حضرت علیؑ کو ساتھ لے کر غارِ حرا میں آئے۔ وہاں آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور یوں حضرت علیؑ پہلی وحی کے چشم دید گواہ بن گئے۔[1]

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ۔

نزولِ وحی کے بعد علیؑ و خدیجہؑ نے سب سے پہلے آپ کی تصدیق کی اور نزولِ وحی کے دوسرے دن انہوں نے آنحضرتؐ کی اقتداء میں نماز پڑھی۔ تین سال تک ان تین نفوسِ قدسیہ کے سوا کوئی دین اسلام پر نہیں تھا۔ اس سلسلے میں طبری اور دیگر مؤرخین نے عفیف کندی سے یہ روایت کی ہے کہ اس نے کہا:

ایک مرتبہ میں زمانۂ جاہلیت میں مکّہ گیا اور عباس بن عبدالمطلب کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ ایک دن میں صحنِ کعبہ میں بیٹھا ہوا کعبے کو دیکھ رہا تھا اور جیسے ہی سورج بلند ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک جوان آیا اور اس نے آسمان کی طرف نظر کی، پھر کعبے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوگیا۔ چند لمحات ہی گزرے ہوں گے کہ ایک بچہ آیا جو اس کی دائیں جانب کھڑا ہوگیا۔ پھر ایک خاتون آئی اور اس کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔ پھر اس جوان نے رکوع کیا اور اس کے ساتھ اس بچے اور خاتون نے بھی رکوع کیا۔ پھر وہ جوان کھڑا ہوا تو اس کے ساتھ وہ بچہ اور خاتون بھی کھڑی ہوگئی۔ پھر اس جوان نے سجدہ کیا۔ اس کے ساتھ دونوں نے بھی سجدہ کیا۔

میں نے عباس سے کہا: یہ امر عظیم ہے۔

عباس نے کہا: بے شک یہ امر عظیم ہے۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ یہ جوان کون ہے؟

میں نے کہا: نہیں، میں نہیں جانتا۔

عباس نے کہا: یہ میرا بھتیجا محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہے۔

پھر عباس نے کہا: کیا جانتے ہو کہ اس کے ساتھ کھڑے ہونے والے کون ہیں؟

میں نے کہا: نہیں، میں نہیں جانتا۔

عباس نے کہا: یہ بھی میرا بھتیجا علی بن ابی طالب بن عبدالمطلبؑ ہے۔ میرے بھتیجے نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے پروردگار نے — جو زمین و آسمان کا پروردگار ہے — اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ واللہ! میں ان تین افراد کے علاوہ کسی کو اس دین پر نہیں دیکھتا۔[1]

اسلام کا اعلانِ عام

جب تک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعوتِ اسلام کا عام اعلان نہیں کیا تھا اس وقت تک کسی کی ان سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ پھر بعثت کے تیسرے برس اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَ قْرَبِيْنَ. یعنی آپ اپنے قریبی رشتے داروں کو دین پہنچائیں اور عذابِ الٰہی سے ڈرائیں۔ (سورۂ شعراء: آیت ۲۱۴)

۱۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک، ج ۳، ص ۱۱۶۱، مطبوعہ یورپ۔

اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرتؐ نے اولادِ مطلب کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ کھانا کھلانے کے بعد آپ نے انہیں اسلام کی طرف بلایا اور فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میری مدد کرے اور جو میری مدد کرے گا وہ میرا خلیفہ، وزیر اور وصی ہوگا؟

آپ کا اعلان سن کر سب خاموش رہے۔ حضرت علیؑ اس وقت اگرچہ بہت کمسن تھے، اٹھے اور عرض کی: یارسول اللہؐ! اس کام میں، میں آپ کی مدد کروں گا۔ رسول اکرمؐ نے تین بار یہ اعلان کیا اور تینوں بار حضرت علیؑ کے علاوہ کسی نے بھی آپ کی دعوت پر لبیک نہ کہی۔ جب حضرت علیؑ تیسری بار نصرتِ پیغمبر کا اعلان کر چکے تو رسولِ اکرمؐ نے ان کو گردن سے پکڑ کر فرمایا: تو میرا خلیفہ، وزیر اور وصی ہے۔

اس دعوت میں ابولہب نے حضرت ابوطالبؑ کا مذاق اڑایا اور حاضرین گھر سے باہر چلے گئے۔[1]

اس واقعے کے بعد رسولِ اکرمؐ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ اور آپ کے چچازاد بھائی جعفر بن ابیطالبؑ نے اسلام قبول کیا۔ ان کے بعد ابوذر غفاریؓ اور کچھ دوسرے افراد اسلام لائے۔ دسویں نمبر پر حضرت ابوطالبؑ کی زوجہ اور علی بن ابی طالبؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد ایمان لائیں۔[2]

قریش کی مخالفت اور حضرت ابوطالبؑ کی حمایت

اسلام آہستہ آہستہ مکے میں پھیلنے لگا اور قریش کے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ جب تک رسولِ اکرمؐ اور ان کے پیروکار عبادتِ الٰہی میں مصروف رہے اس وقت تک کسی نے بھی اسلام کے خلاف آواز بلند نہ کی اور تعجب سے مسلمانوں کی عبادت کو دیکھتے رہے۔ جب پروردگار کے حکم سے رسولِ اکرمؐ نے بت پرستی کی مذمت کی اور اسے عقل دشمنی قرار دیا تو قریش سخت برافروختہ ہوئے۔ وہ ایک وفد بنا کر حضرت ابوطالبؑ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ آپ ہمارے سید و سردار ہیں۔ ہم آپ سے آپ کے بھتیجے کی شکایت کرنے آئے ہیں۔ آپ کا بھتیجا ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتا ہے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ آپ اسے منع کریں کہ وہ ہمارے خداؤں کو برا نہ کہے۔ ہم اسے اس کے خدا کے سپرد کرتے ہیں۔

حضرت ابوطالبؑ نے کسی کو بھیج کر رسولِ اکرمؐ کو بلایا اور ان سے کہا: یہ لوگ قریش کے بزرگ ہیں اور یہ تم سے کچھ مطالبہ کرنے آئے ہیں۔

۱۔ طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۱۷۱-۱۱۱۔ عیون الاثر، ج ۱، ص ۹۸ تا ۱۰۰۔ ۲۔ ابن واضح کاتب، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۳ تا ۲۸۔
سیرت ابن ہشام میں ابن اسحاق سے روایت ہے کہ جس نے امام علیؑ کے بعد اسلام قبول کیا وہ زید بن حارثہؓ ہیں۔ ان کے بعد ابوبکرؓ، عثمان بن عفانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ اسلام لائے۔ ان آٹھ کے بعد ابوعبیدہ بن جراحؓ، ابوسلمہ بن عبداللہ اسدیؓ اور ارقم بن ابی ارقمؓ اسلام لائے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: کیا میں انہیں بھلائی کی دعوت نہ دوں؟

ابوطالبؑ نے کہا: تم انہیں کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟

آپؐ نے فرمایا: میں انہیں ایک ایسی دعوت دیتا ہوں کہ اگر یہ میرا کہنا مان لیں تو سارا عرب وعجم ان کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا۔

ابوجہل نے کہا: وہ کون سی بات ہے ہمیں بھی بتاؤ ہم ایک چھوڑ دس باتیں ماننے پر آمادہ ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: وہ ایک بات یہ ہے کہ تم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہو۔

یہ سن کر لوگ برہم ہوئے اور وہاں سے چل دیئے اور جاتے ہوئے کہنے لگے: ہم تیرے اس خدا کو جس نے تجھے یہ حکم دیا ہے گالیاں دیں گے۔[۱]

قریش کی ایک اور پیشکش

کچھ دن بعد قریش نے رسولِ اکرمؐ سے کہا کہ ہم آپؐ سے مصالحت پر آمادہ ہیں۔ ایک سال ہم آپؐ کے خدا کی عبادت کریں گے اور جواباً ایک سال آپؐ ہمارے خدا کی عبادت کریں۔ اس پیشکش کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ کافرون نازل فرمائی:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ○ قُلۡ يٰٓاَيُّهَا الۡكٰفِرُوۡنَ○ لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ○ وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ○ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ○ وَلَآ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَآ اَعۡبُدُ○ لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ○ آپ کہہ دیجئے کہ اے کافرو! میں ان خداؤں کی عبادت نہیں کرسکتا جن کی تم پوجا کرتے ہو۔ نہ تم میرے خدا کی عبادت کرنے والے ہو اور نہ میں تمہارے معبودوں کی پوجا کرنے والا ہوں۔ اور نہ تم میرے معبود کے عبادت گزار ہو۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔

رسولِ اکرمؐ نے تبلیغ جاری رکھی۔ مشرکینِ قریش ایک مرتبہ پھر ابوطالبؑ کے پاس آئے۔ اس مرتبہ وہ قریش کے خوبصورت اور ذہین جوان ''عمارہ'' کو بھی اپنے ساتھ لیکر آئے تھے۔ انہوں نے اپنے سردار سے کہا: اے ابوطالبؑ! ہم اپنے ساتھ قریش کا خوبصورت جوان لائے ہیں۔ آپ محمدؐ کی جگہ اسے اپنے پاس رکھ لیں اور محمدؐ کو ہمارے حوالے کردیں تاکہ ہم اسے قتل کردیں اور قریش سے یہ تنازعہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

ابوطالبؑ نے ان کی احمقانہ پیشکش کے جواب میں کہا: تم نے عجیب فیصلہ کیا۔ میں تمہارے بیٹے کو

۱۔ سورۂ ص کی آیت ۶ میں اس کی طرف اشارہ ہے: وَ انۡطَلَقَ الۡمَلَاُ مِنۡهُمۡ اَنِ امۡشُوۡا وَاصۡبِرُوۡا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمۡ اِنَّ هٰذَا لَشَىۡءٌ يُّرَادُ. اور ان میں سے ایک گروہ یہ کہہ کر چل دیا کہ چلو اپنے خداؤں پر قائم رہو کہ اس میں ان کی کوئی غرض پائی جاتی ہے۔

پالوں اور تم میرے بیٹے کو قتل کرو۔ میں تمہاری یہ پیشکش مسترد کرتا ہوں۔

جب قریش ہر طرف سے مایوس ہوگئے تو انہوں نے رسولِ اکرمؐ کے پیروکاروں کو ستانا شروع کردیا۔ جب ان کے مظالم حد سے زیادہ بڑھ گئے تو آپ نے اپنے پیروکاروں کو حبشہ ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے جعفر بن ابی طالبؑ کو ان کی سرپرستی کے لئے روانہ کیا۔

قریش نے عمرو بن عاص اور عمارہ کو تحفے تحائف دے کر شاہِ حبشہ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے نجاشی سے ملاقات کی اور اس سے درخواست کی کہ وہ مہاجرین کو ان کے حوالے کردے اور ان سے اپنی سرپرستی اٹھالے۔ نجاشی نے ان کی درخواست کو دَرخورِ اعتنا نہ سمجھا اور بدستور مہاجر مسلمانوں کا احترام کرتا رہا۔

جب ابوطالبؑ نے نجاشی کے حسنِ سلوک کے متعلق سنا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے یہ اشعار کہے جس میں انہوں نے اسے اسلام کی دعوت دی:

تَعْلَم خِیَارَ النَّاسِ اَنَّ مُحَمَّدًا وَزِیْرٌ لِمُوسٰی وَالْمَسِیْحِ بْنِ مَرْیَم

اَتٰی بِھُدًی مِثْلِ الَّذِی اَتَیَا بِہٖ وَ کُلٌّ بِاَمْرِ اللّٰہِ یَھْدِیْ وَ یَعْصِم

وَ اَنَّکُمْ تَتْلُوْنَہٗ فِیْ کِتَابِکُمْ بِصِدْقِ حَدِیْثٍ لَا حَدِیْثِ التَّرَجُّم

وَ اَنَّکَ مَا یَاْتِیْکَ مِنَّا عِصَابَۃٌ لِفَضْلِکَ اِلَّا اَرْجِعُوْا بِالتَّکَرُّم

شیخِ مکہ ابوطالبؑ نے ان اشعار میں شاہِ حبشہ نجاشی کو جو کہ عیسائی تھا خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اے بہترین انسان! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت محمدؐ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کے مددگار ہیں۔ محمدؐ بھی ویسی ہی ہدایت لائے ہیں جیسی کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ لائے تھے۔ یہ تینوں پیغمبر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہدایت کرتے ہیں اور لوگوں کو برائی سے بچاتے ہیں۔ تم اپنی کتاب انجیل میں صحیح طرح سے اس کے ذکر کی تلاوت کرتے ہو جو کہ تخمین وظن پر مبنی نہیں ہے اور جب بھی ہمارا کوئی گروہ تمہاری فضیلت کی امید رکھ کر تمہارے پاس آتا ہے تو وہ احترام واکرام حاصل کر کے واپس آتا ہے۔''

نجاشی نے عمرو بن عاص کی موجودگی میں جعفر بن ابی طالبؑ کو اپنے دربار میں بلایا اور جعفرؓ نے اسلام کی بہت اچھی ترجمانی کی اور مہاجرین کا موقف بیان کیا جس سے نجاشی بڑا متاثر ہوا اور عمرو بن عاص کو مایوس ہوکر دربار سے لوٹنا پڑا۔ نجاشی صداقتِ اسلام سے بڑا متاثر ہوا اور اس نے اقرار کیا کہ شریعتِ محمدیؐ بھی شریعتِ موسوی اور شریعتِ عیسوی کی طرح سے ایک آسمانی شریعت ہے۔

حبشہ میں مہاجرین کی تعداد اسی سے کچھ زیادہ افراد پر مشتمل تھی۔ عرب قبائل میں یہ خبر پھیل گئی کہ اسلام اب صرف جزیرۂ عرب تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ مکے سے باہر نکل کر دوسرے قبائل میں بھی پھیل رہا ہے

جیسا کہ ابوذر غفاریؓ کا تعلق مکے سے نہیں تھا اور وہ بھی مسلمان ہو گئے تھے۔

ابو طالبؑ مسلسل اپنے اشعار سے رسولِ اکرمؐ کی صداقت کا اظہار کرتے رہتے تھے اور لوگوں کو اس ذریعے سے دعوتِ اسلام دیتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مَنَعْنَا الرَّسُولَ رَسُولَ الْمَلِيكِ ۔۔۔ بِبِيضٍ تلالا كَلَمْعِ الْبُرُوقِ

اَذُبُّ وَ اَحْمِي رَسُولَ الْمَلِيكِ ۔۔۔ حِمَايَةَ حامٍ عَلَيْهِ شَفِيقِ

''ہم نے مالک الملک خدا کے پیغمبرؐ کی ایسی تلوار سے حفاظت کی جو بجلی کی طرح سے چمکتی ہے۔ میں مالک الملک خدا کے رسولؐ کی حمایت کرنے والے اور شفیق انسان کی طرح سے حمایت کرتا ہوں۔''[1]

حضرت ابو طالبؑ نے اپنے ان اشعار میں رسولِ اکرمؐ کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

وَاللّٰهِ لَن يَصِلُوا اِلَيکَ بِجَمْعِهِمْ ۔۔۔ حَتّٰى اُوَسَّدَ فِي التُّرَابِ دَفِينَا

وَ عَرَضْتَ دِينًا قَدْ عَرَفْتُ بِاَنَّهٗ ۔۔۔ مِنْ خَيْرِ اَدْيَانِ الْبَرِيَّةِ دِينَا

یعنی خدا کی قسم! جب تک میں خاک میں دفن نہ ہو جاؤں کفار کے ہاتھ تجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ تو نے وہ دین پیش کیا ہے جس کے متعلق میں جانتا ہوں کہ وہ دنیا کے تمام ادیان سے بہتر ہے۔[2]

ابو طالبؑ کا ایک اور شعر ہے:

اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّا وَجَدْنَا مُحَمَّدًا ۔۔۔ نَبِيًّا كَمُوْسٰى خُطَّ فِي اَوَّلِ الْكُتُبِ

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہم نے محمدؐ کو موسیٰ کی طرح نبی پایا ہے جن کا نام تورات میں مذکور ہے۔''[3]

قریش اپنی حرکات سے باز نہ آئے اور ایک مرتبہ پھر انہوں نے یہ پیشکش کی کہ اگر محمدؐ کو دولت کی ضرورت ہے تو ہم اس کے قدموں میں دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ عرب کے دولت مند ترین شخص بن جائیں گے اور اگر انہیں سلطنت کی ضرورت ہے تو ہم انہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔

ان کی یہ پیشکش سن کر نبی اکرمؐ نے فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تو بھی میں دعوتِ اسلام سے باز نہ آؤں گا۔''

حضرت ابو طالبؑ نے رسولِ اکرمؐ سے کہا: آپ کی قوم اس طرح کی باتیں کر رہی ہے لہٰذا آپ اپنے اور میرے متعلق ضرور سوچیں اور مجھ پر ایسا بوجھ نہ ڈالیں جس کے اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہ ہو۔

شفیق چچا کی یہ بات سن کر رسولِ اکرمؐ رو دیئے اور چچا کی طرف پشت کر کے چلنے لگے۔ ابو طالبؑ نے آپ کو بلایا۔ جب رسولِ اکرمؐ واپس آئے اور چچا کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوئے تو ابو طالبؑ نے کہا: بھتیجے! جو تمہارے جی میں آئے کہو، میں کسی بھی حال میں تم کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔

۱۔ ابن اسحاق، سیرت، ص ۱۴۹۔ ۲۔ یعقوبی، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۳۱۔ ۳۔ ابن ہشام، سیرت، ج ۱، ص ۲۷۸۔

حضرت حمزہؑ کا قبولِ اسلام

ایک دن ابوجہل نے کوہِ صفا کے قریب رسولِ اکرمؐ کو اکیلا پایا تو جی بھر کر آپ کو سخت سست کہا، اسلام کو برا بھلا کہا اور آپ کو اذیت دی۔ ایک کنیز نے یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

حضرت حمزہؓ کا مذاقِ طبیعت سپہ گری اور شیر افگنی تھا۔ ان کا معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لے کر گھر سے نکل جاتے اور سارا دن شکار کھیلتے رہتے۔ شام کو واپس آتے تو پہلے حرمِ کعبہ میں جاتے اور طواف کرتے۔ قریش کے رؤساء صحنِ حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے۔ حضرت حمزہؓ ان سے صاحب سلامت کرتے اور کبھی کبھی کسی کے پاس بیٹھ جاتے۔ اس طریقے سے ان کا سب سے یارانہ تھا وہ سب لوگ بھی ان کی عزت کیا کرتے تھے۔

اس دن جب حضرت حمزہؓ شکار سے واپس آئے تو کنیز نے انہیں ابوجہل کی گستاخی کی خبر دی۔ یہ خبر سن کر حضرت حمزہؓ کا چہرہ سرخ ہوگیا اور بڑی جلدی سے حرم میں آئے لیکن اس مرتبہ نہ تو کسی سے صاحب سلامت کی اور نہ کسی کے پاس بیٹھے۔ سیدھے اس طرف گئے جہاں ابوجہل اپنے قبیلے سمیت بیٹھا ہوا تھا اور آتے ہی ابوجہل کے سر پر اس زور سے کمان ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔

انہوں نے ابوجہل سے کہا کہ تیری یہ جرأت کہ تو میرے بھتیجے کے رو در رو گستاخی کرے؟ میں اس کا دین قبول کرنے کا اعلان کرتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ اگر تجھ میں جرأت ہے تو میرے مقابلے میں آ۔

ابوجہل کے خاندان بنی مخزوم کے افراد اس کی مدد کے لئے اٹھے مگر ابوجہل نے دیکھا کہ بات بہت بڑھ جائے گی اس لئے اس نے اپنے خاندان والوں سے کہا: "ابوعمارہ کو کچھ نہ کہو کیونکہ میں نے اس کے بھتیجے سے گستاخی کی ہے۔"

شیخِ قریش ابوطالبؑ قدم قدم پر رسولِ اکرمؐ کی حمایت کرتے رہے اور وہ قصائد سے کفارِ قریش کو رسوا کرتے رہے اور ہر باضمیر شخص سے محمد مصطفیٰؐ کی مدد کا مطالبہ بھی کرتے رہے۔ عموماً ان کے قصائد کا مفہوم کچھ اس طرح ہوتا تھا: "نہیں نہیں خدا کی قسم! کسی کا دست جفاکار میرے بھتیجے تک نہیں پہنچے گا کیونکہ محمدؐ کی حفاظت کے لئے بنی ہاشم کے شیر دل جوان تلواریں بے نیام کئے کھڑے رہتے ہیں اور جس طرح سے شیر شکار پر حملہ کرتا ہے اسی طرح سے بنی ہاشم کے جوان دشمن کی صفوں کو تہ و بالا کر دیتے ہیں اور اگر کسی نے یہ حرکت کرنے کی کوشش کی تو پھر کئی عورتوں کو بیوہ ہونا پڑے گا۔"

ابوطالبؑ نے حمایتِ رسولؐ میں جو قصائد کہے ہیں ان میں سے ایک قصیدہ ۹۴ بیت پر مشتمل ہے۔[۱]

۱۔ ابن ہشام، سیرت، ج۱، ص۲۸۶ تا ۲۹۸۔

شیخِ مکہ کے خلاف بغاوت

کفارِ قریش نے جب یہ محسوس کیا کہ شیخِ مکہ ان کی ایک نہیں سنتا اور ہر وقت رسولِ اسلامؐ اور دینِ اسلام کی حمایت پر کمر بستہ رہتا ہے تو انہوں نے اس کے خلاف بغاوت کرنے کا ارادہ کیا۔ بعثت کے چھٹے سال وہ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ابوطالبؑ اور ان کے قبیلے بنی ہاشم و بنی المطلب کے خلاف اقدام کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دستاویز لکھی جس میں انہوں نے رسولِ اکرمؐ کی حمایت کرنے والوں سے معاشی اور معاشرتی تعلقات توڑنے کا اعلان کیا اور اس دستاویز میں لکھا کہ آئندہ کوئی بھی ان سے رشتہ نہیں کرے گا، کسی قسم کا لین دین نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کے ساتھ کوئی نشست و برخاست رکھے گا۔

کفارِ قریش کے تمام سربرآوردہ افراد نے اس دستاویز پر دستخط کئے۔ پھر اس دستاویز کو خانۂ کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا۔ اس دستاویز کے بعد ابولہب کے سوا سارے بنی ہاشم اور بنی مطلب اپنے گھروں کو چھوڑ کر اپنے شیخ کے ساتھ ایک گھاٹی میں پناہ گزیں ہوئے۔ اس گھاٹی کو آج کل ''شِعبِ ابی طالبؑ'' کہا جاتا ہے۔ اس دوران ابوطالبؑ نے قصیدۂ غرا میں قریش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> میری طرف سے قبیلہ لوی [1] اور بالخصوص کعب کے قبائل کو یہ پیغام پہنچادو۔
> کیا تم نہیں جانتے کہ ہم نے محمدؐ کو ایسا ہی رسول پایا ہے جیسا کہ موسیٰ تھے اور محمدؐ کا نام پہلی کتاب (تورات) میں لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈالدی ہے اور جس کی محبت اللہ خود دلوں میں القاء کرے اس سے بہتر کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ تم نے جو دستاویز لکھی ہے یہ تمہارے لئے ہی ذلت و رسوائی اور نحوست کا سبب بنے گی جس طرح ناقۂ صالح کے بچے کی آواز اس قوم کے لئے بربادی کا باعث بنی تھی۔ ہوش میں آؤ! ہوش میں آؤ! اس سے قبل کہ تمہاری قبروں کی مٹی اکھیڑی جائے اور بے گناہ بھی گناہگار کی طرح عذاب میں پھنس جائے۔ چغل خوروں کی باتوں کی طرف دھیان نہ دو۔ دوستی اور قرابت کے بعد قطع رحمی نہ کرو۔ ایک طویل جنگ کا سبب نہ بنو اور یاد رکھو جنگ بھڑکانے والوں کو جنگ ہمیشہ مہنگی پڑتی ہے۔ ربِّ کعبہ کی قسم! ہم ہرگز ہرگز احمدؐ کو

۱۔ لوی بن غالب قریش کا جد اعلیٰ تھا اور کعب و عامر اس کی اولاد تھے۔ قریش کے تمام قبائل کا نسب کعب بن لوی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اسی لئے شیخ مکہ نے لوی اور نسل کعب کو مخاطب کیا۔ (انساب ابن حزم شرح حال بنی لوی)

حضرت ابوطالبؑ کا یہ قصیدہ سیرت ابن اسحاق، ص ۱۵۷ اور سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۷۳ پر موجود ہے۔

زمانے کی سختیوں کے حوالے نہیں کریں گے۔ ہوش میں آؤ! اس سے پہلے کہ تیز تلواروں سے ہاتھ اور گردنیں کاٹی جائیں۔ میدانِ کارزار میں نیزے ٹوٹیں اور سیاہ گدھیں لاشیں کھانے کے لئے جمع ہوں۔ جب گھوڑوں کی جولانی نے ہر گوشہ و کنار کو پُر کیا ہوا ہو اور سورماؤں کی چنگھاڑ سے رن کانپ رہا ہو۔ کیا ہمارے والد ہاشم نے اپنی اولاد کو نیزہ بازی اور شمشیر زنی کی وصیت نہیں کی تھی؟ ہم اولادِ ہاشم ہیں، ہم جنگ سے نہیں بلکہ جنگ ہم سے بھاگتی ہے اور ہم جنگ کی سختیوں کا کوئی شکوہ نہیں کرتے۔ جب بہادروں کی جانیں خوف سے لبوں پر پہنچ جاتی ہیں، تو اس وقت بھی ہم ہی رزم گاہ کے دلیر اور صاحبانِ عقل ہوتے ہیں۔

ابوطالبؑ کے ان قصائد کی وجہ سے قریش کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ رسولِ اکرمؐ اور دوسرے بنی ہاشم پر حملہ کرتے۔ البتہ اقتصادی محاصرے نے ان پر سخت اثرات مرتب کئے۔ یہ محاصرہ پورے تین سال تک جاری رہا۔ اس محاصرے کے دوران حضرت خدیجہؓ اپنی دولت محصورین پر خرچ کرتی رہیں۔[۱]

اس طویل عرصے میں چھپ چھپا کر بنی ہاشم کو غلہ ملا کرتا تھا۔ حضرت ابوطالبؑ اپنے فرزندِ دلبند حضرت علیؑ کو رات کی تاریکی میں مکہ بھیجتے تھے تاکہ وہ وہاں سے کچھ خورد و نوش کی اشیاء لائیں۔

ابن ابی الحدید کے مطابق حضرت علیؑ رات کی تاریکی میں چپکے سے گھاٹی سے نکلتے اور لوگوں کی نگاہوں سے بچتے بچاتے اس جگہ جا پہنچتے جہاں ابوطالبؑ نے انہیں روانہ کیا ہوتا تھا اور وہ وہاں سے گندم اور آٹے کی بوریاں اپنے کندھے پر اٹھا کر لے آتے تھے۔[۲] محاصرے کے دوران محصورین میں سے کوئی بھی کھلے عام باہر نہیں آسکتا تھا اور نہ ہی باہر سے کوئی شخص ان کے پاس جاسکتا تھا۔[۳]

جیسے ہی رات کا ایک حصہ گزرتا ابوطالبؑ، رسولِ اکرمؐ کو ان کے بستر سے اٹھا کر دوسرے بستر پر سلا دیتے اور علیؑ کو رسولِ اکرمؐ کے بستر پر سلا دیتے تھے تاکہ اگر کوئی شب خون مارے تو علیؑ قتل ہو جائیں لیکن رسولِ اکرمؐ بچ جائیں۔[۴] تین سال کے سخت محاصرے نے محصورین کو فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے معاہدے کی دستاویز پر دیمک کو مسلط کر دیا جس نے اس کو کھا لیا اور اس میں صرف "بِاسْمِکَ اللّٰھم" کے الفاظ باقی بچ گئے تھے۔

۱۔ ابن ہشام، سیرت، ج۱، ص۳۷۳ تا ۳۷۶۔

۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۱۳، ص۲۵۴ مطبوعہ مصر، در شرح خطبۂ قاصعہ فصل فی القول فی السلام ابی بکر و علی

۳۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۱۴، ص۵۸

۴۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۱۴، ص۶۴۔ محمد بن محمد شافعی اندلسی، عیون الاثر، ج۱، ۱۲۷۔

رسولِ اکرمؐ نے اپنے چچا سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ قریش کی دستاویز کو دیمک چاٹ چکی ہے اور وہاں بِاسْمِکَ اللّٰھم کے سرنامے کے علاوہ کوئی عبارت موجود نہیں ہے۔ یہ سن کر ابوطالبؑ گھاٹی سے صحنِ کعبہ میں تشریف لائے جہاں سربرآوردہ افراد جمع تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا:

''میرے بھتیجے نے مجھے خبر دی ہے کہ تمہاری دستاویز کو دیمک نے چاٹ لیا ہے اور اس میں "بِسْمِکَ اللّٰھم" کے سوا کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ اگر میرے بھتیجے کی بات سچی ثابت ہوئی تو تمہیں محاصرہ ختم کرنا چاہئے اور اگر اس کی بات جھوٹی ثابت ہوئی تو میں اپنا بھتیجا تمہارے حوالے کردوں گا اور تمہیں اس کو قتل کرنے کی اجازت ہوگی۔''

حضرت ابوطالبؑ کی اس پیشکش سے قریش بہت خوش ہوئے اور انہوں نے دستاویز طلب کی۔ جب دستاویز کو کھول کر دیکھا گیا تو واقعاً بِاسْمِکَ اللّٰھم کے الفاظ کے سوا تمام دستاویز کو دیمک چاٹ چکی تھی اور یوں نبی اکرمؐ کی خبر سچی ثابت ہوئی۔ اس وقت کچھ افراد ایمان لے آئے اور کچھ نے کہا کہ یہ جادو ہے۔[1]

اس وقت بنی ہاشم و خدیجہؑ کے پانچ غمگسار افراد اٹھے اور انہوں نے قریش کے سامنے اس منحوس دستاویز کو چاک چاک کردیا۔[2] اسکے بعد بنی ہاشم اور بنی مطلب گھاٹی سے باہر اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔

بی بی خدیجہؑ کی رحلت

اب اسلام مکے کی سرحدوں سے باہر نکل کر عرب کے دوسرے قبائل تک پہنچ چکا تھا۔ اسّی سے زیادہ افراد براعظم افریقہ چلے گئے تھے جہاں انہوں نے توحید کا پیغام پہنچایا تھا اور افریقہ میں بھی تلاوتِ قرآن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور وہاں بھی توحید کے پیروکار خدائے واحد کی عبادت کر رہے تھے۔ ان حالات میں قریش اسلام کا گلا دبانے میں کامیاب نہیں ہوسکتے تھے۔

چوراسی سال کے بوڑھے ابوطالبؑ قریش کے ساتھ برسرِپیکار رہنے اور شدید اقتصادی محاصرے کی وجہ سے انتہائی کمزور ہوچکے تھے اور حضرت خدیجہؑ کی عمر بھی پینسٹھ سال سے تجاوز کرچکی تھی۔ ملیکۃ العرب اپنی تمام دولت اسلام پر نچھاور کرچکی تھیں۔ الغرض جب شِعْبِ ابیطالبؑ کا محاصرہ ختم ہوا تو اسلام کے دونوں عظیم مددگار سخت لاغر و نحیف ہوچکے تھے۔ محاصرہ ختم ہونے کے بعد اور ہجرت سے تین سال قبل ماہ رمضان میں اسلام کی عظیم محسنہ حضرت خدیجہؑ کا انتقال ہوگیا۔[3]

۱۔ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۳۱۔ ۲۔ ابن ہشام، سیرت، ج ۱، ص ۳۵۵۔ طبری، تاریخ، ج ۱، ص ۱۱۹۶ تا ۱۱۹۹۔

۳۔ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۳۵۔

حضرت ابوطالبؑ کے آخری لمحات زندگی

حضرت ابوطالبؑ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی اسلام اور رسولِ اکرمؐ کی کامیابی کے لئے فکرمند تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی آخری ساعت میں رسولِ اکرمؐ سے کہا: اے پیارے بھتیجے! میرے مرنے کے بعد تم اپنے ماموؤں یعنی بنی نجّار (جو کہ مدینے کے قبیلۂ خزرج کی شاخ تھے) کی طرف ہجرت کر کے چلے جانا کیونکہ وہ قبیلہ اپنے ہاں پناہ لینے والوں کی سب سے زیادہ حفاظت کرنے والا قبیلہ ہے۔[۱]

یہ الفاظ کہنے کے بعد ابوطالبؑ پر حالتِ نزع طاری ہوئی۔ اس وقت رسولِ اکرمؐ اور عباسؓ بن عبدالمطلب ان کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ آخری لمحات میں حضرت ابوطالبؑ کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے اور وہ ڈوبی ہوئی آواز میں کچھ کہہ رہے تھے۔ عباسؓ نے کان لگا کر سنا تو وہ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰه کہہ رہے تھے۔[۲]

حضرت ابوطالبؑ کی زندگی کا اختتام اسی کلمے پر ہوا جس کی ترویج کے لئے وہ دس سال تک محنت کرتے رہے اور کلمۂ توحید کا لفظ "اللہ" جیسے ہی زبان پر آیا تو انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

حضرت ابوطالبؑ کی طرح کسی نے بھی اسلام اور رسولِ اکرمؐ اور کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰه کی خدمت نہیں کی۔ البتہ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ وہ "علیؑ کے باپ" تھے اور "بغضِ علی" کی وجہ سے لوگوں نے اتنے بڑے محسنِ اسلام کو بھی کافر کہا۔ حضرت ابوطالبؑ کو کافر کہنا تاریخ کا بہت بڑا ظلم ہے۔

یعقوبی لکھتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنے چچا کے انتقالِ پُرملال پر ان کے حق میں یہ جملہ ارشاد فرمایا:

يَا عَمِّ رَبَّيْتَ صَغِيْرًا وَ كَفَلْتَ يَتِيْمًا وَ نَصَرْتَ كَبِيْرًا فَجَزَاكَ اللّٰهُ عَنِّيْ خَيْرًا. یعنی چچا جان! آپ نے بچپن میں میری پرورش کی، یتیمی میں میری کفالت کی اور جب میں بڑا ہوا تو آپ نے میری مدد کی۔ اللہ میری طرف سے آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اور جب جنازہ اٹھا تو سرورِ کونینؐ کبھی تابوت کے آگے چلتے اور کبھی پیچھے آتے اور تابوت کے سامنے کھڑے ہو کر فرماتے: وَصَلَتْكَ رَحِمٌ وَ جُزِيْتَ خَيْرًا.[۳] "چچا جان آپ کو صلۂ رحمی کی جزا عطا ہو اور آپ کو جزائے خیر نصیب ہو۔"

رسولِ اکرمؐ نے تو اپنے شفیق چچا کے متعلق یہ الفاظ کہے تھے لیکن مسلمانوں نے محسنِ اسلام کو یہ صلہ دیا

۱۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی، تاریخ الاسلام، ج ۱، ص ۱۳۸ فصل ثم توفی ابوطالبؑ۔

۲۔ ابن اسحاق، سیرت، باب وفات ابوطالبؑ، ص ۲۳۸۔ ابن ہشام، سیرت، ج ۲، ص ۹۵۔

۳۔ ابن واضح احمد بن ابی یعقوب کاتب، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۳۵۔

کہ ''ابوطالبؑ آتشِ دوزخ میں جل رہا ہے'' اور ستم بالائے ستم یہ کہ انہوں نے یہ الفاظ رسولِ اکرمؐ کی طرف منسوب کر کے اپنی مخاصمانہ رائے کو حدیث کا درجہ دے دیا۔

حضرت ابوطالبؑ کی مخالفت میں جتنی روایات بیان کی گئی ہیں وہ ان حقیقی روایات کے خلاف ہیں جو ہم نے ابھی پیش کی ہیں۔ ابوطالبؑ کی مخالفت پر مبنی تمام روایات کے متعلق ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ سب کی سب دَورِ معاویہ میں بنائی گئی ہیں اور ان کی رسولِ اکرمؐ کی طرف غلط نسبت دی گئی ہے۔

معاویہ کے بعد بنی امیہ کے خلفاء نے ان روایات کی تائید کی اور بنی عباس کے خلفاء نے بھی معاویہ کے حکم سے بنائی جانے والی ان روایات کی سرپرستی کی کیونکہ انہیں ابوطالبؑ کی نسل علویوں سے ہمیشہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان روایات کی سرپرستی کی وجہ سے خلفائے بنو عباس امت کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ اگرچہ علوی بھی رسولِ اکرمؐ کے چچا کی اولاد ہیں اور ہم بھی رسولِ اکرمؐ کے چچا کی اولاد ہیں لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ہم رسولِ اکرمؐ کے چچا عباس کی اولاد ہیں جو مسلمان تھے اسی لئے ہم تمام مادی و معنوی امور میں رسولِ اکرمؐ کے شرعی وارث ہیں جبکہ ہمارے حریف علویوں کا تعلق ابوطالبؑ کی اولاد سے ہے اور ابوطالبؑ تو کافر تھے اور شریعتِ اسلام کا فیصلہ ہے کہ کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔

معاویہ سے لے کر آخری عباسی خلیفہ تک — اور آخری عباسی خلیفہ سے لے کر آج تک — خلافت کے پیروکار ابوطالبؑ کے کفر کی ایک دلیل بھی بیان نہیں کر سکے۔

کتبِ تاریخ و سیرت میں ابوطالبؑ کے اشعار اور گفتار موجود ہیں۔ ان کے کسی شعر اور کسی بھی قول سے ان کا کفر ظاہر نہیں ہوتا۔ آج تک تاریخ نے یہ نہیں بتایا کہ ابوطالبؑ دوسرے اہلِ مکہ اور کفارِ عرب کی طرح بت پوجا کرتے تھے اور آج تک ابوطالبؑ کے بت کا نام دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ مثلاً تاریخ بتاتی ہے کہ فلاں قبیلے کے لوگ لات نامی بت کی پوجا کرتے تھے، فلاں قبیلے کے لوگ منات کی پوجا کرتے تھے۔ ہر قبیلے کا بت جدا جدا ہوتا تھا اور مشاہیر افراد کے اپنے مخصوص بت ہوا کرتے تھے۔

ابوطالبؑ بھی اسی بت پرست معاشرے میں رہتے تھے لیکن معاویہ کی تمام تر دشمنی کے باوجود آج تک اس بت کی نشاندہی کوئی راوی نہ کرسکا کہ ابوطالبؑ فلاں بت کی پوجا کرتے تھے۔

جبکہ حالت یہ ہے کہ تاریخ میں ابوطالبؑ کے اشعار اور خطبات موجود ہیں۔ انہوں نے جب بھی قسم کھائی تو اللہ اور ربِّ کعبہ یا خدا کے دیگر کسی نام کی قسم کھائی۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ ہی ابوطالبؑ کے وردِ زباں رہتے تھے جبکہ بت پرست عربوں کے اکثر اشعار میں ہمیں ان کے خود ساختہ خداؤں کی قسمیں زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔ اگر ابوطالبؑ بھی بت پرست ہوتے تو اپنے کسی خطبے یا کسی شعر میں اپنے بت کی تعریف نہ سہی اس

کے نام کی قسم تو اٹھاتے لیکن خدا گواہ ہے کہ تاریخ میں اس طرح کا کوئی جملہ نہیں ملتا۔[1]

حضرت ابوطالبؑ نے حضرت خدیجہؑ کی رحلت کے تین دن بعد وفات پائی اور ایک قول کے مطابق حضرت خدیجہؑ سے پہلے وفات پائی۔[2] ابوطالبؑ کی وفات کے بعد خدا نے ان کے بیٹے علی ابن ابی طالبؑ کو نصرتِ رسولؐ کے لئے مخصوص کردیا اور وہ پوری زندگی اپنے والد کا کردار ادا کرتے رہے۔

قریش کے سامنے شیرِ خداؑ کی للکار

حضرت خدیجہؑ اور حضرت ابوطالبؑ کی وفات کے بعد قریش نے سمجھ لیا کہ اب رسولِ اکرمؐ بالکل بے یار و مددگار ہوگئے ہیں اور شیخِ مکہ کی وفات کے بعد بنی ہاشم محمدؐ کی نصرت سے ہاتھ اٹھالیں گے۔ ابوطالبؑ کے فرزندِ ارجمند حضرت علیؑ نے سوچا کہ اس طرح سے قریش کی ہمتیں بڑھ جائیں گی۔ لہذا ان کے غلط مفروضے کی تردید کے لئے آپ نے قریش کو للکارا۔ اس دور کے عرب معاشرے میں شاعری ہی اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا مؤثر وسیلہ سمجھی جاتی تھی اس لئے حضرت علیؑ نے یہ قصیدہ کہا:

ارقت لنوح اخِرِ اللّیْلِ عزدَا   شَیْخی ینعٰی وَالا رَئِیْس الْمُسَوَّدَا

اَبَا طَالِبٍ مَاوی الصَّعَالیکِ ذاللندی   وَ ذَالحِلم لَاخلقا وَلَا قَعددَا

اَخَا الملکِ خَلی ثلمة سَیِّدهَا   بَنُو هَاشِم اَوْ یستباح فَیهمدَا

فَاَمْسَتْ قریش یَفْرَحُوْنَ بِفَقْدِہٖ   وَلَسْتُ اَرٰی حَیًّا لِشَیْءِ مُخَلَّدَا

اَرَادَتْ اُمُوْرًا زینتها حُلُوْمُهُمْ   سَتوردهم یَومًا مِّنَ الْغَی مَوْرِدَا

یَرْجُوْنَ تَکْذِیْبَ النَّبِیِّ وَ قَتْلَهٗ   وَان یفتروْا بهتا عَلَیْهِ وَیَجحَدَا

۱۔ ایمانِ ابوطالبؑ کے موضوع پر بہت سی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ آقائے بزرگ تہرانی نے الذریعہ ج ۲، ص ۵۱۰ تا ۵۱۴ پر ان کتابوں کی فہرست دی ہے جو ایمانِ ابوطالبؑ پر لکھی گئی ہیں۔ ان بیسیوں کتابوں میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں:
(۱) علامہ سیوطی، بغیة الطالب لایمانِ ابی طالبؑ و حسن خاتمته (۲) مفتی شافعی، اسنیٰ المطالب فی نجاةِ ابی طالبؑ، احمد بن زینی دحلان مکی شافعی، مکہ۔ (۳) شمس الدین ابی علی فخار بن معد موسوی، ایمان ابی طالبؑ۔ (۴) علامہ امینی، الغدیر، باب ابوطالبؑ مظلوم تاریخ۔ (مذکورہ کتابوں کے علاوہ اس وقت اس موضوع پر (۵) ابوطالبؑ مومن قریش از عبداللہ خنیزی مطبوعہ سعودی عرب اور (۶) ایمان ابوطالبؑ از صائم چشتی، مطبوعہ پاکستان بھی شائع ہوچکی ہیں)۔

۲۔ ابن اسحاق، سیرت، ص ۲۳۶۔ ابن ہشام، سیرت۔ ابن واضح کاتب، تاریخ یعقوبی ورذکر وفات حضرت ابوطالبؑ۔

كَذبتُمْ وَ بَيْتُ اللهِ حَتّٰى نَذيتكمُ — صُدُوْرَ العَوالِى وَ الصَّفِيحِ المُهَنَّدا
وَيَبدأ مِنّا مَنْظر ذُوكَرِيْهَةَ — إذَا مَا تسربلعا الْحَدِيد الْمُسَرَّدا
فَامّا تبيدونَا وَ امّا نَبيدُ كُمْ — وَ اَمَا تَرو اسلم العَشِيْرة اَرْشَدَا
وَ الافان الحى دُوْنَ مُحَمَّدٌ — بَنُوهَاشِم خَيْرَ الْبَرِيَّةِ مُحْتَدِا
وَان لَهٗ فِيكمُ مِنَ اللهِ نَاصِرًا — وَلَسْتَ بلاَق صحب اللهِ اَوْحَدَا
اَغر كفؤ الْبَدْرِ صُوْرَةَ وَجْهِهٖ — جَلا انعيم عَنْهُ ضَوْءُهٗ فَتَوَقَّدَا
اَمِيْن عَلٰى مَا اسْتَودع اللهُ قَلْبَهٗ — وَاِنْ كَانَ قَولاً كَانَ فِيْهِ مُسَدَّدَا

''میں آخر شب میں بلند آواز سے نوحہ کرنے کے لئے بیدار ہوا۔ میرا نوحہ میرے اس بزرگ اور سردار کے لئے تھا جس کی موت کی مجھے خبر دی گئی تھی۔ اس صاحب حکومت کی موت سے ایک خلا پیدا ہوا جس کو بنی ہاشم پُر کردیں گے یا پیغمبرؐ مباح کردیئے جائیں گے تو خدا کی طرف سے یہ آتش فرو ہوگی۔ آج قریش اس کی موت پر خوشیاں منا رہے ہیں جبکہ میں کسی کو بھی زندہ اور دنیا میں ہمیشہ رہنے والا نہیں دیکھتا۔ قریش نے اپنے امور (قتلِ محمدؐ) کا ارادہ کیا ہے جسے ان کی (ناقص) عقلوں نے بھایا ہے اور عنقریب ان کو وہی امور گواہی کے گھاٹ پر اتاریں گے۔ قریش پیغمبرؐ کی تکذیب اور اس کے قتل کی امید کرنے لگے ہیں اور وہ ان پر بہتان تراشی کرکے ان کا انکار کرنے لگے ہیں۔ بیت اللہ کی قسم! تم جھوٹے ہو، تم نے غلط سمجھا ہے، ایسا نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ ہم تمہیں نیزے کی نوک اور ہندی تلواروں کا مزہ چکھا دیں۔ اور جب ہم نے بُنا ہوا لوہا (زرہ) پہن لیا تو ہم ہی سے نہایت ناگوار منظر شروع ہو جائے گا۔ پھر یا تو نتیجے میں تم ہمیں ہلاک کروگے یا ہم تمہیں ہلاک کریں گے یا تم اپنے قبیلے سے صلح کو بہتر خیال کروگے۔ تمہیں علم ہونا چاہئے کہ محمدؐ کے حامی بنی ہاشم ہیں جو اصل کے لحاظ سے بہترینِ خلائق ہیں۔ تمہارے اندر محمدؐ کا ایک مددگار (یعنی علیؑ) موجود ہے اور میں محبّ خدا سے تنہا نہیں ملوں گا۔ وہ ایسے نبی ہیں کہ ہر وحی سے ایک اہم چیز بیان کرتے ہیں۔ اسی لئے میرے رب نے کتاب میں ان کا نام محمدؐ رکھا ہے۔ ان کا چہرہ چودھویں کے اس چاند کی طرح سے روشن ہے جس کی روشنی بادلوں کو چیر کر چمک رہی ہو۔ جو کچھ خدا نے ان کے دل میں ودیعت کیا وہ اس کے امین ہیں اور آپ ہر قول میں سچے ہیں۔''

اس قصیدے کے ذریعے حضرت علیؑ نے کفارِ قریش کو واضح پیغام دیا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ابوطالبؑ کی وفات کے بعد بنی ہاشم کمزور ہو چکے ہیں اور وہ رسولِ اکرمؐ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ انہیں بنی ہاشم کے تیز نیزوں اور خارا شگاف شمشیروں سے ضرور ڈرنا چاہئے کیونکہ بنی ہاشم رسولِ اکرمؐ کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگانے پر آمادہ ہیں اور وہ زرہ بکتر پہن کر میدانِ کارزار میں قدم رکھیں گے تو ایسی

جنگ لڑیں گے جس میں یا تو وہ خود فنا ہو جائیں گے یا کفارِ قریش کو ختم کر کے دم لیں گے یا پھر کافر قریشیوں کو عقل آجائے گی کہ ان سے صلح کرنے میں ہی ان کی بقا کا راز مضمر ہے۔

اس شعر میں جہاں حضرت علیؑ نے دھمکی دی ہے وہاں ان کے جذباتِ قرابت داری کو تحریک بھی دی ہے۔ اس قصیدے میں ہمیں یوں دکھائی دیتا ہے جیسے علیؑ اپنے والد کے لہجے میں کفارِ قریش سے مخاطب ہوں۔ اور آخر ایسا کیوں نہ ہوتا۔ مثل مشہور ہے کہ شیر کا بچہ شیر ہی ہوتا ہے اَلشِبلُ مِن ذاکَ الاَسَد۔

اس قصیدے کا اثر

بعض اوقات لوگوں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں تو اس حالت میں وہ کسی جنگ کے قابل نہیں رہتے کیونکہ پست حوصلہ فوج دشمن کے مقابلے میں ریت کی دیوار ثابت ہوتی ہے۔ ایک اچھے سپہ سالار کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی فوج کو حوصلہ دے تاکہ اس میں جرأت وشہامت پھر سے پیدا ہو اور وہ دشمن کے لئے آہنی دیوار بن جائے۔ اس کے لئے تاریخ سے آپ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

حضرت علیؑ جنگِ جمل فتح کر کے کوفہ تشریف لائے اور چند ہی دن گزرنے کے بعد آپ کو معاویہ سے لڑائی پر مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ آپؑ نے منبرِ کوفہ پر خطبہ دیا جس میں لوگوں کو معاویہ سے جنگ کی ترغیب دی۔ ابھی آپ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ مجمع میں سے ایک شخص نے اٹھ کر کہا: "کل آپ نے بصرے میں ہم سے ہمارے بھائیوں کو قتل کرایا اور آج آپ ہم سے شامی بھائیوں کو قتل کرانا چاہتے ہیں۔ ایسا کبھی نہ ہوگا، ہم اپنے ہاتھوں اپنے بھائیوں کو قتل نہیں کریں گے۔"

اس شخص کے اِس ایک جملے نے سب کے حوصلے پست کر دیئے۔ حضرت مالک اشتر اٹھے اور انہوں نے پست حوصلہ ساتھیوں کو حوصلہ دیا۔ بزدلی کا شوشہ چھوڑنے والا شخص مسجد سے اٹھ کر بھاگنے لگا۔ مالک اشتر کی تقریر نے لوگوں کی ہمت بندھائی تو لوگ اس شخص کے پیچھے دوڑے اور جہاں گھوڑے بکا کرتے تھے وہاں اسے جالیا اور اس پر تلواروں کی اتنی ضربیں ماریں کہ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ حضرت علیؑ نے اس شخص کی دِیَت بیتُ المال سے اس کے ورثاء کو ادا کی اور فرمایا کہ اس کا قاتل نامعلوم ہے اسی لئے اس کی دِیَت مسلمانوں کے بیت المال سے دی جارہی ہے۔[1] کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مالک اشتر کھڑے ہو کر لوگوں کو حوصلہ نہ دلاتے تو لوگ حوصلہ چھوڑ بیٹھتے اور یوں حضرت کے ساتھ کوئی بھی معاویہ کے مقابلے میں نہ جاتا۔

اس طرح کا ماحول مکے میں موجود تھا۔ حضرت علیؑ کو خیال ہوا کہ مبادا حضرت ابوطالبؑ کی وفات

۱۔ نصر بن مزاحم کی کتاب وقعۂ صفین مطبوعہ مصر سے بطور اختصار نقل کیا گیا۔

سے بنی ہاشم کے حوصلے پست نہ ہو جائیں کیونکہ آپ مردِ میدان تھے اور جانتے تھے کہ جس فوج کے حوصلے پست ہو جائیں وہ لڑنے کے قابل نہیں رہتی۔ چنانچہ ایسا نہ ہو کہ کفارِ قریش ایک معمولی سا حملہ کر کے انہیں تہس نہس کر دیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے اس قصیدے کے ذریعے بنی ہاشم کے حوصلے بلند کئے۔ اس قصیدے سے دو مختلف اور متضاد اثرات مرتب ہوئے:

(۱) بنی ہاشم اور دوسرے مومنین پر اثر

بنی ہاشم کو ایک قوی دل شخص کی شدید ضرورت تھی جو ان کی سرپرستی کرے اور انہیں خوف اور پراگندگی سے نجات دلائے۔ حضرت علیؑ کے قصیدے نے ان کی اس ضرورت کو پورا کیا۔ آپ نے اس قصیدے کے ذریعے سے نہ صرف بنی ہاشم بلکہ دوسرے شکستہ دل مومنین کے حوصلے بھی بلند کئے۔

(۲) قریش پر اثرات

ابوطالبؑ کی وفات کے بعد کفارِ قریش کافی جَری ہوگئے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی کافر، رسولِ اکرمؐ پر حملہ کرتا تو اس کی حمایت میں سیکڑوں کفار، بنی ہاشم اور رسولِ اکرمؐ کے خلاف کھلی جنگ کر سکتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؑ کو ہمت و حوصلہ دیا اور آپ نے یہ قصیدہ کہہ کر مکے کے حالات کو اسلام اور رسولِ اکرمؐ کے حق میں تبدیل کر دیا۔ جس طرح سے مالک اشترؒ کی اثر آفریں تقریر نے کوفے کے حالات کو حضرت علیؑ کے حق میں موڑا تھا اسی طرح سے حضرت علیؑ نے بھی اپنے قصیدے سے مکے کی فضا کو رسولِ اکرمؐ کے حق میں موڑ دیا تھا۔

کفارِ قریش کو معلوم تھا کہ بنی ہاشم رسولِ اکرمؐ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے اس لئے انہیں رسولِ اکرمؐ پر حملے کی جرأت نہ ہوئی۔ البتہ محافظِ اسلام ابوطالبؑ کی وفات سے ایک خلا ضرور پیدا ہوا۔ قریش اگرچہ آنحضرتؐ پر قاتلانہ حملہ نہ کر سکے لیکن ان کی ایذا رسانی میں اضافہ ہوگیا جبکہ ابوطالبؑ کی حینِ حیات میں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔

ابولہب اور اس کی بیوی

ابولہب، عبدالمطلب کا بیٹا اور رسولِ اکرمؐ کا چچا تھا۔ ''لہب'' شعلۂ آتش کو کہتے ہیں۔ اس کے سرخ رخساروں کی وجہ سے اسے ابولہب کہا جاتا ہے۔ ابولہب کی ایذا رسانیوں کا سلسلہ اس وقت سے ہی شروع ہوگیا تھا جس دن رسولِ اکرمؐ نے نسلِ عبدالمطلب کو دعوتِ ذُوالعشیرہ میں اپنے گھر بلایا تھا۔ اس کی

اسلام دشمنی کا سلسلہ غزوۂ بدر کے بعد بھی اس کی زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رہا۔ یہاں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ جنگِ بدر کے بعد ابولہب چیچک کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر جہنم رسید ہوا۔ اس کی اذیتوں کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

اسلام کے آغاز میں ایک دن آنحضرتؐ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر "وَا صَبَاحَاہ!" کا نعرہ بلند کیا اور عربوں میں یہ نعرہ اس وقت بلند کیا جاتا تھا جب لوگوں کو کسی خطرے سے آگاہ کرنا مقصود ہوتا تھا۔

اس آواز کے بعد قریش بڑی تعداد میں وہاں جمع ہوگئے تو آپ نے ان سے فرمایا: لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ ایک بہت بڑی فوج تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم میری بات مان لوگے؟

لوگوں نے کہا: ہم نے کبھی آپ سے جھوٹ نہیں سنا (یعنی ہم آپ کی ضرور تصدیق کریں گے۔)

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: میں تمہیں سخت عذاب سے خبردار کرتا ہوں۔

آپ کا یہ فرمان سن کر مجمع میں سے ابولہب نے کہا: تَبًّالَکَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟ یعنی تو ہلاک ہوجائے (نعوذباللہ) کیا تو نے ہمیں اسی لئے یہاں جمع کیا تھا؟

ابولہب کہا کرتا تھا: یہ محمدؐ بھی عجیب شخص ہے۔ یہ ہم سے حیات بَعْدَ المَمات کے لئے مختلف وعدے کرتا ہے اور اس کے لئے بہت سے دعوے کرتا ہے جبکہ میرا تو خیال ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ پھر وہ مذاق کرنے کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں کو کھول کر ان پر پھونک مارتا اور اپنے ہی ہاتھوں سے کہتا تھا: تَبًّالَکُمَا. یعنی تم برباد ہو جاؤ۔ تم تو خالی ہو۔ محمدؐ کے دعوے کی رُو سے تو تمہیں پُر ہونا چاہئے تھا۔[1]

ابولہب کی بیوی اُمِّ جمیل بھی اس جیسی تھی۔ وہ ابوسفیان کی بہن اور معاویہ کی پھوپھی تھی۔ وہ بھی ہمیشہ آنحضرتؐ کو اذیت دینے میں پیش پیش رہتی تھی۔ وہ آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتی اور آپ کے خلاف فتنہ انگیزی کیا کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ابولہب اور اس کی بیوی کے متعلق سورۂ لہب نازل فرمائی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ○ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ○ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ○ وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ○ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ○ یعنی ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ ہلاک ہو جائے۔ نہ اس کا مال ہی اس کے کام آیا اور نہ اس کا کمایا ہوا سامان ہی۔ وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔ اور اس کی بیوی جو لکڑی ڈھونے والی ہے۔ اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی بندھی ہوئی ہے۔[2]

۱۔ ابن ہشام، سیرت، ج۱، ص۳۷۲۔

۲۔ ابن ہشام، سیرت، ج۱، ص۳۷۶۔ جلال الدین سیوطی، درمنثور، تفسیر سورۂ لہب و دیگر تفاسیر۔

ابولہب کے دو بیٹے تھے جن کے نام عُتبہ اور عُتیبہ تھے۔ وہ دونوں رسولِ اکرمؐ کے داماد تھے اور ان کے علاوہ عاص بن وائل بھی رسولِ اکرمؐ کا داماد تھا۔

قریش نے رسولِ اکرمؐ کے تینوں دامادوں سے کہا کہ تم محمدؐ کی بیٹیوں کو طلاق دیدو۔ اس سے وہ معاشی بحران کا شکار ہو جائیں گے اور اس طرح دعوتِ اسلام سے باز آجائیں گے اور مزید یہ کہ ہم تمہاری شادی بھی اپنے خاندان میں کردیں گے۔

عاص بن وائل نے تو قریش کی تجویز سے اتفاق نہ کیا اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دی جبکہ ابولہب کے بیٹوں نے رسولِ اکرمؐ کی دونوں بیٹیوں کو طلاق دیدی۔ اس طلاق کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کی ماں ام جمیل نے سورۂ لہب کے نزول کے بعد ان سے کہا تھا کہ ''اگر تم نے محمدؐ کی بیٹیوں کو طلاق نہ دی تو میں تم سے کلام نہ کروں گی۔''

ام جمیل کی دشمنی صرف یہیں تک محدود نہ تھی۔ ایک دفعہ وہ آنحضرتؐ کے خلاف ہجویہ اشعار پڑھتے ہوئے مسجد الحرام کی طرف آرہی تھی تو اس نے راستے سے ایک بڑا پتھر اٹھایا اور وہ یہ عزم لے کر آگے بڑھی کہ ''اِس وقت رسولِ اکرمؐ مسجد الحرام میں ہوں گے تو میں یہ پتھر ان کے سر پر ماروں گی۔'' لیکن جب وہ مسجد الحرام میں آئی تو اللہ نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور وہ آنحضرتؐ کو نہ دیکھ سکی اور یوں بے نیل ومرام واپس چلی گئی۔[1]

تمام قریش کی ایذاؤں کے مقابلے میں ابولہب کی اذیتیں زیادہ تکلیف دہ تھیں وہ آپ کی دشمنی میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب قریش نے بنی ہاشم سے مقاطعہ کرنے کے لئے عہدنامہ تحریر کیا تو بنی ہاشم اور اولادِ مطلب نے رسولِ اکرمؐ کا ساتھ دیا اور ابولہب اگرچہ بنی ہاشم میں سے تھا مگر اس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے سے انکار کردیا اور وہ کفارِ قریش کا طرفدار ہوگیا تھا۔ اس دستاویز کی وجہ سے بنی ہاشم نے مکے کو چھوڑ کر پہاڑ کی ایک گھاٹی میں پناہ لی تھی جسے ''شِعبِ ابیطالبؑ'' کہا جاتا ہے۔

شِعبِ ابیطالبؑ میں بنی ہاشم مسلسل تین سال تک محصور رہے اور باہر سے کسی طرح کی خوراک ان تک نہیں پہنچتی تھی اور وہ بے چارے درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہوگئے تھے۔ جب تاجروں کا کوئی قافلہ باہر سے مکے آتا اور محصورین میں سے کوئی شخص رقم لے کر اشیائے خورد ونوش خریدنے آتا تو دشمنِ خدا ابولہب تاجروں سے کہتا کہ محمدؐ کے مددگاروں کے لئے اپنی اجناس کی قیمتیں بڑھا دو تاکہ وہ تم سے کوئی چیز خرید نہ سکیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں انتہائی دولت مند اور اپنے وعدے کا پکا ہوں، میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں

۱۔ ابن ہشام، سیرت، ج۱، ص۳۷۸۔

کوئی نقصان نہیں ہونے دوں گا۔

ابولہب کی یہ باتیں سن کر تاجر اپنی اجناس کی قیمتیں اتنی بڑھا دیتے کہ وہ شخص خالی ہاتھ واپس جانے پر مجبور ہو جاتا۔ جب چھوٹے بچے کسی کو خالی ہاتھ واپس آتا دیکھتے تو ان بے چاروں کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ تاجروں کا جو سامان بکنے سے بچ جاتا ابولہب وہ معقول منافع دے کر ان سے خرید لیا کرتا اور تاجروں کو خسارے سے بچا لیتا تھا۔[1]

ہجرتِ مدینہ

حج کے موقع پر دور دراز سے قبائلِ عرب مکہ آتے تھے اور نبیٔ اکرمؐ ہر سال مختلف قبائل کے عمائدین سے ملاقات کر کے انہیں اپنی نصرت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک سال مدینے سے قبیلۂ خزرج کے کچھ افراد حج کے لئے مکہ آئے اور رسولِ اکرمؐ نے ان سے ملاقات فرمائی اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔

ان لوگوں نے علمائے یہود سے آخری رسول کے متعلق پیشین گوئیاں سنی ہوئی تھیں، جیسے ہی رسولِ اکرمؐ نے ان سے گفتگو کی تو انہیں یقین ہو گیا کہ جس نبی کی بشارت توراۃ میں دی گئی ہے وہ یہی نبی ہیں۔ چنانچہ وہ فوراً اسلام لے آئے اور پھر یہاں سے رخصت ہو کر مدینہ پہنچے تو انہوں نے مدینے میں اسلام کا پیغام پھیلایا اور یوں اسلام مدینے میں متعارف ہوا۔

پھر اگلے سال اہلِ مدینہ کا ایک اور گروہ حج پر آیا اور انہوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آنحضرتؐ نے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ہمراہ روانہ کیا تاکہ وہ انہیں اسلامی تعلیمات سکھائیں اور وہاں نمازِ جماعت کا اہتمام کریں۔

مصعبؓ کی شبانہ روز تبلیغ بڑی مؤثر ثابت ہوئی اور بہت سے افراد دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ پھر تیسرے سال مدینے سے ستر سے کچھ زیادہ افراد حج کے لئے مکہ آئے اور انہوں نے آپ کو مدینے آنے کی دعوت دی اور اس امر پر آپ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ اگر آپ ان کے ہاں تشریف لائیں گے تو وہ اسلامی حکومت قائم کریں گے۔ جب یہ گروہ واپس مدینے پہنچا تو انہوں نے مصعبؓ کے ساتھ نمازِ جماعت قائم کی اور یوں اسلام مدینے کا مذہب قرار پایا۔

رسولِ اکرمؐ نے مسلمانوں کو ہدایت دی کہ وہ خفیہ طریقے سے مکے سے ہجرت کر کے مدینے چلے

۱۔ احمد بن زینی دحلان مکی شافعی المتوفی ۱۳۰۴ھ، سیرت النبویہ، ج۲، ص۱۷۔

جائیں۔ چنانچہ مسلمان آہستہ آہستہ ہجرت کر کے مدینے جانے لگے۔ آخر میں حضرت رسولِ اکرمؐ، حضرت علیؑ، حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے چند مسلمان اپنے والدین کی مجبوری کی وجہ سے مکے میں رہ گئے۔

دوسری طرف جب قریش نے دیکھا کہ مسلمان مکے سے ہجرت کر کے دھڑا دھڑ مدینے میں جمع ہونے لگے ہیں اور مدینے میں اسلام روز بروز ترقی کر رہا ہے تو انہیں اس سے خطرہ محسوس ہوا۔ انہوں نے باہمی مشاورت کے بعد طے کیا کہ ہر قبیلے میں سے ایک ایک شخص محمدؐ کے قتل کے لئے جمع ہو جائے اور رات کے وقت انہیں قتل کر دیا جائے تا کہ اسلام مزید نہ پھیل سکے۔ اس وقت جبرئیل امینؑ نے آنحضرتؐ کو کفار کے ارادے سے باخبر کیا اور خدا کی طرف سے آپ کو ہجرت کا حکم پہنچایا تو رسولِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے ذمے چار کام لگائے:

(۱) آپ سفر کے لئے سواری کا بندوبست کریں گے۔

(۲) آپ شبِ ہجرت بسترِ رسولؐ پر سوئیں گے تا کہ کفار یہ سمجھتے رہیں کہ رسولِ اکرمؐ محوِ استراحت ہیں۔

(۳) ہجرت کے بعد قریش کی امانتیں ان کو واپس پہنچائیں گے۔

(۴) خانوادۂ رسالت کے افراد کو لے کر مدینے پہنچیں گے۔

اس کے بعد رسولِ اکرمؐ، حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر رات کی تاریکی میں مکے سے باہر نکلے اور غارِ ثور میں جا چھپے۔ حضرت علیؑ پوری رات بسترِ رسولؐ پر سوتے رہے۔ قریش جن میں ابولہب بھی شامل تھا تلواریں لے کر بیت النبیؐ کے باہر کھڑے رہے۔ آنحضرتؐ کے گھر کی ایک دیوار چھوٹی تھی۔ قاتلوں کا جتھہ ساری رات اس دیوار سے بسترِ رسولؐ پر نگاہ کئے کھڑا رہا اور انہوں نے آپس میں طے کیا تھا کہ جیسے ہی صبح طلوع ہوگی، گھر میں داخل ہو کر (نعوذباللہ) رسول اللہؐ کو قتل کر دیں گے۔

جیسے ہی پَو پھٹی اور بسترِ رسولؐ سے علیؑ کھڑے ہوئے تو انہیں پتا چلا کہ ساری رات وہ مغالطے میں رہے۔ پھر کیا تھا ہر طرف رسولِ اکرمؐ کی ڈھونڈ مچ گئی۔ کھوجی یہاں وہاں ڈھونڈتے ہوئے بالآخر غارِ ثور کے دہانے تک پہنچ گئے۔[۱] اس وقت حضرت ابوبکرؓ بہت گھبرائے مگر رسولِ اکرمؐ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ یعنی غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تلاشِ بسیار کے بعد قریش وہاں سے نامراد واپس چلے گئے۔ حضرت علیؑ نے رسولِ اکرمؐ کے لئے اونٹ خریدا۔[۲] عامر بن فہیرہ ایک اونٹ حضرت ابوبکرؓ کیلئے لے کر گیا۔ راستے کی رہنمائی کے لئے عبداللہ بن اریقط کا انتخاب ہوا۔ وہ بنی الدیل سے تھا اور غیر مسلم تھا۔[۳]

۱۔ ابن ہشام، سیرت، ج۲، ص۱۲۷۔

۲۔ علی بن حسین مسعودی، مروج الذہب، باب ذکر ھجرتہ

۳۔ محمد بن محمد شافعی اندلسی، عیون الاثر، ج۱، ص۱۸۴۔ علی بن حسین مسعودی، مروج الذہب، باب ذکر ھجرتہ، ج۲، ص۲۷۹۔

رسولِ اکرمؐ ان تین افراد کے ساتھ مکے سے قبا پہنچے۔ قبا مدینے سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ نے قبا میں قیام کیا اور حضرت علیؑ کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ حضرت علیؑ نے کفارِ قریش کی امانتیں ان کے سپرد کیں اور رسولِ مقبولؐ کے خاندان کی مستورات کو لے کر قبا پہنچے جہاں آنحضرتؐ ان کے منتظر تھے۔

آنحضرتؐ کی ہجرت کی خبر مدینے کے مسلمانوں کو مل چکی تھی اور وہ بڑی بے تابی سے آپ کی راہ دیکھ رہے تھے۔ وہ روزانہ کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ کر آپ کا راستا دیکھا کرتے تھے یہاں تک کہ سوموار کے دن ربیع الاول کی آٹھ یا بارہ تاریخ کو آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قبا سے مدینہ تشریف لائے۔

آپ کا اونٹ مدینے کے درمیان ایک زمین پر آ کر بیٹھ گیا۔ آنحضرتؐ نے اس زمین کو خریدا اور وہاں مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر میں اینٹیں اور گارا استعمال ہوا اور چھت پر کھجور کے شہتیر ڈال دیئے گئے اور مسجد کے آخر میں ایک چبوترا بنایا گیا جسے "جنحہ" کہا جاتا تھا اور بے سہارا مہاجرین وہاں آ کر رہنے لگے۔

مسجد کے پہلو میں ازواجِ پیغمبرؐ کے لئے کچے کمرے تعمیر کئے گئے۔ ہجرت کے سات ماہ بعد بی بی عائشہؓ کی رخصتی عمل میں آئی۔ پھر آپ نے اپنی بیٹی فاطمہؑ کا عقد علیؑ سے کیا اور اپنے مکان کے ساتھ ایک کمرہ اپنی بیٹی کے لئے بھی تعمیر کیا۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل

رسولِ اکرمؐ نے پہلے اسلامی معاشرے کی ابتدا اس طرح سے فرمائی کہ دو مہاجرین کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔ مثلاً آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ کا بھائی قرار دیا اور اس کے علاوہ آپ نے ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی قرار دیا۔ مثلاً آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو خارجہ بن زہیر انصاری اور حضرت عمر بن الخطابؓ کو عتبان بن مالک انصاری کا بھائی قرار دیا اور دونوں طرح کی مؤاخات کے وقت رسولِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو اپنا بھائی بنایا اور فرمایا: اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ. یعنی تو دنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے۔[1]

رسولِ اکرمؐ نے اپنے قائم کردہ چھوٹے سے اسلامی معاشرے کو دشمنوں سے بچانے کے لئے مدینے کے یہودی قبائل سے ایک معاہدہ کیا جسے میثاقِ مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے میں یہ طے کیا گیا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات خیر سگالی پر مبنی ہوں گے اور بیرونی حملے کی صورت میں دونوں گروہ اس شہر کا مشترکہ دفاع کریں گے۔

یہ معاہدہ مسلمانوں اور مدینے کے تین یہودی قبائل کے درمیان طے پایا تھا۔ یہودی قبیلہ بنی قینقاع

۱۔ محمد بن محمد شافعی اندلسی، (ابن سید الناس) عیون الاثر، ج۱، ص۲۰۰-۲۰۱ باب ذِکر المُؤاخاۃ.

تاجر پیشہ اور پرلے درجے کا سود خور تھا جبکہ بنی نضیر اور بنی قریظہ زراعت سے وابستہ تھے۔ اس معاہدے میں یہ شق بھی تھی کہ شہر مدینہ کی حکومت رسولِ اکرمؐ کے پاس ہوگی اور فیصلے کا حق آنحضرتؐ کو ہی حاصل ہوگا۔[1]

رسولِ اکرمؐ کو میثاقِ مدینہ کی وجہ سے اندرونی اطمینان نصیب ہوا تو آپ نے بے خانماں مہاجرین کی آبادکاری کی طرف توجہ فرمائی کیونکہ وہ سخت تنگدستی میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور وہ انصار کی امداد پر انحصار کئے ہوئے تھے۔ رسولِ اکرمؐ نے قریش کی تجارت کو روکنے کے لئے جنگجو افراد کا ایک دستہ تشکیل دیا۔ ایک مرتبہ اس دستے نے قریش کے ایک چھوٹے سے تجارتی قافلے پر تصرف حاصل کیا جس سے اچھا خاصا مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ آنحضرتؐ نے وہ مال تنگدست افراد میں تقسیم کر دیا۔

غزوۂ بدر

حالات اس نہج پر چلتے رہے پھر ہجرت کے دوسرے سال ماہِ رمضان میں آنحضرتؐ کو اطلاع ملی کہ کفارِ قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ شام سے مکے کی طرف رواں دواں ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ اس قافلے کا تعاقب کیا جائے۔ آپ تین سو تیرہ افراد کو ساتھ لے کر مدینے سے باہر نکل کر بدر کے قریب پہنچے۔ مقام بدر مدینے سے سات منزلوں کے فاصلے پر مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔ تجارتی قافلے کا سالار ابوسفیان تھا۔ اس کو پتا چل گیا کہ رسولِ اکرمؐ اس کے قافلے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اہلِ مکہ کی طرف پیغام بھیجا کہ اپنے قافلے کو بچانے کے لئے اقدام کرو اور وہ خود راستا بدل کر مسلمانوں کے حملے سے قافلے کو بچا کر لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔

قریش، رسولِ اکرمؐ کے مقابلے کے لئے ایک ہزار مسلح افراد کو لیکر مکے سے روانہ ہوئے اور اس لشکر میں کچھ بنی ہاشم کے افراد کو بھی مجبور کر کے اپنے ساتھ لائے جن میں رسولِ اکرمؐ کے چچا عباسؓ اور حضرت علیؑ کے بھائی طالب بھی شامل تھے۔ یہ دونوں افراد قریش کی سرزنش کی وجہ سے مجبور ہو کر لشکر میں شامل ہوئے تھے۔ راستے میں طالب تو کسی طرح سے اپنے آپ کو لشکر سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوگئے اور واپس مکہ آگئے۔

رسولِ اکرمؐ کو معلوم ہوگیا کہ تجارتی قافلہ ہاتھ سے نکل چکا ہے اور اس کی بجائے ایک ہزار مسلح افراد سے ٹکراؤ کا امکان پیدا ہوگیا ہے۔ آپ کے لشکر میں زیادہ تعداد انصارِ مدینہ کی تھی۔ انہوں نے آپ سے یہ معاہدہ کیا ہوا تھا کہ اگر کسی غنیم نے مدینے پر حملہ کیا تو وہ حضورِ اکرمؐ اور شہر مدینہ کا دفاع کریں گے۔ اب حالت بدل چکی تھی اور آپ انہیں جنگ کرنے کے لئے مدینے سے باہر بھی نہیں لائے تھے اس لئے آنحضرتؐ نے

۱۔ محمد بن محمد شافعی اندلسی (ابن سید الناس) عیون الاثر، ج ۱، ص ۱۹۷ باب ذکر الموادعة بین المسلمین والیهود.

ضرورت محسوس کی کہ انصار سے دوبارہ پوچھ لیا جائے کہ کیا وہ جنگ کرنے پر آمادہ بھی ہیں یا نہیں؟

چنانچہ آپ نے مجلسِ مشاورت طلب کی جس میں سارے لشکر نے شرکت کی اور آپ نے اس کو حالات سے آگاہ کیا اور پھر اس سے مشورہ مانگا کہ ان حالات میں کون سا لائحہ عمل اختیار کیا جائے اور صحابہ سے فرمایا کہ تم لوگ مجھے مشورہ دو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے رسولِ اکرمؐ سے کہا: یارسول اللہؐ! خدا کی قسم یہ قریش ہیں اور اس وقت وہ اپنی پوری قوت سے حملہ آور ہونے کے لئے مکے سے چل پڑے ہیں۔ خدا کی قسم! قریش قدرت وشوکت رکھنے والے لوگ ہیں۔ وہ آج تک ذلیل ورسوا نہیں ہوئے۔ خدا کی قسم! جس دن سے قریش نے کفر اختیار کیا ہے وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ خدا کی قسم! قریش اپنی قوت وشوکت سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے اور وہ پوری قوت سے آپ کے ساتھ جنگ کریں گے۔ لہٰذا آپ اپنے آپ کو جنگ کے لئے آمادہ کریں۔ ان دونوں کی حوصلہ شکن گفتگو سن کر رسولِ اکرمؐ نے ان سے رخ پھیر لیا۔[1]

ان دونوں کے بعد مقدادؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا: یارسول اللہؐ! آپ خدا کے حکم پر عمل کریں، ہم آپ کا مکمل ساتھ دیں گے اور بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہیں گے کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ. یعنی تم اور تمہارا رب جا کر جنگ کرو ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کی بجائے ہم کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں اور ہم ان سے جنگ کریں گے۔ اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے اگر آپ ساحلِ سمندر تک بھی جائیں گے تو ہم آپ کے ہمرکاب رہیں گے۔ رسولِ اکرمؐ نے انہیں دعائے خیر دی۔ آپ نے پھر صحابہ سے فرمایا: مجھے مشورہ دو اور اپنی رائے کا اظہار کرو۔

انصار سمجھ گئے کہ رسول اکرمؐ ان کا جواب سننے کے خواہش مند ہیں۔ سعد بن معاذ جو کہ انصار کے سرداروں میں سے ایک تھے، اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا: یارسول اللہؐ! معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمارے جواب کے منتظر ہیں۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: جی ہاں۔

سعد نے کہا: یارسول اللہؐ! میں انصار کے ترجمان کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ آپ شاید کسی کام کے قصد سے مدینے سے باہر تشریف لائے ہیں اور اب خدا کی طرف سے آپ کو کسی اور کام کا حکم ملا ہے۔ یارسول اللہؐ! ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، ہم نے آپ کی تصدیق کی ہے اور ہم نے آپ کے ساتھ فرمانبرداری کا عہد وپیمان کیا ہے۔ آپ کو جس کام کے متعلق خدا کا حکم ملا ہے آپ اسے بجالائیں۔ اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، اگر آپ ہمیں سمندر میں بھی داخل کریں گے تو ہم آپ کے ساتھ سمندر میں بھی داخل ہو جائیں گے۔ اگر ہمارا ایک فرد بھی باقی ہوگا تو وہ بھی آپ کے حکم کی تعمیل کرے گا۔ آپ جس سے چاہیں تعلق

۱۔ شیخین کی گفتگو سے رسولِ اکرمؐ کا رخ موڑنا صحیح مسلم کتاب الجهاد و السیر، باب غزوہ بدر میں مرقوم ہے۔

استوار کریں اور جس سے چاہیں تعلق منقطع کریں اور آپ کو جتنے مال کی خواہش ہو ہماری دولت سے لے لیں اور ہمارے پاس جو مال بچ رہے گا وہ ہمیں اس مال سے زیادہ عزیز نہ ہوگا جو آپ لیں گے....الخ۔

سعد کی گفتگو جیسے ہی تمام ہوئی رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: خدا کی برکت کے سہارے چلتے رہو۔ اس نے مجھے کامیابی کی بشارت دی ہے اور میں گویا کافروں کو قتل ہوتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے کفار کے ہونے والے مقتولین میں سے ایک ایک کے قتل ہونے کی جگہ کی نشاندہی کی۔[1] لشکرِ اسلام نے بدر کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ وہاں رسولِ اکرمؐ کے لئے ایک سائبان بنایا گیا اور صحابۂ کرامؓ اس کی حفاظت کرنے لگے۔ حضرت ابوبکرؓ لشکر سے ہٹ کر اس سائبان تلے آگئے اور جنگ کے خاتمے تک وہیں رہے۔[2]

لشکرِ قریش پورے کرّوفر کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور ماہِ رمضان کی سترہ تاریخ کو کفار اور مسلمانوں کے درمیان پہلی مشہور جنگ ہوئی جسے "جنگِ بدر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ رسولِ اکرمؐ کے لشکر میں سے حضرت علیؑ اور حضرت حمزہؓ نے کارہائے نمایاں انجام دیے اور انہوں نے کفار کے سربرآوردہ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا اور انصار کے بہادر سپاہیوں نے بھی تلوار کے خوب جوہر دکھائے اور بنی ہاشم کے جو افراد مجبوراً جنگ میں آئے تھے انہوں نے مشرکین کی مدد کے لئے بالکل جنگ نہ کی اور مسلمانوں کے خلاف تلوار نہ اٹھائی۔

یہ جنگ مسلمانوں کی کامیابی پر منتج ہوئی۔ مسلمانوں میں سے چودہ افراد شہید ہوئے جن میں سے چھ کا تعلق مہاجرین اور آٹھ کا انصار سے تھا جبکہ قریش کے ستر افراد مارے گئے اور ستر ہی قیدی بنائے گئے۔

مقتولین میں عتبہ، شیبہ اور حنظلہ بھی شامل تھے جن میں سے ایک ابوسفیان کی بیوی اور معاویہ کی ماں ہند کا باپ، ایک بھائی اور ایک بیٹا تھا۔ یہ تینوں حضرت علیؑ اور حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے تھے۔[3]

رسولِ اکرمؐ نے جنگِ بدر میں بنی ہاشم کے علاوہ چند دیگر افراد کے نام لے کر صحابۂ کرامؓ کو ہدایت کی تھی کہ وہ انہیں قتل نہ کریں کیونکہ ان افراد کو مجبوراً میدان میں گھسیٹا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے آنحضرتؐ کے قیامِ مکہ کے دوران اسلام اور رسولِ اکرمؐ کی کوئی نہ کوئی خدمت کی تھی جیسا کہ ابوالبختری نے قریش کے بائیکاٹ کی دستاویز ختم کرنے کے لئے اہم کردار ادا کیا تھا اور اسے پھاڑ ڈالا تھا۔ رسولِ اکرمؐ نے صحابۂ کرامؓ کو عباس کے متعلق خصوصی سفارش کی تھی کہ انہیں قتل نہ کیا جائے کیونکہ قریش انہیں زبردستی اپنے ساتھ لائے ہیں۔

۱۔ واقدی، مغازی، ج۱، ص۴۸، مطبوعہ آکسفرڈ۔ احمد بن علی شافعی مقریزی المتوفی ۸۴۵ھ، امتاع الاسماع، ج۱، ص۷۴۔

۲۔ ابن ہشام، سیرت، ج۲، ص۲۶۷۔

۳۔ ابن ہشام، سیرت، ج۲، ص۳۶۵۔

اس دوران ابوحذیفہ بن عتبہ نے کہا تھا: ہم اپنے آباء، بیٹوں، بھائیوں اور رشتہ داروں کو قتل کریں اور عباس کو قتل نہ کریں؟ خدا کی قسم! اگر میں نے اسے دیکھ لیا تو میں اس کے بدن میں اپنی تلوار بھونک کر رہوں گا۔

رسولِ اکرمؐ نے حضرت عمرؓ کی طرف رخ کر کے فرمایا: کیا یہ لوگ رسول کے چچا پر تلوار بلند کریں گے؟

حضرت عمرؓ نے کہا: یارسول اللہؐ! اگر اجازت ہو تو میں اپنی تلوار سے اس کی گردن اتار دوں۔ خدا کی قسم! اس نے اپنی منافقت کا اظہار کیا ہے۔[۱] آپ نے ان کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔

مالِ غنیمت کی تقسیم پر اختلاف

جنگِ بدر کے خاتمے پر جب قریش کو شکست ہوئی اور وہ بھاگنے لگے تو مسلمان فوج کے تین دستے بن گئے۔ ایک دستے نے بھاگتے ہوئے کافروں کا تعاقب کیا اور انہیں قتل کیا اور کچھ کو قید کیا۔ دوسرے دستے نے ان کے خیموں سے مالِ غنیمت لوٹا اور تیسرے دستے نے رسولِ اکرمؐ کے سائبان کی حفاظت کی کہ کہیں دشمن موقع پا کر رسولِ اکرمؐ پر حملہ نہ کردیں اور آپ کو کوئی گزند نہ پہنچائیں۔

جب جنگ ختم ہوگئی تو مالِ غنیمت کے متعلق مذکورہ تینوں دستوں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ جس دستے نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا اس نے دعویٰ کیا کہ سارے مالِ غنیمت پر ان کا حق ہے۔ دوسرے دستے نے کہا کہ اگر ہم دشمن کا تعاقب کر کے انہیں قتل اور قید نہ کرتے تو تم ہرگز مال جمع نہ کرسکتے اس لئے مالِ غنیمت پر ہمارا بھی حق بنتا ہے۔ تیسرے دستے نے کہا کہ ہم بھی دیکھ رہے تھے کہ دشمن کے مال کا کوئی محافظ موجود نہیں تھا۔ اگر ہم دشمن کا مال لوٹنا چاہتے تو بڑی آسانی سے لوٹ سکتے تھے لیکن ہمیں یہ اندیشہ ہوا کہ اگر دشمن نے دیکھ لیا کہ رسولِ اکرمؐ کا کوئی مددگار ان کے پاس موجود نہیں ہے تو وہ آپ کو شہید کرنے کے لئے آپ کی طرف چلے آتے اور اس کا نتیجہ انتہائی خطرناک نکلتا چنانچہ ہم نے مال پر جانِ رسولؐ کو مقدم رکھا اس لئے اس مال پر ہمارا بھی حق بنتا ہے۔

جب صحابۂ کرامؓ میں مالِ غنیمت پر اختلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال کی پہلی آیت نازل فرمائی جس میں تمام لوگوں کے دعویٰ کو مسترد کردیا اور حکمِ خداوندی میں کہا گیا کہ مالِ غنیمت کسی کی بھی ملکیت نہیں ہے۔ یہ مال بس اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے حکم جاری کیا کہ جس کے پاس جو بھی مالِ غنیمت ہے وہ اپنے پاس نہ رکھے بلکہ اسے حاضر کرے اور اس کے ساتھ آپ نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ وہ مالِ غنیمت کی جمع آوری کی نگرانی کرے۔ صحابۂ کرامؓ نے پورا مالِ غنیمت آنحضرتؐ کی خدمت میں جمع کرا دیا۔ رسولِ اکرمؐ اس مال کو اپنے ساتھ لے کر

۱۔ دیکھئے معجم البلدان میں مادہ "سیر" نیز ابن ہشام، سیرت، ج ۲، ص ۲۸۱۔

مدینے کی طرف روانہ ہوئے اور جب آپ مدینے کے قریب "سیر" کے مقام پر پہنچے تو آپ نے حکم دیا کہ مال غنیمت تمام مجاہدینِ بدر میں یکساں تقسیم کردیا جائے۔[1]

جزیرۂ عرب پر جنگِ بدر کے اثرات

جزیرۂ عرب کے قبائل میں سے مکے کے قبائلِ قریش انتہائی محترم اور دولت مند شمار کیے جاتے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں ان کی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے مدمقابل مسلمان جزیرۂ عرب کے غریب ترین افراد شمار کئے جاتے تھے۔ مسلمانوں کا ایک گروہ قریش کے مظالم سے بچنے کے لئے ہجرت کر کے حبشہ چلا گیا تھا اور ایک گروہ خاموشی سے مکے سے مدینے پہنچ گیا تھا۔ اسی غریب ترین گروہ کے تین سو تیرہ غیر مسلح افراد جو کہ ایک تجارتی قافلے کو ڈرانے دھمکانے کے لئے مدینے سے باہر نکلے تھے انہیں ایک ہزار مسلح افراد سے جنگ کرنا پڑی جبکہ اسلامی لشکر اور قریش کے لشکر میں قوت و اسلحے کے لحاظ سے زمین آسمان کا فرق تھا مگر اس کے باوجود قریش کے ستر افراد میدان میں قتل ہوئے اور ستر ہی گرفتار ہوئے۔ ان کے گھوڑے، اونٹ اور دیگر جنگی سامان مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور بقیۃ السیف جان بچا کر میدان سے بھاگ نکلے اور ذلت و خواری کے ساتھ مکے پہنچے۔

جنگ کے اس حیرت انگیز نتیجے کے سبب لوگ قریش کے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوگئے اور یوں اسلام کا شاندار مستقبل لوگوں کے سامنے نمایاں ہو کر آنے لگا۔

عبداللہ بن اُبَی مدینے کا ایک بااثر شخص تھا اور اہلِ مدینہ اسے اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس کے لئے تاجِ شاہی اور تختِ فروزاں کی تلاش جاری تھی کہ انہی دنوں اہلِ مدینہ کی ملاقات رسولِ اکرمؐ سے ہوئی اور وہ دولت ایمان سے مالامال ہوئے۔ پھر ان کی تعداد برابر بڑھتی رہی اور آخرکار رسولِ اکرمؐ مکے سے ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے۔

آپ کی آمد سے عبداللہ بن اُبَی کی یقینی بادشاہی خاک میں مل گئی اور اس کی تمناؤں کا خون ہوگیا۔ چنانچہ عبداللہ بن اُبَی، رسولِ اکرمؐ کو اپنا حریف تصور کرنے لگا۔ وہ دن رات آپ کی ناکامی کا انتظار کر رہا تھا لیکن جب بدر میں مسلمانوں کو کامیابی نصیب ہوئی تو اسے بھی مجبوراً اپنے دوستوں سمیت اسلام کے آگے گردن جھکانا پڑی۔

دوسری طرف مدینے کے یہودی قبائل تھے جو کہ مسلمانوں کو کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جنگِ بدر کے نتیجے نے انہیں بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا اور اسلام کی کامیابی سے انہیں اپنا اقتدار ڈگمگاتا ہوا دکھائی

۱۔ دیکھئے معجم البلدان مادہ "سیر"۔

دینے لگا۔ ویسے بھی یہودی بے بند و بار اور بے ہدف قسم کے معاشروں میں نشوونما پاتے ہیں۔ فاسد معاشرہ ہی ان کی سود خوری اور زر اندوزی کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ جب مدینے میں اسلام کے قدم مضبوط ہوئے تو وہاں سے انتشار اور طوائف الملوکی نے رَختِ سفر باندھا اور اوس وخزرج کے قبائل جو کہ طویل عرصے سے دست وگریباں چلے آرہے تھے — اور بنی قینقاع کے یہودی ساہوکار انہیں آپس میں لڑا کر ہتھیار کرائے پر چلایا کرتے تھے — اسلام کی برکت سے ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ چنانچہ اوس وخزرج کے اتحاد و اتفاق نے یہودی ساہوکاروں کو بے دست و پا کردیا۔ اب ان یہودیوں نے جنگِ بَدْر کے بعد اسلام کے خلاف سازشوں کا جال بنا اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے پر غور کرنا شروع کردیا۔

یہودی قبائل میں سے بنی قینقاع کچھ زیادہ ہی متکبر تھے۔ ابنِ ہشام رقم طراز ہیں:

رسولِ اکرمؐ نے انہیں بازارِ بنی قینقاع میں جمع کر کے فرمایا: اے گروہِ یہود! خدا سے ڈرو کہ کہیں تم پر قریش کی طرح سے افتاد نہ آپڑے۔ تم لوگ اسلام قبول کرلو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں اور میری نبوت کا تذکرہ تمہاری کتابوں میں موجود ہے اور اللہ نے تم سے میری نبوت کا میثاق لیا ہے۔

یہود نے کہا: اے محمدؐ! تو سمجھتا ہے کہ ہم بھی تیری قوم (قریش) کی طرح سے ہیں؟ تجھے اپنی اس کامیابی پر مغرور نہیں ہونا چاہئے کیونکہ تو نے ان لوگوں سے جنگ جیتی ہے جو جنگ کرنے کا فن ہی نہیں جانتے۔ خدا کی قسم! اگر ہم نے تجھ سے جنگ کی تو پھر تجھے پتا چل جائے گا کہ بس ہم ہی ہم ہیں۔ (یعنی اگر دنیا میں کوئی جاندار قوم ہے تو وہ صرف ہم ہی ہیں۔)

یہُود سے پہلی کشمکش

یہود اپنی چھیڑخانی میں مصروف رہے۔ بقولِ واقدی ایک انصاری کی بیوی ایک یہودی زرگر کی دکان پر گئی۔ وہاں کچھ یہودی جمع تھے جنہوں نے اس خاتون سے کہا کہ اپنے چہرے سے حجاب ہٹائے۔[1] خاتون نے ان کی بات ماننے سے انکار کردیا تو زرگر اٹھا اور اس نے پشت سے اس کا کپڑا کھینچ لیا جس سے اس خاتون کا تقدس مجروح ہوا۔ اس پر یہودی ہنسنے لگے۔ اس خاتون نے مسلمانوں کو اپنی مدد کے لئے پکارا تو ایک مسلمان نے بڑھ کر اس زرگر کو قتل کردیا۔ اس پر بنی قینقاع جمع ہوگئے اور انہوں نے بھی اس مسلمان کو قتل کردیا اور یوں انہوں نے اپنے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ پھر قلعہ بند ہو کر جنگ پر آمادہ ہوگئے۔

رسولِ اکرمؐ اپنی فوج کو لے کر وہاں گئے اور پورے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کیا۔ مسعودی

۱۔ مذکورہ خاتون کا انصاری کی بیوی ہونا واقدی سے منقول ہے۔

التنبیہ والاشراف میں لکھتے ہیں کہ یہ محاصرہ ۳ھ میں شوال کی پندرہ تاریخ سے شروع ہوا اور یکم ذی القعدہ تک جاری رہا۔ آخرکار انہیں اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی۔ ان کے سات سو جنگجو افراد کو اذرعاتِ شام کی طرف جلا وطن کر دیا گیا اور ان کا تمام مال بطورِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔

واضح رہے کہ بنی قینقاع زمین کے مالک نہیں تھے، وہ تاجر تھے اور جنگ کے ہتھیار اور زرگری سے وابستہ تھے۔ رسولِ اکرمؐ نے مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ (خمس) اپنے پاس رکھا اور باقی چار حصے مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے۔[۱]

جنگِ بدر کے بعد قریشِ مکہ ایک سال تک اپنے مقتولین کا سوگ مناتے رہے اور ان کے خون کا انتقام لینے کے لئے تیاری کرتے رہے۔ آخرکار ایک دن وہ بہت بڑا لشکر لے کر مدینے کی طرف چل پڑے۔

غزوۂ اُحُد

اُحد، مدینے سے باہر ایک میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کا نام ہے۔ کفارِ قریش تین ہزار جنگجو، تین ہزار اونٹ اور دو سو گھوڑے لے کر ابوسفیان کی قیادت میں بدھ ۱۲/شوال ۳ھ کو اُحد کے قریب خیمہ زن ہوئے۔ اس جنگ میں ابوسفیان اپنے ساتھ قریش کے دو بُت لات اور عُزّیٰ بھی لایا تھا۔ اس کے علاوہ قریش کے پندرہ سرداروں کی عورتیں بھی ابوسفیان کی بیوی ہند کے ساتھ لشکر میں موجود تھیں۔ یہ عورتیں دف بجا کر رجز پڑھتی تھیں اور لشکر کا حوصلہ بڑھاتی تھیں۔

رسولِ اکرمؐ نے مہاجرین اور انصار کی مجلسِ مشاورت طلب کی کہ آیا مدینے میں رہ کر اس لشکر کا بایں طور مقابلہ کیا جائے کہ جب کفار گھوڑوں پر سوار ہو کر مدینے کی گلیوں میں داخل ہوں تو ہمارے جوان گلیوں میں ان کا مقابلہ کریں اور عورتیں اور بچے چھتوں پر بیٹھ کر ان پر پتھر برسائیں یا پھر مدینے سے باہر نکل کر کھلے میدان میں ان سے جنگ کی جائے؟ فوجی نکتۂ نظر سے رسولِ اکرمؐ اس بات کے حامی تھے کہ جنگ مدینہ میں رہ کر ہی لڑی جائے کیونکہ کفار مدینے کی گلیوں سے واقف نہیں تھے اور انہیں شہر ہی میں رہ کر شدید نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔

آنحضرتؐ کے علاوہ عبداللہ بن اُبَیّ کا بھی یہی خیال تھا لیکن مسلمان جذبۂ جہاد سے سرشار تھے اور وہ چاہتے تھے کہ شہر سے باہر کھلے میدان میں مقابلہ کرنا چاہئے۔ رسولِ اکرمؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کی رائے بھی یہی تھی۔ جذباتی مسلمان کہنے لگے کہ اگر ہم شہر سے باہر نہ نکلے تو یہ ہماری شکست تصور کی جائے گی۔

رسولِ اکرمؐ نے جب مسلمانوں کا جوش و جذبہ دیکھا تو آپ نے ان کی رائے کو قبول کیا اور شہر سے

۱۔ واقدی، مغازی، ج۱، ص۱۷۶ تا ۱۸۰۔ ابن ہشام، سیرت، ج۲، ص۴۲۶ تا ۴۲۸۔

باہر نکل کر جنگ کرنے کا اعلان کیا کیونکہ آپ نے بلاحظہ فرمالیا تھا کہ جوانوں کو شہر میں رہنے کا حکم دینے سے ان کی جذباتِ شہادت کو ٹھیس پہنچے گی۔

رسولِ اکرمؐ ایک ہزار ساتھیوں کو لے کر مدینے سے روانہ ہوئے۔ ابتدا میں عبداللہ بن اُبَیْ بھی اپنے ساتھیوں سمیت اُس لشکر میں شریک تھا لیکن اُس نے اِس موقع پر کھل کر اپنی منافقت کا اظہار کیا اور کہا کہ محمدؐ نے میرا مشورہ نہیں مانا لہذا میں واپس جارہا ہوں۔ اُس کے ساتھ اُس کے قبیلے کے تین سو افراد بھی واپس چلے گئے۔ اُس کے جانے کے بعد لشکرِ اسلام میں سات سو افراد باقی رہ گئے۔ رسولِ اکرمؐ انہیں لے کر کوہِ اُحُد کے قریب پہنچے اور لشکرِ قریش کے سامنے صف بندی فرمائی۔ یہ جنگ ۱۵رشوال بروز ہفتہ شروع ہوئی اور اسی دن ختم ہوئی۔

رسولِ اکرمؐ نے مجاہدینِ اسلام کو کوہِ اُحُد کے سامنے کھڑا کیا، کوہِ اُحُد کے درّے پر آپ نے پچاس تیراندازوں کو متعین کیا اور عبداللہ بن جُبیر کو ان کا سالار مقرر فرمایا۔ آپ کی اس حکمتِ عملی کا مقصد یہ تھا کہ قریش کے جنگجو کہیں عقب سے حملہ آور نہ ہوں اور اگر بالفرض وہ پیچھے سے آنا بھی چاہیں تو تیرانداز انہیں اس راستے سے داخل نہ ہونے دیں۔

ابوسفیان نے دو سو گھڑ سوار دستے کی قیادت خالد بن ولید کے سپرد کی اور اپنا پرچم بنی عبدالدار کے جوانوں کے حوالے کیا۔ معاویہ کی ماں ہند دوسری عورتوں کے ساتھ لشکر کے پیچھے دف بجا کر سپاہیوں کے حوصلے بلند کر رہی تھی۔ جب وہ بنی عبدالدار کے جنگ آزماؤں اور پرچم داروں کے پاس پہنچی تو یہ رجز پڑھا:

وَیْهًا بَنِیْ عَبْدِالدَّار ، وَیْهًا حُمَاةَ الْأَدْبَار ، ضَرْبًا بِكُلِّ بَتَّار.

یعنی اے بنی عبدالدار کے جوانو! اے صف شکنو! اے پرچم بردارو! آگے بڑھو اور تیز دھار تلواروں سے دشمن پر کاری ضربیں لگاؤ۔

لشکرِ قریش میں ایک حبشی غلام وحشی بھی موجود تھا جو دُور سے چھوٹا نیزہ پھینکنے کا ماہر تھا۔ ہند نے اس سے کہا: اگر تو نے آج محمدؐ، علیؑ یا حمزہؑ میں سے کسی ایک کو بھی قتل کر دیا تو میں تجھے غلامی سے آزاد کردوں گی۔

وحشی نے کہا: میں محمدؐ اور علیؑ کو تو قتل نہیں کرسکتا کیونکہ محمدؐ کے اردگرد ہر وقت جاں نثاروں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے اور علیؑ ایک شیر کی طرح سے میدان میں حملہ کرتا ہے۔ اس کی نظر صرف سامنے والے دشمن پر ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ دائیں اور بائیں بھی نگاہ رکھتا ہے۔ البتہ میں حمزہؑ کو قتل کرسکتا ہوں کیونکہ جب وہ چیتے کی سی تیزی کے ساتھ دشمن کی طرف جھپٹتا ہے تو اپنے گرد و پیش پر نظر نہیں رکھتا۔

آغازِ جنگ

مشرکین کے پرچم دار طلحہ بن عثمان نے جسے "کبش الکتیبہ" یعنی سالارِ لشکر کہا جاتا تھا جنگ کا آغاز کیا اور لشکر کی صفوں سے باہر نکل کر پکارا: اے اصحابِ محمدؐ! تمہارا خیال ہے کہ تمہاری تلواروں سے خدا ہمیں جہنم میں بھیجتا ہے اور ہماری تلواروں سے خدا تمہیں جنت میں بھیجتا ہے تو کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو اپنی تلوار سے مجھے جہنم میں پہنچائے یا پھر میری تلوار سے جنت میں جائے؟

حضرت علیؑ اس کے مقابلے پر آئے اور فرمایا: خدا کی قسم! میں اس وقت تک تجھے نہیں چھوڑوں گا جب تک میری تلوار تجھے جہنم میں یا تیری تلوار مجھے جنت میں نہ پہنچا دے۔ پھر آپ نے اس پر حملہ کیا اور اس کا ایک پاؤں کٹ گیا۔ وہ زمین پر گرا اور اس کی تہہ ہٹ گئی جس سے وہ ننگا ہوگیا۔

پھر طلحہ نے حضرت علیؑ سے کہا: فرزندِ عم! تجھے خدا اور رشتہ داری کا واسطہ! مجھے چھوڑ دے۔

حضرت علیؑ نے اسے چھوڑ دیا اور رسولِ اکرمؐ نے اس وقت اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ جب حضرت علیؑ اپنی جگہ واپس آئے تو صحابہؓ نے ان سے پوچھا کہ آپ نے طلحہ کو کیوں چھوڑ دیا؟

آپ نے فرمایا: جب میرا ابنِ عم ننگا ہوچکا تھا اور اس نے مجھے رشتہ داری کا واسطہ دیا تو مجھے شرم آ گئی۔

پھر دونوں لشکروں میں باقاعدہ جنگ کا آغاز ہوگیا۔ حضرت علیؑ نے اس جنگ میں بڑی بے جگری کا مظاہرہ کیا اور قریش کے پرچم برداروں کو خاک و خون میں غلطاں کردیا اور جب ایک پرچم بردار قتل ہوتا تو دوسرا آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیتا اور یوں یکے بعد دیگرے کفار کے دس افراد قتل ہوئے۔ جب بنی عبدالدار کے دس پرچم بردار قتل ہوئے تو ان کے ایک غلام نے آگے بڑھ کر پرچم اٹھا لیا۔ حضرت علیؑ نے اسے بھی قتل کردیا۔ اس کے بعد قریش کا پرچم زمین پر گر گیا۔

جب لشکرِ قریش نے اپنے پرچم کو گرا ہوا دیکھا تو راہِ فرار اختیار کرتے ہی بنی۔ اس جنگ میں حضرت حمزہؓ اور حضرت ابودجانہ انصاریؓ نے بھی شجاعت کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ جب کفار میدان چھوڑ کر بھاگے تو مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور ان کے خیموں تک پہنچ گئے۔ لشکرِ کفار نے اپنی جان بچانے کے لئے خیموں کو چھوڑا اور کھلے میدان میں دوڑنے لگے۔ پھر کیا تھا، مسلمان ان کے خیموں پر ٹوٹ پڑے۔

جب تیرانداز دستے نے دیکھا کہ دوسرا دستہ مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہے اور جنگ ختم ہوچکی ہے تو ان میں سے چالیس افراد نے درّہ چھوڑ دیا اور وہ بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہوگئے۔ جب خالد بن ولید نے یہ منظر دیکھا تو وہ دو سو سواروں کو ساتھ لے کر درّے کی طرف سے حملہ آور ہوا

اور وہاں پر موجود عبداللہ بن جبیر اور ان کے چند ساتھیوں کو شہید کر کے مسلمانوں پر عقب سے حملہ کر دیا۔ اس وقت مسلمانوں کی صفیں ٹوٹ چکی تھیں اور وہ مختلف خیموں میں مالِ غنیمت لوٹ رہے تھے۔

مسلمان اس اچانک افتاد سے بوکھلا اٹھے اور اسی اثناء میں ایک قریشی نے اپنا پرچم زمین سے اٹھا کر بلند کر دیا۔ جب شکست خوردہ کفار نے اپنے عَلَم کو بلند ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ میدان میں واپس آ گئے اور یوں مسلمان دونوں طرف سے گھر گئے اور سخت جنگ شروع ہوگئی۔

اس وقت حبشی غلام وحشی کو موقع مل گیا۔ اس نے تاک کر حضرت حمزہؓ کو نیزہ مارا جس کی وجہ سے وہ سنبھل نہ سکے اور شہید ہوگئے۔ ان کے علاوہ لشکرِ اسلام میں سے بہت سے افراد شہید ہوئے۔

مشرکین نے چاروں طرف سے رسولِ اکرمؐ پر حملہ کیا۔ نسیبہ مازنیہ زخمیوں کو پانی پلانے کے لئے میدان میں موجود تھی۔ جب اس نے جنگ کا پانسہ پلٹتا ہوا دیکھا تو وہ رسولِ اکرمؐ کے دفاع میں مصروف ہوگئی اور اس جنگ میں اسے بہت سے زخم آئے۔[1]

یہ خبر مدینے پہنچی تو بہت سے انصارِ مدینہ گھروں سے نکل کر میدانِ کارزار میں آئے اور شہید ہوئے۔

اس دوران ایک مشرک نے رسولِ اکرمؐ کو پتھر مارا جس سے آپ کی پیشانی اور دندان مبارک زخمی ہوگئے۔ اس سے آپ کی ناک پر بھی چوٹ آئی اور آپ کے چہرۂ مبارک سے بھی خون بہنے لگا۔

قریش کے سورما نبیٔ اکرمؐ کو قتل کرنے کے لئے یکے بعد دیگرے آگے بڑھنے لگے۔ رسولِ اکرمؐ انہیں آتا ہوا دیکھتے تو علیؑ سے فرماتے: علیؑ! اس گروہ کو ہٹاؤ۔ اس وقت جبرئیلؑ نے رسولِ اکرمؐ سے کہا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! اِنَّ هٰذَا لَلْمُوَاسَاة. یعنی یارسول اللہ! فداکاری اور ایثار اسے کہا جاتا ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: آخر ایسا کیوں نہ ہو، عَلِيٌّ مِنِّيْ وَ اَنَا مِنْهُ. یعنی علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ تب جبرئیلؑ نے کہا: وَاَنَا مِنْكُمَا. یعنی میں آپ دونوں سے ہوں۔ اس موقع پر لوگوں نے ہاتف کی یہ ندا سنی: لَاسَيْفَ اِلَّا ذُوالْفَقَار! لَافَتٰى اِلَّا عَلِي. یعنی ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں اور علیؑ کے علاوہ کوئی جوانمرد نہیں۔

اس حملے میں ایک مشرک نے مصعبؓ کو جو آنحضرتؐ کے ہمشکل تھے شہید کر دیا اور چیخ کر کہا "میں

۱۔ زخمی شخص کو پیاس زیادہ لگتی ہے اس لئے نسیبہ خاتون زخمیوں کو پانی پلانے کے لئے فوج کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ زخمیوں کو پانی پلاتیں اور مقدور بھر ان کی مرہم پٹی بھی کرتی تھیں لیکن اس واقعے کو بنیاد بنا کر خواتین کو جنگ میں نہیں دھکیلا جا سکتا کیونکہ

(۱) جنگِ اُحد مدینے سے صرف ایک میل کے فاصلے پر لڑی گئی تھی۔

(۲) نسیبہ خاتون صرف زخمیوں کو پانی پلانے اور مرہم پٹی کے لئے آئی تھیں۔ جب انہوں نے رسولِ اکرمؐ کو دشمنوں میں گھرا ہوا دیکھا تو وہ رسولِ اکرمؐ کو بچانے کے لئے لڑائی میں شامل ہوئی تھیں اور رسولِ اکرمؐ کا دفاع ہر مسلمان مرد اور عورت پر واجب تھا۔

نے محمدؐ کو قتل کر دیا ہے۔" اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ مسلمان میدان جنگ سے بھاگ اٹھے۔

یعقوبی لکھتے ہیں کہ اس وقت علیؑ، طلحہ اور زبیر کے علاوہ رسول اکرمؐ کے پاس اور کوئی باقی نہ رہا۔

میدان سے بھاگے ہوئے مسلمان کوہ احد پر جمع ہوئے اور کہنے لگے کہ اے کاش! اس وقت کوئی مدینے جا کر عبداللہ ابن ابی سے درخواست کرتا کہ وہ ہمارے لئے قریش سے امان حاصل کرے۔

رسول اکرمؐ نے ایک گروہ کو فرار ہوتے ہوئے دیکھا تو آپؐ نے انہیں نام لے کر واپس بلایا چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ پلٹ آئے اور یوں محافظین رسولؐ کی تعداد پندرہ ہوگئی۔ پھر آنحضرتؐ کے محافظ آپ کو کوہ احد کی بلندی پر لے گئے۔ آپؐ زخمی تھے اور آپؐ کے چہرۂ اقدس سے خون بہہ رہا تھا۔ حضرت علیؑ اپنی سپر میں پانی بھر کر لائے اور انہوں نے رسول اکرمؐ کے زخموں کو صاف کیا۔

میدان جنگ مجاہدین اسلام سے خالی ہوگیا۔ ہند عورتوں کو ساتھ لے کر میدان میں آئی جہاں اس نے حضرت حمزہؓ اور دیگر شہداء کے لاشوں کی بے حرمتی کی۔ اس نے حضرت حمزہؓ کی لاش کا مُثلہ کیا یعنی ان کے ناک کان کاٹ لئے اور ان کا ہار بنا کر پہنا اور اپنا ہار اتار کر وحشی کو انعام میں دیدیا۔ ہند کے ساتھ باقی عورتوں نے بھی یہی کچھ کیا۔ پھر جوش انتقام میں ہند نے حضرت حمزہؓ کے شکم کو چاک کیا اور ان کا جگر نکال کر چبانے لگی لیکن اسے نگل نہ سکی۔ ابوسفیان بھی حضرت حمزہؓ کی لاش پر آیا اور ان کے چہرے پر اپنے نیزے کی انی چبھو کر بولا: "اس کا ذائقہ چکھ کہ تو نے اپنوں سے قطع رحمی کی تھی۔"

قبیلۂ احابیش کے سردار حلیس نے جو کہ قریش کا حلیف تھا، جب یہ منظر دیکھا تو پکار کر بولا: اے میرے قبیلے والو! دیکھو رئیس قریش اپنے ابن عم کی لاش کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔

ابوسفیان نے اس سے کہا: مجھ سے غلطی ہوگئی ہے اب تم اس کی پردہ پوشی کرو۔

اس وقت ابوسفیان نے چلا کر پوچھا: کیا محمدؐ زندہ ہیں؟

مسلمانوں نے جواب دیا: ہاں! وہ زندہ سلامت ہیں۔

پھر ابوسفیان نے اعل ھبل، اعل ھبل کہہ کر ہبل کی جے کا نعرہ لگایا۔

رسول اکرمؐ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: تم جواب میں کہو اللّٰہ اعلیٰ و اجل. اللہ بلند و برتر ہے۔

ابوسفیان پکارا: لَنَا الْعُزّٰی وَلاَ عُزّٰی لَکُمْ. ہمارے پاس عزیٰ ہے تمہارے پاس عزیٰ نہیں ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: تم جواباً کہو اَللّٰہُ مَوْلاَ نَا وَلاَ مَوْلاَ لَکُمْ. اللہ ہمارا مولا ہے تمہارا کوئی مولا نہیں۔

جنگ احد میں ۶۸ مسلمان شہید ہوئے۔ رسول اکرمؐ کے حکم کے مطابق ان تمام شہداء کو کوہ احد کے دامن میں دفن کر دیا گیا۔ شہداء کی تدفین کے بعد آنحضرتؐ اپنے زخمی ساتھیوں کو لیکر مدینہ واپس آ گئے۔

مختصر مُوازَنہ

اس جنگ میں حضرت علیؑ نے علمدارِ قریش طلحہ کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی ظرف کا مظاہرہ کیا جبکہ معاویہ کے باپ ابوسفیان اور اس کی ماں ہند نے حضرت حمزہؑ کے جسم کا مُثلہ کیا۔ صحابیہ نسیبہ نے وفاداری اور ایثار کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا جبکہ ہند نے انسان دشمنی کا بدترین مظاہرہ کیا۔

غزوۂ حمراء الاسد

قریش نے راستے میں باہمی مشورہ کیا اور کہا کہ ہم نے واپس آ کر غلطی کی ہے۔ ہم لشکرِ محمدؐ کو شکست دینے میں کامیاب ہو چکے تھے لیکن ہم مدینہ نہیں گئے جبکہ ہمیں مدینے جا کر محمدؐ کا خاتمہ کر دینا چاہئے تھا تاکہ ہم ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتے۔

اُحد سے واپسی کی پہلی رات ہی آنحضرتؐ کو لشکرِ کفار کے عزائم کا پتا چل گیا تھا۔ چنانچہ آپ نے جنگ کے اگلے روز حکم دیا کہ لشکرِ کفار کے تعاقب کے لئے نکلو اور آپ نے یہ وضاحت کر دی کہ تعاقب کے لئے صرف وہی افراد جائیں جو جنگ میں زخمی ہوئے ہیں۔ اس طرح آپ نے عملی طور پر جنگ میں پیٹھ دکھانے والے صحابہ کو سرزنش کی تھی۔ زخمی سپاہی یہ حکم سن کر اپنے گھروں سے نکلے اور انہوں نے مدینے سے آٹھ میل دور مقام ”حمراء الاسد“ تک سفر کیا۔ رسولِ اکرمؐ نے حمراء الاسد پر پڑاؤ ڈالا اور دو آدمیوں کو دشمن کے لشکر کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لئے روانہ کیا۔

بنی خزاعہ کا بنی ہاشم سے معاہدہ تھا، ان میں سے ایک شخص ابوسفیان کے پاس گیا اور اسے مسلمانوں کی شوکت سے خوفزدہ کیا اور کہا کہ مسلمان ایک بہت بڑا لشکر لے کر تمہارے تعاقب میں آ رہے ہیں لہٰذا تم مدینے جانے کا ارادہ ملتوی کر دو۔ ابوسفیان یہ خبر سن کر گھبرا گیا اور اس نے ایک شخص کو بھیجا کہ وہ محمد مصطفیٰؐ کو قریش کے تعاقب سے باز رکھے اور انہیں خوف زدہ کرے۔

رسولِ اکرمؐ نے تین دن تک حمراء الاسد میں قیام کیا اور جب آپ کو یقین ہو گیا کہ دشمن مکے کی طرف چلا گیا ہے تو آپ مدینے واپس تشریف لے آئے۔

پیش گفتار

غارِ حرا میں پہلی وحی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ کے نزول کے ساتھ ہی رسولِ اکرمؐ اسلام کی تبلیغ پر مامور ہوئے۔ آپ کو خلعتِ رسالت عطا ہوا تو امت کی ہدایت کے لئے قرآن اور سنت یعنی قرآن مجید کے ایک سو چودہ سورے نازل ہوتے رہے اور سنّتِ رسولؐ کے ہزارہا گوشے تیئیس سال کے عرصے میں وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہے۔ جس دن آپ مبعوث برسالت ہوئے اسی روز سے اسلام پر عمل درآمد شروع ہوگیا تھا جو الحمدللہ آج تک جاری ہے اور انشاء اللہ تاقیامِ قیامت جاری رہے گا۔

لوگوں تک اسلام پہنچانے کے لئے شیخِ مکہ حضرت ابوطالبؑ نے رسولِ اکرمؐ کی ہر طرح حمایت اور مدد کی۔ اسی طرح اسلام کی نشرواشاعت کے لئے امّ المومنین حضرت خدیجہؓ کی خدمات بھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ مردوں میں سب سے پہلے امام علیؑ اور عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ ایمان لائے۔ خطبۂ قاصعہ میں ہے کہ امام علیؑ نے بچپن ہی سے رسولِ اکرمؐ کی آغوشِ مبارک میں تعلیم و تربیت پائی۔ رسولِ اکرمؐ ان کو اپنے دستِ مبارک سے لقمے بنا بنا کر کھلایا کرتے اور اپنے جسمِ اطہر سے مس کیا کرتے تھے۔ خوشا نصیب کہ مولودِ کعبہ خوشبوئے نبوت سے اپنے مشامِ جاں کو معطّر کیا کرتے تھے۔ جب غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی تو وہاں بھی آپ موجود تھے۔

جب رسولِ اکرمؐ نے تبلیغِ اسلام کے لئے بنی ہاشم کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا اور اسلام کی سربلندی کے لئے ان سے مدد چاہی تو پورے مجمع میں سے صرف امام علیؑ نے ہی کھڑے ہوکر نصرت اسلام کے لئے رسولِ اکرمؐ کو اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ بعثت کے دسویں سال اسلام کے عظیم الشان محسن یعنی حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؓ وفات پاگئے چنانچہ رسولِ اکرمؐ نے اس سال کو "عامُ الحزن" یعنی غم کا سال قرار دیا۔ اس کے تین سال بعد رسولِ اکرمؐ نے مدینے ہجرت فرمائی۔ مدینے میں رہ کر رسولِ اکرمؐ حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؓ کو یاد کیا کرتے تھے اور جب کبھی آپ کوئی گوسفند ذبح کرتے تو حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کے ہاں اس کا

گوشت ضرور بھجواتے۔ حضرت ابوطالبؑ کے بعد ان کے فرزند امام علیؑ، رسول اکرمؐ کے خاص الخاص حامی اور مددگار بنے۔ جنگِ بدر میں امام علیؑ نے باقی تمام مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ تعداد میں مشرکینِ قریش کو قتل کیا اور انہیں قیدی بنایا۔ جنگِ اُحد میں جب تمام اصحاب، رسولِ اکرمؐ کو چھوڑ گئے تو اس وقت امام علیؑ ہی تھے جو اپنی شمشیرِ خارا شگاف لئے شمعِ رسالت کے گرد پروانہ وار جاں نثاری کا ثبوت دیتے رہے۔ امام علیؑ نے ہی جنگِ خندق میں قریش کے نامی گرامی پہلوان عمرو بن عبدِوُد کو قتل کیا جس کے بعد لشکرِ کفار بھاگ گیا تھا۔ جنگِ خیبر میں امام علیؑ نے ہی قلعۂ خیبر کو فتح کیا تھا۔ رسولِ اکرمؐ کے لئے امام علیؑ حضرت ابوطالبؑ کی یادگار اور جنابِ بتول عذرا فاطمہ زہراؑ حضرت خدیجہؑ کی یادگار تھیں۔ رسولِ اکرمؐ نے مدینے میں جناب فاطمہ زہراؑ کی شادی امام علیؑ سے کی اور اس مبارک شادی سے حسنین کریمینؑ پیدا ہوئے۔

جب آیۂ مُباہلہ فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَاجَآءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآئَنَا وَ اَبْنَآئَکُمْ وَ نِسَآئَنَا وَ نِسَآئَکُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ. یعنی علم آجانے کے بعد جو بھی آپ سے جھگڑا کرے تو آپ کہہ دیں کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ اور ہم اپنی عورتوں کو بلائیں اور تم اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنی جانوں کو اور تم اپنی جانوں کو بلاؤ۔ پھر ایک دوسرے کے لئے بددعا اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۶۱) نازل ہوئی تو رسولِ اکرمؐ نصاریٰ نجران سے مباہلے کے لئے علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ کو ساتھ لے کر میدان میں تشریف لائے۔

اور جب آیۂ تطہیر اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا. یعنی اے اہلبیتؑ! اللہ کا تو بس یہی ارادہ ہے کہ وہ تم سے ہر طرح کی ناپاکی دور رکھے اور تمہیں اس طرح پاک رکھے جو پاک رکھنے کا حق ہے۔ (سورۂ احزاب: آیت ۳۳) نازل ہوئی تو آپ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو اپنے زانوؤں پر اور حضرت فاطمہ زہراؑ کو اپنے سامنے اور امام علی مرتضیٰؑ کو اپنے پیچھے بٹھایا اور اپنی چادر ان سب پر کھینچ کر فرمایا: رَبِّ هٰؤُلَآءِ اَهْلُ بَیْتِیْ. یعنی اے پروردگار! یہ ہیں میرے اہلبیتؑ۔ اس لئے ان پانچ بزرگواروں کو پنجتن پاک اور اصحابِ کساء بھی کہا جاتا ہے۔

آیۂ تطہیر کے نزول کے بعد رسولِ اکرمؐ ہر نماز پنجگانہ کے وقت حضرت فاطمہؑ کے گھر کے دروازے پر جاتے تھے۔ حضرت فاطمہؑ کے گھر کا دروازہ مسجد نبوی ہی میں کھلتا تھا چنانچہ جب رسولِ اکرمؐ نماز کے لئے مسجد میں آتے تو آپ کی آمد سے پہلے مہاجرین و انصار کی صفیں وہاں موجود ہوتی تھیں۔ آپؐ اس وقت فرودگاہِ ملائکہ یعنی درِ بتول عذراؑ پر رک کر فرماتے: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَهْلَ الْبَیْتِ! اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ

اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا. اَلصَّلَاة، اَلصَّلَاة. یعنی اے اہلبیتؑ تم پر سلام ہو! پھر آیتِ تطہیر پڑھنے کے بعد فرماتے کہ نماز کا وقت ہے، نماز کا وقت ہے۔

اور جب آیۂ قربیٰ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى. یعنی اے رسولؐ! آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغِ رسالت کا کوئی صِلہ نہیں مانگتا، بجز اس کے کہ تم میرے اقرباء سے مودّت رکھو۔ (سورۂ شوریٰ: آیت ۲۳) نازل ہوئی تو علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ رسولِ اکرمؐ کے ذوی القربیٰ کے طور پر معروف ہوگئے۔

اور جب پیغمبرِ اکرمؐ پر آیۂ قربیٰ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ. یعنی قرابت داروں کو اس کا حق دو۔ (سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۲۶) نازل ہوئی تو سرکار رسالت مآبؐ نے حضرت فاطمہ زہراؑ کو فدک عنایت فرمایا۔

اور جب آیۂ بلّغ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ. یعنی اے رسولؐ! آپ اس حکم کو پہنچا دیجئے جو آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اس کے پیغام کو ہی نہیں پہنچایا۔ خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ بیشک اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۶۷) نازل ہوئی تو رسولِ اکرمؐ نے غدیرِ خُم میں امام علیؑ کا بازو پکڑ کر بلند کیا اور ارشاد فرمایا: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ. یعنی جس کا میں حاکم ہوں یہ علیؑ بھی اس کا حاکم ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے کھلے الفاظ میں امام علیؑ کو اپنا وصی اور جانشین قرار دیا۔ رسولِ اکرمؐ بیمار ہوئے اور سوموار کے دن آپ نے اپنا سر مبارک امام علیؑ کے سینے پر رکھا اور رفیقِ اعلیٰ سے جاملے۔ امام علیؑ نے چند اشخاص کو اپنے ساتھ شامل کیا اور آنحضرتؐ کے غسل و کفن میں مصروف ہوگئے۔ انصارِ مدینہ، سقیفۂ بنی ساعدہ میں سعد بن عبادہ کی بیعت کے لئے جمع ہوئے اور وہ اسے رسولِ اکرمؐ کا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ مہاجرینِ قریش کو جونہی اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی سقیفہ پہنچ گئے اور ان سے کہا: رسولِ اکرمؐ کا تعلق ہم قریش سے تھا اس لئے عرب قریش کے علاوہ کسی دوسرے خاندان کا خلیفہ برداشت نہیں کریں گے۔ قریشی مہاجرین نے انصار سے خوب بحث کی اور نتیجتاً حضرت ابوبکرؓ کی بیعت عمل میں آئی۔ قریشی مہاجرین کا خیال تھا کہ اگر بنی ہاشم میں سے کوئی خلیفہ بنایا گیا تو قیامت تک خلافت کسی دوسرے خاندان کو نہیں مل سکے گی اور انہوں نے ایک دوسرے سے کہا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو خلافت کو قریش میں اس طرح گردش دو کہ بنی ہاشم کے علاوہ قریش کا ہر خاندان اس سے مستفید ہوسکے۔ جس گروہ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی وہ انہیں لے کر رات گئے تک مدینے کی گلیوں میں

پھرتے رہے اور جو شخص بھی انہیں دکھائی دیتا اسے پکڑ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس لے آتے اور اس سے بیعت لیتے۔ منگل کا سارا دن اسی طرح گزرا۔ بدھ کے دن وہ لوگ حضرت ابوبکرؓ کو لے کر مسجد میں آئے اور انہیں منبرِ رسولؐ پر بٹھا دیا اور ایک بار پھر ان کی بیعت کی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے امت سے خطاب کیا اور اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے نمازِ جماعت پڑھائی۔ اس تمام عرصے میں امام علیؑ کے ساتھ چند لوگ رسولِ اکرمؐ کی تجہیز و تکفین میں مصروف رہے۔ خاندانِ بنی ہاشم کے سوگوار افراد خانۂ پیغمبرؐ کے اردگرد ہی رہے اور غسل و کفن کے بعد انہوں نے خدا کے آخری رسول کی نمازِ جنازہ ادا کی۔ بنی ہاشم کے بعد باقی مسلمان سوموار اور منگل کا پورا دن آنحضرتؐ کے حجرے میں آ کر انفرادی نماز جنازہ ادا کرتے رہے۔ منگل کی شام تک یہ سلسلہ مکمل ہوگیا تو بدھ کی شب امام علیؑ نے چند دوستوں کی مدد سے آنحضرتؐ کو سپردِ خاک کردیا۔ سوموار اور منگل کے دو دن حضرت ابوبکرؓ کے حامی کسی نہ کسی طرح سے ان کی بیعت کو مستحکم بنانے کے لئے سرگرم رہے یہاں تک کہ بیعت انجام پذیر ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ خلیفۃ المسلمین بن گئے۔

اسی بیعت سے حضرت عمرؓ خلیفہ بنے۔

اسی بیعت سے حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے۔

اسی بیعت سے معاویہ بن ابی سفیان خلیفہ بنا۔

اسی بیعت سے یزید بن معاویہ بن ابی سفیان خلیفہ بنا۔

اسی بیعت سے بنو امیہ اور بنو عباس اور عثمانی خلیفہ بنے۔

حضرت ابوبکرؓ نے جو کام انجام دیئے وہ اسی بیعت کی وجہ سے انجام دیئے۔ بنو امیہ اور حضرت عثمانؓ نے نیز معاویہ اور یزید نے جو کچھ کیا وہ اسی بیعت کے بل بوتے پر کیا۔ اسلام میں جو کچھ ہو رہا ہے اور امام مہدی مِن آلِ محمدؐ کے ظہور تک جو کچھ ہوتا رہے گا سب کی بنیاد یہی "بیعت" ہے۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ خلافتِ راشدہ کی سیاست نے رسول اللہؐ کی سنت پر کیا کیا اثرات مرتب کئے۔

خلافتِ راشدہ میں سُنّتِ رسولؐ

سُنّتِ رسولؐ — عہدِ ابوبکرؓ میں

حضرت ابوبکرؓ، وفاتِ رسولؐ کے بعد ربیع الاول ۱۱ھ میں خلیفہ بنے اور جمادی الثانی ۱۳ھ کو ان کی وفات ہوئی اور یوں ان کی مدتِ خلافت لگ بھگ دو سال اور ڈھائی ماہ ہے۔

حضرت ابوبکرؓ قریش کی حمایت سے برسرِ اقتدار آئے تھے مگر بنی ہاشم نے ان کی حمایت نہیں کی تھی۔ بنی ہاشم کے علاوہ قبائلِ انصار کے کچھ افراد اور بیرونِ مدینہ کے کچھ عرب قبائل بھی آپ کے مخالفین میں شامل تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرنے والے قریشی مہاجر تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ خلیفہ کا تعلق بنی ہاشم کے علاوہ قریش کی کسی اور شاخ سے ہو۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ مہاجرین نے انصار سے کہا تھا: رسولِ اکرمؐ کا تعلق قریش سے تھا اور عرب اس بات پر راضی نہیں ہوں گے کہ ان کا خلیفہ قریش کے علاوہ کسی اور قبیلے سے ہو۔ سقیفہ میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہ خلافت کے لئے قریش کے امیدوار تھے۔ سقیفہ کے اجلاس میں امام علیؑ اور عباسؓ کا نام نہیں لیا گیا اور ابوبکرؓ کو قریشی ہونے کی بنا پر منتخب کیا گیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں ابن عباس سے ایک مرتبہ کہا تھا: ابن عباس! تم رسولِ اکرمؐ کے ابن عم ہو۔ تمہارے قبیلے کو کس چیز نے تم سے باز رکھا؟ یعنی اگرچہ تم بھی قریش سے ہو مگر تمہاری قوم نے تم میں سے خلیفہ کیوں منتخب نہیں کیا؟

ابن عباس نے کہا: میں نہیں جانتا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: میں جانتا ہوں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تم (بنی ہاشم) ان پر حکومت کرو۔

ابن عباس نے کہا: آخر ایسا کیوں ہے جبکہ ہم تو ان سے بھلائی اور نیکی کرنے والے لوگ ہیں؟

حضرت عمرؓ نے کہا: اے خدا معاف کرنا! قریش نے اس بات کو ناپسند کیا کہ نبوت اور خلافت دونوں ایک خاندان میں جمع ہو جائیں اور یہ چیز تمہارے لئے فخر و مباہات کا سبب بن جائے۔ شاید تم کہو کہ یہ کام تو ابوبکرؓ نے کیا تھا۔ نہیں بخدا! جو امر ابوبکرؓ کے ہاتھ میں پہنچا تھا اسے انہوں نے بڑی عقل مندی سے انجام دیا تھا۔[۱]

دوسری روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے ابن عباس سے یوں کہا تھا: ابن عباس! تمہیں معلوم ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے بعد کس چیز نے تمہاری قوم کو تم سے باز رکھا تھا؟

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا تھا لہٰذا میں نے کہا: اگر مجھے اس کا جواب نہیں معلوم تو امیر المومنین (عمرؓ) مجھے اس سے آگاہ کریں گے۔

حضرت عمرؓ نے کہا: انہیں یہ بات پسند نہ تھی کہ نبوت اور خلافت تمہارے خاندان میں جمع ہو جائے اور اس طرح تم اپنے قبیلے پر فخر کرنے لگو۔ اس لئے قریش نے اپنے لئے خلیفہ منتخب کیا اور اس انتخاب میں وہ صحیح راستے پر چلے اور کامیاب ہوئے۔

ابن عباسؓ نے کہا: امیر المومنین! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں کچھ کہوں۔

حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں تم بات کرو۔

ابن عباسؓ نے کہا: امیر المومنین! آپ نے کہا کہ قریش نے اپنے لئے خلیفہ کا چناؤ کیا اور اس چناؤ میں وہ صحیح راستے پر چلے اور کامیاب ہوئے (اس کا جواب یہ ہے) اگر قریش اسے منتخب کرتے جسے خدا نے اس کام کے لئے منتخب کیا تھا تو اس صورت میں ہم کہہ سکتے تھے کہ وہ صحیح راستے پر چلے اور کامیاب ہوئے ہیں۔ قریش اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور خلافت جمع ہو جائیں جبکہ اللہ نے ناپسند کرنے والی قوم کے متعلق فرمایا ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ. یعنی جب انہوں نے خدا کے نازل کردہ احکام کو برا سمجھا تو خدا نے بھی ان کے اعمال ضائع کر دیئے۔ (سورۂ محمد: آیت ۹)

حضرت عمرؓ نے کہا: افسوس ہے ابن عباس! واللہ تمہاری باتیں مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں مگر میں ان کی تصدیق کرنا پسند نہیں کرتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ہاں تمہارا مقام کم ہو جائے۔

ابن عباسؓ نے کہا: امیر المومنین! وہ کیا باتیں ہیں؟ اگر (بالفرض) وہ باتیں صحیح ہیں تو سچی باتوں سے میری منزلت میں کمی نہیں آنی چاہئے اور اگر وہ باتیں غلط ہیں تو مجھ جیسا شخص اپنے سے باطل کو دور کر سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کہتے پھرتے ہو کہ "لوگوں نے مارے ظلم و حسد کے خلافت

۱۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک، ج ۵، ص ۲۷۶۸، مطبوعہ یورپ۔

کو ہم سے دور کردیا۔"

میں نے کہا: امیرالمومنین! ہم پر ہونے والے ظلم سے ہر عاقل اور غیر عاقل خوب اچھی طرح سے واقف ہے اور جہاں تک ہم سے حسَد کا تعلق ہے تو ابلیس نے بھی حضرت آدمؑ سے حسد کیا تھا اور ہم محسود (آدمؑ) کی اولاد ہیں۔

حضرت عمرؓ نے کہا: افسوس! اے بنی ہاشم! تمہارے دل حسَد، بغض اور کینہ سے بھرے ہوئے ہیں، ان سے حسَد، بُغض اور کِینہ دور نہیں کیا جاسکتا۔

میں نے کہا: امیرالمومنین! جن دلوں سے اللہ نے ہر طرح کی ناپاکی کو دور رکھا ہے، آپ ان کے متعلق یہ نہ کہیں کہ وہ حَسَد، بُغض اور کِینہ سے بھرے ہوئے ہیں کیونکہ رسولِ اکرمؐ کے دل کا تعلق بھی ہم بنوہاشم سے تھا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: اب چلے جاؤ۔

میں نے کہا: میں جارہا ہوں۔

جب میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو وہ مجھ سے شرمسار ہوئے اور کہا: اے ابن عباسؓ بیٹھ جاؤ۔ خدا کی قسم! میں تمہارے حق کا خیال رکھتا ہوں اور جو چیز تمہاری خوشی کا سبب بنے اسے دوست رکھتا ہوں۔

میں نے کہا: اے امیرالمومنین! میں آپ پر اور ہر مسلمان پر حق رکھتا ہوں (کیونکہ میں آنحضرتؐ کا ابن عم ہوں) اور جو شخص اس حق کا لحاظ رکھے وہ سیدھے راستے پر ہے اور جس نے اسے ضائع کیا گویا اس نے خود اپنے مقدّر پر ٹھوکر ماری ہے۔

اس گفتگو کے بعد عمرؓ اٹھ کر چل دیئے۔[1]

حضرت عمرؓ کے قتل کے بعد مجلسِ شوریٰ کے بارے میں امام علیؑ نے فرمایا تھا: لوگ قریش کو دیکھتے ہیں اور ان کے کاموں کے منتظر رہتے ہیں۔ قبیلۂ قریش اپنے معاملات پر توجہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر خلافت بنی ہاشم میں چلی گئی تو ان کے گھر سے کبھی نہ نکلے گی اور جب خلافت بنی ہاشم کے علاوہ قریش کے دوسرے قبیلے میں ہوگی تو وہ قریش کے تمام قبائل میں گردش کرے گی اور سب تک پہنچ جائے گی۔[2]

اس گفتگو کا ماحصل

مذکورہ تینوں افراد (علیؑ، عمرؓ اور ابن عباسؓ) واقعے کے عینی گواہ تھے جبکہ ان میں سے دو افراد تو دو مخالف جماعتوں (قریش اور بنی ہاشم) کے رہنما تھے جبکہ حضرت عمرؓ سقیفہ کے ہیرو تھے اور حوادثِ مذکور کی حقیقت

۱و۲۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک، ج۵، ص۲۷۷۰ و ۲۷۸۷، مطبوعہ یورپ۔

کو بھلا ان سے بہتر اور کون جان سکتا ہے؟

اس گفتگو سے حضرت عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ وہ ابن عباسؓ کو بنی ہاشم کا کمسن نوجوان سمجھتے تھے اور اس طرح کی گفتگو سے وہ ابن عباسؓ کو جذباتی کر دینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ابن عباسؓ جذبات کی رو میں بہہ کر بنی ہاشم کے اندرونی راز ان کے سامنے اگل دیں گے اس لئے وہ بار بار ابن عباس سے یہ کہتے ہیں:

تمہاری قوم اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ تمہارے خاندان میں نبوت اور خلافت دونوں جمع ہو جائیں اور یوں تم اپنی قوم کے مقابلے میں فخر و مباہات کرنے لگ جاؤ۔ اسی لئے قریش نے اپنے لئے خلیفہ کا انتخاب کیا اور وہ اپنے کام میں کامیاب بھی ہو گئے۔

ابن عباسؓ نے پہلے پہل تو خلیفہ سے بات کرنے کی اجازت طلب کی اور کہا کہ میں اس شرط پر کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یہ بات سن کر ناراض نہ ہوں گے۔ جب خلیفہ نے وعدہ کرلیا اور انہیں اجازت دے دی تو انہوں نے کہا کہ اگر قریش خلافت کے لئے اس کا انتخاب کرتے جسے خدا نے اس کام کے لئے چنا تھا تو پھر ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے امور میں کامیاب ہوئے ہیں۔ البتہ آپ نے جو یہ کہا کہ قریش ایک خاندان میں نبوت و امامت کا ہونا پسند نہیں کرتے تو ان کی پسند و ناپسند کسی چیز کے حق ہونے کا معیار نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”انہوں نے خدا کے نازل کردہ احکام کو برا سمجھا تو خدا نے بھی ان کے اعمال ضائع کر دیئے۔“

پھر حضرت عمرؓ نے کہا: مجھے تمہارے متعلق معلوم ہوا ہے کہ تم لوگوں سے یہ کہتے پھرتے ہو کہ ”لوگوں نے ہم پر ظلم کیا اور ہم سے حسد کیا ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ہمیں خلافت سے علیحدہ رکھا ہے۔“

ابن عباسؓ نے بھی اس بات کا بڑا خوبصورت جواب دیتے ہوئے کہا: جہاں تک ظلم کی بات ہے تو ہر دانا اور نادان اس سے بخوبی واقف ہے یعنی ایں راز است کہ معلوم عوام است۔ حسد کا جہاں تک تعلق ہے تو ابلیس نے بھی حضرت آدمؑ پر حسد کیا تھا اور ہم بھی حسد کا شکار ہونے والے حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں اسی لئے اگر لوگوں نے ہم سے حسد کیا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔

اس گفتگو میں تینوں افراد نے اس نکتے پر اتفاق کیا ہے کہ خلافت کے معاملے میں جو کچھ بھی ہوا وہ قریش کی آشیرباد سے ہوا ہے۔ قریش کی ایک شخصیت حضرت عمرؓ نے اس کی توجیہ یہ پیش کی ہے کہ قریش ایک خاندان میں نبوت اور خلافت کو اکٹھا دیکھنا پسند نہیں کرتے اور انہیں یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی کہ بنی ہاشم خلافت و نبوت کی وجہ سے فخر و مباہات کریں۔

امام علیؑ نے اس میں اس نکتے کا اضافہ کرتے ہوئے فرمایا: قریش کو آج تک یہ فکر ستائے ہوئے ہے

کہ اگر بنی ہاشم میں خلافت چلی گئی تو پھر قریش کے دیگر قبائل میں خلافت کبھی نہیں جاسکے گی جبکہ قریش کی خواہش یہ ہے کہ خلافت کو بنی ہاشم کے علاوہ دوسری شاخوں میں پھیرتے رہیں تاکہ قریش کی ہر شاخ اس عہدے سے مستفید ہوسکے۔ اسی لئے انہوں نے بنی ہاشم کو آج تک خلافت سے محروم رکھا ہے۔

ابن عباسؓ نے اس سلسلے میں اپنا موقف یہ بیان کیا کہ قریش نے بنی ہاشم سے حسد کیا ہے اور انہوں نے بنی ہاشم کو خلافت سے دور رکھ کر ان پر ظلم کیا ہے اور مزید یہ کہ خلافت کو خدا نے جہاں رکھا تھا، قریش نے اسے اس کے مرکز سے ہٹا دیا ہے۔ ابن عباسؓ کی دلیل اتنی وزنی تھی کہ حضرت عمرؓ سے اس کا جواب نہ بن پڑا اور وہ غصے کا اظہار کرنے لگے۔

اس بیان سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ پہلے تین خلفاء کے دور میں پالیسی یہ رہی کہ بنی ہاشم کے علاوہ قریش کے باقی خاندانوں میں خلافت کو گردش دی جائے اور اس سیاست کا اجراء اس طرح سے کیا گیا کہ قبیلہ تیم سے حضرت ابوبکرؓ کو منتخب کیا گیا اور بنی عدی سے حضرت عمرؓ کو چنا گیا اور بنی امیہ سے حضرت عثمانؓ کو منتخب کیا گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے حامی افراد کی یہ رائے تھی اور یہ تھا ان کا نتیجہ۔ اب آیئے دیکھیں ان کی رائے سے اختلاف رکھنے والے کون تھے اور ان کا انجام کیا ہوا۔

مخالفینِ بیعتِ ابوبکرؓ کا انجام

مسلمانوں کے تین گروہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے اختلاف کیا تھا۔ ان میں سے دو گروہوں کا تعلق مدینے سے تھا۔ ایک گروہ انصارِ مدینہ کا، دوسرا گروہ بنی ہاشم کا اور تیسرا گروہ مدینے سے باہر رہنے والے اَعراب کا تھا۔ اب ان تینوں گروہوں کا انجام ملاحظہ فرمائیں:

(الف) رسول اکرمؐ کی وفات کے فوراً بعد انصارِ مدینہ آنحضرتؐ کی تجہیز و تدفین چھوڑ کر سقیفۂ بنی ساعدہ میں خلافت کے لئے جمع ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ خلافت کا منصب انہیں حاصل ہو۔ ان کی حرصِ اقتدار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمیشہ کے لئے خلافت سے محروم کردیا۔ سقیفۂ بنی ساعدہ میں اپنے طلب کردہ اجتماع میں انہوں نے قریش سے شکست کھائی اور قریش کے خلفاء کی پالیسیوں نے انہیں سیاست کے میدان سے ہمیشہ کے لئے نکال دیا۔

(ب) بنی ہاشم کی طرف سے خلافت کے امیدوار وہی علی ابن ابی طالبؑ تھے جنہیں رسولِ اکرمؐ نے اپنا وصی مقرر کیا تھا۔ رسولِ اکرمؐ کی تدفین کے بعد امام علیؑ اپنے گھر میں گئے۔ امام علیؑ کا گھر وہی فاطمہ زہراؑ کا

گھر تھا۔ اسی لئے مورخین اس گھر کو "بیت فاطمہؑ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جس طرح خانوادۂ رسالت کے حجرے ازواج کے نام سے موسوم تھے مثلاً کہا جاتا تھا کہ یہ حجرۂ عائشہؓ ہے، یہ حجرۂ ام سلمہؓ ہے وغیرہ۔

چنانچہ ہم بھی یہاں مورخین کی پیروی کرتے ہوئے امام علیؑ کے گھر کو "بیتِ فاطمہؑ" ہی کہیں گے۔

بنی ہاشم اور ان کے علاوہ وہ لوگ جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی، آستانِ ملک پاسبان میں امام علیؑ کے پاس جمع ہوئے اور بیعت کے متعلق گفتگو کی۔[1]

ابوبکر جوہری لکھتے ہیں کہ:

اس زمانے میں امام علیؑ رات کے وقت حضرت فاطمہ زہراؑ کو گدھے پر سوار کرا کے انصار کے دروازوں پر تشریف لے جاتے تھے۔ (شیعہ روایات میں مذکور ہے کہ امام علیؑ رات کے وقت حسنینؑ کو اپنے ساتھ لیکر جاتے تھے اور بچوں کے ہاتھ آپ کے ہاتھ میں ہوتے تھے)۔ امام علیؑ انصار سے اپنی خلافت کے لئے مدد مانگتے تھے اور ان کے ساتھ حضرت فاطمہؑ بھی (اس کام کے لئے) تعاون طلب کرتی تھیں۔

اس کے جواب میں انصار کہتے: "اے بنتِ رسولؐ! ہم اُس شخص کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر رسول اللہؐ کے ابن عم پہلے آتے اور ہم سے بیعت کا مطالبہ کرتے تو ہم ان کے سوا ہرگز کسی اور کی بیعت نہ کرتے۔"

امام علیؑ ان کے جواب میں کہتے: "تو کیا میں رسول اکرمؐ کے جنازے کو ان کے گھر میں یونہی چھوڑ دیتا۔ انہیں غسل نہ دیتا، کفن نہ پہناتا، جنازہ نہ پڑھتا، دفن نہ کرتا؟ کیا میں یہ کام چھوڑ کر خلافت کے لئے لوگوں سے جھگڑنے لگ جاتا؟"

حضرت فاطمہؑ فرماتیں: "ابوالحسنؑ نے وہی کچھ کیا جو انہیں زیب دیتا تھا اور دوسروں نے جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ ان سے اس کا حساب لے گا۔[2]

خلافت انتظامیہ نے بنی ہاشم میں تفریق پیدا کرنے کے لئے عمّ رسولؐ حضرت عباس کے گھر کا رخ کیا اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عباس سے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ خلافت میں تمہیں بھی حصہ دیا جائے۔ حضرت عباس نے نفی میں جواب دیا چنانچہ نمائندگان خلافت وہاں سے ناامید ہو کر واپس آئے۔

ارکانِ حکومت نے محسوس کیا کہ جب تک بیتِ فاطمہؑ سے ان کی مخالفت جاری رہے گی اس وقت تک حکومت مستحکم نہیں ہوگی۔ چنانچہ اس گھر پر حملہ کیا گیا جہاں جبرئیلِ امینؑ وحی لایا کرتے تھے۔ یہ کام عمرؓ اور دوسرے قریشی صحابہ کی سرکردگی میں انجام دیا گیا۔ جس دروازے پر رسولِ اکرمؐ روزانہ پانچ مرتبہ آ کر سلام کرتے اور پھر

۱۔ سقیفہ کی تفصیلات مؤلف کی کتاب "عبداللہ بن سبا"، جلد اول اور معالم المدرستین میں دیکھئے۔

۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، مطبوعہ مصر، درضمن خطبہ ۶۶، ج ۶، ص ۱۳ در حالات یوم السقیفہ۔

نماز پڑھایا کرتے تھے، اربابِ سقیفہ نے اسی مقدس گھر کے دروازے کو آگ لگا دی۔

رسولِ اکرمؐ جس گھر کی اتنی تعظیم وتکریم کیا کرتے تھے، ان کے صحابہ نے اسی گھر کو آگ لگائی...اور پھر بیتِ فاطمہؑ میں داخل ہوگئے۔ امام علیؑ کو وہاں سے پکڑ کر زبردستی مسجد میں لایا گیا۔ امام علیؑ نے مسجد میں اپنے حق کے اثبات کے لئے دلائل دیئے۔

امام علیؑ کے دلائل سن کر انصار نے کہا: یا علیؑ! اگر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے سے پہلے انصار آپ کی یہ گفتگو سن لیتے تو ان میں سے دو شخص بھی آپ کی بیعت سے پیچھے نہ رہتے لیکن اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے اور اب وہ بیعت کر چکے ہیں۔[1] امام علیؑ نے وہاں بیعت نہ کی اور ارکانِ خلافت نے بھی آپ سے زیادہ تعرض نہ کیا۔ اس کے بعد امام علیؑ گھر واپس آگئے۔

اس واقعے کے بعد اہلِ اقتدار نے آلِ محمدؐ کے خلاف شدید اقتصادی جنگ شروع کردی اور ان کو اقتصادی طور پر مفلوج کرنے کے لئے خمس میں سے ان کا حق ختم کردیا گیا باوجودیکہ ان پر زکوٰۃ حرام تھی۔ خمس سے محرومی کے بعد اربابِ اقتدار نے بنتِ رسولؐ کو باپ کی میراث سے محروم کردیا۔ رسولِ اکرمؐ نے اپنی صاحبزادی کو ''فدک'' ہبہ کیا تھا لیکن لوگوں نے بی بیؑ کی اس زمین کو بحق سرکار ضبط کرلیا۔ یہ رویہ صرف فاطمہؑ بنت محمدؐ کے ساتھ روا رکھا گیا۔ ان کے علاوہ رسولِ مقبولؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں جن لوگوں کو زمینیں اور باغات عطا کئے تھے وہ کسی سے بھی واپس نہیں لئے گئے۔[2]

آلِ محمدؐ کے خلاف معاشی واقتصادی جنگ کے متعلق اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ خمس کی بندش اور فدک کے چھن جانے سے آلِ محمدؐ مالیات سے محروم ہوگئے کیونکہ ان دو ذرائع کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی متبادل روزگار نہیں تھا۔ اس معاشی ناکہ بندی کی وجہ سے امام علیؑ کے پاس لوگوں کا ہجوم جمع نہیں رہ سکتا تھا۔ اس اقتصادی جنگ کی وجہ سے خلافت انتظامیہ اور بنتِ رسولؐ کے درمیان سخت نزاع پیدا ہوا اور بنتِ رسولؐ کو مجبور ہو کر مسجدِ نبوی میں آنا پڑا جہاں انہوں نے اپنے حق کا دفاع کیا اور انصار سے بھی مدد طلب کی لیکن انہوں نے خاموش رہنے کو ترجیح دی۔

بنتِ رسولؐ ہزاروں درد لے کر بوجھل قدموں سے واپس گھر تشریف لائیں اور کچھ ہی عرصے بعد ان کی وفات ہوگئی اور وہ اپنے والد رسول اللہؐ کے پاس چلی گئیں۔ رحلتِ فاطمہؑ کے بعد امام علیؑ یکا وتنہا رہ گئے۔ لوگوں نے ان سے منہ موڑ لیا...اور اس کے بعد جو کچھ ہوا ہم نے ان واقعات کی تفصیل اپنی کتاب

۱۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۶، ص۱۲۔

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھیں معالم المدرستین جلد دوم، باب اجتهاد الخليفتين في الخمس۔

عبداللہ بن سبا کی پہلی جلد میں بیان کی ہے۔

اس کے بعد اربابِ خلافت نے انصار اور بنی ہاشم کو میدانِ سیاست سے دور رکھنے کی پالیسی اپنائی اور فتوحات کے لئے ان گروہوں میں سے کسی فرد کو بھی فوج کا سالار نہیں بنایا گیا اور نہ ہی انہیں اسلامی شہروں میں کسی انتظامی عہدے پر فائز کیا گیا۔ یہ تو ہوا مدینے کے مخالفین کے دو گروہوں کے ساتھ ان کا سلوک۔ اب آیئے دیکھیں انہوں نے مدینے سے باہر اپنے مخالفین کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا۔

(ج) خلافت کے مخالف ایسے مسلمان قبائل جو مدینے سے باہر رہتے تھے ان سے نمٹنے کے لئے اربابِ خلافت نے ان پر ارتداد کا الزام عائد کیا اور کہا کہ یہ لوگ اسلام چھوڑ کر مرتد ہوگئے ہیں۔

اس الزام کے بعد حکومت نے ان سے جنگ کی یہاں تک کہ ان کی قوت ختم ہوگئی۔ حکومت نے اپنے مخالفین سے صرف جنگ کرنے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ جنگ کے بعد ان کے جنگجو افراد کو قتل کردیا اور ان کے اموال کو لوٹ لیا۔ نیز ان کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قید کر کے شہر مدینہ بھیج دیا۔ ان میں سے اگر کسی کو سفارش میسر آگئی تو وہ آزاد ہوگیا اور جس کے پاس کوئی سفارش نہیں تھی اسے غلام بنالیا گیا۔

عرب کے تین قبائل میں تین افراد نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ حکومت نے ان کے ساتھ بھی جنگ کی اور انہیں شکست دی۔ ان کے جنگجو افراد کو قتل کیا گیا اور ان کے مال کو بطورِ غنیمت لوٹ لیا گیا اور بقیۃ السیف افراد کو غلام بنالیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے ابتدائی دنوں میں ہی تمام عربی افراد کو غلامی سے آزاد کردیا۔

عہدِ ابوبکرؓ میں حدیث پالیسی

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے پورے دور کو سامنے رکھ کر ہی ان کا سنت و حدیث کے متعلق رویہ واضح کیا جاسکتا ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس دور میں حدیث پالیسی یہ تھی کہ ایسی احادیث کو پھیلایا جائے جن سے سرکاری اقدامات کی تائید ہوتی ہو اس کے علاوہ باقی احادیث پر پابندی عائد کردی جائے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد انصارِ مدینہ سقیفہ بنی ساعدہ میں سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنانے کی غرض سے جمع ہوئے۔ خلیفہ سازی کے لئے ان کے پاس قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں تھی۔ انہوں نے یہ اقدام قبائلی عصبیت کے تحت کیا تھا۔

جب قریشی مہاجرین کو اس بات کا علم ہوا تو وہ فوراً سقیفہ پہنچے اور انہوں نے اپنے استحقاقِ خلافت کے لئے انصار کے سامنے یہ موقف پیش کیا کہ رسولِ اکرمؐ کا تعلق قبیلۂ قریش سے تھا اور عرب قریش سے باہر کا خلیفہ قبول نہیں کریں گے۔ اس دلیل کو بنیاد بنا کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی گئی جبکہ دو دن تک بنی ہاشم رسول اکرمؐ کی تجہیز و تکفین میں مصروف رہے اور قریشی مہاجرین کے لئے میدان صاف تھا۔ چنانچہ ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہوگئے۔

خلافت کے متعلق مہاجرین و انصار کے تنازع کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہرگز نہیں تھی اور فریقین میں سے کسی فریق نے بھی قرآن و حدیث کا کوئی حوالہ نہ دیا۔ پھر اس کے بعد ارباب خلافت نے:

۱۔ خمس میں سے خاندان پیغمبر اور عام بنی ہاشم کا حصہ ختم کر دیا جبکہ ان کے پاس بنی ہاشم کو خمس سے محروم رکھنے کی کوئی شرعی دلیل نہیں تھی حالانکہ اس حکم سے سورۂ انفال کی آیت خمس کی سراسر مخالفت کی گئی کیونکہ آیت خمس میں واضح طور پر "ذی القربیٰ" کا حق مذکور ہے۔ رسول اکرمؐ نے ہزاروں صحابہ کی موجودگی میں اپنے خاندان کو خمس میں ایک حصہ دیا تھا اور آپ نے متعدد بار یہ عمل دہرایا تھا۔ پس یہ کہا جاسکتا ہے کہ خلافت کی ہیئت حاکمہ نے قرآن مجید اور سنت رسولؐ کو صرف سیاسی رقابت کی بھینٹ چڑھایا۔

۲۔ رسول اکرمؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؑ کو فدک ہبہ کیا تھا لیکن خلیفہ نے ان کی زمین ضبط کر لی اور جب حضرت فاطمہؑ نے فدک کی واپسی کا مطالبہ کیا تو ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس بات کے گواہ پیش کریں کہ آیا رسول اکرمؐ نے انہیں فدک ہبہ بھی کیا تھا یا نہیں؟

اور گواہ صرف حضرت فاطمہؑ سے ہی طلب کئے گئے ورنہ رسول اکرمؐ نے اپنی حیات طیبہ میں بہت سے افراد کو جائداد و باغات عطا کئے تھے۔ خلافت انتظامیہ نے کسی بھی صحابی کی جائداد ضبط نہیں کی اور کسی سے بھی ہبہ کے گواہ طلب نہیں کئے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ چونکہ امام علیؑ کی زوجہ تھیں اور امام علیؑ اس خلافت کے مخالف تھے، اس لئے فدک ضبط کر کے انہیں معاشی طور پر ہراساں کیا گیا۔

۳۔ حضرت فاطمہؑ کو ان کے والد کی میراث سے محروم کر دیا گیا جبکہ مسئلہ میراث اسلام اور قرآن کے بدیہی مسائل میں سے ایک ہے اور تمام مسلمان قرآن مجید میں میراث کی آیات پڑھ چکے تھے اور رسول اکرمؐ اس پر عمل کرتے تھے۔ بی بیؑ کو حق وراثت سے محروم کرنا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ اس سے قرآن مجید کی تکذیب لازم آتی تھی، اسی لئے ارباب سیاست کو مجبوراً ایک حدیث گھڑنا پڑی تاکہ اس حدیث سے اپنے سیاسی مخالف گھرانے کو نان شبینہ کا محتاج کر دیا جائے۔ قرآن کریم کی آیات میراث کے مقابلے میں یہ حدیث گھڑی گئی:

حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: "ہم گروہ انبیاءؑ ہیں، ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا اور ہمارا ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔"

اس حدیث میں یہ پہلو غور طلب ہے کہ پیغمبرؐ کا ترکہ صدقہ ہوتا ہے اور صدقہ آل محمدؐ پر حرام ہے۔ حدیثِ لاوارثی اس وقت پیش کی گئی جب بنت رسولؐ نے خلیفہ سے اپنا قرآنی حق طلب کیا۔ اس کے بعد بنت رسولؐ نے مناسب سمجھا کہ وہ اپنا معاملہ دربارِ خلافت میں ہزاروں صحابہ اور امتِ اسلامیہ کے سامنے پیش کریں تاکہ ساری امت طرفین کے استدلال کا اندازہ کر سکے اور خلافت کے حامیوں کو بتا سکیں کہ قرآنی احکام

معطل کرنے میں وہ بھی ان کے شریک ہیں۔

چنانچہ احقاقِ حق کے لئے حضرت فاطمہؑ چند خواتین کو لے کر مسجد نبوی میں تشریف لائیں۔ آپؑ کے آنے سے قبل آپ کے لئے مسجد میں پردہ لٹکایا گیا تھا۔ اب صورتحال کچھ یوں تھی کہ پردے کے پیچھے حضرت فاطمہؑ اور دوسری مستورات تھیں اور پردے کے دوسری طرف اربابِ خلافت اور دوسرے تمام صحابۂ کرامؓ تھے۔

حضرت فاطمہؑ نے سب سے پہلے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ آپ کی غم بھری ٹھنڈی سانس نے حاضرین پر اثر کیا اور وہ رونے لگے۔ اس کے بعد حضرت فاطمہؑ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی پھر فرمایا: میں فاطمہؑ بنت محمدؐ ہوں ..... اور بہت کچھ کہنے کے بعد آپ نے فرمایا: اے ابوقحافہ کے بیٹے! وا عجبا! تو تو اپنے باپ کی میراث پائے اور میں اپنے والد کی میراث سے محروم رہوں؟

اس کے بعد حضرت فاطمہؑ نے انصار کو خطاب کیا اور انہیں حق کا ساتھ نہ دینے پر سخت سست کہا۔ جب آپ کا خطبہ مکمل ہوگیا تو حضرت ابوبکرؓ نے خطبہ دیا اور انہوں نے اپنے خطبے میں رسولِ اکرمؐ کا احترام کیا اور حضرت فاطمہؑ کی تعریف و توصیف کے بعد کہا: اے دخترِ پیغمبرؐ! میں نے رسول اکرمؐ سے خود سنا کہ آپ نے فرمایا ''ہم گروہِ انبیاءؑ کا کوئی وارث نہیں ہوتا اور ہماری جو جائیداد بچ جائے وہ صدقہ ہے۔''

حضرت فاطمہؑ نے اس کے جواب میں فرمایا: کیا تم نے جان بوجھ کر خدا کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا ہے جبکہ قرآن مجید میں ہے:

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ. سلیمانؑ نے داؤدؑ کی میراث پائی۔ (سورۂ نمل: آیت ۱۶)

اس کے بعد آپ نے میراث کی چند دوسری آیات بھی تلاوت فرمائیں اور آپ نے صاحبِ اقتدار فرد کی بیان کردہ روایت کی پُرزور تردید فرمائی اور حاضرین میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ کھڑا ہو کر کہتا کہ میں نے بھی یہ حدیث سنی تھی۔

اس واقعے کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنی خلافت کے استحکام کے لئے ایک حدیث کی ضرورت تھی اور ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت فوراً ایک حدیث بنالی گئی۔ تاریخِ اسلام میں یہ پہلا موقع تھا جب حکومتی سطح پر نصِ قرآن کے مقابلے میں حدیث وضع کی گئی۔ اس کے بعد کتبِ خلفاء میں ہمیں اس کی بہت سی مثالیں نظر آتی ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر خاندانِ رسولؐ کے ساتھ حکومت کے اس سخت رویے کو دیکھ کر اصحاب خاموش کیوں رہے جبکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ قرآن کے مقابلے میں حدیث وضع کی گئی ہے اور حکومت اپنے سیاسی حریفوں کا مالک بن نویرہ کی طرح سے قتل عام کر رہی ہے، تو انہوں نے احتجاج کیوں نہ کیا؟ اس

سوال کا جواب دینے کے لئے اس وقت کے جزیرۂ عرب کے حالات اور عربوں اور بالخصوص صحابہ کی نفسیات کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔

اِسی کتاب میں عدالتِ صحابہ پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے اور جزیرۂ عرب کے عوام کی عمومی حالت کے متعلق ہم نے بحث کے مقدمے میں کچھ معروضات پیش کئے تھے جن کا یہاں اِعادہ کرتے ہیں۔

عرَبوں میں قول وقرار کی اہمیّت

عرب کے لوگوں کی غالب اکثریت لکھنے پڑھنے سے عاری تھی ان کے تمام معاملات زبانی قول وقرار پر مبنی ہوتے تھے۔ مثلاً اگر ایک شخص ایک بیگانے کے متعلق کہہ دیتا کہ یہ آج سے میرا بیٹا ہے تو وہ سچ مچ کا بیٹا بن جاتا تھا اور متبنّیٰ بنانے والا شخص اس شخص کا والد بن جاتا تھا اور اس کے بیٹے بیٹیاں نووارد متبنّیٰ کے بھائی بہن قرار پاتے تھے اور پورا قبیلہ اِلحاق شدہ فرد کو اپنے قبیلے کا ایک جزو تسلیم کرلیتا تھا۔ کسی کو قبیلے سے جدا کرنے کی بھی شکل وصورت ایسی ہی تھی۔ مثلاً اگر کسی کے متعلق یہ کہہ دیا جاتا کہ ''اس شخص کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں ہے'' تو وہ شخص اپنے قوم قبیلے سے کٹ جاتا تھا۔

لین دین، خرید وفروخت کے تمام تر معاملات کا انحصار ''زبان'' پر ہوتا تھا اور دو قبیلوں کے باہمی عہد و پیمان اور صلح و جنگ کے معاملات بھی زبانی کلامی طے ہوتے تھے۔

کبھی کسی مثبت قرارداد کے لئے ایک دوسرے سے معاہدہ کرتے تو اس معاہدے پر قائم رہنے کے لئے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے جسے ''بَیعَت'' کہا جاتا تھا۔ عہد و پیمان کی پابندی کو شخصی عظمت وشرافت کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت کی دوسری اقوام کی بہ نسبت عرب اپنی زبان کے زیادہ پکے تھے۔ وہ جان دینا پسند کرتے تھے لیکن قول سے پھرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

شریعتِ اسلام نے بھی صحیح قسم کے عہد و پیمان کو پورا کرنے کی تاکید کی ہے اور رسولِ اکرمؐ نے اسلامی معاشرے کی بنیاد ہی بیعت پر رکھی تھی۔ البتہ اسلام نے غلط اور بے ہودہ قسم کی قرارداد اور قول وقرار کو لغو قرار دیا جیسا کہ متبنّیٰ بنانے کے اعلان کو اسلام نے لغو قرار دیا۔

اگر اس نکتے پر توجہ دی جائے تو پھر صحابہ کی خاموشی اور حکومت کے ناروا اقدامات کے سامنے ان کی سپردگی کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ انصار نے جب مسجد میں شیخین کے ساتھ امام علیؑ کی مدلّل گفتگو سنی تو وہ بے ساختہ پکار اُٹھے: ''اگر ابوبکرؓ کی بیعت سے قبل انصار آپ کی گفتگو سن لیتے تو وہ آپ کے علاوہ کسی کی بھی بیعت نہ کرتے۔'' اور جب دخترِ پیغمبر نے انصار سے مدد طلب کی تو انہوں نے حضرت فاطمہؑ سے بھی یہی کہا تھا: ''اب

کیا ہوسکتا ہے۔ اب تو ہم اس شخص کی بیعت کر چکے۔"

اور جب حضرت فاطمہؑ نے مسجدِ نبوی میں اپنے حق کا مطالبہ کیا اور اربابِ خلافت نے آپ کو حق دینے سے انکار کردیا تو اس وقت بھی آپ نے انصار سے حمایت طلب کی تھی مگر اس کے جواب میں بھی وہ خاموش رہے۔ انصار کی خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو بیعت کا پابند محسوس کرتے تھے اور اپنی بیعت شکنی کو اپنے لئے ننگ و عار خیال کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ اقدامات غلط ہیں لیکن وہ عرب روایات کے تحت اپنے قول وقرار کے پابند تھے جبکہ اسلام کسی باطل قرارداد کی پابندی کو ضروری قرار نہیں دیتا۔ اگر بالفرض چند افراد آپس میں مل کر کسی کا مال لوٹنے کا عہد و پیمان باندھیں اور اس سلسلے میں ایک شخص کی بیعت کریں تو ایسی بیعت باطل ہوگی اور اسلام کی نظر میں قابلِ اجرا نہ ہوگی۔ لیکن عرب نفسیات کے اعتبار سے اس قرارداد سے منحرف ہونا ننگ و عار کا سبب تصور کیا جاتا تھا اور اس وقت صحابہ کی یہی نفسیاتی کیفیت تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ بیعت کی وجہ سے وہ پابند ہو چکے ہیں لہٰذا انہیں ہر حالت میں خلیفہ کی فرمانبرداری کرنی چاہئے۔

سابقہ بیان کی روشنی میں عہدِ ابوبکرؓ میں حدیث وسنّت کے ساتھ یہ رویّہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

انصار اسلامی آداب کو پس پشت ڈالتے ہوئے رسولِ اکرمؐ کے جنازے کو گھر میں چھوڑ کر سقیفہ جا پہنچے تا کہ کسی نہ کسی طرح سے انہیں اقتدار حاصل ہو جائے۔ انہیں کسی لحاظ سے سنّتِ پیغمبر کی فکر نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی رائے پر عمل کیا اور اُن لوگوں نے نہ صرف سنت سے روگردانی کی تھی بلکہ صاحبِ سنت کے وُجودِ مُطہّرؐ سے بھی روگردانی کی تھی کیونکہ انہوں نے آنحضرتؐ کے کفن دفن کو چھوڑ کر خلافت حاصل کرنے کے لئے سقیفہ کا رخ کیا تھا۔ ان کا مطمحِ نظر صرف "دنیا" تھا اور انہوں نے اپنی رائے پر عمل کیا تھا۔

انصار کا یہ غیر اخلاقی اجتماع وفاتِ رسولؐ کے بعد سب سے پہلا اجتماع تھا جس میں مسلمانوں نے سنّت کے مقابلے میں اپنی رائے پر عمل کیا تھا۔ اس معاملے میں مہاجرین قریش بھی انصار سے پیچھے نہ رہے اور دونوں فریقوں کے کاموں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ مہاجرین بھی حصولِ اقتدار کے لئے سقیفہ میں جمع ہوئے تھے انصار کی طرح انہوں نے بھی حضرت رسول اعظمؐ کی سنت پر اپنی رائے کو مقدم رکھا تھا۔

اہلِ دنیا کارِ دنیا ساختند مصطفیؐ را بے کفن انداختند

ان نازک لمحات میں بنی ہاشم کا اور بالخصوص امام علیؑ کا کردار قابلِ تحسین تھا۔ ان پر آفرین ہے کہ تاجدارِ انبیاء کو سپردِ خاک کرنے تک آپ ان کی سنّت کے سوا کسی اور طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے۔ بقول شرف الدین قلندرؒ:

امامی کہ روزِ وفاتِ پیغمبرؐ خلافت گزارد بہ ماتم نشیند

اس کے بعد مکتبِ خلفاء میں سنّتِ پیغمبرؐ کے مقابلے میں رائے پر عمل کرنے کا رواج ہوگیا اور اہلبیت

رسولؐ کے خلاف جو اقتصادی جنگ لڑی گئی تھی اس میں بھی ارباب خلافت نے سنت کی بجائے اپنی رائے پر عمل کیا اور اہلبیت رسولؐ کے معاشی محاصرے کے دوران ایک موقع ایسا بھی آیا جہاں حکومت کو نصِ قرآن کے مقابلے میں ایک حدیث گھڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور چشم فلک نے دیکھا کہ کس طرح حاکم وقت نے ایک خود ساختہ بات کو حدیث کے عنوان سے مسجد نبوی میں پیش کردیا۔ لیکن چونکہ حدیث لاوارثی نصِ قرآن کے خلاف تھی اس لئے بنت رسولؐ نے مجمع عام میں اس حدیث کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

اس حدیث کے وضعی ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے جب حضرت فاطمہؑ نے اس حدیث کو ماننے سے انکار کیا تو اس وقت مسجد صحابہ سے بھری ہوئی تھی۔ اگر یہ حدیث سچی ہوتی تو کوئی نہ کوئی صحابی اٹھ کر یہ ضرور کہتا کہ میں نے بھی رسول اکرمؐ سے یہ حدیث سنی تھی لیکن کسی بھی صحابی نے خلیفہ کی حمایت نہیں کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث اول و آخر خلیفہ تک ہی محدود تھی اور امت کا کوئی بھی فرد اسے نہیں جانتا تھا۔

خلیفہ کی صاحبزادی بی بی عائشہؓ نے بھی اس حقیقت کی تصریح کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا: جب اللہ کے رسولؐ کی وفات ہوئی تو... انہوں نے میراثِ پیغمبرؐ میں اختلاف کیا (اس سے مراد وہ اختلاف ہے جو سنتِ رسولؐ اور اربابِ خلافت میں ہوا تھا)۔

میراث پیغمبرؐ کے متعلق ابوبکرؓ کے علاوہ ہم نے کسی اور کے پاس کوئی علم نہ پایا۔ ابوبکرؓ نے کہا: میں نے پیغمبرؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم گروہ انبیاءؑ کا کوئی وارث نہیں ہوتا اور جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔[1]

اور یوں حضرت ابوبکرؓ نے اسی مفہوم کی ایک اور روایت رسول اکرمؐ سے نقل کی جس میں انہوں نے بزعم خویش ترکۂ رسولؐ کے وارث کا تعین کیا ہے۔ ان کے مطابق رسول اکرمؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی نبی کو کوئی چیز عطا فرماتا ہے تو وہ چیز نبی کی وفات کے بعد ان کے قائم مقام کی ملکیت ہوتی ہے۔[2]

اس حدیث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ تو میراث سے محروم رہیں لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ رسول اکرمؐ کے قائم مقام بن چکے ہیں لہٰذا وہ رسول اکرمؐ کی میراث پاسکتے ہیں۔ چنانچہ خلیفہ نے بنت رسولؐ کو حق میراث نہیں دیا تھا لیکن خود اس میں تصرف کیا تھا۔ پھر بنت رسولؐ نے پوچھا کہ تیرے مرنے پر تیری میراث کس کو ملے گی؟ خلیفہ نے کہا: میری اولاد میری میراث پائے گی۔ اس پر حضرت فاطمہؑ نے پوچھا کہ پھر ہماری بجائے تو نے رسول اللہؐ کی میراث کیوں پائی ہے؟[3]

۱۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص ۷۳

۲۔ ابوداؤد، سنن، ج ۳، ص ۱۴۴، باب فی صفایا رسول اللہ، حدیث ۲۹۷۳۔ احمد بن حنبل، مسند، ج ۱، ص ۴۔

۳۔ معالم المدرستین، ج ۲، ص ۱۴۴، طبع اول۔

بی بی عائشہؓ کی وضاحت کے مطابق: ''اس بات کا علم صرف حضرت ابوبکرؓ کو تھا کہ انبیائے کرامؑ کی اولاد اپنے باپ کی میراث نہیں پاتی۔'' بی بی عائشہؓ کے اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے بھی اپنی بیٹی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کا میراث میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اگر آنحضرتؐ یہ مسئلہ اپنی صاحبزادی کو بتا کر جاتے تو وہ میراث مانگنے ہی نہ جاتیں۔ اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ گویا پیغمبرِ خداؐ نے اس مسئلے کی تبلیغ میں (نعوذباللہ) کوتاہی کی تھی۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ خلیفۂ اول کے دَور میں خلیفہ کی تائید کے لئے حدیث سازی کو برا نہیں سمجھا گیا اور بعد میں حاکم کے علاوہ دوسرے افراد سے بھی اس مفہوم کی تائید کے لئے حدیث سازی کرائی گئی۔ مثلاً آپ صحیح بخاری کی اس حدیث کو ملاحظہ فرمائیں جس میں ابوہریرہ سے منقول ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: میری میراث میں سے ایک درہم بھی تقسیم نہ ہوگا۔ میں جو کچھ چھوڑ کر جاؤں اس میں میری بیویوں کے نفقے اور میرے ملازمین کے اخراجات کے علاوہ باقی سب صدقہ ہے۔[1]

ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ابوہریرہ نے یہ حدیث عہدِ ابوبکرؓ کے بعد گھڑی تھی اور ہمارے پاس اپنے دعویٰ کی دلیل کے لئے ام المومنین عائشہؓ کا وہ قول موجود ہے جس میں انہوں نے کہا تھا: ''وفاتِ رسولؐ کے بعد انہوں نے اختلاف کیا تو میراثِ انبیاءؑ کا علم ابوبکرؓ کے علاوہ کسی کے پاس بھی نہ تھا۔''

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ''نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا ہم گروہِ انبیاءؑ ہیں اور ہماری کوئی میراث نہیں ہوتی۔''

اگر ابوہریرہ نے بھی اس دَور میں اس روایت کو بیان کیا ہوتا تو ام المومنین یہ کبھی نہ کہتیں کہ میراثِ پیغمبر کے متعلق ابوبکرؓ کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ابوہریرہ نے دراصل یہ روایت حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی تائید میں وضع کی تھی۔ شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار ہونا اسی کو کہتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے تو کہا تھا: ''انبیاءؑ کی کوئی میراث نہیں ہوتی، ان کا ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔'' جبکہ ابوہریرہ کی روایت کہتی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا تھا: ''میری طرف سے ایک دینار میں بھی میراث جاری نہیں ہوگی میرے ترکے میں سے میری بیویوں کو نان نفقہ اور میرے خادمین کو خرچہ دیا جائے گا۔ باقی صدقہ ہوگا۔''

ابوہریرہ نے ''ایک دینار'' کا تذکرہ کر کے بات کو پختہ کرنے کی کوشش کی اور اپنی جعلی روایت میں بنتِ رسولؐ کو محروم کرنے کے ساتھ ساتھ ازواج اور خادمین کو ترکۂ رسول کا حقدار بنا کر بیک وقت ازواجِ رسول اور خلیفۂ رسول کو خوش کیا ہے۔

۱۔ محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، کتاب الفرائض، ج۴، ص۱۱۰، باب قول النبی لانورث ما ترکنا صدقۃ۔ اسی صفحے پر بی بی عائشہؓ کی اپنے والد کی تائید میں روایت موجود ہے۔ صحیح بخاری کتاب الخمس، ج۲، ص۱۲۶۔ مسلم بن حجاج نیشاپوری، صحیح مسلم، کتاب الجہاد، حدیث ۵۵۔ ابوداؤد، سنن، ج۳، ص۱۴۴، باب صفایا رسول اللہؐ۔ احمد بن حنبل، مسند، ج۲، ص۲۴۲ و ۲۷۶۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی تائید میں ہم نے جو روایت پیش کی ہے یہ صرف ایک نمونہ ہے ورنہ جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفاء میں اس طرح کی تائیدی روایات بڑی تعداد میں یکجا کی گئی ہیں۔ حکام کی سیاست کی تائید کے لئے اس طرح کی روایات ہم آئندہ صفحات میں بیان کریں گے۔ انشاء اللہ

ابوہریرہ کی روایت کی طرح سے جو روایات خلفاء کے زمانہ کے بعد ان کی تائید کے لئے وضع کی گئی ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے کچھ روایات کی طرف ہم نے اپنی کتاب معالم المدرستین، جلد دوم، باب متعۃ الحج، میں اشارہ کیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مکتبِ خلفاء میں صحیح اور غیر صحیح احادیث مخلوط ہیں۔ ایک ماہرِ حدیث کے سوا ان کی تشخیص کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔

نقلِ حدیث پر پابندی

لاوارثی حدیث سے دَورِ ابوبکرؓ میں حدیث پالیسی کے ایک پہلو کا اظہار ہوتا ہے جبکہ ان کی پالیسی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ حدیثِ پیغمبرؐ کو منظرِ عام پر نہ آنے دیا جائے۔

ذہبی اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد ابوبکرؓ نے صحابہ کو جمع کر کے کہا: تم لوگ رسولِ اکرمؐ سے احادیث روایت کرتے ہو اور ان کے متعلق آپس میں اختلاف کرتے ہو اور جو لوگ تمہارے بعد آئیں گے وہ تم سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے لہٰذا تم لوگ رسولِ اکرمؐ سے کوئی روایت نہ کرو۔ اگر کوئی شخص تم سے سوال کرے تو تم اس سے کہو: قرآن ہمارے درمیان موجود ہے، جسے قرآن نے حلال کیا ہے تم اسے حلال جانو اور جسے قرآن نے حرام کیا ہے تم اسے حرام جانو۔[1]

حضرت ابوبکرؓ کا یہ سرکاری فرمان قرآن مجید کی اس آیت کے سراسر خلاف ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ. یعنی اے رسولؐ! ہم نے آپ کی طرف قرآن کو نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے ان احکام کو واضح کریں جو اُن کی طرف نازل کئے گئے ہیں۔ (سورۂ نحل: آیت ۴۴)

قرآن مجید کے تمام حلال و حرام کی تشریح اور وضاحت حدیثِ پیغمبرؐ میں کی گئی ہے اور قرآنی احکام سیرتِ رسولؐ میں مجسم ہو کر سامنے آتے ہیں۔ حلال و حرام کی وضاحت کے لئے اگر حدیث کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور صرف قرآن پر انحصار کیا جائے تو اس سے ایک رکعت نماز کی ادائیگی کے طریقے کا بھی علم نہیں ہو سکے گا لہٰذا حدیث کے متعلق حضرت ابوبکرؓ کی حکومت کا یہ رویہ بالکل غیر مناسب تھا اور جہاں تک حضرت ابوبکرؓ کے اس

۱۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج۱، ص۲ اور ۳، در شرح حال ابوبکرؓ۔

قول کا تعلق ہے کہ ''تم اس میں اختلاف کرتے ہو'' تو ان کی یہ بات بالکل درست ہے کیونکہ اگر لوگوں کو حدیث بیان کرنے کی کھلی اجازت دیدی جاتی تو اس کے نتیجے میں کچھ لوگ حدیث کی پیروی کرتے اور کچھ لوگ خلفاء کی آرا کی پیروی کرتے اور یوں مسلمانوں میں شدید اختلاف پیدا ہونے کے امکانات بہت بڑھ جاتے۔

حضرت ابوبکرؓ نے نقلِ حدیث پر پابندی لگا کر نہ صرف قرآن مجید کی محوّلہ بالا آیت کی بلکہ متعدد ایسی آیات کی بھی مخالفت کی جن میں حدیثِ پیغمبرؐ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا یہ حکم ان احادیث کے بھی خلاف تھا جن میں رسولِ اکرمؐ نے لوگوں کو اپنی احادیث یاد کرنے اور لکھنے کا حکم دیا تھا۔[1]

حضرت ابوبکرؓ نے احادیث کے متعلق دوہری پالیسی اپنائی تھی۔ ان کی یہ پالیسی آنے والے خلفاء کے لئے مشعلِ راہ بنی اور انہوں نے اس پالیسی کو برقرار رکھا۔ اس پالیسی سے کہ ''نقلِ حدیث منع ہے'' وہ اپنی رائے پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے عہد میں اکثر ذاتی رائے پر عمل کیا یہاں تک کہ زندگی کے آخری لحات میں بھی اپنی رائے پر عمل کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔

تاریخ طبری اور دیگر کتبِ تاریخ میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مرض الموت میں حضرت عثمانؓ کو تنہائی میں بلایا اور اپنی وصیت لکھوانی شروع کی۔ فرمایا لکھو ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ یہ وہ دستاویز ہے جو ابوبکرؓ نے مسلمانوں کے لئے تحریر کی ہے۔ امّا بعد...!''

اس وقت آپ پر اتنی نقاہت طاری تھی کہ املاء کراتے کراتے کچھ دیر کے لئے آپ بے ہوش ہوگئے۔ ان کی بے ہوشی کے دوران حضرت عثمانؓ نے اپنی طرف سے یہ عبارت تحریر کی: ''میں نے عمر بن الخطابؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے اور یہ تقرر و استخلاف کر کے میں نے تمہاری خیر خواہی کی ہے۔''

جب حضرت ابوبکرؓ ہوش میں آئے تو انہوں نے عثمانؓ سے کہا کہ تم نے جو کچھ لکھا ہے مجھے پڑھ کر سناؤ۔ حضرت عثمانؓ نے وہ نوشتہ انہیں سنایا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا: اللہ اکبر! معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں یہ اندیشہ لاحق ہوگیا تھا کہ کہیں میں یہ الفاظ لکھانے سے پہلے ہی دنیا سے چل نہ بسوں اور لوگ اختلاف کا شکار نہ ہو جائیں؟

حضرت عثمانؓ نے کہا: ہاں! یہی بات تھی۔

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: خدا تمہیں جزائے خیر دے اور اس نوشتۂ عثمانی کو قبول کیا۔

حضرت ابوبکرؓ کا آزاد کردہ غلام ''شدید'' اس دستاویز کو لے کر حضرت عمرؓ کے پاس گیا اور حضرت عمرؓ نے مسجد میں جمع لوگوں سے کہا: اے لوگو! خلیفۂ رسول کی بات پر کان دھرو اور اس کے فرمان کو تسلیم کرو کیونکہ وہ کہتا ہے کہ اس نے تمہاری خیر خواہی کی ہے۔[2] چنانچہ اس وثیقہ کی بنیاد پر لوگوں نے حضرت عمرؓ کی بیعت کی اور یوں آپ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ بنے۔

۱۔ معالم المدرستین، ج ۲، ص ۵۵ تا ۵۸۔ ۲۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک، ج ۴، ص ۲۱۳۸، مطبوعہ یورپ۔

سُنّتِ رَسولؐ — عہدِ عمرؓ میں

حضرت عمر بن الخطابؓ نے ماہ جُمادی الثانی ۱۳ھ کو مسندِ خلافت سنبھالی اور ۲۶/ذی الحجہ ۲۳ھ کو قتل ہوئے۔ ان کا دورِ خلافت دس سال اور چار ماہ تھا۔[1]

عہدِ عمرؓ کی حکومتی پالیسی

حضرت عمرؓ کے عہد کی حکومتی پالیسیوں نے حدیث وسنت پر پانچ طرح کے اثرات مرتب کئے جو یہ ہیں:

۱۔ قریش کی برتری قائم کرنے کی پالیسی

۲۔ عرب قوم پرستی کو فروغ دینے کی پالیسی

۳۔ معاشرے میں طبقاتی نظام رائج کرنے کی پالیسی

۴۔ صحابۂ کرامؓ کو مدینہ میں نظر بند رکھنے کی پالیسی

۵۔ جعلی اہلبیت متعارف کرانے کی پالیسی

۱۔ قریش کی بَرتری قائم کرنے کی پالیسی

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اسی قبیلہ پرستی کو رواج دیا جو قبل از اسلام عرب معاشرے میں رائج تھی۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب دنیا قبائلی نظام اور عرب قومیت کی اَساس پر قائم تھی۔ وہاں سوچ اور فکر کا محور قبیلہ تھا۔ مثلاً میرا قبیلہ، میرے قبیلے کے حلیف، شیخِ قبیلہ، شاعرِ قبیلہ، آبِ قبیلہ اور زمینِ قبیلہ وغیرہ۔

اس دَور میں اگر ایک قبیلے کا کوئی شخص دوسرے قبیلے کے کسی شخص کو قتل کرتا تو مقتول کا پورا قبیلہ اسے اپنی عزت وانا کا مسئلہ بنالیتا تھا اور جب تک وہ قاتل کو یا قاتل کے قبیلے میں سے کسی ایک شخص کو قتل نہ کرتے اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا تھا اور قبیلہ پرستی کے جنون میں اس وقت کا معاشرہ اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ ایک صحرانشین عرب اپنے قبیلے کے باہر کسی بھی شریف ترین شخص کو رشتہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ رسولِ اکرمؐ نے اس معاشرے کے خلاف زبانی اور عملی جہاد کیا اور اللہ تعالیٰ نے قبیلہ پرستی کے بت کو پاش پاش کردیا۔ فرمایا:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ. اے انسانو! بے شک ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمہیں

۱۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی، التنبیہ والاشراف، دول الاسلام، ص ۱۹۔

قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو اور خدا کے ہاں زیادہ عزت والا وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ (سورۂ حجرات: آیت ۱۳)

رسولِ اکرمؐ نے اپنی عمر مبارک کے آخری سال حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشاد فرمایا:

''اے لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ آگاہ رہو! کسی عرب کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عرب پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے۔''

پھر آپؐ نے فرمایا: کیا میں نے خدا کا پیغام پہنچا دیا؟

لوگوں نے کہا: جی ہاں یارسول اللہؐ! آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا۔

رسول اکرمؐ نے قوم پرستی کے خلاف صرف زبان سے ہی جہاد نہیں کیا بلکہ آپ نے اپنے عمل سے بھی قوم پرستی کو ختم کر کے مساوات اور مؤاسات کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ تشکیل دیا۔ آپ نے اسلامی معاشرے میں حضرت بلال حبشیؓ کو مؤذن مقرر کیا۔ نیز آپ نے سیکڑوں کام ایسے انجام دیئے جن سے قبیلہ پرستی کی روایات کو زک پہنچی تھی۔

رسولِ اکرمؐ نے قبائلی بنیادوں کو ختم کر کے اسلامی معاشرے کی بنیاد ''انسانی مساوات'' پر رکھی جبکہ حضرت عمرؓ کے عہد میں حکومت کے تقاضوں کے پیش نظر ایک بار پھر انسانی مساوات کو چھوڑ کر قوم پرستی کو فروغ دیا گیا۔ مثلاً رسولِ اکرمؐ کی رحلت کے بعد سقیفۂ بنی ساعدہ میں جو کچھ ہوا اس کی بنیاد بھی قبیلہ پرستی پر تھی۔ انصار ''سعد بن عبادہ'' کی بیعت کرنا چاہتے تھے گرچہ ان کے پاس سعد کی خلافت کے لئے کوئی شرعی دلیل موجود نہیں تھی۔ بس یہ کہا گیا کہ انصار نے اسلام اور رسولِ اسلامؐ کو پناہ دی تھی اسی لئے خلیفہ بھی انصار سے ہونا چاہئے۔ سقیفہ کے اجلاس میں کسی بھی انصاری نے ''سعد'' کی دوسرے صحابہ پر فضیلت کی کوئی دلیل پیش نہیں کی تھی۔ انصار کے پاس لے دے کر بس یہی ایک دلیل تھی کہ ''خلیفہ ہمارے قبیلے سے ہونا چاہئے۔''

مہاجرین نے انصار کے مقابلے میں یہ جواب دیا: رسولِ اکرمؐ کا تعلق ہمارے قبیلے — قریش — سے تھا اس لئے خلافت بھی قریش میں رہنی چاہئے اور عرب اس بات کو سخت ناپسند کریں گے کہ ان کا خلیفہ قریش کے علاوہ کسی اور خاندان سے ہو۔

قریش ازم کو ہی دلیل بنا کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی گئی اور جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے تو انہوں نے مدینہ اور مدینہ سے باہر رہنے والے اپنے مخالفین کی خوب سرکوبی کی یہاں تک کہ ان کی حکومت مستحکم ہوگئی۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد جیسے ہی حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے خلافت کو خاندانِ قریش کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں تمام حساس عہدے قریش یا ان کے حلیف قبائل کے پاس تھے۔ وہی تمام

بڑے شہروں کا نظم ونسق چلاتے تھے۔ فوج کی سالاری کا منصب بھی قریش کے پاس تھا۔ البتہ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ بنی ہاشم کا کوئی شخص کسی کلیدی عہدے پر فائز نہ ہونے پائے۔ ہم اپنی دلیل کے لئے مسعودی کے بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حمص کا عامل فوت ہوگیا۔ حمص، صوبہ شام کا ایک بڑا شہر اور ایک اہم فوجی چھاؤنی تھا۔

عاملِ حمص کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ کو طلب کیا اور انہیں بتایا کہ حمص کے عامل کی وفات ہوگئی ہے۔ وہ ایک نیک انسان تھا اور نیک لوگ بہت کم ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ تم بھی جماعتِ صالحین میں سے ہی ہوگے لیکن اس کے باوجود میرے دل میں تمہارے لئے ایک خلش پائی جاتی ہے اگرچہ میرے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ میں نے دلیل تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر مجھے آج تک تمہارے خلاف کوئی دلیل ہاتھ نہیں لگی۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ حمص کے عامل بننے کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟

ابن عباسؓ نے کہا: جب تک آپ اپنی قلبی کیفیت کا اظہار نہیں کرتے اس وقت تک میں بھی کوئی عہدہ لینے پر آمادہ نہیں ہوں۔

حضرت عمرؓ نے کہا: آخر تم کس لئے جاننا چاہتے ہو؟

ابن عباسؓ نے کہا: میں اس لئے جاننا چاہتا ہوں کہ اگر میرے اندر کوئی خامی ہوگی تو میں اس کے ازالے کی کوشش کروں گا تاکہ وہ خامی کسی وقت میرے لئے پریشانی کا سبب نہ بنے اور اگر میں بے گناہ ہوا تو اپنی بے گناہی کی وجہ سے عہدہ قبول کرلوں گا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: ابن عباسؓ! مجھے تمہارے متعلق اندیشہ ہوا کہ کہیں کل کلاں کو میں مرجاؤں اور تم حمص کے عامل ہوئے تو لوگوں کو اپنی خلافت کی دعوت دینے نہ لگ جاؤ۔ نہیں نہیں! دوسروں کو چھوڑ کر لوگوں کو تمہاری طرف نہیں آنا چاہئے۔[1]

ان الفاظ سے حضرت عمرؓ یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ اگر حمص جیسا اہم شہر — جو کہ بہت بڑی فوجی چھاؤنی تھا — ابن عباسؓ کے حوالے کردیا جائے اور ان کی وفات ہوجائے تو کہیں ابن عباسؓ فوج کی پشت پناہی اور اپنے منصب کے بل بوتے پر لوگوں کو سردارِ بنی ہاشم علیؑ کی بیعت کی دعوت دینے نہ لگ جائیں چنانچہ انہوں نے گفتگو کے آخر میں کہا: ''نہیں نہیں! دوسروں کو چھوڑ کر لوگوں کو تمہاری طرف نہیں آنا چاہئے۔''

وہ اس گفتگو سے ابن عباسؓ سے یہ وعدہ لینا چاہتے تھے کہ اگر انہیں گورنر مقرر کیا جائے گا تو وہ اپنا اثر ورسوخ علیؑ کے حق میں استعمال نہیں کریں گے مگر ابن عباسؓ اس طرح کی کوئی یقین دہانی نہ کراسکے لہٰذا

۱۔ مسعودی، مروج الذہب، ج۲، ص۳۲۱۔

حضرت عمرؓ نے اپنی دلی خواہش کے باوجود انہیں گورنر مقرر نہ کیا اگرچہ وہ ان کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔

اس گفتگو سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) حضرت عمرؓ بنی ہاشم کو حساس عہدے دینے سے اس لئے گریزاں تھے کہ کہیں وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے علیؑ کو خلیفہ منتخب نہ کرا دیں۔

(۲) حضرت عمرؓ ہر وقت سوچا کرتے تھے کہ بنی ہاشم کو کس طرح اقتدار سے دور رکھ کر قریش کے دیگر قبائل کو دربارِ خلافت سے نزدیک کیا جائے۔

خاندانِ قریش کے تمام خلفاء ایک طے شدہ پالیسی کے تحت انصار کو بھی حساس عہدوں سے دور رکھتے تھے۔ ہاں اگر کبھی قریش میں سے انہیں کوئی آدمی نہ ملتا تو بامرِ مجبوری وہ انصار کو عہدہ دیتے تھے یا پھر غیر اہم منصب پر انصار کو متعین کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی زندگی کے آخری لحات تک انصار کو دیوار سے لگایا جاتا رہا اور جب حضرت عمرؓ نے خلافت کے لئے چھ رکنی شوریٰ تشکیل دی تو اس میں انہوں نے کسی انصاری کو شامل نہ کیا۔

حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں قریش کی برتری کی جس پالیسی کو فروغ دیا گیا تھا اس کے اسلامی معاشرے پر نہایت گہرے اثرات مرتب ہوئے اور اس پالیسی نے حدیثِ رسولؐ اور سنتِ رسولؐ پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے جو آج تک دیکھے جاسکتے ہیں۔

۲۔ قوم پرستی کو فروغ دینے کی پالیسی

حضرت عمرؓ کے عہد میں عرب قوم پرستی کو بڑا فروغ ملا جس کے چار نمونے پیش خدمت ہیں:

(الف) کوئی غیر عرب، عرب سے اور کوئی غیر قریش، قریشی سے شادی نہ کرے۔[۱]

(ب) غیر عرب ماں کا بچہ باپ کی میراث نہیں پائے گا۔ البتہ اگر وہ عرب سرزمین میں پیدا ہوا ہو تو پھر باپ کا وارث تصور کیا جائے گا۔[۲] (اس قانون کی مثال آج کل برطانیہ میں موجود ہے۔ اگر کوئی انگریز کسی غیر انگریز عورت سے شادی کرے اور بچہ برطانیہ میں پیدا ہو تو اس کو برطانیہ کا شناختی کارڈ ملتا ہے اور اگر وہ بچہ برطانیہ سے باہر کسی دوسرے ملک میں پیدا ہو تو اسے برطانیہ کے شہری حقوق نہیں ملتے۔)

(ج) عرب نصرانیوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا بلکہ دوسرے مسلمانوں کی طرح ان سے زکوۃ

۱۔ معالم المدرستین، ج ۲، ص ۳۵۲ تا ۳۵۶

۲۔ اس مفہوم کو موطا امام مالک ج ۲، ص ۶۰، مطبوعہ مصر ۱۳۴۳ھ، میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اَبیٰ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَنْ یُوَرِّثَ اَحَدًا مِّنَ الْاَعَاجِمِ اِلَّا اَحَدٌ وُلِدَ فِیْ اَرْضِ الْعَرَبِ. ہم نے اس جملے کے مفہوم کو استنباط کر کے یہاں نقل کیا ہے۔

وصول کی جاتی تھی جبکہ عجمی نصرانیوں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔[1]

(د) حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت بلال حبشیؓ کی طرح جو غیر عرب صحابۂ کرامؓ عہدِ رسولؐ میں مدینے میں رہتے تھے وہ رہیں لیکن ان کے علاوہ باقی غیر عرب مدینے میں رہائش اختیار نہ کریں۔

البتہ دو افراد کو وہاں رہنے کی خصوصی اجازت دی گئی تھی، ان میں سے ایک شوستر کا اصلی فرمانروا ''ہرمزان'' تھا جس سے خلیفہ فتوحاتِ ایران کے متعلق مشورے لیا کرتا تھا[2] اور دوسرا ''ابولؤلؤ'' تھا یہ ایک ماہر کاریگر تھا اور لوگوں کو اس کی ضرورت تھی۔[3]

مسعودی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

وَكَانَ عُمَرُ لَا يَتْرُكُ اَحَدًا مِّنَ الْعَجَمِ يَدْخُلُ الْمَدِيْنَةَ. فَكَتَبَ اِلَيْهِ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ اَنَّ عِنْدِىْ غُلَامًا نَقَّاشًا، نَجَّارًا، حَدَّادًا، فِيْهِ مَنَافِعُ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ فَاِنْ رَاَيْتَ اَنْ تَاْذَنَ لِىْ فِى الْاِرْسَالِ بِهٖ فَعَلْتُ فَاَذِنَ لَهٗ. حضرت عمرؓ کسی بھی غیر عرب کو مدینے میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے البتہ جب مغیرہ بن شعبہ نے انہیں لکھا کہ میرے پاس ایک غلام ہے جو بیک وقت نقاش، بڑھئی اور لوہار ہے اور وہ اہلِ مدینہ کے لئے نفع بخش ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اسے مدینے بھیج دوں؟ پس حضرت عمرؓ کی اجازت سے مغیرہ نے اسے مدینے بھیج دیا۔

حضرت عمرؓ اور ہرمزان کے مابین مشاورت سے متعلق ہم تاریخ سے صرف ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔

مسعودی رقم طراز ہیں:

حضرت عمرؓ نے ہرمزان سے فارس، اصفہان اور آذربائیجان کی جنگ کے متعلق مشورہ کیا تو ہرمزان نے کہا: فارس (ایران کا دروازہ) بمنزلہ سر اور اصفہان و آذربائیجان بمنزلہ دو پَروں کے ہیں۔ اگر بالفرض ایک پَر کاٹ دیا جائے تو سر دوسرے پَر کی حفاظت کرتا رہے گا لیکن اگر سَر کاٹ دیا جائے تو دونوں پَر کچھ نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا آپ اپنے کام کی ابتدا سَر سے کریں۔[4]

۳۔ طبقاتی نظام رائج کرنے کی پالیسی

حیاتِ رسولؐ میں جو بھی مالِ غنیمت آتا آپؐ اس میں سے ایک حصہ خمس نکال کر باقی چار حصے مجاہدین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ رسولِ اکرمؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اور پھر حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی

۱۔ تفصیلات کے لئے دیکھیں معالم المدرستین، ج ۲، ص ۳۵۲ـ۳۵۶۔
۲۔ مسعودی، مروج الذہب، ج ۲، ص ۳۲۲۔
۳۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء، در شرح حال عمرؓ، ص ۱۳۳۔
۴۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص ۱۴۳ـ۱۴۴

سالوں میں بھی یہ نظام قائم رہا۔ جب فتوحات کی کثرت ہوئی اور فارس کا کچھ حصہ فتح ہوگیا اور غنائم بڑھ گئے تو خلیفہ نے غنائم کی تقسیم کے لئے مسلمانوں سے مشورہ کیا۔

امام علیؑ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ جتنا بھی مال تمہارے پاس جمع ہو اسے سال کے آخر تک تقسیم کردو اور اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھو۔ دوسروں نے دیگر تجاویز پیش کیں۔ ایک شخص نے کہا: میں نے بادشاہانِ شام کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس ناموں پر مشتمل رجسٹرات ہوتے ہیں اور ان کے پاس ایک باقاعدہ فوج کا ادارہ ہوتا ہے۔ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ خلیفہ کو اس کی بات پسند آئی اور انہوں نے حکم دیا کہ قبائل کی بنیاد پر رجسٹرات تیار کئے جائیں جن میں لوگوں کے نام درج ہوں۔[۱]

مؤرخ بلاذری نے بیت المال کی تقسیم کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

رسولِ اکرمؐ کی تمام ازواج کے لئے سالانہ دس ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا گیا جبکہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے لئے بارہ ہزار درہم وظیفہ مقرر ہوا۔

جن لوگوں نے جنگِ بدر میں حصہ لیا تھا ان میں سے ہر فرد کے لئے سالانہ پانچ ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا گیا اور جو لوگ بدر میں شامل نہیں تھے اور اُحد میں شامل تھے ان میں سے ہر فرد کے لئے چار ہزار درہم مقرر ہوئے اور اس طرح سے وظیفے کی شرح کم ہوتی گئی یہاں تک کہ بعض مسلمانوں کو سال میں دو سو درہم وظیفہ ملتا تھا اور اس طرح سے رجسٹرات میں لوگوں کے نام درج کئے گئے تھے۔[۲]

خلیفہ نے لوگوں کے وظائف میں کمی بیشی کر کے اسلام میں طبقاتی نظام پیدا کیا اور پھر آہستہ آہستہ مسلمان معاشرہ اس نظام سے اتنا مانوس ہوا کہ اسے دین کا جزو سمجھا جانے لگا۔

حضرت عمرؓ نے اپنی گفتار و کردار سے طبقاتی نظام کو مستحکم کیا۔ مثلاً وہ کہا کرتے تھے کہ جب تک اہلِ بدر میں سے ایک بھی فرد باقی رہے گا یہ امر (خلافت) ان ہی میں رہے گا اور اگر تمام اہلِ بدر دنیا سے رخصت ہو جائیں تو پھر یہ امر اہلِ اُحد میں رہے گا اور جب تک اہلِ اُحد کا ایک بھی شخص باقی رہے گا اس وقت تک یہ امرِ خلافت ان سے باہر نہیں جائے گا۔ پھر اس کے بعد...[۳] فتحِ مکہ تک ترتیب وار غزوات کا نام لیا کرتے تھے اور آخر میں کہتے تھے کہ فتحِ مکہ کے بعد مسلمان ہونے والوں کا خلافت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے جانشین کے لئے جو چھ رکنی مجلس شوریٰ تشکیل دی تھی وہ اہلِ بدر پر مشتمل تھی۔ خلیفہ نے اس طرح کے اقدامات سے مشہور اور نامور صحابہ کو اپنی ذات سے خوش کر دیا اور انہیں مال و دولت میں

۱۔ مسعودی، مروج الذہب، ج ۲، ص ۳۲۲۔

۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۱۲، ص ۲۱۴۔ بلاذری، فتوح البلدان، ص ۵۴۹۔ معالم المدرستین، ج ۲، ص ۸۵ تا ۸۷۔

۳۔ حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی، تاریخ الخلفاء۔

الجھا کر سیاسی فکر سے علیحدہ کر دیا اور انہیں گایوں، بھیڑ بکریوں، اونٹوں، گھوڑوں اور کاشتکاری میں الجھا دیا۔ اس طرح اسلامی معاشرے میں دو طبقات پیدا ہو گئے ایک اشرافیہ — جس کے پاس دولت کی ریل پیل اور خدام کی فوج ظفر موج تھی — اور دوسرے محروم اور مستضعف لوگ جن کے پاس زندگی کی کوئی آسائش موجود نہ تھی۔ اس تقسیم سے اسلامی معاشرے میں بہت زیادہ نقصانات ہوئے جن کی تفصیل کیلئے علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔

۴۔ صحابہؓ کو نظر بند رکھنے کی پالیسی

حضرت عمرؓ نے ایسے تمام صحابہ کو مدینے میں نظر بند کر دیا جن کے بارے میں انہیں اندیشہ تھا کہ وہ مدینے سے باہر رہ کر ان کی حکومت کے لئے مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔ عبداللہ بن عمر کہتے ہیں: زبیر بن عوام ایک بہادر اور دلیر انسان تھے۔ وہ عمرؓ کے پاس گئے اور جو کام ان سے سرزد ہو گیا تھا اس کی وجہ سے عمرؓ ان سے خوفزدہ رہتے تھے۔ (ایک بار زبیر نے حمایتِ علیؑ میں تلوار بلند کی تھی) زبیر نے عمرؓ سے کہا: آپ مجھے اجازت دیں میں خدا کی راہ میں جہاد کے لئے جانا چاہتا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے کہا: تیرے لئے وہی جہاد کافی ہیں جو تو نے رسولِ اکرمؐ کے ساتھ کئے تھے۔

حضرت زبیر خود کلامی کرتے ہوئے ناراض واپس چلے گئے۔

حضرت عمرؓ نے کہا: اصحابِ پیغمبر میں سے کون میری مجبوری کو سمجھتا ہے؟ اگر میں نے اس فتنے کے دہانے کو بند نہ کیا تو یہ فتنہ امتِ محمدؐ کو ہلاک کر دے گا۔[1]

ایک اور روایت میں ان سے یہ الفاظ مروی ہیں: میں اس درّے کے دروازے (یعنی مدینے) پر کھڑا ہوں تاکہ ایسا نہ ہو کہ اصحابِ پیغمبر لوگوں میں جائیں اور انہیں گمراہ کریں۔[2]

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا بیان ہے:

حضرت عمرؓ نے اپنی موت سے پہلے مختلف مقامات سے صحابہ کو مدینے میں جمع کیا اور حضرت ابوذرؓ اور... اور... اور... اور ان سے کہا: تم نے کیسی احادیث پھیلا رکھی ہیں؟

انہوں نے کہا: کیا تم ہمیں حدیثِ پیغمبرؐ بیان کرنے سے روک رہے ہو؟

حضرت عمرؓ نے کہا: تم یہاں میرے پاس رہو۔ خدا کی قسم! جب تک میں زندہ ہوں اس وقت تک تم مجھ سے جدا نہ ہو سکو گے۔ ہم بہتر جانتے ہیں کہ تمہاری بیان کردہ کس حدیث کو قبول کریں اور کس کو رد کریں۔ پھر حضرت عمرؓ کی وفات تک یہ لوگ مدینہ میں رہے۔[3]

۱۔ خطیب، تاریخ بغداد، ج ۷، ص ۴۵۳۔ ۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ۔ ۳۔ منتخب کنز العمال، ج ۴، ص ۶۱۔

نشرِ حدیث کو روکنے کی غرض سے حضرت عمرؓ نے ازواجِ پیغمبر کو حج و عمرہ سے بھی روک دیا تھا[۱] کیونکہ ازواجِ رسول میں حضرت ام سلمہؓ جیسی بزرگ خاتون بھی موجود تھیں جنہیں حضرت عمرؓ نقلِ حدیث سے روک نہیں سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے تمام ازواج کے سفرِ حج و عمرہ پر پابندی لگا دی اور یہ پابندی ان کی پوری مدتِ خلافت میں جاری رہی۔ اپنی خلافت کے آخری سال میں وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی زیرِ نگرانی ان کو اپنے ساتھ حج پر لے گئے جہاں ان دونوں نے کسی کو اُن کے نزدیک نہیں آنے دیا۔[۲]

۵۔ جعلی اہلبیتؑ متعارف کرانے کی پالیسی

فتوحات کے پھیلاؤ کی وجہ سے لوگوں کو اسلام شناسی اور تاریخِ اسلام جاننے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ حکومت کا شعبۂ تبلیغ عوام کو قرآن سناتا اور سنت کے وہ نکات بیان کرتا جو اُن کی پالیسی سے متصادم نہیں تھے اور خلفاء کے بنائے ہوئے قوانین کو اسلام کے نام سے پیش کرتا تھا لیکن حکومت کے شعبۂ تبلیغ کو ''تاریخ اسلام'' سمجھانے میں بڑی مشکل پیش آتی تھی کیونکہ نومسلم رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتے تھے اور یہ جاننے کے بھی خواہش مند تھے کہ اسلام نے کس طرح ترقی کی، کن کن لوگوں نے آپ کی نصرت یا مخالفت کی اور وہ کون لوگ تھے جنہوں نے آپ کے لئے قربانیاں دیں یا آپ کے انتہائی مقرب تھے اور اس وقت رسولِ اکرمؐ کی باقیات میں سے کون کون موجود ہے؟

علاوہ ازیں نومسلم قرآن مجید میں آیۂ قربیٰ اور آیۂ مباہلہ جیسی آیات پڑھتے تو فطری تقاضوں سے مجبور ہوکر پوچھتے تھے کہ رسولِ اکرمؐ کے وہ قرابتدار کون ہیں جن کی مودّت کو قرآن مجید نے اجرِ رسالت قرار دیا ہے؟ اسی طرح وہ پوچھتے تھے کہ عیسائیوں سے مُباہلہ کرنے کے لئے رسولِ اکرمؐ کن لوگوں کو لے کر گئے تھے؟ بالفاظِ دیگر وہ کون صادقین تھے جنہیں رسول اللہؐ ابنائنا، نسائنا اور انفسنا کا مصداق بنا کر لے گئے تھے؟

اور پھر تحقیق کرنے پر انہیں پتا چلتا تھا کہ پہلے ''ناصرِ رسول'' امام علیؑ کے والد ابوطالبؑ تھے جو کہ رشتے میں رسولِ اکرمؐ کے چچا تھے اور خواتین میں یہ اعزاز حضرت خدیجہؑ کو حاصل ہوا تھا جو کہ رسولِ اکرمؐ کی پہلی زوجہ تھیں اور وہ امام علیؑ کی ساس تھیں۔ پھر لوگوں کو یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ خواتین میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؑ ایمان لائی تھیں اور مردوں میں سب سے پہلے امام علیؑ ایمان لائے تھے اور یہ کہ انہیں معلوم ہوجاتا تھا کہ غزوات میں پیغمبرِ اکرمؐ کے سب سے بڑے ناصر امام علیؑ ہی تھے۔ علاوہ ازیں آیاتِ قرآن اور احادیثِ رسولؐ

۱۔ محمد بن سعد واقدی، طبقات ابن سعد، ج ۸، ص ۲۰۸۔

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھیں ''نقش عائشہؓ در تاریخ اسلام'' کی جلد اول، فصل ''عائشہؓ حج پر جاتی ہیں''

سے انہیں یہ بھی پتا چلتا تھا کہ پیغمبرِ اکرمؐ کے ذوی القربیٰ امام علیؑ اور ان کا گھرانہ ہے۔

پھر لوگ سنتے تھے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا تھا: ''فاطمہؑ جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔'' تو انہیں اشتیاق ہوتا تھا کہ معلوم کریں فاطمہؑ کون تھیں؟ تو انہیں پتا چلتا تھا کہ فاطمہؑ، محمد مصطفیٰؐ کی دختر اور علی مرتضیٰؑ کی زوجہ تھیں۔ بعض جاں نثار صحابہ کی تبلیغ کی وجہ سے نومسلم افراد نے جان لیا کہ حسنؑ اور حسینؑ کون تھے، ان کا تعلق کس گھرانے سے تھا اور ان کے بارے میں رسولِ اکرمؐ نے کیا فرمایا تھا؟

تحقیق کرنے پر پتا چلتا تھا کہ حسنؑ وحسینؑ دو بھائی ہیں اور وہ علی مرتضیٰؑ اور فاطمہ زہراؑ کے نورِ چشم اور رسولِ اکرمؐ کے نواسے ہیں اور ان انکشافات کی وجہ سے لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی فضیلت و زیبائی کے وارث علیؑ اور ان کے والد اور ان کی ساس اور ان کی زوجہ اور ان کے فرزند ہیں۔ اس انکشاف کے ساتھ ہی لوگوں کو جب یہ معلوم ہوتا کہ اسلام کی تمام فضیلتوں کا محور گھرانہ، حکومت وقت کا مخالف ہے اور علیؑ نے پورے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی اور مزید یہ کہ وہ کہتے رہتے ہیں کہ میں رسولِ اکرمؐ کا وصی اور ان کا بالحق خلیفہ ہوں۔ یہ تمام باتیں حکومت کی پریشانی کا موجب تھیں۔ آخرکار حکومت نے ان پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کے لئے ایک پلان تیار کیا جس کے چند نکات کو ہم نمبروار بیان کریں گے۔

اس سے پہلے ہم نے عرض کیا کہ حضرت ابوبکرؓ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ یہ پیشکش کرنے رسولِ اکرمؐ کے چچا حضرت عباسؓ کے پاس گئے کہ وہ انہیں اقتدار میں شریک کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ چاہتے تھے کہ کسی طرح سے حضرت عباسؓ کو امام علیؑ سے علیحدہ کیا جائے لیکن حضرت عباسؓ نے ان کی پیشکش قبول نہیں کی۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی یہی پالیسی برقرار رہی کیونکہ حکومت امام علیؑ کے مقابلے میں کسی اور کو رسولِ اکرمؐ کے قرابتدار بنا کر پیش کرنے کی خواہش مند تھی۔ چنانچہ اس پالیسی کی رو سے حضرت عباسؓ کی شخصیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا جبکہ حضرت عباسؓ جنگِ بدر تو کجا، اُحد و خندق و خیبر و تبوک میں بھی شریک نہیں تھے بلکہ وہ تو جنگِ بدر میں کفارِ قریش کے ساتھ تھے اور اس جنگ میں قید بھی ہوئے تھے مگر اس کے باوجود اربابِ خلافت نے ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت انہیں پذیرائی بخشی اور تمام بدری و اُحدی صحابہ پر فوقیت دی اور ان کے لئے گرانقدر وظیفہ مقرر کیا۔ انہیں سالانہ بارہ ہزار درہم وظیفہ دیا جانے لگا اور ۱۸ھ میں جب مدینے میں خشک سالی ہوئی تو حضرت عمرؓ نے نمازِ استسقاء کے لئے حضرت عباسؓ کو ''رسولِ اکرمؐ کا چچا بنا کر'' بارگاہِ احدیت میں بطور شفیع پیش کیا۔[۱]

۱۔ صحیح بخاری، کتابُ الْاِسْتِسْقَاء بَاب سُوال النَّاسِ الامام الاستسقاء اِذَاقحطوا. ج۱، ص۱۲۴۔
و کتابُ فضَائلِ النبیؐ بَاب مَناقِب عباسؓ بن عبدالمطلب. ج۲، ص۲۰۰۔ طبقات ابن سعد، ج۳، ق۱، ص۳۲۲۔

علاوہ ازیں ان کے فرزند حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی حضرت عمرؓ نے کافی عزت افزائی کی۔ وہ بزرگ صحابہ کے ساتھ ان سے بھی مشورہ لیتے تھے اور قرآن کی تفسیر کے لئے بھی ان سے رجوع کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بہت سے ''اشعارِ عرب'' یاد تھے۔ چنانچہ وہ اشعار کی روشنی میں قرآن مجید کی لغوی تفسیر بیان کرتے تھے۔[۱]

خلیفہ نے اس طرح سے حضرت عباس اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو رسولِ اکرمؐ کے قرابت دار بنا کر متعارف کرایا۔ علاوہ ازیں ہم بتا چکے ہیں کہ خلیفہ، ابن عباسؓ کو حمص جیسے اہم شہر کا گورنر بھی مقرر کرنا چاہتے تھے مگر وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس عہدے پر تقرری سے قبل ابن عباسؓ انہیں یہ ضمانت دیں کہ ان کے مرنے کے بعد ابن عباسؓ اپنے عہدے کا غلط استعمال نہیں کریں گے اور امام علیؑ کو خلیفہ نہیں بنائیں گے؟

رسولِ اکرمؐ نے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے اہلبیتؑ کو متعارف کرایا تھا اور اربابِ خلافت نے ان حقیقی اہلبیتؑ کی بجائے پیغمبرؐ کے دیگر اعزاء و اقرباء کو اہلبیتِ رسول کے عنوان سے پہچنوایا لیکن دونوں اطراف کے مقاصد جداگانہ تھے۔ رسولِ اکرمؐ کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے بعد مسلمان اسلامی عقائد و احکام اور حدیث و سنت حاصل کرنے کے لئے اہلبیتِ رسول کی طرف رجوع کریں، ان کی بیعت کر کے اسلامی معاشرہ تشکیل دیں اور امت اس کام کو خوش دلی کے ساتھ ان کے مقام و منزلت کی معرفت کے ساتھ انجام دے، ان سے محبت کو اجرِ رسالت اور جزوِ ایمان سمجھ کر ان کی پیروی کرے۔

لیکن خلافتِ وقت نے رسولِ اکرمؐ کے حقیقی اہلبیتؑ کی بجائے حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد کو اہلبیت کے عنوان سے متعارف کرایا اور ان کی شخصیت کا خوب امیج بنایا جس کے فوری اور دور رس نتائج برآمد ہوئے۔

اس پالیسی کا فوری نتیجہ تو یہ نکلا کہ نومسلم افراد نے حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد کو ان آیات کا مصداق سمجھ لیا جو اہلبیتؑ کی شان میں نازل ہوئی تھیں اور اس سے امام علیؑ کی شخصیت تحت الشعاع قرار پائی۔ حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد مسلمانوں کی عقیدت کا مرکز بن گئے اور امام علیؑ اور ان کی اولاد کا مقام دھندلا گیا۔ اس پالیسی کا دوسرا اور دور رس نتیجہ یہ نکلا کہ جب مسلمانوں نے بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آ کر اہلبیتِ رسولؐ کی قیادت میں حکومت تشکیل دینی چاہی تو بنی عباس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس دور میں مدینہ اہلبیتِ رسولؐ کا مرکز تھا اور کوفہ شیعیان علیؑ کا مرکز تھا مگر بنی عباس نے مدینہ اور کوفہ سے بہت دور خراسان سے اپنی مہم کا آغاز کیا اور اپنے آپ کو اہلبیتِ رسولؐ کے عنوان سے متعارف کرا کر بنی امیہ کے خلاف ایک منظم تحریک چلائی جس کے نتیجے میں بنی امیہ کی حکومت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی اور اس کی جگہ بنی عباس کی حکومت نے لے لی جبکہ

۱۔ محمد بن سعد واقدی، طبقات ابن سعد، ج ۲، ق ۲، ص ۱۲۰۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ۔

کردار کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا دونوں حکومتیں انسان دشمن اور اسلام دشمن تھیں۔ بنی عباس کی حکومت نے حدیث و سنت سے وہی سلوک کیا جو اُن کے پیشرو کرتے چلے آئے تھے۔ سیکڑوں برس تک مسلمان بنی عباس کی ظالمانہ حکومت کے عذاب میں گرفتار رہے۔ بنی عباس کے مظالم بیان کرنے کے لئے کئی مجلدات کی ضرورت ہے۔

مکتبِ خلافت نے اپنی تبلیغات کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کرانے کی بھرپور کوشش کی مکہ و مدینہ میں شیخین ہی رسولِ اکرمؐ کے قریب ترین رفیق، وزیر اور مشیر تھے اور یہی دونوں بزرگوار اسلام کی دوسری اور تیسری شخصیت تھے۔ مکتب خلافت کی تبلیغات صرف یہیں تک محدود نہیں تھیں بلکہ انہوں نے اپنی خودساختہ روایات سے لوگوں کو یہ باور کرانے کی بھی کوشش کی کہ دونوں بزرگوار رسولِ اکرمؐ سے زیادہ پرہیزگار اور زیادہ دانا و بینا تھے۔

تاریخِ اسلام کی مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمِ اول امام علیؑ تھے لیکن مکتبِ خلافت نے مسلم اول کا لقب ان سے چھین کر حضرت ابوبکرؓ کو دیدیا اور حضرت عمرؓ کی شخصیت یوں تراش کر پیش کی گئی کہ وہ رسول اکرمؐ سے بھی زیادہ اسلام کے ہمدرد دکھائی دینے لگے اور انہیں "ماں سے بھی زیادہ مہربان دائی" کے روپ میں پیش کیا گیا۔

جس دَور میں دوسرے صحابہ کو حدیث بیان کرنے کی ممانعت تھی اس دَور میں حضرت عمرؓ اور بی بی عائشہؓ کو اجازت تھی کہ وہ جو چاہیں رسولِ اکرمؐ سے روایت کریں۔ اس سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عمرؓ اسلام کے عظیم "ہیرو" کے طور پر متعارف ہوئے اور انہیں امام علیؑ سے افضل و برتر سمجھا جانے لگا۔ اس سے سنتِ پیغمبرؐ پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے وہ آج تک باقی ہیں۔

مکتبِ خلافت نے حضرت عائشہؓ کو رسولِ اکرمؐ کی چہیتی بیوی اور بارگاہِ الٰہی کی مقرب ترین شخصیت بنا کر پیش کیا اور انہیں اہلبیت کی ممتاز ترین فرد ہونے کا شرف بھی دیا گیا۔ اس طرح ان کی شخصیت کو باعظمت ظاہر کر کے حضرت خدیجہؑ اور حضرت فاطمہ زہراؑ کے مقام کو کم کرنے کی کوشش کی گئی کیونکہ اربابِ خلافت چاہتے تھے کہ حضرت خدیجہؑ اور حضرت فاطمہؑ کی عظمت گہنا جائے اور لوگ ان کی قربانیوں کو فراموش کردیں۔

حضرت عائشہؓ کی شخصیت کو ممتاز بنانے کے لئے خلفاء ان سے استفتاء کرتے اور سنتِ رسولؐ کے متعلق ان سے وضاحت کے طالب ہوتے تھے اور یوں خلفاء کے طرزِ عمل سے ام المومنین سنتِ پیغمبرؐ کی پہچان کے لئے اولین مرجع کے طور پر متعارف ہوئیں۔ آپ کی روایات نے سیرت و سنت پیغمبرؐ پر منفی اثرات مرتب کئے جبکہ خلفائے ثلاثہ کی سیرت کو تقویت حاصل ہوئی۔ بی بی عائشہؓ کی روایات کے منفی اثرات حضرت امام مہدیؑ کے ظہور تک باقی رہیں گے۔[۱]

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیں "نقش عائشہؓ در تاریخ اسلام" اور المعجم المفھرس لالفاظ الحدیث النبوی، در مادہ عائشہؓ، اور کتاب ہذا کی جلد اول، باب عوامل تحریف۔

مذکورہ بیانات کی روشنی میں ہم حدیثِ رسولؐ کے بارے میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے دوران کئے جانے والے اقدامات کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

عہدِ عمرؓ میں حدیث پالیسی

حضرت عمرؓ کے دَور میں حدیثِ رسولؐ کے متعلق چار خطرناک رویے اختیار کئے گئے جو یہ ہیں:

(۱) نقلِ حدیث پر پابندی۔

(۲) سرکاری طور پر مسلمانوں میں اسرائیلی روایات پھیلانے کی اجازت۔

(۳) قرآن وسنّت کے علیٰ الرغم خلیفہ کا اپنی رائے پر عمل کرنا۔

(۴) سرکاری اِقدامات کی تائید میں خلفاء کے لئے روایت سازی۔

ا۔ نقلِ حدیث پر بندش کی پالیسی

حضرت عمرؓ کے عہد میں رسولِ اکرمؐ کی حدیث بیان کرنے اور لکھنے کی ممانعت تھی اور یہی نہیں بلکہ خلیفہ کی طرف سے حکم جاری ہوا کہ جس کسی کے پاس احادیث لکھی ہوئی ہوں وہ لے آئے۔ جب صحابہ اپنے اپنے مجموعے لے کر آئے تو خلیفہ نے حکم دیا کہ ان تمام مجموعہ ہائے حدیث کو جلا دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور تمام مجموعے آن کی آن میں نذرِ آتش کردیئے گئے۔ اس پالیسی کو مزید مؤثر بنانے کے لئے صحابہ پر پابندی عائد کردی گئی کہ وہ مدینے سے باہر نہیں جائیں گے کہ مبادا حدیث وسنت بیان کرنے لگیں۔[۱]

واضح رہے کہ نہ صرف صحابہٴ کرامؓ پر بلکہ امہات المؤمنین پر بھی یہی پابندی عائد کی گئی تھی۔ ان کے لئے مدینے سے باہر جانا منع تھا اور انہیں حج جیسے شرعی سفر سے بھی روک دیا گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے پورے عرصۂ اقتدار میں صرف ایک سال انہیں حج کی اجازت ملی لیکن نگرانی کے لئے حضرت عثمانؓ وعبدالرحمان بن عوفؓ کو ان کے ساتھ بھیجا گیا جنہوں نے کسی کو بھی ان سے ملنے نہ دیا جیسا کہ ہم سابقہ صفحات میں وضاحت کرچکے ہیں۔

ذیل میں ہم نقلِ حدیث پر پابندی کے تین نمونے نقل کرتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ اس دَور میں حدیث بیان کرنا کتنا مشکل کام تھا؟

(۱) سعد بن ابی وقاصؓ حج کے لئے مدینے سے مکے آئے اور حج کے بعد دوبارہ مدینے واپس گئے۔ اس پورے سفر میں انہوں نے ایک بھی حدیث بیان نہیں کی۔[۲]

۱۔ معالم المدرستین، ج۲، ص۴۴۔۴۸، باب "منع کتابة الحدیث"۔ ۲۔ سنن دارمی، باب من ھاب الفتیا، ج۱، ص۸۴۔

مؤلف کہتا ہے کہ یہ سب کچھ سفرِ حج کے دوران ہوا جبکہ مناسکِ حج کی صحیح ادائیگی کے لئے سنتِ پیغمبرؐ کے بیان کرنے کی اشد ضرورت ہے مگر اس شدید ضرورت کے ہوتے ہوئے بھی سعد نے حدیث سے اپنے ہونٹ سی لئے تھے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دوَر میں نقلِ حدیث پر کتنی شدید سینسر شپ نافذ تھی۔

(۲) ایک شخص پورا سال حضرت عبداللہ بن عمر کے ساتھ رہا لیکن انہوں نے پورے ایک سال کے عرصے میں اس شخص سے ایک بھی حدیث بیان نہ کی۔[1]

(۳) حضرت عمرؓ نے قرظہ بن کعب انصاری کو کوفہ روانہ کرتے وقت یہ نصیحت کی تھی کہ وہ وہاں رہ کر حدیثِ رسولؐ بیان نہ کریں۔

چنانچہ قرظہ نے بھی اس نصیحت پر پورا عمل کیا۔ جب بھی لوگ ان سے حدیثِ رسولؐ سننے کی خواہش کرتے تو وہ کہتے: ''امیر المومنین نے ہمیں حدیثِ رسولؐ بیان کرنے سے منع کیا ہے۔''[2]

حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حدیثِ پیغمبرؐ کی نشر و اشاعت سے منع کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ قرآن پڑھیں لیکن قرآن کے معانی اور تفسیر نہ پوچھیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صبیغ بن عسل تمیمی نے جو کہ اپنی قوم کے عمائدین میں سے تھے ''وَالذَّارِيَاتِ ذَرْوًا....'' کے متعلق سوال کیا تو حضرت عمرؓ نے انہیں مدینہ طلب کیا اور کھجور کی چھڑی سے اتنا پیٹا کہ ان کے سر سے خون بہہ کر دامنِ پیراہن پر بہنے لگا۔ پھر انہیں قید میں ڈال دیا۔ کچھ عرصے بعد دوبارہ طلب کیا اور ان کی پیٹھ پر ایک سو کوڑے مارے یہاں تک کہ ان کی کمر زخمی ہوگئی۔ بعدازاں انہیں بصرہ بھیج دیا اور حکم دیا کہ کوئی شخص ان سے گفتگو نہ کرے۔ آخرکار صبیغ کے لئے زندگی اجیرن ہوگئی۔ وہ ایک دن ابوموسیٰ کے پاس آئے اور اس کا دامن پکڑ لیا۔ ابوموسیٰ نے ان کے متعلق سفارش کی تو خلیفہ نے لوگوں کو ان کے ساتھ نشست و برخاست کی اجازت دی۔[3]

ہم نے خلیفۂ اول کے دوَر میں حدیث و سنت بیان کرنے پر پابندی کی وجوہات کی طرف مختصر اشارہ کیا تھا۔ اب ہم اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہیں :

اعلانِ نبوت کے ساتھ ہی قریشِ مکہ نے رسولِ اکرمؐ اور مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے اور ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی ان کی دشمنی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ جنگِ بدر، اُحد، خندق اور حُدَیْبِیَہ کی داستانیں اسی دشمنی کی مظہر ہیں جس میں سیکڑوں مسلمان شہید ہوئے۔ اسی دشمنی کے ماحول میں سب سے پہلے امام علیؑ اسلام لائے

۱۔ حافظ عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، سنن، باب من هاب الفتيا، ج ۱، ص ۸۴۔

۲۔ دارمی، سنن، ج ۱، ص ۸۵۔ ابن عبداللہ، جامع بیان العلم، ج ۲، ص ۱۴۷۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۴۔

۳۔ اس واقعہ کی تفصیل جلد اول میں ص ۵۴۴۔۵۴۶ پر گزر چکی ہے۔

اور حضرت ابوطالبؑ نے پیغمبرِ اسلامؐ کے پشتیبان کا کردار ادا کیا اور حضرت فاطمہ زہراؑ کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہؑ نے ایثار و فداکاری کی تاریخ رقم فرمائی۔

اور ہجرت کے بعد جب مدنی زندگی شروع ہوئی اور قریش نے باقاعدہ لڑائیوں کا سلسلہ شروع کیا تو امام علی ابن ابیطالبؑ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے سب سے بڑے جاں نثار بن کر ابھرے اور مدینے کے انصار نے بھی اسلام کی فوج بن کر کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

جب آیۂ تطہیر نازل ہوئی تو اس آیت کے مصداق محمد، علی، فاطمہ، حسن و حسین علیہم السلام تھے اور جب آیۂ مباہلہ نازل ہوئی تو رسولِ اکرمؐ انہیں نفوسِ قدسیہ کو لے کر مباہلے کے لئے روانہ ہوئے۔ اسی طرح جب آیۂ قربیٰ نازل ہوئی تو رسولِ اکرمؐ نے اپنی بیٹی فاطمہ زہراؑ کو فدک ہبہ کیا۔

ایسی ہی مجبوریوں کی بناپر خلافت انتظامیہ نے لوگوں کو نقلِ حدیث نیز تفسیرِ قرآن بیان کرنے سے منع کیا۔ تفسیرِ قرآن پوچھنے والوں کو نہ صرف زدوکوب کیا گیا بلکہ قید کی سزا بھی دی گئی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ کہیں لوگوں کو خلافت غصب کرنے اور خاندانِ پیغمبرؐ کی مخالفت کرنے والوں کی اصلیت کا پتا نہ چل جائے اور اس کے ساتھ ساتھ مدینے سے باہر رہنے والے لوگوں کو انصار کی اسلامی خدمات کا علم نہ ہو جائے۔ ان حقائق کو چھپانے کے لئے حدیث کی اشاعت اور قرآن کی تفسیر ممنوع قرار دے دی گئی۔

یہ پالیسی کا ایک رخ تھا۔ اس کا دوسرا رخ یہ تھا کہ خلفاء کی تائید میں روایات گھڑی جائیں۔ اس کام کی ابتدا حضرت ابوبکرؓ کی خلافت سے ہوئی البتہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے دوران اس پالیسی کو شد و مد سے نافذ کیا گیا اور حدیث و سنت کے متبادل کے طور پر اسلامی معاشرے میں اسرائیلیات کو فروغ دیا گیا۔

۲۔ اسرائیلی روایات کی نشرواشاعت

حضرت عمرؓ کے عہد میں نشرِ حدیث پر پابندی عائد کی گئی اور اس کے بجائے اسرائیلی روایات کو فروغ دیا گیا۔ اس کام کے لئے کعب الاحبار کی خدمات حاصل کی گئیں جو ماضی میں یہودیوں کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے حضرت عمرؓ کے عہد میں اسلام قبول کیا تھا اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں دربارِ خلافت کا بڑا عالم بن کر ابھرا۔ اس کے علاوہ نومسلم عیسائی راہب تمیم داری کی خدمات بھی حاصل کی گئیں جو حضرت عمرؓ کے دور میں مسجدِ نبوی میں نمازِ جمعہ سے قبل خطاب کیا کرتا تھا۔

۳۔ اسلامی احکام وقوانین میں مُداخلت

حضرت عمرؓ نے قرآن وسنت میں بیان کردہ بہت سے احکامات میں تبدیلی کی جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کرچکے ہیں۔ علاوہ ازیں چند مسائل پر تفصیلی بحث معالم المدرستین جلد دوم میں ''خلفاء کے اجتہادات'' کے عنوان سے پیش کی گئی ہے اور ایسے تمام مسائل کی تحقیق کے لئے کئی کتابوں کی ضرورت ہے۔ ایسے خودساختہ قوانین واحکام کو دوسری صدی ہجری میں اجتہاد کا نام دیا گیا اسی لئے مکتبِ خلفاء کی کتابوں میں کچھ اس طرح کے الفاظ ہمیں دکھائی دیتے ہیں: ''خلیفہ نے اس مسئلے کے متعلق یہ اجتہاد کیا تھا۔''

۴۔ خلفاء کے لئے روایت سازی

گزشتہ صفحات میں ہم نے مسلسل لکھا کہ خلیفہ کی طرف سے نشرِ حدیث پر سخت پابندی عائد تھی اور کسی صحابی کو حدیثِ رسولؐ بیان کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ اس دَور میں دو افراد اس حکم سے مستثنیٰ تھے ایک امّ المومنین حضرت عائشہؓ اور دوسرے حضرت عمرؓ۔

حضرت عائشہؓ تینوں خلفاء کے عہد میں مکتبِ خلافت کی سرکاری ترجمان تھیں۔ خلفاء کو جس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی وہ ان سے پوچھ لیتے اور ام المومنین حکومت کی تائید میں حدیثِ رسولؐ بیان کرتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ نے حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ کی تائید کے لئے جو احادیث بیان کی تھیں ان میں سے ہم نے چند احادیث کی تفصیل اپنی کتاب ''نقشِ عائشہ در تاریخ اسلام'' کی جلد اول، صفحہ ۱۱۹ پر نقل کی ہے۔

حضرت عائشہؓ کے بعد حضرت عمرؓ وہ دوسرے شخص تھے جنہیں احادیث بیان کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ ہم ذیل میں ان کی چند ایسی روایات نقل کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی ہی حکومت کی تائید میں بیان کی تھیں۔

ہماری سابقہ بحثوں کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں کتاب وسنت کے مقابلے میں ''اجتہادِ خلیفہ'' کا عنصر شامل ہوگیا تھا اور یہاں عجیب پہلو یہ ہے کہ مکتبِ خلفاء میں حضرت ابوبکرؓ کے افعال کی تائید حدیثِ رسولؐ سے کی جاتی ہے جبکہ حضرت عمرؓ کے اجتہاد کو سنتِ رسولؐ سے مقدّم جانا جاتا ہے اور حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید حدیث کی بجائے قرآن سے کرائی جاتی ہے جیسا کہ ''موافقاتِ عمرؓ'' کی روایات میں حضرت عمرؓ کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ: ''میں نے چند امور میں اپنے پروردگار کے ساتھ موافقت کی۔''

ایک اور روایت میں اسی مفہوم کو حضرت عمرؓ نے اپنی زبانی ان الفاظ سے تعبیر کیا: ''میرے رب نے چند امور میں مجھ سے موافقت کی'' یا پھر ''خدا نے خلیفہ سے موافقت کی۔''

وہ مسائل کچھ اس طرح سے ہیں مثلاً حضرت عمرؓ خود کہتے ہیں: میں نے فلاں مسئلے کے لئے رسولِ اکرمؐ کو تجویز دی کہ ایسا کرنا چاہیے، اس کے بعد اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر وحی نازل فرمائی جس میں میری تجویز کے مطابق حکم دیا گیا اور میری تجویز کو تمام امت کے لئے واجب قرار دیا گیا۔

ایک اور روایت میں کہتے ہیں: میں نے رسولِ اکرمؐ کو فلاں کام سے منع کیا مگر آپؐ نے میری بات نہ مانی۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر قرآن کی آیت اتاری جس میں انہیں اس کام سے روک دیا گیا اور میری ہی رائے کے تحت وہ کام تمام مسلمانوں کے لئے حرام قرار پایا۔

اس طرح کی تمام روایات میں بیان کیا گیا کہ حضرت عمرؓ کے منہ سے جو الفاظ ادا ہوئے تھے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان ہی الفاظ میں وحی نازل فرمائی۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ جب سورۂ مومنون کی بارہویں سے چودہویں آیات نازل ہوئیں جن میں انسانی خلقت کے مراحل بیان کئے گئے ہیں تو میں نے اس آیت کی تکمیل کے لئے کہا: فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ. پس میرا کہا ہوا یہ جملہ ان آیات کا تکملہ بن کر نازل ہوا: ثُمَّ اَنْشَاْنَاہُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ. اسی روایت کو دلیل بنا کر مکتبِ خلفاء کے علماء نے کہا: قرآن میں عمرؓ کا کلام موجود ہے۔

ان روایات سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ جب رسولِ اکرمؐ کو کوئی تجویز دیتے تھے تو ان کی تجویز اتنی وقیع ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے وہ کام رسولِ اکرمؐ اور تمام مسلمانوں پر واجب کر دیتا تھا۔ ان کے کہے ہوئے الفاظ قرآن کی آیت بن کر نازل ہو جاتے تھے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ رسولِ اکرمؐ کوئی کام کرتے اور وہ سنتِ رسولؐ بنتا تو حضرت عمرؓ، رسولِ اکرمؐ کو اس کام سے منع کرتے تھے اور وہ آپ سے باقاعدہ بحث کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوتی جس میں رسولِ اکرمؐ سے کہا جاتا تھا کہ وہ اس کام کو چھوڑ دیں اور حضرت عمرؓ کی رائے پر عمل کریں۔

ان روایات کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ حضرت عمرؓ کی رائے رسولِ اکرمؐ کی رائے پر مقدم ہے۔ لہٰذا اگر رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کسی سنت کی بجائے اپنا حکم جاری کریں تو متاثرہ اذہان یہ فیصلہ کریں گے کہ سنتِ رسولؐ کے مقابلے میں حضرت عمرؓ کی رائے کی زیادہ اہمیت ہے کیونکہ نزولِ وحی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرمؐ کی بجائے ہمیشہ حضرت عمرؓ کی ہی تائید کی تھی اور یہ فکر اس طرح کی روایات سے اور بھی زیادہ پختہ ہوئی مثلاً کہا گیا کہ ملائکہ عمرؓ کے ساتھ ہمکلام ہوتے ہیں۔[1]

اور رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: اللہ نے عمرؓ کی زبان اور قلب پر حق کو جاری کیا ہے۔

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضائل عمرؓ، حدیث ۲۳۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۲، ص ۳۳۹ و ج ۶، ص ۵۵۔ مسند طیالسی، حدیث ۲۳۴۸۔

اور رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا۔[1]

''موافقاتِ عمرؓ'' کی روایات خود حضرت عمرؓ کے دَور میں ہی وضع کی گئی تھیں اور حضرت عمرؓ نے اپنی زبان سے ہی مذکورہ انکشافات کئے تھے۔ البتہ انہوں نے اپنی موافقات کی تعداد کچھ کم بیان کی تھی اور ان کے بعد ان کے پیروکاروں نے تائید مزید کی غرض سے ان میں اضافہ کیا۔

اس مقام پر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔

آخر صحابہ نے موافقاتِ عمر جیسی روایات کس طرح سے قبول کرلی تھیں؟ کیونکہ ان روایات کے مطابق حضرت عمرؓ کا مقام رسولِ اکرمؐ سے زیادہ بلند ہے اور یوں ان روایات سے نہ صرف مقامِ رسالت کی توہین ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اور قرآن مجید کی بھی توہین ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر خدا اور کلامِ خداؑ کے متعلق کیا جسارت ہوسکتی ہے کہ خلیفہ لوگوں کے سامنے کہیں کہ تخلیق انسان کے مراتب کی آیات سن کر میں نے فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کہا تو اللہ نے وحی میں بھی میرا ہی کہا ہوا جملہ نازل کردیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کی توہین آمیز گفتگو سن کر صحابہ کیوں خاموش رہے اور کسی نے بھی انہیں کیوں نہ ٹوکا؟

اسلام سے پہلے صحابہ کی حالت کیا تھی اور حضرت عمرؓ کے عہد میں ان کی حالت کیا تھی اگر اس سوال کے جواب پر نظر رکھی جائے تو سابقہ سوال کا جواب باآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔[2]

صحابۂ کرامؓ جو اسلام سے قبل غالباً جزیرۂ عرب میں صحرانشینی کی زندگی گزار رہے تھے یعنی وہ جو میٹھے پانی کے ایک گھونٹ اور شکم پُری کے لئے ایک روٹی کی خاطر ساری عمر سرگرداں رہتے تھے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ان کی حالت بالکل بدل چکی تھی اور نانِ شبینہ کے محتاج افراد بہترین باغات اور عالیشان محلات کے مالک بن چکے تھے اور ان کی خدمت کے لئے ایران، روم اور مصر جیسی متمدن دنیا کے افراد بطورِ غلام موجود تھے اور پری پیکر حسینائیں بطورِ کنیز ان کے محل سراؤں میں کام کررہی تھیں۔ یقیناً یہ سارا عیش و آرام انہیں حضرت عمرؓ کی فتوحات کی بدولت نصیب ہوا تھا اور ان لذات دنیا کے لئے انہیں حضرت عمرؓ کی خوشنودی عزیز تھی۔

کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ عمر ابن سعد نے حکومت رَے کے لالچ میں ریحانۂ رسول حضرت امام حسین علیہ السلام کو ذبح کرنا اور ابن زیاد کی فوج کا سالار بننا قبول کرلیا تھا۔ اس نے رسولِ مقبولؐ کے جگر گوشوں کو ریگزارِ کربلا میں شہید کیا اور ان کے پاک جسموں کو سُمِ اسپاں سے پامال کیا۔ پھر شہداء کے سرکاٹ کر نوکِ نیزہ

۱۔ ذہبی، تاریخ اسلام۔ حافظ ابن کثیر، تاریخ۔ ابن عساکر، تاریخ مدینۃ دمشق اور سیوطی، تاریخ الخلفاء، باب فضائل عمرؓ۔

۲۔ حضرت فاطمہؑ نے مسجدِ پیغمبرؐ میں کھڑے ہوکر صحابہ کو ان کی سابقہ زندگی کی تلخیاں یاد دلائی تھیں۔ حضرت فاطمہؑ کے خطبے کیلئے ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغۃ، طبع اول مصر، ج۴، ص۷۹ اور ابن طیفور کی بلاغات النساء ص۱۲ تا ۱۵ کا مطالعہ فرمائیں۔

پر بلند کئے اور حرمِ رسول اللہؐ کو قید کر کے ابن زیاد کے دربار میں پیش کیا؟

اگر حکومت رَے کے لالچ میں عمر ابن سعد یہ سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا تو پھر سعد بن وقاص، عمرو بن عاص اور مغیرہ بن شعبہ اور ان جیسے افراد خلیفہ کی خوشنودی کے طلبگار دکھائی دیں تو اس میں تعجب کیا ہے؟

حضرت سیدالشہداء امام حسین علیہ السلام نے کیا ہی خوب فرمایا ہے:

اِنَّ النَّاسَ عَبِیْدُ الدُّنیَا وَ الدِّیْنُ لَعْقٌ عَلٰی اَلْسِنَتِهِمْ یَحُوْطُوْنَهٗ مَا دَرَّتْ مَعَائِشُهُمْ فَاِذَا مُحِصُّوْا بِالْبَلَاءِ قَلَّ الدَّیَّانُوْنَ یعنی لوگ دنیا کے بندے ہیں اور دین کا نام صرف زبان کے چٹخارے کے لئے لیتے ہیں۔ جب تک ان کی زندگی اچھی گزرتی رہے وہ دین سے وابستہ رہتے ہیں لیکن جونہی آزمائش کا وقت آتا ہے تو دین کے طرف دار بہت تھوڑے رہ جاتے ہیں۔

فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے کے بعد اکابر صحابہ خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ گئے اور ان کی اکثریت کی رضامندی سے موافقاتِ عمر کی تائیدی روایات منظر عام پر آئیں اور ان روایات کو پہلے اسلام کے مرکز مکہ و مدینہ میں پھیلایا گیا پھر وہاں سے یہ روایات ان نومسلموں تک پہنچیں جنہوں نے فتوحات کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔

خلیفہ کے اقدامات کا نتیجہ

حدیث سے متعلق حضرت عمرؓ کی مذکورہ چار پالیسیوں کا نتیجہ اسلام اور مسلمانوں میں یوں نمودار ہوا۔

(۱) حضرت عمرؓ نے حدیث روایت کرنے کو ممنوع قرار دیا تھا۔ ان کی یہ پالیسی امام علیؑ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت کے علاوہ ستر سال تک جاری رہی۔ یعنی حضرت عمرؓ کے دور سے لے کر آخری اموی خلیفہ کے دور تک یہی پالیسی قائم رہی۔

(۲) جب تدوینِ حدیث کا آغاز ہوا تو اس وقت تک اسرائیلی روایات کا خس و خاشاک حدیثِ پیغمبرؐ میں شامل ہو چکا تھا چنانچہ یہ روایات بھی اسلامی کتابوں میں در آئیں اور ان ہی روایات کی وجہ سے آج تک مسلمان گہرے اعتقادی انحراف کا شکار چلے آرہے ہیں جس کی کچھ وضاحت ہم ''معانی اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ'' کے باب میں کریں گے۔ انشاء اللہ۔

(۳) حضرت عمرؓ نے قرآن و سنت کے بہت سے احکامات میں کمی بیشی کی جس کی تفصیل کے لئے الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ امام علی ابن ابی طالبؑ نے اپنے ایک خطبے میں ایسے پچیس سے زیادہ امور کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی وضاحت ہم نے معالم المدرستین جلد دوم میں کی ہے۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں تک حضرت عمرؓ کے اجتہادات اس قدر زیادہ ہو چکے تھے کہ دین اسلام کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا تھا۔

ایک اسلام وہ تھا جو کہ عصرِ رسول میں رائج تھا جس کی بنیاد قرآن و سنت پر تھی۔ دوسرا اسلام وہ تھا جو خلیفہ کے اجتہادات نے تشکیل دیا تھا اور اس وقت پرانے مسلمانوں کی اکثریت اور نئے مسلمانوں کی پوری جماعت اس سے وابستہ ہو چکی تھی اور جدید اسلام کے بہت سے احکام و مسائل قرآن و سنت کے معارض تھے۔

خلافتِ عمرؓ کا اِختتام اور مجلس شوریٰ کا قیام

ابولولو مجوسی کی ضربت کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنی جانشینی کے لئے چھ افراد پر مشتمل ایک شوریٰ تشکیل دی جس میں علیؑ و عثمانؓ بنی عبدمناف سے، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص بنی زہرہ سے، زبیر بنی اسد سے اور طلحہ بن عبیداللہ بنی تیم سے لئے گئے تھے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر کو حکم دیا کہ وہ ان افراد کے درمیان بطورِ فیصل موجود رہیں علاوہ ازیں ابوطلحہ انصاری کو پچاس شمشیر اندازوں پر حاکم بنا کر حکم دیا کہ وہ شوریٰ کی نگرانی کریں۔ اگر پانچ آدمی ایک طرف ہوں اور ایک آدمی مخالفت کرے تو مخالف کی گردن بلا دریغ اڑا دی جائے۔ اگر چار آدمی ایک طرف ہوں اور دو آدمی دوسری طرف تو پھر دو آدمیوں کی گردن ماردی جائے لیکن اگر دونوں طرف تین تین آدمی ہوں تو عبداللہ بن عمر کا فیصلہ تسلیم کیا جائے یا پھر اس گروہ کی رائے کو تسلیم کیا جائے جس میں عبدالرحمٰن بن عوف ہوں۔ جو تین افراد عبدالرحمٰن کی رائے کے مخالف ہوں ان کی گردنیں کاٹ دی جائیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میرا گمان ہے کہ ان میں سے علیؑ یا عثمانؓ خلیفہ ہوں گے۔

ملاقات کے بعد جونہی یہ لوگ خلیفہ کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے تو امام علیؑ نے بنی ہاشم سے فرمایا کہ خلافت ہم سے دور ہوگئی ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کس دلیل کے تحت یہ بات کہہ رہے ہیں؟

امام علیؑ نے فرمایا: سعد، عبدالرحمٰن بن عوف کا چچازاد ہے اور عبدالرحمٰن، عثمانؓ کا داماد ہے۔ چنانچہ یہ تینوں افراد اتفاق کرلیں گے اور اگر طلحہ و زبیر نے بالفرض میری حمایت کی تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ عبدالرحمٰن دوسروں کے ساتھ ہے۔[۱]

۱۔ طبری، تاریخ، ج۵، ص۲۷۷۷ تا ۲۷۸۱، مطبوعہ یورپ۔ احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری، انساب الاشراف، ج۵، ۱۵ تا ۱۸۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اس فرمان سے عبدالرحمٰن بن عوف کو خلیفہ گر کا کردار سپرد کیا۔ حضرت عمرؓ کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شوریٰ کا حقیقی راز عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس تھا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن عوف نے کیا کیا تھا تاکہ ہم بھی اس راز کو جان سکیں۔

عبدالرحمٰن بن عوف نے ان تین دنوں میں جو کارنامہ سرانجام دیا تھا وہ یہ تھا کہ انہوں نے مہاجرین و انصار کے علاوہ دیگر مسلمانوں کو مسجدِ نبوی میں جمع کیا اور خلافت کے امیدواروں سے کہا کہ میں اور سعد خلافت سے اس شرط پر دستبردار ہو جاتے ہیں کہ مجھے تم چاروں میں سے کسی کو منتخب کرنے کا مکمل اختیار ہوگا۔

حضرت عثمانؓ نے سب سے پہلے اس پیشکش کو قبول کیا اور امام علیؑ کے سوا باقی افراد نے بھی ثالثی کی اس پوزیشن کو تسلیم کرلیا۔

ابوطلحہ انصاری نے جو کہ پچاس شمشیرزن افراد کے ہمراہ وہاں موجود تھے امام علیؑ سے پوچھا: اے ابوالحسن! آپ عبدالرحمٰن کو ثالث کیوں نہیں مانتے جبکہ وہ قابلِ اطمینان مسلمان ہے؟

امام علیؑ نے عبدالرحمٰن بن عوف سے فرمایا کہ میں تمہارے مطلوبہ کردار کو اس صورت میں قبول کروں گا جب تم قسم کھا کر اقرار کرو کہ خواہشِ نفس پر عمل نہیں کروگے اور ہر حال میں حق کی پاسداری کروگے۔

عبدالرحمٰن بن عوف نے قسم کھائی کہ میں حق کی پاسداری کروں گا۔

اس وقت امام علیؑ نے فرمایا: ٹھیک ہے اب تم اپنا کام کرو۔

اس کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف نے دنیا کو یہ باور کرانے کے لئے کہ وہ علی ابن ابی طالبؑ اور عثمان بن عفانؓ کو خلافت کے لئے بطور امیدوار منتخب کر رہے ہیں لوگوں سے ان کی رائے چاہی۔ اس وقت دونوں امیدواروں کے حامیوں کا جوش وخروش دیدنی تھا اور دونوں کے حامی اپنے اپنے امیدوار کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھنے کے خواہش مند تھے۔

حضرت عمارؓ نے کہا: اگر تم چاہتے ہو کہ لوگوں کا آپس میں اختلاف نہ ہو تو پھر علیؑ کی بیعت کرو۔

حضرت مقدادؓ نے کہا: عمارؓ سچ کہہ رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ کے ماموں زاد عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے کہا: اگر تم چاہتے ہو کہ قریش آپس میں اختلاف نہ کریں تو پھر عثمانؓ کی بیعت کرو۔

عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی نے کہا: عبداللہ بن سعد بن ابی سرح سچ کہہ رہا ہے۔ اگر تم نے عثمانؓ کی بیعت کی تو میں بھی بیعت کروں گا۔

حضرت عمارؓ نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح سے کہا: تو کب سے اسلام کا خیرخواہ بنا ہے؟

پھر بنی ہاشم اور بنی امیہ آپس میں گفتگو کرنے لگے۔

حضرت عمارؓ نے اُٹھ کر کہا: اے لوگو! خدا نے اپنے پیغمبرؐ کی وجہ سے تمہیں عزت دی ہے اور اپنے دین کے ذریعے سے تمہیں سربلندی عطا کی ہے۔ تم کب تک خلافت کو اہلبیتؑ سے دور رکھوگے؟

ایک مخزومی نے اُٹھ کر کہا: اے فرزندِ سمیہ! تم اپنی حد پار کر رہے ہو۔ تمہیں قریش کے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟[1]

سعد بن ابی وقاص نے عبدالرحمٰن سے کہا: اس کام کو جلد نمٹاؤ ورنہ شورش پیدا ہو جائے گی۔

عبدالرحمٰن بن عوف جنہوں نے بڑے ماہرانہ انداز میں معاملات کو منطقی نتیجے تک لے جانے کی منصوبہ بندی کی تھی اور لوگوں میں بھی ہیجان پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی، ظاہرداری کرتے ہوئے امام علیؑ سے مخاطب ہو کر کہا: میں آپ کی بیعت کرتا ہوں اور اس کے لئے میری شرط یہ ہے کہ آپ کتابِ خدا، سنتِ رسول اور سیرتِ شیخین پر عمل کریں گے۔

امام علیؑ نے کہا: میں مقدور بھر کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ پر عمل کروں گا۔

پھر عبدالرحمٰن نے حضرت عثمانؓ کی طرف رخ کر کے کہا: میں آپ کی بیعت کرتا ہوں اور اس کے لئے میری شرط یہ ہے کہ آپ کتابِ خدا، سنتِ رسول اور سیرتِ شیخین پر عمل کریں گے۔

حضرت عثمانؓ نے کہا: میں کتابِ خدا، سنتِ رسولؐ اور سیرتِ ابوبکرؓ و عمرؓ پر عمل کروں گا۔

عبدالرحمٰن نے دوبارہ امام علیؑ کے سامنے وہی شرط بیان کی تو امام علیؑ نے بھی اپنا پہلا جواب دُہرایا۔ پھر عبدالرحمٰن نے دوسری بار حضرت عثمانؓ کے سامنے اپنی شرط دہرائی تو انہوں نے دوسری بار بھی اثبات میں جواب دیا۔

عبدالرحمٰن نے تیسری بار امام علیؑ کی طرف رخ کر کے اپنی شرط کا اعادہ کیا۔ امام علیؑ نے تیسری بار فرمایا: کتابِ خدا اور سنتِ پیغمبرؐ کی موجودگی میں کسی کی سیرت پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس ذریعے سے تم امرِ خلافت کو مجھ سے دور کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ عبدالرحمٰن نے تیسری بار حضرت عثمانؓ کی طرف رخ کیا اور اپنی شرط کو دہرایا۔ حضرت عثمانؓ نے تیسری بار بھی اثبات میں جواب دیا۔ عبدالرحمٰن نے ہاتھ بڑھا کر مذکورہ شرط کے تحت حضرت عثمانؓ کی بیعت کی اور انہیں مسلمانوں کا خلیفہ بنا دیا۔[2]

۱۔ طبری، تاریخ، ج۵، ص۲۷۷۹-۲۷۸۷، مطبوعہ یورپ۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، شرح خطبۂ شقشقیہ، ج۱، ص۱۹۳۔

۲۔ طبری، تاریخ، ج۵، ص۲۷۹۳، مطبوعہ یورپ۔ ابن واضح، تاریخ یعقوبی، ج۱، ص۱۶۲-۱۶۳۔ بلاذری، انساب الاشراف، ج۵، ص۱۹۔ ابن عبدربہ اندلسی، العقد الفرید، ج۳، ص۷۷۔ شوریٰ کی تفصیلات کیلئے معالم المدرستین ج۱، صفحہ ۱۳۵، طبع دوم دیکھئے۔

حضرت عمرؓ کی "خود تشکیل کردہ شوریٰ" کا یہ وہ راز تھا جو عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس تھا جسے انہوں نے بڑی دانائی کے ساتھ نافذ کیا تھا۔

بیعتِ عثمانؓ کے بعد کی کہانی

جب عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمانؓ کی بیعت کی تو امام علیؑ ناراض ہو کر وہاں سے اُٹھے اور چل دیئے۔ اس وقت عبدالرحمٰن بن عوف آگے بڑھے، انہوں نے اپنے ہاتھ میں تلوار پکڑ رکھی تھی، یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ارکانِ شوریٰ میں سے صرف عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس تلوار تھی جبکہ پانچ دوسرے اشخاص نہتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے امام علیؑ سے کہا: آپ بیعت کریں ورنہ میں آپ کی گردن اُڑا دوں گا۔ دوسرے ارکانِ شوریٰ نے بھی امام علیؑ سے کہا کہ آپ عثمانؓ کی بیعت کریں ورنہ ہم سب آپ سے جنگ کریں گے۔ امام علیؑ واپس آئے اور انہوں نے حضرت عثمان کی بیعت کی۔[1]

شوریٰ اور بیعتِ عثمانؓ کا ماحصل

(۱) مجلسِ شوریٰ قریش کے چھ افراد پر مشتمل تھی جس میں عبدالرحمٰن بن عوف کو خلیفہ چننے کا اختیار دیا گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ، حضرت ابوبکرؓ کے انتہائی معتمد تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو ہی تعیینِ خلیفہ کی دستاویز لکھنے کیلئے پسند کیا تھا اور جب ابتدائی الفاظ لکھوانے کے بعد وہ بیہوش ہوگئے تو حضرت عثمانؓ نے ہی ان کے مافی الضمیر کو سمجھتے ہوئے یہ الفاظ لکھے تھے: "میں تمہاری بھلائی کو مدِّنظر رکھ کر عمر بن خطابؓ کو اپنا جانشین نامزد کرتا ہوں۔"

حضرت عثمانؓ نے اپنی طرف سے یہ الفاظ لکھ کر جہاں حضرت ابوبکرؓ کے دلی جذبات کی ترجمانی کی تھی وہاں انہوں نے حضرت عمرؓ کو بھی زیر بارِ احسان کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اس احسان کا بدلہ چکانے کی فکر میں تھے اس لئے انہوں نے ایک گورکھ دھندہ قسم کی شوریٰ تشکیل دی تھی جس کے اراکین پر ایک نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ عنانِ خلافت حضرت عثمانؓ کی طرف موڑ دی گئی ہے۔

(۲) دنیا کو دکھانے کے لئے مجلسِ شوریٰ میں امام علیؑ کو بھی نامزد کیا گیا تھا لیکن دَرپردہ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن کو سمجھا دیا تھا کہ نئے خلیفہ سے کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ کے علاوہ سیرتِ شیخینؓ پر عمل کرنے کا عہد بھی لیں کیونکہ ان کو یقین تھا کہ امام علیؑ ہرگز یہ شرط قبول نہیں کریں گے اور اسی لئے وہ خلیفہ نہیں بن سکیں گے۔ چنانچہ جو کچھ انہوں نے سوچا تھا وہی ہو کر رہا۔

۱۔ احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری، انساب الاشراف۔

(۳) سیرتِ شیخین کی شرط کو کتاب و سنت کی طرح منوانے کے لئے پچاس شمشیر اندازوں کا دستہ مقرر کیا گیا کہ چھ میں سے جو بھی آدمی اس شرط کو تسلیم نہ کرے اسے بے دریغ قتل کر دیا جائے۔

یہ شمشیر انداز صرف امام علیؑ کے لئے کھڑے کئے گئے تھے کیونکہ حضرت عمرؓ کے ذہن رسا نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ان میں سے امام علیؑ کے علاوہ کوئی دوسرا مخالفت نہیں کرے گا اور حضرت عمرؓ کا یہ خدشہ صرف اندازوں پر مبنی نہیں تھا کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے وقت بھی علیؑ نے مخالفت کی تھی اور اس وقت حضرت زبیر نے ان کی حمایت کی تھی۔

حضرت عمرؓ یہ بھی جانتے تھے کہ ان بارہ برسوں میں امام علیؑ اور حضرت زبیر کے وہ پرانے مراسم قائم نہیں رہے تھے پھر بھی انہوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ان پچاس لوگوں کو ارکانِ شوریٰ پر متعین کیا تھا کہ اگر بالفرض اس بار بھی حضرت زبیر، امام علیؑ کا ساتھ دیں اور نئے خلیفہ کی بیعت نہ کریں تو علیؑ کے ساتھ ان کا کام بھی تمام کر دیا جائے۔

(۴) سیرتِ شیخین کی شرط نے سنتِ پیغمبرؐ پر تین منفی اثرات مرتب کئے:

الف: شروع شروع جب خلیفۂ اول نے اجتہاد کیا تو ان کی تائید میں احادیث بھی تیار کی گئیں لیکن بعدازاں حضرت عمرؓ نے بہت سے مسائل میں تغیر و تبدل کیا تو ان کی تائید میں حدیث سازی کی زحمت بھی نہیں کی گئی بلکہ صرف یہ کہہ دیا گیا کہ خلیفہ کے اجتہاد کے لئے حدیث کی ضرورت نہیں کیونکہ یہی بزرگوار اکثر رسولِ اکرمؐ کی بھی اِصلاح کیا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ بھی وحی کے ذریعے ان کی تائید کردیا کرتا تھا۔

زندگی کے آخری لحات میں حضرت عمرؓ نے سوچا کہ ممکن ہے ہمارے اجتہاد کو تسلیم نہ کیا جائے اور اسے ہماری ذاتی آراء کہہ کر مسترد کر دیا جائے لہٰذا انہوں نے عبدالرحمٰن کو یہ وصیت کی کہ کتاب و سنت کی طرح سیرتِ شیخین کو بھی حصولِ خلافت کی ایک شرط بنا کر پیش کریں تاکہ ان کے اجتہاد کو قانونی تحفظ حاصل ہو سکے۔ حضرت عمرؓ کے ذہنِ رسا نے جو سوچا تھا وہ پورا ہو کر رہا اور اس دور سے لے کر آج تک (اور شاید ظہورِ مہدیؑ تک) ان کے اجتہاد کو امت کی اکثریت نے دین کا حصہ تسلیم کرلیا ہے اور اس کے برعکس کتاب و سنت کے احکام کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔

ب: اِس شرط کی وجہ سے مکتبِ خلفاء میں سیرتِ شیخین کو کتاب و سنت کا درجہ ملا اور اسے احکامِ اسلام کے استنباط کا ماٗخذ قرار دیا گیا۔

ج: اِس شرط کو تسلیم کر کے شیخین کے تمام ''تصرفات'' کو نہ صرف قانونی تحفظ حاصل ہوا بلکہ مکتبِ خلفاء میں آئندہ کے لئے بھی اس قسم کے اجتہادات کا دروازہ کھل گیا اور مکتبِ خلفاء میں دو گروہوں کو کتاب و

سنت کے مقابلے میں اجتہاد کا حق دیا گیا۔ ان میں سے پہلا گروہ خود خلفاء کا تھا اور دوسرا اس مکتب کے علماء کا تھا۔

ہم اِنشاءَ اللہ آئندہ ابواب میں مکتبِ خلفاء کے علماء کے اجتہاد کا جامع جائزہ پیش کریں گے۔ البتہ کتاب و سنت کے مقابلے میں خلفاء کے اجتہاد کے لئے معالم المدرستین جلد دوم باب ''مدرسہ خلفاء کے مجتہدین'' ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں ہم صرف ایک گواہی پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ عباسی خلیفہ ظاہر بِاَمْرِاللہ بن ناصر لِدِیْنِ اللہ ان الفاظ کے ساتھ لوگوں سے اپنے لئے بیعت لیتا تھا: ''میں اپنے آقا و مولا، تمام لوگوں کے لئے واجب الاطاعت امام، ابونصر محمد الظاہر بِاَمْرِاللہ کی کتابِ خدا، سنتِ پیغمبر اور اجتہادِ امیرالمومنین پر بیعت کرتا ہوں اور یہ کہ اس کے علاوہ کوئی خلیفہ نہیں ہے۔''[۱]

ظاہر بِاَمْرِاللہ کی بیعت ۶۲۳ھ میں کی گئی تھی۔ بیعت کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ خلیفہ کتاب و سنت کے مطابق عمل کرے گا نیز اسے اپنے ذاتی اجتہاد پر بھی عمل کرنے کا پورا پورا اختیار ہوگا اگرچہ اس کا اجتہاد کتاب و سنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

نتیجہ بحث

سابقہ بیانات کا نتیجہ یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں احکامِ اسلام کا سرچشمہ کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ تھا اور موقع و محل کی مناسبت سے قرآن مجید کی آیات نازل ہوتی رہتی تھیں۔ آخرکار آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ میں ہی اللہ تعالیٰ نے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی آیت کے ذریعے اِکمالِ دین کا اعلان کردیا۔ یہ اسلام زمانۂ مصطفیٰؐ کا اسلام تھا۔

رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد خلفاء اور مکتبِ خلفاء کے علماء نے بعض احکام اپنی صوابدید کے مطابق تبدیل کئے اور زمانۂ مصطفیٰؐ کے اسلام کی طرف سے اس تبدیلی و ترمیم کو قانونی تحفظ بھی فراہم کیا گیا اور اسی حقیقت کو دیکھ کر اسلام دشمن آج تک یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں: ''اسلام کے عقائد و احکام مرحلہ وار مکمل ہوئے ہیں۔'' اس موضوع پر مشہور یہودی مستشرق گولڈزیہر (Goldizeher) نے ''تَطَوُّرُ العقیدۃ وَ الشریعۃ فِی الاسلام'' نامی کتاب لکھی ہے۔

یہ سب کچھ سیرتِ شیخین کی شرط کی وجہ سے ہی ہوا اور حضرت عثمانؓ نے اس شرط کو تسلیم کرکے اسے قانونی جواز فراہم کیا جس کی وجہ سے مکتبِ خلفاء میں ذاتی آراء کو قرآن و سنت کے مساوی حیثیت مل گئی۔

۱۔ حافظ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص۳۶، مطبوعہ مصر، سال ۱۳۷۱ھ۔

سنّتِ رسولؐ — عہدِ عثمانؓ میں

حضرت عثمانؓ یکم محرم ۲۴ھ کو خلیفہ بنے اور ۳۵ھ ذی الحجہ میں قتل ہوئے۔ ان کی مدتِ خلافت بارہ سال تھی۔ حضرت عمرؓ اپنی مسلسل کوششوں سے ان کی خلافت کی راہ ہموار کر گئے تھے اور ویسے بھی حضرت عثمانؓ کتاب و سنت اور سیرتِ شیخین کی شرط پر برسرِاقتدار آئے تھے اس لئے کسی کو بھی ان پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

حضرت عثمانؓ کے بارہ سالہ دورِ خلافت کو چھ چھ برسوں کے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا چھ سالہ دَور

اس عرصے میں حضرت عثمانؓ، حضرت عمرؓ کے اندازِ حکمرانی کی پیروی کرتے رہے اور ان کے اجتہاد کو بروئے کار لاتے رہے۔ ان کا یہ عرصۂ خلافت حضرت عمرؓ کے دَور کی بہ نسبت زیادہ ملاطفت آمیز تھا۔ انہوں نے غیر عرب افراد کو مدینے میں رہائش کی اجازت دی اور صحابہ کو مدینے سے باہر جانے کی بھی اجازت دے دی۔ اسی لئے ان کے چھ سالہ دَور کو حکومت اور عوام کے درمیان بہتر تعلقات کا دَور قرار دیا جاسکتا ہے۔

دوسرا چھ سالہ دَور

اِس دَور میں حضرت عثمانؓ نے کچھ تازہ اجتہادات کیے جن میں خویش پروری کا اجتہاد سرفہرست تھا۔

حضرت عمرؓ اپنے دَور میں قریش اور ان کے حلیف قبائل کو مرکزی اور کلیدی عہدوں پر فائز کرتے تھے اور جب انہیں منصب کے لائق شخص قریش میں دکھائی نہ دیتا تو وہ انصار میں سے بدّری و اُحدی صحابہ کی اولاد کا بھی بعض مناصب پر تقرر کردیتے تھے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اپنے دوسرے چھ سالہ دَور میں جو اجتہاد کیا اس کی رو سے تمام کلیدی مَناصب قریش کے جانے پہچانے افراد کی بجائے اپنے قبیلے بنی امیہ کے سپرد کردیئے۔ عراق و ایران کے فاتح سعد بن ابی وقاص کو معزول کر کے انہوں نے کوفے کی گورنری پر اپنے شرابی بھائی ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو مقرر کیا۔ مصر کے فاتح عمرو بن عاص کو گورنری سے ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی سعد بن ابی سرح کو مقرر کیا۔ باقی تمام شہروں میں بھی انہوں نے بنی امیہ کے جوانوں کو گورنر مقرر کیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے بیٹے اور رشتہ داروں کو کلیدی عہدے ہی نہیں دیئے بلکہ انہوں نے صِلہ رحمی کے نام پر بنی امیہ کے لئے بیت المال کے دروازے کھول دیئے اور یہ سلسلہ ان کے قتل تک جاری رہا۔

اس چھ سالہ دَور میں بنی امیہ نے مسلمانوں پر ظلم وستم روا رکھا۔ مظلوم اور شاکی افراد جب دادرسی کے لئے خلیفہ کے پاس گئے تو ان کی شنوائی نہ ہوئی بلکہ ان کو بدترین سزاؤں کے علاوہ سرِعام گالیاں دے کر رُسوا کیا گیا۔ ان چھ سالوں میں حضرت عثمانؓ نے اقرباء پروری کر کے بنی امیہ کے لئے مستقبل کی حکومت کا راستا ہموار کیا اسی لئے انہیں بنی امیہ کے سلسلے کا پہلا حکمران شمار کیا جاتا ہے۔

عہدِ عثمانؓ میں حدیث پالیسی

عیسائی راہب تمیم داری جو بوجوہ مسلمان ہو گیا تھا، حضرت عمرؓ کی اجازت سے خطبۂ جمعہ سے قبل مسجدِ نبوی میں خطاب کیا کرتا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں اسے دربار میں بھی خطاب کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ایک سابق عیسائی راہب مسجدِ نبوی میں صحابۂ کرامؓ کی موجودگی میں ہفتے میں دو بار خطاب کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اسی دَور میں کعب الاحبار کو سرکاری عالم ہونے کا اعزاز دیا گیا۔

حضرت عثمانؓ کے دوسرے چھ سالہ دَور میں حضرت ابوذرؓ اور حضرت عمارؓ جیسے جلیل القدر اور صادق اللہجہ صحابی بڑی رازداری سے احادیث پھیلانے میں مصروف ہوگئے لیکن حکومت کو اطلاع ملنے پر ان کو سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت ابوذرؓ کو حق گوئی کی پاداش میں مدینے سے شام جلاوطن کیا گیا۔ جب امیرِ شام ان کی حدیث گوئی کے سبب پریشان ہوگیا تو انہیں شام سے دوبارہ مدینے بھیج دیا گیا جہاں خلیفہ کے روبرو حدیث گوئی کے ''جرم'' میں آپ کو شہر بدر کر کے ربذہ کے بے آب وگیاہ صحرا میں بھیج دیا گیا جہاں آپ بھوک و پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر فوت ہوئے۔ اسی طرح حضرت عمارؓ کو بھی سخت جسمانی ایذائیں دی گئیں۔[1]

حضرت عثمانؓ کو اپنے پہلے چھ سالوں میں احکامات کے جواز کے لئے حدیث سے مدد لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن دوسرے چھ سالہ دَور میں حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ جعلی حدیثیں بھی گرتی ہوئی حکومت کو سہارا نہ دے سکیں اور یوں عثمانی حکومت اپنے منطقی انجام کو پہنچی۔

خلافتِ عثمانؓ کا خاتمہ کیسے ہوا؟

جب بنی امیہ کے حکام نے مصر، کوفہ اور بصرہ میں لوگوں پر مظالم کی انتہا کردی تو وہاں کے باشندے بڑی تعداد میں جمع ہو کر احتجاج کرنے مدینہ آنے لگے۔ یہاں اتفاق سے انہیں قریش کے عمائدین کی سرپرستی بھی حاصل ہوگئی جن میں حضرت عائشہؓ اور طلحہ و زبیر سرفہرست تھے۔ کئی سالوں تک

۱۔ نقش عائشہؓ در تاریخ اسلام، باب ''بی بی عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے عہد میں۔''

حالات اسی نہج پر چلتے رہے۔ اس دوران حضرت عثمانؓ کے چچا حکم بن ابی عاص، ان کے شرابی بھائی ولید اور ان کے رضاعی بھائی سعد بن ابی سرح کی مذمت پر مبنی احادیث بھی سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہوئی لوگوں کی زبانوں تک پہنچیں اور پورے عالم اسلام میں پھیل گئیں۔

امیر المومنین امام علیؑ کی کوششوں سے کئی بار حضرت عثمانؓ اور شورشی افراد میں مذاکرات کے بعد معاہدہ ہو جاتا لیکن جب حضرت عثمانؓ معاہدے پر عملدرآمد نہ کرتے تو لوگوں کو مجبوراً پھر مدینے آنا پڑتا اور وہ خلیفہ سے عدل و انصاف کا مطالبہ کرتے تھے۔ امام علیؑ کی زیرِ قیادت بنی ہاشم نے ہر ممکن طریقے سے حضرت عثمانؓ کو شورشیوں سے محفوظ رکھا۔ آخرکار پچیس سال سے زبانوں پر لگے ہوئے تالے ٹوٹ گئے اور کچھ صحابہ نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے امام علیؑ کی شان میں احادیثِ رسولؐ بیان کرنی شروع کر دیں۔ جن لوگوں نے آنحضرتؐ کی زیارت نہیں کی تھی جب انہوں نے ان احادیث کو سنا تو امام علیؑ ان کی تمناؤں کا مرکز بن گئے اور تمام مسلمانوں کی زبانوں پر صرف انہیں کا نام آنے لگا اور وہ امام علیؑ کو ہی امت کا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔

معاہدے کی بار بار خلاف ورزیوں سے بددل ہو کر شورشی افراد نے خلیفہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اس مرحلے پر بھی امام علیؑ نے ہر ممکن طریقے سے حضرت عثمانؓ کی مدد کی۔ آپ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو ان کے گھر پر پہرہ دینے کے لئے بھیجا کہ کہیں لوگ حملہ کر کے انہیں قتل نہ کر دیں۔ اس پہرے کے دوران امام حسنؑ کو کچھ کاری زخم بھی آئے۔

آخرکار محمد بن ابی بکر چند شورشیوں کو لے کر ہمسائے کے گھر سے خلیفہ کے گھر میں داخل ہوئے اور انہیں قتل کر دیا۔ خلیفہ کے قتل کے ساتھ ہی مسلمان بیعت کی زنجیروں سے آزاد ہو گئے۔ وہ پہلی بار اپنی قسمت کے آپ مالک بنے۔ تمام معتبر روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے اصحاب اور دوسرے اہلِ مدینہ امام علیؑ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ "یہ نظام کسی امیر کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، لوگوں کے لئے ایک امام کا وجود ناگزیر ہے اور آج آپ کے سوا ہم کوئی شخص نہیں پاتے جو اس منصب کے لئے آپ سے زیادہ مستحق ہو، نہ سابق خدمات کے اعتبار سے اور نہ رسولِ اکرمؐ کے ساتھ قرب کے اعتبار سے۔" امام علیؑ نے انکار کیا مگر لوگ اصرار کرتے رہے۔ آخرکار آپ نے کہا کہ میری بیعت گھر بیٹھے خفیہ طریقے سے نہیں ہو سکتی، عام مسلمانوں کی رضا کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں۔ پھر مسجد نبوی میں اجتماع عام ہوا اور تمام مہاجرین و انصار نے امام علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کی۔[1]

۱۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک، ج ۳، ص ۴۵۲۔

سنتِ رسولؐ — عہدِ علیؑ میں

ماہ ذی الحجہ ۳۵ھ میں امام علیؑ سریر آرائے خلافت ہوئے اور ماہ رمضان ۴۰ھ میں مسجد کوفہ میں شہید کر دیئے گئے۔ آپ کی مدتِ خلافت چار سال آٹھ ماہ بنتی ہے۔

حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد جب لوگوں کا شدید اصرار ہوا تو آپ نے چند شرائط کے تحت ان کی بیعت کو قبول کیا ان شرائط میں یہ دو شرطیں انتہائی اہم تھیں:

(۱) آپ لوگوں کو حق و عدالت کی راہ پر چلائیں گے اور سنتِ رسولؐ کی پیروی کریں گے۔

(۲) مسلمانوں کو بتائے بغیر بیت المال سے ایک درہم بھی اٹھا کر کسی کو نہیں دیں گے۔

اس شرط کے ذریعے آپ نے مراعات یافتہ طبقے کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا کیونکہ اسی شرط کے ذریعے آپ نے تمام اہلِ مدینہ سے بیعت لی۔ البتہ بنی امیہ اور ان کے مقرب افراد نے آپ کی بیعت نہیں کی جن میں خلیفہ کا مدح گو شاعر حسّان بن ثابت اور سابقہ دَور میں کاتبِ قرآن زید بن ثابت شامل ہیں۔ علاوہ ازیں سعد بن ابی وقاص اور اسامہ بن زید بھی یہ کہہ کر امام علیؑ کی بیعت میں شامل نہ ہوئے کہ اس کے بعد معاشرے میں اختلاف پیدا ہونے والا ہے۔

عہدِ علیؑ کی مالی پالیسی

اپنی بیعت کے ایک دن بعد آپ نے بیت المال کی رقم تمام مسلمانوں میں برابر تقسیم کردی اور ہر مسلمان کے حصے میں تین دینار آئے۔ آپ نے بدری، اُحدی، خندقی، مہاجر، انصار، طلقاء (آزاد شدہ) اور عرب و غیر عرب میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا۔ حد یہ ہے کہ آپ کے غلام قنبر کو بھی تین دینار ملے اور آپ کو بھی اپنے حصے کے تین دینار ملے۔

دولت کی مساوی تقسیم مراعات یافتہ طبقے کے لئے خطرے کی گھنٹی تھی۔ چنانچہ طبقاتی نظام کی بدولت سرمایہ دار بننے والوں کا وفد مسجد نبوی میں جمع ہوا اور آپ سے کہا: یا علیؑ! آپ نے اپنے کام میں عدل کے تقاضوں کو مدنظر نہیں رکھا۔ جو لوگ ہماری تلواروں کی وجہ سے مسلمان ہوئے اور جو کل تک ہمارے غلام تھے اور جنہیں ہم نے راہِ خدا میں آزاد کیا تھا، آپ نے انہیں بھی ہمارے برابر وظیفہ دیا ہے۔ آپ نے ہماری سبقتِ اسلام کو فراموش کر دیا ہے۔

امام علیؑ نے فرمایا: تم لوگوں نے اسلام میں سبقت کی تو اس کی جزا تمہیں روزِ قیامت ملے گی اور مجھ سمیت تم سب نے دیکھا ہے کہ رسولِ اکرمؐ اس طرح سے مال تقسیم کیا کرتے تھے۔ (یعنی یہی سنتِ پیغمبرؐ ہے)۔

اتنے میں بنی امیہ مسجد نبوی میں آئے اور اس وفد کے ساتھ مل گئے۔ پھر وہ انہیں لے کر آپ کے پاس آئے اور انہوں نے آپ کے سامنے اپنے ان مشرک مقتولین کے نام لئے جنہیں آپ نے مختلف غزوات میں قتل کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اس کے باوجود ہم آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں لیکن بیعت کے لئے ہماری یہ تین شرطیں ہیں:

(۱) اب تک جو کچھ ہم کرتے رہے ہیں آپ ہم سے اس کا مواخذہ نہیں کریں گے۔

(۲) اس وقت جو مال و دولت ہمارے پاس ہے آپ وہ ہم سے نہیں چھینیں گے۔

(۳) حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو قتل کریں گے۔

بنی امیہ کی یہ جسارت آمیز گفتگو سن کر آپ کو غصہ آیا اور آپ نے فرمایا: تمہارے خون "حق" نے بہائے تھے، میں نے نہیں بہائے تھے اور اس وقت مسلمانوں اور خدا کا جو مال تمہارے پاس ہے اس کے متعلق عدل کے تقاضوں پر عمل کیا جائے گا۔ قاتلینِ عثمان کا قتل کرنا ضروری ہوا تو تم کو ان کے ساتھ جنگ کرنا پڑے گی[1]

لیکن تمہارے لئے میری شرط یہ ہے کہ میں تمہیں کتاب اور سنتِ رسولؐ پر لے کر چلوں گا۔ پس جس شخص کے لئے حق تنگی کا باعث ہو تو باطل اور زیادہ تنگی کا سبب ہوا کرتا ہے اور اگر تمہیں میری اس طرح کی بیعت قبول نہ ہو تو تم جہاں بھی جانا چاہو چلے جاؤ میری طرف سے تمہیں امن ہوگا۔

بنی امیہ نے کہا: ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم بیعت کریں گے اور آپ کے ساتھ یہیں رہیں گے۔[2]

مرتضوی حکومت کے عُمّال

امام علی مرتضیٰؑ نے بنی امیہ کے نالائق عمال کو ان کے عہدوں سے برطرف کر کے لائق اور قابل حکام کا تقرر کیا اور بنی ہاشم اور غیر قریشی قبائل کے احساسِ محرومی کو ختم کیا۔ چنانچہ آپ نے انصار میں سے قیس بن سعد بن عبادہ کو مصر کا، عثمان بن حنیف کو بصرے کا اور سہل بن حنیف کو مدینے کا گورنر مقرر کیا۔ بنی ہاشم میں سے آپ نے قثم بن عباس کو مکے اور عبیداللہ بن عباس کو صنعاء یمن اور جنگِ جمل کے بعد عبداللہ بن عباس کو بصرہ کا

۱۔ مولا علیؑ کے فرمان کا مقصد یہ تھا کہ عثمانؓ کے قاتلوں میں بی بی عائشہؓ، طلحہ، زبیر اور بہت سے مہاجرین و انصار اور مصر و کوفہ کے ہزاروں افراد شامل ہیں۔ اگر ان سب کا قتل کرنا ضروری ہوا تو تمہیں ان ہزاروں افراد سے مقابلے کے لئے بلایا جائے گا۔

۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۲، ص ۱۷۰-۱۷۳، طبع اول مصر۔

حاکم مقرر فرمایا۔ اسی طرح سے دیگر باصلاحیت افراد کو دوسرے شہروں کا حاکم مقرر فرمایا۔

عہدِ علیؑ میں دولت کی عادلانہ تقسیم سے طبقاتی نظام کی چولیں ہل گئیں اور اشراف کو عوام پر جو مصنوعی برتری دے دی گئی تھی وہ خاک میں مل گئی۔ مثلاً اُمّ المومنین عائشہؓ کو ایک سال میں بارہ ہزار درہم ملتے تھے لیکن اب انہیں بھی اپنے آزاد کردہ غلام کی طرح دو سو درہم سالانہ پر قناعت کرنا پڑی۔ نیز طلحہ، زبیر اور اشرافیہ طبقے سے وابستہ دوسرے لوگوں کے مالی مفادات کو بھی شدید زک پہنچی۔

امام علیؑ کی یہ عدالت و مساوات قریشی مہاجرین کو بہت بُری محسوس ہوئی لیکن انصار کو آپ کی اس رَوِش سے خوشی محسوس ہوئی کیونکہ ایک طویل عرصے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو قریشی مہاجرین کے ہم پلّہ پایا۔ جب مہاجرین کے مالی مفادات کو ضرب لگی تو انہوں نے ایک دوسرے کو اس خطرے سے خبردار کیا اور اس سے نجات کی صورت پر غور و فکر کرنے لگے۔

چنانچہ عمرو بن عاص نے معاویہ کو خط بھیجا جس میں اس نے تحریر کیا:

امابعد! تیار ہو جا کیونکہ علیؑ تجھ سے تیری ساری دولت واپس لینے والا ہے۔ علیؑ تجھے درخت کی اس شاخ کی طرح سے بنانے والا ہے جس کے تمام پتّے موسم خزاں میں جھڑ چکے ہوں۔[1]

قریش جو کہ مدت سے اشرافیہ طبقہ بن چکا تھا اور جنہوں نے امتِ اسلامیہ کے وسائل کا استحصال کر کے بڑی بڑی جاگیریں اور جائیدادیں بنالی تھیں، وہ امام علیؑ کی اس مساویانہ پالیسی کو برداشت کرنے پر راضی نہیں تھے۔ وہ لوگوں سے یہ بھی تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ ”علیؑ نے ہمارا گزارہ الاؤنس کم کر کے ایک عام آدمی کے برابر کر دیا ہے لہٰذا اٹھو اور علیؑ سے جنگ کرو۔“

آخر کار گہری سوچ بچار کے بعد قریش نے امام علیؑ کو ناکام کرنے کے لئے لوگوں سے کہا: اے مسلمانو! تمہارا خلیفہ و امام عثمان مظلوم مارا گیا ہے۔ اس کے خون کا انتقام لو۔ جب قریش نے اچھی طرح سے لوگوں کے جذبات بھڑکا دیئے تو انہوں نے امام علیؑ کو قاتلِ عثمان کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ امام علیؑ پر قتل کا الزام سب سے پہلے حضرت عائشہؓ نے لگایا۔

شیخین کے عہدِ خلافت میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حضرت عائشہؓ کی شان و عظمت بڑھا چڑھا کر پیش کی جاتی تھی اور اس سے حکام کا مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی مسلمان یہ کہے کہ موجودہ حکومت سے فاطمہؑ راضی نہیں ہیں تو اس کے جواب میں کہا جائے کہ ”کیا ہوا! فاطمہؑ سے افضل خاتون عائشہؓ تو راضی ہیں۔“

حضرت عائشہؓ کی شخصیت کو اس طرح پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ خلافت سے تنازعہ کی وجہ سے مقام فاطمہؑ کو بے اثر بنا دیا جائے۔

۱۔ علی بن حسین مسعودی شافعی، مروج الذہب، ج۲، ص۳۵۴۔

حضرت عائشہؓ کو اس قدر عظمت دینے کا منصوبہ مکتب خلافت کے لئے سخت نقصان دہ بھی ثابت ہوا کیونکہ مسلسل تبلیغات کی وجہ سے امت کے ذہنوں میں حضرت عائشہؓ کا مقام اتنا بلند ہو چکا تھا کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف قیام کیا تو حضرت عثمانؓ کو قتل ہونا پڑا۔ قتل عثمانؓ کے بعد حضرت عائشہؓ نے امام علیؑ کے خلاف خروج کیا اور آپ کی حکومت کو ناکام کرنے کے لئے خون عثمانؓ کے قصاص کا نعرہ بلند کیا۔ حضرت عائشہؓ نے خانۂ خدا میں ڈیرے ڈال دیئے اور پکار کر کہا: لوگو! عثمانؓ مظلوم مارا گیا ہے اور اس کا قاتل علیؑ ہے۔ خون عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لئے اٹھو۔ عثمانؓ کی زندگی کا ایک دن علیؑ کی پوری زندگی سے بہتر ہے۔

جب قریش نے سنا کہ امّ المومنین نے امام علیؑ کے خلاف آواز بلند کی ہے تو وہ مدینے اور دوسرے شہروں سے روانہ ہو کر مکے پہنچے۔ بنی امیہ اور قریش کے دیگر قبائل امّ المومنین کے گرد جمع ہو گئے اور آپ کی سرکردگی میں بصرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

امام علیؑ ان کے تعاقب میں فوج لے کر نکلے اور دونوں فوجوں کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوا۔ ام المومنین کے لشکر میں قریش کی مختلف شاخوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد تھے جبکہ امام علیؑ کے لشکر میں انصار زیادہ اور قریش بہت کم تھے لیکن اس جنگ میں ام المومنین کو شکست ہوئی اور امام علیؑ کو فتح نصیب ہوئی۔ جنگ کے بعد امام علیؑ بصرے سے کوفہ آئے۔

بصرے میں شکست کھانے کے بعد قریش، معاویہ کے پاس شام میں جمع ہوئے۔ اس کے بعد معاویہ نے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا اعلان کیا اور ایک لاکھ شمشیرزن افراد لے کر میدان صفین میں امام علیؑ کے مدمقابل آ گیا۔ اس جنگ میں مدینے کے دو انصاری معاویہ کے ساتھ تھے اور باقی تمام انصار امام علیؑ کے ساتھ تھے۔ تحکیم قبول کرنے کے اعلان کے ساتھ یہ جنگ ختم ہوگئی لیکن قریش کی دشمنی بدستور جاری رہی۔

نہج البلاغہ کے خطبہ ۲۱۵ میں ہے کہ امام علیؑ اللہ تعالیٰ سے اُن کا شکوہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیۤ اَسۡتَعۡدِیۡکَ عَلٰی قُرَیۡشٍ... خدایا! میں قریش سے انتقام لینے پر تجھ سے مدد کا خواستگار ہوں کیونکہ انہوں نے میری قرابت اور عزیز داری کے بندھن توڑ دیئے اور میرے ظرف (عزت و حرمت) کو اوندھا کر دیا اور اس حق میں کہ جس کا میں سب سے زیادہ اہل ہوں، جھگڑا کرنے کے لئے ایکا کر لیا ہے۔

قریش کا یہ کردار کوئی نیا نہیں تھا۔ اس سے قبل انہوں نے رسول اکرمؐ سے بھی جنگیں کی تھیں۔ ان جنگوں میں انصار رسول اکرمؐ کے ہمرکاب ہو کر ان سے لڑتے تھے۔ رسول اکرمؐ کی وفات کے پچیس برس بعد تاریخ نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو دہرایا۔ چشم فلک نے پھر وہی نظارہ دیکھا کہ رسول اکرمؐ سے لڑنے والے قریش ایک بار پھر رسول اکرمؐ کے وصی سے برسرپیکار ہیں اور رسول اکرمؐ کے جاں نثار انصار مدینہ ایک بار پھر رسول اکرمؐ کے وصی کے جاں نثار بن گئے ہیں۔

امام علیؑ کوفہ آئے اور انہوں نے کوفے کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔

کوفہ، جنوبی ایران کے سوا سارے ایران کا مرکز تھا۔ نومسلم ایرانی جنہیں مَوَالِی اور اَلحَمرَاء کہا جاتا تھا بڑی تعداد میں کوفے میں جمع ہو گئے تھے۔ سابقہ طبقاتی نظام میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ انہیں اچھوت سمجھا جاتا تھا اور ان بے چاروں کو امتِ اسلامی کا حصہ ماننے پر بھی کوئی آمادہ نہیں تھا۔ جب امام علیؑ کوفہ آئے تو آپ نے طبقاتی نظام کو ختم کر کے تمام مسلمانوں کے ساتھ برابری کا سلوک کیا۔ آپ نے عرب وعجم اور امیر و غریب، آقا و غلام کی تفریق ختم کردی تو کوفے میں موجود ایرانیوں نے سکھ کا سانس لیا اور پروانہ وار آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ ایرانیوں کا یہ اجتماع عربوں کو سخت بُرا محسوس ہوا۔

قوم پرستی کی سرکوبی کے چند نمونے

(۱) ایک مرتبہ دو عورتیں امام علیؑ کے پاس کچھ امداد طلب کرنے آئیں۔ آپ نے دونوں کو کچھ رقم اور کھانے پینے کا کچھ سامان عطا فرمایا۔ ان میں سے ایک عورت نے کہا: امیرالمومنینؑ! آپ نے ہم دونوں سے یکساں سلوک کیا جبکہ میں عرب ہوں اور یہ عجم ہے۔

امام علیؑ نے فرمایا: ''خدا کی قسم! تقسیمِ اموال کے متعلق مجھے اسماعیلؑ و اسحٰقؑ کی اولاد میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔''

حضرت اسحٰقؑ و حضرت اسماعیلؑ دونوں حضرت ابراہیمؑ کے فرزند تھے۔ حضرت اسماعیلؑ نے مکے میں زندگی بسر کی تھی اور ان کا شمار قبائلِ عرب میں کیا جاتا ہے۔ قریش کا تعلق نسلِ اسماعیلؑ سے تھا جبکہ حضرت اسحٰقؑ نے جزیرۂ عرب سے باہر زندگی بسر کی تھی اور ان کی اولاد کو عجمی یعنی غیر عرب کہا جاتا ہے۔

(۲) ایک دن امیرالمومنینؑ مسجد کوفہ میں تشریف فرما تھے۔ آپ کے گرد کچھ ایرانی جمع تھے۔ اشعث بن قیس جو کہ ایامِ جاہلیت میں یمن کے شاہانِ کندہ میں سے تھا مسجد میں آیا۔ جب اس نے دیکھا کہ آپ کے پاس بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے تو کہا: امیرالمومنینؑ! ان سرخ فام افراد نے میرے اور آپ کے درمیان فاصلہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے مجمع میں قدم رکھا تاکہ وہ انہیں ہٹا کر خود امام علیؑ کے قریب بیٹھ سکے۔

یہ دیکھ کر امام علی علیہ السلام نے فرمایا: مَنْ یَعذِرُنِیْ مِنْ ھٰؤُلَآءِ الضَّیَاطِرَۃ. اُس جیسے بددماغ افراد کے متعلق کون میرا عذر قبول کرے گا؟

یہ سخت جملہ کہہ کر آپؑ نے اشعث کے پندار جاہلیت کو توڑ دیا۔

حضرت میثم تمارؒ کا واقعہ

امام علیؑ عرب وعجم سے یکساں سلوک روا رکھتے اور بعض اوقات آپ موالی (آزاد کردہ) کو عربوں پر بھی ترجیح دیتے جیسا کہ آپ حضرت میثم تمارؒ سے انتہائی شفقت کا سلوک کرتے جن کا تذکرہ کچھ یوں ہے:

(۳) حضرت میثم تمارؒ بنی اسد کی ایک عورت کے غلام تھے۔ امیرالمومنینؑ نے انہیں خرید کر آزاد کیا۔ انہوں نے کوفے میں کھجور کی دکان کرلی۔ امامؑ کو ان سے اتنا پیار تھا کہ آپ اکثر ان کی دکان کے چبوترے پر بیٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ تو آپ نے ان کی عدمِ موجودگی میں کھجوریں بھی فروخت کی تھیں۔ حضرت میثم تمارؒ، امیرالمومنینؑ کے خاص الخاص اور رازدار اصحاب میں سے تھے۔

۶۰ھ میں میثمؒ حج بیت اللہ کے لئے حجاز گئے۔ مدینے میں حضرت ام سلمہؓ کے درِ دولت پر حاضر ہوئے اور اپنا تعارف کرا کے انہیں سلام کیا تو ام المومنین ام سلمہؓ نے فرمایا: ایک رات میں نے سنا کہ رسولِ اکرمؐ، علیؑ سے تمہارا نام لے کر تمہارے متعلق سفارش کر رہے تھے۔ اس کے بعد ام المومنین ام سلمہؓ نے اپنی کنیزوں کو حکم دیا کہ وہ میثمؒ کی داڑھی پر خوشبو لگائیں۔

حضرت میثم نے کہا: اگر آج آپ میرے چہرے کو مشک کی خوشبو لگا رہی ہیں تو بہت جلد یہ چہرہ اہلبیتِ رسولؐ کی محبت میں خون سے رنگین ہوگا۔

حضرت ام سلمہؓ کے بعد میثم تمارؒ، ابن عباسؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا: اے ابن عباسؓ! تفسیرِ قرآن کے متعلق مجھ سے جو پوچھنا چاہو پوچھ لو کیونکہ مجھے قرآن کی تاویل اور شانِ نزول امیرالمومنینؑ نے سکھائی ہے۔

ابن عباسؓ نے کاغذ اور دوات طلب کی اور میثمؒ کے بیانات لکھنے لگے۔ اثنائے گفتگو میثمؒ نے ان سے کہا: ''اگر تم یہ سن لو تو تمہاری حالت کیا ہوگی کہ میثمؒ کو صلیب پر لٹکایا گیا ہے اور صلیب پانے والوں میں میرا نواں نمبر ہے اور میرے صلیب کی لکڑی دوسری لکڑیوں سے چھوٹی اور زمین سے زیادہ قریب ہے۔''

ابن عباسؓ نے جب یہ سنا تو سخت برافروختہ ہو کر کہنے لگے: ''میثمؒ! تم کاہن ہو چکے ہو اور پیشین گوئیاں کرنے لگے ہو۔'' ابن عباسؓ نے چاہا کہ ان کی بیان کردہ تفسیر کے کاغذات کو پارہ پارہ کردیں۔

مگر حضرت میثمؒ نے کہا: ایسا مت کریں۔ آپ اس تحریر کو اپنے پاس رہنے دیں اور اگر آپ دیکھیں کہ میری بات سچ ثابت نہیں ہوئی تو پھر بلا شک اسے پھاڑ دیں۔

ابن عباسؓ نے کہا: ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔

ابن عباس نے اس تحریر کو ان کی پیشگوئی کے نتیجے کے انتظار میں اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا۔ میثم تمارؓ حج سے فارغ ہو کر کوفہ آئے۔ ابن زیاد کے حکم سے میثمؓ کو گرفتار کیا گیا اور پیشگوئی کے عین مطابق انہیں صلیب پر چڑھایا گیا۔ میثمؓ نے صلیب کی لکڑی کو اپنا منبر بنایا اور صلیب کے گرد جمع ہونے والے لوگوں کے سامنے اہلبیتؑ کی شان میں احادیثِ رسول بیان کرنے لگے۔

جب ابن زیاد کو یہ اطلاع ملی تو اس نے حکم دیا کہ ان کے پہلو میں نیزے کا وار کیا جائے۔ میثم تمارؓ کو نیزہ لگا تو ان کے پہلو، منہ اور دماغ سے خون جاری ہوا اور ان کا چہرہ خون سے رنگین ہو گیا۔

حضرت امیر المومنینؑ کے صاحب اسرار اس صحابی کی شہادت کا یہ المناک واقعہ سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے وارد عراق ہونے سے دس دن پہلے پیش آیا۔[۱]

۱۔ علامہ محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، ج ۴۲، ص ۱۲۱ و ۱۳۳۔

پیش گفتار

اسلام میں مختلف فرقوں کے بننے کی وجوہات اور ان فرقوں کے عقائد و نظریات کا تجزیہ اس باب میں پیش کیا جائے گا۔ نیز ان فرقِ اسلامی کے وجود میں آنے کے تاریخی اسباب اور مکتبِ خلفاء میں فرقوں کے بکثرت جنم لینے کے حقیقی عوامل کا بھی جائزہ لیا جائے گا اور واضح کیا جائے گا کہ مکتبِ اہلبیتؑ میں درحقیقت ہمیشہ سے صرف ایک ہی فرقہ یعنی شیعہ امامیہ اثناء عشریہ کا وجود رہا ہے اور اس مکتب سے منسوب باقی فرقے تین حال سے خالی نہیں ہیں۔

۱۔ یا تو سرے سے ان کا وجود ہی نہیں ہے اور وہ علمائے مذہب کے ذہن کی اختراع ہیں۔

۲۔ یا مکتبِ اہلبیتؑ کی طرف ان کی نسبت جھوٹ اور افترا پر مبنی ہے۔

۳۔ یا اگر کچھ فرقے پیدا بھی ہوئے تو چند دنوں کے بعد معدوم ہو گئے۔

بات یہ ہے کہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ آنحضرتؐ نے حکمِ الٰہی کے بموجب امام علی علیہ السلام کو اپنا وصی، خلیفہ اور امت کا امام مقرر کیا تھا جبکہ دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ خلافت انتصابی امر نہیں بلکہ ایک انتخابی منصب ہے اور خدا اور اس کے رسولؐ نے مسلمانوں کی ولایت و امارت کے لئے بعنوانِ نص کسی کو نامزد نہیں فرمایا بلکہ انہوں نے اس منصب کو مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد اسلامی معاشرے میں جن حالات نے جنم لیا ان کا جامع خلاصہ یہ ہے کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں معدودے چند لوگوں کی بیعت سے حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہوئے۔ پھر انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لحات میں حضرت عمرؓ کے حق میں اپنی وصیت لکھوائی اور جب حضرت عمرؓ ابولولو کے قاتلانہ حملے میں زخمی ہوئے تو انہوں نے اپنی جانشینی کے لئے مہاجرین پر مشتمل چھ رکنی شوریٰ تشکیل دی۔ اس شوریٰ کے ایک رکن عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی کوششوں سے حضرت عثمانؓ خلیفہ بننے میں کامیاب ہو گئے۔

قتل عثمانؓ کے بعد مہاجرین وانصار اور تابعین کی بھاری اکثریت نے امام علیؑ کی بیعت کی جن میں طلحہ وزبیر پیش پیش تھے مگر انہوں نے عہد شکنی کی اور حضرت عائشہؓ کی سرکردگی میں لشکر لیکر بصرہ (عراق) کی طرف چل پڑے اور خون عثمانؓ کے قصاص کا نعرہ لگا کر اپنے امام اور خلیفۂ وقت کے خلاف لڑے اور مغلوب ہوئے۔

دوسری طرف شام کے گورنر معاویہ نے بھی امام علی علیہ السلام کی بیعت نہیں کی تھی۔ اس نے بھی خون عثمانؓ کے انتقام کا نعرہ بلند کیا اور میدان صفین (عراق) میں امام علی علیہ السلام سے جنگ کی اور جب دیکھا کہ اس کے لشکر کو یقینی شکست ہونے والی ہے تو قرآن نیزوں پر اٹھا لئے گئے جس سے امام علی علیہ السلام کے ساتھ عراقیوں کے ایک گروہ نے جنگ کرنے سے انکار کر دیا اور امام علی علیہ السلام کو معاہدۂ تحکیم پر مجبور ہونا پڑا۔ بعدازاں اہل عراق کے اصرار پر آپ نے ابوموسیٰ اشعری کو حَکم تسلیم کرلیا حالانکہ آپ اس سے مطمئن نہ تھے۔

معاویہ نے اپنی طرف سے عمرو بن عاص کو حَکم مقرر کیا۔ تین دن بعد جب دونوں حَکم دومۃ الجندل میں مل کر بیٹھے تو عمرو بن عاص نے ابوموسیٰ اشعری سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اس معاملے میں کیا صورت مناسب ہوگی؟ اس نے کہا "میرے خیال میں ہم ان دونوں حضرات کو معزول کردیں اور امیر کے انتخاب کو مسلمانوں پر چھوڑ دیں۔" عمرو بن عاص نے کہا: "آپ کا خیال درست ہے۔" اس کے بعد دونوں حَکم مجمع عام میں آئے جہاں دونوں طرف کے لاکھوں آدمی موجود تھے۔ عمرو بن عاص نے ابوموسیٰ اشعری سے کہا کہ آپ لوگوں کو بتا دیجئے کہ ہم ایک رائے پر متفق ہوگئے ہیں۔ ابن عباسؓ نے ابوموسیٰ اشعری سے کہا: "اگر آپ دونوں ایک رائے پر متفق ہوگئے ہیں تو اس متفقہ فیصلے کا اعلان عمرو بن عاص کو کرنے دیجئے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ دھوکہ کھا گئے ہیں۔" ابوموسیٰ نے کہا: "مجھے اس کا کوئی خطرہ نہیں۔ ہم نے بالاتفاق ایک فیصلہ کیا ہے۔"

پھر وہ تقریر کرنے کے لئے اٹھے اور بولے کہ "میں اور میرے دوست (یعنی عمرو بن عاص) نے بالاتفاق فیصلہ کیا ہے کہ ہم علیؑ اور معاویہ کو الگ کردیں اور لوگ باہمی مشورے سے جس کو پسند کریں اپنا امیر بنالیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی انگوٹھی اتار کر کہا کہ جس طرح سے میں نے اس انگوٹھی کو اپنی انگلی سے الگ کیا ہے اسی طرح سے میں علی بن ابی طالبؑ کو خلافت سے الگ کرتا ہوں۔"

اس کے بعد عمرو بن عاص نے کہا: "ان صاحب نے جو کچھ کہا وہ آپ لوگوں نے سن لیا۔ انہوں نے اپنے آدمی (حضرت علیؑ) کو معزول کردیا ہے۔ پھر اس نے اپنی انگوٹھی اتارتے ہوئے کہا: ابوموسیٰ کی طرح میں بھی علیؑ کو خلافت سے یوں جدا کرتا ہوں جیسے میں نے اس انگوٹھی کو اپنی انگلی سے جدا کیا ہے۔ پھر اس نے انگوٹھی پہنتے ہوئے کہا: "جس طرح سے میں نے یہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہنی ہے اسی طرح سے میں معاویہ کو منصب خلافت پر بحال رکھتا ہوں۔"

اس واقعے کے نتیجے میں امام علی علیہ السلام کے لشکر میں شامل کوفیوں کا ایک گروہ جو نظریاتی طور پر مکتبِ خلفاء سے وابستہ تھا اور خلافت کو انتخابی امر سمجھتا تھا اس نے تمام مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ عائد کیا اور ان سے علیحدگی اختیار کی۔ اس گروہ نے امام علی علیہ السلام کے خلاف خروج کیا تو امام علی علیہ السلام نے ان خارجیوں سے لڑائی کی اور ان کے لشکر کے بہت بڑے حصے کو نہروان میں قتل کردیا۔ صرف چند خارجی باقی بچے۔ ان باقی بچ جانے والوں میں سے عبدالرحمٰن ابن ملجم مرادی نے امام علی علیہ السلام کو مسجدِ کوفہ میں شہید کردیا۔

امام علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے امام حسن علیہ السلام کی بیعت کی لیکن معاویہ نے بیعت نہیں کی اور آپ کے مقابلے پر ایک بڑا لشکر لے کر آیا۔ اہلِ کوفہ نے امام حسن علیہ السلام سے دغا کی۔ آخرکار ۴۰ھ میں امام حسن علیہ السلام کو مجبوراً معاویہ کے ساتھ صلح کرنا پڑی۔ مکتبِ خلفاء میں اس سال کو عَامُ الْجَمَاعَة کہا جاتا ہے کیونکہ اس سال معاویہ کی خلافت پر سب کا اجماع ہوا تھا۔

معاویہ نے بیس سال تک حکومت کی جس کے دوران خلافت کے استحکام کے لئے بہت سی روایات گھڑ کر انہیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے منسوب کردیا گیا۔ ان جھوٹی روایات اور تحریف شدہ احادیث کو مکتبِ خلفاء میں سنتِ رسولؐ کا نام دیا گیا۔ اگر ان روایات کا جائزہ لیا جائے تو ان کی چار قسمیں ہیں:

(ا) ایسی روایات جو واقعاً رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہی مروی تھیں لیکن اِمتدادِ زمانہ اورنقلِ روایات میں کمی بیشی کے سبب اس میں اس قدر تبدیلی ہوگئی کہ فرمانِ رسولؐ کو ''پہچاننا'' دشوار ہوگیا۔

(ب) ایسی روایات جو اہلِ کتاب کے علماء یا ان کے شاگردوں سے مروی تھیں لیکن انہیں احادیثِ رسولؐ میں اس طرح مخلوط کردیا گیا کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہوگیا۔ چنانچہ اس طرح کی روایات سے اللہ تعالیٰ کی تجسیم اور مخلوقات سے اللہ تعالیٰ کی تشبیہ کا عقیدہ پیدا ہوا۔

(ج) ایسی روایات جو رسولِ اکرمؐ سے ہی مروی تھیں لیکن انہیں حکومت کے مفاد میں موڑ دیا گیا۔

(د) ایسی روایات جو بنیادی طور پر ارکانِ خلافت کیلئے گھڑی گئی تھیں، ان کی نوعیت ایسی تھی کہ:

۱۔ ان میں خلفاء کی تعریف کی گئی تھی۔

۲۔ ان میں خلفاء کے مخالفین کی مذمّت کی گئی تھی۔

۳۔ ان میں خلفاء کی سیاست، ان کی رائے اور اجتہاد کی تائید کی گئی تھی۔ اس طرح کی روایات میں کہا گیا کہ حاکمِ وقت کے خلاف خروج کرنا حرام ہے اگرچہ وہ ظالم اور فاسق ہی کیوں نہ ہو اور اس کی

اطاعت ہر حال میں واجب ہے۔ الغرض ایسی روایات کا تعلق جھوٹی احادیث کے اسی حصے سے ہے۔

اسی طرح بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ حاکم کی حکومت مشیتِ ایزدی کے سبب سے ہے کیونکہ خیر اور شر دونوں خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ نیز یہ کہ انسان اپنے افعال میں مختار نہیں بلکہ مجبورِ محض ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی روایات اور ... وَالْقَدَرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی کے عقیدے کا تعلق بھی اسی قسم کی احادیث سے ہے اور اس طرح کی روایات سے مکتبِ خلفاء میں فرقۂ جبریہ نے جنم لیا۔

احادیث و روایات کی مذکورہ چار اقسام کے علاوہ صحابہ کے بعض اقوال — اور احکام میں ان کے اجتہاد اور تابعین کی بہت سی آراء کو جو قرآن و سنت کے سراسر خلاف ہیں احادیث کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔

الغرض یہ تمام اسباب بہت سے فقہی مذاہب کے پیدا ہونے کا باعث بنے اور ایسی ہی روایات کی وجہ سے مکتبِ خلفاء میں اہلِ رائے و اجتہاد اور سَلَفی مکتب نے جنم لیا۔

مکتبِ خلفاء میں تدوینِ حدیث کی اجازت

۱۰۰ھ کے قریب جب عمر بن عبدالعزیزؒ نے نشرِ حدیث پر عائد پابندی ختم کردی تو مکتبِ خلفاء کے علماء نے راویوں سے احادیثِ رسولؐ جمع کرنا شروع کردیں۔

احادیث کی جمع و تدوین کے لئے محدثین شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ سفر کرتے۔ جب وہ کسی شہر میں پہنچتے تو تشنگانِ حدیث ان کی خدمت میں حاضری دیتے اور ان سے اکتسابِ حدیث کرتے نیز اپنے پاس موجود احادیث بھی ان کے سامنے روایت کرتے تھے۔ اس طرح احادیث جو کہ پہلے صرف مدینہ، کوفہ، بصرہ اور دمشق کے معدودے چند علماء کے پاس تھیں رفتہ رفتہ تمام بلادِ اسلامیہ میں پھیل گئیں اور ان احادیث کی وجہ سے مکتبِ خلفاء میں شدید فکری، اعتقادی اور عملی اختلاف پیدا ہوا جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

مکتبِ اہلبیتؑ میں تدوینِ حدیث

جس زمانے میں عمر بن عبدالعزیزؒ نے نشرِ حدیث پر سے پابندی اٹھائی تو محبانِ اہلبیتؑ بھی امام محمد باقر علیہ السلام سے استفادہ کرنے کے قابل ہوگئے اور انہوں نے دل کھول کر آپ سے علمِ حدیث حاصل کیا۔ پھر جب ۱۰۵ھ میں ہشام خلیفہ بنا تو اہلبیتؑ اور ان کے ماننے والوں پر از سرِ نو سختیاں بڑھ گئیں اور ایک روایت کے مطابق ۱۱۷ھ میں امام محمد باقر علیہ السلام کو زہر دے کر حکومتِ وقت نے شہید کرادیا۔

۱۲۵ھ میں ہشام مر گیا تو ولید بن یزید بن عبدالملک برسرِ اقتدار آیا۔ اِس دوران خراسان میں بنی عباس کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ اسی سال کے شروع میں بنی عباس کے مبلغین عبداللہ بن عباس کے پوتے محمد بن علی کی زیارت کے لئے آئے تو خراسان سے بہت سے تحفے بھی ساتھ لائے۔ ان مبلغین میں ابومسلم خراسانی بھی شامل تھا جسے محمد بن علی نے اپنے مبلغین کا امیر مقرر کیا تھا۔

پھر اسی سال محمد کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے ابراہیم نے ابومسلم خراسانی کے منصب کی توثیق کردی اور بنی امیہ کے آخری حکمران مروان حمار نے ابراہیم کو قتل کرا دیا۔ ابراہیم کے قتل کے بعد بنی عباس کے پیروکاروں نے اس کے بھائی عبداللہ کی بیعت کی۔ عبداللہ جو "سفاح" کے نام سے مشہور تھا بنی عباس کا پہلا خلیفہ بنا اور یوں ۱۳۲ھ میں بنی امیہ کی خلافت کا خاتمہ اور بنی عباس کی خلافت کا آغاز ہوا۔

۱۲۵ھ سے ۱۳۲ھ تک بنی امیہ اور بنی عباس کے درمیان شدید جنگ جاری رہی جس کی وجہ سے بنی امیہ کی حکومت شکست و ریخت کا شکار ہوگئی نیز اس عرصے میں خوارج کی شورشیں بھی عروج پر رہیں۔

بنی امیہ میں ویسے تو ایک سے بڑھ کر ایک ظالم تھا لیکن یزید اور ولید بن یزید اپنے فسق و فجور کی وجہ سے بڑے بدنام ہوئے۔ ولید اتنا بڑا فاسق تھا کہ اس نے خانۂ کعبہ کی چھت پر شراب نوشی کے لئے ایک بالا خانہ بنانے کا ارادہ کیا تھا اور اس مقصد کے لئے ماہرِ تعمیرات کو بھی مکے بھیجا تھا۔[۱]

ولید بن یزید کے علانیہ فسق و فجور کی وجہ سے مملکت کے حالات دگرگوں ہوگئے اور اس کے تایازاد یزید بن ولید بن عبدالملک نے اس کے خلاف بغاوت کردی اور بنی امیہ کے کچھ ممتاز افراد کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگیا۔ آخرکار ان دونوں میں شدید جنگ ہوئی اور ۱۲۶ھ میں یزید بن ولید نے ولید بن یزید کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

اس عرصے میں اسلامی علوم اور حدیثِ رسولؐ کے جُویا پَروانہ وار شمعِ ہدایت امام جعفر صادق علیہ السلام کے گرد جمع ہوئے اور آپ سے سنتِ رسولؐ، تفسیرِ قرآن اور دوسرے اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ دینی تعلیم کا یہ سلسلہ ایامِ حج میں مدینہ، مکہ، عرفات اور مِنیٰ میں عروج پر پہنچ جاتا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے زنادقہ اور دوسرے مذاہب کے علماء سے مناظرے کئے جنہیں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

منصور عباسی کی خلافت کے اوائل ۱۴۵ھ تک یہ سلسلہ یونہی قائم رہا اور مسلمان بارہ سال سے زیادہ عرصے تک خراسان، رَے، قم، کوفہ اور دیگر دور دراز مقامات سے امام عالی مقامؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے

۱۔ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۳۳۳۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تاریخ کی جلد ۱۰ کے صفحہ ۸ پر اس طرف اشارہ کیا ہے۔

اور سنتِ رسولؐ اور علومِ اسلامی کا فیض لے کر اپنے شہروں کو واپس لوٹ جاتے تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد تین ہزار تک کہی گئی ہے۔ اس زمانے میں ہزاروں محدّث اپنے سلسلۂ حدیث کی اسناد یوں بیان کرتے تھے:

حَدَّثَنِیْ اَبُوْعَبْدِاللّٰہِ جعفر بْنُ مُحَمَّدٍ الصَّادِقُ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ، عَنْ جِبْرِیْلَ، عَنِ الْبَارِیْ...

اور کبھی سلسلۂ اسناد یوں بیان ہوتا تھا:

حَدَّثَنِیْ اَبُوْجَعْفَرٍ مُحَمَّدُ الْبَاقِرُ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ عَنْ جِبْرِیْلَ عَنِ الْبَارِیْ...

اس زمانے میں علمِ حدیث کی چھوٹی کتابیں مرتب ہوئیں جنہیں "اصل" کہا جاتا تھا اور ان کی تعداد چار سو تھی جنہیں مجموعی طور پر اُصولِ اربع مأۃ کہا جاتا تھا۔

مکتبِ خلفاء میں تدوینِ حدیث

عمر بن عبدالعزیزؒ نے کتابتِ حدیث پر عائد پابندی ختم کی اور لوگوں کو حدیثِ رسولؐ جمع کرنے کی ترغیب دی لیکن ان کی زندگی نے ان سے وفا نہ کی۔ وہ ۹۹ھ میں خلیفہ بنے اور ماہ صفر ۱۰۱ھ میں انتقال فرما گئے۔ لکھا ہے کہ بنی امیہ کے افراد نے انہیں زہر دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد بنی امیہ کے دوسرے خلفاء نے ان کی پالیسیوں کو جاری نہ رکھا۔ زہری المتوفی ۱۲۴ھ نے ایک کتاب تالیف کی تھی جو کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے دورِ حکومت کا احاطہ نہیں کرتی تھی۔[1]

۱۳۲ھ میں بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور بنی عباس کی خلافت شروع ہوئی۔ وہ بنی امیہ کے مظالم کی تلافی کا دعویٰ لے کر اٹھے تھے لیکن جب انہیں فتح حاصل ہوگئی تو ظلم و تشدد اور قتل و غارتگری میں انہوں نے بنی امیہ کو مات کردیا۔ انہوں نے حتی الامکان امیہ خاندان کے ایک ایک فرد کو ڈھونڈ نکالا اور چن چن کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا اور کئی برس ان کے آثار ختم کرنے میں صرف کردیے۔

۱۳۶ھ میں منصور دوانقی خلیفہ بنا اور ۱۴۵ھ میں اس نے نسلِ امام حسن علیہ السلام کے — دو امام زادگان محمد اور ابراہیم سے جنگ کی۔ یہ دونوں بھائی لوگوں کو اہلبیتِ رسولؐ کی حکومت کی دعوت دیتے تھے۔

اس کے بعد بنی عباس کی خلافت کے دوران علیؑ و بتولؑ کی اولاد وقفے وقفے سے ان کے خلاف علم

۱۔ دیکھیں کتاب قواعد التحدیث، ص۴۶ و ۴۷، تالیف محمد جمال الدین القاسمی، المتوفی ۱۳۳۲ھ، مطبوعہ قاہرہ، طبع ۱۳۸۰ھ، تدریب الراوی، ص۴۱، تالیف سیوطی، طبع ۱۳۹۲ھ۔ الحدیث النبوی الشریف، ص۳۳، تالیف محمد الصباغ، مطبوعہ دمشق، طبع ۱۳۹۷ھ۔

بغاوت بلند کرتی رہی اور جب بھی کوئی علوی، عباسی حکومت کے خلاف اٹھتا تو وہ الرضا مِن آلِ محمدؐ یعنی آلِ محمدؐ کی برگزیدہ شخصیت کی بیعت کی دعوت دیتا تھا۔

عباسی حکومت پوری قوت سے امام زادوں کی بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف رہی۔ اس عرصے میں مکتبِ اہلبیتؑ کی روایات کو اسلامی معاشرے میں خوب فروغ حاصل ہوا اور مختلف اسلامی شہروں میں ہزاروں محدّث حَدَّثَنِي الْبَاقِرُ (ع) اور حَدَّثَنِي الصَّادِقُ (ع) کہنے لگے۔

بنی عباس کی حکومت کو بیک وقت دو خطرات درپیش تھے۔ پہلا خطرہ تو ان علویوں سے جو وقتاً فوقتاً تلوار لے کر ان کے مقابلے کے لئے میدان میں آجاتے تھے اور دوسرا خطرہ اس صحیح اسلامی فکر سے جسے محدثین، اوصیائے رسولؐ کی زبانی پھیلانے میں مصروف تھے۔

ان احادیث نے مسلمانوں کو خوابِ خرگوش سے بیدار کیا اور مسلمان بنی عباس کی خلافت کو ''ظالمانہ'' سمجھنے لگے اور خلفاء کے احکام کو ''غیراسلامی'' قرار دینے لگے۔ علویوں کی مسلسل تحریک کا سرچشمہ بھی یہی روایات تھیں کیونکہ جب لوگ صحیح احادیث کو سنتے تو انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگتی تھی کہ خلفاء کے احکامات، اسلام کے احکامات کے مطابق نہیں ہیں اور اس فکر کے نتیجے میں لوگ انہیں اولی الامر ماننے میں پس و پیش کرنے لگتے اور ان کی اطاعت کو اپنے لئے غیر ضروری قرار دیتے تھے۔ نتیجتاً وہ امام زادگان کے گرد جمع ہو کر حکومت کے خلاف جنگ کرتے تھے۔

بنی عباس نے دونوں خطرات سے نمٹنے کے لئے الگ الگ پالیسیاں بنائیں۔ انہوں نے اپنے خلاف مسلح جدوجہد کرنے والے علویوں کا مقابلہ تلوار سے کیا اور ایسی احادیث جن کی وجہ سے ان کی حکومت کے خلاف لوگوں میں نفرت پیدا ہوتی تھی ـــــ اور لوگ اس ظالم حکومت کو خراج دینا غیراسلامی سمجھنے لگتے تھے اور ان کے احکام کو سنتِ رسولؐ سے متصادم خیال کرتے تھے ـــــ کا علاج ایک دوسرے طریقے سے کیا۔ اس کے لئے انہوں نے اطاعتِ امیر کے وجوب کی احادیث کو زیادہ سے زیادہ رواج دیا۔ منصور کے دَور سے لے کر آخری عباسی خلیفہ تک مکتبِ خلفاء کی احادیث کو پھیلانے کی زیادہ سے زیادہ کوششیں کی گئیں کیونکہ ایسی احادیث کی نشر و اشاعت میں انہیں اپنی عافیت دکھائی دیتی تھی اور بنی عباس نے صحیح احادیث کا مقابلہ کرنے کے لئے مکتبِ خلفاء کے مُحدّثین کی سرپرستی کی اور انہیں دربار میں خصوصی مقام دیا۔

محدّثین احادیث جمع کرنے کے لئے شہر بہ شہر یعنی بلخ، بخارا، سمرقند، نیشاپور، رَے، کوفہ، بصرہ، بغداد، دمشق، مکہ، مدینہ اور اسکندریہ سے لے کر اندلس تک کا سفر کرتے تھے۔ وہ اس سفر کے دوران جہاں خود احادیث

حاصل کرتے تھے وہاں دوسرے لوگوں کو اپنی احادیث بھی سنایا کرتے تھے۔

یہی دور مکتبِ خلفاء کی احادیث کی تدوین کا دور ہے۔ (امام) مالک بن انس المتوفی ۱۷۹ھ نے اپنی کتاب مؤطا تالیف کی جس میں انہوں نے احادیثِ رسولؐ کے ساتھ ساتھ صحابہ و تابعین کے اجتہاد کو بھی جمع کیا۔ (امام) مالک کے بعد محدثین نے مذکورہ چاروں اقسام کی احادیث کو جمع کیا اور دارمی المتوفی ۲۵۵ھ، ابن ماجہ المتوفی ۲۷۳ھ، ابوداؤد المتوفی ۲۷۵ھ، ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ اور نسائی المتوفی ۳۰۳ھ نے اپنے مجموعوں کو ''سنن'' کے نام سے پیش کیا جو ''سنت'' کی جمع ہے۔ ان کتب میں سے آخری چار محدثین کی کتابوں کو مکتبِ خلفاء کی صحیح کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

محمد بن اسماعیل بخاری المتوفی ۲۵۶ھ اور مسلم بن حجاج نیشاپوری المتوفی ۲۶۱ھ نے اپنی کتابوں کو ''جامع صحیح'' کے نام سے متعارف کرایا اور مکتبِ خلفاء سے وابستہ افراد بخاری و مسلم کی کتابوں کو قرآن مجید کی طرح سے صحیح مانتے ہیں۔ وہ کسی کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ بخاری و مسلم کی احادیث کی صحت میں کسی قسم کا شک کرے اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں شک کرنے کو سنتِ رسولؐ میں شک کرنے کے مترادف گردانتے ہیں۔

جب یہ احادیث مسلمانوں میں پھیلیں اور ان کے مجموعے مرتب ہو کر سامنے آئے تو مکتبِ خلفاء کے پیروکاروں میں احکام و عقائد کے لحاظ سے بہت سے اختلافات پیدا ہوئے جنہیں ہم آگے بیان کریں گے۔

مکتبِ خلفاء میں اِختلاف اور فرقہ بندی

اس سے پہلے ہم عرض کر چکے ہیں کہ محدثین جمع حدیث کے لئے دور دراز شہروں کا سفر کرتے اور مختلف لوگوں سے ملتے تھے۔ ان کی آمد و رفت اور کتبِ حدیث کی تدوین سے مکتبِ خلفاء کے پیروکاروں میں دو طرح کے اختلافات ابھر کر سامنے آئے۔

۱۔ اسلامی احکام میں اِختلاف

۲۔ اسلامی عقائد میں اِختلاف

(۱) اسلامی اَحکام میں اِختلاف

مکتبِ خلفاء میں فرقہ بندی کا اہم ترین سبب حدیث کو قبول یا رَد کرنا ہے۔ مکتبِ خلفاء میں سے (امام) ابوحنیفہ نے کھلے لفظوں میں اعلان کردیا تھا کہ جو حدیث ان کی رائے کے خلاف ہوگی وہ اسے تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم نے اپنی کتاب معالم المدرستین میں ''دوسری صدی میں اجتہاد'' کے عنوان سے اس پر روشنی ڈالی ہے اور چند ایسی مثالیں بھی پیش کی ہیں جن میں (امام) ابوحنیفہ نے صریحاً سنتِ رسولؐ کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔

(امام) ابوحنیفہ اور ان کے پیروکاروں نے احکام کے استنباط کے لئے قیاس، اِستحسان اور مَصالحِ مرسلہ جیسے قاعدے مقرر کیے جن کا مقصد درحقیقت انسانی رائے پر عمل کرنا تھا۔ (امام) ابوحنیفہ کے شاگردوں اور پیروکاروں نے اپنے قاعدوں کو کتاب و سنت کی طرح اسلامی احکام کے استنباط کا مأخذ قرار دیا۔ چنانچہ جو شخص ان قاعدوں کے مطابق احکام کا اِستنباط کرتا تھا اسے ''مجتہد'' کہا گیا اور قواعد کے استعمال کے طریقے کو ''اجتہاد'' کا نام دیا گیا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ کتاب و سنت کے مقابل ذاتی رائے پر عمل کو اجتہاد کہا گیا اور اس کا سلسلہ خلفائے ثلاثہ کے دَور سے شروع ہوا۔ اس کی تفصیل بھی ہم نے ''دونوں مکاتب کا فقہ و اجتہاد کے متعلق موقف'' کے عنوان سے اپنی کتاب معالم المدرستین کی دوسری جلد میں بیان کی ہے۔

صحابہ کے بعد سب سے پہلے (امام) مالک بن انس نے سنتِ رسولؐ کے ساتھ ساتھ صحابہ و تابعین کے اجتہادات کو اپنی کتاب موطّا میں مرتب کیا تھا اور انہیں احکامِ اسلام کا ماٗخذ قرار دیا تھا لیکن ان سے پہلے (امام) ابوحنیفہ نے رائے پر عمل کرنے کے احکام کے لئے قانون قاعدے بنائے تھے۔

(امام) ابوحنیفہ کے بعد ان کے شاگردوں نے انہیں قاعدوں کا سہارا لے کر بہت سے حرام، حلال کر دیئے اور اس کا نام اَلْحِیَلُ الشَّرْعِیَّۃ یعنی شرعی حیلے رکھا۔[۱]

دربارِ خلافت سے وابستہ علماء شرعی حیلوں کے ماہر تھے جن میں ہارون رشید کے دوٗر کا قاضی القضاۃ ابو یوسف سرفہرست تھا۔

(امام) مالک نے (امام) ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کی اس گستاخی کو قبول نہیں کیا تھا چنانچہ لوگوں نے (امام) مالک سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا: ''اسلام میں ابوحنیفہ سے زیادہ منحوس انسان آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت اسلام مکمل ہو چکا تھا اس لئے ہمیں پیغمبرؐ اور اصحابِ پیغمبرؐ کی روایات کی پیروی کرنی چاہئے اور ذاتی رائے کی پیروی سے پرہیز کرنا چاہئے۔''[۲]

(امام) ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کے شرعی حیلوں کے ردِّعمل کے طور پر بہت سے مکاتبِ فکر سامنے آئے۔ حنفی مکتب کی مخالفت میں حنبلی مکتب منظرِ عام پر آیا۔ اس مکتب کے بانی (امام) احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ تھے۔ انہوں نے حدیث کی بہت بڑی کتاب مسند احمد لکھی ہے۔ (امام) احمد بن حنبل نے لوگوں کو عصرِ پیغمبرؐ اور عصرِ صحابہؓ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی۔ وہ صحابہؓ کو ''سلفِ صالحین'' کے عنوان سے یاد کرتے تھے۔

حنفی اور حنبلی مکتبِ فکر میں اختلافات کی خلیج اتنی بڑھی کہ دونوں نے ایک دوسرے کو گناہگار، فاسق اور خارج از اسلام قرار دیا۔

خطیبِ بغدادی نے اپنی تاریخ میں (امام) ابوحنیفہ کے مخالفین کے یہ اشعار نقل کئے ہیں:

اِذَا ذُوالرَّاْیِ خَاصَمَ فِیْ قِیَاس وَجَآءَ بِبِدْعَۃٍ ھنۃٍ سَخِیْفَۃ
اتینَا ھُمْ بِقَوْلِ اللّٰہِ فِیھَا وَاٰثَارٍ مُبررۃٍ شَرِیْفَۃ
فکَمْ مِّنْ فَرَجٍ مُحْصَنَۃٍ عَفِیْفَۃ احلّ حَرَامُھَا بِاَبِیْ حَنِیْفَۃ[۳]

جب کوئی اہل رائے اپنے قیاس سے بدعت کو لاتا ہے تو ہم اس کے مقابلے میں قرآن و حدیث پیش کرتے ہیں۔ کتنی ہی شوہردار اور با عفت عورتیں (امام) ابوحنیفہ کے فتووں سے اجنبی مردوں پر حلال کی جا چکی ہیں۔

۱۔ ابن حزم، المحلی، ج ۱۱، ص ۳۵۱۔۲۵۷۔ ۲ و ۳۔ خطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص ۳۹۶ اور ص ۴۰۸۔

ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کی سیاسی رَوش

احمد بن علی خطیب بغدادی بیان کرتے ہیں کہ (امام) ابوحنیفہ کے خلیفہ ابوجعفر منصور عباسی سے دو متضاد قسم کے تعلقات قائم ہوئے تھے۔ ابتدا میں وہ خلیفہ منصور کے پاس ملازمت کرتے تھے۔

۱۴۲ھ میں جب بغداد کے گرد فصیل بنائی گئی تو اس وقت (امام) ابوحنیفہ فصیل کی اینٹیں گننے پر مامور تھے۔ انہوں نے اینٹیں گننے کے لئے ایک منفرد طریقہ ایجاد کیا تھا۔ وہ ایک سو یا ایک ہزار اینٹیں شمار کرکے وہاں چھوٹی سے لکڑی نصب کر دیتے تھے اور یوں ہر ہزار اینٹ کے بعد ایک لکڑی لگاتے جاتے تھے اور آخر میں وہ ان لکڑیوں کو گن لیتے تھے۔ گنتی کا یہ طریقہ سب سے پہلے (امام) ابوحنیفہ نے متعارف کرایا تھا۔[۱]

عمر کے آخری حصے میں (امام) ابوحنیفہ نے حکومت کی مخالفت کی تھی جیسا کہ خطیب بغدادی اور دیگر مؤرخین نے لکھا ہے۔

جب ابراہیم نے منصور کے خلاف بصرے میں خروج کیا تو (امام) ابوحنیفہ نے منصور کے خلاف اور ابراہیم کے حق میں فتویٰ دیا تھا۔[۲] بیان کیا جاتا ہے کہ اسی فتوے کی وجہ سے منصور نے (امام) ابوحنیفہ کو بغداد کے قیدخانے میں ڈال دیا اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔

(امام) ابوحنیفہ کے بعد ان کے شاگرد دربارِ خلافت سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے شاگردِ خاص ابویوسف، ہارون رشید کے عہد میں قاضی القضاۃ تھے۔ ایک بار جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: ''ہم (امام) ابوحنیفہ کے پاس جاتے تھے اور ان سے فقہ سیکھتے تھے لیکن اُمورِ دین میں ہم ان کی تقلید نہیں کرتے تھے۔''[۳]

بہرحال خلفاء نے حنفی مذہب کو رواج دیا اور عثمانیوں کے دور میں بھی حنفی مذہب سرکاری مذہب تھا۔ یہ دو فقہی مذاہب کا مختصر سا بیان تھا جو حدیث کو قبول یا ترد کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔

(۲) اسلامی عقائد میں اِختلاف

مکتبِ خلفاء کے پیروکاروں میں صِرف فقہی اختلاف ہی نہیں بلکہ عقائد کا بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے جو کہ اس طرح سے ہے:

۱۔ تاریخ بغداد، ج۱، ص۷۱۔

۲۔ تاریخ بغداد، ج۱۳، ص۳۸۴۔۳۸۶، باب ذکر ماحکی عن ابی حنیفة من رأیة فی الخروج علی السلطان۔

۳۔ تاریخ بغداد، ج۱۳، ص۳۸۶ و ۳۷۵۔

(ا) ایک فرقے کا خیال ہے کہ ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور مکان کا تصور صفاتِ باری کے لئے جائز ہے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا اعضاء و جوارح اور مکان و مکانیت سے منزہ ہے انہوں نے صفاتِ الٰہی کو معطل کیا ہے۔ چنانچہ یہ فرقہ اپنے مخالفین کو معطلة الصفات کہتا ہے۔

دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ اعضاء و جوارح کا تعلق صفاتِ اجسام سے ہے اور یہ مخلوق کی صفت ہے اور خدا مخلوق کی صفات سے بلند وبالا ہے۔ یہ گروہ اپنے مخالفین کو مجسمہ اور مشبّھہ کہتا ہے کیونکہ ان کا مخالف گروہ خدا کی جسمانیت کا قائل ہے۔

(ب) فرقۂ مجسمہ کہتا ہے کہ خدا قدیم ہے اور اس کی صفات بھی قدیم ہیں۔ چونکہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور کلام کرنا ایک صفت ہے اور خدا کی ہر صفت قدیم ہے لہٰذا قرآن بھی قدیم ہے۔ پس اسے مخلوق نہیں کہا جاسکتا۔

جبکہ فرقۂ معطلة الصفات کہتا ہے کہ اللہ بیشک قدیم ہے اور قرآن مجید اس کا کلام ضرور ہے لیکن قدیم نہیں ہے۔ پس جو شخص قرآن مجید کو اللہ کی طرح قدیم مانے وہ مشرک ہے کیونکہ وہ دو قدیموں کا قائل ہے۔

مؤلف کہتا ہے کہ مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جو قرآن مجید کو قدیم سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اتنی توجہ تک نہیں کی کہ سورۂ مبارکۂ انفال کی پہلی ہی آیت کہتی ہے: وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ.... اے رسولؐ! یہ لوگ آپ سے غنائم کی تقسیم کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

یہ آیت اس وقت اتری تھی جب جنگِ بدر کے بعد غنائم کے متعلق صحابۂ کرامؓ میں اختلاف پیدا ہوا تھا اور انہوں نے تقسیمِ غنائم کے متعلق رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کیا تھا۔

اب اگر قرآن مجید قدیم ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جس دوَر میں صحابہ پیدا نہیں ہوئے تھے اس وقت بھی یہ آیت موجود تھی کہ صحابہ تقسیم غنائم کے متعلق آپؐ سے پوچھتے ہیں۔ جب پوچھنے والے ہی دنیا میں موجود نہیں تھے تو ان کا سوال ان کے وجود سے مقدم کیسے ہوسکتا ہے؟

اسی طرح سے قرآن مجید میں چودہ مرتبہ يَسْئَلُونَكَ یعنی وہ آپ سے پوچھتے ہیں اور دو مرتبہ يَسْتَفْتُوْنَكَ یعنی وہ آپؐ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں آیا ہے۔ اسی طرح سے جب ایک عورت نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اپنے شوہر کی شکایت کی تو سورۂ مبارکۂ مجادلہ کی پہلی آیت قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا..... ''اللہ نے اس عورت کی بات سن لی ہے جو آپ سے اپنے شوہر کے متعلق جھگڑ رہی تھی'' نازل ہوئی تھی۔

اب اگر قرآن مجید کو قدیم مان لیا جائے تو اس کے ساتھ سوال کرنے والوں کے سوالات کو بھی قدیم

ماننا پڑے گا اور صرف سوال قدیم نہیں ہوسکتا جب تک سائل قدیم نہ ہو۔ تو کیا قرآن مجید کو قدیم ماننے والے ان تمام سائلوں کو، فتویٰ طلب کرنے والوں کو اور اپنے شوہر سے جھگڑنے والی عورت کو بھی قدیم ماننے پر تیار ہیں؟

حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ قرآن مجید کی اکثر آیات کسی نہ کسی واقعہ سے مربوط ہیں جبکہ واقعات حادث ہیں قدیم نہیں ہیں۔ جب واقعات ہی حادث ہیں تو ان سے مربوط آیات کو قدیم کیونکر کہا جاسکتا ہے؟

(ج) ایک فرقے کا خیال ہے کہ بندوں کے تمام افعال خدا کی طرف سے ہیں اور بندوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔[1] جبکہ دوسرے فرقے کا خیال ہے کہ انسان کے افعال خود اس کے اپنے پیدا کردہ ہیں اور اگر انسان اپنے افعال میں مجبور ہے تو اللہ تعالیٰ کے عدل سے یہ بات بعید ہے کہ افعال تو وہ خود انجام دلوائے اور عذاب دوسروں کو دے۔[2]

پہلے فرقے کو جبریہ اور دوسرے کو عدلیہ کہا جاتا ہے۔

(د) مکتبِ خلفاء کو ماننے والوں کی اکثریت خلیفہ کی اطاعت کو واجب سمجھتی ہے اور اس کے خلاف خروج کو حرام جانتی ہے اگرچہ خلیفہ ظالم اور بدکار ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ کچھ چھوٹے گروہ ایسے بھی ہوئے ہیں جو ظالم اور بدکار خلیفہ کے خلاف خروج کے قائل تھے۔ مقتدر طبقے نے ایسی فکر رکھنے والوں کو تباہ و برباد کیا اور پھر انہیں تاریخ میں ہمیشہ برُے الفاظ سے یاد کیا گیا۔

اس طرح کے اختلاف کا سبب وہ احادیث ہیں جو ہم نقل کر آئے ہیں۔ اب ہم عقائد میں شدید اختلاف رکھنے والے فرقوں کا ایک ہلکا سا تعارف پیش کرتے ہیں:

(۱) جہمی

جہم بن صفوان کے پیروکاروں کو جہمی یا جہمیہ کہا جاتا ہے۔[3]

اس بحث کی شروعات میں ہم یہ بتادیں کہ جہم اور جہمیہ کے نظریات کے متعلق اس وقت ہمارے پاس دوطرح کے مأخذ ہیں:

(ا) وہ کتابیں جو اُن کے مخالفین نے جہم کے نظریات کی رد میں لکھی تھیں۔

(ب) مذاہب وملَل کی کتابیں جن میں اس فرقے کے نظریات بتائے گئے ہیں۔

۱۔ عبدالکریم شہرستانی، الملل والنحل، ج۱، ص۸۵۔ الفصل الثانی: الجبریۃ۔

۲۔ عبدالکریم شہرستانی، الملل والنحل، ج۱، ص۴۳۔ الفصل الاول: المعتزلۃ۔

۳۔ انساب سمعانی ''جہمی'' کے ذیل میں۔

اس طرح کی علمی بحثوں میں نہایت محتاط رویہ اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ مخالفین کی تحریروں سے کسی فرقے کے حقیقی خیالات کا پتا لگانا انتہائی مشکل کام ہے۔ اور مذاہب وملل کے نظریات اور ان کی تاریخ لکھنے والوں کی کتابوں سے نقل کرنے میں بھی بڑی احتیاط درکار ہوتی ہے کیونکہ اس طرح کی کتابوں میں بعض ایسے فرقوں کے نام بھی موجود ہیں جن کا سرے سے کبھی وجود ہی نہیں رہا اور بعض اوقات مورخینِ مذاہب وملل مذکورہ فرقے سے براہِ راست نظریات حاصل کرنے کی بجائے ان کے مخالفین سے سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر کے اپنی کتابوں میں بہت کچھ لکھ دیتے ہیں جبکہ ان کی بات حقیقت سے کوسوں دور ہوتی ہے۔

بہرنوع مذکورہ بالا دونوں مآخذ پر سوفیصد اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے اس لئے ہم نے فرقہ جہمیہ کے نظریات اخذ کرنے میں بڑی احتیاط برتی ہے جس کے نتیجے میں ہمیں اس فرقہ کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ:

(ا) جہم اور جہمیہ خدا کی جسمانیت کے منکر تھے۔[۱]

(ب) قرآن مجید کو قدیم نہیں بلکہ مخلوق مانتے تھے۔

(ج) انسان کے افعال خدا کے پیدا کردہ ہیں اور وہ اپنے افعال میں مجبور ہے۔[۲]

(د) امام وہ ہوسکتا ہے جو کتاب وسنت کا عالم ہو اور اسکے انتخاب پر مسلمانوں کا اجماع ہوا ہو۔[۳]

جہم کی مختصر سوانح حیات

جہم بلخ کا رہنے والا اور قبیلۂ ازد کا آزاد کردہ تھا۔ اس کی کنیت ابومحرز تھی۔[۴] جس زمانے میں جہم کوفے گیا تو اس نے وہاں (امام) ابوحنیفہ سے کئی مناظرے کئے۔[۵] پھر کچھ عرصے بعد جب وہ بلخ واپس آیا تو اس نے مقاتل بن سلیمان سے تجسیمِ خداوندی کے متعلق بھی کئی مناظرے کئے۔ واضح رہے کہ مقاتل خداوندِ عالم کے لئے جسم وجسمانیت کے عقیدے میں غلو کرتا تھا۔[۶]

۱۔ کتاب جہم بن صفوان، ص۷۱، الفصل الثالث نفی الصفات عن اللّٰہ تعالیٰ۔

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: (۱) الرد علی الجهمية والزنادقة، تالیف (امام) احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ، مطبوعہ قاہرہ۔ (۲) الرد علی الجهمية، تالیف عثمان بن سعید دارمی، المتوفی ۲۸۰ھ، مطبوعہ لیڈن ۱۹۶۰ء۔ (۳) جہم بن صفوان، تالیف حامد علی، مطبوعہ بغداد ۱۹۶۵ء۔ یہ کتاب جہم کی زندگی پر ایک جامع کتاب ہے۔

۳۔ فرق الشیعہ، ص۱۳۵۔

۴۔ انساب سمعانی۔

۵۔ مناقب ابی حنیفہ، ج۱، ص۱۴۵ تا ۱۴۸، تالیف موفق بن احمد مکی، مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۲۱ھ۔

۶۔ مقاتل کے حالات ”اہلِ کتاب کے عقائد کے اثرات“ کے ضمن میں انشاء اللہ آگے بیان کئے جائیں گے۔

مقاتل نے تنگ آ کر حاکمِ بلخ سے درخواست کی کہ وہ جہم کو ترمذ جلاوطن کر دے۔[1]

بیان کیا جاتا ہے کہ ترمذ میں اس وقت سمنیہ فرقے کے لوگ بڑی تعداد میں آباد تھے۔ درحقیقت سمنیہ بدھ مت کے پیروکار تھے اور وہ مادی اجسام کے علاوہ کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔[2] جب اسلامی فوج نے ترمذ فتح کیا تو اس وقت وہاں لگ بھگ ایک ہزار بدھ بھکشو رہتے تھے اور ان کے وہاں بارہ مندر تھے۔[3] جہم نے ترمذ کے سمنیہ فرقے سے مناظرے کئے اور انہیں مسلمان بنایا۔[4]

کہا جاتا ہے کہ جہم بن صفوان نے معتزلہ کے اکابرین سے بھی خط و کتابت کی تھی اور ان سے بھی کئی مناظرے کئے تھے۔[5]

جہم کا سیاسی کردار

جہم بن صفوان کا زمانہ بنی امیہ کی سلطنت کے آخری ایام کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں لوگ بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے اور حکومت کے خلاف جگہ جگہ شورشیں اُٹھ رہی تھیں۔

اس زمانے میں حارث بن سریج تمیمی نے ۱۱۶ھ میں بنی امیہ کے خلاف خروج کیا اور لوگوں کو کتاب و سنت کی پیروی اور ہشام بن عبدالملک اموی کو معزول کرنے کی دعوت دی۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے ساٹھ ہزار کا لشکر جمع کر کے بلخ، جوزجان اور طالقان کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد شہرِ مرو کی جنگ میں اسے شکست ہوئی تو وہ ترکستان بھاگ گیا اور وہاں بارہ برس تک مقیم رہا۔ وہ کبھی کبھی ترکوں کی مدد سے بنی امیہ (عربوں) کے خلاف کاروائیاں کیا کرتا تھا۔

۱۱۸ھ میں لشکرِ بنی امیہ نے ایک ایسے قلعے کو فتح کیا جس میں حارث کے پیروکار رہتے تھے۔ بنی امیہ نے وہاں کے قلعہ نشین افراد کی اکثریت کو تہ تیغ کر دیا اور بوڑھوں اور بچوں کو قید کر کے بلخ کے بازار میں بیچ دیا۔

نصر بن سیار والیٔ خراسان نے ۱۲۶ھ میں یزید بن ولید بن عبدالملک اموی سے حارث کے لئے امان نامہ حاصل کیا۔ اسی اثنا میں حارث ''مرو'' آیا۔

۱۔ حافظ ابن کثیر، تاریخ، ج۹، ص۳۵۰۔ ذہبی، تاریخ الاسلام، ج۵، ص۵۶۔

۲۔ احمد بن یحییٰ بن مرتضیٰ (المتوفی ۸۴۰ھ)، طبقات المعتزلہ، ص۳۴، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۱ء

۳۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (عربی ترجمہ — دائرۃ المعارف الاسلامیہ) مادہ ''ترمذ''

۴۔ احمد بن یحییٰ بن مرتضیٰ، طبقات المعتزلہ، ص۳۴ اور احمد بن حنبل، الرد علی الجھمیۃ، ص۱۵۔

۵۔ احمد بن یحییٰ بن مرتضیٰ، طبقات المعتزلہ، ص۳۲۔

نصر بن سیار نے حارث کو پیشکش کی کہ اگر وہ اموی حکومت کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہوجائے تو اسے اس کے بدلے میں ایک صوبے کی گورنری اور ایک لاکھ دینار بطور انعام دیئے جائیں گے۔

حارث نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور والی کو پیغام بھیجا: ''میں ظلم اور برائی کے خاتمہ کے لئے پورے تیرہ سال تک اس شہر سے دور رہا ہوں، میں دنیا اور لذاتِ دنیا کا طلبگار نہیں ہوں جبکہ تو مجھے ''دنیا'' کی دعوت دے رہا ہے۔ میرا تجھ سے صرف یہی مطالبہ ہے کہ کتاب وسنت پر عمل کر اور نیک افراد کو شہروں کا حاکم مقرر کر۔ اگر تو نے ایسا کیا تو میں تیرے لشکر میں شامل ہو کر تیرے دشمنوں سے جنگ کروں گا۔''

نصر بن سیار نے اس کے مطالبے کو قبول نہ کیا جس کی وجہ سے حارث نے لوگوں کو دوبارہ بنی امیہ کے خلاف بغاوت پر ابھارا اور رفتہ رفتہ ایک لشکر جمع کرلیا۔ اس مرتبہ جہم بن صفوان نے حارث کا ساتھ دیا۔ ۱۲۸ھ میں حارث کو جنگ میں شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ اس کے بعد جہم بن صفوان کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔[۱]

جہم ایک پُرجوش اور متحرک شخص تھا۔ وہ اپنے عقیدے کی نشر و اشاعت میں انتہائی مخلص تھا۔ مکتبِ خلفاء کے محدّثین کے ساتھ اس کے زیادہ تر اختلافات تجسیم وتشبیہ خداوندی کے متعلق تھے اور اس کے علاوہ اس نے مکتبِ خلفاء کے علماء سے قرآن کے قدیم ہونے اور مخلوق نہ ہونے پر بھی بہت سے مناظرے کئے تھے۔

جہم کے بہت سے پیروکار تھے۔[۲]

مکتبِ خلفاء کے محدثین نے اس کی تردید میں کئی کتابیں لکھیں اور ان میں سے شاید قدیم ترین کتاب الرد علی الجهمية والزنادقة (امام) احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ نے لکھی تھی۔

جہم مذہبِ اعتزال کے مؤسّسین کا ہم عصر تھا۔ بعض عقائد میں ان کی آرا ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور اس بات میں اختلاف ہے کہ کون کس سے متاثر تھا۔[۳] جبکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ دونوں فرقوں نے تجسیم خداوندی کی نفی جیسے کچھ مسائل مکتبِ اہلبیتؑ کے شاگردوں سے اخذ کئے تھے۔

اب ہم جن مذاہب کا تذکرہ کریں گے ان کے متعلق ہمارے پاس قابلِ اعتماد مآخذ موجود ہیں۔ مثلاً ان فرقوں کے علماء کی لکھی ہوئی کتابیں بھی ہمارے پاس ہیں نیز مسعودی اور دیگر قابلِ اعتماد معاصر علماء کی کتابیں بھی ہماری دسترس میں ہیں۔

۱۔ حافظ ابن کثیر، تاریخ، ذکر حوادث ۱۱۶ھ - ۱۲۸ھ، ج ۵، ص ۳۶ا اور ۳۶۱، مطبوعہ یورپ۔ تاریخ طبری میں مذکورہ سالوں کے واقعات تفصیل کے ساتھ جبکہ تاریخ ابن اثیر میں اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

۲۔ انساب سمعانی۔

۳۔ کتاب جہم بن صفوان کی چھٹی فصل ص ۱۶۱ دیکھیں۔

(۲) مُعتزلی

اس مذہب کا بانی واصل بن عطاء غزال المتوفی ۱۳۱ھ ہے۔ اس کی کنیت ابوحذیفہ تھی اور وہ عرب کے قبیلہ ''ضبہ'' یا ''مخزوم'' کا آزاد کردہ تھا۔ وہ بصرہ میں رہتا تھا اور حسن بن یسار بصری (المتوفی ۱۱۰ھ) کی مجلسِ درس میں حاضر ہوتا تھا۔ بعد میں اس نے حسن بصری سے چند مسائل میں اختلاف کیا اور اس کا درس چھوڑ دیا۔

عربی میں کنارہ کشی کو اعتزال اور کنارہ کشی کرنے والے کو معتزل کہتے ہیں۔ اسی کنارہ کشی کی وجہ سے اس مذہب کے ماننے والوں کو معتزلہ اور ان کے مذہب کو اعتزال کہا جاتا ہے۔

واصل بن عطاء نے اپنے نظریات کی تبلیغ کیلئے اسکندریہ سے اندلس تک مبلّغ بھیجے۔ اِس کے علاوہ اُس نے خراسان، یمن، کوفہ اور دیگر اسلامی شہروں میں بھی مبلّغین روانہ کئے۔ واصل کے پیروکاروں میں عمرؔو بن عبید کو بڑا مقام حاصل ہے۔ عمرؔو بن عبید المتوفی ۱۴۲ھ قبیلہ تیم کا آزاد کردہ تھا اور بصرہ میں رہتا تھا۔ وہ پہلے حسن بصری کے درس میں شرکت کرتا تھا لیکن بعد میں اس نے حسن بصری کے درس کو چھوڑ کر مذہبِ اعتزال اختیار کرلیا۔[۱]

مُعتزلی نظریات

جہمیہ کی طرح سے معتزلہ بھی تجسیم خداوندی کے منکر تھے اور جہمیہ کی طرح وہ بھی قرآن کو مخلوق تسلیم کرتے تھے اور قدیم نہیں جانتے تھے۔ البتہ جہمیہ جبرؔ کے جبکہ معتزلہ اِختیار کے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بندے اپنے افعال میں آزاد ہیں اور بندوں کے افعال کو خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔[۲]

متوکّل عباسی کے دوؔر تک معتزلی مذہب نے خوب ترقی کی لیکن جب متوکّل نے اقتدار سنبھالا تو اُس نے اس فرقے کی شدید مخالفت کی اور اس کے پیروکاروں کو بہت تنگ کیا۔[۳]

متوکّل کے دوؔر کے بعد اَشاعرہؔ اور اہلِ حدیث سے کئی صدیوں تک ان کے مناظرے جاری رہے۔ آخرکار عثمانی خلفاء کے عہد میں اَشاعرہؔ اور اہلِ حدیث نے حکومت کی آشیرباد سے انہیں حَرفِ غلَط کی طرح مٹا دیا۔

(۳) اہلِ حدیث

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ (امام) ابوحنیفہ نے احکام پر مبنی احادیث کے متعلق نامناسب رویہ اختیار کرتے ہوئے احکام کے استنباط کے لئے کچھ قواعد وضوابط مثلاً قیاس، استحسان اور مصالح مرسلہ مرتب کئے تھے۔

۱۔ تاریخ بغداد، ج ۱۲، ص ۱۶۶۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، ج ۳، ص ۱۳۔ ابن کثیر، تاریخ، ج ۱۰، ص ۱۰ درذکر حوادث ۱۴۲ھ۔

۲۔ عبدالقاہر اسفرائنی، الفرق بین الفرق، ص ۱۱۴۔ الفصل الثالث، مقالات القدریۃ والمعتزلـۃ۔

۳۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء۔ تاریخ طبری اور ابن اثیر جزری، الکامل فی التاریخ، درحالات متوکل۔

علاوہ ازیں مکتبِ خلفاء کی کتبِ حدیث میں ایسی بہت سی احادیث موجود ہیں جن میں خدا کی جسمانیت نیز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسی تمام احادیث کی معتزلہ اور جہمیہ تاویل کرتے ہیں مگر اُس سے حقیقی معانی مراد نہیں لیتے جبکہ محدثین ان احادیث کو حقیقی معانی پر محمول کرتے ہیں۔

(امام) ابوحنیفہ اور ان کے پیروکاروں اور جہمیہ و معتزلہ کے ساتھ محدّثین کی بہت سی بحثیں ہوئیں اور پھر آہستہ آہستہ حدیث کے طرفداروں نے اہلِ حدیث کے نام سے ایک نیا فرقہ بنالیا۔

اہلِ حدیث میں معتبر نام (امام) احمد بن حنبل کا ہے۔ انہوں نے حدیث پر ایک وقیع کتاب لکھی ہے جو مسند احمد کے نام سے مشہور ہے۔ (امام) احمد بن حنبل نے مسند کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں تالیف کی تھیں جن میں کتاب الرد علی الجھمیۃ اور کتاب فضائل علی بن ابی طالبؑ شامل ہیں۔[1]

(امام) احمد بن حنبل قرآن مجید کو مخلوق نہیں مانتے تھے اور اپنے موقف کا ثابت قدمی سے دفاع کرتے تھے جبکہ مامون رشید قرآن کو مخلوق مانتا تھا اور جو لوگ قرآن کو مخلوق نہیں مانتے تھے انہیں سخت اذیتیں دیتا تھا لیکن ان مشکل حالات میں بھی (امام) احمد بن حنبل اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹے رہے اور ان کی یہی استقامت ان کی شہرت کا باعث بنی۔

مامون کے بعد معتصم المتوفی ۲۲۷ھ نے اسی عقیدے کی پاداش میں (امام) احمد بن حنبل کو قید کیا اور واثق عباسی المتوفی ۲۳۲ھ کے عہدِ حکومت میں انہیں آزادی نصیب ہوئی اور جب متوکّل خلیفہ بنا تو اس نے معتزلہ کے نظریۂ خلقِ قرآن کو خیرباد کہہ کر اہلِ حدیث کے نظریے کو اختیار کیا۔ اس نے (امام) احمد بن حنبل کی بڑی تعظیم وتوقیر کی۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ خلیفہ، (امام) احمد بن حنبل کی بے حد عزّت کرتا ہے تو انہوں نے بھی اسے اپنا رہبر و امام مان لیا۔[2]

۱۔ حافظ ابن کثیر، تاریخ، ج ۱۰، ص ۳۲۵۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج ۴، ص ۴۱۲، در ذکر احوال احمد بن حنبل۔

۲۔ مکتبِ خلفاء میں فرقہ وارانہ اختلافات کا اثر کیا ہوا؟ اس کے جواب کے لئے ہم امام الائمہ ابن خزیمہ کی اس گفتگو کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو انہوں نے مستدرک حاکم ج ۳، ص ۵۱۳ میں ابوہریرہؓ کا دفاع کرتے ہوئے کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابوہریرہؓ کی احادیث پر تنقید کرنے والوں کا تعلق ــــ یا جہمیوں سے ہے جو صفاتِ خدا کو معطل قرار دیتے ہیں اور ابوہریرہؓ کی احادیث کو اپنے نظریات کے مخالف پاتے ہیں۔ ــــ یا پھر خوارج سے ہے جو ان کی احادیث پر تنقید کرتے ہیں کیونکہ ابوہریرہؓ کی روایات تلقین کرتی ہیں کہ حاکم کے خلاف خروج حرام اور اس کی اطاعت واجب ہے جبکہ خوارج حاکم کے خلاف خروج کو واجب سمجھتے ہیں۔ ــــ یا پھر قدریہ سے ہے جو یہ مانتے ہیں کہ انسانوں کے اعمال کا ازل سے فیصلہ ہوچکا ہے جبکہ ابوہریرہؓ کی روایات اس مفہوم کے خلاف ہیں۔ یا پھر فقہاء ابوہریرہؓ کی احادیث کو ماننے سے پس و پیش کرتے ہیں کیونکہ انہیں ابوہریرہؓ کی روایات اپنے فقہی مزاج کے خلاف دکھائی دیتی ہیں۔

(امام) احمد بن حنبل کے بعد معتزلہ اور اہلِ حدیث میں نظریاتی جنگ نے شدت اختیار کرلی اور اہلِ حدیث نے اپنے لئے ''اہلِ سنّت والجماعت'' کا لفظ مخصوص کر کے جداگانہ تشخص کا اظہار کیا۔

عہدِ بنی عباس میں یونانی فلسفے کی کئی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور یوں مسلمانوں میں یونانی فلسفہ متعارف ہوا اور اس نے بہت سے اذہان کو متأثر کیا۔ عباسی حکمرانوں نے فلسفے کی سرپرستی کی اور پھر مذہبی مباحث میں فلسفیانہ مباحث کا رنگ جھلکنے لگا جسے معتزلہ کے کتابی اور زبانی مناظروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ فلسفہ کی اشاعت کی وجہ سے علمِ کلام وجود میں آیا۔ فلسفے کی اشاعت سے محدّثین میں کئی فرقے پیدا ہوگئے اور فلسفیانہ افکار کے دَوْر میں مکتبِ خلفاء میں ایک اور فرقے نے جنم لیا جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۴) اشعری

اشعری فرقے کی نسبت ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری المتوفی ۳۲۴ھ کی طرف ہے جو ابوموسیٰ اشعری کی نسل سے تھا۔

ابوالحسن اشعری چالیس برس کی عمر تک بصرہ میں مقیم رہا۔ ابتدا میں اس کا تعلق بھی معتزلہ سے تھا اور وہ مشہور معتزلی عالم ''جبائی'' المتوفی ۳۰۳ھ کا شاگرد تھا۔[۱]

جس طرح معتزلہ کے مؤسّس واصل بن عطا اور عمرو بن عُبید نے حسن بصری سے کنارہ کشی کر کے ایک علیحدہ مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی تھی، اسی طرح ابوالحسن اشعری نے بھی معتزلی مذہب سے کنارہ کشی اختیار کی[۲] اور محدّثین کی طرح لوگوں کو حدیث کی طرف دعوت دی۔

اس کے بعد اشعری بغداد گیا اور معتزلہ کی تردید شروع کردی۔ اشعری کا ذہن فلسفہ سے بھی متأثر تھا اور جب وہ معتزلہ سے مناظرہ کرتا تو علمِ حدیث کے ساتھ ساتھ فلسفے سے بھی کام لیتا تھا اور بعض عقائد میں اسے حدیث کے ظاہری الفاظ سے اختلاف تھا۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو (امام) احمد بن حنبل کے مکتب کا عُروج خیال کرتا تھا مگر محدّثین اور بالخصوص (امام) احمد بن حنبل کے پیروکاروں میں اسے چنداں پذیرائی نصیب نہ ہوسکی۔

اشعری مشہور شافعی فقیہ ابواسحٰق مروزی کے حلقۂ درس میں شرکت کرتا تھا اس لئے فقہِ شافعی کے کچھ پیروکاروں نے اشعری عقیدہ اپنا لیا جبکہ کچھ دیگر شافعیوں نے معتزلی نظریات اختیار کئے اور یوں عقائد کے اعتبار سے مکتبِ خلفاء دو بڑے مذاہب یعنی معتزلی اور اشعری میں تقسیم ہوگیا اور فقہی طور پر مکتبِ خلفاء کے پیروکار حنفی، مالکی اور شافعی مذاہب میں بٹ گئے۔ رفتہ رفتہ (امام) احمد بن حنبل کا مکتب بھی فقہی مذہب میں شمار ہونے لگا۔

۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (دائرۃ المعارف الاسلامیہ) ج۲، ص۲۱۸۔ ۲۔ وفیات الاعیان، درحالات اشعری، ج۳، ص۳۹۸۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے باہمی مُناظرے علم کلام کے اصولوں کے مطابق ہوتے تھے۔ چونکہ اَشاعرہ اور معتزلہ کے مناظروں میں علمِ کلام کے اصول چھائے رہتے تھے اس لئے اہلِ حدیث ان دونوں فرقوں سے جدا ہوگئے بعدازاں مکتبِ خلفاء میں بہت سے فقہی مذاہب متعارف ہوئے پھر ۶۶۵ھ میں ''مملوک''[۱] کے عہد میں ملک ظاہر بیبرس بند قداری نے فِقہ میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مذاہب کو اور عقائد میں اشعری عقیدے کو سرکاری طور پر تسلیم کیا۔ مکتبِ خلفاء کے پیروکاروں میں یہ حکم آج تک رائج ہے۔[۲]

(۵) سلفی

ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں (امام) احمد بن حنبل کے مکتب کے ایک پیروکار احمد بن عبدالحلیم المعروف ابن تیمیہ حرّانی المتوفی ۷۲۸ھ نے تمام اسلامی فرقوں کے خلاف محاذ قائم کیا۔ مکتبِ خلفاء کی طرف سے اگرچہ اس وقت اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کا اعلان ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو مجتہد کہلاتا تھا۔[۳]

ابن تیمیہ عقیدۂ تجسیم میں بہت غلو کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مِنبر کی سیڑھی سے نچلی سیڑھی پر قدم رکھا اور منبر سے اتر کر حاضرین سے کہا جس طرح میں منبر کی سیڑھیاں اُتر رہا ہوں اسی طرح خدا بھی اوپر کے آسمان سے نیچے کے آسمان کی طرف اترتا ہے۔[۴]

ابن تیمیہ رسولِ اکرمؐ سے توسّل اور اِستغاثہ کو حرام سمجھتا تھا اور ''یا محمدؐ'' کے الفاظ کو ناجائز کہتا تھا۔[۵]

ابن تیمیہ چونکہ فضائلِ علیؑ کا منکر تھا اس لئے مکتبِ خلفاء کے علماء نے اس کے خلاف منافق کا فتویٰ جاری کیا تھا اور اس کی دلیل یہ پیش کی تھی کہ حدیثِ رسولؐ ہے کہ یَاعَلِیُّ لَایُبْغِضُکَ اِلَّا مُنَافِق. اے علیؑ! منافق کے سوا تجھ سے کوئی بُغض نہیں رکھے گا اور ابن تیمیہ چونکہ دشمنِ علیؑ ہے اس لئے وہ منافق ہے۔[۶]

مکتبِ خلفاء کے علماء نے دمشق، قاہرہ اور اسکندریہ میں کئی بار اس سے مناظرے کئے اور اس کو قید کرنے کا فتویٰ جاری کیا اور بعض اوقات ابن تیمیہ سے اس کے فاسد عقائد سے توبہ بھی کرائی گئی۔[۷]

ابن تیمیہ کے بعد اس کے پیروکاروں نے اسے شیخ الاسلام کا لقب دیا اور انہوں نے اپنے مکتب کو ''سلفیہ'' کے نام سے موسوم کیا اور اس نام سے انہوں نے یہ تأثر دینے کی کوشش کی کہ وہ سَلَف صالحین کی پیروی

۱۔ ''مملوک'' مصر کا خاندان غلاماں جو بعد ازاں آزاد ہوا۔

۲۔ مقریزی، الخطط، ج ۲، ص ۱۶۱، مطبوعہ قاہرہ، سال ۱۳۲۶ھ۔

۳،۴،۵۔ ابن حجر عسقلانی، الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنہ، ص ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۵۸، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۸۵ھ۔

۶،۷۔ ابن حجر عسقلانی، الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنہ، ص ۱۶۶، ص ۱۵۰۔ ۱۷۰، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۸۵ھ۔

کرنے والا فرقہ ہے اور سَلَفِ صالحین سے ان کی مراد صحابۂ کرام، تابعین اور پہلی، دوسری اور تیسری صدی ہجری کے (امام) احمد بن حنبل جیسے علماء ہیں۔

سلفی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ انتہائی سخت رویہ رکھتے ہیں اور یہ لوگ اپنے آپ کو مومن جبکہ تیسری صدی ہجری سے لے کر آج تک کے تمام مسلمانوں کو گمراہ اور بدعتی سمجھتے ہیں۔[1]

(۶) وہّابی

بارہویں صدی ہجری میں ایک سلفی محمد بن عبدالوہاب المتوفی ۱۲۰۷ھ نے مسلمانوں کے خلاف خروج کیا اور اس نے ابن تیمیہ کے نظریات کو اس سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے پیروکاروں کو ''وہّابی'' کہا جاتا ہے۔

محمد بن عبدالوہاب زیارتِ قبور کو بدعت اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد ان سے طلبِ شفاعت کو گمراہی اور استغاثہ وتوسّل کے لئے ''یا محمدؐ'' اور ''یارسول اللہؐ'' وغیرہ کہنے کو شرک کہتا تھا۔

ابن تیمیہ کے پیروکاروں کے علاوہ محمد بن عبدالوہاب قرنِ سوم کے بعد سے لے کر آج تک کے تمام مسلمانوں کو مشرک کہتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ: ہمارے دور کے مشرکین — یعنی آج کے مسلمان — کا شرک دورِ جاہلیت کے مشرکین سے زیادہ سخت ہے۔[2]

وہابیوں اور سلفیوں میں تین نکات کا فرق ہے:

(۱) صاحبِ مقامِ محمود نبیٔ محتشم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں شدید بے ادبی۔

(۲) وہابیوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو واجب القتل سمجھنا یہاں تک کہ وہ وہابیت کو قبول کرلیں یا ان کے اپنے الفاظ میں جب تک شرک چھوڑ کر توحید کو اختیار نہ کرلیں۔ اسی خود ساختہ دلیل کی بناپر وہ مسلمانوں کے شہروں کو، مشرکین کے شہراور وہابیوں کے شہروں کو بلادِاسلام اور بلادِاہلِ توحید کہتے ہیں۔

(۳) ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام گناہ بخش دے گا کیونکہ وہابی شرک سے بیزار ہیں اس لئے وہ جتنے بھی گناہ کریں پھر بھی جنت میں جائیں گے۔

مذکورہ بالا تینوں نکات میں نے اپنے بہت سے سفرِ حج اور ان کے تمام طبقات سے بحث مباحثہ اور ان کی رفتار وگفتار سے اخذ کئے ہیں اور ایک طویل جستجو سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے عقائد اور ان کی

۱۔ ابن تیمیہ کی کتاب منہاج السنۃ اور ابن تیمیہ کے ۹۱ قلمی رسائل کا مطالعہ فرمائیں۔ ان رسائل کی فوٹو کاپی مجمع علمی اسلامی کی لائبریری میں موجود ہے۔

۲۔ معالم المدرستین، ج ۱، ص ۶۲۔

وجوہات درج ذیل ہیں:

۱۔ میں نے اپنے مشاہدات میں انہیں گستاخِ رسولؐ پایا۔ ان کی بے ادبی کے کچھ نمونے میں بتا چکا ہوں۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ باقی انسانوں کی طرح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جسمِ اطہر بھی قبر میں نعوذُ باللہ بوسیدہ اور مٹی میں مل کے مٹی ہو چکا ہے اور یہ لوگ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قبرِ مطہرؐ کو باقی لوگوں کی قبور سے زیادہ محترم اور ممتاز تسلیم نہیں کرتے۔

مؤلف کہتا ہے کہ اس بے ادبی کی بنیاد ان روایات و احادیث پر ہے جن میں خواجۂ لولاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شخصیت کو عام انسانوں سے بھی نعوذ باللہ زیادہ پست ثابت کیا گیا ہے۔[۱]

اسی طرح ایک جھوٹی روایت یہ بنائی گئی کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ دعا مانگی تھی:

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا... ''خدایا! میری قبر کو بُت نہ بنانا کہ لوگ اس کی پوجا کرنے لگیں۔ خدا ان قوموں پر لعنت کرے جنہوں نے اپنے انبیاءؑ کی قبروں کو مسجد بنا دیا۔''

ہم نے معالم المدرستین میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مذکورہ بالا روایات بالکل جھوٹی ہیں۔[۲]

۲۔ اپنے فرقے کے علاوہ باقی تمام مسلمان فرقوں کے واجبُ القتل ہونے کا نظریہ بھی انہوں نے اپنی ان روایات سے اخذ کیا ہے جن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اور ان کا یہ رویہ ان کی گفتار و رفتار اور کردار سے جھلکتا ہے۔ اس کے لئے زیادہ ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۔ وہابی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر صورت میں ان کے گناہ معاف کر دے گا اور انہیں جہنم نہیں جانے دے گا۔ اس سلسلے میں میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا وہ یہ ہے:

حُجاجِ کرام سے میں نے متعدد بار سنا کہ وہابی مکے اور مدینے میں بُرائیاں کرتے ہیں۔ جب پہلی بار میں نے ایسے واقعات سنے تو میرے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا اور میں حیران رہ گیا کہ یہ کام تو ان کی اپنی کتابوں میں بھی حرام ہیں اس کے باوجود انہیں ان افعالِ قبیحہ کی جسارت کیسے ہوئی؟ لیکن دوسری طرف سے خبریں اس تواتر سے ملتی تھیں کہ انہیں جھٹلانا بھی ممکن نہ تھا۔ یہ واقعات سن کر میں سوچنے لگا کہ آخر وہابیوں کی جسارتیں اتنی کیوں بڑھ گئی ہیں؟

اس کا علم مجھے ایک سفرِ حج کے دوران ہوا۔ میں نمازِ عشاء کے بعد مسجد خیف میں ایک سعودی خطیب کو سننے کے لئے منبر کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ خطیب نے منبر پر بیٹھ کر شرک کے موضوع پر گفتگو کی۔ پھر اس نے

۱۔ اس مفہوم کی مزید روایات ہم نے اپنی کتاب معالم المدرستین کی جلد اول طبع دوم صفحہ ۳۹ پر پیش کی ہیں۔

۲۔ معالم المدرستین، جلد اول، باب الخلاف حول البناء علی قبور الانبیاء۔

شرک کی اقسام شمار کر کے غیر وہابی مسلمانوں کو مشرک قرار دیا۔ مثلاً ''یارسول اللہؐ'' کہنا اور اہلِ قبور کے لئے نذر ماننا جیسے مسائل پر اس نے گفتگو کی۔

اس کے بعد اس نے ایک خاص انداز سے کہا کہ حدیثِ رسولؐ ہے کہ خداوندِ عالم نے فرمایا: اے میرے بندے! تیرا جو جی چاہے گناہ کر اور اپنے گناہوں سے دنیا کو بھر دے لیکن مشرک نہ بَن، میں تیرے سارے گناہ معاف کر دوں گا ''وَلَا اُبَالِیْ'' اور میں تیرے گناہوں کو کوئی اہمیت نہیں دوں گا۔ بس مشرک نہ بَن۔[1]

جب خطیب یہ حدیث بیان کر رہا تھا تو اس کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی اور وہ اپنے کچھ گناہوں کو یاد کر کے خوش ہو رہا تھا اور گناہوں کی لذّت سے سرشار دکھائی دیتا تھا۔

محمد بن عبدالوہّاب اور آلِ سعود

بارہویں صدی ہجری کے وسط میں درعیہ نجد کے امیر محمد بن سعود نے محمد بن عبدالوہاب کی پیروی کی۔ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے سعود اور اس کے پیروکاروں نے جہاد فی سبیل اللہ کے نام پر اردگرد کے مسلمان قبائل پر حملے کئے جس میں بہت سے مسلمان مارے گئے اور ان کی عورتیں بے عصمت ہوئیں اور ان کے مال کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹ لیا گیا۔

اس دن سے لیکر آج تک وہابیت نے بے شمار مسلمانوں کو قتل کیا ہے اور ان کا مال لوٹا ہے۔ تاریخ ان کی بربریت کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ وہابیوں نے ۱۴۰۷ھ میں چار سو حجاج بیت اللہ کو مُراسمِ حج کی ادائیگی کے دوران قتل کیا۔

۱۔ خطیب نے یہ حدیث صحیح بخاری کے حوالے سے بیان کی تھی لیکن مؤلف نے اس حدیث کو مسند احمد جلد ۵ کے صفحہ ۱۶۷ پر یوں پڑھا: رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: ''ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اے فرزند آدم! تو جب بھی مجھے پکارے گا اور مجھ سے سوال کرے گا تو تُو نے جو کچھ بھی کیا ہوگا میں تجھے بخش دوں گا۔ اگرچہ قیامت کے دن تو مجھ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ تو نے زمین کی مقدار میں گناہ کئے ہوں تو میں بھی اس حال میں ملاقات کروں گا کہ میں زمین کے وزن کے برابر تیرے تمام گناہ معاف کر دوں گا۔ اگرچہ تیرے گناہ اتنے ہوں کہ زمین سے لے کر آسمان تک کا فاصلہ تیرے گناہوں سے پُر ہو، پھر بھی میں تیرے تمام گناہ معاف کر دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ تو میرے لئے شریک کا قائل نہ ہو اور مجھ سے مغفرت طلب کرتا ہو تو میں تجھے بخش دوں گا اور تیرے گناہوں کو کوئی اہمیت نہیں دوں گا۔''

اس طرح کی احادیث کتبِ خلفاء میں بہت زیادہ ہیں۔ صحیح بخاری کتاب الجنائز جلد اول صفحہ ۱۵۰ پر بھی یہ حدیث اختصار سے مذکور ہے۔

مکتبِ اہلبیتؑ میں فکری اتحاد

ہماری اس بحث کو سمجھنے کے لئے حسبِ ذیل پانچ موضوعات پر توجہ کرنا ضروری ہے:

(ا) اوصیائے پیغمبرؐ کا تعیّن

(ب) اخفائے حدیث

(ج) مکتبِ اہلبیتؑ کے پیروکاروں کا خروج

(د) اوصیائے پیغمبرؐ کا تعیّن اور اخفائے حدیث کے اثرات

(ہ) شیعہ اور تشیّع کی پہچان

(ا) اوصیائے پیغمبرؐ کا تعیّن

انبیائے کرامؑ اور اوصیائے عظامؑ کا تبلیغی فرض ہے کہ وہ اپنے زمانے کے لوگوں کو شرعی ذمہ داریوں سے آگاہ کریں۔ عہدِ رسالت میں امت کو یہ بات جاننے کی سخت ضرورت تھی کہ آنحضرتؐ کے بعد امت کا امام کون ہوگا؟ اسی لئے دعوتِ ذوالعشیرہ کے موقع پر جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بنی ہاشم کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا تھا تو آپ نے پہلی دعوتِ اسلام میں ہی یہ واضح کر دیا تھا کہ امام علی علیہ السلام آپ کے وصی ہیں۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً موقع ومحل کی مناسبت سے آنحضرتؐ لوگوں کو امام علی علیہ السلام کی وصایت وخلافت سے آگاہ کرتے رہے۔ زندگی کے آخری ایام میں حجۃ الوداع سے واپس ہوتے ہوئے غدیرِ خُم کے مقام پر آپ نے ہزاروں مسلمانوں کے سامنے امام علی علیہ السلام کو ولیٔ امر کی حیثیت سے متعارف کرایا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بعد لوگوں کی تکلیفِ شرعی کو متعدد ذریعوں سے واضح کریں۔ چنانچہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اوصیاء اور خدا کے مقرر کردہ صاحبانِ امر کو متعدد طریقوں سے متعارف کرایا جن میں سے درج ذیل ذرائع خاص اہمیت کے حامل تھے:

۱۔ رسولِ اکرمؐ نے مسلمانوں کو ظہورِ مہدیؑ کی بشارت دی اور بتایا کہ وہ آخری امام ہوں گے۔

۲۔ رسولِ اکرمؐ نے مسلمانوں کو بتایا کہ اماموں کی تعداد بارہ ہوگی۔

۳۔ رسولِ اکرمؐ نے مسلمانوں کو بتایا کہ امامِ اوّل علیؑ کے بعد ان کے فرزند حسنؑ اور حسینؑ امام ہوں گے۔

۴۔ رسولِ اکرمؐ نے جابر بن عبداللہ انصاریؓ جیسے خاص صحابہ کو بارہ اماموں کے نام بتائے تھے اور امام علی علیہ السلام کو ایک دستاویز سونپی تھی جس میں اماموں کے نام اور حالات درج تھے۔

البتہ آخری قسم کی تبلیغ عمومی اور سب کے لئے یکساں نہیں تھی۔ آپ نے تبلیغ کی یہ خصوصی قسم خاص الخاص افراد کو ہی تعلیم فرمائی تھی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد ہر امام نے اپنے پیروکاروں کو اپنے بعد آنے والے امام کا تعارف کرایا اور ہر امام نے یکے بعد دیگرے امام مہدی علیہ السلام کی بشارت دی۔ بعض اماموں نے اپنے کچھ عقیدت مندوں کو اپنے بعد آنے والے تمام اماموں کے ناموں سے بھی مطلع فرمایا۔

(ب) اِخفائے حدیث

درمکتبِ خلفاء: سابقہ مباحث میں ہم نے بتایا ہے کہ وفاتِ رسولؐ کے بعد سے لیکر عمر بن عبدالعزیزؒ کے دَورِ خلافت تک مکتبِ خلفاء کے حکمرانوں نے اشاعتِ حدیث کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ علاوہ ازیں اس مکتب کے پیروکاروں نے ساتویں صدی ہجری کے آخر تک مختلف طریقوں سے حدیث کو چھپانے کے خوب جتن کیے۔[1]

درمکتبِ اہلبیتؑ: اس مکتب میں بھی روایات کو مخفی رکھا گیا لیکن یہاں اِخفاء کی وجوہات وہ نہیں تھیں جو مکتبِ خلفاء کے علماء کے پیشِ نظر تھیں۔

ائمۂ اہلبیتؑ کے مسلسل قتل اور قید و بند کی وجہ سے اہلبیتؑ اور ان کے پیروکار کھل کر احادیث بیان نہیں

۱۔ معالم المدرستین جلد اول میں ہم نے "وصیت" کے ذیل میں ثابت کیا ہے کہ کتمانِ حدیث کیلئے یہ طریقے اختیار کیے گئے:

(۱) سنتِ رسولؐ کے لکھنے سے روکنا۔

(۲) حدیثِ رسولؐ کی مَن پسند تاویل کرنا۔

(۳) اقوالِ صحابہ میں سے کچھ حصہ حذف کرنا۔

(۴) کتابوں اور کتب خانوں کو نذرِ آتش کرنا۔

(۵) مذمّتِ خلفاء کی روایات کے رُواۃ کو ضعیف کہنا۔

(۶) سنتِ رسولؐ میں سے ایک روایت کو مکمل طور پر حذف کرنا۔

(۷) سیرتِ صحابہ کا کچھ حصہ حذف کر کے حقیقت میں تحریف کرنا۔

(۸) صحیح سنتِ رسولؐ اور صحیح سیرتِ صحابہ کے مدّمقابل جعلی روایات بنانا۔

(۹) سیرتِ صحابہ کی پوری گفتگو کو حذف کر کے اس کی طرف ہلکا سا اشارہ کرنا۔

(۱۰) حدیثِ رسولؐ میں سے بعض الفاظ کو حذف کر کے اس کی جگہ مبہم الفاظ داخل کرنا۔

کر سکتے تھے۔ البتہ جب امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کے اَواخر اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی کے اَوائل میں تھوڑا سا وقفہ نصیب ہوا تو دونوں اماموں نے علوم و معارف کے دریا بہا دیئے۔ اس قلیل عرصے کے علاوہ اہلبیتؑ اور ان کے ماننے والے اکثر اوقات تقیہ میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور کھل کر سنتِ رسولؐ کی اشاعت سے معذور تھے۔

(ج) مکتبِ اہلبیتؑ کے پیروکاروں کا خروج

ائمۂ اطہار علیہم السلام کے زمانے میں مکتبِ اہلبیتؑ کے ماننے والوں نے ظالم حکومتوں کے خلاف کئی بار خروج کیا۔ عام طور پر اس خروج کا دو میں سے ایک مقصد ہوتا تھا:

(۱) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے خروج۔ (۲) مہدویت کے نام پر خروج۔

(۱) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیلئے خروج کی عظیم مثال سبطِ رسول حضرت امام حسین علیہ السلام کا خروج ہے۔ آپ کا خروج امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تمام تحریکوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام جب مدینے سے نکلے تو اپنے بھائی محمد بن حنفیہؒ کے نام وصیت میں اپنے قیام کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا: ...اِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِیْ اُمَّةِ جَدِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اٰمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَنْھٰی عَنِ الْمُنْکَرِ. میری تحریک کا مقصد نہ زیادتی ہے نہ سرکشی اور نہ ہی یہ نفسانیت پر مبنی ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ فساد پھیلاؤں یا کسی پر ظلم کروں۔ میں تو اپنے ناناؐ کی امت کی اصلاح کے لئے نکلا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ نیکی کا حکم دوں اور برائی سے روک دوں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے لوگوں کو یہ دعوت ہرگز نہیں دی کہ وہ ان کی تشکیلِ حکومت کے لئے بَیعت کریں۔ امام حسین علیہ السلام نے حکومت کے حصول کے لئے خروج نہیں کیا تھا۔ آپ کا خروج امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے خروج کی روشن ترین مثال ہے۔

(۲) مہدویت کے نام پر خروج کی مثال حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی نسل میں جناب محمد اور ان کے بھائی جناب ابراہیم کا قیام ہے۔ اس قیام کے دوران محمد اور ابراہیم کے والد عبداللہ، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ آپ میرے دونوں بیٹوں کی بیعت کریں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اِن کُنتَ تَریٰ اَنَّ ابنَکَ ھٰذا ھُوَ الْمَھْدِی، فَلَیْسَ بِہٖ وَلَا ھٰذَا اَوْ اَنَّہٗ، وَاِنْ کُنتَ انما ترید ان تخرجہٗ غَضَبًا لِلّٰہِ وَلیامر بالمعروفِ وَ یَنْھٰی عَنِ المنکرِ کانا وَاللہِ

لَا نَدَعُکَ وَاَنْتَ شَیْخُنَا وَ نُبَایِعُ اِبْنَکَ بِھٰذَا الْاَمْرِ۔[1]

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا بیٹا مہدی ہے تو وہ مہدی نہیں ہے اور نہ ہی یہ ظہورِ مہدی کا وقت ہے۔ البتہ اگر وہ خدا کی شریعت کی پامالی کی وجہ سے ناراض ہو کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے خروج کرتا ہے تو خدا کی قسم اس صورت میں ہم آپ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے کیونکہ آپ ہمارے بزرگ ہیں اور ہم اس کے لئے آپ کے بیٹے کی بیعت کریں گے۔"

مہدویت کے نام پر امام زادوں نے جتنے قیام کیے تھے، یہ قیام ان بیسیوں قسم کے قیام کا ایک نمونہ ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے تحریری وصیت نامے اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آل محمدؐ کی نظر میں صرف وہی قیام صحیح ہے جس کی بنیاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر رکھی گئی ہو اور ایسا قیام رضائے الٰہی کے موافق ہے۔

(د) اَوصیائے پیغمبرؐ کا تعیّن اور اِخفائے حدیث کے اَثرات

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مسلسل تبلیغ کی وجہ سے اہلِ مدینہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ امام علی، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام حق کے امام ہیں اور اہلِ مدینہ ان تینوں شخصیات کو اچھی طرح سے پہچانتے تھے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزید کے خلاف قیام کیا اور یزید نے آپ کو شہید کرا دیا۔ پھر اس نے مدینے اور مکے کو تاراج کیا اور خانۂ کعبہ کو شدید نقصان پہنچایا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے قیام سے لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ آپ کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے امت کا امام مقرر کیا تھا۔ اب جس کے خلاف حسینؑ قیام کریں گے وہ نہ تو رسولؐ کا جانشین ہو سکتا ہے اور نہ امت کا امام ہو سکتا ہے۔ چاہے لوگ اس کی بَیعت ہی کر لیں پھر بھی وہ خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے لئے عقیدۂ امامت کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

امامِ عالیمقامؑ جب مدینے سے نکلے تو انہوں نے امامت کی میراث کے تبرکات اُمّ المومنین حضرت ام سلمہؓ کے سپرد کیے تھے۔ جب حضرت امام سجّاد علیہ السلام قید خانۂ شام سے رہائی کے بعد مدینے آئے تو انہوں نے وہ تبرکات حضرت ام سلمہؓ سے واپس لئے۔ حضرت امام سجّاد علیہ السلام کے اس عمل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے جانشین حضرت امام سجّاد علیہ السلام ہیں اور اس سے امامِ وقت کی پہچان کے خواہش مند افراد کو راہِ حق مل گئی اور انہیں امامِ وقت کا علم ہوگیا۔[2]

۱۔ امین الاسلام ابوعلی فضل بن حسن بن فضل، اعلام الوریٰ، ص ۲۷۲۔ ۲۔ معالم المدرستین، ج ۲، ص ۳۲۰۔

اَوصیائے پیغمبر کے تقرر کے اثرات کے بعد ہم کتمانِ حدیث کے بُرے اثرات کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔
خلفاء نے حدیث کی اِشاعت پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ اَوصیائے پیغمبر اور ظہورِ مہدیؑ سے متعلق احادیث بیان کرنا ممنوع تھا جن میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے امت کو بشارت دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ مہدیٔ موعودؑ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جیسا کہ وہ پہلے ظلم و جَور سے بھری ہوئی ہوگی۔
چنانچہ اِخفائے حدیث کی وجہ سے حقیقتِ مہدیؑ عوام تو در کنار بنی ہاشم اور بنی عباس کے لوگوں پر بھی اِس قدر مخفی ہوگئی تھی کہ انہوں نے اپنے گھر میں ایک اجتماع منعقد کیا جس میں وہ محمد بن عبداللہ کی مہدیٔ موعودؑ کی حیثیت سے بیعت کرنا چاہتے تھے۔ پھر امام جعفر صادق علیہ السلام نے انہیں ان کی غلطی پر متنبہ کیا اور بتایا کہ یہ ظہورِ مہدیؑ کا وقت نہیں ہے۔
رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اوصیاء کے یکے بعد دیگرے ناموں سے خاص صحابہ کو مطلع کیا تھا لیکن امام محمد باقر علیہ السلام کے بعد عام لوگوں کے لئے امام کو پہچاننا آسان نہیں تھا۔

(ہ) شیعہ اور تشیّع کی پہچان

تشیّع کو پہچاننے کے لئے اسلام کو پہچاننا نہایت ضروری ہے۔
توحید (الوہیت و ربوبیت) اور جملہ انبیائے کرامؑ کی نبوت، اسلام کے ضروری اَحکام، مَعاد جسمانی، حساب و کتاب اور روزِ قیامت پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت پر عمل کرنے کی خواہش کا نام اسلام ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد ان عقائد و احکام کو ائمۂ اہلبیتؑ سے حاصل کرنے کا نام تشیّع ہے۔
سادہ لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں اہلبیتؑ کے ذریعے سے تعلیماتِ رسولؐ کو حاصل کرنے اور ان پر عمل کرنے کو تشیّع کہا جاتا ہے۔
حضرت امام حسین علیہ السلام کے زمانے میں شیعوں کے لئے تین ائمہ کو پہچاننا ضروری تھا اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں چھ ائمہ کو پہچاننا اور ان کے فرامین کو قبول کرنا ضروری تھا اور آج جبکہ مہدیٔ موعود عَجَّلَ اللہ فرجہُ الشریف اَرْوَاحُنَا لَہُ الفِدَاء کا زمانہ ہے تو شیعہ وہی ہے جو بارہ اماموں کو پہچانے اور ان کی پیروی کرے اور تعلیماتِ رسولؐ کے لئے انہیں ذریعہ قرار دے۔
اب ہم چند مثالوں کے ذریعے بتائیں گے کہ رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اوصیاء کا تعارف کیسے کرایا اور آپؐ کے بعد ائمہ نے اپنے جانشین کا تعارف کیسے کرایا۔

رسولِ اکرمؐ امام باقرؑ کا تعارف کراتے ہیں

نبیؐ مکرم صلی اللہ علیہ وآلِہ وسلم نے امام محمد باقر علیہ السلام کا تعارف کرایا تھا جس کا تذکرہ امام محمد باقر علیہ السلام اور جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی ملاقات کے متعلق دو روایات میں یوں کیا گیا ہے:

(۱) جابر بن عبداللہ سر پر عمامہ[1] رکھ کر مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر ''یا باقرؑ یا باقرؑ'' کی صدائیں دیتے تھے۔ (اللہ کے رسولؐ نے امام باقرؑ کو بَاقِرُ الْعِلْم کا لقب دیا تھا جس کے معنی ہیں علم کے حقائق واضح کرنے والا)۔ لوگ دور دراز سے حج و زیارت کے لئے مدینے آتے تھے۔ جب حضرت جابرؓ یہ صدائیں دیتے تھے تو لوگ ان کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ جابرؓ بڑھاپے کی وجہ سے سٹھیا گئے ہیں اور بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔

جابر بن عبداللہ انصاریؓ ان سے کہا کرتے کہ واللہ! میں نہیں بہکا ہوں، میں نے خود اللہ کے رسولؐ سے اپنے کانوں سے سنا تھا اِنَّکَ سَتُدْرِکُ رَجُلاً مِنِّیْ اِسْمُہٗ اِسْمِیْ وَشَمَائِلُہٗ شَمَائِلِیْ یبقرُ الْعِلْمَ بقراً. ''عنقریب تم ایک ایسے شخص سے ملاقات کرو گے جو مجھ سے ہوگا۔ وہ میرا ہم نام ہوگا اور اس کے شمائل و خصائل میرے شمائل و خصائل سے مماثل ہوں گے۔ وہ علم کو کھول دے گا اور علم کے چہرے پر پڑے ہوئے پردے ہٹادے گا۔'' چنانچہ اس حدیث کے تحت مجھے اس بَاقِرُ الْعِلْم کا انتظار ہے اور میں اسے صدائیں دے رہا ہوں۔[2]

اس حدیث میں ایک اور نکتہ بھی مضمر ہے وہ یہ کہ اللہ کے رسولؐ نے امام محمد باقر علیہ السلام کا تعارف کراتے ہوئے رَجُلاً مِنِّیْ کے الفاظ ارشاد فرمائے ہیں یعنی وہ شخص جو مجھ سے ہے۔ یہ بات گزر چکی ہے کہ اس قولِ رسولؐ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کارِ تبلیغ میں اس کا کام براہِ راست میرا کام ہوگا۔

(۲) حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ مدینے کی گلیوں میں چکر لگاتے اور ''یا باقرؑ! یا باقرؑ!'' پکارتے تھے۔ اہلِ مدینہ جب ان پر اعتراض کرتے تو وہ انہیں اللہ کے رسولؐ کی یہ حدیث سناتے تھے۔[3]

۱۔ جب کسی خاص شخص سے ملاقات مقصود ہوتی تھی تو عرب رواج کے مطابق سر پر عمامہ رکھا جاتا تھا۔ رسولِ اکرمؐ بھی نمازِ عید کے موقع پر عمامہ سر پر رکھتے تھے اور وفود سے ملاقات کے وقت بھی آپ عمامہ باندھ کر آتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیں عبداللہ بن سبا، جلد دوم، فصل "جاء علی فی السحاب."

۲۔ ثقۃ الاسلام شیخ کلینی، الکافی، ج۱، ص۴۶۹۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج۴۶، ص۲۲۵ تا ۲۲۸۔

۳۔ اسفرائنی، الفرق بین الفرق، (المتوفی ۴۲۹ھ) مطبوعہ قاہرہ، ص۶۰۔ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۶۱، ورذکر وفات امام باقرؑ

امام سجّادؑ کی طرف سے امام باقرؑ کا تعارف

حضرت امام سجّاد علیہ السلام نے تبرکاتِ امامت یعنی مولا امیرالمومنین علیہ السلام کے قلمی نسخے اور حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہتھیار وقتِ آخر امام محمد باقر علیہ السلام کے سپرد فرمائے۔

حضرت امام سجّاد علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ کے دوسرے بیٹوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے درخواست کی کہ وہ انہیں ان تبرکات میں شریک کریں۔ ان کی یہ بات پورے مدینے میں پھیل گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ مدینہ جان گئے کہ تبرکاتِ امامت کا وارث امام محمد باقر علیہ السلام کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔

ان واقعات سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اہلبیتِ طاہرین علیہم السلام نے کتنی عمدہ حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے امام علی علیہ السلام سے لے کر امام محمد باقر علیہ السلام تک امامت کی تمام اصحاب اور اہلِ مدینہ کو تبلیغ فرمائی۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے بعد دوسرے ائمہؑ کے لئے خداوند تعالیٰ، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ائمۂ طاہرین علیہم السلام نے ایک اور طریقہ اختیار کیا جیسا کہ اس روایت سے آشکار ہوتا ہے۔

جب منصور عباسی کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات کی خبر ملی تو اس نے حاکم مدینہ کو لکھا کہ ''معلوم کرو کہ جعفرؑ نے کسے اپنا وصی مقرر کیا تھا اور جسے اس نے اپنا وصی مقرر کیا ہو اس کی گردن اڑا دو۔''

حاکم مدینہ نے منصور کو لکھ بھیجا کہ ''جعفرؑ نے موت سے قبل (۱) خلیفہ (۲) حاکم مدینہ (۳) اپنے فرزند عبداللہ (۴) اپنے فرزند موسیٰ کاظمؑ (۵) موسیٰ کاظمؑ کی والدہ حمیدہ کو اپنا وصی بنایا ہے۔''

خلیفہ نے حاکم مدینہ کو جواباً لکھا کہ ''ان لوگوں کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔'' [۱]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ صادقِ آلِ محمدؑ اگر اپنی وفات کے وقت کسی خاص فرد کی جانشینی کا اعلان کرتے تو حکومت وقت اسے شہید کردیتی اور یوں ہدایت کا سلسلہ منقطع ہوجاتا۔ اسی لئے امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایسی حکمت عملی اختیار کی جس کی وجہ سے حقیقی امام کی زندگی خطرات سے محفوظ ہوگئی۔

اس کے علاوہ امام محمد باقر علیہ السلام کے بعد امام کے تعیّن کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ امام وقت اپنی زندگی میں اپنے خاص خاص شیعوں کو بعد میں آنے والے امام کی خبر دیتا تھا۔[۲] پھر جب لوگوں کو امام وقت

۱۔ ثقۃ الاسلام شیخ کلینی، الکافی، ج ۱، ص ۳۱۰۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۴۷، ص ۳۔

۲۔ بحارالانوار کی ائمہ سے مخصوص مجلدات ملاحظہ فرمائیں۔

کی پہچان کی ضرورت محسوس ہوتی تو اللہ تعالیٰ کچھ ایسے اسباب فراہم کردیتا کہ دوست اور دشمن امام وقت کو پہچان لیتے تھے۔ حکام وقت کا ائمہ سے رویہ ہی ہمارے دعویٰ کی دلیل ہے جس کی مختصر روئیداد یہ ہے:

ہارون رشید امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو مدینے سے بغداد بلا کر قید کردیتا ہے۔ مامون رشید نے امام علی رضا علیہ السلام کو مدینے سے خراسان طلب کیا اور ولی عہدی کے بہانے نظر بند کردیا۔ اسی طرح بنی عباس کے خلفاء امام محمد تقی علیہ السلام کو بغداد اور امام علی نقی و امام حسن عسکری علیہم السلام کو سامرہ لے گئے اور اس طرح سے یہ ائمہ زندگی کے آخری لمحات تک خلفاء کی زیر نگرانی رہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خلفائے بنی عباس نے ائمۂ اہلبیتؑ کے ساتھ یہ رویہ کیوں اختیار کیا تھا اور انہیں یہ رویہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اس کا اول و آخر جواب یہی ہے کہ خلفاء جانتے تھے کہ یہ بزرگوار شیعوں کے امام ہیں اور جب کسی امام کو بغداد، خراسان یا سامرہ لے جا کر قید کیا جاتا تو ان شہروں کے رہنے والوں کو بھی پتا چل جاتا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حقیقی جانشین اور امت کے امام وہی ہیں جنہیں ظالم حکام نے قید کیا ہے۔ علاوہ ازیں نظر بند ائمہ کو بعض اوقات سرکاری مناظروں میں ہزاروں لوگوں کے سامنے لایا جاتا جہاں وہ اپنے دلائلِ قاہرہ سے اسلام کی حقانیت اور اپنی امامت ثابت کرتے تو بے خبر افراد کو بھی ان کی امامت کا پتا چل جاتا تھا۔

ان سب اسباب سے بڑھ کر ائمہ کی سیرت ان کی امامت کی دلیل بن جاتی تھی۔ مدینہ سے دور رہنے والے لوگ اہلِ مدینہ اور بچے کھچے اصحابِ رسولؐ سے ملاقات کر کے امت کے حقیقی رہنماؤں کے متعلق معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی وصیت نے بیک وقت دو اثرات مرتب کئے تھے:

(۱) حقیقی وارث کو حکام کی نگاہوں سے چھپا لیا اور اپنے جانشین کی زندگی کو تحفظ فراہم کیا۔

(۲) شیعوں کیلئے آپ کی وصیت میں کوئی ابہام پیدا نہ ہوا بلکہ اس سے انہیں زیادہ واضح رہنمائی حاصل ہوئی۔

اس نکتے کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل روایت پر توجہ فرمائیں:

جب امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات کی خبر کوفے میں شیعوں کو ملی تو ابوحمزہ ثمالیؒ نے مخبر سے کہا: کیا امام جعفر صادق علیہ السلام نے کسی کو اپنا وصی مقرر کیا ہے؟

خبر لانے والے نے کہا: جی ہاں۔ انہوں نے اپنے دو بیٹوں عبداللہ اور موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ

۱۔ مسلمانوں کے بعض شہر مدینے سے بہت دور واقع تھے لیکن حج و زیارت کی وجہ سے سارا سال مدینے میں لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی جس سے مذکورہ معلومات حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔

منصور دوانیقی کو اپنا وصی مقرر کیا ہے۔

مخبر کی بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ ابوحمزہ ثمالیؒ نے مسکرا کر کہا: ہم خدا کی اس بات پر حمد بجالاتے ہیں کہ اس نے ہمارے لئے راہ ہدایت کو واضح کردیا۔ امامؑ نے اپنے بڑے بیٹے کے حال سے ہم کو آگاہ کیا اور اپنے چھوٹے بیٹے (امام موسیٰ کاظمؑ) کی طرف رہنمائی کی اور امر عظیم کو مخفی رکھا۔

لوگوں نے ابوحمزہ ثمالیؒ سے کہا کہ آپ اپنی گفتگو کا مقصد واضح کریں۔

ابوحمزہ ثمالیؒ نے کہا: امام جعفر صادق علیہ السلام نے بڑے بیٹے عبداللہ کے ساتھ اپنے چھوٹے بیٹے موسیٰ کاظم (علیہ السلام) کا نام لے کر درحقیقت ہمیں یہ بات سمجھائی ہے کہ بڑا بیٹا امامت کے لائق نہیں ہے اور ان کی نیابت کی صلاحیت ان کے چھوٹے بیٹے موسیٰ کاظم (علیہ السلام) کے پاس ہے۔ نیز یہ کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے بطورِ احتیاط منصور دوانیقی کو بھی اپنا وصی مقرر کیا ہے تاکہ اگر منصور پوچھ لے کہ جعفرؑ بن محمدؐ کا وصی کون ہے تو لوگ اسے کہیں کہ آپ ہی ان کے وصی ہیں۔[1]

یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی امامت کا معاملہ خواصِ شیعہ سے مخفی نہیں تھا۔[2] اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی زندگی میں ہی اپنے خواص کو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی نشان دہی کردی تھی اور ابوحمزہ ثمالیؒ جیسے خاص شیعہ اس بات سے غافل نہیں تھے۔ ابوحمزہؒ نے اپنے اس بیان سے امام کاظم علیہ السلام کی وصایت کا دفاع کیا اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی وصیت کی حسین توجیہ فرمائی۔

ہمارے بیان کردہ امور پر اگر توجہ دی جائے تو مکتبِ اہلبیتؑ کے پیروکاروں کے اختلاف کی نوعیت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

مکتبِ اہلبیتؑ کے پیروکاروں کا اختلاف

مکتبِ اہلبیتؑ کے پیروکاروں کے باہمی اختلاف کو جس شدّ و مد سے بیان کیا جاتا ہے اس میں حقیقت کم اور جھوٹ زیادہ ہے۔ اس مطلب کی وضاحت کے لئے پہلے ہم شیعوں کے ان فرقوں کا تذکرہ کریں گے جو ائمۂ اہلبیت علیہم السلام کی زندگی میں پیدا ہوئے اور اس کے بعد غیبتِ کبریٰ کے زمانے میں جنم لینے والے اختلافات کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۴۷، ص ۴، حدیث ۱۱، نقل از مناقب ابن شہر آشوب، ج ۳، ص ۴۳۴۔

۲۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۴۸، ص ۲۱ تا ۲۸۔

(۱) سبائیہ

سب سے پہلے شیعوں کی طرف سبائی فرقے کی نسبت دی جاتی ہے۔ ہم نے اپنی کتاب عبداللہ بن سبا کی تین جلدوں میں ثابت کیا ہے کہ دنیا میں عبداللہ بن سبا کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں رہا۔ یہ ایک فرضی کردار ہے جو مؤرخینِ مذاہب وملل کی ذہنی اختراع ہے۔ اس سے منسوب سبائیہ مذہب صرف کتابوں تک محدود ہے اور حقیقی دنیا میں یہ کبھی موجود ہی نہیں تھا۔

(۲) کیسانیہ

مؤرخینِ مذاہب وملل نے کیسانیہ کی نسبت کیسان کی طرف دی ہے۔ انہوں نے کیسان کے متعلق یہ تین احتمالات نقل کئے ہیں:

۱۔ ایک گروہ کے مطابق کیسان امام علی علیہ السلام کا آزاد کردہ غلام تھا۔[۱]

۲۔ ایک اور گروہ کے مطابق کیسان سے مراد مختار ثقفی ہیں اور یہ فرقہ ان سے منسوب ہے۔[۲]

۳۔ ایک اور گروہ کے مطابق کیسان محمد بن حنفیہؓ کا لقب ہے اور یہ فرقہ ان سے منسوب ہے۔[۳]

عقیدۂ کیسانیہ

اس فرقے کے عقائد وافکار کے متعلق مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ فرقہ محمد بن حنفیہؓ المتوفی ۸۱ھ کا پیروکار ہے اور اس کے ماننے والے اسے مہدیٔ موعود سمجھتے ہیں۔ مختار ثقفی ان کا پیروکار تھا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ محمد بن حنفیہؓ کی وفات کے بعد امامت اس کے فرزند ابوہاشم المتوفی ۹۸ھ یا ۹۹ھ کو منتقل ہوئی اور ابوہاشم نے محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس المتوفی ۱۲۴ھ یا ۱۲۵ھ کو منتقل کی اور اسے اپنا وصی مقرر کیا۔ محمد کے بعد امامت اس کے بیٹے ابراہیم کو ملی۔ ابراہیم کے بعد امامت اس کے دو خلیفہ بیٹوں سفاح اور منصور کو ملی اور ان دونوں نے بنی عباس کی حکومت تشکیل دی۔[۴]

۱۔ عبدالکریم شہرستانی، الملل والنحل، شرح کیسانیہ، ج۱، ص۱۴۷۔

۲۔ عبدالقاہر اسفرائنی، الفرق بین الفرق، مطبوعہ قاہرہ، باب ذکر کیسانیہ، ص۳۸۔

۳۔ علی بن اسماعیل اشعری، مقالات الاسلامیین، ص۲۱۔

۴۔ عبدالقاہر اسفرائنی، الفرق بین الفرق، ص۴۰۔ عبدالکریم شہرستانی، الملل والنحل، ج۱، ص۱۴۷ و۱۵۰ و۱۵۱۔

مذکورہ قول کی رو سے کیسانیہ شیعوں کا ایک ایسا فرقہ ہے جس نے ایک سُنّی خلافت قائم کی جو پانچ سو سال تک قائم رہی۔ یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

الف: سب سے پہلے یہ طے کیا جائے کہ ان تینوں میں سے کیسان کس کا لقب تھا؟

ب: مؤرخینِ مذاہب وملل کے سوا آج تک کسی دوسرے مؤرخ نے بھی امام علی علیہ السلام کے کسی آزاد کردہ غلام کیسان کا تذکرہ کیا ہے؟

ج: محمد بن حنفیہؒ، امام علی علیہ السلام کے مشہور و معروف فرزند تھے۔ ان کے حالات کتبِ رجال، حدیث اور سیرت میں موجود ہیں تو کیا مؤرخینِ مذاہب وملل کے علاوہ کسی اور محدّث، مؤرخ یا رِجالی نے ان کا لقب کیسان لکھا ہے؟

مختار ثقفی کے متعلق بھی ہم یہی پوچھنا چاہتے ہیں۔

جب مکتبِ خلفاء کے علماء کیسان کی حقیقت بیان کرنے سے عاجز ہوگئے تو انہوں نے ایک اور موقف اختیار کیا اور کہا کہ کیسان ایک جنّ کا نام ہے اور مذہبِ کیسانیہ اس سے منسوب ہے۔ ایسا ''ذہن رسا'' رکھنے والوں کو آفرین ہو کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ کوئی انسان جنّ کا انکار نہیں کرسکتا اور ویسے بھی مکتبِ خلفاء کا جنّات سے بڑا قریبی تعلق رہا ہے کیونکہ حضرت ابوبکر کی بیعت کا انکار کرنے پر جنّات نے سَعد بن عبادہ کو تیر مار کر ہلاک کیا تھا۔[1]

اصل بات یہ ہے کہ فرقۂ کیسانیہ کا دنیا میں کبھی کہیں وجود ہی نہیں رہا اور سبائیہ و کیسانیہ نامی دونوں فرقے مذاہب وملل پر لکھنے والوں کے ساختہ پرداختہ ہیں۔

اس داستان کی حقیقت

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادتِ عظمیٰ کے بعد محبانِ آلِ محمدؐ کے ایک گروہ نے کوفے میں جمع ہوکر امام عالیمقام کے خونِ اطہر کے قِصاص کا عزمِ مصمّم کیا۔ اس گروہ کو تاریخ کے اوراق میں ''توّابین'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس گروہ نے ۶۵ھ میں سلیمان بن صرد خزاعی کی قیادت میں لشکرِ شام سے جنگ کی۔ لشکرِ شام کی قیادت ابن زیاد نے کی۔ اس جنگ میں توّابین کی پوری جماعت شہید ہوگئی۔

توّابین کے بعد مختار بن عبید ثقفی نے ۶۶ھ میں خونِ حسینؑ کا انتقام لینے کے لئے ابن زیاد سے جنگ

1۔ عبداللہ بن سبا، ج ۱، باب سقیفہ۔

کی اور اسے قتل کردیا۔ اس جنگ میں لشکر شام کے ستر ہزار افراد مارے گئے۔[۱]

مختار ثقفی نے عمر بن سعد اور شمر جیسے قاتلانِ حسینؑ کو بھی قتل کر کے ان کے سر امام سجّاد علیہ السلام کی خدمت میں مدینہ روانہ کئے۔[۲]

اسی عرصے میں عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں خلافت کا دعویٰ کیا اور لوگوں سے بیعت لی۔ محمد بن حنفیہؒ نے اس کی بیعت نہ کی۔ ابن زبیر نے محمد بن حنفیہؒ اور ان کے خاندان کو مکے کی ایک گھاٹی ''شعب عارم'' میں قید کردیا اور درّے کے باہر ایندھن جمع کرا کے انہیں خبردار کیا کہ اگر تم لوگوں نے فلاں تاریخ تک بیعت نہ کی تو میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو جلا کر خاکستر کردوں گا۔

حضرت محمد حنفیہؒ نے کسی کو کوفے بھیج کر مختار ثقفی سے مدد طلب کی۔ اس نے چار سو فوجی روانہ کئے جنہوں نے محمد حنفیہ کو رہائی دلائی۔[۳]

اس واقعہ کے بعد ابن زبیر نے اپنے بھائی مصعب بن زبیر کو ایک لشکر دے کر ۶۷ھ میں مختار سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا اس جنگ میں مختار کو شکست ہوئی اور وہ شہید ہوگئے۔

مختار ثقفی نے بہت قلیل عرصے تک حکومت کی۔ انہوں نے ابن زیاد کے لشکر کے امراء کو قتل کیا۔ مختار کی شہادت کے بعد بنی امیہ کی حکومت نے ان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کیا اور بنی امیہ کے طرفدار مؤرخین نے انہیں خوب بدنام کیا۔ بنی امیہ کے پھیلائے ہوئے بے سروپا قصے مذاہب وملل کی کتبِ تاریخ میں آج بھی موجود ہیں۔

جہاں تک محمد بن حنفیہؒ کی شخصیت کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنی وفات کے وقت اپنے آپ کو امام ہی نہیں سمجھتے تھے۔ جب وہ اپنے آپ کو امام ہی نہیں سمجھتے تھے تو انہوں نے اپنے فرزند ابوہاشم کو امامت کیسے تفویض کی اور ابوہاشم نے امامت دوسروں کو کیسے منتقل کردی؟

اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ احادیثِ نبویؐ پر پابندی کی وجہ سے اس دور میں مہدویت کا معاملہ اتنا واضح نہیں تھا جتنا کہ آج ہے اور اسی وجہ سے ہم نے دیکھا کہ بنی ہاشم، محمد بن عبداللہ کو مہدی جان کر ان کی بیعت کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے انہیں ان کے نکتۂ نظر کی غلطی سے آگاہ کیا تھا اسی لئے یہ کہنا کسی حد تک صحیح ہوسکتا ہے کہ سید الشہداء کے بعد کچھ افراد نے مہدویت کا چند دنوں کے لئے دعویٰ کیا ہو لیکن جیسے ہی کسی امام سے ان کی ملاقات ہوئی ہو تو انہوں

۱۔ عبدالقاہر اسفرائنی، الفرق بین الفرق، ص ۴۶۔

۲-۳۔ ابن اثیر جزری، الکامل فی التاریخ، در ذکر حوادث، ۶۶ھ و ۶۷ھ۔

نے اسے اس کی غلطی سے آگاہ کیا ہو۔

اگر مختار بن عبید کے متعلق مذکورہ روایات کو بالفرض تسلیم بھی کرلیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جنگی ضروریات کی وجہ سے انہوں نے کچھ توریہ آمیز کلمات کہے ہوں اور اپنے قیام کے لئے محمد بن حنفیہؒ یا امام سجاد علیہ السلام کا نام لیا ہو۔ علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ائمۂ اہلبیتؑ کی وہ روایات سنی ہوں جن میں قاتلانِ حسینؑ کے قتل کی پیشین گوئی کی گئی تھی اسی لئے انہوں نے ان روایات کو اپنے قیام کے لئے اجازت نامہ تصور کیا ہو اور انہوں نے ان پیشین گوئیوں سے استفادہ کیا ہو۔

اگر محمد بن حنفیہؒ کے متعلق چند افراد نے کچھ افکار پیش بھی کئے ہوں تو بھی ان کے افکار کو ایک فرقے کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جاسکتا اور اگر بالفرض مختار نے بھی چند کلمات کہے ہوں تو بھی اسے شیعوں کے ایک مکتب کی حیثیت سے پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔

ہماری بحث کا اول و آخر نتیجہ یہی ہے کہ کیسانیہ نام کے کسی فرقے کا تاریخ میں کبھی کوئی وجود نہیں رہا۔

(۳) غُرابیہ

مکتبِ خلفاء کے دانشوروں نے فرقۂ غرابیہ کا یہ عقیدہ بیان کیا ہے کہ ان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تو جبریلِ امینؑ کو امام علی علیہ السلام کی طرف روانہ کیا تھا لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہو بہو امام علیؑ کی شبیہ تھے اس لئے جبریلِ امینؑ کو مغالطہ ہوا اور انہوں نے خدا کا پیغام غلطی سے امام علی علیہ السلام کی بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک پہنچا دیا۔ اس فرقے کا کہنا یہ ہے کہ جس طرح سے دو کوے یا دو مکھیاں بالکل ایک جیسی ہوتی ہیں اسی طرح سے علیؑ اور محمدؐ بھی ایک جیسے لگتے تھے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس فرقے کا عقیدہ ہے کہ امام علیؑ، اللہ کے رسول ہیں اور ان کے بیٹے بھی اللہ کے رسول ہیں۔ یہ فرقہ کہتا تھا کہ پَر رکھنے والے پر لعنت کرو۔ اس سے ان کی مراد جبریلِ امینؑ ہوتے تھے۔

اس فرقے کا کفر یہودیوں کے کفر سے بھی زیادہ شدید ہے کیونکہ یہودیوں نے تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ کہا تھا کہ آپ پر کون سا فرشتہ وحی لاتا ہے؟ جب آپ نے انہیں بتایا کہ مجھ پر جبریلِ امینؑ وحی لاتے ہیں تو انہوں نے کہا تھا کہ ہم جبریلؑ سے محبت نہیں کرتے کیونکہ وہ ہمیشہ عذاب لے کر نازل ہوتا ہے۔ اگر جبریلؑ کی جگہ میکائیلؑ وحی لاتے تو ہم ضرور آپ پر ایمان لاتے کیونکہ میکائیلؑ ہمیشہ رحمت لے کر نازل ہوتے ہیں۔

یہودیوں نے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کا انکار کیا تھا اور جبریلِ امینؑ کو دشمن سمجھا تھا

لیکن اس کے باوجود انہوں نے کبھی جبرئیلِ امینؑ پر لعنت نہیں کی تھی لیکن روافض کا یہ گروہ غرابیہ حضرت جبرئیلِ امینؑ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر لعنت کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جو بھی اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، جبرئیلؑ و میکائیلؑ کا دشمن ہو تو اللہ بھی کافروں کا دشمن ہے۔ (سورۂ بقرۃ: آیت ۹۸)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا ہے کہ جو شخص کسی فرشتے سے دشمنی رکھتا ہے وہ کافر ہے اور جسے خدا نے کافر کہا ہو اسے مسلمان نہیں سمجھا جاسکتا۔[۱]

اس طرح کی یاوہ گوئی کو مکتبِ خلفاء میں علمی بحث کا نام دیا گیا ہے۔ مؤرخینِ مذاہب وملل نے اس طرح کے بہت سے خیالی فرقے بنا کر ان کو مکتبِ اہلبیتؑ سے منسوب کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ان نام نہاد مؤرخین نے اپنے فرقوں کی گمراہی کو ثابت کرنے کے لئے مکتبِ اہلبیتؑ میں اس طرح کے خیالی فرقے پیدا کئے۔

مکتبِ اہلبیتؑ کے فرضی فرقوں اور مکتبِ خلفاء کے حقیقی فرقوں کا موازنہ

مکتبِ خلفاء میں عقائد کے اعتبار سے اشعری، معتزلی، سلفی اور فقہ کے لحاظ سے حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فرقے کافی پہلے وجود میں آئے اور آج بھی یہ فرقے موجود ہیں۔ ان میں سے ہر فرقے کے عقائد و احکام

۱۔ اسفرائنی کی الفرق بین الفرق کے صفحہ ۲۵۰ اور ۲۵۱ کی عربی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

اَلغرابیة قومٌ زَعَمُوا اَنّ اللّٰہ عزوجل اَرسلَ جبرئیلَ الی عليّ فغلطَ فِي طریقهِ فَذَهَبَ اِلیٰ مُحمدٍ، لِاَنّہُ کَانَ یشبھہُ وقَالوا: کَانَ اَشبَہَ بِہٖ مِنَ الغُرَابِ بِالغُرَابِ وَالذُّبابِ بالذُّبابِ. وَزَعَمُوا اَنّ علیًّا کَانَ الرسُول وَ اَولَادہُ بَعدہُ ھم الرسُل وَ ھٰذہِ الفِرقةُ تقولُ لِاَتبَاعِھا: اَلعِنُوا صَاحِبَ الرِیشِ! یَعنُونَ جِبرئیلَ.

وَکُفرُ ھٰذہِ الفِرقةِ اکثرُ مِنْ کُفرِ الیھودِ الذین قالوا لرسولِ اللّٰہِ: مَنْ یَاتیکَ بِالْوَحْيِ مِنَ اللّٰہِ تعالیٰ؟ فَقَالَ: جِبرئیلُ. فقالوا! اِنّا لَا نُحبُّ جِبریلَ، لِاَنّہٗ ینزلُ بِالعذابِ وَقالوا: لَوْ اَتاکَ بِالْوَحْيِ مِیکائیلُ الَّذِیْ لَایَنزِلُ اِلَّا بِالرَّحْمَةِ لَاٰمنّا بِکَ.

فَالیَھُودُ— مَعَ کُفرِھِمْ بِالنّبِيِّ وَ مَعَ عَدَاوَتِھِم لِجبریلَ— لَا یَلْعَنُوْنَ جبریلَ، وَاِنّمَا یَزْعَمُوْنَ اَنّہٗ مِن مَلَائکةِ العَذَابِ دُوْنَ الرحمةِ. وَالغرابیة مِنَ الرافِضَةِ یَلعنُوْنَ جبریلَ وَ مُحمَّدًا وقد قَالَ اللّٰہُ تعالیٰ "مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّلّٰہِ وَ مَلَآئِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْکَالَ فَاِنَّ اللّٰہَ عَدُوٌّ لِّلْکَافِرِیْنَ." وَفِی ھٰذا تحقیقُ اسْمِ الکافرِ لِمُبغضِ بَعضِ المَلَائکةِ، وَلَا یَجُوزُ اِدخالُ مَنْ سَمّاھُمُ اللّٰہُ کافرینَ فِیْ جُملةِ فِرَقِ المُسلِمِیْن.

اس موہوم اور خیالی فرقے کے متعلق ابوالمظفر محمد بن طاہر اسفرائنی المتوفی ۴۷۱ھ کی کتاب التبصیرُ فِی الدِّینِ وَ تمییزُ الفِرقَةِ الناجیة مِنَ الفِرَقِ الھَالِکِین، ص۷۵، مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۷۴ھ کا مطالعہ فرمائیں۔

اس فرقے کے علماء نے اپنی کتابوں میں لکھے ہیں اور ہر فرقے کے ماننے والوں نے اپنے عقائد و احکام کے استدلال بھی پیش کیے ہیں۔ ہر فرقے کے علماء نے اپنے فرقے کی تاریخ اور حقیقت نیز اس فرقے کے علماء کے طبقات کی تفصیل تحریر کی ہے۔[۱]

مثلاً فرقۂ اشاعرہ کی تاریخ تأسیس اور اس کے مؤسّس کے متعلق سب کو علم ہے اور اس کے مؤسّس کی تاریخِ ولادت و وفات بھی کتابوں میں درج ہے۔ نیز اس کی آراء بھی اس کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی موجود ہیں جو ہر شخص کی دسترس میں ہیں اور تمام اہلِ علم کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہر فرقے کی معلومات اسی فرقے کی کتابوں سے حاصل ہوسکتی ہیں۔

فرقۂ اشاعرہ کے بانی کے بعد اس فرقے کے دیگر علماء کا نسب، ولادت و وفات اور ان کی آراء اور ان کی تحریریں بھی ہر پڑھے لکھے شخص کی دسترس میں ہیں اور ان کتابوں کی طرف رجوع کر کے ہر شخص اس فرقے کے عقائد و احکام جان سکتا ہے اور اسے بنیاد بنا کر ہی اس فرقے کے متعلق کوئی فیصلہ کرسکتا ہے۔

آیئے دیکھیں مکتبِ خلفاء کے علماء نے جن فرقوں کی نسبت مکتبِ اہلبیتؑ کی طرف دی ہے ان کی حقیقت کیا ہے؟

(۱) فرقۂ سبائیہ

مکتبِ خلفاء کے علماء نے لکھا ہے کہ اس فرقے کا بانی عبداللہ بن سبا تھا۔ اس کے متعلق ہم مکتب خلفاء کے علماء سے چند سوال دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ کیا عبداللہ کا باپ سَبا آسمان سے گرا تھا یا اس کا بھی کوئی باپ تھا؟ اگر وہ آسمان سے نہیں گرا تھا اور اس کا بھی کوئی باپ تھا تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ اس کا نام و نسب کیا تھا؟

۲۔ کیا عبداللہ بن سبا کی کوئی کتاب کسی کے پاس موجود ہے؟

۳۔ جن اکابر صحابہ مثلاً ابوذر غفاریؓ، عمار یاسرؓ یا تابعین میں سے مالک اشترؒ اور محمد بن ابی بکرؓ جنہیں مکتبِ خلفاء کے مؤرخین نے سبائی لکھا ہے، کیا ان بزرگوں نے کبھی کہا تھا کہ ہم سبائی ہیں؟

۴۔ ابوذر غفاریؓ، عمار یاسرؓ، حجر بن عدیؓ اور صعصعہ بن صوحان عبدیؓ جنہیں سبائی کہا گیا ہے، تو کیا ان بزرگوں کی کوئی کتاب کسی کے پاس موجود ہے؟ یا پھر جو کچھ کسی کے پاس موجود ہے وہ ان کے دشمنوں کی لکھی ہوئی ہے جو ان کے بعد لکھی گئی ہے اور خدا کے ان نیک بندوں کو اس فرقے کی کوئی خبر نہیں تھی؟

۱۔ مثلاً طبقات الشافعیہ، تالیف تاج الدین سبکی، المتوفی ۷۷۱ھ۔ طبقات الحنابلہ، تالیف ابویعلی محمد بن حسین۔ طبقات المعتزلہ، تالیف احمد بن یحییٰ بن مرتضیٰ (المتوفی ۸۴۰ھ)۔

(ب) فرقۂ کیسانیہ

جس کیسان سے فرقۂ کیسانیہ منسوب ہے ذرا اس کی وضاحت تو کی جائے کہ آخر یہ کیسان کون تھا؟

کیا کیسان محمد بن حنفیہؒ تھے یا مختار ثقفیؒ تھے یا امام علی علیہ السلام کے آزاد کردہ غلام کا لقب تھا اور اگر آخری بات سچی ہے تو پھر خدارا یہ تو بتایئے کہ اس کا اصلی نام کیا تھا؟

کیسانیہ کون ہیں؟ اور کیا آج تک کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں کیسانی مذہب سے تعلق رکھتا ہوں؟ اور کہیں ایسا تو نہیں کہ مختار ثقفیؒ کے مخالفین نے انہیں بدنام کرنے کے لئے یہ پھلجڑی چھوڑی ہو؟

(ج) فرقۂ غرابیہ

اس فرقے کے متعلق ہمیں بتایا جائے کہ اس کا بانی کون تھا؟ وہ کس شہر میں پیدا ہوا، کس زمانے میں زندگی بسر کی اور کس شہر میں اپنے عقائد کا پرچار کیا؟ اس سلسلے میں ہمیں یہ بھی بتایا جائے کہ آج تک کسی نے کہا کہ میرا تعلق غرابیہ فرقے سے ہے؟ اگر یہ ثابت کرنا مشکل ہو تو کم ازکم یہ تو بتایا جائے کہ کس شخص نے غرابیہ فرقے کے افراد سے ملاقات کی تھی؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مکتب اہلبیتؑ کے مخالفین نے اپنی دشمنی کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے یہ بہتان طرازی کی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ فرقے کبھی بھی موجود نہیں رہے۔ یہ صرف مؤرخین کے اذہان کی پیداوار ہیں جبکہ مکتبِ خلفاء کے فرقے ایک اٹل حقیقت ہیں۔ وہ صدیوں سے قائم ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ البتہ جن بیسیوں فرقوں کی نسبت مکتبِ اہلبیتؑ کی طرف دی گئی ہے ان میں سے دو فرقے زیدیہ اور اسماعیلیہ ایک حقیقت ہیں اور ان کا وجود ہے جبکہ باقی فرقوں کا آج تک وجود ہی ثابت نہیں ہے۔

اس بحث میں ہم ان دونوں فرقوں کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

(۴) زیدیہ

زیدیہ مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے جو کہ اپنے آپ کو زید بن علی بن حسین علیہم السلام کا پیروکار سمجھتا ہے۔ حضرت زید کے خروج کی داستان درج ذیل ہے:

۱۲۱ھ یا ۱۲۲ھ میں حضرت زید ہشام بن عبدالملک اموی المتوفی ۱۲۵ھ کے پاس شام گئے تو اس نے ان کی توہین کی۔ اس کے بعد حاکم کوفہ نے ان کی اور اہلبیتؑ کی توہین کی جس سے ان کے رگ و پے میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے اموی حکومت کے خلاف خروج کیا۔ کچھ اہلِ کوفہ نے ان کی بیعت کی اور انہوں

نے حاکم کوفہ سے جنگ کی اور اس جنگ میں شہید ہو گئے۔[۱]

حضرت زید کے بعد خراسان میں ان کے فرزند یحییٰ نے ۱۲۵ھ میں اموی حاکم کے خلاف خروج کیا اور شہر جوزجان میں شہید ہوئے۔[۲]

حضرت زید اور ان کے فرزند نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے خروج کیا تھا۔[۳]

حضرت زید اور یحییٰ کی شہادت کے بعد ایک گروہ وجود میں آیا جو اپنے آپ کو زید کا پیروکار کہنے لگا اور زیدیہ فرقے کے نام سے موسوم ہوا۔

فرقۂ زیدیہ باقی شیعوں کی طرح سے یہ نہیں مانتا کہ امامت ایک الٰہی منصب ہے اور امام کا انتخاب خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور پیغمبر اسلامؐ نے اللہ کے حکم سے مسلمانوں کو اس کی تبلیغ کی تھی۔

اس کے برعکس فرقۂ زیدیہ کا نظریہ یہ ہے کہ بعد از علی مرتضیٰؑ اولادِ علیؑ و بتولؑ میں سے جو بھی تلوار لے کر خروج کرے وہی مسلمانوں کا امام ہے۔[۴]

زیدیہ اور اہلسنت میں بہت سے نکات مشترک ہیں۔ اہلسنت کی طرح سے زیدیہ کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ امام کا انتخاب خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں زیدیہ فقہی احکام میں (امام) ابوحنیفہ کی تقلید کرتے ہیں اور وہ (امام) ابوحنیفہ کی تقلید اس لئے کرتے ہیں کہ جب عباسی خلیفہ منصور کے عہد میں دو حسنی سید بھائیوں یعنی محمد اور ابراہیم نے کوفہ اور بصرہ میں خروج کیا تھا تو (امام) ابوحنیفہ نے ان کے حق میں فتویٰ دیا تھا اور انہوں نے اپنے فتویٰ میں کہا تھا کہ مسلمانوں کو ان کی حمایت کرنی چاہئے۔

عقیدۂ امامت میں اہلسنت سے توافق اور (امام) ابوحنیفہ کی تقلید کے بعد فرقۂ زیدیہ پر یہ اعتراض وارد ہوتے ہیں:

۱۔ زید شہید کے حالات کے لئے دیکھیں: بحار الانوار، ج ۴۶، ص ۱۷۰ تا ۱۸۸۔ مقاتل الطالبین، مطبوعہ قاہرہ، طباعت ۱۳۶۸ھ، ص ۱۴۲۔۱۵۱۔ تاریخ ابن کثیر در ذکر حوادث ۱۲۱ھ۔ ابن اثیر نے بڑی وضاحت سے ان مظالم کا تذکرہ کیا ہے جو زید پر روا رکھے گئے تھے اور انہوں نے زید کی شہادت کو ۱۲۲ھ کے حوادث میں ذکر کیا ہے۔

۲۔ ابوالفرج اصفہانی، مقاتل الطالبین، ص ۱۵۲ تا ۱۵۸۔ اور ابن اثیر جزری، الکامل فی التاریخ، در ذکر حوادث ۱۲۵ھ۔

۳۔ ابن اثیر جزری، الکامل فی التاریخ، در ذکر شہادت زید و یحییٰ۔

۴۔ زیدیوں کا یہ نظریہ میں نے زیدی مذہب کے لوگوں سے مباحثے کے نتیجے میں اخذ کیا ہے۔ علاوہ ازیں شہرستانی نے بھی الملل والنحل، ج ۱، ص ۱۵۴ میں زیدیوں کے ذکر میں ان کا یہی عقیدہ لکھا ہے۔

۱۔ اگر تلوار کے ساتھ خروج کرنا امامت کی شرط ہے تو پھر امام علی، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام جب خانہ نشین تھے تو اس وقت کیا وہ امام نہیں تھے؟ مزید یہ کہ جب امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کی تو اس کے بعد ان کی امامت ان سے سلب ہوگئی تھی یا باقی رہی؟

۲۔ حضرت امام سجاد اور حضرت امام باقر علیہم السلام نے اموی حکومت کے خلاف خروج نہیں کیا تھا۔ ان کے متعلق زیدیہ کی رائے کیا ہوگی؟

۳۔ زیدیہ کے پاس (امام) ابوحنیفہ کی تقلید کا کیا جواز ہے جبکہ (امام) ابوحنیفہ ان ائمہ کی امامت کے قائل نہیں تھے جنہیں زیدیہ اپنا امام مانتے ہیں کیونکہ (امام) ابوحنیفہ خلفائے ثلاثہ کی امامت و خلافت کے قائل تھے اور وہ علی، حسن اور حسین علیہم السلام کو امام نہیں جانتے تھے۔ علاوہ ازیں (امام) ابوحنیفہ فقہی احکام میں حضرت زید اور ان کے آبائے طاہرین کے پیروکار نہیں تھے اور وہ اپنی رائے پر عمل کرتے تھے۔

ہمیں فرقۂ زیدیہ کی اس روش پر انتہائی تعجب ہے۔ اگر حضرت زید ان لوگوں کو دیکھ لیتے تو نہ جانے وہ ان کے متعلق کیا کہتے؟

خلاصہ یہ ہے کہ زیدیہ فرقے نے سُنّی عقائد کے بہت سے حصے کو قبول کیا اور چند مسائل انہوں نے شیعہ عقیدے سے بھی اخذ کئے ہیں۔ پھر انہوں نے کچھ عقائد کا اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے اسی لئے زیدیہ نہ تو سُنّی ہیں اور نہ ہی شیعہ۔ انہیں سُنّی اور شیعہ سے جداگانہ ایک تیسرا فرقہ سمجھنا چاہئے۔ اس فرقے کے متعلق جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ یہ فرقہ اپنے عقائد و احکام میں حضرت زید اور مکتبِ اہلبیتؑ کے دوسرے پیروکاروں سے بنیادی اختلاف رکھتا ہے اور یہ فرقہ جہاں مکتبِ اہلبیتؑ سے کوسوں دور ہے وہاں مکتبِ خلفاء کے زیادہ قریب ہے۔

(۵) فطحیہ

یہ فرقہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند عبداللہ سے منسوب ہے۔ ان کا لقب ''افطح'' بیان کیا جاتا ہے اور ''افطح'' اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا سر یا پاؤں عام انسانوں سے بڑے ہوں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات کے وقت وہ بڑے بیٹے تھے۔ چنانچہ جب امام نے اپنے بہت سے جانشینوں کے نام ایک دستاویز میں تحریر کئے تھے تو اس وصیت میں آپ نے ان کا نام بھی تحریر کیا تھا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات کے بعد اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا تھا اور گھر میں خوب صفائی ستھرائی کرائی اور صدر دروازے پر ایک دربان بھی بٹھایا تھا اور مسند پر تکیہ لگا کر امامت کا دعویٰ کیا تھا۔[۱]

۱۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج ۴۷، ص ۲۵۲ و ۲۵۳۔

ان کی اونچی دکان کو دیکھ کر کچھ شیعہ ان کے پاس گئے اور ان سے کچھ مسائل دریافت کئے لیکن وہ صحیح جواب نہ دے سکے اور شیعوں نے جان لیا کہ انہیں احکام کا صحیح علم نہیں ہے جس کی وجہ سے انہوں نے ان کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا۔ پھر انہوں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی طرف رجوع کیا۔[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات کے ستر دن بعد عبداللہ کی بھی وفات ہوگئی۔

درج بالا بیانات پڑھنے کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس نام کا کوئی فرقہ وجود میں نہیں آیا تھا کیونکہ اتنی قلیل مدت میں ایک فرقے کو کیسے تشکیل دیا جاسکتا ہے؟

علاوہ ازیں وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس کے نام سے فرقہ قائم کیا تھا؟

(۶) اسماعیلیہ

اسماعیلی امام علی علیہ السلام سے لے کر امام جعفر صادق علیہ السلام تک چھ ائمہ اہلبیتؑ پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد امامت ان کے فرزند اسماعیل کو منتقل ہوئی تھی۔[2]

اس فرقے کو ''شش امامی'' بھی کہا جاتا ہے۔[3]

پھر اس فرقے کے اندر مختلف عقائد اور فرقوں نے جنم لیا اور وہ تقسیم در تقسیم کا شکار ہوگئے۔ اس فرقے کی تاریخ اور ان کے عقائد کا خلاصہ درج ذیل ہے:

یہ فرقہ اپنے آپ کو امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند اسماعیل کی طرف منسوب کرتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسماعیل اپنے پدرِ بزرگوار کی زندگی میں ہی وفات پاگئے تھے۔ اسماعیل کی موت کے وقت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایسے عجیب کام کئے تھے جس کی مثال خاندانِ عصمت کی موت کے وقت نہیں ملتی۔ جب اسماعیل کی وفات ہوئی تو امام جعفر صادق علیہ السلام نے تیس شیعوں کو اپنے گھر بلایا۔ پھر آپ نے اپنے ایک شیعہ کو جس کا نام داؤد تھا آواز دے کر فرمایا: داؤد! اس کے منہ سے کپڑا ہٹاؤ۔ داؤد نے امام کے حکم سے ان کے منہ سے کپڑا ہٹایا تو آپ نے حاضرین میں سے ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ فرمایا کہ غور سے اسماعیل کی شکل و صورت دیکھ لو۔

۱۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج ۴۷، ص ۲۵۲ و ۲۵۳۔ المقالات والفرق، تالیف سعد بن عبداللہ اشعری، المتوفی ۳۰۱ھ، ص ۸۶، مطبوعہ تہران سال ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء۔

۲۔ محمد عبدالکریم بن ابی بکر احمد شہرستانی اشعری، الملل والنحل، ج ۱، ص ۱۶۷۔

۳۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے شیعوں نے انہیں یہ نام دیا ہے۔

جب سب نے اچھی طرح سے ان کی شکل وصورت دیکھ لی تو امامؑ نے حاضرین سے فرمایا: یہ بتاؤ اسماعیل زندہ ہے یا وفات پاچکا ہے؟

تمام حاضرین نے بیک زبان ہوکر کہا: اسماعیل وفات پاچکا ہے۔

پھر آپ نے فرمایا: خدایا! گواہ رہنا۔ اس کے بعد آپ نے غسل وکفن دینے کا حکم دیا۔ جب غسل و کفن مکمل ہوگیا تو آپ نے مفضل سے فرمایا کہ اس کے منہ سے کفن ہٹادو۔

مفضل نے ان کے منہ سے کفن ہٹایا تو آپ نے تمام حاضرین سے فرمایا: تم سب اسے غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ اسماعیل فوت ہوگیا ہے یا نہیں؟

سب نے جواب دیا: مولا! وہ فوت ہوگیا ہے۔

امام کے اس طرزِ عمل سے تمام حاضرین حیران وششدر رہ گئے۔ پھر آپ نے فرمایا: خدایا! گواہ رہنا! کیونکہ باطل پرست اسماعیل کی موت میں شک وشبہ کریں گے۔

جب اسماعیل دفن ہوگئے تو امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: کفن پہنے ہوئے جو مردہ اس قبر میں دفن ہوا وہ کون ہے؟

سب نے کہا: وہ آپ کا فرزند اسماعیل ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے کہا: خدایا گواہ رہنا! اس کے بعد آپ نے اپنے فرزند امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ یہ حق کے ساتھ ہے اور حق اس کے ساتھ ہے۔[۱]

اس کے علاوہ کچھ دوسری روایات میں مذکور ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے حکم دیا کہ اسماعیل کے حاشیۂ کفن پر یہ جملہ لکھا جائے: "اِسْمَاعِیلُ یَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" اسماعیل گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔[۲]

آپ نے حکم دیا کہ انہیں غسل وکفن دیا جائے اور جب کفن پہنایا جاچکا تو آپ نے فرمایا کہ اس کے منہ سے کپڑا ہٹادیا جائے۔ پھر آپ نے اس کی پیشانی اور گلے کو بوسہ دیا۔[۳]

مشایعتِ جنازہ کے وقت آپ نے کئی بار حکم دیا کہ جنازے کو زمین پر رکھ دیا جائے اور جب جنازہ

۱۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۴۷، ص ۲۵۴ بہ نقل از مناقب ابن شہر آشوب، ج ۱، ص ۲۲۸۔

۲۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۴۷، ص ۲۴۸ حدیث نقل از کمال الدین و تمام النعمہ شیخ صدوق، ج ۱، ص ۱۶۰۔ شیخ طوسی، تہذیب، ج ۱، ص ۲۸۹۔ علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۴۷، ص ۲۵۵ نقل از مناقب ابن شہر آشوب، ج ۱، ص ۲۲۹۔

۳۔ شیخ الطائفہ صدوق، کمال الدین و تمام النعمہ، ج ۱، ص ۱۶۰۔

رکھ دیا جاتا تو آپ اس کے منہ سے کپڑا ہٹا کر اس کے چہرے کو دیکھتے تھے اور آپ کے اس عمل کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسماعیل کی وفات میں شک نہ کریں۔[۱]

بہت سی روایات میں مذکور ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے ایک شیعہ کو اسماعیل کی نیابت میں حج کرنے کے لئے روانہ کیا تھا۔[۲]

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسماعیل کی وفات کے بعد تیس معتبر شیعوں کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اسماعیل کے منہ سے کپڑا ہٹا کر دیکھیں۔ جب انہوں نے اچھی طرح سے دیکھ لیا تو آپ نے پوچھا: اسماعیل فوت ہو چکا ہے یا زندہ ہے؟

سب نے کہا: اسماعیل فوت ہو چکا ہے۔

پھر آپ نے حکم دیا کہ اسے غسل و کفن دیا جائے اور آپ نے اس کے حاشیۂ کفن پر یہ جملہ لکھوایا:

"اِسْمَاعِیْلُ یَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ۔"

اس جملے کے لکھوانے سے امامؑ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ یہ کفن اسماعیل کا ہی کفن ہے۔

کفن پہنانے کے بعد پھر آپ نے حکم دیا کہ کفن کے بند کھول دیئے جائیں۔ جب بندِ کفن کھولے گئے تو آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ اس مردے کو اچھی طرح سے دیکھ لو۔ جب تمام حاضرین نے غور سے دیکھ لیا تو آپ نے ان سے پوچھا: یہ کس کا بدن ہے؟

سب نے کہا: یہ آپ کا بیٹا اسماعیل ہے جو فوت ہو گیا ہے۔

پھر جب جنازہ اُٹھا تو اس کے جلوس میں تیس سے کہیں زیادہ افراد ہوں گے۔ آپ نے کئی بار جنازے کو زمین پر رکھوایا اور ہر بار کفن کے بند کھولے اور اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس عمل کی وجہ سے تمام حاضرین آپ کی طرف متوجہ ہوئے اور جب اسماعیل دفن ہونے لگے تو آپ نے حاضرین سے پھر پوچھا کہ یہ کس کا بدن ہے؟

سب نے کہا: یہ اسماعیل کا بدن ہے۔

جب اسماعیل قبر میں دفن ہو چکے تو آپ نے حاضرین سے باردیگر پوچھا کہ یہ غسل کسے دیا گیا اور کفن پہنا کر کسے دفنایا گیا ہے؟

لوگوں نے کہا: آپ کے فرزند اسماعیل کو۔

پھر کچھ عرصے بعد آپ نے ایک شخص کو اسماعیل کی نیابت میں حج پر بھیجا۔

۱۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۴۷، ص ۲۴۲ بہ نقل از ارشاد شیخ مفید، ص ۳۰۲۔

۲۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۴۷، ص ۲۵۴ بہ نقل از مناقب ابن شہر آشوب، ج ۱، ص ۲۲۸ اور شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۴۷، ص ۲۵۵ بہ نقل از مناقب ابن شہر آشوب، ج ۱، ص ۲۳۰۔

امام صادق علیہ السلام نے اسماعیل کی وفات کو بار بار ظاہر کیا تو کیا اس کے باوجود یہ کہنا صحیح ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے کے لوگ یہ کہیں کہ آپؑ نے فرمایا تھا کہ اسماعیل مرا نہیں ہے؟ اور مزید یہ کہ اسماعیل، امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد بھی زندہ تھا اور وہ آپؑ کے بعد امام بنا؟

امام جعفر صادق علیہ السلام کی اتنی بڑی تکذیب کے بعد یہ لوگ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم ائمۂ اہلبیتؑ کے پہلے چھ اماموں کے ماننے والے ہیں؟ اور تعجب ہے کہ لوگوں نے اس فرقے کا نام شش امامی کیسے رکھ دیا جبکہ حقیقتاً یہ لوگ شش امامی نہیں ہیں۔ چھ اماموں کو ماننا تو کجا یہ لوگ تو ان چھ اماموں میں سے کسی کو بھی نہیں مانتے، ان ائمہ میں سے کسی کے فرمان کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ اگر یہ لوگ چھ ائمۂ اہلبیتؑ کے قائل ہوتے تو یہ کبھی نہ کہتے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد اسماعیل زندہ تھے اور وہ آپ کے بعد امامت کے منصب پر فائز ہوئے اور یہ کبھی نہ کہتے کہ اسماعیل کے بعد امامت ان کے فرزند محمد کو منتقل ہوئی۔

اسماعیلی یا اسماعیلیہ نام کے فرقے کا دَور گزرنے کے ساتھ ائمۂ اہلبیتؑ سے فاصلہ بڑھتا گیا اور اہلبیتؑ کے شیعوں سے روز بروز ان کا فاصلہ زیادہ ہوتا گیا یہاں تک کہ جب شیعیت سے ان کا انحراف ایک سو اسّی ڈگری کے زاویے پر پہنچ گیا تو وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

پھر ان میں قرامطہ نامی ایک فرقہ پیدا ہوا جنہوں نے مکے میں تاریخ کا بدترین قتل عام کیا اور خانۂ کعبہ سے حجرِ اسود کو اُکھاڑ کر لے گئے اور آخر کار مصر کے فاطمی خلیفہ کے مجبور کرنے پر اسے واپس کیا۔[۱]

حسن بن صباح کے ماننے والے بھی اسماعیلی تھے جو کہ الموت نامی قلعوں میں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اس فرقے کی ایک شاخ دروزی بھی ہے جو کہ لبنان اور فلسطین میں آباد ہیں۔

اس تفصیل کا ماحَصَل یہ ہے کہ اسماعیلی فرقہ اپنی تأسیس کے وقت سے شیعہ فرقہ نہیں تھا کیونکہ اس فرقے سے وابستہ افراد نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی مخالفت کی تھی۔ پھر مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ اسلام سے خارج ہوگئے اور انہوں نے اسلام اور تشیع کی مخالفت کی۔

اسماعیلی فرقے کی حقیقت واضح کرنے کے لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس فرقے کا تاریخ میں وہی کردار ہے جو مسیلمہ کذّاب اور اس کی قوم بنی حنیفہ کا ہے جس کی داستان کچھ یوں ہے:

مُسَیلمہ کذّاب اور بنی حنیفہ کی داستان

حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلِہٖ وسلم کے زمانے میں جو عرب قبائل اسلام قبول کرتے تھے وہ

۱۔ ابن اثیر جزری، الکامل فی التاریخ، در ذکر حوادث، ۳۳۹ھ۔

اپنے قبیلے کے کچھ افراد کو اپنا نمائندہ بنا کر آپؐ کی خدمت میں بھیجتے تھے جو آپؐ کو اپنے اور اپنے قبیلے کے قبولِ اسلام کی خبر دیتے تھے۔ حضورؐ ان کا اسلام قبول فرماتے، نمائندہ افراد آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور آپؐ ان سب کو انعام و اکرام سے نوازتے۔ ان نمائندہ افراد کو اصطلاحی طور پر عربی میں ''وفد'' کہا جاتا تھا۔

ساکنینِ یمامہ بنی حنیفہ نے بھی اسلام قبول کیا اور اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع کے لئے ایک وفد رسولِ اسلامؐ کی خدمتِ اقدس میں بھیجا۔ بنی حنیفہ کے وفد میں مسیلمہ کذّاب بھی شامل تھا۔

روایت ہے کہ جب یہ وفد مدینے پہنچا تو مسیلمہ کذّاب سامان کی دیکھ بھال کے لئے بیٹھ گیا اور دوسرے افراد دربارِ نبوتؐ میں حاضر ہوئے اور اپنے قبیلے کے قبولِ اسلام کی آنحضرتؐ کو خبر دی۔ آپؐ نے ان افراد کو انعام دیا اور مسیلمہ کذّاب کے لئے بھی انعام روانہ کیا اور فرمایا: مسیلمہ تم سے زیادہ برا نہیں ہے۔

جب یہ وفد واپس یمامہ پہنچا تو مسیلمہ مرتد ہو گیا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور کہا کہ پیغمبر نے میرے متعلق کہا ہے کہ میں تم سب سے زیادہ بُرا نہیں ہوں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے نبوّت میں مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا شریک بنایا ہے۔ اس کے بعد مسیلمہ نے بنی حنیفہ کے سامنے جو خود ساختہ اسلام پیش کیا اس میں اس نے نماز کی چھٹی کرا دی اور زنا اور شراب کو حلال قرار دیا۔

الغرض مسیلمہ نے اپنے قبیلے کے سامنے عین اسی طرح کا اسلام پیش کیا جیسا کہ آج کل مغرب کے اسلام شناس اور ان کے شاگرد پیش کر رہے ہیں۔ مسیلمہ نے اپنی قوم قبیلے کی نفسیات کو مدِنظر رکھ کر ان کے سامنے ایک عجوبہ اسلام پیش کیا۔ اُس کا بیان کردہ اسلام وہاں کی تہذیب و ثقافت اور ان لوگوں کی خواہشات کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ اس کی قوم بنی حنیفہ اس پر ایمان لے آئی اور جب اس کے اچھے خاصے پیروکار بن گئے تو اس نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں اس مضمون کا خط روانہ کیا:

از مسیلمہ رسول اللہ بطرف محمد رسول اللہؐ۔ آپ پر سلام ہو۔

امابعد! مجھے بھی اَمرِ نبوت میں آپ کے ساتھ شریک کر دیا گیا ہے۔ اب آدھی زمین ہماری اور آدھی قریش کی ہوگی لیکن قریش زیادتی کرنے والا گروہ ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

از محمد رسول اللہؐ بطرف مسیلمہ کذّاب۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔

امابعد! زمین خدا کی ہے، وہ جسے چاہے اس کا وارث بناتا ہے۔[۱]

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں مسلمانوں نے اس

۱۔ ابن ہشام، سیرت، ج ۴، ص ۲۲۳ و ۲۴۵ ۔ ۲۷۲۔ طبری، تاریخ، ص ۱۷۳۷ و ۱۷۳۹، ۱۷۴۸ و ۱۷۴۹، مطبوعہ یورپ۔

سے جنگ کی جس میں فریقین کے ہزاروں افراد قتل ہوئے۔ مسیلمہ کذاب کے ساتھ اس کے قبیلے کے کچھ لوگ مارے گئے اور باقی قیدی بنالئے گئے۔

اس واقعہ میں ہم نے دیکھا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بنی حنیفہ کے وفد اور بنی حنیفہ کے قبیلہ پر اسلام کا حکم جاری کیا، قبیلے کے وفد کے اسلام کو قبول کیا، ہر ایک کو انعام و اکرام سے بھی نوازا۔ وفد کے دوسرے ارکان کی طرح آپ نے مسیلمہ کا اسلام بھی قبول کیا اور دوسرے افراد کی طرح اسے بھی انعام دیا۔ الغرض رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس وفد سے بھی وہی مشفقانہ برتاؤ کیا جو آپ نے عبداللہ بن ابی کے ساتھ روا رکھا تھا جس کے متعلق سورۂ منافقون نازل ہوئی تھی اور آپ نے مسیلمہ کے متعلق فرمایا: ''وہ تم سے بدتر نہیں ہے۔''

ان الفاظ سے شاید آپ کا مقصود یہ ہو کہ وہ اس وقت تمہاری طرح سے اسلام لایا ہے اور وہ تمہاری مانند ہے اور اس کے بعد عنقریب تم سب مرتد ہو جاؤ گے۔

مسیلمہ کا پیروکار فرقہ، خدا و رسولؐ کے جملہ احکامِ اسلام کو تسلیم کرتا تھا۔ ان کے اور باقی مسلمانوں کے درمیان بس یہی ہلکا سا فرق تھا کہ وہ مسیلمہ کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ نبوت میں شریک سمجھتے تھے اور اگر ان کا تھوڑا سا اختلاف تھا تو صرف نماز، روزہ، شراب اور زنا کے متعلق تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی ہوش مند اس طرح کا تبصرہ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مسیلمہ اسلام سے خارج ہوگیا تھا اور وہ دنیا کا بدترین کذاب تھا۔ اس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا اسی لئے وہ کافر ہوگیا اور بنی حنیفہ کے جن افراد نے اس کی پیروی کی تھی وہ بھی کافر ہوگئے۔

آمدم برسرِ مطلب! اسماعیلیوں کا معاملہ بھی مسیلمہ کذاب جیسا ہی ہے کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم امام اول سے لے کر امام ششم تک ائمۂ اہلبیتؑ کے ماننے میں باقی تمام شیعوں کے ساتھ شریک ہیں لیکن امام ششم کے بعد ہم ان کے فرزند اسماعیل اور اس کے بعد ان کے فرزند محمد اور پھر دوسرے اماموں کو مانتے ہیں۔ ان کی یہ گفتگو بھی مسیلمہ کذاب کے کسی فریب کار حامی کی سی ہے کہ ہم آدمؑ سے خاتمؑ تک تمام انبیائے کرامؑ کو مانتے ہیں جبکہ ہم میں اور دوسرے مسلمانوں میں بس یہی فرق ہے کہ ہم مسیلمہ کو بھی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ نبوت میں شریک مانتے ہیں اور اس کے علاوہ بس دو چار احکام میں دوسرے مسلمانوں سے اختلاف کرتے ہیں لہٰذا ہم بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح سے مسلمان ہیں۔

جس طرح مسیلمہ کے کسی طرفدار کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے اسی طرح اسماعیلیوں کا بھی یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ بھی باقی شیعوں کی طرح سے چھٹے امام تک ائمہ اہلبیتؑ کو مانتے ہیں۔ البتہ چھٹے امام کے بعد ان کے فرزند

اسماعیل پھر اس کے بعد دوسرے ائمہ کو مانتے ہیں۔

مسیلمہ کے ماننے سے جس طرح بنی حنیفہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوگئے تھے اسی طرح سے اسماعیل اور اس کی نسل اور دوسروں کو ماننے سے اسماعیلی بھی شیعیت سے خارج ہوگئے ہیں اور جس طرح سے بنی حنیفہ کے افراد کو مسلمان تسلیم نہیں کیا جاسکتا اسی طرح سے اسماعیلیوں کو بھی شیعہ نہیں مانا جاسکتا اور نہ ہی انہیں شیعوں کا ایک فرقہ تسلیم کیا جاسکتا ہے اور پھر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اسماعیلیوں نے اسلام کے ضروری احکام کے مقابلے میں خود ساختہ احکام تیار کر لئے اور یوں آہستہ آہستہ وہ دن بھی آپہنچا جب وہ اسلام کے دائرے سے ہی خارج ہوگئے اور یوں اس وقت انہیں نہ تو شیعہ تسلیم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کا فرقہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۷) غُلات

ائمۂ اہلبیتؑ کی زندگی میں وقتاً فوقتاً چھوٹے گروہ نمودار ہوتے تھے جو کہ بہت سے دعوے کرتے تھے اور لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے تھے۔ اس کے جواب میں ائمہ ان پر لعنت کر کے ان کی حقیقت سے پردہ اٹھا دیتے تھے اور کسی بھی شیعہ اور سُنّی کو ان کی پہچان میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا تھا۔ یوں ایسے گروہ چند دنوں میں ہی معدوم ہوجاتے اور اپنی موت آپ مرجاتے تھے۔

شہرستانی نے — جو کہ مکتبِ خلفاء کا مشہور دانشور تھا اور عقائد میں اشعری المسلک اور فقہ میں شافعی کا مقلّد تھا،[۱] اپنی مشہور کتاب الملل والنحل میں — غالیوں کے فرقوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے ائمۂ اہلبیتؑ کی بیزاری کا بھی ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ائمہؑ نے ہر دور میں ان سے مبارزہ کیا۔

آخر میں شہرستانی نے لکھا کہ وَتَبَرَّأَ مِنْ هٰؤُلَاءِ كُلِّهِمْ جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ الصَّادِقُ (رض) وَ طَرَدَهُمْ وَلَعَنَهُمْ...... جعفر بن صادقؑ نے ان تمام فرقوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا اور انہیں اپنے سے دور دھکیل دیا اور ان پر لعنت فرمائی۔[۲]

دینی فرقے بننے کے اسباب

اس بحث کے اختتام پر مناسب ہے کہ مختلف دینی فرقوں کی پیدائش کے اسباب بیان کئے جائیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل چند باتیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔ عبدالکریم شہرستانی، مقدمہ کتاب الملل والنحل۔

۲۔ عبدالکریم شہرستانی، الملل والنحل، ج۱، ص۱۷۳ تا ۱۸۱۔

(۱)　انسانی فعالیت اور اسبابِ تحرک میں سے اہم ترین سبب ''اپنے مفادات کے تحفظ کی خواہش ہے'' جسے ہم خودخواہی سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اسی خودخواہی کی وجہ سے انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے جدوجہد کرتا ہے۔

انسانی خواہشات میں سب سے بڑی خواہش حکومت طلبی ہے۔ اس کے بعد اپنی خواہشات کی آزادانہ تکمیل ہے۔ ان دونوں خواہشوں کے حصول میں جو چیز مدد و معاون ہوسکتی ہے وہ دولت ہے۔ مذکورہ خواہشات کی تکمیل کے لئے انسان دولت جمع کرتا ہے اور ہر شخص کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ خودخواہی کے باوجود معاشرے میں اسے نیک نامی بھی حاصل رہے۔

یہ جان لینے کے بعد کہ انسان معاشرے کے اس اجتماعی نظام کی تائید کرتا ہے جس سے اس کی خواہشات کی تکمیل ہوسکے اور اگر ایسا اجتماعی نظام میسر آجائے تو انسان اس کی پیروی کرنے لگتا ہے۔

(۲)　اللہ تعالیٰ نے دوقسم کے لوگ پیدا کئے ہیں: ایک رہبر اور دوسرے پیروکار۔

رہبروں اور رہنماؤں کی بھی دوقسمیں ہیں۔ اولاً: اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا. ایسے رہبر جو ہمارے فرمان کے مطابق ہدایت کرتے ہیں۔ (سورۂ انبیاء: آیت ۷۳، سورۂ سجدہ: آیت ۲۴) اور ثانیاً: اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ. ایسے رہبر جوجہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ (سورۂ قصص: آیت ۴۱)

اسی طرح سے پیروکاروں کی بھی دوقسمیں ہیں: پہلی قسم کے لوگ عقل و دانش کو استعمال کرتے ہوئے ان رہبروں کی پیروی کرتے ہیں جوان کی اعلیٰ انسانی اقدار کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ایسے افراد ہمیشہ رہبروں کی پہلی قسم کی پیروی کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے پیروکاروں کے بارے میں امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: هَمَجٌ رَعَاعٌ اَتْبَاعُ كُلِّ نَاعِقٍ يَمِيْلُوْنَ مَعَ كُلِّ رِيْحٍ. یعنی یہ ایسے بے عقل اور بے ارادہ لوگ ہوتے ہیں جو ہر نعرہ لگانے والے کے پیچھے ہولیتے ہیں اور جدھر ہوا کا رخ دیکھتے ہیں اسی طرف ہوجاتے ہیں۔

(۳)　انسانی معاشروں میں لوگوں کی دانش و بینش یا بے علمی اور نالائقی سے گروہ تشکیل پاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر لوگوں کی علمی صلاحیت یا جہالت گروہ بنانے یا گروہ ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اس نفسیاتی تجزیے کے بعد ہم دین میں مختلف فرقوں کی پیدائش کا جائزہ لینے کے قابل ہوسکتے ہیں۔

مختلف فرقے بنانے میں اُن افراد نے بڑا کردار ادا کیا جو کہ ریاست کے طلبگار تھے اور انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے لوگوں کی جہالت اور نادانی سے خوب استفادہ کیا اور اپنے زمانے اور حالات کے مطابق جدوجہد کی۔ ایسے افراد نے اپنی طرح کے جاہ طلب لوگوں کو منصب و ریاست کی خوشخبری دی اور ان کے سامنے دین کے نام پر ایسے نظریات پیش کئے جو لوگوں کی خواہشات سے مطابقت رکھتے تھے۔ اس طرح انہوں نے اپنا ایک حلقہ بنالیا اور پھر انہوں نے اپنے حلقے یا فرقے کے لئے کسی مذہب کا نام ایجاد کیا۔ یوں دنیا میں

نئے نئے فرقے وجود میں آتے رہے۔ جب بھی کوئی فرقہ وجود میں آتا ہے تو اس کے باقی رہنے یا ختم ہونے کا دار و مدار اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کے عوامل پر ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر حسین علی بہاء کو "بہائی فرقہ" بناتے وقت روس کے زاروں کی حمایت حاصل تھی۔ ابھی وہ اپنا فرقہ بنانے میں مصروف تھا کہ روس میں انقلاب آ گیا اور سرمایہ دارانہ نظام کی بساط لپیٹ دی گئی۔

زار حکومت کا سقوط حسین علی بہاء کے لئے شدید صدمہ تھا۔ پھر اس نے اور اس کے بیٹے عباس آفندی نے انگریزوں کی آشیرباد سے اپنی تبلیغات کو آگے بڑھایا۔ جب حکومتِ برطانیہ کا سورج غروب ہونے لگا تو اس فرقے نے امریکہ کی حمایت حاصل کی۔ اس وقت جہاں کہیں بچے کھچے بہائی موجود ہیں انہیں امریکہ کی حمایت حاصل ہے۔ یہ فرقہ اپنی پیدائش سے لے کر آج تک استعماری قوتوں کا جاسوس رہا ہے۔ اگر اس فرقے کو استعماری طاقتوں کی پشت پناہی حاصل نہ ہوتی تو یہ فرقہ آج تاریخ کے اوراق میں دفن ہو جاتا اور دنیا میں اس کا کہیں نام و نشان تک نہ ملتا۔

الف۔ مسیلمۂ کذّاب و بنی حنیفہ

جزیرۃ العرب میں جب اسلام کی شہرت پھیلی اور جیسے ہی اسلام کا سورج پوری آب و تاب سے چمکنے لگا تو بنی حنیفہ نے اپنی بہتری اسی میں دیکھی کہ وہ بھی اسلام قبول کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور قبولِ اسلام کی اطلاع دینے کے لئے اپنا ایک نمائندہ وفد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔

بنی حنیفہ نجد کے دور افتادہ علاقے میں رہائش پذیر تھے اور رُشدِ فکری سے محروم تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس قبیلے کے ایک شاطر مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور عربی کا کچھ مسجّع و مقفّیٰ کلام ''وحیٔ الٰہی'' کے عنوان سے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا اور ان سے کہا کہ میں تمہارے ہی قبیلے کا ایک فرد ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے محمد قرشیؐ کے ساتھ نبوت میں شریک کیا ہے۔ اللہ نے مجھے اور میرے قبیلے کو عرب کی آدھی زمین کا وارث بنایا ہے اور آدھی زمین کا وارث قریش کو بنایا ہے۔ علاوہ ازیں میری نبوت کی برکت سے تم پر نماز معاف کر دی ہے اور تمہارے لئے شراب اور زنا کو حلال قرار دیا ہے۔

مسیلمہ کذاب نے اپنی قوم کو گمراہ کرنے کے لئے دو نکات پیش کئے :

۱۔ آدھی زمین بنی حنیفہ کی ہے۔

۲۔ تھکا دینے والی نماز انہیں معاف کر دی ہے اور خوش گزرانی کے لئے زنا اور شراب کو حلال کر دیا ہے۔

جب اس کی قوم نے اپنے ہی ہم قبیلہ شخص سے یہ باتیں سنیں تو وہ اس پر ایمان لے آئے اور اس کے جاں نثار ساتھی بن گئے کیونکہ مسیلمہ کی نبوت میں انہیں اپنی خواہشوں کی تسکین کا سامان دکھائی دیتا تھا۔

ب۔ اسماعیلیہ

اسماعیلی فرقے کی بنیاد میں بھی حکومت و ریاست کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس فرقے کے بانیوں نے پہلے تو حضرت اسماعیل کی وفات کا انکار کیا اور بعدازاں رُشدِ فکری سے محروم افراد میں اپنے آپ کو اسماعیل کا نائب مشہور کر کے دولت اور اقتدار حاصل کیا۔ پھر انہوں نے ائمہٴ اہلبیتؑ کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ کر کے اپنے پیروکاروں کو ان سے دور رکھا اور انہیں اور ان کی اولاد کو ہمیشہ کے لئے رُشدِ فکری سے محروم کر دیا۔ پھر زمانے اور حالات کی ضرورتوں کے مطابق انہوں نے احکامِ اسلام کو تبدیل کیا اور احکام میں تبدیلی کرتے وقت لوگوں کی خواہشات کو مدِّنظر رکھا۔ یوں آہستہ آہستہ وہ اسلام سے دور ہوگئے اور آج بھی اسماعیلی فرقے کا وجود عالمی استعمار کے ساتھ رابطے کی وجہ سے ہے۔ اس دَوْر میں بہائی اور اسماعیلی دونوں عالمی استعمار کے گماشتوں کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

ج۔ غُلَات

غلات کی داستان بھی اسماعیلیوں کی داستان سے چنداں مختلف نہیں ہے۔ ائمہٴ اہلبیتؑ کے زمانے میں بعض افراد نے مسیلمہ کذّاب کی طرح چند دنوں کے لئے ائمہؑ کے ہاں آنا جانا شروع کیا اور بعد میں انہوں نے اپنی آمد و رفت کو دلیل بنا کر اپنے کام کا آغاز ائمہؑ کی نیابت کے حوالے سے کیا۔ پھر جب انہوں نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے ائمہؑ کے لئے صفاتِ ربوبیت کا اثبات کیا تاکہ جب لوگ ائمہؑ کو خدا مان لیں گے تو ان کا نبی بننا آسان ہو جائے گا۔

ان بدبختوں میں سے کچھ نے حد سے تجاوز کر کے خدائی کا دعویٰ بھی کیا۔

اِدھر ائمہٴ طاہرینؑ بھی ان کی حرکتوں سے غافل نہیں تھے۔ انہوں نے ہر دور میں ان سے بیزاری کا اعلان کیا اور اپنی تبلیغات سے ان جھوٹے دعویداروں کی امامت، نبوت اور ربوبیت کا ابطال کیا جس کے نتیجے میں اس طرح کے اکثر دعویداروں کو قتل ہونا پڑا۔

مکتبِ اہلبیتؑ کی طرف منسوب فرقوں کے تجزیہ کیلئے ہم دو اہم امور کی دوبارہ یاددہانی کرانا چاہتے ہیں:

(۱) امام زادگان کا خروج

سابقہ صفحات میں ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ نسلِ پیغمبرؐ کے قیام و خروج کے سلسلے کو دو حصوں میں تقسیم

کیا جاسکتا ہے: (۱) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیلئے قیام (۲) مہدویت کے نام سے قیام

یہ تذکرہ گزر چکا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کا قیام پہلے طرز کے قیام کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ امام عالی مقامؑ نے اپنے قیام کے دوران کبھی بھی توریہ آمیز گفتگو کا سہارا نہیں لیا۔ آپ نے ہمیشہ اپنے قیام کے اغراض و مقاصد کو واضح جملوں میں بیان کیا۔ بنی ہاشم کے نام اپنے ایک خط میں آپ نے تحریر فرمایا تھا:

"...مَنْ لَحِقَ بِیْ مِنْکُمُ اسْتُشْهِدَ. وَمَنْ تَخَلَّفَ، لَمْ يَبْلُغِ الْفَتْحَ." تم میں سے جو میرے ساتھ چلے گا وہ شہید کر دیا جائے گا اور جو میرے پیچھے رہ جائے گا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔

امام حسین علیہ السلام نے ہر موقع پر اپنا موقف اچھی طرح واضح کیا۔

امام حسین علیہ السلام کے بعد جہاں تک امام زادوں کے قیام کا تعلق ہے تو ان کا قیام بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے تھا لیکن ان کے اور امام حسین کے قیام میں ایک واضح فرق تھا۔

حضرت زید شہید اور دیگر امام زادوں کا قیام اگرچہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے تھا لیکن انہوں نے عوام سے واضح الفاظ میں اپنا مدعا بیان نہ کیا اور توریۂ آمیز کلمات کا سہارا لیا۔

مختار ثقفی نے خون حسینؑ کے انتقام کے لئے قیام کیا تو انہوں نے بھی توریۂ کی روش اپنائی اور اس دور میں جیسا کہ ہمارے قارئین جانتے ہیں امامت اور مہدویت کی احادیث بیان کرنے پر سخت پابندی تھی اور لوگوں کو امامت اور مہدویت کے متعلق حقائق کا کچھ زیادہ علم نہیں تھا، جب لوگوں نے ان کی توریۂ آمیز باتیں سنیں تو ان کے ذہنوں میں ایک طرح کا خلفشار پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی امام زادہ کسی جگہ قیام کرتا تو لوگ یہ سمجھ کر کہ شاید یہی مہدی ہو اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے۔

اس کے علاوہ لوگوں کی حمایت کا ایک اور سبب بھی تھا۔ لوگ اموی اور عباسی حکومتوں کے مظالم سے تنگ آچکے تھے اور وہ ہر طالع آزما کا ساتھ دینے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ رہتے تھے۔ اس کی مثال حارث کے قیام سے بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ جب اس نے "ترمذ" میں حکومت کے خلاف خروج کیا تو ہزاروں افراد نے اس کا ساتھ دیا۔

امام زادگان وقتاً فوقتاً ظالم حکومتوں کے خلاف خروج کرتے رہے۔ جب کبھی کسی امام زادے کو شکست ہوتی اور وہ مارا جاتا تو لوگ سابقہ حالت پر لوٹ جاتے اور اس امام زادے سے منسوب کسی مکتب کو تشکیل نہیں دیتے تھے۔ البتہ زید شہید کی شہادت کے کئی برس بعد ان کے نام سے ایک دبستانِ مذہب ضرور منسوب کیا گیا جنہیں زیدیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۲) چند گروہ جو امام کی پہچان کیلئے سرگرداں رہے

حکومتِ وقت کی طرف سے ائمۂ اہلبیتؑ پر ہر وقت سختی کی جاتی تھی اور عوام الناس کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ جب بھی کسی امام کی وفات ہوتی تو اس کے دور دراز کے پیروکاروں کو یہ پریشانی لاحق ہوتی تھی کہ امام کی وفات کے بعد ان کے زمانے کا اور حق و صداقت کا رہبر کون ہے؟ اور جب انہیں حق و صداقت کا رہبر مل جاتا تھا تو وہ اس کی پیروی کرنے لگتے تھے۔ لیکن مکتبِ خلفاء کے مؤرخین کے کرشمہ ساز ہاتھوں نے جو کہ مکتبِ اہلبیتؑ کے خلاف ادھار کھائے بیٹھے تھے، امام وقت کے متلاشی گروہوں کے بھی علیحدہ فرقے تراشے۔ اس کی واضح مثال ''فرقہ واقفیہ'' کا کتابی وجود ہے۔ اس فرقے کی حقیقت بس اتنی سی تھی کہ چند روز تک انہیں امام کاظم علیہ السلام کی وفات کا یقین نہ آیا تو وہ چند دن تک حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو ہی امام مانتے رہے اور جب انہیں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی وفات کا یقین ہوگیا تو انہوں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو اپنا امام مان لیا۔

ہمارے مؤرخین نے یہ بات غنیمت جانی اور رائی کا پہاڑ بنادیا۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو ''سبعیہ'' (ہفت امامی) یا واقفیہ کے نام سے متعارف کرایا اور خامہ فرسائی کرتے ہوئے کتابوں کے اوراق سیاہ کردیئے۔ ہمارے مؤرخین کو یہ تو دکھائی دیا کہ معدودے چند افراد نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی وفات کا اعتبار نہ کیا لیکن انہیں امام علی رضا علیہ السلام کے حضور یہی افراد سرِتسلیم خم کرتے ہوئے نظر نہ آئے۔

ہمارے مؤرخین کو تو ایک بہانہ چاہئے۔ مثلاً امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند عبداللہ افطح نے جو کہ اپنے والد کے بعد صرف ستر دن تک زندہ رہے، نجانے انہوں نے امامت کا دعویٰ کیا تھا یا نہیں لیکن ہمارے مؤرخین نے نہ صرف ان کی امامت کا تذکرہ کیا بلکہ ان سے منسوب ''فرقۂ افطحیہ'' بھی بنا کر دم لیا۔

ہمارے مؤرخین کا یہ وطیرہ تھا کہ اگر بالفرض ایک کوا بھی امام کی منڈیر پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا تو وہ فرقۂ غرابیہ کے نام سے ایک فرقہ تیار کرنے اور اس کی تاریخ لکھنے پر کمربستہ دکھائی دیتے تھے۔

حقیقتِ حال

ائمۂ اہلبیتؑ کے ادوار میں جس کسی نے بھی ان کی نیابت کا غلط دعویٰ کیا یا ان کے حق میں غلو کیا تو اس وقت کے امام نے ان کے غلط افکار کی پرزور تردید کی اور اس کے پیش کردہ غلط نظریات کو ابتدائی دور میں ہی ختم کردیا۔ جب امام علی رضا علیہ السلام ولی عہد مقرر ہوئے تو آپ نے مامون رشید کے دربار میں مختلف مذاہب

وملل کے علماء سے مناظرے کر کے ہر قسم کے غلط نظریات کو بیخ وبُن سے اُکھاڑ دیا۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے بعد جتنے بھی امام آئے لوگ انہیں ''ابن الرضا'' کے نام سے یاد کرتے تھے اور تمام مسلمان جانتے تھے کہ یہ بزرگوار شیعوں کے امام ہیں۔ اس لئے بنی عباس انہیں اپنے پایۂ تخت میں نظر بند رکھتے تھے اور بنی عباس کے اس اقدام نے بھی ان کے امرِ امامت کو تمام مسلمانوں پر واضح کر دیا تھا۔

امام علی نقی علیہ السلام نے عثمان بن سعید کو اپنا وکیل خاص مقرر کر کے وکلائے خاص کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہی عثمان بن سعید امام حسن عسکری علیہ السلام کے بھی وکیل خاص تھے اور اس دور کے تمام شیعوں کے مرجع تھے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کی وفات کے بعد امام صاحب الزمان عجّل اللہُ تعالیٰ فرجہٗ نے سب سے پہلے اُنہیں اپنا نائبِ خاص مقرر فرمایا اور جب تک وہ زندہ رہے اس وقت تک عالَمِ تشیع کی مرجعیت ان کے پاس رہی۔ ان کی وفات سے کچھ دن قبل امام صاحب الزمان عجّل اللہُ تعالیٰ فرجہٗ نے اپنے ایک فرمان کے تحت ان کے فرزند محمد بن عثمان بن سعید کو اپنا نائب خاص مقرر فرمایا۔ ان دو بزرگوں کے بعد حسین بن رَوح اور ان کے بعد علی بن محمد سمری امام صاحب الزمان عجّل اللہُ تعالیٰ فرجہٗ کے نائب خاص مقرر ہوئے۔

(یہ چاروں بزرگ ''نوابِ اَربعہ'' کہلاتے ہیں۔ علی بن محمد سمری کی وفات کے بعد نائبینِ خاص کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔)

ائمۂ اہلبیتؑ کے اس حکیمانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اسماعیلیوں کے علاوہ (جو کہ شیعہ نہیں تھے اور ائمۂ اہلبیتؑ کے مخالف تھے بعد میں وہ اسلام کے بھی مخالف بن گئے) شیعوں کا کوئی قابلِ ذکر فرقہ جنم نہ لے سکا۔

زیدیہ حضرت زید کی شہادت کے ایک عرصے بعد پیدا ہوا۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس فرقے کا آغاز کب ہوا۔ زیدیہ کو مسلمانوں کا فرقہ کہا جاسکتا ہے لیکن شیعوں کا فرقہ کہنا صحیح نہیں ہے۔

ائمۂ اہلبیتؑ کے دوُر میں تالیف کا سلسلہ شروع ہوا اور اُصولِ اَربعمأۃ کے نام سے چار سو رسائل مرتب ہوئے۔ اس کے بعد اَور کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور ان رسائل کے ذریعے ائمۂ اہلبیتؑ نے اپنے پیروکاروں کو اسلامی فکر و دانش سے متعارف کرایا اور ان کے پیروکار اثنا عشری کہلائے۔ تمام شیعوں کا بارہ اماموں پر ایمان ہے جن میں سے گیارہ امام شہید ہو چکے ہیں اور بارھویں امام پردۂ غیبت میں ہیں اور تمام شیعہ ان کی غَیبَت پر ایمان رکھتے ہیں اور سنتِ رسولؐ کو ان ہی ائمہ طاہرینؑ سے حاصل کرتے ہیں۔

یہاں تک ہم نے ان فکری اختلافات کا تذکرہ کیا جن کا تعلق ائمۂ اہلبیتؑ کے دور سے تھا اور اب ہم ان فکری اختلافات کا تذکرہ کریں گے جو غَیبتِ کبریٰ کے زمانے میں پیدا ہوئے۔

غَیبَتِ کُبریٰ میں مکتبِ اہلبیتؑ کے فکری اختلافات

ہمارے سابقہ بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ ائمہٴ اہلبیتؑ نے اپنے اپنے زمانے میں شیعوں کو ہر قسم کی فکری پریشانیوں سے محفوظ رکھا اور ان کے بعد ان کے مکتب کے تربیت یافتہ علماء کی تبلیغات سے شیعہ ہر قسم کے فکری انتشار سے محفوظ رہے۔ جب بارھویں امام کی غیبتِ کبریٰ شروع ہوئی تو تشیّع کے متعلق دو امور تمام مسلمانوں پر واضح ہو چکے تھے:

(۱) ہر شخص شیعوں کے بارہ اماموں کے نام و نسب سے واقف ہو چکا تھا۔[۱]

(۲) تشیّع کے افکار و نظریات (جو کہ اسلام ناب محمدیؐ کی ترجمانی پر مشتمل ہیں اور جس میں تفسیرِ قرآن اور سنتِ رسولؐ کو خصوصی مقام حاصل ہے) بارہ اماموں اور ان کے شاگردوں کے توسّط سے عام ہو چکے تھے اور ان کے متعلق کئی چھوٹی بڑی کتابیں تالیف ہو چکی تھیں جو مسلمانوں کی دسترس میں تھیں۔

ان ہی دو اسباب کی وجہ سے غَیبتِ مہدیؑ تا ظہورِ مہدیؑ شیعوں میں فرقہ بندی کا امکان ختم ہو گیا لیکن احادیثِ اہلبیتؑ کے سمجھنے میں نظریاتی اختلاف کا پیدا ہونا فطری تھا اس لئے شیعوں میں فہمِ حدیث کے حوالے سے اخباری اور اصولی نام کے دو مکتبِ فکر پیدا ہوئے۔

اخباری اور اصولی

اخباری اور اصولی علماء کے درمیان اختلاف اس لئے ہوا کہ علمائے اصول نے مکتبِ خلفاء کی چند اصطلاحات استعمال کیں جس کے سبب مکتبِ اہلبیتؑ کے کچھ محدّثین علمِ اصول سے ہی متنفر ہو گئے اور علمِ اصول کے تمام مسائل کو انہوں نے مکتبِ خلفاء کے افکار کا نتیجہ قرار دیا جبکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔

مکتبِ اہلبیتؑ کے اصولی علماء نے کچھ اصطلاحات مکتبِ خلفاء سے ضرور نقل کی ہیں لیکن ان کے ہاں ان کا وہ مفہوم نہیں تھا جو مکتبِ خلفاء میں رائج تھا۔ مثلاً لفظ ''مجتہد'' مکتبِ خلفاء میں بھی استعمال ہوتا ہے اور مکتبِ اہلبیتؑ کے اصولی علماء کے ہاں بھی لیکن دونوں کے مفہوم میں بڑا تفاوت ہے۔

مکتبِ خلفاء میں مجتہد وہ ہوتا ہے جو خدا اور رسولؐ کے احکام کے مقابلے میں اپنی رائے پیش کرے اور اپنی رائے کو نص پر فوقیت دے جبکہ مکتبِ اہلبیتؑ کے اصولی علماء کے نزدیک مجتہد وہ ہے جو قرآن و سنت سے

۱۔ اہلسنت میں سے سبط ابن جوزی حنفی نے تذکرہٴ خواص الامۃ میں اور عبدالکریم شہرستانی نے الملل والنحل ج۱، ص۱۷۳ میں ان کے حالات تحریر کئے ہیں۔

احکام شرعی کا استنباط کرے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لفظ فقیہ کو جو کہ وسیع معانی پر مشتمل ہے، مجتہد کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

علمائے اصول نے جہاں مکتب خلفاء کی اصطلاحات استعمال کی ہیں وہیں ہمارے محدّثین نے بھی مکتبِ خلفاء کی اس روش کو اپنایا ہے کہ جس طرح مکتبِ خلفاء کے محدّثین نے صِحاح سِتّہ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن ابوداؤد اور سنن نسائی) کی تمام احادیث کو صحیح قرار دیا اسی طرح ہمارے محدّثین نے بھی کُتبِ اَربعہ (کافی، من لایحضرہ الفقیہ، تھذیب اور استبصار) کی جملہ روایات کو صحیح قرار دیا۔[1]

ہمارے محدّثین نے اس روش کو اپنایا جبکہ اس مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ علمِ اصول کی تمام اصطلاحات کا گہرا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ کتبِ اربعہ کی جو روایات محکم دلائل اور مکتبِ اہلبیتؑ کی فکر کے مطابق نہ ہوں انہیں چھوڑ دیا جائے اور باقی کو قبول کرلیا جائے۔

کتبِ حدیث کے متعلق صحیح روش یہ ہے کہ تمام احادیث کی سَنَد اور مَتن کا تجزیہ کیا جائے اور جو احادیث ان قواعد کے مطابق ہوں جنہیں پیغمبرِ اکرمؐ اور ان کے اوصیاء نے ''شناختِ حدیث'' کے لئے مقرر کیا ہے ان کو صحیح سمجھا جائے اور باقی کو چھوڑ دیا جائے۔

یہ تھے اخباری اور اصولی علماء کے اختلاف کے دونمونے جو ہم نے اوپر پیش کئے۔

ہماری اس وضاحت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اخباری اور اصولی دو علیحدہ علیحدہ فرقے نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک ہی مکتب کے پیرو ہیں۔ ان کا اختلاف کتاب وسنت سے استنباط کے طریقوں پر ہے۔ یہاں ہم یہ بھی بتادیں کہ یہ اختلاف سابقہ زمانے میں پایا جاتا تھا لیکن آج کل اَخباریّین نہیں پائے جاتے اور انہیں ''جماعتِ محدّثین'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

خلاصۂ بحث

بعداز رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسلمان (۱) مکتبِ خلفاء اور (۲) مکتبِ اہلبیتؑ میں تقسیم ہوگئے۔

(۱) **مکتبِ خلفاء** کے مطابق خدا و رسولؐ نے بعدِ رسولؐ امت کی رہبری کا کام امت کے سپرد کیا تھا اور انہیں یہ اختیار دیا تھا کہ وہ اپنی رائے سے رہبر کا انتخاب کرلیں۔ چنانچہ مکتبِ خلفاء کے علماء پہلے خلیفہ سے لے کر ترکی کے آخری عثمانی خلیفہ ۱۳۳۶ھ تک تمام خلفاء کی خلافت کو شریعتِ اسلام کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔ وہ قرآن، سنت رسولؐ اور اجتہاداتِ صحابہ کو بالعموم اور خلفائے ثلاثہ کے اجتہادات کو بالخصوص اسلام کا مأخذ ومنبع سمجھتے ہیں اور سنتِ رسولؐ کے متعلق تمام صحابہ کو عادل سمجھ کر ان سے سنت حاصل کرتے ہیں۔

۱۔ تفصیل کے لئے معالم المدرستین کی جلد سوم میں باب رأی المدرستین فی تقسیم الحدیث کا مطالعہ فرمائیں۔

(۲) **مکتبِ اہلبیتؑ** میں قرآن وسنت کو ہی مأخذ ومنبع سمجھا جاتا ہے۔ سنتِ رسولؐ معلوم کرنے کیلئے وہ بارہ اماموں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان کے علاوہ مومن صحابہ کی احادیث بھی قبول کرتے ہیں۔

قرنِ اول کی چوتھی دہائی میں دونوں مکاتب میں سے کچھ افراد جدا ہوئے جنہوں نے تمام مسلمانوں کو کافر اور مشرک کہا اور تلوار لے کر میدان میں نکل آئے۔ انہوں نے تمام مسلمانوں کو بلاتفریق گردن زدنی قرار دیا۔ اس فرقے کو ''خوَارِج'' کہا جاتا ہے۔

مکتبِ خلفاء کی کوکھ سے عقائد کے متعلق مختلف الخیال فرقے وجود میں آئے جن میں سے صرف معتزلی، اشعری اور سلفی فرقے پیدا ہوئے اور سلفی کے بطن سے وہابی پیدا ہوئے۔

احکام کے متعلق مکتبِ خلفاء میں مالکی، حنفی، شافعی اور حنبلی فرقے نمودار ہوئے۔

مکتبِ اہلبیتؑ میں اختلاف کو حیاتِ ائمہؑ اور غَیبَتِ کبریٰ کے ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ائمہ کے دور میں کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ کسی امام نے شہادت پائی تو اس کے کچھ پیروکار جنہیں حدیثِ رسولؐ اور اوصیائے رسولؐ کی پوری معرفت حاصل نہ ہوتی تھی پریشانی کا شکار ہو جاتے تھے لیکن جب ان میں سے کچھ دانا افراد کا بعد والے امام سے تعارف ہوتا تھا تو ان کا تذبذب ختم ہوجاتا تھا۔ ائمۂ اہلبیتؑ اپنے ماننے والوں کو اسلامی عقائد و احکام سے ہمیشہ باخبر رکھا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی زندگی میں شیعوں میں فرقہ بندی نہ ہوسکی۔ جب بارہویں امام پردۂ غَیبَت میں چلے گئے تو اس وقت تک لوگ بارہ اوصیاء کے نام ونسب سے واقف ہوچکے تھے اور امامِ زمانہؑ کی غَیبَت کے وقت مکتبِ اہلبیتؑ کے پیروکار علماء چھوٹی بڑی سیکڑوں کتابیں تالیف کر چکے تھے جن میں تمام اسلامی علوم کو جمع کیا گیا تھا۔ مکتبِ اہلبیتؑ کی کتابیں نہ صرف غَیبَت کے وقت موجود تھیں بلکہ آج بھی موجود ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک موجود رہیں گی۔ یوں جب ائمۂ اہلبیتؑ کا تبلیغی کام مکمل ہوگیا تو غَیبَتِ کبریٰ کا دَور شروع ہوا۔

اس بیان سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ائمۂ اہلبیتؑ کی خصوصی توجہ کے سبب ان کے پیروکار ہر طرح کی تفرقہ اندازی سے محفوظ رہے اور ان میں باقاعدہ کوئی فرقے نہ بن سکے۔

جہاں تک زیدیوں اور اسماعیلیوں کی بات ہے تو حقیقت بس اتنی سی ہے کہ زیدیہ کے گمنام بانی نے مکتبِ اہلبیتؑ سے چند عقائد اور مکتبِ خلفاء سے بیشتر عقائد و احکام اَخذ کیے پھر انہیں مخلوط کر کے زیدیہ فرقہ بناڈالا۔ اس لحاظ سے زیدیہ نہ توسنّی ہیں اور نہ شیعہ۔ انہیں مسلمانوں کا ایک تیسرا متوازی فرقہ سمجھنا چاہئے۔

اسماعیلی فرقے کو مسیلمۂ کذّاب کے پیروکار بنی حنیفہ سے تشبیہ دینا یوں مناسب ہے کہ بنی حنیفہ پہلے مسلمان تھے لیکن جب انہوں نے مسیلمۂ کذّاب کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ نبوت میں شریک

سمجھا تو وہ مرتد ہوگئے اور دائرۂ اسلام سے نکل گئے۔ ان کے اِرتداد کے بعد انہیں مسلمان فرقہ کہنا صحیح نہیں۔ بنی حنیفہ کی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی میں وفات پانے والے ان کے فرزند اسماعیل کو جب انہوں نے اپنا امام مانا تو وہ بھی تشیع کے دائرے سے خارج ہوگئے اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا انہوں نے احکامِ اسلام کے مقابلے میں خودساختہ احکام تیار کئے اور بتدریج اسلام سے خارج ہوگئے۔ بنابریں انہیں مسلمان فرقہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح سے غالیوں کو بھی مسلمان نہیں کہا جاسکتا۔

ان کے علاوہ مذاہب و مسالک کی متعلقہ کتابوں میں سبائیہ، کیسانیہ اور غرابیہ نام کے جو شیعہ فرقے دکھائی دیتے ہیں یہ سب جھوٹ اور بہتان تراشی ہے۔ اس نام کے فرقے دنیا میں کبھی تھے ہی نہیں اور یہ صرف مکتبِ خلفاء کے مؤرخین کی کرشمہ سازی ہے۔ ان کے رویّے کو دیکھ کر ہم عربی کا مشہور مقولہ ہی دہرا سکتے ہیں:

''مَنْ یَخْلُقُ مَایَقُوْلُ، فَحِیْلَتِیْ فِیْهِ ضَعِیْفَةٌ'' یعنی جو شخص منہ پر جھوٹ بولے تو میں اس کا کوئی علاج نہیں کرسکتا۔

دَورِ ائمہ میں مکتبِ اہلبیتؑ کے پیروکاروں کے اختلافات کی یہی نوعیت تھی جو ہم نے بیان کی ہے اور جب بارہویں امام کی غَیبَت ہوئی تو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نزدیک شیعوں کے بارہ امام اتنے مشہور تھے کہ کوئی شخص شیعوں میں امامت کا دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا مگر اس کے باوجود اس بات کا قوی امکان تھا کہ رِیاست اور زَعامَت طَلَب افراد کہیں بارہویں امام کی نیابت کا دعویٰ نہ کردیں اس لئے بارہویں امام نے اپنے چار نائب مقرر کرکے ایسے لوگوں کو ہمیشہ کے لئے مایوس کردیا اور جب چوتھے نائب کی وفات قریب ہوئی تو آپؑ نے اپنی توقیع مبارک کے ذریعے لوگوں کو خبردار کردیا کہ آئندہ ان کا کوئی نائبِ خاص نہیں ہوگا۔

اب اگر کوئی امامِ زمانہؑ کی نیابتِ خاص کا دعویٰ کرے گا تو وہ بہائیوں کی طرح اسلام اور تشیع کے دائرے سے خارج ہوجائے گا اور قادیانیوں کی طرح دائرۂ اسلام و تسنن سے بھی خارج متصور ہوگا۔

ائمۂ اہلبیتؑ کی معرفت اور ان کے علوم کے متعلق چھوٹی بڑی سیکڑوں تصنیفات منظرِ عام پر آچکی تھیں اسی لئے امامت کے متعلق تشیّع میں کسی فرقہ بندی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ البتہ احادیث و روایات کی تحقیق و دلالت کے متعلق بعض شیعہ فقہاء میں اختلافِ نظر ضرور پیدا ہوا اور اس اختلاف کی وجہ سے بعض علماء کو اخباری اور بعض کو اصولی کے نام سے یاد کیا گیا لیکن عصرِ حاضر میں تمام شیعہ فقہاء اصولی ہیں اور اخباری نام کی اس وقت کوئی علیحدہ جماعت موجود نہیں ہے۔

اب ہم اِنشاءَ اللہ یہ بتائیں گے کہ مکتبِ اہلبیتؑ کے پیروکار کس دلیل کے تحت اسلامی عقائد، احکام اور سنّتِ رسولؐ کو ائمۂ اہلبیتؑ سے حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

پیش گفتار اوّل

کتاب خدا میں مقام اہلبیتؑ

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا اے اہلبیتؑ! اللہ کا ارادہ بس یہ ہے کہ تم سے ہر ناپاکی کو دور رکھے اور تمہیں اس طرح سے پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔ (سورۂ احزاب: آیت ۳۳)

قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی (اے رسولؐ!) کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا بجز یہ کہ تم میرے قرابتداروں سے مودت رکھو۔ (سورۂ شوریٰ: آیت ۲۳)

سنت رسولؐ میں مقام اہلبیتؑ

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رسولؐ پر درود بھیجتے ہیں تو اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجتے رہو اور سلام کرتے رہو۔ (سورۂ احزاب: آیت ۵۶)

تفسیر قرطبی اور دیگر تفاسیر نیز صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں ابو مسعود انصاری سے مروی ہے کہ ہم سعد بن عبادہ کی محفل میں بیٹھے تھے کہ رسول اکرمؐ ہمارے پاس تشریف لائے۔ بشیر بن سعد نے آپ سے پوچھا: یارسول اللہؐ! خدا نے ہمیں آپ پر درود بھیجنے کا حکم دیا ہے پس ہم کس طرح آپ پر درود بھیجیں؟ رسول اللہؐ کچھ دیر خاموش رہے جس کی وجہ سے میں نے سوچا کہ کاش میں نے آپ سے یہ سوال نہ پوچھا ہوتا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ وَ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ فِی

الْعَالَمِیْنَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ خدایا! محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود بھیج جیسا کہ تو نے آلِ ابراہیم پر درود بھیجا اور محمدؐ و آلِ محمدؐ پر برکت نازل فرما جیسا کہ تو نے تمام جہانوں میں آلِ ابراہیم پر برکت نازل فرمائی۔ بے شک تو لائقِ حمد اور صاحبِ عزّت ہے۔

اور سلام جیسا کہ تم سیکھ چکے ہو ویسے ہی کہو۔[1]

سُننِ ترمذی میں ہے کہ اس بارے میں دوسرے صحابہ: علی، ابوحمید، کعب بن عُجْرہ، طلحہ بن عبیداللہ، ابوسعید، زید بن حارثہ اور بریدہ سے بھی احادیث مروی ہیں۔

ترمذی لکھتے ہیں کہ یہ حدیث حسن و صحیح ہے۔

نیز صواعق المحرقہ فِی الردِ علیٰ اھلِ البدعۃِ والزندقہ تالیف ابن حجر مکی ہیثمی المتوفی ۹۷۴ھ اور جواہر العقدین سمہودی المتوفی ۹۱۱ھ میں منقول ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ نے فرمایا: مجھ پر ناقص درود نہ بھیجو۔ پوچھا گیا کہ یارسول اللہ! ناقص درود کیسا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ناقص درود یہ ہے کہ تم "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ" (یا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ بَارِکْ وَسَلِّمْ) کہہ کر خاموش ہوجاؤ۔ ایسا مت کرو بلکہ تم کہو: "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ۔"

ان احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ جب بھی رسولِ پاکؐ پر درود بھیجا جائے تو اس کے ساتھ ان کی آلِ پاکؑ پر درود بھیجنا سنّتِ نبوی ہے جبکہ کچھ مسلمانوں نے اسے ترک کردیا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتے۔

۱۔ دیکھئے صحیح بخاری، کتاب الانبیاءؑ، باب یزفون النسلان فی المشی، ج ۳، ص ۱۵۹۔ کتاب الدعوات، باب الصلاۃ علی النبیؐ و باب ھل یصلی علی غیر النبی، ج ۴، ص ۷۲۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ علی النبیؐ بعد التشھد، حدیث ۶۵، ۶۶، ۶۹، ص ۳۰۵۔ سنن ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ علی النبیؐ بعد التشھد، ج ۱، ص ۲۵۷۔ سنن نسائی، کتاب السھو، باب الامر بالصلاۃ علی النبیؐ، مطبوعہ بیروت، ج ۳، ص ۴۵ و باب کیف الصلاۃ علی النبیؐ، مطبوعہ بیروت، ج ۳، ص ۴۷ تا ۴۹۔ سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ، باب الصلاۃ علی النبیؐ، ج ۱، ص ۲۹۲ تا ۲۹۳، حدیث ۹۰۳ اور ۹۰۶۔ سنن ترمذی، کتاب الوتر، باب ماجاء فی صفۃ الصلاۃ علی النبیؐ، ج ۱، ص ۱۷۹ و کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الاحزاب، آیت ۵۶، ج ۱۲، ص ۹۵۔ سنن دارمی، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ علی النبیؐ، ج ۱، ص ۳۰۹۔ موطا مالک، کتاب السفر، باب ماجاء فی الصلاۃ علی النبیؐ، ج ۱، ص ۱۷۹۔ مسند احمد، ج ۱، ص ۱۶۲، ج ۳، ص ۴۷، ج ۴، ص ۱۱۸، ۱۱۹، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۴، ج ۵، ص ۲۷۴۔

آئندہ مباحث کے بنیادی نکات

سابقہ مباحث میں ہم نے سنتِ پیغمبرؐ [۱] کے متعلق خلفاء کے رویّے کا تفصیلی جائزہ لیا اور اب احیائے سنت کے متعلق ائمۂ اہلبیتؑ کے کردار کا جائزہ لیں گے اور ہمارا جائزہ چار نکات پر مشتمل ہوگا جن کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) رسولِ اکرمؐ نے قیامت تک آنے والے انسانوں کی رہنمائی کے لئے قرآن مجید کی تفسیر، اپنی سنت اور ایسے تمام علوم و معارف جو انسان کو اوجِ کمال تک پہنچاتے ہیں، امام علیؑ کو تعلیم فرمائے تھے اور ان کے توسط سے یہ علوم و معارف ان کی نسل کے گیارہ ائمہؑ تک یکے بعد دیگرے پہنچے۔ اس مقصد کے لئے رسولِ اکرمؐ نے پوری زندگی امام علیؑ کی خصوصی تربیت فرمائی تھی۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے تبلیغِ اسلام کو قیامت تک باقی رکھنے کے لئے امام علیؑ اور ان کے گیارہ فرزندوں کو اوصیائے پیغمبرؐ کے عنوان سے معیّن فرمایا۔ پیغمبرِ اسلامؐ چاہتے تھے کہ قیامت تک آنے والے تمام لوگ جان لیں کہ دین کے ہادی و رہبر کون ہیں اور ان کے درد کی دوا کس کے پاس ہے؟ بحکمِ خدا رسولِ خداؐ نے واضح بیانات کے ذریعے لوگوں کو بارہ اماموں کی پہچان کرائی۔ امامت کے واضح بیان سے ہی تبلیغِ دین کا کام مکمل ہوا اور تمام انسانوں پر خدا کی نعمت پوری ہوئی۔

(۳) پیغمبرِ اکرمؐ کی وفات کے بعد آپ کے اوصیاء نے تین صدیوں تک پوری جانفشانی اور جدوجہد سے قرآن مجید کی تفسیر، سنتِ پیغمبرؐ اور اسلام کے عقائد و احکام پر سے تحریف کے پردوں کو ہٹایا اور اللہ تعالیٰ کی توفیقات سے قرآن مجید کی صحیح تفسیر اور سننِ اسلامی اور علوم و معارفِ الٰہی کو لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔

(۴) ائمۂ ہدیٰ میں سے ہر امام نے اپنے اپنے دور میں اسلام کے تحفظ کی بھرپور کوششیں کیں تاکہ اسلام تمام لوگوں تک پہنچ سکے اور یہ دین قیامت تک جاری رہ سکے۔

رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد جن لوگوں نے مکتبِ خلفاء کی بنیاد رکھی تھی انہوں نے حیاتِ رسولؐ میں ہی لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ حدیثِ رسولؐ مت لکھا کرو کیونکہ وہ بھی انسان ہیں اور خوشی اور ناراضگی کی حالت میں

۱۔ رسولِ اکرمؐ کا قول و عمل ''سنت'' ہے لیکن مکتبِ خلفاء میں خلفائے ثلاثہ کا عمل بھی رسولِ اکرمؐ کے عمل کی طرح اہمیت رکھتا ہے۔ (امام) مالک بن انس عملِ پیغمبرؐ کی طرح عملِ خلفاء کو بھی اسلامی احکام کا ماخذ جانتے ہیں جبکہ مکتبِ اہلبیتؑ بارہ اوصیائے پیغمبرؐ کے فعل کو سنتِ پیغمبرؐ کا کاشف سمجھتا ہے۔

کئی باتیں ان کے منہ سے نکلتی ہیں۔

جب رسولِ اکرمؐ نے زندگی کے آخری لمحات میں ارادہ کیا کہ ایک ایسی تحریر لکھ جائیں جس کی موجودگی میں امت قیامت تک گمراہی سے محفوظ رہ سکے اور اس کام کے لئے کاغذ اور قلم دوات طلب فرمائی تو مکتبِ خلفاء کے بانیوں نے کہا: ''رسول اللہؐ پر بیماری کا غلبہ ہے اور آپ ہذیان کہہ رہے ہیں۔ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔''

آہ! یہ کتنا دردناک سانحہ تھا!!!

وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد ان لوگوں نے حدیث کی نشر و اشاعت پر پابندیاں عائد کردیں اور یہ پابندیاں ایک صدی تک قائم رہیں۔ پہلی صدی کی پہلی چوتھائی میں ایسا وقت بھی آیا جب حدیثِ رسولؐ بیان کرنے والے صحابہ کو سخت سزائیں دی گئیں۔

حدیثِ پیغمبرؐ سنتِ نبوی کا اساسی رکن ہے مگر مکتبِ خلفاء میں اس اساسی رکن کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اس کے برعکس مکتبِ اہلبیتؑ میں حدیث کو یاد کرنے اور اس کی نشر و اشاعت پر روزِ اول سے ہی توجہ دی گئی۔ انشاء اللہ اس کی تفصیل آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔

یہاں یہ بتانا انتہائی ضروری ہے کہ ہم مذکورہ امور کے اِثبات کے لئے مکتبِ اہلبیتؑ کی کتب کا حوالہ دیں گے کیونکہ صحیح علمی روش کا یہی تقاضا ہے اور مکتبِ اہلبیتؑ کی روایات کی تائید کے لئے مکتبِ خلفاء کی کتابوں کا حوالہ حاشیہ میں دیں گے جبکہ اس سے قبل مکتبِ خلفاء کے امور کی وضاحت کے لئے ہم نے ان کی معتبر کتابوں کے حوالے دیئے تھے۔

مکتبِ اہلبیتؑ میں سرگزشتِ حدیث

مکتبِ اہلبیتؑ نے پیغمبرِ اکرمؐ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی حدیث کی نشر و اشاعت کا آغاز کر دیا تھا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حقائقِ اسلام اور احکامِ اسلام کی بنیاد قرآن حکیم پر ہے اور اس کی تشریح، توضیح اور تفصیل حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اسلام کے اولین مبلغین کی ذمہ داری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شارعِ مقدس اسلام پر جو وحی فرمائی آپؐ نے اس کی مکمل تشریح و توضیح اور قیامت تک پیش آنے والے اسلامی احکامات کے متعلق امام علیؑ کو تعلیم دی تھی۔ آپؐ نے اپنی تعلیم کو صرف زبانی حد تک ہی محدود نہیں رکھا تھا بلکہ امام علیؑ کو وہ تعلیمات لکھوا دی تھیں اور انہوں نے ان کو مدوّن فرمایا تھا۔

پیغمبرِ اکرمؐ نے دو طرح کی مجالس میں امام علیؑ کو تعلیمات منتقل کی تھیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

الف۔ باقاعدہ مجالسِ تعلیم

امام علیؑ، پیغمبرِ اکرمؐ سے علم سیکھنے کیلئے روزانہ خصوصی وقت لیا کرتے تھے جس کی تفصیل بہت سی کتابوں میں خود ان ہی کی زبانی منقول ہے۔ بطورِ نمونہ ہم کتاب "کافی" سے آپؑ کی بیان کردہ گفتگو نقل کرتے ہیں:

میں روزانہ ایک مرتبہ دن اور ایک مرتبہ رات کے وقت رسولِ اکرمؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا تھا۔ اس وقت آپؐ مجھ سے خلوت میں گفتگو کیا کرتے تھے اور آپؐ جہاں بھی جاتے تھے میں آپؐ کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا اور تمام صحابۂ رسولؐ جانتے تھے کہ میرے سوا رسولِ اکرمؐ کسی سے بھی اس طرح کی نشست و برخاست نہیں رکھتے تھے۔

ہماری یہ ملاقاتیں اکثر و بیشتر میرے گھر پر ہی ہوتی تھیں۔ آپ میرے ہاں تشریف لاتے اور میں بھی آپ کے گھر جایا کرتا۔ جب میں آپ کے ہاں جاتا تو آپ جس زوجہ کے حجرے میں ہوتے میرے آتے ہی انہیں حجرے سے باہر بھیج دیتے اور مجھ سے خلوت میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس گفتگو میں میرے علاوہ کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب آنحضرتؐ میرے ہاں تشریف لاتے اور مجھ سے راز و نیاز کی باتیں کرتے تو

فاطمہؑ میرے پہلو میں بیٹھی رہتی تھیں۔ آپ نہ تو فاطمہؑ کو گھر سے باہر جانے کا کہتے اور نہ ہی حسنؑ وحسینؑ کو۔ میں ان ملاقاتوں میں جو کچھ آپ سے دریافت کرتا تھا آپ اس کا مکمل جواب دیتے تھے اور جب میں خاموش ہو جاتا اور میرے سوالات پورے ہو جاتے تو آپ اپنی طرف سے گفتگو کا آغاز فرماتے تھے۔

قرآن مجید کی کوئی آیت ایسی نہیں جو اللہ کے رسولؐ پر اُتری ہو مگر یہ کہ آپؐ نے اسے میرے سامنے تلاوت فرمایا اور اس کی وضاحت کی یہاں تک کہ میں نے اسے لکھ لیا اور آپؐ نے مجھے قرآن کی تاویل، تفسیر، ناسخ، منسوخ، محکم، متشابہ اور خاص و عام کی تعلیم دی اور آپ نے خداوندِ علیٰ اعلیٰ سے دعا کی مجھے اس کے فہم اور یاد رکھنے کی طاقت عطا فرمائے۔ رسول اللہؐ کی دعا کی برکت سے میں نے کتاب خدا کی جس آیت اور جس مطلب کو لکھا اسے کبھی فراموش نہ کیا۔

کافی کی روایت ابھی جاری ہے لیکن ہم اس روایت کو یہیں پر روک رہے ہیں اور حضرت زید بن علی بن حسین (المتوفی ۱۲۰ھ) کی زبانی امام علیؑ کا فرمان نقل کرتے ہیں جس سے بہت سے اذہان میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب بھی مل جائے گا۔ روایت یوں ہے :

حضرت زید بن علی نے کہا کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا: میں اس وقت تک سوتا نہیں تھا جب تک رسولِ خداؐ مجھے ان باتوں کی تعلیم نہ دیتے جو اس دن جبریلؑ حلال و حرام، سنت اور امر و نہی کے بارے میں لیکر آئے تھے اور آپ ہر آیت کے متعلق مجھے خبر دیتے تھے کہ یہ آیت کس چیز یا کس شخص کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

جب حضرت زید نے امام علیؑ کا یہ فرمان نقل کیا تو کسی نے ان سے کہا: جب رسولِ خداؐ اور امام علیؑ ایک دوسرے سے دور ہوتے تھے اور دونوں کے درمیان مکان کا فاصلہ ہوتا تھا تو پھر رسولِ خداؐ ہر روز کی وحی کے متعلق امام علیؑ کو کیسے تعلیم دیتے تھے؟

حضرت زید نے جواب میں کہا: جس دن رسولِ مختارؐ اور ان کے وصی کی ملاقات نہ ہوتی تو آنحضرتؐ مطالبِ وحی کو محفوظ رکھتے اور جب بھی ملاقات ہوتی تو فرماتے کہ ''اے علیؑ! فلاں دن مجھ پر فلاں بات نازل ہوئی اور فلاں دن مجھ پر فلاں مطلب نازل ہوا۔'' اِس طرح رسولِ خدا کہفُ الوریٰؐ ان تمام دنوں کی رُو داد امام علیؑ سے بیان فرما دیتے تھے۔[1]

اب کافی کی روایت کا اگلا حصہ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ بصائر الدرجات، ص ۱۹۷، حدیث ۳۔ اس حدیث کی تائید کتبِ خلفاء کی ان تین روایات سے ہوتی ہے: سنن نسائی، ج ۱، ص ۱۷۸، باب التنحنح فی الصلاۃ۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، باب الاستئذان، حدیث ۳۷۰۸۔ مسند احمد، ج ۱، ص ۸۵، حدیث ۶۴۷ اور ج ۱، ص ۱۰۷، حدیث ۸۴۵، ج ۱، ص ۸۰، حدیث ۶۰۸۔ تاریخ بخاری، ۱۳۱/۲/۳۔

رسولِ اکرمؐ اللہ تعالیٰ کے تمام اوامر و نواہی، حلال و حرام خواہ ان کا تعلق موجودہ زمانے سے ہوتا تھا یا آنے والے زمانے سے، میرے لئے بیان فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ سابقہ آسمانی کتابوں میں جو کچھ انبیاء و مرسلینؑ پر نازل ہوا تھا آنحضرتؐ اس کی بھی مجھے تعلیم دیتے تھے اور سابقہ امتوں کی اطاعت و معصیت سے بھی باخبر فرماتے تھے۔ میں نے ان تمام باتوں کو یاد کرلیا اور ان کا ایک حرف بھی کبھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد رسولِ خداؐ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور خدا سے دعا فرمائی کہ وہ میرے دل کو علم و فہم اور حکمت و نور سے بھردے۔[1]

یہ تھا امام علیؑ اور رسولِ خداؐ کی باقاعدہ اور روزمرّہ مجالس کا خلاصہ۔

ب۔ غیر منظّم مجالسِ تعلیم

سابقہ بحث سے معلوم ہوا کہ امام علیؑ اور رسول خداؐ کے درمیان روزمرّہ کی منظّم تعلیمی مجالس منعقد ہوتی تھیں جو کہ روزانہ دو بار ہوا کرتی تھیں۔ ان مجالس کے علاوہ رسولِ خداؐ بعض اوقات خصوصی طور پر بھی امام علیؑ کو حقائق و معارف کی تعلیم کے لئے وقت دیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں سننِ ترمذی اور مکتبِ خلفاء کی دیگر مستند کتب کی یہ حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

ترمذی لکھتے ہیں:

جابر بن عبداللہ انصاری[2] نے کہا: جنگِ طائف میں رسولِ خداؐ نے علیؑ کو بلایا اور ان کے ساتھ سرگوشی کرنے لگے۔ صحابہ نے (ازراہِ اعتراض) کہا: رسولِ خداؐ کی اپنے ابن عم کے ساتھ سرگوشی کتنی لمبی ہوگئی ہے۔ جب لوگوں کی یہ بات رسولِ خداؐ نے سنی تو فرمایا کہ میں نے نہیں بلکہ اللہ نے اس سے سرگوشی کی ہے۔[3]

۱۔ ثقۃ الاسلام شیخ کلینی، الکافی، ج۱، ص۶۲۔۶۳۔ علامہ شیخ حر عاملی، وسائل الشیعہ (طبع قدیم)، ج۳، ص۳۹۴، حدیث۱۔ مستدرک الوسائل، ج۱، ص۳۹۳۔ طبرسی، احتجاج، ص۱۳۴۔ حسن بن علی بن حسین بن شعبہ حرانی، تحف العقول عن آل الرسولؑ، ص۱۳۱۔ ملامحسن فیض کاشانی، وافی، ج۱، ص۶۳۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، مرآۃ العقول فی شرح اخبار آل الرسولؑ، ج۱، ص۲۱۰۔

طبقات ابن سعد در حالات حضرت علیؑ، ۱۰۱/۲/۲ میں اس حدیث کی تین مؤید احادیث موجود ہیں اور ان میں سے ایک حدیث (امام) احمد بن حنبل کی قلمی کتاب ''فضائل علی بن ابی طالبؑ'' میں بھی مروی ہے۔

۲۔ یہ وہی جابر ہیں جنھوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے ملاقات کی تھی۔ حضرت جابر نے ۷۰ھ کے بعد وفات پائی تھی۔

۳۔ حافظ محمد بن عیسیٰ ترمذی، سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب امام علیؑ، ج۱۳، ص۱۷۳۔ تاریخ بغداد، ج۷، ص۴۰۲۔ ابن عساکر، تاریخ مدینہ دمشق ج۲، ص۳۱۰۔ حافظ ابن کثیر، تاریخ، ج۷، ص۳۵۶۔ ابن اثیر جزری، اُسد الغابہ، ج۴، ص۲۷۔ یہی روایت جندب بن ناجیہ (یا ناجیہ بن جندب) کی زبانی ملا علی متقی ہندی کی کنز العمال، مطبوعہ حیدرآباد، ۱۳۱۲ھ، ج۶، ص۳۹۹۔ طبع دوم، ج۱۲، ص۲۰۰، حدیث۱۱۲۲ اور محب طبری، الریاض النضرۃ فی مناقب العشرہ، ج۲، ص۲۶۵ میں بھی منقول ہے۔

ترمذی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

نجوائے الٰہی سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرمؐ کو امام علیؑ کے ساتھ سرگوشی کرنے کا حکم دیا تھا۔

آیئے دیکھیں کہ آخروہ ایسا کون سا مسئلہ تھا جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کو امام علیؑ کے ساتھ سرگوشی کرنے کا حکم دیا تھا؟

اس سلسلے میں ایک امکان یہ ہوسکتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ جنگ میں مصروف تھے اور آپ نے امام علیؑ سے جنگی پالیسی کے متعلق سرگوشی کی ہو۔ مگر یہ امکان صحیح نہیں ہے کیونکہ رسولِ خداؐ کا یہ معمول تھا کہ آپؐ جنگ کے متعلق تمام صحابہ سے مشورہ کرتے تھے۔ آپ نے کسی بھی جنگ کے موقع پر کسی فردِ واحد سے مشورہ نہیں کیا۔ جنگِ بدر، اُحد اور خندق کے موقع پر آپ نے ایسا ہی کیا تھا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ آنحضرتؐ اور امام علیؑ کی سرگوشی اسی راز و نیاز کا حصہ تھی جو آپ روزانہ امام علیؑ سے کیا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں دوسرا امکان وہی ہے جس کا تذکرہ حضرت زید بن علی نے کیا تھا کہ اگر چند روز تک نبی اور وصی کی ملاقات نہ ہوتی تو پھر جس دن دونوں بزرگوار ملتے تو اس دن رسولِ خداؐ باقی تمام دنوں کی وحیٔ الٰہی اور اوامر و نواہی کے متعلق امام علیؑ کو مطلع کیا کرتے تھے اور عین ممکن ہے کہ جنگِ طائف میں حضورِ اکرمؐ اور امام علیؑ کی سرگوشی کا تعلق بھی اسی قسم سے ہو۔[1]

رسولِ خداؐ اور امام علیؑ کی باقاعدہ یا قاعدے سے ہٹ کر ملاقاتوں اور راز و نیاز کا مقصد صرف یہی ہوتا تھا کہ آپؐ اسلام کے تمام علوم و معارف اور عقائد و احکام امام علیؑ کو خصوصی طور پر سکھاتے تھے۔

آنحضرتؐ نے پہلے وصی کو حکم دیا کہ دُوسرے اَوصِیاء کیلئے اَحکام لکھیں

امالی شیخ طوسی، بصائرالدرجات اور ینابیع المودۃ میں ہے کہ احمد بن محمد بن علی بن امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے آباء کی سَنَد سے روایت کی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے امام علیؑ سے فرمایا: میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے لکھ لو۔

امام علیؑ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! کیا آپ کو اس بات کا خدشہ ہے کہ میں کہیں بھول نہ جاؤں؟

رسولِ خداؐ نے فرمایا: تم نہیں بھولو گے۔ مجھے تمہارے متعلق بھولنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میں نے خدا سے دعا کی ہے کہ ان علوم کو بہتر حافظے میں رکھے اور تمہیں نسیان میں مبتلا نہ کرے تم اپنے (امرِ امامت میں)

۱۔ اس طرح کی راز و نیاز کی خصوصی مجالس کا اشارہ سورۂ مجادلہ کی آیت نجویٰ یعنی آیت ۱۲ اور ۱۳ میں بھی کیا گیا ہے۔ مزید تحقیق کے لئے معالم المدرستین، ج ۱، ص ۳۲۲ دیکھئے۔

شریک افراد کے لئے لکھو۔

امام علیؑ نے پوچھا: یارسول اللہؐ! میرے شریک کون ہیں؟

رسولِ خداؐ نے فرمایا: وہ امام تمھارے شریک ہیں جو تمھاری نسل سے ہوں گے۔ ان کی برکت سے میری امت پر بارانِ رحمت برسے گی اور ان کے واسطے سے میری امت کی دعائیں قبول ہوں گی۔ ان کے وجود کی برکت سے خدا میری امت سے بلاؤں اور آفتوں کو دور کرے گا اور ان کی وجہ سے آسمان سے رحمتِ الٰہی نازل ہوگی۔ پھر رسولِ خداؐ نے اپنی انگشتِ مبارک سے امام حسنؑ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ ان میں کا پہلا فرد ہے۔ پھر آپؐ نے امام حسینؑ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: امام اس کی نسل سے ہوں گے۔" [1]

تبلیغ کی دو قسمیں

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے پیغمبرؐ پر نازل فرمایا ابلاغ کے لحاظ سے اسے دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا حصہ ان مطالب و مفاہیم پر مشتمل تھا کہ زمانہ اور وقت جن کے ابلاغ کا متقاضی تھا اور ان کے بیان کے لئے مناسب شرائط اور حالات موجود تھے۔ ایسے امور کی تبلیغ رسولِ خداؐ بنفسِ نفیس اور کسی واسطے کے بغیر خود فرماتے تھے۔ دوسرا حصہ ان مطالب و مفاہیم پر مشتمل تھا جن پر عمل کا ابھی زمانہ نہیں آیا تھا۔ ایسے امور کے لئے رسولِ خداؐ نے صرف امام علیؑ کو ہی تعلیم دی تھی اور امام علیؑ نے دونوں طرح کے احکام و مطالب کو علیحدہ علیحدہ کتابوں میں تحریر کیا تھا۔

گردشِ لیل و نہار یونہی جاری رہی حتیٰ کہ دونوں دوستوں کی جدائی کا وقت آ گیا۔ وصیؑ اور نبیؐ کی جدائی کے لحات قریب سے قریب تر ہوگئے تو رسولِ خداؐ نے اپنی زندگی کے آخری لحات میں امام علیؑ سے انتہائی اہم نشست کی اور تعلیماتِ الٰہی کا آخری حصہ بھی ان کے سپرد کیا۔

آخری تعلیمی نشست

عبداللہ بن عمرو بن عاص کا بیان ہے:

رسولِ خداؐ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا کہ میرے بھائی کو میرے پاس بلاؤ۔ امام علیؑ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسولِ خداؐ نے اپنی چادر علیؑ پر ڈالی اور انھیں اپنے انتہائی قریب کیا پھر ان سے بڑی

۱۔ امالی طوسی (مطبوعہ نعمان، نجف ۱۳۸۴ھ، ج ۲، ص ۵۶۔ بصائر الدرجات، ص ۱۶۷۔ سلیمان ابراہیم قندوزی، ینابیع المودۃ، مطبوعہ دار الخلافۃ العثمانیہ، ۱۳۰۲ھ، ص ۲۰۔

آہستگی کے ساتھ گفتگو کی۔[1]

حضرت ام سلمہؓ نے اس داستان کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: اس ذات کی قسم! جس کی میں قسم کھایا کرتی ہوں۔ رسولِ خداؐ سے آخری گفتگو کرنے والے علیؑ ہی تھے۔ صبح کے وقت ہم آنحضرتؐ کی عیادت میں مصروف تھیں۔ آپ بار بار پوچھتے تھے کہ کیا علیؑ آگئے؟ کیا علیؑ آگئے؟ حضرت فاطمہؑ نے کہا: تو کیا آپ نے انہیں کسی کام سے بھیجا ہوا ہے؟

پھر کچھ دیر بعد علیؑ آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ آنحضرتؐ کو علیؑ سے کوئی کام ہے۔ اس لئے میں دوسری ازواج کے ساتھ حجرے سے باہر آگئی اور ہم دروازے کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔ دوسری عورتوں کی نسبت میں حجرے کے زیادہ قریب تھی۔ رسولِ خداؐ نے علیؑ کو اپنے انتہائی قریب کیا اور ان کے ساتھ رازونیاز میں مصروف ہوگئے۔ اسی دن آنحضرتؐ نے وفات پائی۔ اسی لئے آنحضرتؐ سے آخری گفتگو کرنے والے علیؑ تھے۔[2]

اس روایت کو خود امام علیؑ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

''پیغمبرِ خداؐ نے اپنی بیماری کے آخری روز فرمایا کہ میرے بھائی سے کہو کہ میرے پاس آئے۔''

جب میں پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ میرے قریب آجاؤ۔ میں آپ کے قریب گیا۔ اس وقت آپ نے میرا سہارا لیا اور اسی حالت میں آپ مجھ سے گفتگو کرتے رہے (اور آپ مجھ سے اتنے قریب تھے کہ) کسی وقت آپ کے لعابِ دہن کے مبارک قطرات مجھ تک پہنچتے تھے۔ یہاں تک کہ رسولِ خداؐ کے وصال کا وقت آگیا اور آپ نے میری گود میں آخری سانس لی۔[3]

مندرجہ بالا احادیث میں ہم نے دیکھا کہ رسولِ خداؐ نے اسلام کے تمام علوم و معارف امام علیؑ کو لکھوا دیئے تھے اور ایک مدون کتاب کی صورت میں ان کے پاس ودیعت رکھے تھے تاکہ بعد میں آنے والے ائمہؑ کے لئے ایک لکھی ہوئی دستاویز موجود ہو۔

۱۔ ابن عساکر، تاریخ مدینۂ دمشق، مطبوعہ بیروت، ۱۳۹۵ھ، درحالات امام علیؑ، ج۲، ص۴۸۴۔ حافظ ابن کثیر شافعی، تاریخ، ج۷، ص۳۵۹۔ ملا علی متقی ہندی، کنزالعمال، طبع اول، ج۶، ص۳۹۲۔

۲۔ اس حدیث کو حاکم نے مستدرک اور ذہبی نے تلخیص ج۳، ص۱۳۹ میں صحیح کہا ہے۔ اس کے علاوہ مستدرک حاکم، ج۳، ص۱۴ تا ۱۷ میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان یہ ہے ''کان اقرب الناس عهدا برسول اللّٰہ'' اور اس باب میں انہوں نے چند اسناد کے ساتھ روایت کی ہے کہ وقت آخر امام علیؑ ہی آنحضرتؐ کے قریب تر تھے۔ علاوہ ازیں مصنف ابن ابی شیبہ ج۶، ص۳۴۸۔ حافظ علی بن ابی بکر ہیثمی، مجمع الزوائد، ج۹، ص۱۱۲۔ کنزالعمال، طبع دوم، ج۱۵، ص۱۲۸، باب فضائل علی بن ابی طالبؑ، حدیث۳۷۴۔ تذکرہ خواص الامة، باب حدیث النجویٰ والوصیة میں فضائل احمد بن حنبل سے یہی حدیث نقل کی ہے۔

۳۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ باب من قال توفی رسول اللّٰہ فی حجر علیؑ بن ابیطالبؑ، ج۲، ق۲، ص۵۱، مطبوعہ یورپ۔

جامِعۃ ـــــ یا امام علیؑ کی کتاب

بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امام علی علیہ السلام کے پاس کئی ایسی کتابیں تھیں جن میں اسلام کے معارف و احکام درج تھے۔ ہم ان کتابوں میں سے صرف ایک کتاب کے تذکرے پر اکتفا کرتے ہیں جسے احادیث و روایات میں ''جامِعۃ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ کتاب رسولِ خداؐ نے لکھوائی تھی جو امیرالمومنینؑ نے اپنے دست مبارک سے تحریر کی تھی۔ بعض روایات میں ''کتابِ علیؑ'' کے الفاظ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان الفاظ سے بھی یہی کتاب مراد ہوتی ہے۔ اصولِ کافی اور بصائر الدرجات میں ابوبصیر[۱] کا قول درج ہے جسے ہم کافی[۲] سے نقل کرتے ہیں۔

ابوبصیر بیان کرتے ہیں کہ میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: میں آپ پر قربان جاؤں! مجھے آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے۔ یہاں کوئی دوسرا تو ہماری باتیں سننے والا نہیں ہے؟

امامؑ نے ساتھ والے دروازے کا پردہ ہٹایا اور پھر مجھ سے فرمایا: ابومحمد! تمہیں جو کچھ پوچھنا ہو پوچھ لو۔

میں نے کہا: میں قربان جاؤں! آپ کے شیعہ احادیث کے متعلق دعویٰ کرتے ہیں کہ رسولِ خداؐ نے امام علیؑ کے سامنے علم کا ایک دروازہ کھولا تھا اور اسی ایک دروازے سے ایک ہزار دوسرے دروازے کھل گئے تھے۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا: اے ابومحمد! ہمارے پاس جامِعۃ ہے۔ لوگ کیا جانیں کہ جامِعۃ کیا ہے؟

میں نے کہا: میں صدقے جاؤں! جامِعۃ کیا ہے؟

امامؑ نے فرمایا: وہ ایک صحیفہ ہے جس کا طول رسولِ خداؐ کے ہاتھ کے مطابق ستر ہاتھ کا ہے اور اس کا ایک ایک مطلب رسولِ خداؐ کی زبان مبارک سے ادا ہوا اور امیرالمومنینؑ نے اسے اپنے دست مبارک سے تحریر کیا تھا۔ اس صحیفے میں تمام حلال وحرام کا ذکر ہے اور لوگوں کو جس چیز کی ضرورت ہے یا ہوگی اس کے متعلق گفتگو کی گئی ہے یہاں تک کہ جسم پر ایک ہلکی سی خراش کی دِیَت کا بھی ذکر موجود ہے۔

اس وقت آپ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: اے ابومحمد! اجازت دیتے ہو؟

۱۔ رواۃِ حدیث میں دو ابوبصیر گزرے ہیں۔ ایک کا نام یحییٰ بن ابوالقاسم تھا۔ ان کی کنیت ابومحمد تھی۔ وہ امام باقرؑ اور امام صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ جب کتبِ حدیث میں مطلقاً ابوبصیر کے الفاظ وارد ہوں تو یہی ابوبصیر مراد ہوتے ہیں۔

۲۔ ثقۃ الاسلام شیخ کلینی، الکافی، ج۱، ص۲۳۹۔ بصائر الدرجات، ص۱۵۱ تا ۱۵۳۔ ملا محسن فیض کاشانی، وافی، ج۲، ص۱۳۵۔ یہ طولانی روایت ہم نے یہاں بقدرِ ضرورت نقل کی ہے۔ ابوبصیر سے منقول دوسری روایت میں تھوڑا سا لفظی اختلاف ہے۔

بصائر الدرجات، ص۱۴۹ تا ۱۵۲، حدیث ۷۔ ص۱۴۲، حدیث ۱۔ وافی، ج۲، ص۱۳۵۔

میں نے جواب دیا: میں قربان! میرا تمام جسم آپ کے اختیار میں ہے۔

پھر آپ نے میرے کندھے پر زور دیا اور فرمایا: ''حتیٰ کہ اس کی دِیَت کا بھی'' آپ نے یہ بات ذرا ناراض لہجے میں فرمائی۔

میں نے کہا: خدا کی قسم! یہ واقعی علم ہے۔

''جامعہ'' اور ''کتابِ علیؑ'' کا تذکرہ بہت سی روایات میں موجود ہے البتہ ہم یہاں صرف اسی ایک روایت پر اکتفا کرتے ہیں۔

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک امام اپنی وفات کے وقت امام علیؑ کی کتابوں کو بالعموم اور ''جامعہ'' کو بالخصوص کس طرح دوسرے امام کے سپرد کرتا تھا؟

شیخ کلینی نے اصول کافی میں سلیم بن قیس[1] سے نقل کیا:

میں امام حسنؑ کے نام امام علیؑ کی وصیت کا شاہد تھا۔ آپ نے وصیت مکمل کرنے کے بعد امام حسنؑ، محمد حنفیہؒ اور اپنے تمام بیٹوں اور اپنے ممتاز شیعوں اور اہلِ خاندان کو اس کا گواہ مقرر کیا۔ پھر اس وقت آپ نے کتاب اور اپنے ہتھیار امام حسنؑ کے سپرد فرمائے اور کہا:

بیٹا! رسولِ خداؐ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اسی طرح سے تمہیں اپنا وصی مقرر کروں اور کتابیں اور ہتھیار تمہارے سپرد کروں جس طرح سے رسولِ خداؐ نے مجھے اپنا وصی مقرر کیا تھا اور کتابیں اور ہتھیار میرے حوالے کئے تھے۔ اس کے ساتھ رسولِ خداؐ نے مجھے یہ بھی حکم دیا تھا کہ میں تمہیں یہ حکم دوں کہ جب تمہارا وقتِ آخر آئے تو تم یہ چیزیں اپنے بھائی حسینؑ کے حوالے کرو۔

اس کے بعد امیر المومنینؑ نے امام حسینؑ سے فرمایا: رسولِ خداؐ نے تمہیں یہ حکم دیا ہے کہ تم ان تبرکات کو اپنے بیٹے (زین العابدینؑ) کے حوالے کرو۔

پھر امام علیؑ نے امام زین العابدینؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: رسول خداؐ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم یہ امانتیں اپنے بیٹے محمد (باقرؑ) کے حوالے کرنا اور میری اور رسولِ خداؐ کی طرف سے انہیں سلام کہنا۔[2]

کافی اور بصائر الدرجات میں حمران[3] کی روایت ہے کہ میں نے امام باقرؑ سے اس سربمہر صحیفے کے

۱۔ سلیم بن قیس ابوصادق ہلالی عامری اصحاب امیر المومنینؑ میں سے تھے۔ انہوں نے امام سجادؑ تک کا زمانہ پایا تھا۔ قاموس الرجال، ج۴، ص۴۳۵۔

۲۔ ثقۃ الاسلام شیخ کلینی، الکافی، ج۱، ۲۹۷۔ ملا محسن فیض کاشانی، وافی، ج۲، ص۹۷۔

۳۔ حمران بن اعین شیبانی کی کنیت ابوحمزہ یا ابوالحسن تھی اور وہ تابعی تھے۔ باوثوق اور مقبول انسان تھے۔ انہوں نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے احادیث روایت کی ہیں۔ قاموس الرجال، ج۳، ص۴۱۳۔

متعلق پوچھا جو ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس امانتاً رکھوایا گیا تھا اور لوگ اس کے متعلق مختلف باتیں کر رہے تھے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: جب رسولِ خداؐ نے وفات پائی تو ان کا علم، ہتھیار اور جو کچھ بھی آنحضرتؐ کے پاس (میراثِ امامت کا) سامان تھا وہ سب کا سب امیرالمومنینؑ نے میراث میں حاصل کیا۔ آنحضرتؐ کے یہ علوم و معارف اور ہتھیار (امیرالمومنینؑ کے پاس رہے) تا آنکہ وہ امام حسنؑ کو اور بعدۂ امام حسینؑ کو ملے۔ اور جب ہمیں دشمنوں کے غلبے کا اندیشہ ہوا تو میرے دادا امام حسینؑ نے وہ سامان جناب ام سلمہؓ کے پاس بطورِ امانت رکھوا دیا۔ میرے بابا علیؑ بن الحسینؑ نے وہ سامان جناب ام سلمہؓ سے واپس لے لیا تھا۔

میں نے کہا: بہت اچھا! ان کے بعد یہ سامان آپ کے پدرِ بزرگوار تک اور ان کے بعد آپ تک پہنچا۔

امام محمد باقرؑ نے فرمایا: ہاں! ایسا ہی ہے۔[۱]

عمر بن ابان[۲] کی روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس سربمہر صحیفے کے متعلق پوچھا جو ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس رکھوایا گیا تھا اور لوگ اس کے متعلق مختلف باتیں کرتے تھے تو امامؑ نے جواب دیا: جب رسولِ خداؐ رفیقِ اعلیٰ کے پاس چلے گئے تو ان کا علم، ہتھیار اور جو کچھ (میراثِ امامت) آپ کے پاس تھا وہ سب امام علیؑ کو ملا تھا اور آپ کے پاس رہا۔ بعد میں وہ سامان ان کے فرزند امام حسنؑ کو اور ان کے بعد امام حسینؑ کو ملا۔[۳]

(یہ سن کر میں صبر نہ کرسکا اور امامؑ کے فرمان کے بعد) میں نے عرض کیا: (وہ تبرکاتِ امامت) امام حسینؑ کے بعد امام زین العابدینؑ اور ان کے بعد امام محمد باقرؑ اور ان کے بعد آپ تک پہنچے ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ہاں! ایسا ہی ہے۔

کتابُ الغیبَۃ شیخ طوسی، مناقب ابن شہرآشوب اور بحارالانوار میں "فضیل" [۴] سے مروی ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا: جب امام حسین علیہ السلام نے سفرِ عراق کا ارادہ کیا تو انہوں نے رسولِ خداؐ کا وصیت نامہ، کتابیں اور دوسری اشیاء جناب ام سلمہؓ کے پاس بطورِ امانت رکھیں اور فرمایا کہ نانی جان! جب میرا بڑا بیٹا آپ سے یہ امانت طلب کرے تو اس کے سپرد کر دیجئے گا۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام زین العابدینؑ، جناب ام سلمہؓ کے پاس گئے تو انہوں

۱۔ ثقۃ الاسلام شیخ کلینی، الکافی، ج۱، ص۲۳۵۔ بصائر الدرجات، ص۱۷۷۔ ملا محسن فیض کاشانی، وافی، ج۲، ص۱۳۲۔

۲۔ ابوحفص، عمر بن ابان کلبی کوفی کا تعلق امام جعفر صادقؑ کے اصحاب سے تھا۔ معجم رجال الحدیث، ج۱۳، ص۱۲۔

۳۔ ثقۃ الاسلام شیخ کلینی، الکافی، ج۱، ص۲۳۶۔ بصائر الدرجات، ص۱۷۷۔ ملا محسن فیض کاشانی، وافی، ج۲، ص۱۳۳۔

۴۔ ابوالقاسم، فضیل بن یسار بنی نہد کا آزاد کردہ تھا۔ وہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے تھا۔ قاموس الرجال، ج۷، ص۳۴۳۔

نے امام حسین علیہ السلام کی تمام امانتیں ان کو لوٹا دیں۔[۱]

کتاب کافی، اعلام الوریٰ، مناقب ابن شہر آشوب اور بحار الانوار میں ابوبکر حضرمی[۲] سے روایت ہے۔ یہ روایت کافی میں اس طرح مرقوم ہے:

امام حسینؑ جب عراق جانے لگے تو انہوں نے کتابیں اور وصیت نامہ جناب ام سلمہؓ کے پاس بطورِ امانت رکھے اور جب امام زین العابدینؑ واپس (شام سے مدینہ) آئے تو انہوں نے وہ امانتیں ان کو لوٹا دیں۔[۳]

اس کے علاوہ ایک اور وصیت نامہ امام حسین علیہ السلام اپنے ساتھ کربلا لے کر گئے تھے۔ یہ وہ وصیت نامہ تھا جو ایک امام دوسرے امام سے بطورِ میراث حاصل کرتا ہے۔ امام حسینؑ نے وہ وصیت نامہ اپنی بیٹی فاطمہؑ کے پاس بطورِ امانت رکھا تھا۔ انہوں نے بعد میں وہ وصیت نامہ امام زین العابدینؑ کے سپرد کیا تھا۔

امام حسینؑ نے وہ وصیت نامہ اپنی بیٹی کے پاس اس لئے امانت رکھوایا تھا کیونکہ امام زین العابدینؑ سخت بیمار تھے۔

امام محمد باقرؑ اور میراثِ امامت

کافی، اعلام الوریٰ، بصائر الدرجات اور بحار الانوار میں عیسیٰ بن عبداللہ[۴] سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے یہ روایت کی ہے کہ جب امام زین العابدینؑ نے وقتِ آخر اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے فرزندوں پر نظر کی اور امام محمد باقرؑ سے فرمایا: اے محمدؑ! اس صندوق کو اٹھاؤ اور اپنے گھر لے جاؤ۔ اس کے بعد امامؑ نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: اس صندوق میں درہم و دینار نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہ خزانہ علم سے لبریز ہے۔[۵]

علاوہ ازیں بصائر الدرجات اور بحار الانوار میں اسی عیسیٰ بن عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: امام زین العابدینؑ نے اپنی وفات سے قبل ایک ٹوکرا یا صندوق اپنے پاس منگوایا اور اپنے

۱۔ کتاب الغیبۃ، مطبوعہ تبریز، ۱۳۲۳ھ، ص ۱۲۸۔ ابن شہر آشوب، مناقب، ج ۴، ص ۱۷۲۔ بحار الانوار، ج ۴۶، ص ۱۸، حدیث ۳۔

۲۔ ان کا نام عبداللہ بن محمد تھا اور انہوں نے امام جعفر صادقؑ سے بہت سی احادیث نقل کی ہیں۔ قاموس الرجال، ج ۱۶، ص ۱۵۔

۳۔ الکافی، ج ۱، ص ۳۰۴۔ اعلام الوریٰ، ص ۱۵۲۔ بحار الانوار، ج ۴۶، ص ۱۸۔ ابن شہر آشوب، مناقب، ج ۴، ص ۱۷۲۔

۴۔ عیسیٰ بن عبداللہ بن عمر بن علی بن ابی طالب امام صادقؑ کے صحابی تھے۔ انہوں نے آپ سے بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ قاموس الرجال، ج ۷، ص ۲۷۵۔

۵۔ الکافی، ج ۱، ص ۳۰۵، حدیث ۲۔ اعلام الوریٰ، ص ۲۶۰۔ بصائر الدرجات، ص ۴۴۔ بحار الانوار، ج ۴۶، ص ۲۲۹۔ وافی، ج ۲، ص ۸۳۔

فرزند سے فرمایا: اے محمدؑ! اس صندوق کو لے جاؤ۔

وہ اس صندوق کو چار افراد کی مدد سے لے گئے۔

جب امام زین العابدینؑ کی وفات ہوئی تو میرے باقی چچا اس صندوق کے مال میں سے اپنا حصہ مانگنے میرے والد کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ اس میراث میں سے ہمارا حصہ ہمیں دے دیں۔

امام باقرؑ نے ان سے فرمایا: بخدا! اس صندوق میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگر اس میں تمہارا حصہ ہوتا تو وہ (میرے والد) اسے میرے سپرد نہ کرتے۔

(اس کے بعد صادقِ آلِ محمدؑ نے فرمایا:) اس صندوق میں رسولِ خداؐ کے ہتھیار اور کتابیں تھیں۔[1]

امام جعفر صادقؑ اور میراثِ امامت

بصائر الدرجات میں زُرارہ[2] سے منقول ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: امام محمد باقرؑ نے اپنے حینِ حیات ہی میں وہ میراث اور کتابیں مجھے منتقل کر دی تھیں۔[3]

امام موسیٰ کاظمؑ اور میراثِ امامت

کتابِ غَیْبَت نعمانی اور بحارالانوار میں حماد صائغ سے منقول ہے کہ میں اس مجلس میں موجود تھا جہاں مفضل بن عمر، امام جعفر صادقؑ سے مسائل پوچھ رہے تھے کہ اس دوران ابوالحسن موسیٰ (امام موسیٰ کاظمؑ) تشریف لائے۔ امام جعفر صادقؑ نے مفضل سے پوچھا: کیا تم (میرے بعد) کتابِ علیؑ کے مالک کو دیکھنا چاہتے ہو؟

مفضل نے کہا: بھلا اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے؟

امام جعفر صادقؑ نے امام موسیٰ کاظمؑ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: یہ (میرے بعد) کتاب علیؑ کا مالک اور وارث ہے۔[4]

۱۔ ثقۃ الاسلام شیخ کلینی، الکافی، ج۱، ص۳۰۵، حدیث۱۔ ملا محسن فیض کاشانی، وافی، ج۲، ص۸۲۔ بصائر الدرجات، ص۱۶۵۔ امین الاسلام ابوعلی فضل بن حسن بن فضل المتوفی ۵۴۸ھ، اعلام الوریٰ، ص۲۶۰۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج۲۶، ص۲۲۹۔

۲۔ زرارہ کا نام عبدربہ اور کنیت ابوالحسن تھی۔ ان کے والد کا نام اعین تھا اور بنی شیبان کے آزاد کردہ تھے۔ زرارہ کوفے میں رہتے تھے۔ انہوں نے امام جعفر صادقؑ سے روایات نقل کی ہیں۔ ان کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ قاموس الرجال، ج۴، ص۱۵۴۔

۳۔ بصائر الدرجات، ج۱، ص۱۵، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۶۔

۴۔ نعمانی، کتاب الغیبۃ، ص۱۷۷۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج۴۸، ص۲۲، حدیث۳۳۔

امام علی رضاؑ اور میراث امامت

شیخ کلینی کی کافی، شیخ مفید کی ارشاد، شیخ طوسی کی کتاب الغیبۃ اور علامہ مجلسی کی بحارالانوار میں امام موسیٰ کاظمؑ سے مروی ہے کہ میرا بڑا بیٹا علیؑ میری تمام اولاد میں سب سے زیادہ نیک ہے۔ وہ مجھے تمام اولاد میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر کتاب جفر کا مطالعہ کرتا ہے اور نبی یا اس کے وصی کے سوا آج تک کسی نے اس کتاب پر نظر نہیں ڈالی۔[۱]

ائمۂ اہلبیتؑ کا ''جامعہ'' سے رجوع کرنا

سب سے پہلے جس امام نے کتاب امیرالمومنینؑ کی طرف اشارہ کیا اور اس کے متعلق لوگوں کو بتایا وہ امام زین العابدینؑ تھے اور یہی بات **الکافی، من لایحضرہ الفقیہ، تہذیب، معانی الاخبار** اور **وسائل الشیعہ** کی روایات سے مستفاد ہوتی ہے۔ ہم اس مطلب کو کافی سے نقل کر رہے ہیں۔

ابان بن تغلب[۲] سے مروی ہے کہ اس نے کہا: امام زین العابدین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ ایک مرنے والے نے اپنے مال میں سے کچھ کی وصیت کی ہو (یعنی اس نے مال کی مقدار مقرر نہ کی ہو بلکہ یہ کہا ہو کہ میرے مرنے کے بعد میرا کچھ مال فلاں مد میں صرف کیا جائے اور اس نے مقدار کی بجائے شَیْئٌ مِنْ مَّالِی جیسے مبہم الفاظ استعمال کئے ہوں) تو اس کے مال کا کتنا حصہ وصیت میں سے خرچ کیا جائے گا؟

امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: کتاب علیؑ میں لفظ شَیْئٌ سے مراد چھٹا حصہ ہے۔[۳]

نیز خصال، عقاب الاعمال اور وسائل الشیعہ میں امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ کتاب علیؑ میں مذکور ہے کہ جس شخص میں یہ تین خصلتیں ہوں گی وہ اپنی زندگی میں ان کا نقصان دیکھ لے گا:

(۱) سرکشی کرنا (۲) قطع رحمی کرنا (۳) جھوٹی قسم کھانا۔[۴]

۱۔ ثقۃ الاسلام شیخ کلینی، الکافی، ج۱، ص۳۱۱۔ محمد بن محمد بن نعمان عکبری (شیخ مفید المتوفی ۴۱۳ھ)، ارشاد، ص۲۸۵۔ شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی، کتاب الغیبۃ، ص۲۸۔ ملا محسن فیض کاشانی، وافی، ج۲، ص۸۳۔ بصائر الدرجات، ص۱۶۴، حدیث ۷ تا ۹۔

۲۔ ابان بن تغلب بن ریاح ابوسعید بکری بنی جریر کے آزاد کردہ تھے۔ انہوں نے امام زین العابدینؑ، امام باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے روایت کی تھی۔ انہیں امام جعفر صادقؑ سے روایت کرنے پر سرزنش کی گئی تو انہوں نے کہا: میں بھلا ان سے روایت کیوں نہ کروں کہ میں نے جب بھی ان سے کوئی مسئلہ پوچھا تو انہوں نے "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ" کہہ کر جواب دیا۔

۳۔ ثقۃ الاسلام شیخ کلینی، الکافی، ج۷، ص۴۰، حدیث ۱۔ صدوق، مَنْ لَایَحْضُرُہُ الْفَقِیْہ، ج۴، ص۱۵۱۔ صدوق، معانی الاخبار، ص۲۱۷۔ شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی، تہذیب، ج۹، ص۲۱۱، حدیث ۸۳۵۔ علامہ شیخ حر عاملی، وسائل الشیعہ، ج۱۳، ص۴۵۰، حدیث۔

۴۔ شیخ صدوق، خصال، ص۱۲۴۔ شیخ صدوق، عقاب الاعمال، ص۲۶۱۔ علامہ شیخ حر عاملی، وسائل الشیعہ، ج۱۶، ص۱۱۸۔

امام جعفر صادقؑ نے چاند کی پہلی تاریخ کے اثبات کے متعلق کتاب علیؑ کی طرف اشارہ کیا تھا۔[۱]

مذکورہ دو موارد کے علاوہ ہماری تحقیق کے مطابق امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے انتالیس مقامات پر کتاب علیؑ کا حوالہ دیا تھا۔[۲]

امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے صرف کتاب علیؑ کے حوالے پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے کئی بار اسے گھر سے منگوا کر ان اصحاب کو اس کی زیارت بھی کرائی اور اس کے کچھ مطالب بھی پڑھ کر سنائے تھے:

(۱) زرارہ (۲) محمد بن مسلم[۳] (۳) عمر بن اذینہ[۴] (۴) ابوبصیر

(۵) ابن بکیر[۵] (۶) عبدالملک بن اعین[۶] (۷) معتب[۷]

اور کئی بار ایسا اتفاق بھی ہوا کہ امام باقرؑ اور امام صادقؑ نے مکتب خلفاء کے پیروکاروں کے سامنے بھی کتاب علیؑ منگوا کر اس سے اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ درج ذیل حدیث اس مطلب کی شاہد ہے:

نجاشی بیان کرتے ہیں کہ عذافر صیرفی[۸] حکم بن عتیبہ[۹] کو لے کر امام باقرؑ کی خدمت میں آیا۔ حکم نے گفتگو کا آغاز کیا اور مسائل پیش کئے۔ اگرچہ امامؑ اس کو دیکھ کر خوش نہیں تھے مگر اس کے باوجود آپ اسے جواب دیتے رہے۔ ایک مسئلے میں ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا (حکم نے امامؑ کے جواب کو قبول نہ کیا)

۱۔ شیخ طوسی، استبصار، ج ۳، ص ۶۴۔ وسائل الشیعہ، ج ۷، ص ۱۸۲۔

۲۔ معالم المدرستین، ج ۲، ص ۳۳۶ تا ۳۳۹۔

۳۔ محمد بن مسلم بن ریاح طحان (المتوفی ۱۵۰ھ) کی کنیت ابوجعفر اوقص تھی۔ انہوں نے امام محمد باقرؑ سے احادیث روایت کی ہیں۔ آپ کتاب اربعمائة مسألة فی ابواب الحلال والحرام کے مؤلف ہیں۔ قاموس الرجال، ج ۸، ص ۳۷۸۔

۴۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا نام محمد بن عمر بن اذینہ تھا مگر ان کے والد کا نام ان کے نام پر غالب آ گیا۔ ان کا تعلق امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے تھا۔ معجم رجال الحدیث، ج ۱۳، ص ۲۱۔

۵۔ ابن بکیر کا پورا نام ونسب یہ ہے: ابوعلی عبداللہ بن بکیر بن اعین شیبانی۔ احادیث میں انتہائی موثق تھے۔ انہوں نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی تھی۔ قاموس الرجال، ج ۵، ص ۳۹۹۔

۶۔ ابوفراس عبدالملک بن اعین شیبانی نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے احادیث نقل کی ہیں اور امام جعفر صادقؑ کی زندگی میں ان کی وفات ہوئی۔ قاموس الرجال، ج ۶، ص ۱۸۱۔

۷۔ معتب۔۔۔ امام جعفر صادقؑ کے آزاد کردہ تھے۔ عباسی خلیفہ منصور دوانیقی کے حکم پر انہیں ایک ہزار کوڑے مارے گئے جس سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ قاموس الرجال، ج ۹، ص ۴۷۔ مزید روایات معالم المدرستین، ج ۲، ص ۳۳۹ تا ۳۴۳ میں دیکھیں۔

۸۔ عذافر بن عیسیٰ خزاعی صیرفی نے امام جعفر صادقؑ سے روایات نقل کی تھیں۔ قاموس الرجال، ج ۶، ص ۲۹۵۔

۹۔ حکم بن عتیبہ کوفی نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے احادیث روایت کی ہیں۔ حکم نے ۱۱۳ھ یا ۱۱۴ھ یا ۱۱۵ھ میں ساٹھ برس سے کچھ زیادہ عمر میں وفات پائی۔ مکتب خلفاء کے اصحاب صحاح نے اس سے روایات لی ہیں۔ قاموس الرجال، ج ۳، ص ۳۷۵۔ شیخ طوسی، تہذیب، ج ۱، ص ۲۹۲۔

تو امامؑ نے اپنے بیٹے سے فرمایا: جاؤ، کتابِ علیؑ لے آؤ۔

آپ کا بیٹا ایک بہت بڑی کتاب لے کر آیا جو طومار کی طرح سے لپٹی ہوئی تھی۔ امامؑ نے کتاب کھول کر مسئلہ تلاش کیا اور اس کے سامنے رکھتے ہوئے فرمایا: یہ رسولِ خداؐ نے لکھائی تھی اور امام علیؑ نے لکھی تھی۔

اس کے بعد آپ نے حَکَم سے فرمایا: اے ابواحمد تم، سلمہ[۱] اور ابو المقدام[۲] مشرق و مغرب میں جہاں چاہو چلے جاؤ مگر بخدا جو تسلی بخش علم ہم خانوادۂ وحی و تنزیل کے پاس ہے اور جسے جبرئیلِ امینؑ لائے تھے، اس سے بڑھ کر مطمئن کرنے والا علم تم کہیں اور نہیں پاؤ گے۔[۳]

ائمۂ اہلبیتؑ کبھی مسئلے کے شرعی حکم کے لئے کتابِ علیؑ کا حوالہ دیتے تھے اور کبھی اس کے حوالے کے بغیر اس میں بیان کردہ مسئلہ بیان کرتے تھے۔ ہم نے اس مفہوم کی تفصیل معالم المدرستین میں بیان کی ہے۔[۴]

اسی وجہ سے ائمۂ اہلبیتؑ کی احادیث میں ایک ہی سَنَد دکھائی دیتی ہے اور تمام ائمہؑ کی احادیث کا مدرک و مأخذ ایک ہے۔

ہشام بن سالم[۵] اور حماد بن عثمان[۶] کے علاوہ دیگر رواۃ نے امام جعفر صادقؑ سے یہ روایت کی ہے کہ میری حدیث میرے والد کی حدیث ہے — اور میرے والد کی حدیث میرے دادا کی حدیث ہے — اور میرے دادا کی حدیث امام حسینؑ کی حدیث ہے — اور امام حسینؑ کی حدیث امام حسنؑ کی حدیث ہے — اور امام حسنؑ کی حدیث امیر المومنینؑ کی حدیث ہے — اور امیر المومنینؑ کی حدیث رسولِ خداؐ کی حدیث ہے — اور رسولِ خداؐ کی حدیث — فرمانِ خداوندی ہے۔[۷]

۱۔ ابویحییٰ سلمہ بن کہیل حضرمی کوفی نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے ملاقات کی تھی۔ قاموس الرجال، ج۴، ص۴۳۹۔

۲۔ ابوالمقدام کا نام ثابت بن ہرمز تھا۔ یہ لوہار پارسی تھا۔ اس نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے ملاقات کی تھی۔ سلمہ اور ابوالمقدام دونوں کا تعلق فرقہ "بتریہ" سے تھا۔ یہ لوگوں کو ولایتِ علیؑ کی دعوت دیتے تھے۔ اس کے ساتھ یہ لوگ شیخین کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے۔ حضرت عثمان، طلحہ، زبیر اور بی بی عائشہؓ سے دشمنی رکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اولادِ علیؑ میں سے جو بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قیام کے لئے خروج کرے اس کا ساتھ دینا واجب ہے۔

۳۔ رجال نجاشی، ص۲۷۹۔ ۴۔ معالم المدرستین، ج۲، ص۳۴۴۔

۵۔ ہشام بن سالم، ابومحمد جوالیقی کوفی نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے اور ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ قاموس الرجال، ج۹، ص۳۵۷۔

۶۔ حماد بن عثمان فزاری، امام جعفر صادقؑ، امام موسیٰ کاظمؑ اور امام علی رضاؑ کے اصحاب میں سے تھے اور انہوں نے تینوں ائمہ سے روایات نقل کی ہیں۔ قاموس الرجال، ج۳، ص۳۹۷۔

۷۔ کافی، ج۱، ص۵۳۔ ارشاد مفید، ص۲۵۷۔

ایک مرتبہ جابر بن عبداللہ انصاری نے امام محمد باقرؑ سے کہا تھا کہ آپ جب مجھ سے کوئی حدیث ارشاد فرمائیں تو اس کی سَنَد بھی بیان فرمائیں۔

امامؑ نے فرمایا: میرے والد نے میرے دادا سے اور میرے دادا نے رسولِ خداؐ سے اور رسولِ خداؐ نے جبریلؑ سے اور جبریلؑ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کی اور میں جب بھی تم سے کوئی حدیث بیان کروں تو اس کی سَنَد یہی ہے۔[۱]

اسی لئے امام جعفر صادق علیہ السلام نے حفص بن بختری بغدادی[۲] سے فرمایا تھا تم نے مجھ سے جو کچھ سنا ہے تم اسے میرے والد کی طرف سے بھی بیان کر سکتے ہو اور تم نے جو کچھ مجھ سے سنا ہے اسے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی روایت کرنے کے مجاز ہو۔[۳]

کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا:

فَوَالِ اُنَاسًا قَوْلُهُمْ وَ حَدِيْثُهُمْ رَوٰى جَدُّنَا عَنْ جِبْرَئِيْلَ عَنِ الْبَارِى

ان لوگوں سے دوستی رکھ جو اس طرح سے روایت اور حدیث بیان کریں کہ ہمارے ناناؐ نے جبریلِ امینؑ سے اور جبریلِ امینؑ نے خداوند باری تعالیٰ سے روایت کی۔

مکتبِ خلفاء میں سرگزشتِ حدیث

مکتبِ اہلبیتؑ میں جہاں حدیث کو اتنا استحکام دیا گیا وہیں مکتبِ خلفاء میں اسکی سرگزشت بڑی دردناک ہے۔

مکتبِ خلفاء میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ خلافت تک حدیث کا لکھنا ممنوع تھا۔ جب عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسندِ خلافت سنبھالی تو انہوں نے احادیث لکھنے کا حکم جاری کیا اور یوں ایک حرام کام حلال ہوگیا۔ مکتبِ خلفاء سے وابستہ علماء نے قرنِ دوم میں حدیث کی تدوین کا کام شروع کیا۔

دوسری صدی کی ابتدا میں محدّثین نے جو احادیث جمع کیں اس کے لئے کم از کم چار واسطوں کی ضرورت تھی کیونکہ محدّثین میں یہ امر طے شدہ ہے کہ ایک صدی میں ایک حدیث کے لئے چار راویوں کا ہونا لازم و لابُد ہے۔ اس امر کی مزید وضاحت کے لئے ہم بطورِ نمونہ ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

۱۔ شیخ مفید، امالی، ص ۲۶۔

۲۔ حفص بن بختری بغدادی بنیادی طور پر کوفے کا باشندہ تھا۔ اس نے امام جعفر صادقؑ سے روایات نقل کی تھیں اور اس نے ایک کتاب بھی تالیف کی تھی۔ قاموس الرجال، ج ۳، ص ۳۵۵۔

۳۔ وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۳۸۰، حدیث ۸۶۔

فرض کریں جس دوَر میں عمر بن عبدالعزیزؒ نے کتابتِ حدیث کی اجازت دی، اس وقت کوئی محدّث ایک حدیث خود عمر بن عبدالعزیزؒ کی زبانی نقل کرے تو اس کی سَنَد یوں تشکیل پائے گی کہ میں نے یہ حدیث عمرؒ سے سنی۔

۱۔ اور عمر اپنے والد عبدالعزیز سے حدیث بیان کریں گے۔

۲۔ عبدالعزیز اپنے والد مروان سے روایت کریں گے۔

۳۔ مروان، رسولِ خداؐ سے براہِ راست حدیث بیان نہیں کرسکتا کیونکہ آنحضرتؐ کے دوَرِ حیات میں وہ شیر خوار بچہ تھا۔ اس لئے مروان اس روایت کو اپنے باپ حکَم بن ابی عاص سے روایت کرے گا۔

۴۔ حکَم بن ابی عاص کو مدَنی زندگی میں چند دنوں کے لئے رسولِ خداؐ کی زیارت نصیب ہوئی تھی لہٰذا وہ براہِ راست رسولِ خداؐ سے روایت کرے گا۔

اس مثال سے واضح ہوا کہ جس دوَر میں حدیث کی تدوین ہوئی تو اس وقت ایک محدّث کو کم از کم چار واسطوں کی ضرورت تھی اور جو حدیث ایک سو سال کے بعد چار واسطوں سے نقل کی جائے تو نجانے وہ کس قدر قابلِ اعتماد ہوگی؟

ہم اپنی بات کی دلیل مکتبِ خلفاء کے محدّثین کی زبانی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ذہبی اور ابن کثیر نے بشیر بن سعد سے روایت کی کہ وہ کہا کرتا تھا: لوگو! خدا سے ڈرو اور روایت کرنے میں احتیاط سے کام لو۔ بخدا! میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا جو ہمارے ساتھ ابوہریرہ کی مجلس میں بیٹھے تھے جبکہ ابوہریرہ کچھ رسولِ خداؐ کی حدیثیں روایت کرتے تھے اور کچھ کعب الاحبار کی باتیں نقل کرتے تھے۔ پھر جب ہم اس مجلس سے اٹھے تو میں نے اپنے کئی ساتھیوں کو دیکھا کہ وہ کعب الاحبار کی روایت کو رسولِ خداؐ کی حدیث کہہ کر بیان کررہے تھے۔[1]

اگر خدانخواستہ اور بالفرض ہمارے پاس اس امر کی کوئی دلیل نہ ہو کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے اسلام کے جملہ علوم ومَعارف لکھوا کر اپنے بارہ اوصیاء کے سپرد کئے تھے تو بھی قرآن وسنت یعنی عقائد و احکام کی تفسیر کے لئے مسلمانوں کے پاس ان بارہ اوصیاء کی طرف رجوع کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کیونکہ پیغمبرِ اکرمؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ ان کے بعد ان کے بارہ وصی امت کے رہنما ہوں گے۔

۱۔ حافظ ابن کثیر شافعی، تفسیر القرآن العظیم، ج ۳، ص ۱۰۴۔ ابوہریرہ کے تفصیلی حالات ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ج ۲، ص ۴۳۶ اور حافظ ابن کثیر شافعی، البدایہ والنہایہ المعروف بہ تاریخ ابن کثیر، ج ۸، ص ۱۰۹ پر دیکھیں۔

پیش گفتارِ دوم

امامت کے متعلق اس بحث کے آغاز پر ہم سنی اور شیعہ مکتب کے افکار کی اساس کا جائزہ لیں گے۔
رسولِ اکرمؐ کی وفات سے لے کر آج تک عالمِ اسلام میں دو مکاتبِ فکر پائے جاتے ہیں:
(۱) مکتبِ خلافت۔ (۲) مکتبِ امامت۔
مکتبِ خلافت کا نظریہ ہے کہ پیشوا اور رہنما انتخاب کے ذریعے مقرر ہوتا ہے۔
مکتبِ امامت کا نظریہ ہے کہ امت کے پیشوا اور رہنما پیغمبرِ اکرمؐ کے وصی ہیں۔ یہ امرِ وصایت خدا کے تقرر اور پیغمبرِ اکرمؐ کی خبر سے انجام پاتا ہے۔ لوگوں کو امام کے انتخاب کا کوئی حق نہیں ہے۔
جو گروہ انتخاب کا قائل ہے اس کا عقیدہ ہے کہ یہ انتخاب لوگوں کے ذریعے سے انجام پاتا ہے اور پیغمبرِ اکرمؐ کے بعد لوگوں کو ان کے جانشین منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔
مکتبِ امامت کا عقیدہ ہے کہ خدا انتصاب کے ذریعے اوصیاء مقرر فرماتا ہے اور رسولؐ بھی اپنا جانشین خود مقرر نہیں کرتا اور نہ ہی امت کو جانشینِ رسولؐ کے انتخاب کا حق ہے۔ امام کو خدا مقرر کرتا ہے اور رسولؐ اس تقرر کی خبر دیتا ہے۔
دونوں مکاتبِ فکر کے نظریات کے تفصیلی جائزے سے قبل دو نکات کا بیان کرنا انتہائی اہم ہے:
(۱) مکتبِ خلافت کے علماء نے بہت سی ایسی کتابیں تحریر کی ہیں جن میں حکومت سازی کے قواعد و قوانین اور اس کے لئے ضروری امور، حاکم کے فرائض، رعایا پر اسلامی حکومت کے حقوق اور اسلامی حکومت پر رعایا کے حقوق، مزید یہ کہ والی اور وزیر کا انتخاب کیسے ہونا چاہئے، امام جمعہ اور قاضی کیسے ہونا چاہئے، مالیات کی وصولی کا طریقۂ کار کیا ہونا چاہئے اور زکوٰۃ، خراج اور جزیہ کی مقدار کیا ہونی چاہئے اور مذکورہ مالیات کس سے وصول کئے جائیں اور کیسے وصول کئے جائیں جیسے احکام موجود ہیں اور مذکورہ کتابیں مکتبِ خلفاء کے مستند اور مسلّم علماء نے تحریر کی ہیں۔ ہم خلیفہ کے انتخاب کے طریقۂ کار کے متعلق ان ہی کتابوں سے استفادہ کریں گے اور بتائیں گے

کہ مکتبِ خلفاء میں خلیفہ کے انتخاب کا کیا طریقہ ہے؟

(۲) ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ خلیفہ کی اصطلاح کا لفظی و معنوی مفہوم کیا ہے اور شریعت میں یہ لفظ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اہلِ شریعت کی اصطلاح میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہے؟

(ا) خلیفہ کے لغوی معنی

ابن اثیر لکھتے ہیں کہ "خلیفہ اسے کہتے ہیں جو کسی دوسرے کی نیابت اور جانشینی کرے۔"[۱]

راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ "خلافت کسی کی نیابت کو کہا جاتا ہے۔"[۲]

قرآن مجید میں کئی مقامات پر خلیفہ کی جمع "خلائف" اور "خلفاء" استعمال ہوئی ہے اور وہ اسی لغوی معنی میں استعمال ہوئی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: وَجَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ. اس نے تمہیں قومِ نوحؑ کے بعد ان کا جانشین بنایا۔ (سورۂ اعراف: آیت ۶۹)

رسولِ اکرمؐ کی بعض احادیث میں ہمیں یہ لفظ اسی لغوی معنی میں دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا: اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَآئِي، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَآئِي، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَآئِي خدایا! میرے خلفاء پر رحم فرما۔ خدایا! میرے خلفاء پر رحم فرما۔ خدایا! میرے خلفاء پر رحم فرما۔

لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہؐ! آپ کے خلفاء کون ہیں؟

آپ نے فرمایا: اَلَّذِيْنَ يَأْتُوْنَ بَعْدِيْ يَرْوُوْنَ حَدِيْثِيْ وَسُنَّتِيْ....[۳] میرے خلفاء وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے اور میری حدیث وسنت کو بیان کریں گے۔

۱۔ نهاية اللغة مادہ "خلف"۔

۲۔ راغب اصفہانی، مفردات القرآن مادہ "خلف"۔

۳۔ شیخ صدوق، معانی الاخبار، ص۳۷۴۔ ابن قتیبہ دینوری، عیون الاخبار، مطبوعہ نجف، ج۲، ص۳۶۔
شیخ صدوق، من لایحضرة الفقیه، تحقیق علی اکبر غفاری، ج۴، ص۴۲۰۔ علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج۲، ص۱۵۲، حدیث۷۔
کتبِ خلفاء کے مصادر کیلئے دیکھیں: رامہرمزی، المحدث الفاصل، باب فضل الناقل عن رسولِ اللّٰہؐ، ص۱۶۳۔ قاسمی، قواعدالتحدیث، باب فضل راوی الحدیث، طبع دوم، ص۴۸۔ خطیب بغدادی، شرف اصحاب الحدیث، باب کَوْنُ اصحابِ الحدیثِ خلفاءَ الرسول، ص۳۰۔ ابن عبدالبر، جامع بیان العلم، ج۱، ص۵۵۔ ابونعیم، اخبار اصبہان، ج۱، ص۸۱۔ سیوطی، الفتح الکبیر، بنقل از ابوسعید، ج۱۰، ص۲۳۳۔ ملا علی متقی ہندی، کنزالعمال، کتاب العلم، باب آداب العلم، فصل روایة الحدیث و آداب الکتابة بنقل از امیرالمومنین علیؑ و ابن عباسؓ، طبع دوم، ج۱۰، ص۱۲۸ تا ۱۳۳، حدیث۱۰۷۶، ۱۱۲۷۔ ج۱۰، ص۱۸۱، حدیث۱۴۰۷۔ قاضی عیاض، الالماع، باب شَرَفُ علمِ الحدیث و شَرَفُ اهلِه، ص۱۱۔

(ب) مسلمانوں میں خلیفہ کی اصطلاح

گزشتہ بحث میں ہم نے بتایا تھا کہ زمانۂ پیغمبرؐ میں کچھ چیزوں کے نام رکھے گئے تھے اور یہ نام یا پیغمبرِ اکرمؐ نے تجویز کئے تھے یا خداوندِ عالم نے وہ نام تجویز کئے تھے اور پیغمبرِ اکرمؐ نے ان کی تبلیغ فرمائی تھی۔ اس طرح کے ناموں کو مُصطلَحاتِ اسلامی یا مُصطلَحاتِ شرعی کہا جاتا ہے۔[1] یعنی ایسی اصطلاحات یا ایسے نام جو شریعت اور صاحبِ شریعت کی طرف سے منتخب ہوئے ہوں۔

اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ ایسے نام بھی ہیں جنہیں مسلمانوں یا علمائے اسلام نے ایک مخصوص مفہوم کے لئے وضع کیا ہے۔ ایسے ناموں کو مُصطلَحاتِ مُتشرّعہ یا مُصطلَحاتِ مُسلِمین کہا جاتا ہے۔

مسلمان حکمران کے لئے لفظ خلیفہ شرعی اصطلاح نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ کے زمانے میں خلیفہ کا یہ مفہوم نہیں تھا۔ لفظ خلیفہ موجودہ معنی میں مسلمانوں کا وضع کردہ ہے اور مکتبِ خلفاء نے اسے رائج کیا ہے۔

مکتبِ خلفاء میں جسے رسولِ خداؐ کی جانشینی کے لئے منتخب کیا گیا تھا، اسے لفظ ''خَلِیفَۃُ الرسول'' سے تعبیر کیا گیا اور بعد میں بطورِ اختصار لفظ ''خلیفہ'' مروج ہوا۔

مکتبِ خلفاء کے پیرو اپنے حاکم اور سلطان کو لفظ ''خلیفۃ اللہ'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ بہرنوع خلیفۃ الرسول اور خلیفۃ اللہ کے الفاظ کو مختصر کر کے خلیفہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(ج) اسلام میں خلیفہ کی اِصْطِلاح

قرآنی آیات اور اسلامی روایات پر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی اصطلاح میں خلیفۃ اللہ کا خطاب اس شخص کو دیا گیا جسے اللہ نے اس زمانے کے لوگوں کو تبلیغِ اسلام کے لئے مقرر کیا ہو۔ خواہ وہ نبی ہو یا کسی نبی کا وصی ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: يَادَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ. (سورۂ ص: آیت ۲۶) اس کے علاوہ حضرت آدمؑ کے قصے میں ارشاد ہوا ہے: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً. (سورۂ بقرہ: آیت ۳۰)

ان دونوں آیات میں لفظ خلیفہ مذکورہ معنی میں استعمال ہوا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خلیفۃ اللہ ہر دَوْر کے اس رہبر و پیشوا کو کہا جاتا ہے جو دین کی تبلیغ اور اس کی حفاظت اور احکامِ الٰہی کو پہنچانے پر مامور ہو اور لوگوں پر واجب ہے کہ وہ خدا کے مقرر کردہ خلیفہ کو پہچانیں اور اسے اپنا مرجع اور پناہ گاہ قرار دیں۔[2]

۱۔ علم اصولِ فقہ میں اسے ''حقیقتِ شرعی'' کہا جاتا ہے۔

۲۔ معالم المدرستین، باب مُصطلحاتُ بحثِ الامامۃ وَالخلافۃ۔

مکتبِ خلفاء میں اِمامت کا تصوّر

بحث کے آغاز میں ہم نے امامت کے موضوع پر جن کتابوں کی طرف اشارہ کیا تھا ان میں الاحکام السلطانیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ قاضی ماوردی المتوفی ۴۵۰ھ اور قاضی ابویعلی المتوفی ۴۵۸ھ دونوں اپنے وقت کے قاضی القضاۃ تھے۔ ان دونوں قاضیوں نے مسئلۂ امامت پر تفصیلی کتابیں لکھی تھیں اور دونوں کی کتابوں کا نام الاحکام السلطانیہ ہے۔ چنانچہ مذکورہ دونوں حضرات نے اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خلافت — جو کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جانشینی کا نام ہے تین طرح سے منعقد ہوسکتی ہے:

(۱) کوئی خلیفہ کسی کو اپنا جانشین نامزد کردے تو جسے وہ نامزد کرے گا اس کی خلافت کسی اشکال کے بغیر صحیح ہوگی۔ مثلاً: اگر ہارون رشید کہہ دے کہ "میرے بعد امین اور مامون خلیفہ ہوں گے" تو مسلمانوں کے لئے اس فرمان کو ماننا ضروری ہے کیونکہ دونوں کو ایک شرعی و اسلامی خلیفہ نے نامزد کیا ہے اور اس کے فرمان کو ماننا دینی طور پر واجب ہے۔

اس مثال کے بعد مکتبِ خلفاء کے دونوں قاضی لکھتے ہیں:

اس طرح کی خلافت میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس صورت میں نامزد ہونے والے خلیفہ کی خلافت کے صحیح ہونے پر سب کا اتفاق اور اجماع ہے۔

مکتبِ خلفاء کے ان دونوں قاضیوں کے پاس اس طرح کی خلافت کے صحیح ہونے کی جو بنیادی دلیل ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت حضرت عمرؓ کو اپنی جانشینی کے لئے نامزد کیا تھا اور کسی نے بھی اس نظریے کی مخالفت نہیں کی تھی۔ عامۃ المسلمین کی طرف سے اس نامزدگی کو قبول کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس طریقے کو جائز اور صحیح سمجھا تھا۔ پہلے خلیفہ کی طرف سے دوسرے خلیفہ کی نامزدگی کے جائز ہونے کی دو دلیلیں ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنی جانشینی کے لئے نامزد کیا تھا اور

اس سلسلے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس دوُر کے مسلمانوں نے اس نامزدگی پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

مکتبِ خلفاء میں اس طرح کی خلافت کے صحیح ہونے میں کوئی اِشکال نہیں ہے۔[۱]

(۲) لوگ خلیفہ کا انتخاب کریں۔

خلیفہ کے انتخاب کے لئے اہلِ حل و عقد کی تعداد کتنی ہونی چاہیے؟ اس کے لئے مکتبِ خلفاء کے علماء میں اختلاف ہے۔

ماوردی لکھتے ہیں:

اہلِ علم کی اکثریت کا خیال ہے کہ انتخابِ خلیفہ کے لئے پانچ اہلِ حل و عقد یعنی قوم کے دانا و بینا افراد کا ہونا ضروری ہے یا یہ کہ ایک شخص کسی کو منتخب کرے اور چار دوسرے اس کی تائید کریں۔[۲]

اس نظریے کے لئے انہوں نے یہ دلیل بیان کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے انعقاد کے وقت اِن پانچ افراد نے اُن کی بیعت کی تھی جس سے اُن کی خلافت کو قانونی اور آئینی جواز حاصل ہوگیا تھا۔

(۱) عمر بن خطابؓ (۲) ابوعُبیدہ بن جراحؓ (۳) سالمؓ، ابوحذیفہؓ کا آزاد کردہ

(۴) نعمان بن بشیرؓ (۵) اُسید بن حُضیرؓ

سقیفہ میں ان پانچ افراد نے ہی بیعت کی تھی اور حضرت ابوبکرؓ مقام خلافت پر فائز ہوئے تھے۔ جب وہ سقیفہ میں خلیفہ منتخب ہوگئے تو لوگوں کو چار و ناچار ان کی بیْعت کرنا ہی پڑی۔[۳] اس دلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اہلِ حل و عقد میں سے پانچ افراد کسی کو منتخب کرلیں اور اسے خلیفہ سمجھ کر اس کی بیْعت کرلیں تو باقی مسلمانوں کے لئے اس کی بیْعت ضروری ہوجاتی ہے۔

اس نظریے کے صحیح ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے انتخابِ خلیفہ کے لئے چھ رکنی شوریٰ تشکیل دی تھی اور انہوں نے کہا تھا: اگر چھ افراد میں سے پانچ افراد کسی کی خلافت کو تسلیم کرلیں تو وہ خلیفہ قرار پائے گا۔ مکتبِ خلفاء سے وابستہ علماء کی اکثریت اس عقیدے سے اتفاق رکھتی ہے۔

۱۔ عربی عبارت ملاحظہ فرمائیں: "وَاَمّا اِنعقادُ الامامةِ بعهد من قبله فهو مِمّا انعقد الاجماعُ عَلٰی جوازِه و وَقعَ الاتفاق عَلٰی صِحّتِه لِاَمْرَینِ عَمل المُسلمونَ بِهِمَا وَلَمْ یتناکَرُوْهُما: اَحَدُهُمَا: اَنَّ ابابکرٌ عَهِدَ بها اِلٰی عمرٌ فَاَثبَتَ المُسلمونَ اِمامتهُ بِعَهدِه." ماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص۱۰، طبع سوم، مصر ۱۳۹۳ھ۔ قاضی ابویعلی حنبلی، الاحکام السلطانیہ، ص۲۵، طبع دوم، مصر ۱۳۸٦ھ۔ قاضی روز بہان، سلوک الملوک دستور حکومت اسلامی، ص۴۴ تا ۵۵، مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۱۳۸٦ھ۔

۲۔ "اَقَلّ مَنْ تَنعَقِدُ بِهِ مِنهمُ الإمامَةُ، خَمْسَة یَجْتَمِعُونَ عَلٰی عَقدِها، اَوْ یَعقِدُهَا اَحَدُهُم بِرِضا الاَربعَة." ماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص۷۔ قاضی ابویعلی حنبلی، الاحکام السلطانیہ، ص۲۳۔ قاضی روز بہان، سلوک الملوک، ص۴۳۔

۳۔ ماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص۷۔ سقیفہ کی تفصیلی روداد کے لئے ہماری کتاب عبداللہ بن سبا، ج۱، ص۷۸ تا ۱۳۹ دیکھیں۔

مکتبِ خلافت سے وابستہ کچھ علماء کا یہ نظریہ ہے کہ خلافت بھی عقدِ اِزدِواج کی طرح سے ایک عقد ہے جس طرح نکاح کے لئے ایک عقد پڑھنے والے اور دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح خلافت کے انعقاد کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو بیعت کرے اور دو ایسے گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے جو رضامندی کے اظہار کا اعلان کریں۔

خلیفہ کے تقرر کے لئے اتنے ہی اہلِ حل وعقد افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔[۱]

مکتبِ خلفاء کے تیسرے گروہ کا کہنا ہے کہ اگر ایک شخص بھی کسی کی خلیفہ کے عنوان سے بیعت کر لے تو بس وہی کافی ہے اور ایک شخص کے انتخاب سے کوئی بھی انسان پوری امت کا خلیفہ بن جاتا ہے۔

اس گروہ کی دلیل یہ ہے کہ رحلتِ رسولؐ کے وقت عباس بن عبدالمطلب نے امام علیؑ سے کہا تھا: اُمْدُدْ یَدَکَ اُبَایِعْکَ فَیَقُوْلُ النَّاسُ: عَمُّ رَسُوْلِ اللّٰہِ بَایَعَ ابْنَ عَمِّہٖ فَلَا یَخْتَلِفُ عَلَیْکَ اثْنَانِ۔[۲] آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ لوگ کہیں گے کہ رسولِ خداؐ کے چچا نے رسولِ خداؐ کے ابنِ عم کی بیعت کرلی ہے لہٰذا کوئی سے دو افراد بھی آپ کے متعلق اختلاف نہیں کریں گے۔

چنانچہ یہ گروہ کہتا ہے کہ بیعت بھی حاکمِ شرع کے حکم یا فرمان کی مانند ہے اور جس طرح سے حاکمِ شرع کا حکم ماننا واجب ہے اسی طرح سے فردِ واحد کی بیعت کا ماننا بھی واجب ہے۔

ان دونوں دلیلوں کا ماحصل یہ ہے کہ اگر ایک بھی شخص کسی کو خلیفہ سمجھ کر بیعت کرے تو اس کی خلافت کو قانونی اور آئینی جواز حاصل ہو جائے گا۔[۳]

(۳) طاقت اور تلوار کے زور پر خلافت پر قبضہ کرنا۔ پس اگر کوئی شخص طاقت کے بل بوتے پر خلیفہ بن بیٹھے تو وہ برحق خلیفہ ہے اور اس کی خلافت اسلامی اور قانونی ہوگی۔

قاضی ابویعلی لکھتے ہیں: جو شخص تلوار اور طاقت کی وجہ سے اسلامی معاشرے پر غلبہ حاصل کر لے اور خلیفہ بن جائے اور اپنے آپ کو امیرالمومنین کہلانے لگ جائے تو کسی ایسے شخص کے لئے جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہو یہ جائز نہیں کہ وہ ایک رات اس عالم میں بسر کرے کہ اپنے امام کو نہ جانتا ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خلیفہ نیک ہے یا بد۔[۴]

۱۔ ماوردی، الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیہ، ص ۷۔

۲۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۲، ق ۲، ص ۳۸۔ مسعودی، مروج الذہب، ج ۲، ص ۲۰۰۔ ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ، ج ۱، ص ۴۔

۳۔ مذکورہ اقوال کو ماوردی نے الاحکام السلطانیہ، ص ۷ پر نقل کیا ہے۔

۴۔ "وَمَنْ غَلَبَ عَلَیْھِمْ بِالسَّیْفِ حَتّٰی صَارَ خَلِیْفَۃً وَسُمِّیَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَلَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یَّبِیْتَ وَلَا یَرَاہُ اِمَامًا بَرًّا کَانَ اَوْ جَائِرًا۔" قاضی ابویعلی حنبلی، الاحکام السلطانیہ، ص ۲۳۔

مکتبِ خلفاء کے معتبر فقیہ فضل اللہ بن روزبہان نے اس طرح کی خلافت کے متعلق سلوک الملوک میں لکھا ہے کہ ''بادشاہ اور امام بننے کا چوتھا طریقہ قوت و غلبہ ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ جب امام فوت ہو جائے اور کوئی شخص امامت کا دعویٰ کرے جبکہ کسی نے اس کی بیعت نہ کی ہو اور کسی نے اسے خلیفہ نہ بنایا ہو اور وہ طاقت اور استبداد کی وجہ سے غلبہ پالے تو اس کی امامت قائم ہو جاتی ہے خواہ کسی نے اس کی بیعت نہ بھی کی ہو، خواہ وہ قریشی ہو یا نہ ہو، خواہ وہ عرب ہو یا عجم یا ترک ہو، خواہ اُس میں شرائط موجود ہوں یا وہ فاسق اور جاہل ہو۔ اس کے باوجود اس پر امام اور خلیفہ کے الفاظ کا اطلاق ہوگا۔''[۱]

خلیفہ اور مسلمان

اگر کوئی شخص جبر و استبداد یا ایک یا تین یا پانچ افراد کی بیعت سے یا خلیفۂ سابق کی نامزدگی سے خلیفہ بن جائے تو تمام مسلمانوں پر اس کی معرفت واجب ہے یعنی تمام مسلمانوں پر اس کا نام و نسب جاننا اور اس کی خلافت کو تسلیم کرنا اسی طرح سے واجب ہے جس طرح خدا و رسولؐ کی معرفت واجب ہے۔

یہ ایک نظریہ ہے لیکن اکثریت کا عقیدہ ہے کہ لوگوں کے لئے اجمالی طور پر اتنا جاننا ہی کافی ہے کہ ان کا خلیفہ کون ہے اور تفصیلی پہچان ضروری نہیں ہے۔[۲]

مکتبِ خلفاء کے علماء نے اپنی معتبر ترین کتابوں میں اور عالی قدر راویوں سے ایسی بہت سی روایات نقل کی ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ خلیفہ خواہ کتنے ہی جرائم اور فسق و فجور میں مبتلا ہو اس کے خلاف تلوار اٹھانا حرام اور اس کے خلاف خروج کرنا جائز نہیں۔ ان روایات کا ہلکا سا نمونہ پیش خدمت ہے۔

(۱) حضرت حذیفہؓ، رسولِ اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں:

یَکُوْنُ بَعْدِیْ اَئِمَّةٌ لَا یَهْتَدُوْنَ بِهُدَایَ وَلَا یَسْتَنُّوْنَ بِسُنَّتِیْ فِیْهِمْ رِجَالٌ قُلُوْبُهُمْ کَقُلُوْبِ الشَّیَاطِیْنِ فِیْ جُثْمَانِ اِنْسٍ.

قَالَ: قُلْتُ: کَیْفَ اَصْنَعُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ اَدْرَکْتُ ذٰلِکَ؟

فَقَالَ: تَسْمَعُ وَ تُطِیْعُ لِلْاَمِیْرِ وَاِنْ ضَرَبَ ظَهْرَکَ وَاَخَذَ مَالَکَ فَاسْمَعْ وَاَطِعْ.[۳]

میرے بعد ایسے امام ہوں گے جو میرے راستے پر نہیں چلیں گے اور میرے طریقے پر عمل نہیں کریں

۱۔ قاضی روزبہان، سلوک الملوک دستور حکومت اسلامی، ص ۴۷، مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

۲۔ ماوردی، الاحکام السلطانیة والولایات الدینیه، ص۱۵۔

۳۔ صحیح مسلم، ج ۶، ص ۲۰ تا ۲۲، باب الامر بلزوم الجماعة، مطبوعہ محمد علی صبیح، بمیدان ازہر قاہرہ، مصر۔

گے۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کے دِل شیطانوں کے دلوں جیسے ہوں گے لیکن بظاہر ان کی شکل انسانوں کی سی ہوگی۔

حذیفہؓ نے کہا: یارسول اللہؐ! اگر بالفرض میں ان کا زمانہ پاؤں تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: تجھے سو فیصد امیر کا فرمان سننا چاہیے اور اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔ اگرچہ تیری پشت پر تازیانے برسائے اور تیرا مال چھین لے پھر بھی تو اس کے فرمان کو سن اور اس کی اطاعت کر۔

(۲) ابن عباسؓ نے رسولِ اکرمؐ سے روایت کی ہے آپؐ نے فرمایا:

مَنْ رَأٰی مِنْ اِمَامِهٖ شَیْئًا یَکْرَهُهٗ فَلْیَصْبِرْ فَاِنَّهٗ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَمَاتَ، مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً. اگر کوئی شخص اپنے حکمران میں ایسی چیز دیکھے جو اسے پسند نہ ہو تو اسے صبر کرنا چاہیے کیونکہ جو شخص بھی مرکزِ خلافت اور اس کے پیروکاروں کی جماعت سے ایک بالشت جدا ہو کر مرا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔[1]

(۳) ابن عباسؓ نے رسولِ خداؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

لَیْسَ اَحَدٌ مِنَ النَّاسِ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شِبْرًا فَمَاتَ عَلَیْهِ، اِلَّا مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً. کسی بھی شخص کو بادشاہ کے خلاف خروج کرنے کا حق نہیں ہے اگر کوئی شخص ایک بالشت کی مقدار اس کی حکومت سے سرتابی کرے اور اس حالت میں مرجائے تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔[2]

مکتبِ خلفاء کے ایک عظیم دانش مند نے ان احادیث کو مدِ نظر رکھ کر لُزُومُ طَاعَةِ الْاُمَرَاء کا باب قائم کیا اور اس میں ان خیالات کا اظہار کیا:

''عمومِ اہلسنت یعنی فقہاء، محدثین و متکلمین کہتے ہیں کہ فسق و فجور، ظلم و جبر اور لوگوں کے حقوق غصب کرنے کی بنا پر حاکم کو معزول نہیں کیا جاسکتا اور اصولی طور پر اس کے خلاف خروج کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ البتہ اسے پند و نصیحت کرنا ضروری ہے اور اسے خدا اور روزِ آخرت سے ڈرانا چاہیے کیونکہ ہمارے پاس پیغمبرِ اکرمؐ کی بہت سی احادیث موجود ہیں جو ہمیں حاکم کے خلاف خروج کرنے سے منع کرتی ہیں۔''

خلاصہ یہ ہے کہ حکمران طبقے کے خلاف خروج کرنا اجماعِ مسلمین سے حرام ہے اگرچہ وہ فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہوں۔

اس نظریے کی رُو سے یزید بن معاویہ جیسے شرابی، زانی، سگ باز، قاتل اور مجرم کے خلاف خروج کرنا حرام ہے اور اس نظریے کے تحت عبدالملک بن مروان کے خلاف بھی خروج حرام ہے جبکہ اس نے منجنیق کے ذریعے سنگ باری کر کے خانۂ کعبہ کو نقصان پہنچایا تھا۔

۱و۲۔ صحیح مسلم، باب الامر بلزوم الجماعة، ج۶، ص۲۰۔۲۲، مطبوعہ مصر، ۱۳۳۴ھ۔

اس نظریے سے ولید اموی کو بھی تقویت پہنچتی ہے اور اس کے خلاف خروج کرنا بھی حرام ہے حالانکہ اس نے قرآن مجید کو تیروں کا نشانہ بنایا تھا۔ پھر بھی مسلمانوں پر ایسے ظالم حاکم کے خلاف خروج کرنا حرام ہے اور جو بھی مخالفت کرے گا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

صحیح مسلم کے شارح نووی لکھتے ہیں کہ بہت سی متواتر روایات ان احادیث کی تائید کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اہلسنت کا اجماع ہے کہ فسق و فجور کی وجہ سے امام کو اس کی اِمامت و اَمارت سے معزول نہیں کیا جا سکتا۔[1]

نووی نے اس کے علاوہ قرآن مجید کی آیت:

یَاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ. ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور جو تم میں صاحبانِ امر ہوں ان کی اطاعت کرو۔ (سورۃ النساء: آیت ۵۹) سے بھی استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ ''اولی الامر'' کی اطاعت واجب ہے۔ اس سے مراد حکمران طبقہ ہے لہٰذا مسلمانوں کو ان کی اطاعت کرتے رہنا چاہیے۔

مکتبِ خلفاء کی آراء کا خلاصہ یہ ہے کہ حاکم کی اطاعت ہر صورت میں واجب ہے خواہ وہ کتنا ہی ظالم اور بدکار کیوں نہ ہو۔

مکتبِ اہلبیتؑ میں اِمامت کا تصوّر

مکتبِ اہلبیتؑ کے مطابق امامت کا تعلق انتصابِ الٰہی سے ہے۔ اس مکتب کے پیشوا اور علماء اپنے نظریے کے اِثبات کے لئے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ "وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا. یعنی اور جب اللہ تعالیٰ نے چند کلمات کے ذریعے حضرت ابراہیمؑ کا امتحان لیا تو انہوں نے ان کو پورا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہیں لوگوں کا امام مقرر کرتا ہوں" سے استدلال کرتے ہیں۔

اب وہ کلمات کون سے تھے جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کا امتحان لیا تھا۔ کیا اس سے مراد اُن کے فرزندِ دلبند حضرت اسماعیلؑ کی قربانی ہے یا اس سے مراد نمرود جیسے بڑے طاغوت کے ساتھ ان کی محاذ آرائی ہے یا اس سے مراد بے خطر ہو کر آگ کے شعلوں میں کود جانا ہے یا اس سے مراد عشقِ الٰہی کے تمام امتحانی مراحل ہیں؟ قرآن مجید نے اس نکتے کی واضح الفاظ میں نشان دہی نہیں کی۔ بہرنوع اتنی بات مسلّم ہے کہ جس بھی واقعہ یا جن واقعات سے خلیلِ خداؑ کا امتحان لیا گیا وہ انتہائی سخت اور حضرت ابراہیمؑ کے لئے بڑی آزمائش کا سبب تھے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام عشقِ الٰہی کے تمام امتحانات سے سُرخرو ہو کر نکلے تو ان کے پروردگار کی طرف سے انہیں امامت کا عظیم الشان عہدہ عطا ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس عہدے سے قبل حضرت ابراہیمؑ منصبِ نُبوّت و خُلّت اور مقامِ اولوالعزم پر فائز تھے۔ لیکن نہ جانے لفظ امامت میں ایسی کیا تاثیر تھی کہ جیسے ہی اللہ نے انہیں یہ عہدہ عطا فرمایا تو آپ وجد میں آ گئے اور اللہ سے اپنی نسل کے لئے بھی اس عہدے کی درخواست کی۔

حضرت ابراہیمؑ نے جیسے ہی اللہ کا پیغام سنا اور امامت کے عہدے پر فائز ہوئے تو انہوں نے خدا سے درخواست کی کہ وہ اس عہدے کو ان کی نسل میں بھی باقی رکھے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ انسانی

۱۔ شرح نووی بر مسلم، باب الامر بلزوم الجماعة، ج ۱۲، ص ۲۲۹۔ سنن بیہقی، ج ۸، ص ۱۵۸۔ منتخب کنزالعمال علی حاشیہ مسند، ج ۲، ص ۱۳۶۔ مسند احمد، ج ۲، ص ۹۳، ۳۰۶، ۳۸۱، ۴۸۸۔ ج ۳، ص ۱۱۴۔ ج ۴، ص ۱۲۶ و ۲۰۲۔ سنن ابوداؤد، ج ۴، ص ۲۲۱، حدیث ۴۷۵۸، ۴۷۵۹، ۴۷۶۲۔ سنن ترمذی، ج ۴، ص ۴۸۸، حدیث ۲۱۹۹۔

تقاضوں کے تحت اپنی اولاد کی خیرخواہی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی طرح ان کی اولاد بھی اس باطنی سرفرازی کو حاصل کر سکے۔ اسی لئے انہوں نے عرض کیا: قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ خدایا! اور میری نسل میں سے بھی؟

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ. امامت بندوں کے ساتھ میرا عہد خاص ہے اور میرا یہ عہد ظالموں اور ستم گروں تک نہیں پہنچتا۔

آیئے دیکھیں ظالم کون ہے؟

قرآن مجید کی اصطلاح میں جو شخص اپنے نفس پر ظلم کرے اسے ظالم کہا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص بت پرستی کرے یا خودکشی کرے تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور قرآن کے فلسفے کے تحت ایسا شخص ظالم ہوگا۔

اسلام نے ظالموں کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک وہ جو اپنے نفس پر ظلم کرے اور دوسرا وہ جو دوسروں پر ظلم کرے اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کا مال لوٹ لے یا سود خوری کرے یا کسی کی ناموس کو برباد کرے تو ایسا شخص ظالم کہلائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ خدا کی ہر طرح کی نافرمانی ظلم کے دائرے میں شامل ہے اور نافرمانی کرنے والا شخص ظالم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ اور جو کوئی خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے تو اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ (سورۂ طلاق: آیت ۱)

اس سلسلے میں قرآن مجید فرقان حمید کا فلسفہ یہ ہے کہ ظلم خواہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو منصب امامت کے سراسر منافی ہے۔

اس قرآنی استدلال سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صرف وہی ہو سکتا ہے جو "معصوم" ہو۔

مذکورہ آیت کے علاوہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی امامت کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ امام کو اللہ مقرر کرتا ہے مثلاً:

(۱) وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عَابِدِيْنَ. ہم نے انہیں امام بنایا۔ وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے ان کی طرف نیک کام کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔ (سورۂ انبیاء: آیت ۷۳)

(۲) وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيَاتِنَا يُوْقِنُوْنَ. ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں سے کچھ لوگوں کو امام بنایا۔ وہ ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کرتے تھے۔ انہوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔ (سورۂ سجدہ: آیت ۲۴)

ان آیات سے مستفاد ہوتا ہے کہ امام کو خدا مقرر کرتا ہے۔ خدا کے علاوہ کسی کو بھی امام مقرر کرنے کا

اختیار نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ عہدۂ امامت ظالموں کو نہیں ملے گا کیونکہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی نسل کے لئے امامت کی درخواست کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میرا یہ عہدہ ظالموں کو نہیں ملے گا۔ امامت کے لئے طہارت و عصمت ضروری ہے۔

آیئے! قرآن مجید سے تلاش کریں کہ عصمت و طہارت کا گھرانہ کون سا ہے؟

قرآن مجید نے خانوادۂ عصمت و طہارت کا تعارف کراتے ہوئے اعلان کیا: اِنَّمَا یُرِیْدُاللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔ اے اہلبیتؑ! اللہ کا ارادہ بس یہی ہے کہ تم سے ہر طرح کی پلیدی اور گناہ کو دور رکھے اور تمہیں یوں پاک و پاکیزہ رکھے جیسا پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔ (سورۂ احزاب: آیت ۳۳)

اس آیت میں لفظ اھل البیت استعمال ہوا ہے اور اس لفظ کا تعلق ''اصطلاحاتِ شرعی'' سے ہے کیونکہ یہ لفظ قرآن مجید میں آیا ہے اور پیغمبر اسلامؐ نے اپنی احادیث کے ذریعے اس گروہ کے افراد کا تعارف کرایا تھا۔[۱]

اس آیت کے نزول کے وقت رسولِ خداؐ نے امام علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ کو جمع کیا اور ان پر اپنی چادر ڈالی اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ رسولِ خداؐ نے عملی طور پر یہ ثبوت فراہم کیا کہ آپ کی ازواج اہلبیتؑ میں شامل نہیں ہیں۔[۲] اور جب بھی اسلامی روایات میں لفظ ''اہلبیتؑ'' کا اطلاق ہوتا ہے تو اس سے مراد یہی ذواتِ قادسہ و مقدسہ ہوتی ہیں۔ امامت کی دوسری شرط یعنی عصمت صرف اہلبیتؑ کے لئے ثابت ہے۔ اہلبیتؑ کے علاوہ کسی دوسرے کی عصمت ثابت نہیں ہے۔

شرطِ اوّل کی مزید تحقیق

مکتبِ اہلبیتؑ میں امامت کو امرِ انتصابی قرار دیا جاتا ہے اور مکتبِ اہلبیتؑ کا نظریہ یہ ہے کہ امام کو خدا مقرر کرتا ہے اور پیغمبر کا کام صرف یہ ہے کہ وہ خدا کے تقرر کی تبلیغ کرتا ہے اور اسے اپنی طرف سے امام مقرر کرنے کا ہرگز کوئی حق نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا تو نبیٔ اکرمؐ نے اللہ کے حکم کی تبلیغ کی اور لوگوں کو نماز کا پیغام پہنچایا اپنی طرف سے نماز کا حکم نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حجِ بیت اللہ کا حکم دیا تو رسولِ خداؐ نے حکمِ خداوندی سے لوگوں کو حج کی تعلیم دی اور اپنی طرف سے حج کا حکم نہیں دیا۔

۱۔ اس لفظ سے مراد چودہ معصومین یعنی رسول الاعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، حضرت سیدہ فاطمہ زہراؑ اور بارہ امام علیہم السلام ہیں۔

۲۔ دیکھئے کتاب شواہد تحریف جزو ''حدیث کساء''۔

تمام امورِ شرعی میں پیغمبر کی حیثیت پیغام رساں کی سی ہے اور باقی احکام اسلام کی طرح مسئلۂ امامت کی بھی یہی کیفیت ہے۔ امام، خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے اور نبی صرف اس کی تبلیغ کرتا ہے۔ امامت کے متعلق نبیؐ اکرمؐ کے فرمان کی حیثیت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کی سی ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے مسلمانوں کو نماز کا حکم دیا اور بتایا کہ نماز اس طرح سے پڑھو۔ ابتدا میں یوں وضو کرو۔ پھر تکبیرِ تحریمہ کے بعد پہلی اور دوسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ ایک اور سورت پڑھو اور یوں رکوع اور سجدہ بجالاؤ اور آپ نے ہی امت کو بتایا کہ فلاں نماز کی اتنی رکعتیں ہیں اور فلاں نماز اتنی رکعات پر مشتمل ہے۔ آپ نے ہی واجباتِ نماز اور مقدماتِ نماز کی وضاحت فرمائی اور.....

رسولِ اکرمؐ نے یہ باتیں اپنی طرف سے نہیں کی تھیں۔ انہوں نے حکمِ خدا کی تبلیغ کی تھی۔ اسی طرح سے مسئلہ امامت کے متعلق بھی آپؐ نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بھی اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبان پر وحی کی مہر ثبت کی ہے اور ان کے متعلق یہ گواہی دی ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. یعنی (ہمارا نبیؐ) اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ تو وحی ہوتی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔ (سورۂ نجم: آیات ۳ و ۴)

وہ روایات جن میں عموم اہلبیتؑ کا اثبات کیا گیا ہے

احادیث کی اس قسم میں کسی خاص امام کا نام نہیں لیا گیا بلکہ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ امامت اہلبیتؑ کے ساتھ مخصوص ہے۔ بطورِ نمونہ یہ دو احادیث پیش خدمت ہیں:

(ا) حدیثِ ثقلین

پہلی روایت ہم صحیح مسلم[1] سے نقل کرتے ہیں جبکہ یہ حدیث کتبِ خلفاء کی متعدد کتابوں مثلاً مسند احمد، سنن دارمی، سنن بیہقی اور مستدرک حاکم وغیرہ میں موجود ہے۔[2]

زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع سے واپسی کے سفر پر ایک تالاب کے کنارے جس کا نام ''خم'' تھا، حضرت ختمی مرتبتؐ نے یہ خطبہ دیا:

اے لوگو! آگاہ رہو کہ میں بھی ایک انسان ہوں اور وہ وقت قریب ہے جب مجھے (عالمِ بقا کی طرف) بلالیا جائے گا اور میں اس فرمانِ حق کو قبول کرلوں گا۔ میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں بطورِ میراث چھوڑ کر جارہا ہوں۔ پہلی ''کتابِ خدا'' اس میں ہدایت اور نور ہے، اسے نہ چھوڑنا، اسے تھامے رکھنا اور دوسرے ''میرے اہلبیتؑ'' میں تمہیں اپنے اہلبیتؑ کے متعلق خدا کی یاد دلاتا ہوں۔

مستدرکِ حاکم میں اس سے آگے یہ جملہ ہے۔ دیکھنا تم میرے بعد ان دونوں سے کیسا سلوک کرتے ہو؟ اور جب تک یہ دونوں میرے پاس حوضِ کوثر پر نہ پہنچ جائیں اس وقت تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

حدیث شریف کے آخری جملے کی وجہ سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اہلبیتؑ کے ائمہ جن کی تعداد رسولِ خداؐ نے بارہ بیان فرمائی ہے، ان میں سے آخری امام کی عمر مبارک اتنی طویل ہونی چاہئے کہ دنیا کے اختتام

۱۔ صحیح مسلم، ج ۷، ص ۱۲۲، مطبوعہ مصر، ۱۳۳۴ھ۔

۲۔ حاکم نیشاپوری، مستدرک، ج ۳، ص ۱۰۹ و ۱۴۸ بقیہ مدارک کیلئے المعجم المفهرس لالفاظ الحديث النبوی دیکھیں۔

تک وہ باقی رہے تاکہ دنیا میں قرآن اور وارثِ قرآن دونوں ساتھ ساتھ رہیں اور رسولِ خداؐ کا یہ فرمان سچا دکھائی دے کہ قرآن اہلبیتؑ سے الگ نہ ہوگا اور اہلبیتؑ قرآن سے جدا نہ ہوں گے۔

ایسے ہی الفاظ رسولِ خداؐ نے خطبۂ عرفہ میں ارشاد فرمائے تھے۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسولؐ کو ایامِ حج میں عَرَفہ میں دیکھا۔ آپؐ اپنی اونٹنی عضباء پر سوار تھے اور آپؐ نے یہ خطبہ دیا:

اے لوگو! میں تم میں ایسی چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں کہ اگر تم ان سے جدا نہ ہوئے اور وابستہ رہے تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔ وہ چیز خدا کی کتاب اور میری عترت یعنی میرے اہلبیتؑ ہیں۔[1]

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد ترمذی لکھتے ہیں کہ یہ حدیث ابوذر غفاری، ابوسعید خدری، زید بن ثابت اور حذیفہ بن اُسیّد رضوان اللہ علیہم سے بھی منقول ہے۔

ان روایات میں رسولِ خداؐ نے اہلبیتؑ کو قرینِ قرآن قرار دیا اور مسلمانوں کو بتایا کہ ہدایت کا سرچشمہ قرآن اور اہلبیتؑ ہیں اور ان سے وابستگی گمراہی سے بچنے اور نجات پانے کا ذریعہ ہے اور آپؐ نے فرمایا: خیال رکھنا اور دیکھنا کہ تم میرے بعد ان دونوں سے کیا سلوک کرتے ہو اور یہ بھی جان لو کہ یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے اور حوضِ کوثر — مقامِ نجات — پر میرے پاس وارد ہوں گے۔

آسمانی کتابیں لوگوں کی رہنما اور امام ہیں اور اِعتقاد، اَخلاق اور عمل میں ''نظری حیثیت'' سے امام ہیں اور یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے۔[2]

جب قرآن کی امامت مسلم ہے تو رسولِ خداؐ نے اہلبیتؑ کو قرآن کا ہمدوش قرار دے کر ان کی امامت پر مُہرِ تصدیق ثبت کی ہے۔

الفاظ بدل کر ہم اس مفہوم کو یوں ادا کرسکتے ہیں:

نظری اعتبار سے اسلام قرآن مجید کی آیات میں دکھائی دیتا ہے اور عملی لحاظ سے اسلام اہلبیتؑ کی صورت میں دکھائی دیتا ہے اور جب ہم نظری لحاظ سے قرآن کو امام مانتے ہیں تو ہمیں عملی لحاظ سے اہلبیتؑ کو امام ماننا پڑے گا۔

نیز ہم نے دیکھا کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے ''ہدایت'' کو اپنی ان دوگراں قدر میراث میں منحصر کیا ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ اِعتقاد، اَخلاق اور عمل کے لئے قرآن مجید رہنما ہے لیکن اس کے ساتھ اہلبیتؑ کا ہونا ضروری ہے تاکہ قرآن اور اسلام کے عقائد و اخلاق و اعمال کی وضاحت ہوسکے اور ہدایت کا سامان بھی فراہم ہوسکے۔

۱۔ سنن ترمذی، ج۵، ص۶۶۲، حدیث ۳۷۸۶

۲۔ سورۂ حجر: آیت ۱۷ اور سورۂ احقاف: آیت ۱۲۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ حدیث مختلف صورتوں میں اتنے زیادہ افراد سے مروی ہے کہ اگر سب کی تفصیل بیان کی جائے تو اس کے لئے علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ ہم حدیثِ ثقلین کے طُرق و اسناد اور متن کی بحث نہیں کرنا چاہتے۔ یہاں پر ہمارا مقصد صرف یہی بیان کرنا ہے کہ رسول خداؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے امامت کو اہلبیتؑ میں منحصر کیا ہے اور آپ نے اہلبیتؑ کو قرآن کا ہم مرتبہ قرار دیا ہے۔

(ب) ائمہؑ کی تعداد کے بارے میں روایات

روایات کے اس مجموعے میں آنحضرتؐ کے بعد آنے والے ائمہ، خلفاء اور حکام کی تعداد معین کردی گئی ہے۔ البتہ ان کے افراد میں سے کسی کا نام اس میں نہیں آتا۔

اب تک مجھے یہ روایات رسول اکرمؐ کے چار صحابہ سے ملی ہیں۔ ان میں سے ایک بزرگ جابر بن سمرہؓ ہیں اور ان کی روایات صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن ترمذی، مسند طیالسی (ابو سلمان بن داؤد طیالسی) اور مسند احمد بن حنبل وغیرہ میں موجود ہیں[1]

جابر بن سمرہؓ کی روایت صحیح مسلم سے نقل کی جاتی ہے وہ کہتے ہیں:

میں اپنے باپ کے ساتھ رسول اکرمؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا: دین ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا تاوقتیکہ قیامت برپا ہوجائے اور تم پر بارہ خلیفہ ہوں گے جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔

اس روایت میں اس سے زیادہ نقل نہیں کیا گیا لیکن امیرالمومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اس حصے کا اضافہ فرمایا ہے جو اس روایت میں سے محذوف ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْاَ ئِمَّۃَ مِنْ قُرَیْشٍ غُرِسُوْا فِیْ ھٰذَا الْبَطْنِ مِنْ ھَاشِمٍ لَا تَصْلُحُ عَلٰی سِوَاھُمْ وَلَا تَصْلُحُ الْوُلَاۃُ مِنْ غَیْرِھِمْ. بلاشبہ ائمہ قریش میں سے ہوں گے جو اسی قبیلے کی ایک شاخ بنی ہاشم کی کشت زار سے ابھریں گے۔ نہ امامت کسی اور کو زیب دیتی ہے اور نہ ان کے علاوہ کوئی اس کا اہل ہوسکتا ہے۔[2]

مسند احمد بن حنبل اور مستدرک حاکم وغیرہ میں موجود روایت میں مسروق بیان کرتے ہیں کہ ہم کوفے میں عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس بیٹھے تھے اور وہ ہمیں قرآن کا درس دے رہے تھے۔ ایک شخص نے ان سے پوچھا:

۱۔ صحیح مسلم، ج۶، ص۲تا۴، کتاب الامارہ، باب النَّاسُ تبعٌ لقریشٍ۔ صحیح بخاری، ج۹، ص۸۱، کتاب الاحکام، باب الاستخلاف۔ سنن ترمذی، ج۲، ص۴۵، مطبوعہ ہندوستان اور ج۴، ص۵۰۱، حدیث ۲۲۲۵، مطبوعہ مصر۔ سنن ابوداؤد، ج۴، ص۱۰۶، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید۔ اس کے علاوہ مسند احمد بن حنبل، ج۵، ص۸۶ سے ۱۰۷ تک۔

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۲، مترجمہ مفتی جعفر حسین۔

اے ابو عبد الرحمٰن! کیا آپ نے رسولِ اکرمؐ سے یہ نہیں پوچھا کہ اس امت میں کتنے خلیفہ ہوں گے؟

عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا: جب سے میں عراق آیا ہوں تمہارے سوا کسی نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا۔

پھر کہا: ہاں! ہم نے رسولِ اکرمؐ سے اس بارے میں پوچھا تھا اور انہوں نے فرمایا تھا: اِثْنٰی عَشَرَ کَعِدَّۃِ نُقَبَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ. بارہ افراد، جتنی کہ بنی اسرائیل کے نقیبوں کی تعداد تھی۔[1]

یہ روایت انس بن مالک اور عبداللہ بن عمرو بن عاص سے نقل کی گئی ہے۔ بلاشبہ ان روایات میں سے ہر ایک کو اتنے زیادہ افراد نے نقل کیا ہے کہ اس کے نتیجے میں ان کی روایات تواتر کی حد تک پہنچ گئی ہیں اور مکمل طور پر قابلِ اطمینان ہیں۔

حدیث کی تفسیر اور شارحین کی سرگردانی

اس قسم کی احادیث سے اہلسنت کے محققین اور شارحین سخت الجھن کا شکار ہیں اور ان کے لئے ایسے معانی دریافت کرنے سے قاصر ہیں جو مکتبِ خلفاء کے مقبول عقائد سے ہم آہنگ ہوں۔ وہ صحیح طور پر آج تک یہ متعین نہیں کر پائے کہ یہ بارہ اشخاص کون ہیں اور یکے بعد دیگرے کیونکر آئیں گے تاکہ قیامت تک باقی رہیں اور یہ گروہ جس کے ساتھ اسلام کی عزت اور سربلندی وابستہ ہے کن کن خصوصیات کا حامل ہوگا۔ نیز یہ کہ آیا ہر شخص خواہ اس کی شخصیت کیسی ہی کیوں نہ ہو اس رتبے پر فائز ہو سکتا ہے یا قطعاً ضروری ہے کہ خلیفہ عادل ہو۔

اول: مشہور فقیہ ابن عربی صحیح ترمذی کی شرح میں کہتے ہیں کہ ہم رسولِ خداؐ کے خلفاء کو شمار کرتے ہیں اور انہیں یوں پاتے ہیں:

(۱) ابوبکرؓ (۲) عمرؓ (۳) عثمانؓ (۴) علیؑ
(۵) حسنؑ (۶) معاویہ (۷) یزید بن معاویہ (۸) معاویہ بن یزید
(۹) مروان (۱۰) عبدالملک بن مروان (۱۱) ولید (۱۲) سلیمان
(۱۳) عمر بن عبدالعزیز (۱۴) یزید بن عبدالملک (۱۵) مروان بن محمد بن مروان
(۱۶) سفاح (۱۷) منصور۔

اسی طرح خلفاء کی گنتی کرتے ہوئے انہوں نے اپنے زمانے (۵۴۳ھ) تک ستائیس اور اشخاص کے

۱۔ احمد بن حنبل، مسند، ج۱، ص ۳۹۸ و ۴۰۶۔ حاکم نیشاپوری، مستدرک، ج۴، ص۵۰۱۔ ملا علی متقی ہندی، کنز العمال، ج۳، ص۲۶۔ منتخب کنز العمال، ج۵، ص۳۱۲، برحاشیہ المسند۔ ابن حجر ہیثمی مکی، صواعق محرقہ، ص۲۰، دوسرا ایڈیشن ۱۳۸۵ھ۔ علی بن ابی بکر ہیثمی، مجمع الزوائد، ج۵، ص۱۹۰۔ سیوطی، الجامع الصغیر، ج۱، ص۷۵۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص۱۰، مطبوعہ پاکستان۔

نام لئے اور پھر کہا: اگر ہم ابتدائے خلافت سے بارہ اشخاص گنیں اور ان کو نظر میں رکھیں جو بظاہر خلافتِ نبوی کے حامل رہے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ سلیمان بن عبدالملک تک بارہ افراد پورے ہوجاتے ہیں اور اگر ہم انہیں شمار کریں جو درحقیقت اور صحیح معنوں میں خلافتِ نبوی کے حامل رہے ہیں تو وہ پہلے چار خلفاء اور عمر بن عبدالعزیز ہیں لہٰذا اس حدیث کے معنی میری سمجھ میں نہیں آتے۔[۱]

اس بارے میں کہ بارہ سے زیادہ خلیفہ ہوئے ہیں، اہلسنت کے نامور محدّث قاضی عیاض کہتے ہیں:

یہ اعتراض باطل ہے کیونکہ رسولِ اکرمؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ بارہ اشخاص کے علاوہ اور خلیفہ نہیں ہوں گے، نہ انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ اتنے خلیفہ ہی ہوں گے جتنے بلاشبہ ہوئے ہیں اور آنحضرتؐ کا یہ ارشاد اس بات سے مانع نہیں کہ اس تعداد سے زیادہ بھی ہوں۔[۲]

ایک اَور عالم کا کہنا ہے:

رسولِ اکرمؐ کی مراد یہ ہے کہ اسلام میں قیامت تک بارہ خلفاء ایسے ہوں گے جو حق پر عمل کریں گے اور اس گروہ میں تسلسل بھی ضروری نہیں ہے۔ اسی بنا پر ''اس کے بعد افراتفری ہوگی'' کے جملے سے آنحضرتؐ کی مراد قیامت کی نشانیاں اور اس سے پہلے دجّال کے خروج جیسے فتنے ہیں۔ بارہ خلفاء سے مراد چار خلفاء اور حسنؑ، معاویہ، عبداللہ بن زبیر[۳] اور عمر بن عبدالعزیز ہیں۔ (ان کی مجموعی تعداد آٹھ بنتی ہے) اور اس بات کا احتمال ہے کہ ان میں مہدی عباسی (۱۲۷ھ - ۱۶۹ھ) کا اضافہ بھی کیا جاسکے کیونکہ وہ عباسیوں میں ایسا ہی ہے جیسا امویوں میں عمر بن عبدالعزیز ہے اور ظاہری عدل و انصاف کی بنا پر اسے بھی اس فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ نتیجے کے طور پر دو اشخاص باقی رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک مہدی (موعودِ آخرالزماںؑ) ہیں جو اہلبیتؑ میں سے ہوں گے۔[۴] اور دوسرے کے متعلق معلوم نہیں کہ وہ کون ہوگا؟

مزید کہا گیا کہ اس حدیث میں رسولِ اکرمؐ کی مراد یہ ہے کہ خلافت کی عزت و شوکت اور اسلام کی قوت و سطوت کے زمانے میں بارہ خلیفہ ہوں گے۔ اس بنا پر آنحضرتؐ کے موردِ بحث خلفاء وہ اشخاص ہیں جن کے ادوار میں اسلام عزیز رہا ہو اور سب مسلمان ان کی شخصیت کے بارے میں اتفاقِ نظر رکھتے ہوں۔[۵]

۱۔ شرح سنن ترمذی، ج ۹، ص ۶۸ و ۶۹۔

۲۔ نووی، شرح صحیح مسلم، ج ۱۲، ص ۲۰۱۔ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری شرح صحیح بخاری، ج ۱۶، ص ۳۳۹ و ۳۴۱۔

۳۔ ابن زبیر نے نماز جمعہ کے چالیس خطبوں میں رسول اکرمؐ پر درود نہیں بھیجا۔ وہ خاندانِ رسالت سے خود کہا کرتا تھا کہ ''میں چالیس سال سے تمہارے خلاف اپنے دل میں بغض اور دشمنی پال رہا ہوں۔'' (مسعودی، مروج الذہب، ج ۳، ص ۷۹)

۴۔ ابن حجر ہیثمی مکی، صواعق محرقہ، ص ۲۱، مطبوعہ مصر۔ حافظ جلال الدین سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص ۱۶، مطبوعہ پاکستان۔

۵۔ فتح الباری، ج ۱۶، ص ۳۳۸ و ۳۴۱۔ نووی، شرح صحیح مسلم، ج ۱۲، ص ۲۰۲ و ۲۰۳۔

اہلسنت کے نامور محدّث اور شارح بیہقی اس نظریے کی وضاحت کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

مذکورہ صفات کے حامل ہونے کے ساتھ یہ تعداد ولید بن عبدالملک کے زمانے تک مکمل ہوگئی اور اس کے بعد بہت بڑی افراتفری اور بدنظمی پھیلی اور پھر حکومت عباسیوں کو مل گئی۔ بلاشبہ اگر ہم مذکورہ صفات کو نظرانداز کردیں تو تعداد بارہ سے بڑھ جائے گی اور اگر ہم افراتفری کے بعد کے خلفاء کو فہرست میں شامل کرلیں تب بھی یہی صورت ہوگی۔[1]

اس نظریے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا:

جو افراد خلافت میں موردِ اتفاق رہے ہیں ان میں سے ابتدا میں ہم تین خلفاء کو جانتے ہیں اور ان کے بعد جنگِ صفّین میں تحکیم تک علیؑ ہیں۔ تحکیم کے بعد معاویہ نے خود کو خلیفہ کا نام دیا (اور علیؑ کی خلافت کے بارے میں اتفاق ختم ہوگیا) اس کے بعد بھی حالات اسی نہج پر رہے حتیٰ کہ امام حسنؑ کی صلح کے بعد سب نے معاویہ (کی خلافت) پر اتفاق کیا اور اس کے بعد اس کے بیٹے یزید کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ حسینؑ کی خلافت قائم نہیں ہوئی اور وہ جلد ہی مارے گئے۔ یزید کی موت کے بعد دوبارہ اختلاف ہوا حتیٰ کہ خلافت عبدالملک بن مروان تک پہنچی اور جس پر عام اتفاق ہوا۔

بلاشبہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اتفاق عبداللہ بن زبیر کے قتل ۷۳ھ کے بعد ظاہر ہوا۔ عبدالملک کے بعد اس کے چار بیٹوں کی خلافت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ یہ چار اشخاص ولید، سلیمان، یزید اور ہشام تھے۔ یزید کے درمیان سلیمان کی وصیت کی بناپر خلافت عمر بن عبدالعزیز کو ملی۔ اس گروہ کا بارہواں شخص جس پر لوگوں نے اتفاق کیا ولید بن عبدالملک تھا جس نے چار سال حکومت کی۔

شافعی مذہب کے بزرگ محدّث اور مشہور فقیہ ابن حجر یہ توجیہ بیان کرتے ہیں۔

''مذکورہ احادیث کی توجیہات میں سے یہ بہترین توجیہ ہے۔''

آٹھویں صدی کے نامور مؤرخ، محدّث اور مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ راستا جس پر بیہقی چلا ہے اور ایک گروہ نے اس کے ساتھ موافقت کی ہے کہ اس حدیث سے مراد وہ خلفاء ہیں جو مسلسل ولید بن یزید بن عبدالملک تک گزرے ہیں، وہ ایسا راستا ہے جس کے بارے میں بہت تأمّل ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس ولید کے زمانے تک خلفاء کو جس طریقے سے بھی شمار کریں ان کی تعداد ان سے زیادہ بنتی ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ چار خلفاء یعنی (۱) ابوبکرؓ، (۲) عمرؓ، (۳) عثمانؓ اور (۴) علیؑ کی خلافت موردِ اتفاق اور مسلّم ہے۔ اس کے بعد (۵) حسنؑ بن علیؑ ہیں کیونکہ علیؑ نے ان کے اور ان کی خلافت کے بارے میں وصیت کی تھی اور اہلِ عراق

۱۔ حافظ عمادالدین ابوالفداء اسماعیل بن عمر دمشقی شافعی (حافظ ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ)، البدایہ والنہایہ، ج۶، ص۲۴۹۔

نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی حتیٰ کہ انہوں نے اور معاویہ نے صلح کر لی۔ (۶) معاویہ کے بعد (۷) یزید اور اس کے بعد (۸) معاویہ بن یزید اور پھر (۹) مروان، پھر (۱۰) عبدالملک بن مروان، پھر اس کا بیٹا (۱۱) ولید بن عبدالملک، پھر (۱۲) سلیمان بن عبدالملک اور پھر (۱۳) عمر بن عبدالعزیز، پھر (۱۴) یزید بن عبدالملک اور پھر (۱۵) ہشام بن عبدالملک حاکم اور خلیفہ ہوئے ہیں۔ یہ سب مل کر پندرہ اشخاص بنتے ہیں۔ ان کے بعد ولید بن یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ (جسے بیہقی نے بارہواں شمار کیا ہے) اور اگر عبدالملک سے پہلے عبداللہ بن زبیر کی حکومت کو بھی شامل کر لیا جائے تو تیرہ اشخاص بنتے ہیں۔ (ابتدائے خلافت سے گنتی کے مطابق) رسولِ اکرمؐ کے پسندیدہ بارہ خلفاء کے بارے میں ان تمام دشواریوں کے باوجود یزید بن معاویہ ان میں شامل ہو جاتا ہے اور عمر بن عبدالعزیز جیسا شخص جس کی سب بزرگوں نے تعریف کی ہے، اس فہرست سے خارج ہو جاتا ہے حالانکہ اسے خلفائے راشدین میں شمار کیا گیا ہے اور سبھی اس کی عدالت کے معترف ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ وہ ایک عادل حکمران تھا حتیٰ کہ رافضی بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ ہم فقط ان اشخاص کو معتبر جانتے ہیں جن پر امت کا اجماع ہوا ہے تو انہیں اس مشکل سے دوچار ہونا پڑے گا کہ علیؑ بن ابی طالبؑ اور ان کے فرزند حسنؑ کو خلفاء کی فہرست سے نکالنا پڑے گا کیونکہ لوگوں نے ان کی خلافت پر اتفاق نہیں کیا تھا اور تمام اہل شام نے ان کی خلافت پر بیعت نہیں کی تھی۔

اس گفتگو کے بعد ابن کثیر ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں:

ایک عالم معاویہ، یزید اور معاویہ بن یزید کو بارہ خلفاء میں شمار کرتا ہے لیکن مروان اور عبداللہ بن زبیر کو ان میں شامل نہیں کرتا کیونکہ امت نے ان میں سے ایک پر بھی اتفاق نہیں کیا تھا۔ میں کہتا ہوں اگر ہم یہ بات خلفاء کو گننے کے لئے قبول کر لیں تو ہمیں ان کی گنتی یوں کرنا پڑے گی:

(۱) ابوبکرؓ (۲) عمرؓ (۳) عثمانؓ (۴) معاویہ (۵) یزید (۶) عبدالملک
(۷) ولید (۸) سلیمان (۹) عمر بن عبدالعزیز (۱۰) یزید (۱۱) ہشام۔

یہ مل کر گیارہ بنتے ہیں۔ ان کے بعد ولید بن یزید بن عبدالملک فاسق ہے لیکن اصولاً یہ راستا قبول کرنا ناممکن ہے کیونکہ اس سے علیؑ اور ان کے فرزند حسنؑ ان بارہ افراد کی فہرست سے خارج ہو جاتے ہیں اور یہ بات دونوں مکاتب کے علماء کی تصریحات کے خلاف ہے اور اس روایت کے بھی خلاف ہے جو سفینہ نے آنحضرتؐ سے نقل کی ہے یعنی ''میرے بعد تیس سال تک خلافت ہے اس کے بعد کاٹنے والی بادشاہت ہو جائے گی۔''[۱]

۱۔ حافظ ابن کثیر شافعی، البدایہ والنہایہ، ج۶، ص۲۵۰، طبع آفسٹ، مطبوعہ بیروت۔

ابن جوزی نے اپنی کتاب ''کشف المشکل'' میں ان احادیث کو حل کرنے کے دو طریقے بتائے ہیں:

(۱) رسولِ اکرمؐ نے اپنی حدیث میں ان حوادث کی جانب اشارہ فرمایا ہے جو آپؐ کے اور صحابہؓ کے بعد رونما ہونے تھے اور درحقیقت رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ اس سلسلے میں پیوستہ اور یکساں ہیں۔ رسولِ اکرمؐ ان حکومتوں کی خبر دیتے ہیں جو آپ کے بعد قائم ہونی تھیں اور ان ارشادات کے ذریعے ان حکومتوں میں موجود خلفاء کی تعداد بتاتے ہیں اور شاید "لَا یَزالُ الدِّیْن..." [۱] کے الفاظ سے یہ مراد ہے کہ جب تک بارہ خلفاء موجود رہیں گے تب تک حکومت مضبوط اور مستحکم طریقے پر برقرار رہے گی۔ پھر اس کی شکل بدل جائے گی اور اس کے حالات و واقعات بے حد مشکل ہو جائیں گے۔ رسول اللہؐ کا پہلا خلیفہ بنی امیہ میں سے ہے اور وہ یزید بن معاویہ ہے اور ان کا آخری فرد مروان حمار ہے اور ان کی کل تعداد تیرہ ہے۔ عثمان بن عفانؓ، معاویہ اور عبداللہ بن زبیر اس میں شامل نہیں ہیں کیونکہ ان کا شمار صحابہ میں ہے۔ پس اگر اس تعداد میں سے مروان بن حکم کو اس بناپر خارج کردیں کہ اس کے صحابی ہونے میں شک ہے یا اس لئے کہ اس نے خلافت زوراور غلبہ سے حاصل کی تھی اور اس زمانے کے لوگوں نے برضا و رغبت عبداللہ بن زبیر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی تو پھر بارہ افراد کی تعداد مکمل ہوجاتی ہے۔ (اور یوں آنحضرتؐ کی پیشگوئی درست ثابت ہوتی ہے) جب خلافت بنی امیہ سے نکل گئی تو بہت بڑا فساد برپا ہوا اور بڑے عظیم حوادث رونما ہوئے اور یہ صورت اس وقت تک قائم رہی جب تک بنی عباس کی خلافت قائم نہیں ہوگئی اور اس کے بعد بھی خلافت کے حالات میں بڑی واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ابن حجر فتح الباری میں یہ لکھنے کے بعد اسے رد کرتے ہیں اور اس میں مضمر مشکلات گنواتے ہیں۔ [۲]

(۲) اس بات کا احتمال ہے کہ بارہ افراد سے عبارت اس خلافت کا تعلق امام مہدیؑ کے بعد کے دَور سے ہو جو کہ آخری زمانے میں خروج کریں گے۔ میں نے کتاب دانیال میں یہ لکھا دیکھا ہے کہ جب مہدیؑ دنیا سے رحلت فرمائیں گے تو ان کے بعد سِبطِ اکبر (حضرت امام حسنؑ) کی اولاد میں سے پانچ آدمی اور پھر سِبطِ اصغر (حضرت امام حسینؑ) کی اولاد میں سے پانچ آدمی حکومت حاصل کریں گے۔ اس گروہ کا آخری فرد وصیت کرے گا کہ سِبطِ اکبر کی اولاد میں سے ایک شخص اس کا جانشین ہو اور وہ خلافت کرے۔ پھر اس کا فرزند خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالے گا اور یوں مذکورہ بالا حکام کی تعداد مکمل ہوجائے گی اور ان میں سے ہر ایک ہدایت یافتہ (مہدی) امام ہوگا۔

۱۔ صحیح مسلم جلد ۶، صفحہ ۴، مطبوعہ مصر ۱۳۳۴ھ میں ہے کہ ''جب تک بارہ خلفاء موجود ہوں گے دین قائم رہے گا اور.....'' درحقیقت روایت کے متن میں لفظ ''دین'' کے معنی بدل دیئے گئے ہیں اور اس سے حکومت مراد لی گئی ہے جو کہ بالکل بے ربط ہے۔

۲۔ قاضی شہاب الدین احمد بن علی کنانی (ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ، فتح الباری فی شرح صحیح البخاری، ج ۱۶، ص ۳۴۰۔

اس عبارت کے بعد ابن جوزی کہتے ہیں:

ایسی روایت بھی موجود ہے جس کے مطابق اس (مہدی) کے بعد بارہ افراد حکومت پر فائز ہوں گے جن میں سے چھ امام حسنؑ کی اولاد میں سے اور پانچ امام حسینؑ کی اولاد میں سے اور ایک دوسروں میں سے ہوگا۔ جب وہ فوت ہوگا تو زمانہ فاسد ہو جائے گا۔[1]

ابن حجر ہیثمی اس حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

یہ روایت قطعاً بے بنیاد ہے لہٰذا اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔[2]

علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے:

یوں معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے اس حدیث میں اپنے بعد رونما ہونے والے عجائب کی خبر دی ہے اور ان زمانوں میں وقوع پذیر ہونے والی بدنظمی اور افراتفری کے بارے میں پیشنگوئی کی ہے۔ یہ زمانے ہوں گے جب لوگ بیک وقت بارہ امراء کے گرد جمع ہو جائیں گے اور اگر رسولِ اکرمؐ کا کوئی اَور چیز کہنے کا ارادہ ہوتا تو آپ یقیناً فرماتے: "بارہ امیر ہوں گے جن میں سے ہر ایک یہ کام کرے گا۔"

چونکہ حضورِ اکرمؐ نے ان افراد کے متعلق کوئی خبر نہیں دی لہٰذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ تمام خلفاء ایک ہی وقت میں ہوں گے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ پیشنگوئی متذکرہ بالا مفہوم کے ساتھ پانچویں صدی میں پوری ہوئی کیونکہ اس زمانے میں اندلس میں چھ آدمی ایسے تھے جن میں سے ہر ایک نے خلیفہ کا لقب اختیار کر رکھا تھا۔ ان چھ خلفاء کے علاوہ مصر کا حاکم (فاطمی خلیفہ) اور بغداد میں عباسی خلیفہ بھی موجود تھا (یوں مجموعی تعداد آٹھ ہو جاتی ہے) ان کے علاوہ کچھ اَور مدعیانِ خلافت بھی تھے جو خوارج اور ان علویوں پر مشتمل تھے جنہوں نے اسی زمانے میں خروج کیا اور عباسی خلفاء کی اطاعت کا جوا گردن سے اتار پھینکا اور حکومت اور خلافت کے مدعی بن گئے۔

یہ نقل کرنے کے بعد ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کہتے ہیں:

یہ باتیں بالخصوص وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں صرف بخاری کی مختصر روایت کا علم ہے اور جنہوں نے حدیث کے دوسرے ذرائع پر نظر نہیں ڈالی (جن میں بارہ خلفاء کے بارے میں کافی صراحت موجود ہے) علاوہ ازیں ان بہت سے خلفاء کی موجودگی بجائے خود تفاوت اور جدائی کا موجب ہے لہٰذا انہیں آنحضرتؐ کی مراد اور مقصود ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا۔[3]

یہ تھیں مذکورہ بالا احادیث کے بارے میں مکتبِ خلفاء کی تشریحات اور توجیہات جو اوپر بیان کی گئیں۔

۱۔ فتح الباری فی شرح صحیح بخاری، ج۱۶، ص۳۴۱۔ (پہلا ایڈیشن مصر) ۲۔ صواعق محرقہ، ص۲۱۔ (دوسرا ایڈیشن)

۳۔ فتح الباری، ج۴، ص۳۳۸۔ شرح نووی، ج۱۲، ص۲۰۲۔

ان روایات کا حقیقی مفہوم

اب ہم واپس لوٹتے ہیں اور روایات کے مجموعے پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان کا حقیقی مفہوم کیا ہے تا کہ ہم ان سب روایات کی نادرستی کو جن میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی واضح طور پر سمجھ سکیں۔ ان احادیث کو بنظرِ غائر دیکھنے سے جن باتوں کا پتا چلتا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) رسولِ اکرمؐ کے خلفاء کی تعداد بارہ سے تجاوز نہیں کرتی اور وہ سب کے سب قریش میں سے ہیں۔ ہمارے اس دعویٰ کی دلیل وہ واضح اور صریح الفاظ ہیں جو اس قسم کی احادیث میں سے چند ایک میں موجود ہیں۔ مثلاً وَیَکُوْنُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ اِثْنَا عَشَرَ قَیِّمًا کُلُّهُمْ مِنْ قُرَیْشٍ. اس امت کے بارہ سرپرست ہوں گے جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔[1]

یا یَمْلِکُ هٰذِهِ الْاُمَّةَ اِثْنَا عَشَرَ خَلِیْفَةً. اس امت کے بارہ خلیفہ ہوں گے۔[2]

یا یَکُوْنُ بَعْدِیْ اِثْنَا عَشَرَ خَلِیْفَةً کُلُّهُمْ مِنْ قُرَیْشٍ. میرے بعد بارہ خلفاء ہوں گے جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔[3]

''میرے بعد بارہ خلیفہ ہوں گے'' یا ''اس امت کے بارہ خلیفہ ہوں گے'' جیسے ملتے جلتے جملوں سے پتا چلتا ہے کہ خلفاء اور امت کے سرپرستوں کی تعداد حتمی طور پر بارہ تک محدود ہے۔

(۲) یہ پیشوا اور خلفاء قیامت تک مسلسل (بلافصل) امت کے درمیان موجود ہوں گے۔ اس قول کو ثابت کرنے کے لئے ہم ان روایات سے رجوع کرتے ہیں جو دستیاب ہیں۔

مسلم اپنی صحیح میں رسولِ گرامی قدرؐ کی حدیث نقل کرتے ہیں کہ:

جب تک دنیا میں فقط دو آدمی بھی باقی ہوں گے اس وقت تک اَمرِ خلافت قریش میں ہی رہے گا۔[4]

یہ حدیث جو اہلسنت کے معتبر ترین مصادر سے نقل کی گئی ہے، واضح طور پر بتاتی ہے کہ خلفاء کا سلسلہ روزِ قیامت تک مسلسل جاری رہے گا۔

اب ہم اس حدیث کو دہراتے ہیں جو پہلے بھی نقل ہو چکی ہے۔

''یہ دین قیامت تک اور تم پر بارہ خلفاء کی خلافت تک باقی رہے گا۔''[5]

۱۔۲۔۳۔ کنز العمال، ج ۱۳، ص ۲۷، حدیث ۱۶۴۔ حدیث ۱۶۵۔ حدیث ۱۶۶۔

۴۔ صحیح مسلم، ج ۶، ص ۳، مطبوعہ مصر۔

۵۔ صحیح مسلم، ج ۶، ص ۴۔ کنز العمال، ج ۱۳، ص ۲۷، حدیث ۱۶۲۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حدیث قیامت تک دین کے قائم رہنے کی خوشخبری سناتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بارہ خلفاء کی خلافت کی بھی خبر دیتی ہے اور وہ ان معنوں میں کہ رسولِ خداؐ تصریح فرماتے ہیں کہ ''میرا دین قیامت تک باقی رہے گا۔'' اور یہ بارہ خلفاء کی خلافت کی مدّت ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان خلفاء میں سے کم ازکم ایک خلیفہ کی عمر اتنی طولانی ہو کہ خلافت کی اس طویل مدت کے برابر ہونے کا امکان پیدا ہوسکے۔

یہ احادیث تحریف سے کیسے بچ گئیں؟

اب اس حسّاس نکتے کی طرف توجہ دینا ضروری ہے کہ اس قسم کی احادیث کیونکر نقل کی گئیں اور دوسرے اور بہتر لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خلافت اور بالخصوص اموی خلافت کی سخت سینسر شپ کے باوجود کیسے بچ گئیں؟

میرا خیال ہے کہ جب حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ نے پہلی مرتبہ یہ احادیث نقل کیں، اس وقت خلفاء کی تعداد کم تھی اور بلاشبہ یہ سیدھی سی بات ہے کہ ہم تصور کریں کہ وہ اس وقت اس چیز کی پیش بینی نہیں کرسکتے تھے کہ بعد میں توجیہ اور تفسیر کی خاطر انہیں کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا اور اگر وہ بروقت اس دِقّت کو بھانپ لیتے تو کتبِ خلفاء کی معتبر ترین کتابوں میں درج یہ احادیث ہم تک یا تو سرے سے پہنچتی ہی نہیں یا پھر انہیں اسی طرح سے بے اثر بنادیا جاتا جس طرح اور بہت سی معتبر اور واضح احادیث بے اثر بنادی گئی ہیں۔ اس بنا پر ہماری زیرِ بحث حدیث کی نشر و اشاعت کا سبب یہ ہے کہ جس وقت وہ نقل کی گئی تھیں اس وقت تک خلفاء کی تعداد بارہ تک نہیں پہنچی تھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو احادیث معاویہ یا یزید بن معاویہ کے عہدِ حکومت تک نقل کی گئیں ان کا تعلق اس زمانے سے ہے جب رہی خلفاء کی تعداد ابھی چھ یا سات سے متجاوز نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا خلافت کی انتظامیہ کو اس کی نشر و اشاعت سے کسی خطرے کا احساس نہ ہوا اور جب خلفاء کی تعداد بارہ سے بڑھ گئی تو اس وقت حدیث کی اشاعت کو روکنا یا اس میں تحریف کرنا ممکن نہ رہا۔

حدیث کی توجیہ میں جو مختلف اور دُور از کار باتیں فرض کی گئیں انہیں دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فقط اہلبیتؑ کا مکتب ہی مذکورہ بالا حدیث کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

آخر میں ہم یہ یاددہانی کرانا چاہتے ہیں کہ اس حدیث کی اہمیت اس بنا پر بہت زیادہ ہے کہ یہ اہلسنت کی صحاح، سُنَن، مسانید اور حدیث پر لکھی گئی دوسری کتابوں میں موجود ہے اور سبھی اس کے صحیح اور معتبر ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔

وہ روایات جن میں خلافتِ علیؑ کا اِثبات کیا گیا ہے

بارہ خلفاء والی احادیث میں جو ہم نے سابقہ صفحات میں نقل کی ہیں خلفاء کے فرداً فرداً نام نہیں لئے گئے ہیں۔ اب ہم ان احادیث کی جانب رجوع کرتے ہیں جن میں سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہونیوالے خلفاء کے ناموں کی تصریح کی گئی ہے۔ ان احادیث کے تجزیے پر ہم اپنی بحث مکمل کریں گے۔

دعوتِ ذُوالعشیرہ میں جانشینِ رسولؐ کا تعارف

اس موضوع پر پہلا متن جس سے ہم اِستناد کریں گے حدیثِ اِنذار یا حدیثِ یومُ الدار ہے۔ یہ حدیث اہلسنت کے بہت سے معتبر تاریخی اور روائی مصادر و مَدارک مثلاً تاریخ طبری، تاریخ ابن اثیر، تاریخ ابوالفداء، مسند احمد، کنزالعمال، تاریخ ابن الوردی اور دلائل النبوۃ بیہقی وغیرہ میں موجود ہے۔ اگرچہ اجمال اور تفصیل کے لحاظ سے ان کی روایات ایک دوسرے سے قدرے متفاوت ہیں۔ ہم مذکورہ بالا واقعہ کو تاریخ طبری سے نقل کریں گے جو اس موضوع پر قدیم مَصادِر میں سے ہے اور مکتبِ خلفاء کی معتبر ترین تاریخی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

''حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ جب (سورۂ شعراء کی آیت ۲۱۴) وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو رسولِ اکرمؐ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے اَعزّاء و اقرباء کو اللہ کی جانب دعوت دوں اور انہیں خبردار کروں۔ میرے اندر اس کی طاقت نہیں ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جب بھی میں اس کا آغاز کروں گا تو ناپسندیدہ حالات کا مجھے سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے میں نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ پھر جبریل امینؑ مجھ پر نازل ہوئے اور انہوں نے کہا: اے محمدؐ! اگر آپؐ نے حکمِ پروردگار کی تعمیل نہ کی تو پروردگار آپ کو عذاب دے گا۔ (اے علیؑ! اب تأخیر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔) لہٰذا تم تھوڑا سا کھانا تیار کرو، پھر عبدالمطلب کی اولاد کو ہمارے ہاں کھانے پر مدعو کرو تاکہ میں اس حکمِ پروردگار کو ان تک پہنچا سکوں جس کے متعلق مجھے حکم دیا گیا ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: میں نے آنحضرتؐ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لوگوں کو مہمانی پر بلایا اور اس وقت ان کی تعداد کم و بیش چالیس تھی۔ جب وہ سب کے سب جمع ہوگئے تو آپؐ نے مجھے کھانا لانے کا حکم دیا۔ میں کھانا لے آیا اور آپؐ کے سامنے رکھ دیا۔ آپؐ نے اس میں سے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اپنے دانتوں سے اسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا اور کھانے کے گرداگرد ٹکڑے ڈال دیئے۔

پھر آپؐ نے فرمایا: اللہ کا نام لے کر شروع کرو۔

سبھی نے کھایا اور سیر ہوگئے۔ میں اُس کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضے میں علیؑ کی جان ہے کہ جو کچھ میں لایا تھا اسے ایک شخص ہی کھا سکتا تھا لیکن چالیس اشخاص نے کھایا اور سیر ہوگئے اور کھانا پھر بھی بچ رہا۔

اس کے بعد رسولِ اکرمؐ نے مجھ سے فرمایا: انہیں سیراب کرو۔ میں نے ان کے لئے لسی تیار کی ہوئی تھی چنانچہ میں وہ لسی لے آیا۔ اس لسی کی مقدار اتنی تھی کہ اسے ایک آدمی ہی پی سکتا تھا لیکن ان سب نے سیر ہو کر پی۔

جب لوگ کھا پی چکے تو رسولِ خداؐ نے ان سے گفتگو کرنا چاہی مگر ابولہب نے آنحضرتؐ پر سبقت کی اور بولا: اس نے تم پر جادو کر دیا ہے۔[1]

ابولہب کی یہ بات سن کر حاضرین اٹھ کر چلے گئے اور رسولِ خداؐ کوئی بات نہ کر سکے۔ اس واقعے میں ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ جب ابولہب نے آپ کے پورے منصوبے کو "جادو" کہہ کر ناکام کر دیا تو آپ نے بھی کوئی گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا اور یوں یہ مجلس برخاست ہوگئی اور سب لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے۔

رسولِ خداؐ نے پھر دوسرے دن مجھے حکم دیا کہ دعوت کا سامان تیار کروں اور لوگوں کو کھانے پر بلاؤں۔ لوگ کھانے کے لئے جمع ہوئے۔ رسولِ خداؐ نے ابولہب کو بولنے کا موقع نہ دیا اور آپ نے اپنے رشتہ داروں سے فرمایا: اے فرزندانِ عبدالمطلب! خدا کی قسم! میں عرب کے کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو اپنی قوم کے لئے اس تحفے سے بہتر کوئی چیز لایا ہو جو میں تمہارے لئے لایا ہوں۔ میں تمہارے لئے دنیا اور آخرت کی بھلائی لایا ہوں۔ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس کی جانب دعوت دوں۔ تم میں سے کون ہے جو تکلیفوں میں میرا ساتھ دے اور رسالت کی ادائیگی میں میری مدد کرے تا کہ وہ تمہارے درمیان میرا بھائی، وصی اور خلیفہ ہو۔

۱۔ جب ابولہب نے دیکھا کہ ایک شخص کے کھانے اور ایک شخص کی لسی سے رسولِ خداؐ نے چالیس آدمیوں کو سیر کر دیا ہے تو اس کے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ اب آپؐ اپنی نبوت کا اعلان کریں گے لہٰذا اس نے رسولِ خداؐ کی گفتگو روکنے کے لئے مداخلت کی اور کہا کہ "محمدؐ نے تم پر جادو کر دیا ہے" جس کی وجہ سے رسولِ خداؐ نے سکوت فرمایا اور کچھ کہنا مناسب نہ جانا کیونکہ جب کوئی رسول اللہؐ کی بات کی تکذیب کرے اور اسے بے اثر بنادے تو رسول اللہؐ کا سکوت کرنا ایک معقول بات ہے۔

اسی طرح جب رسولِ خداؐ نے مرض الموت میں قرطاس و قلم مانگا اور حضرت عمرؓ نے مداخلت کی اور آپ کی بات کو بے اثر بنانے کے لئے کہا اِنَّ الرَّجُلَ لَیَھْجُر یعنی رسول اللہؐ ہذیان کہہ رہے ہیں تو آپؐ نے سکوت فرمایا اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ تمام لوگ خاموش رہے اور کسی نے بھی آنحضرتؐ کی بات کا جواب نہ دیا۔ تاہم میں نے جو اُن میں سب سے چھوٹا تھا کہا: اَنَا یَانَبِیَّ اللّٰہِ اَکُوْنُ وَزِیْرَکَ عَلَیْہِ. یا نبی اللہ! میں بارِ رسالت اٹھانے میں آپ کا وزیر اور مددگار بنوں گا۔[1]

رسولِ اکرمؐ نے اپنا ہاتھ میری گدی پر رکھا اور فرمایا: اِنَّ ھٰذَا اَخِیْ وَ وَصِیِّیْ وَ خَلِیْفَتِیْ فِیْکُمْ فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَاَطِیْعُوْا. یہ میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا خلیفہ ہے۔ یہ جس بات کا حکم دے اس پر کان دھرو اور اس کی اطاعت کرو۔

بنی ہاشم کے بڑے بوڑھے اور قبیلے کے بزرگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ تمسخر آمیز انداز میں ہنس رہے تھے اور ابوطالبؑ سے کہہ رہے تھے کہ تمہارا بھتیجا تمہیں حکم دے رہا ہے کہ تم اپنے کمسن بیٹے کی اِطاعت کرو حالانکہ تم قریش کے شیخ اور رئیس ہو۔''[2]

یہ پہلا دن تھا جب رسولِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو امت کے امام کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اس دن جبکہ پہلی دفعہ اسلام کی رسمی اور علانیہ دعوت دی گئی آنحضرتؐ نے تین بنیادی چیزوں کی دعوت دی۔ یعنی اللہ کی توحید کی دعوت، اپنی نبوت ورسالت کی دعوت اور علی بن ابیطالبؑ کی وزارت، خلافت اور وصایت کی دعوت۔ اس کا پہلا عنوان وزارت ہے جو رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے زمانے سے وابستہ ہے اور خلافت و وصایت کے عنوانات کا تعلق آنحضرتؐ کی وفات کے بعد کے زمانے سے ہے۔ وزارت سے مراد تبلیغ کا بھاری بوجھ اٹھانے میں امام علیؑ کا رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں ان کے ساتھ اتحادِ عمل ہے اور وصایت و خلافت کا مفہوم آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد امام علیؑ کا وہی بوجھ تن تنہا اٹھانا ہے۔

ہم پہلے اس حقیقت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ ہر شخص کا خلیفہ وہی کام کرتا ہے جو وہ خود کرتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر کا خلیفہ بھی پیغمبر کے کام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ اس کی زندگی میں اس کے خاص کام یعنی تبلیغ میں اس کا شریک ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کے کام کو جاری رکھتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ حکومت کا

۱۔ حضرت ہارونؑ، حضرت موسیٰؑ کے وزیر تھے، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کی دعا مذکور ہے: وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ھٰرُوْنَ اَخِی اشْدُدْ بِہٖٓ اَزْرِیْ وَاَشْرِکْہُ فِیْٓ اَمْرِیْ. اور میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارونؑ کو میرا وزیر بنادے، اس کے ذریعے سے میری پشت مضبوط کردے اور میرے کام میں اس کو شریک بنا۔ (آیات ۲۹ تا ۳۲) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی دعا قبول فرمائی اور حضرت ہارونؑ کو ان کا وزیر بنایا جیسا کہ سورۂ فرقان میں ہے: وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَہٗٓ اَخَاہُ ھٰرُوْنَ وَزِیْرًا. ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی اور اس کے ساتھ ان کے بھائی ہارونؑ کو ان کا وزیر بنایا۔ (آیت ۳۵)

۱۔ طبری، تاریخ، ج۲، ص ۳۱۹ تا ۳۲۱، مطبوعہ دار المعارف، ۱۹۶۸ء، مصر۔ طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۱۹، ص ۷۴۔ ابوالحسن عزالدین علی بن ابی الکرم جزری (ابن اثیر المتوفی ۶۳۰ھ) الکامل فی التاریخ، ج ۲، ص ۴۱، مطبوعہ دار الکتاب العربی۔

حاصل ہوتا ہے۔ بلاشبہ حکومت — پیغمبری کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں ہے اور پیغمبری کے لئے حکومت کچھ ضروری بھی نہیں ہے۔ البتہ پیغمبر کو حاکم ہونا چاہئے اور اس کی موجودگی میں کسی دوسرے آدمی کو حکومت کا کوئی حق نہیں ہوتا اور پیغمبر کی موجودگی میں دوسروں کی حکومت صحیح نہیں ہوتی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پیغمبر کی بعثت کا مقصد حکومت کا حصول نہیں ہوتا کہ اگر اسے حکومت حاصل نہ ہو تو اس کی پیغمبری میں خلل و تناقض واقع ہوجائے۔ حضرت عیسیٰؑ کو ان کی ساری زندگی میں حکومت اور مادی قوت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی تمام عمر احکامِ الٰہی کی تبلیغ میں صرف کردی تھی لیکن کیا اس بنا پر ان کی پیغمبری میں کوئی خلل واقع ہوا؟

حضرت خاتم الانبیاءؐ نے ہجرت سے پہلے جو تیرہ سال مکے میں گزارے اس دوران وہ حاکم نہیں تھے لیکن ان کی پیغمبری میں کوئی نقص اور خلل واقع نہیں ہوا تھا لہٰذا اگر امام علیؑ ایک وقت میں حاکم ہوں اور ایک وقت میں حاکم نہ ہوں تو اس سے ان کی خلافت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور ان کی امامت کی بنیاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

یہ جو رسولِ اکرمؐ نے اس موقع پر امام علیؑ کا تعارف بطورِ خلیفہ کرایا ہے اس سے آپ کے پیش نظر کیا چیز تھی؟ کیا وہ آپ کو اسلامی معاشرے کے حاکم کے طور پر متعارف کرانا چاہتے تھے اور اپنے بعد ان کی حکومت کو مستحکم کرانا چاہتے تھے؟

نہیں! انہوں نے حاکم کا تعین نہیں کیا بلکہ آپ کے لئے حاکم سے بھی برتر اور بالاتر مقام تجویز کیا ہے اور آپ کو پیغمبر کے وصی اور وزیر اور پیغمبر کے بعد اللہ تعالیٰ کے احکام کے مبلّغ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ اس مفہوم کے ساتھ کہ خلافت ایک بلند مقام کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس میں خالص اور غیر تحریف شدہ اسلام کی حفاظت اور اشاعت، عادلانہ اسلامی حکومت اور قضاوت کا عظیم عہدہ اور جمعہ اور جماعت کی امامت بھی چیزیں شامل ہیں لیکن یہ باقی چیزوں کو چھوڑ کر ان میں سے فقط کسی ایک چیز کے برابر نہیں ہے۔

رسولِ اکرمؐ کے بعد سرپرست

ایک اور روایت میں جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کرچکے ہیں اور جس کا ذکر امیر المومنینؑ کی جنگی مہم کے سلسلے میں آیا تھا ہم نے دیکھا کہ آنحضرتؐ نے فوج کے دو دستے یمن بھیجے۔ ان میں سے ایک دستہ امام علیؑ کی سرکردگی میں اور دوسرا دستہ خالد بن ولید کی کمان میں بھیجا گیا۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا کہ اگر دونوں لشکر وہاں اکٹھے ہوجائیں تو کمان امام علیؑ کریں گے۔

خالد نے، جس میں زمانہ جاہلیت کی عادات و خصائل بدرجۂ اتم موجود تھیں، اس فیصلے پر بہت برا منایا۔

لہٰذا اس مشن کے مکمل ہونے کے بعد اس نے چند افراد کو بھیجا تاکہ وہ رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں امام علیؑ کے خلاف ایک شکایت نامہ پیش کریں۔

صحابیٔ رسول بریدہؓ، جو شکایت نامہ لے کر گئے، کہتے ہیں:

میں نے وہ چٹھی جو میرے پاس تھی آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کی اور پڑھ کر آپ کو سنائی۔ اسے سن کر آنحضرتؐ کو اِس قدر غصہ آیا کہ اس کے آثار مجھے آپ کے چہرۂ مبارک پر دکھائی دیے۔ اس موقع پر میں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ چٹھی خالد نے بھیجی ہے اور مجھے آپ کی خدمت میں پہنچانے کا حکم دیا ہے۔ چونکہ وہ میرا سالار ہے اس لئے میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: علیؑ کی برائی مت کرو۔ وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور وہ میرے بعد تمہارا ولی، سرپرست اور صاحبِ اختیار ہے۔[۱]

حدیث کے ایک اور متن میں مندرجہ بالا حدیث میں اضافہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب بریدہؓ نے رسولِ اکرمؐ کے غصے کو دیکھا تو گویا انہیں اپنے اسلام میں شک ہوگیا لہٰذا انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! میں آپ کو رفاقت کے ان حقوق کی قسم دیتا ہوں جو ہمارے درمیان موجود ہیں کہ چونکہ میں نے آپ کو غصہ دلایا ہے اس لئے آپ دوبارہ اپنا ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں ایک دفعہ پھر آپ کے ہاتھ پر اسلام کے لئے بیعت کروں اور میرا گناہ بخشا جائے۔[۲]

اس روایت کی بنیاد پر امام علیؑ، رسولِ اکرمؐ کے بعد مسلمانوں کے سرپرست، صاحبِ اختیار اور ولی ہیں یعنی صحیح معنوں میں اس ولایت کے مقام پر آنحضرتؐ کے جانشین ہیں جو آپ کو لوگوں کی جان و مال پر حاصل ہے تاکہ وہ اس قوت اور اختیار کو ہر پہلو میں ان کی (یعنی عوام کی) دینی اور دنیاوی مصلحت کے مطابق استعمال میں لائیں۔

ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے امیرالمومنینؑ سے فرمایا: اَنْتَ وَلِیُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِیْ. میرے بعد تم ہر مومن کے ولی، سرپرست اور صاحبِ اختیار ہو۔[۳]

ایک اور روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب راوی امامؑ کے بارے میں شکایت لے کر پہنچتا ہے تو آپ فرماتے ہیں: نہیں! اس قسم کی باتیں علیؑ کے بارے میں مت کہو وہ میرے بعد ہر شخص سے بڑھ کر لوگوں پر ولایت، حکم اور ارادہ نافذ کرنے کے حقدار ہیں۔[۴]

۱۔ احمد بن حنبل، مسند، ج۵، ص۳۵۶۔ نسائی، خصائص، ص۲۴۔ مجمع الزوائد، ج۹ ص۱۲۷۔ کنزالعمال، ج۱۳، ص۳۰۷ تا ۳۱۲۔

۲۔ مجمع الزوائد، ج۹، ص۱۲۸۔ ۳۔ مسند طیالسی، ج۱۱، ص۳۶۰۔ ایک اور روایت میں یوں ہے: اِنَّکَ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ بَعْدِیْ

۴۔ اُسُد الغابہ، ج۵، ص۹۴۔ مجمع الزوائد، ج۹ ص۱۰۹۔

ان روایات کی بناپر جو اب تک ہماری نظر سے گزر چکی ہیں، رسولِ اکرمؐ نے علیؑ بن ابی طالبؑ کے لئے اپنی خلافت، وزارت اور وصایت کے مقامات کا صداقت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ان کا تعارف ان درجات اور مراتب کے ساتھ کرایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ خود آپ کے بعد سب مومنین کے ولی ہیں۔

آیتِ وَلایت

امام علیؑ نے مسجدِ نبوی میں حالتِ رکوع میں ایک سائل کو اپنی انگشتری عطا کی جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝

تمہارا ولی بس اللہ اور اس کا رسولؐ اور وہ مومن ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۵۵)

اس آیت میں بھی امامؑ کی ولایتِ عامہ کی تصریح کی گئی ہے اور اہلسنت کی کتابوں میں موجود متعدد روایات میں اس امر کی جانب اشارہ ہوا ہے۔ یہ تمام اہلسنت کی معتبر روایات تھیں جن سے پتا چلتا ہے کہ رسولِ پاکؐ نے کس طرح وصیت کی ہے اور آپ کے مرض الموت میں حالات نے کیا رخ اختیار کیا؟

آنحضرتؐ چاہتے تھے کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے اُن ارشادات کو جو انہوں نے اپنے وصی اور لوگوں کے حاکم کے متعلق کہے تھے تحریری شکل دیں اور اسے ایک محکم دستاویز کی صورت دے کر اس پر گواہوں کی گواہی ثبت کرائیں۔

آنحضرتؐ کی زندگی کا معمول تھا کہ اپنے اہم فرامین کی دستاویز تیار کراتے تھے اور اس پر مہر ثبت کر کے اپنے دستخط فرماتے تھے اور گواہوں کی گواہیاں ڈلواتے تھے۔ اس کے بعد آپ اس دستاویز کو عرب قبائل یا غیر عرب سرداروں کے پاس روانہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے زندگی کے آخری لمحات میں بھی یہی ارادہ کیا تھا۔ لیکن آپؐ کو اس کی اجازت نہیں دی گئی اور آپؐ سے ایسی باتیں کہی گئیں جنھوں نے معاشرے میں آپؐ کی نبوت کی قبولیت پر ہی کئی سوالیہ نشان ڈال دیئے تھے۔ یہی وہ موقع تھا جب آپؐ نے خاموشی کو ترجیح دی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ مسئلہ اس وقت اچانک پیش نہیں آیا بلکہ آنحضرتؐ کی حیاتِ مبارکہ کے تمام حساس اَدوار میں اور اسلام کی پیش رفت کے تمام اہم مرحلوں میں آنحضرتؐ کی جانشینی کا ہر ہر پہلو سے اعلان کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے خوفناک اَدوار میں بھی —— جب امویوں اور عباسیوں کے ہاتھوں آلِ محمدؐ کے محبّوں کا قتلِ عام کیا جاتا تھا اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر انہیں صلیب دی جاتی تھی —— یہ معتبر نصوص اہلسنت کے

اول درجے کے مصادر کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہماری یہ بحث خِتَامُہٗ مِسْکٌ کا نمونہ پیش کرے اس لئے ہم مکتبِ خلفاء کے حوالہ سے وصی اور وصیتِ پیغمبرؐ کے متعلق دو مزید احادیث پیش کر کے بحث کو مکمل کرنا چاہتے ہیں۔

حدیثِ اول

طبرانی اور اس کے علاوہ مکتبِ خلفاء کے چوٹی کے محدّثین نے رسولِ خداؐ کے عظیم المرتبت صحابی حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسولِ اکرمؐ سے عرض کیا: یارسول اللہؐ! ہر پیغمبر کا کوئی نہ کوئی وصی ہوتا ہے۔ آپ کا وصی کون ہے؟

رسولِ خداؐ نے اس وقت تو خاموشی اختیار کی مگر اس کے بعد پھر میری اور ان کی ملاقات ہوئی تو آپؐ نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ یہ آواز سن کر میں تیزی سے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور لبیک کہی تو آپؐ نے فرمایا: جانتے ہو حضرت موسیٰؑ کے وصی کون تھے؟

میں نے عرض کیا: جی ہاں! حضرت موسیٰؑ کے وصی حضرت یوشع بن نونؑ تھے۔

آپ نے فرمایا: وہ حضرت موسیٰؑ کے وصی کیوں بنے؟

میں نے کہا: اس لئے کہ اس زمانے میں وہ تمام لوگوں سے زیادہ علم رکھتے تھے۔

چنانچہ اس کے بعد رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: میرا وصی اور میرے اَسْرار کا مقام اور میرے بعد تمام لوگوں میں بہترین شخص، جو میرے وعدوں کو پورا کرے گا اور جو میرا قرض ادا کرے گا، وہ علیؑ بن ابی طالبؑ ہے۔

حدیث کا تجزیہ

رسولِ خداؐ سے یہ سوال حضرت سلمانؓ نے کیا تھا اور حضرت سلمانؓ کی تاریخ یہ ہے کہ رسولِ خداؐ کی ملاقات سے قبل وہ اصفہان کے علاقے ''جی'' میں رہتے تھے۔ ان کے والد کا تعلق بزرگانِ مجوس سے تھا۔ جب ایک عیسائی قافلہ اصفہان آیا اور وہ اس سے ملے تو انہوں نے مجوسی مذہب چھوڑ کر حضرت عیسیٰؑ کا دین قبول کیا اور اپنے آبائی گھر کو چھوڑ کر اس قافلے کے ساتھ ایران سے چلے گئے۔

حضرت سلمان فارسیؓ کئی برس شام اور عراق کے راہبوں کی خانقاہوں میں رہے۔ انہوں نے نصرانی مذہب کے بزرگ علماء سے علمِ دین حاصل کیا اور انبیائے سَلَف کی آسمانی کتابوں بالخصوص توراۃ، زبور اور انجیل کی تعلیم حاصل کی۔ نیز انبیائے سَلَف کی تاریخ اور روشن زندگی کے متعلق بھی کافی معلومات حاصل کیں اور پھر

انہیں میں سے ایک نصرانی عالم کی رہنمائی کی بدولت حضرت سلمان فارسیؓ مدینہ آئے اور انہوں نے یہ طویل سفر حضرت خاتم الانبیاءؐ کے شرفِ صحبت کی غرض سے طے کیا تھا۔

جب مقدر نے یاوری کی اور سلمانؓ اپنا گوہرِ مقصود پانے میں کامیاب ہو گئے اور رسولِ اکرمؐ پر ایمان لے آئے تو رسولِ خداؐ نے بھی انہیں خاطر خواہ مقام عطا فرمایا اور وہ رسولِ خداؐ کے عظیم المرتبت صحابی بن گئے۔[۱]

اب اُسی سلمانؓ نے آنحضرتؐ سے یہ سوال کیا کہ ہر نبی کا وصی ہوتا ہے، چنانچہ آپ کا وصی کون ہے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبرِ اکرمؐ اس کا فی الفور جواب نہیں دیتے اور خاموش رہتے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں ممکن ہے کہ رسولِ خداؐ نے مصلحت کی بنا پر خاموشی اختیار کی ہو کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ اس کا جواب بہت سے لوگوں پر گراں گزرے گا۔

رسولِ خداؐ کی مصلحت آمیز خاموشی پر ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا کیونکہ ہم نے آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ میں کئی ایسے مواقع دیکھے ہیں جہاں آپ کسی مصلحت کی وجہ سے خاموش رہے تھے۔ ان مواقع میں سے ایک موقع حضرت زید بن حارثہؓ کی مطلقہ حضرت زینب بنت جحشؓ کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش کا تھا۔ آپؐ چاہتے تھے کہ حضرت زینبؓ سے نکاح کریں لیکن آپؐ لوگوں کے طعنوں سے ڈرتے تھے اس لئے آپ نے کچھ عرصے تک اپنی اس خواہش کو دل میں چھپائے رکھا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حضرت زینب سے نکاح کرنے کا حکم دیا تو آپؐ نے فرمانِ خداوندی کی تعمیل کی۔

آنحضرتؐ کی بُربنائے مصلحت خاموشی کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَی النَّاسَ... آپؐ اپنے دل میں اس بات کو چھپا رہے تھے جسے خدا ظاہر کرنے والا تھا اور آپؐ لوگوں سے ڈر رہے تھے۔ (سورۂ احزاب: آیت ۳۷)

ممکن ہے حضرت زینبؓ سے نکاح کی طرح سے رسولِ خداؐ نے حضرت سلمانؓ کے جواب میں بھی خاموشی اختیار کی ہو۔ بہر حال رسولِ خداؐ کے جواب کے اس انداز میں کئی حکمتیں تھیں۔

(ا) حضرت سلمانؓ کے متعلق امیر المومنینؑ نے فرمایا تھا: سلمانؓ نے اوّلین و آخرین کا علم سیکھا ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سابقہ کتابوں اور سابقہ انبیاءؑ کی سیرت و سنت کا علم سلمانؓ نے اہلِ کتاب کے علماء سے سیکھا ہے اور انہوں نے خاتم الانبیاءؐ سے قرآن و سنت کا علم حاصل کیا ہے۔

اسی اوّلین و آخرین کے علوم کے حامل سے پوچھا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے وصی کون تھے؟ تو وہ بتاتے ہیں کہ یوشع بن نونؑ تھے۔ پھر پوچھا جاتا ہے کہ یوشعؑ کی وصایت کا سبب کیا تھا؟ وہ کہتے ہیں کہ وہ امت موسیٰؑ کے سب سے بڑے عالم تھے اس لئے وہ وصی موسیٰؑ کے عہدہ پر فائز ہوئے تھے۔

۱۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، اُسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ اور الاصابہ فی تمییز الصحابہ۔

(ب) پیغمبرِ اکرمؐ جب حضرت سلمانؓ کا امتحان لے لیتے ہیں اور یہ سنتے ہیں کہ حضرت یوشعؑ کی وصایت کی اَساس علم پر قائم تھی تو آپ فوراً فرماتے ہیں کہ "علیؑ میرا وصی ہے۔"

اس طرح سے آنحضرتؐ نے حضرت سلمانؓ کو یہ درس دیا کہ اگر وسعتِ علم کی بنیاد پر حضرت یوشعؑ، حضرت موسیٰؑ کے وصی مقرر ہوئے تھے تو اسی سبب سے علیؑ میرا وصی ہے۔

(ج) پیغمبر اکرمؐ اور حضرت سلمانؓ کے سوال و جواب میں مسلمانوں کو مسئلہ وصایت کی اَساس سے آگاہ کرنا مقصود تھا۔

آنحضرتؐ نے امت کو یہ بتایا کہ امام علیؑ اس لئے وصی نہیں ہیں کہ وہ میرے چچازاد بھائی ہیں کیونکہ اگر وصایت کا دار و مدار رشتہ داری پر ہوتا تو اس وقت عباس بن عبدالمطلب بھی زندہ تھے اور ان کے بیٹے بھی موجود تھے۔ امام علیؑ کی وصایت کی بنیاد دامادی پر بھی نہیں تھی کیونکہ شاید اس وقت کوئی اور داماد بھی زندہ ہو۔ امام علیؑ کی وصایت کی بنیاد ان کی بے مثال فداکاری، جانبازی اور جنگوں میں ان کے قائدانہ کردار پر بھی نہیں تھی۔ اگرچہ امام علیؑ جیسا شجاع چشمِ فلک نے نہیں دیکھا تھا مگر اس کے باوجود ان کی وصایت ان کی شجاعت کی مرہونِ منت نہیں تھی۔ امام علیؑ کی سبقتِ اسلام بھی اگرچہ ان کا امتیازی اعزاز ہے مگر اس اعزاز پر بھی انہیں وصی مقرر نہیں کیا گیا۔ امام علیؑ کی وصایت کی بنیاد یہ بھی نہیں تھی کہ باقی صحابہ کے برعکس ان کی پیشانی کبھی کسی بت کے آگے نہیں جھکی تھی۔

رسولِ خداؐ کی نظر میں امام علیؑ کی ایک ایک فضیلت موجود تھی مگر رسولِ خداؐ اسلام کے تحفظ کیلئے وصی مقرر کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ چاہتے تھے کہ وصی ایسا ہو جو اسلام کی حفاظت کرنا جانتا ہو۔ حفاظتِ اسلام کے لئے تمام چیزوں سے بڑھ کر علم کی ضرورت ہے۔ جو شخص تمام لوگوں سے زیادہ عالم ہوگا وہی اسلام کو تحفظ فراہم کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہوگا۔ اسی لئے جیسے ہی آپؐ نے حضرت سلمانؓ کا یہ جواب سنا کہ حضرت یوشعؑ اس لئے وصی تھے کہ وہ پوری امتِ موسیٰؑ میں سب سے بڑے عالم تھے تو آپ نے فوراً فرمایا کہ "میرا وصی علیؑ ہے۔" اس طرح آپ نے امت کو رہتی دنیا تک یہ درس دیا کہ میرے بعد پوری امت میں علیؑ جیسا کوئی عالم نہیں ہے۔

(د) سلمانؓ اور سلمانؓ مزاج بہت سے صحابہ کو علم تھا کہ امام علیؑ ہی رسولِ اکرمؐ کے وصی ہیں مگر انہوں نے یہ سوال کر کے بیک وقت دو فائدے حاصل کئے:

پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ جو لوگ مولا علیؑ کو وصی مانتے تھے ان کے اطمینانِ قلب میں اضافہ ہوا اور حضرت ابراہیمؑ کی طرح بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کہہ کر انہوں نے دولتِ اطمینان میں اضافہ کیا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی صفوں میں چھپے ہوئے منافقین کو بھی یہ بتلا دیا گیا کہ وہ وصایت کی توقع نہ رکھیں کیونکہ وصایت کا دار و مدار کثرتِ علم پر ہے۔

حدیث دوم

پیغمبرِ اسلامؐ کے ایک دوسرے صحابی حضرت بریدہؓ [۱] سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہر پیغمبر کا وصی ہوتا ہے اور میرا وصی اور وارث علیؑ ہے۔ [۲]

حدیثِ غدیر اور حدیثِ منزلت اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی جیسی احادیث جن سے امام علیؑ کی امامت کا اثبات ہوتا ہے کے متعلق مکتبِ خلفاء سے وابستہ علماء کی صدیوں سے یہ رَوِش رہی ہے کہ ایسی تمام احادیث کی تاویل کر کے انہیں بے اثر ثابت کیا جائے اور مسلمانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ ایسی احادیث سے امام علیؑ کی ایک گونہ فضیلت تو ثابت ہوتی ہے لیکن ان سے امام علیؑ کی امامت اور وصایت ثابت نہیں ہوتی۔

اس کے بعد دوسرے مرحلے کے طور پر مکتبِ خلفاء نے ایسی روایات و احادیث وضع کی ہیں جن کے مقابلے میں فضائلِ علیؑ کی احادیث بے وقعت دکھائی دیتی ہیں۔ [۳]

رسولِ خداؐ کی بہت سی احادیث میں امام علیؑ کی وصایت و امامت کی تصریح کی گئی ہے۔ ایسی احادیث کو منظرِ عام سے غائب کرنے کے لئے حضرت عائشہؓ سے لے کر مسلسل سات صدیوں تک کوششیں کی گئی ہیں اور کتمان و تحریف کے دس طریقوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب معالم المدرستین میں ان دس طریقوں کی مکمل نشان دہی کی ہے اور اسّی (۸۰) سے زائد صفحات میں کتمان و تحریف کی قلعی کھول دی ہے۔ [۴]

سات سو سال کی طویل کوششوں کا اثر یہ نکلا کہ امام علیؑ کا مشہور لقب ''الوصی'' طاقِ نسیان کی نذر ہو گیا اور اس وقت حضرت کا یہ لقب لوگوں کو فراموش ہو چکا ہے۔

ان مباحث کے بعد ہم ان احادیث و روایات کا تجزیہ کریں گے جن میں تحریف کی گئی یا جنہیں

۱۔ بریدہ بن عبداللہ اسلمی کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ غزوۂ احد کے بعد انہوں نے مدینے ہجرت کی تھی اور باقی غزوات میں شریک ہوئے تھے۔ جب شہر بصرہ قائم ہوا تو انہوں نے بصرہ میں رہائش اختیار کی۔ پھر جنگِ خراسان میں شامل ہوئے اور ''مرو'' میں وفات پائی۔ (اسد الغابہ، ج ۲، ص ۱۷۵)

۲۔ حضرت سلمانؓ، حضرت بریدہؓ اور وصایت کی دوسری احادیث کے ساتھ ساتھ ایسے اشعار جو امرِ وصایت کے بارے میں کہے گئے ہیں اور اس کے احتجاجات کے لئے ہماری کتاب معالم المدرستین کی جلد اول کا مطالعہ فرمائیں۔

۳۔ ایسی روایات کے لئے ہمارے گزشتہ مباحث کی طرف رجوع کریں۔ وہاں ہم نے احادیثِ غنا و موسیقی اور حضرت عثمانؓ کے شرم و حیا کی داستانوں اور موافقاتِ عمرؓ کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔

۴۔ کتمان و تحریف کی چیدہ مثالوں کے لئے ضمیمہ ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

وضع کر کے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کردیا گیا۔ ان احادیث کی بحث میں ہم یہ واضح کریں گے کہ ان جعلی روایات اور احادیث سے امتِ اسلامیہ کے عقائد پر کیا مضر اثرات مرتب ہوئے اور مسلمانوں کے عقیدہ وفکر کو کس طرح سے مسموم کیا گیا۔ نیز یہ کہ صفاتِ ربوبیت اور انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت اور اسلامی احکام پر ان کے برے اثرات کس طرح سے مرتب ہوئے۔ ان کے ذریعے سے اسلامی احکام وعقائد میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں؟

اس موضوع پر تفصیلی بحث کے بعد انشاءَ اللہ ہم بتائیں گے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح سیرت وحدیث کے احیاء کے لئے ائمہ اہلبیتؑ نے کیا کردار ادا کیا اور انہوں نے صحیح سنّت کا گرانقدر تحفہ امت کو کیسے واپس لوٹایا۔

ضمیمہ نمبر ۱

آیتِ تطہیر خاندان رسالت کی عصمت کے لئے ایک قطعی دلیل ہے اور مکتبِ خلفاء کے مصادر میں اس کے بے شمار حوالے موجود ہیں۔ اس کے لئے ہم بطور نمونہ چند حوالہ جات پر اکتفا کرتے ہیں اور ابتدا میں ہم اس سلسلے کی ایک حدیث نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ:

اِنَّ اللّٰہَ قَسَّمَ الْخَلْقَ قِسْمَیْنِ، فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِھِمَا قِسْمًا، فَذٰلِکَ قَوْلُہٗ: وَاَصْحَابُ الْیَمِیْنِ وَاَصْحَابُ الشِّمَالِ. فَاَنَا مِنْ اَصْحَابِ الْیَمِیْنِ، وَ اَنَا خَیْرُ اَصْحَابِ الْیَمِیْنِ... ثُمَّ جَعَلَ الْقَبَائِلَ بُیُوْتًا، فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِھَا بَیْتًا، فَذٰلِکَ قَوْلُہٗ: "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا" فَاَنَا وَ اَھْلُ بَیْتِیْ مُطَھَّرُوْنَ مِنَ الذُّنُوْبِ.[۱]

ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالی نے مخلوق کو دو قسموں میں تقسیم کیا اور مجھے بہتر قسم میں قرار دیا۔ اللہ نے اس کے متعلق فرمایا کہ دائیں ہاتھ والے اور بائیں ہاتھ والے۔ اور میں دائیں ہاتھ والوں میں سب سے بہتر ہوں۔ پھر اللہ نے قبائل کو مختلف گھر دیئے۔ مجھے سب سے بہتر گھر میں جگہ دی اور اس کے متعلق اللہ نے فرمایا: اے اہلبیتؑ! اللہ کا ارادہ بس یہی ہے کہ وہ تم سے ہر طرح کی ناپاکی دور رکھے اور تمہیں ایسا پاک رکھے جیسا کہ پاک رکھنے کا حق ہے۔ میں اور میرے اہلبیتؑ گناہوں سے پاک ہیں۔

آیۂ تطہیر کے متعلق قدیم اور جدید علماء کے نظریات

عَنْ قَتَادَۃَؒ فِیْ قَوْلِہٖ: "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ..." قَالَ: ھُمْ اَھْلُ بَیْتٍ طَھَّرَھُمُ اللّٰہُ مِنَ السُّوْءِ وَ اخْتَصَّھُمْ بِرَحْمَتِہٖ (بِرَحْمَۃٍ مِّنْہُ).[۲]

۱۔ سیوطی، تفسیر درمنثور، ج ۵، ص ۱۹۹۔ ۲۔ سیوطی، تفسیر درمنثور، ج ۵، ص ۱۹۹۔ طبری، تفسیر، ج ۲۲، ص ۵۔

"اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ....." کی آیت کے متعلق قتادہ نے کہا: یہ آیت اس خاندان سے مخصوص ہے جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر قسم کی برائی سے پاک رکھا ہے اور اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔

قَالَ الطَّبری: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ، یَقُوْلُ: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ یَآ اَھْلَ بَیْتِ مُحَمَّدٍ وَ یُطَھِّرَکُمْ مِّنَ الدَّنَسِ الَّذِیْ یَکُوْنُ فِیْٓ اَھْلِ مَعَاصِی اللّٰہِ[1] طبری کہتے ہیں کہ مفہوم آیت اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ یہ ہے کہ اے اہلبیتِ پیغمبرؐ! اللہ کا ارادہ بس یہی ہے کہ وہ تم سے ہر قسم کی برائی اور بے حیائی کو دور رکھے اور تمہیں اس ناپاکی سے پاک و پاکیزہ رکھے جو کہ خدا کے نافرمانوں میں ہوتی ہے۔

قَالَ الزَّمَخْشَرِی: وَاسْتَعَارَ لِلذُّنُوْبِ: الرِّجْسَ وَلِلتَّقْوٰی: الطُّھْرَ، لِاَنَّ عِرْضَ الْمُقْتَرِفِ لِلْمُقْبِحَاتِ یَتَلَوَّثُ بِھَا وَیَتَدَنَّسُ کَمَا یَتَلَوَّثُ بِدَنُہٗ بِالْاَرْجَاسِ.[2] زمخشری کہتے ہیں: اللہ نے گناہوں کے لئے لفظ "رِجس" اور تقویٰ کے لئے "طُھر" کے لفظ بطورِ استعارہ استعمال کئے ہیں کیونکہ برائیاں کرنے والا شخص برائیوں میں ملوث ہو کر اس طرح سے گندا ہو جاتا ہے جیسا کہ نجاست کے ملوث ہونے سے انسان کا جسم گندا ہو جاتا ہے۔

قَالَ الرَّازِی: فَقَوْلُہٗ تَعَالٰی "لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ" اَیْ یُزِیْلَ عَنْکُمُ الذُّنُوْبَ "وَیُطَھِّرَکُمْ" اَیْ یُلْبِسَکُمْ خِلَعَ الْکَرَامَۃِ.[3] رازی کہتے ہیں: لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تم سے گناہ دور رکھے اور وَیُطَھِّرَکُمْ کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیں خلعت کرامت سے سرفراز فرمائے۔

قَالَ الْبَیْضَاوِی: "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ" الذَّنْبَ الْمُدَنِّسَ لِعِرْضِکُمْ... "وَیُطَھِّرَکُمْ" مِّنَ الْمَعَاصِی "تَطْھِیْرًا" وَاسْتِعَارَۃُ الرِّجْسِ لِلْمَعْصِیَۃِ وَالتَّرْشِیْحِ بِالتَّطْھِیْرِ لِلتَّنْفِیْرِ عَنْھَا.[4] بیضاوی کہتے ہیں: آیتِ تطہیر میں اللہ تعالیٰ نے جس "رِجس" کو اہلبیتؑ سے دور رکھنے کا اعلان کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اے اہلبیتؑ! خدا تم سے ان گناہوں کو دور رکھنا چاہتا ہے جو تمہاری عزت و عظمت کو داغدار کریں اور تمہیں گناہوں سے پاک و پاکیزہ رکھنا چاہتا ہے۔ اس آیت میں معصیت کو بطورِ استعارہ "رِجس" کہا گیا ہے اور گناہوں سے نفرت کرنے کو "تطہیر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قَالَ الْمَرَاغِی: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ یَآ اَھْلَ بَیْتِ الرَّسُوْلِ وَیُطَھِّرَکُمْ مِّنْ دَنَسِ الْفِسْقِ وَالْفُجُوْرِ الَّذِیْ یَعْلَقُ بِاَرْبَابِ الذُّنُوْبِ وَالْمَعَاصِی.[5] مراغی کہتے ہیں کہ

۱۔ طبری، تفسیر، ج ۲۲، ص ۵۔ ۲۔ کشاف، تفسیر، ج ۳، ص ۴۲۵، مطبوعہ مصر ۱۹۵۳ء ۳۔ رازی، تفسیر کبیر، ج ۲۵، ص ۲۰۹۔
۴۔ بیضاوی، تفسیر، ص ۵۵۷، طبع ۱۳۰۵ھ ۵۔ مراغی، تفسیر، ج ۲۲، ص ۷، مطبوعہ مصر۔

آیۂ تطہیر میں اللہ اہلبیتؑ سے یہ کہہ رہا ہے کہ اے خاندانِ پیغمبر! اللہ تم سے ہر برائی اور بے حیائی کو دور رکھنا چاہتا ہے اور تمہیں فسق و فجور کی اس غلاظت سے پاک رکھنا چاہتا ہے جو گناہگاروں اور نافرمانوں سے چمٹی ہوتی ہے۔

علمائے لغت نے "رِجس" کے معنی میں ایسے الفاظ بیان کئے ہیں جن سے پاکیزگی مقامِ عصمت پر منتہی ہوتی ہے۔

راغب اصفہانی بیان کرتے ہیں: "رِجْس" پلید چیز کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے "رَجُلٌ رِجْسٌ" پلید مرد اور "رِجَالٌ اَرْجَاسٌ" پلید لوگ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ. یعنی پلیدی کا تعلق عملِ شیطان سے ہے۔

پلیدی کی چار قسمیں ہو سکتی ہیں:

(۱) پلیدی بلحاظِ طبیعت۔ (۲) پلیدی بلحاظِ عقل۔ (۳) پلیدی بلحاظِ شریعت

(۴) ایسی پلیدی جس میں تینوں اسباب شامل ہوں۔ مثلاً مردار کہ وہ شریعت کے لحاظ سے بھی پلید ہے۔ عقل کے لحاظ سے بھی پلید ہے اور انسانی طبیعت کے لحاظ سے بھی کراہت آمیز ہے جبکہ جوا اور شراب بلحاظِ شریعت پلید ہیں اور بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں شریعت کے ساتھ ساتھ بلحاظِ عقل بھی پلید ہیں۔[۱]

مشہور لغت نویس ابن اثیر کہتے ہیں:

اَلرِّجْسُ: اَلْقَذَرُ. وَقَدْ يُعَبَّرُ بِهِ عَنِ الْحَرَامِ وَالْفِعْلِ الْقَبِيحِ.[۲]

"رِجْس" پلیدی کو کہا جاتا ہے اور بعض اوقات اس سے حرام اور فعلِ قبیح مراد ہوتا ہے۔

علامہ ابن منظور لکھتے ہیں:

اَلرِّجْسُ: اَلْقَذَرُ وَقَدْ يُعَبَّرُ بِهِ عَنِ الْحَرَامِ وَ الْفِعْلِ الْقَبِيحِ وَ الْعَذَابِ وَ اللَّعْنَةِ وَالْكُفْرِ.[۳]

"رِجْس" پلیدی ہے اور کبھی حرام اور فعلِ قبیح، عذاب، لعنت اور کفر کو بھی رِجْس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فیروز آبادی لکھتے ہیں:

اَلرِّجْسُ: اَلْقَذَرُ وَكُلُّ مَا اسْتُقْذِرَ مِنَ الْعَمَلِ وَالْعَمَلِ الْمُؤَدِّيْ اِلَى الْعَذَابِ وَالشَّكِّ وَالْعِقَابِ وَالْغَضَبِ.[۴]

۱۔ راغب اصفہانی، مفردات القرآن، مادہ رجس، ص ۱۸۷، مطبوعہ تہران، ۱۳۷۳ھ

۲۔ ابن اثیر، النهايه فی غريب الحديث والاثر، ج ۲، ص ۲۰۰، مطبوعہ مصر ۱۳۸۳ھ

۳۔ علامہ ابن منظور، لسان العرب المحيط، مادہ رجس، ج ۱، ص ۱۱۲۸۔ مطبوعہ یوسف خیاط و ندیم مرعشلی۔

۴۔ فیروز آبادی، قاموس المحيط، مادہ رجس، ج ۲، ص ۲۲۷، مطبوعہ مصر۔

رِجْس پلیدی ہے اور ہر وہ عمل رِجْس ہے جو پلیدی سے آلودہ ہو اور ہر وہ عمل رِجْس ہے جو عذاب، شک، عقاب اور غضب پر منتہی ہوتا ہو۔

جوہری لکھتے ہیں:

اَلرِّجْسُ: اَلْقَذَرُ، وَقَالَ الْفَرَّاءُ فِیْ قَوْلِہٖ تعَالیٰ "وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَایَعْقِلُوْنَ" اِنَّہٗ الْعِقَابُ وَالْغَضَبُ.[۱]

"الرِّجْس" پلیدی کو کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور اللہ "رِجْس" کو ان لوگوں پر ڈال دیتا ہے جو سمجھتے نہیں ہیں۔ فرّاء نے کہا کہ یہاں لفظ رِجْس سے مراد عقاب اور غضب ہے۔

عبدالقادر رازی نے کسی تبدیلی کے بغیر "رِجْس" کے یہی معنی لکھے ہیں۔[۲]

فیومی لکھتے ہیں:

اَلرِّجْسُ: اَلنَّتْنُ وَالرِّجْسُ: اَلْقَذَرُ. قَالَ الْفارَابِی: وَکُلُّ شَیْءٍ یَسْتَقْذِرُ فَھُوَ رِجْسٌ. وَقَالَ النَّقَّاشُ: اَلرِّجْسُ اَلنَّجَسُ. وَقَالَ فِی الْبَارِع: وَرُبَمَا قَالُوا: اَلرَّجَاسَۃُ وَالنَّجَاسَۃُ، اَیْ جَعَلُوْھُمَا بِمَعْنًی.[۳]

"رِجْس" بدبو کو کہا جاتا ہے اور "رِجْس" پلیدی کو کہا جاتا ہے۔ فارابی نے کہا: ہر وہ چیز جس سے نفرت محسوس ہو وہ "رِجْس" کہلاتی ہے۔ نقاش نے کہا: "رِجْس" نجس کو کہا جاتا ہے۔ اور "بَارِع" کے متعلق کہا: بعض اوقات عرب رَجَاسَت و نَجَاسَت کے الفاظ کو ایک ہی معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں۔

ابن فارس لکھتے ہیں:

الرِّجْسُ اَلْقَذَرُ لِاَنَّہٗ لطخ وَخلط.[۴]

"رِجْس" پلیدی کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مل جاتی ہے اور چھٹ جاتی ہے۔

حبیش تفلیسی کہتے ہیں:

معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن مجید میں لفظ "رِجْس" تین قسم کی وجوہات میں استعمال ہوا:

۱۔ "رِجْس" بمعنی شراب، قمار بازی، بت اور جوئے کے تیروں کے لئے استعمال ہوا۔

۲۔ "رِجْس" کفر و نفاق کے معنی میں استعمال ہوا۔

۳۔ "رِجْس" برے کردار کے لئے استعمال ہوا۔[۵]

۱۔ الصحاح مادہ رجس، ج ۲، ص ۹۳۰، مطبوعہ مصر، تحقیق احمد عبدالغفور عطار۔ ۲۔ مختار الصحاح، ص ۲۳۲۔

۳۔ المصباح المنیر، مادہ رجس، ج ۱، ص ۲۶۶۔ ۴۔ معجم مقائس اللغہ، ج ۲، ص ۴۹۰۔ ۵۔ وجوہ قرآن، ص ۱۱۰۔

ضمیمہ نمبر۲

مکتب خلفاء نے لفظ ''وصی'' کو چھپانے کیلئے جو کتربیونت کی ہے اس کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

(۱) طبری نے اپنی تفسیر میں اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں حدیث دار — فَاَیُّکُمْ یُؤَازِرُنِیْ هٰذَا الْاَمْرَ وَاَنْ یَّکُوْنَ اَخِیْ وَ وَصِیِّیْ وَخَلِیْفَتِیْ فِیْکُمْ. یعنی تم میں سے کون اس امر میں میری مدد کرتا ہے کہ وہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہو — کے الفاظ ''بھائی، وصی اور خلیفہ'' کو ''کذا و کذا'' سے بدل دیا جس سے حدیث رسولؐ کے معنی یہ بن گئے کہ تم میں سے کون ہے جو میری مدد کرے اور وہ! ''وہ وہ'' ہو۔

(۲) مصر کے محمد حسنین ہیکل نے اپنی کتاب ''حیات محمدؐ'' کے پہلے ایڈیشن کے صفحہ ۱۰۴ پر یہ پوری حدیث نقل کی لیکن جب اس نے ۱۳۳۵ھ میں دوسرا ایڈیشن شائع کرایا تو اس میں سے یہ حدیث نکال دی۔

(۳) سیرت ابن ہشام دراصل سیرت ابن اسحاق کا اقتباس ہے۔ ابن ہشام نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا:
''سیرت ابن اسحاق کے جن مطالب کو لوگ ناپسند کرتے ہیں میں نے وہ اپنی کتاب میں نقل نہیں کیے۔''

حالانکہ سیرت ابن اسحاق میں دعوت ذوالعشیرہ کا پورا واقعہ موجود ہے اور اس میں آنحضرتؐ کی یہ حدیث بھی موجود ہے۔ ابن ہشام کو معلوم تھا کہ اس روایت سے بہت سی جبینوں پر شکنیں نمودار ہوں گی لہٰذا اس نے اس حدیث کو حذف کردیا۔ ابن ہشام کی انہی ''خوبیوں'' کی وجہ سے اس کی کتاب کو قبولیت عامہ کی سند دی گئی اور سیرت ابن اسحاق متروک ہوچکی ہے حتیٰ کہ اس کے نسخے مفقود ہوچکے ہیں۔

پیشِ گفتار

مُسلمانوں پر اہلِ کتاب کے نظریات کے اَثرات

اہلِ کتاب کے اَفکار خاص کر اسرائیلی روایات نے دو ذرائع سے مسلمانوں میں نفوذ کیا۔

(ا) خود اہلِ کتاب کے توسّط سے

(ب) کچھ مسلمانوں کے توسّط سے

(ا) اہلِ کتاب کے توسّط سے اہلِ کتاب کے اَفکار کا نفوذ

وضعِ حدیث کی بحث میں ہم نے اہلِ کتاب کے علماء کی مدینے آمد کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ خلفاء نے مسلمانوں کو اسلام کے حقائق سے بے خبر رکھنے کیلئے حدیث کی اشاعت ممنوع قرار دی تھی اور اس کے برعکس انہوں نے نومسلم یہودی وعیسائی علماء کو اہلِ کتاب کی محرّف روایات بیان کرنے کی کھلی چھٹی دیدی تھی۔

سابقہ مباحث میں ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ ''تمیم داری'' قبولِ اسلام سے قبل ایک عیسائی راہب تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اسے نمازِ جمعہ سے قبل مسجدِ نبویؐ میں خطاب کرنے کی اجازت دی تھی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں وہ ہفتے میں ایک بار خطاب کیا کرتا تھا لیکن حضرت عثمانؓ کے عہد میں وہ دو بار خطاب کرنے لگا تھا۔

''ماتع'' جو کعب الاحبار کے نام سے مشہور تھا وہ بھی اسلام لانے سے قبل یہودیوں کا بہت بڑا عالم تھا۔ یہ اتنا ہوشیار شخص تھا کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں درباری عالم کے منصب پر فائز ہوگیا اور فاروقی وعثمانی دوَر میں نہ صرف اپنے اس منصب پر برقرار رہا بلکہ مکتبِ خلفاء کے پیروکار اسلامی علوم وعقائد اور تفسیرِ قرآن کے لئے اسی کی طرف رجوع کرنے لگے تھے۔[1]

کعب الاحبار کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ توْرات کے تحریف شدہ افکار اور بنی اسرائیل کے دیگر

۱۔ حافظ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ۴، ص ۱۷۔

نظریات مسلمانوں میں رائج کرے۔ مکتبِ اہلبیتؑ کے شاگرد اس کی اس سازش سے پوری طرح باخبر تھے جیسا کہ حسبِ ذیل روایت میں مذکور ہے۔

طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

لوگوں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ کعب کہتا ہے کہ قیامت کے دن چاند اور سورج کو دو پے شدہ بیلوں کی شکل میں لایا جائے گا اور دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

یہ سن کر ابن عباسؓ سخت برافروختہ ہوئے اور انہوں نے تین بار کہا: کعب جھوٹا ہے! کعب جھوٹا ہے! کعب جھوٹا ہے!۔ یہ یہودی نظریات ہیں جنہیں کعب اسلام میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات سے بلند و بالا ہے کہ وہ اطاعت کی وجہ سے کسی کو سزا دے۔ کیا تم نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا: وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ. یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ (سورۂ ابراہیم: آیت ۳۳)

پھر ابن عباسؓ نے کہا: دَائِبَيْنِ کا مفہوم ہے کہ دونوں ہمیشہ خدا کی اطاعت میں مصروف رہتے ہیں۔ ان دو اَجرامِ فلکی کے متعلق اللہ نے اِطاعت گزار ہونے کی گواہی دی ہے پھر بھلا وہ انہیں عذاب کیسے دے گا؟ اللہ اس یہودی عالم کو قتل کرے اور اس کی یہودی گری کی روش کو رسوا کرے۔ یہ اللہ کی شان میں کس قدر جسارت کرتا ہے اور اس نے اللہ کے دو فرمانبردار اَجرامِ فلکی کی کتنی بڑی توہین کی ہے۔ پھر ابن عباسؓ نے کئی بار اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔

اس کے بعد ابن عباسؓ نے سورج چاند کے متعلق ایک حدیث بیان کی جس کا خلاصہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے دو نورانی اَجرام پیدا کئے۔ ایک کو سورج بنایا اور اسے زمین کے مَشارِق و مَغارِب کے برابر حجم دیا اور دوسرے کو چاند بنایا اور اس کا حجم سورج سے کم رکھا۔ چونکہ یہ دونوں اَجرام آسمان میں ہیں اور زمین سے بہت دور ہیں اس لئے وہ ہمیں چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔[1]

۱۔ ہم نے اس حدیث کو مختصر کیا ہے۔ پوری حدیث تاریخ طبری ج ۱، ص ۶۲ و ۶۳، مطبوعہ یورپ میں یوں ہے:

عَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ: بَيْنَا ابْنُ عَبَّاسٍ ذَاتَ يَوْمٍ جَالِسٌ اِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا ابْنَ عَبَّاسٍ! سَمِعْتُ الْعَجَبَ مِنْ كَعْبِ الْحِبْرِ يَذْكُرُ فِي الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ.

قَالَ: وَكَانَ مُتَّكِئًا، فَاحْتَفَزَ ثُمَّ قَالَ: وَمَا ذَاكَ؟

قَالَ: زَعَمَ اَنَّهُ يُجَاءُ بِالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَاَنَّهُمَا ثَوْرَانِ عَقِيْرَانِ فَيُقْذَفَانِ فِيْ جَهَنَّمَ.

قَالَ عِكْرِمَةُ: فَطَارَتْ مِنِ ابْنِ عَبَّاسٍ شَفَةٌ وَوَقَعَتْ اُخْرٰى غَضَبًا.

ثُمَّ قَالَ: كَذَبَ كَعْبٌ! كَذَبَ كَعْبٌ! كَذَبَ كَعْبٌ! ثَلَاثَ مَرَّاتٍ. بَلْ هٰذِهٖ يَهُوْدِيَّةٌ يُرِيْدُ اِدْخَالَهَا فِي الْاِسْلَامِ، اَللّٰهُ اَجَلُّ وَاَكْرَمُ مِنْ اَنْ يُعَذِّبَ عَلٰى طَاعَتِهٖ، اَلَمْ تَسْمَعْ قَوْلَ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى: وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ؟ اِنَّمَا يَعْنِيْ دُؤُوْبَهُمَا فِي الطَّاعَةِ. فَكَيْفَ يُعَذِّبُ عَبْدَيْنِ يُثْنِيْ عَلَيْهِمَا اَنَّهُمَا دَائِبَانِ فِيْ طَاعَتِهٖ؟ قَاتَلَ اللّٰهُ هٰذَا الْحِبْرَ، وَقَبَّحَ حِبْرِيَّتَهٗ، مَا اَجْرَاَهٗ عَلَى اللّٰهِ! وَاَعْظَمَ فِرْيَتَهٗ عَلٰى هٰذَيْنِ الْعَبْدَيْنِ الْمُطِيْعَيْنِ لِلّٰهِ!

حدیث کا تجزیہ

مذکورۃُ الصدر روایت کو ہم ''دو پے شدہ بیلوں'' کی روایت کا نام دیتے ہیں اور اس سلسلے میں چند مَطالِب عرض کرتے ہیں:

(۱) ابن عباسؓ نے کعب الاحبار کی اس روایت کی تردید کی کہ ''سورج اور چاند کو دوزخ میں ڈالا جائے گا'' اور انہوں نے کعب کی تردید کے لئے قرآنِ مجید کی آیت سے استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''سورج اور چاند ہمیشہ خدا کی فرمانبرداری میں مصروف ہیں۔'' اس کے بعد ابن عباسؓ نے کہا: یہ بات خدا کی عدالت کے خلاف ہے کہ وہ ان دو اَجرامِ فلکی کی اِطاعت کے باوجود ان کو عذاب دے۔

(۲) ابن عباسؓ نے اس بات پر کہ ''سورج اور چاند کو دو پے شدہ بیلوں کی صورت میں لایا جائے گا'' یہ کہہ کر کعب کی جہالت کو ظاہر کیا کہ سورج اور چاند اگر چہ ہمیں چھوٹے دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ اتنے چھوٹے نہیں ہیں۔ ان کا حجم اس زمین سے زیادہ ہے اور ان کے بھی مشرق و مغرب ہیں۔

پھر ابن عباسؓ نے سورج اور چاند کی تخلیق کے متعلق پیغمبرِ اکرمؐ کی حدیث نقل کی اور ہم اس حدیث سے یہ نتیجہ برآمد کرنے میں حق بجانب ہیں کہ:

(۳) آنحضرتؐ نے فرمایا: زمین کی طرح سورج اور چاند کا بھی مشرق و مغرب ہے۔ اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں اَجرام یعنی سورج، چاند اور زمین ایک دوسرے کے گرد گردش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے مشرق و مغرب جنم لیتے ہیں۔

(۴) پیغمبرِ اکرمؐ نے تینوں اَجرام کے مشرق و مغرب کو جمع کی صورت میں یعنی مَشارِق و مَغارِب ارشاد فرما کر

قَالَ: ثُمَّ اسْتَرجَعَ مِرَارًا وَ اَخَذَ عُوَيْدًا مِّنَ الْاَرْضِ فَجَعَلَ يَنكُتهُ فِي الْاَرْضِ. فَظَلَّ كَذٰلِكَ مَاشَاءَ اللّٰهُ. ثُمَّ اَنَّهُ رَفَعَ رَاْسَهُ وَ رَمٰى بِالْعُوَيْدِ، فَقَالَ: اَلَا اُحَدِّثُكُمْ بِمَا سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ يَقُوْلُ فِي الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَ بَدْءِ خَلْقِهِمَا وَ مَصِيْرِ اَمْرِهِمَا؟ فَقُلْنَا: بَلٰى، رَحِمَكَ اللّٰهُ.

فَقَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ سُئِلَ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ: اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى لَمَّا اَبْرَمَ خَلْقَهُ اَحْكَامًا فَلَمْ يَبْقَ مِنْ خَلْقِهِ غَيْرُ اٰدَمَ، خَلَقَ شَمْسَيْنِ مِنْ نُوْرِ عَرْشِهِ. فَاَمَّا مَا كَانَ فِيْ سَابِقِ عِلْمِهِ اَنَّهُ يَدَعُهَا شَمْسًا فَاِنَّهُ خَلَقَهَا مِثْلَ الدُّنْيَا مَا بَيْنَ مَشَارِقِهَا وَ مَغَارِبِهَا. وَاَمَّا مَا كَانَ فِيْ سَابِقِ عِلْمِهِ اَنَّهُ يَطْمِسُهَا وَ يُحَوِّلُهَا قَمَرًا، فَاِنَّهُ دُوْنَ الشَّمْسِ فِي الْعِظَمِ، وَلٰكِنْ اِنَّمَا يُرٰى صِغَرُهُمَا مِنْ شِدَّةِ ارْتِفَاعِ السَّمَاءِ وَ بُعْدِهَا مِنَ الْاَرْضِ.

قَالَ: فَلَوْ تَرَكَ اللّٰهُ الشَّمْسَيْنِ كَمَا كَانَ خَلَقَهُمَا فِيْ بَدْءِ الْاَمْرِ، لَمْ يَكُنْ يُعْرَفُ اللَّيْلُ مِنَ النَّهَارِ، وَلَا النَّهَارُ مِنَ اللَّيْلِ وَكَانَ لَا يَدْرِيْ اِلٰى مَتٰى يَعْمَلُ، وَمَتٰى يَاْخُذُ اَجْرَهُ ـــ اَلْحَدِيْثُ.

اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تینوں اَجرامِ فلکی گول ہیں اگرچہ وہ مسطح انداز میں بھی کیوں نہ ہوں اور ہر ایک کے لئے ایک مشرق اور ایک مغرب سے زیادہ مشرق و مغرب نہیں ہیں۔

(۵) ابن عباسؓ نے کعب پر شدید تنقید کر کے حاضرین کو بتایا کہ وہ خود اس یہودی زادے سے روایت کرنے کے روادار ہرگز نہیں ہیں اور وہ کعب کی روایات کو یہودیت کی ترویج کی قابلِ مذمت کوشش سمجھتے ہیں اور وہ اس بات پر ہرگز آمادہ نہیں ہیں کہ کعب کی باتیں سن کر لوگوں کے سامنے بیان کریں۔

ابن عباسؓ کی اس رَوش کو دیکھ کر ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ بعض محدّثین کی وہ روایات جو کہتی ہیں کہ ''ابن عباسؓ نے کعب سے فلاں فلاں روایات بیان کی ہیں'' جھوٹ کا پلندہ ہیں اور ان روایات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ روایات بھی پیغمبرِ اکرمؐ کی طرف منسوب وضعی روایات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

جن محدّثین نے ابن عباسؓ کو کعب کا شاگرد بنانے کی مذموم کوشش کی ہے اس کے پس منظر میں عباسی خلفاء کی خوشامد کا جذبہ کارفرما ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ عبداللہ بن عباس عباسی خلفاء کے مُورثِ اعلیٰ تھے اور عباسی حکومت میں ابن عباسؓ کی روایات کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ چنانچہ بعض خوشامدی قسم کے محدّثین نے بنی عباس کے خلفاء کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لئے اس طرح کی بے سروپا روایات بیان کیں۔ اس طرح کی روایات سے انہوں نے دو طرح کے مقاصد حاصل کئے (۱) ابن عباسؓ کے بھاری بھرکم نام کی وجہ سے ان کی روایات تنقید سے محفوظ رہیں گی۔ (۲) انہیں عباسی خلفاء کا قرب حاصل ہو سکے گا۔

ابن عباسؓ نے سورج چاند کے متعلق رسولِ خداؐ کی جو حدیث بیان کی وہ لائقِ صد توجہ ہے اور موجودہ علمُ الافلاک بھی اس کی تائید کرتا ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ مستقبل کے مزید انکشافات کے ساتھ اس حدیث کی اہمیت مزید اجاگر ہو سکے جبکہ کعب کی روایت بدترین جہالت کا مرقع ہے اور اس کا مقصد مسلمانوں میں یہودی افکار کی ترویج کے سوا اور کچھ نہیں۔

(۶) ابن عباسؓ نے کعب کی جاہلانہ روایت کو اگرچہ بڑی حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا مگر کعب کے شاگردوں نے کعب کے احمقانہ خیالات کو حدیثِ پیغمبرؐ بنا کر امتِ اسلامیہ میں متعارف کرایا اور کعب کے منظورِ نظر شاگرد ابوہریرہ اور اس جیسے افراد کی ''برکت'' سے یہ روایت اسلامی مَدارک میں شامل ہوگئی۔

تفسیر ابن کثیر میں یہ روایت پوری تفصیل کے ساتھ اور کنزالعمال میں اختصار کے ساتھ ابوہریرہ سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا: رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن سورج اور چاند دوپے شدہ بیلوں کی شکل میں دوزخ میں ہوں گے۔

جب ابوہریرہ نے یہ روایت بیان کی تو حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا: ابوہریرہ! ذرا یہ بتاؤ کہ

سورج اور چاند نے آخر کون سا گناہ کیا ہے؟

ابو ہریرہ نے کہا: میں تمہارے سامنے رسولِ خداؐ کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم پوچھ رہے ہو کہ سورج اور چاند نے کون سا گناہ کیا ہے؟

ابن کثیر نے سَنَدِ ضعیف کے ساتھ ''انَس'' سے روایت کی ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا: اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ثَوْرَانِ عَقِیْرَانِ فِی النَّارِ. یعنی سورج اور چاند دوپٹے شدہ بیلوں کی شکل میں دوزخ میں ہوں گے۔[۱]

''دوپٹے شدہ بیلوں'' کی روایت کا مزید تجزیہ

ابوہریرہؓ اور انسؓ نے اس روایت کو حضرت رسولِ اکرمؐ سے منسوب کیا ہے۔ یہ نسبت سراسر باطل ہے۔ یہ رسولِ اکرمؐ کا فرمان ہرگز نہیں بلکہ کعب الاحبار کی گفتگو ہے کیونکہ یہ بات خلافِ حقائق ہی نہیں بلکہ نصِّ قرآن اور حدیثِ پیغمبرؐ کے بھی خلاف ہے۔ نیز حضرت ابن عباسؓ نے اس روایت کو اسرائیلی خیال کہہ کر مسترد کیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ کعب الاحبار مسلمانوں میں یہودی افکار کا پرچار کرتا ہے۔

اگر ہمارے سابقہ اور آئندہ مباحث پر توجہ دی جائے تو یہ بات زیادہ واضح ہو سکے گی۔

اہلِ بحث و تحقیق کو اس چیز کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے کہ ہم امتِ اسلامیہ کے پہلے فرد نہیں جنہوں نے کعب الاحبار کے متعلق یہ انکشاف کیا ہو کہ اس نے مسلمانوں میں یہودی افکار کو پروان چڑھایا تھا۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ جس دَور میں کعب نے یہ مذموم کوششیں کی تھیں تو رسولِ خداؐ کے ابن عم اور امام علیؑ کے شاگرد ابن عباسؓ نے اس کے عزائم کو اسی وقت بھانپ لیا تھا۔ اس سے بڑھ کر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وصیِّ رسول امام علیؑ نے بھی خلیفہ عمرؓ کی مجلس میں کعب کے مذموم عزائم کی طرف اشارہ کیا تھا۔

سابقہ مطالب کی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ ابوہریرہؓ اور انس بن مالکؓ کی روایت رسولِ خداؐ کے بجائے ''کعب الاحبار'' سے مروی ہے۔ البتہ کعب اور ابوہریرہؓ کے روایت کرنے کے انداز میں ایک واضح فرق موجود ہے۔ کعب کو رسولِ خداؐ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی تھی اس لئے وہ اپنے اسرائیلی نظریات کو رسولِ خداؐ کی طرف نسبت دینے سے قاصر تھا جبکہ ابوہریرہؓ اور دوسرے صحابہ کو رسولِ خداؐ کی صحبت نصیب ہوئی تھی اس لئے وہ بات کو رسولِ خداؐ کی طرف منسوب کر سکتے تھے۔

چنانچہ اگر بات کعب تک محدود رہتی تو مسلمانوں پر اس کے مضر اثرات کم ہوتے لیکن غضب یہ ہوا کہ

۱۔ ابوہریرہؓ اور انس بن مالکؓ کی دونوں روایات کو ابن کثیر نے اپنی تاریخ کی پہلی جلد اور اپنی تفسیر میں اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ مذکورہ دونوں روایات کنز العمال، جلد ۶، صفحہ ۱۰۱ پر بھی مرقوم ہیں۔

ابو ہریرہؓ جیسے لوگ کعب کے زیر اثر تھے جو اس کی بے سروپا باتوں کو قَالَ الرَّسُوْل کے عنوان سے بیان کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے اور جب سیدھے سادے مسلمان، صحابہ کی زبانی ایک بات سنتے تھے تو وہ اسے قولِ رسولؐ سمجھ کر قبول کر لیتے تھے اور یوں اسرائیلی نظریات اسلام میں داخل ہو گئے۔

انس بن مالکؓ کی طرف منسوب روایت کو ضعیف کہنے سے اس کے مضر اثرات ہرگز کم نہیں ہو سکتے کیونکہ دِرَایۃُ الحدیث کا مشہور قاعدہ ہے کہ جب ضعیف روایت کے پہلو بہ پہلو قوی روایت موجود ہو تو اس ضعیف روایت کو بھی ضعیف نہیں سمجھا جاتا اس لئے محدثین اگرچہ انسؓ کی طرف منسوب روایت کو ضعیف کہہ بھی دیں تو اس کے اثرات سے گلوخلاصی ممکن نہیں ہے۔

انسؓ کی طرف سَنَدِ ضعیف سے منسوب روایت کی ہم اس طرح توجیہ کرتے ہیں کہ صحابہ کے بعد بہت سے ایسے محدثین پیدا ہوئے جو اسرائیلی نظریات کے گرویدہ تھے مگر انہیں رسولِ خداؐ کی صحبت میسر نہیں ہوئی تھی اس لئے وہ براہِ راست رسولِ خداؐ سے روایت کرنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے اپنی مطلب برآری کے لئے درمیانی راستا یہ نکالا کہ اسرائیلی افکار کو کسی صحابی کی طرف منسوب کر کے اسے حدیثِ پیغمبرؐ کے عنوان سے پیش کرتے تھے اور یوں ان کی خواہش کی تکمیل بھی ہو جاتی تھی اور مسلمان بھی ان کے بچھائے ہوئے دام کو سمجھ نہیں پاتے تھے۔

پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مکتبِ خلفاء کے محدّثین نے دانستہ یا نادانستہ طور پر دونوں قسم کی روایات کو حدیثِ رسولؐ اور سنتِ پیغمبرؐ کے طور پر متعارف کرایا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسرئیلی افکار پر مبنی روایات کو استحکام ملتا گیا اور کسی میں بھی ان کی مخالفت کا یارا باقی نہ رہا۔

امتِ اسلامیہ میں اسرائیلی افکار یہودی علماء اور ان کے خوشہ چین صحابہ و تابعین کی وجہ سے در آئے اور وہ ان افکار کی نشر و اشاعت کا مضبوط وسیلہ ثابت ہوئے۔

(۲) کچھ مسلمانوں کے توسّط سے اہلِ کتاب کے اَفکار کا نفوذ

کچھ مسلمانوں نے اہلِ کتاب کے نظریات کو امتِ اسلامیہ میں رائج کیا۔ ان میں سے ہم بطورِ نمونہ مکتبِ خلفاء کے دو صحابی اور ایک مفسّر کا کچھ تذکرہ کرتے ہیں:

پہلا نمونہ: ابو ہریرہ دوسیؓ

ان صحابی کی کنیت ابو ہریرہ ہے۔ ان کے اصلی نام کے متعلق اختلاف ہے۔ مؤرخین نے تیس تک ان

کے نام گنوائے ہیں۔[1] ان کا تعلق اَعرابِ یمن کے قبیلے دَوس سے تھا۔ انہوں نے تیس سال تک اپنے علاقے میں زندگی گزاری اور فتح خیبر کے بعد مدینے آئے۔ وہ تین سال تک پیغمبرِ اکرمؐ کی صحبت میں رہے۔[2] ابوہریرہؓ مسجد نبوی کے اس چبوترے پر رہتے تھے جو مسافروں اور غریب مسلمانوں کے لئے مسجد کے شمالی حصے میں بنایا گیا تھا جسے ''صفہ'' کہا جاتا تھا۔

جس زمانے میں معاویہ نے بُسر بن ارطات کو شیعیانِ علیؑ کے قتلِ عام کے لئے بھیجا تھا اور اس نے شام سے تا بہ یمن تیس ہزار شیعوں کو شہید کیا تھا[3] اس بُسر نے جاتے وقت ابوہریرہؓ کو حاکم مدینہ بنایا تھا۔[4] پھر معاویہ کے دَورِ خلافت میں بھی ابوہریرہؓ کچھ عرصے تک مدینے کے حاکم رہے[5] اور اسی زمانے میں انہوں نے کھل کر اپنی روایات بیان کیں۔

پیغمبرِ اکرمؐ کے کچھ صحابی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور بیشتر نہیں جانتے تھے۔ ابوہریرہؓ کا تعلق اس صف سے تھا جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔[6]

اسی کتاب میں آگے آپ پڑھیں گے کہ ابوہریرہؓ، کعب الاحبار کے شاگرد تھے۔

کعب ان کے متعلق کہا کرتا تھا: میں نے ایسا شخص نہیں دیکھا جس نے تورات نہ پڑھی ہو مگر ابوہریرہؓ سے زیادہ تورات کا ماہر ہو۔[7] مقصد یہ ہے کہ احبار یہود کہ جنہوں نے تورات پڑھی ہے، ان کے بعد ابوہریرہؓ ہی تورات کا بڑا عالم ہے۔

۱۔ ابوہریرہؓ کا محتاط ترجمہ یہی ہو سکتا ہے ''بلی کے بچونگڑے کا ساتھی''۔ سیرتِ رسولؐ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ جب بھی کوئی شخص اسلام قبول کرتا اور اگر اس کا نام شائستہ نہ ہوتا تو آنحضرتؐ اس کا نام تبدیل کر کے کوئی اچھا سا نام تجویز فرماتے تھے لیکن اس کے باوجود ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر موصوف کا ''طرفہ نام'' یہی تھا تو آنحضرتؐ نے اسے تبدیل کیوں نہ کیا؟

۲۔ الاصابہ میں حالات ابوہریرہؓ کے تحت خود ابوہریرہؓ سے یہی مروی ہے۔ صحیح بخاری، کِتَابُ بَدْءِ الْخَلْقِ، بَابُ عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ فِي الْإِسْلَامِ، ص۱۸۵، شرح حال ابوہریرہ در طبقات ابن سعد، مطبوعہ یورپ، ج۴/ق۲، ص۶۷۔ الاصابہ، ج۴، ص۲۰۰۔

یہ خود ابوہریرہؓ کا بیان ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ علاء حضرمی کی فوج میں بطورِ مؤذن بحرین گئے اور وہاں کچھ عرصہ مقیم رہے تو اس سے ان کے صحبتِ نبویؐ کے دورانیہ میں مزید کمی ہو جاتی ہے۔

۳۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھیں نقش عائشہؓ در تاریخ اسلام، باب داستان جنگ جمل۔

۴۔ ثقفی، کتاب الغارات، ج۲، ص۶۰۷۔ ابن ابی الحدید معتزلی، شرح نہج البلاغہ، ج۱، ص۱۲۸۔

۵۔ مسند احمد، ج۲، ص۴۳۰۔

۶۔ ابوہریرہ کا اپنا بیان ہے: ''عبداللہ بن عمرو بن عاص لکھ سکتا تھا جبکہ میں لکھنا نہیں جانتا تھا۔'' صحیح بخاری، کِتَابُ الْعِلْمِ، بَابُ كِتَابَةِ الْعِلْمِ، ج۱، ص۲۲۔ رامهرمزی، كِتَابُ الْمُحَدِّثُ الْفَاصِلِ، ص۳۶۸۔ خطیب بغدادی، تَقْيِيدُ الْعِلْمِ، ص۸۲۔

۷۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج۱، ص۳۹۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں: كَانَ اَبُوْهُرَيْرَةَ يُدَلِّسُ. اَىْ يَرْوِىْ مَاسَمِعَهُ مِنْ كَعْبٍ وَمَا سَمِعَهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يُمَيِّزُ هٰذَا مِنْ هٰذَا۔[1] ابوہریرہ روایتِ حدیث میں "تدلیس"[2] سے کام لیتا تھا اور وہ کعب اور رسول خداؐ سے سنی ہوئی باتوں کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا تھا اور کعب کی روایت کو پیغمبرؐ کی روایت سے جدا نہیں کرتا تھا۔

وہ مزید لکھتے ہیں: كَانَ اَصْحَابُنَا يَدَعُوْنَ مِنْ حَدِيْثِ اَبِىْ هُرَيْرَةَ.[3] ہمارے دانش مند ساتھی ابوہریرہؓ کی بعض روایات کو چھوڑ دیتے تھے۔ اور مَا كَانُوْا يَأْخُذُوْنَ بِكُلِّ حَدِيْثِ اَبِىْ هُرَيْرَةَ.[4] ہمارے دانشمند ساتھی ابوہریرہؓ کی ہر حدیث کو قبول نہیں کرتے تھے۔

ہمیں زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ ابوہریرہؓ نے رسولِ خداؐ کی ایک دوسرے سے متضاد روایات بھی بیان کی ہیں۔ صحیح بخاری، کتاب الطب کی یہ روایت ملاحظہ فرمایئے:

بقولِ ابوہریرہؓ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "کوئی بیماری متعدی نہیں ہوتی۔"

اس وقت ایک بدّو نے کہا: یارسول اللہؐ! پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ غزال کی طرح خوبصورت اونٹوں میں سے جب کوئی اونٹ بیمار ہوتا ہے تو اس کی بیماری باقی اونٹوں کو بھی لگ جاتی ہے؟

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: پہلے اونٹ کو کس نے بیمار کیا تھا؟

اس روایت کے بعد بخاری نے ابوہریرہؓ سے ایک اور روایت یہ نقل کی ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا: "بیمار شخص کو تندرست شخص کے پاس نہیں جانا چاہئے۔"

ابوہریرہؓ کے چچازاد ابوسلمہ نے ابوہریرہؓ سے کہا: کیا اس سے پہلے تم نے یہ حدیثِ رسولؐ بیان نہیں کی کہ "بیماری میں چھوت چھات نہیں؟"

ابوہریرہؓ نے جواباً حبشیوں کی زبان میں چند الفاظ کہے۔

۱۔ حافظ ابن کثیر، تاریخ، ج۸، ص۱۰۹۔

۲۔ علمِ درایۃ الحدیث میں "تدلیس" کی تعریف یہ ہے: دلّس المحدث فی الاسناد: تعمد الخطا والخلط یعنی کسی محدث کی طرف سے جان بوجھ کر اسناد کو غلط ملط کرنا۔ تدلیس کی مزید تعریف یہ ہے کہ راوی کسی ایسے شخص کے حوالے سے روایت بیان کرے جو اس کے دور میں ہو لیکن راوی نے براہِ راست اس سے روایت نہ سنی ہو۔ التہذیب نووی، ص۸۔

۳۔ حافظ ابن کثیر، تاریخ، ج۸، ص۱۰۹۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی کی سیر الاعلام النبلاء، ج۲، ص۴۳۶ میں بھی یہ گفتگو اختصار کے ساتھ حالات ابوہریرہؓ کے ضمن میں بیان ہوئی ہے۔

۴۔ حافظ ابن کثیر، تاریخ، ج۸، ص۱۰۹۔

ابوہریرہؓ کے چچازاد ابوسلمہ نے اس کا دفاع کرتے ہوئے کہا: اس مقام کے علاوہ میں نے ابوہریرہؓ کو کسی روایت میں بھولتے ہوئے نہیں دیکھا۔[1]

ابوسلمہ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ابوہریرہؓ نے صرف ایک اسی روایت میں اشتباہ کیا اور پہلی روایت کے متضاد روایت بیان کی۔

خیر—! ہمیں ابوسلمہ کی صفائی سے کوئی غرض نہیں ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ابوہریرہؓ جیسے افراد ہمیشہ ہی نسیان کا شکار رہتے ہیں۔

ابوہریرہؓ کا اعترافِ وضعِ حدیث

ابوہریرہؓ نے خود اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ انہوں نے نبیٔ اکرمؐ سے جو روایات نقل کی ہیں وہ انہوں نے خود لسانِ رسولؐ سے نہیں سنی تھیں۔

امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں لکھتے ہیں کہ ابوہریرہؓ نے ایک حدیث روایت کی تو حاضرین نے کہا: تم نے جو کچھ کہا کیا یہ پیغمبرِ اکرمؐ کا فرمان ہے یا تم نے اپنی جیب سے روایت نکالی ہے؟

ابوہریرہؓ نے کہا: میرے یہ "فرمودات" میری جیب سے نکلے ہیں۔[2]

اس داستان کو بخاری نے اپنی صحیح میں یوں نقل کیا ہے:

ابوہریرہؓ سے حاضرین نے کہا: کیا تم نے یہ حدیث پیغمبرِ اکرمؐ سے سنی تھی؟

ابوہریرہؓ نے کہا: نہیں یہ حدیث میں نے اپنی جیب سے نکالی ہے۔[3]

(امام) احمد بن حنبل اپنی مسند میں لکھتے ہیں:

ابوہریرہؓ نے ایک روایت رسولِ خداؐ کی طرف منسوب کر کے بیان کی لیکن حدیث کے اختتام پر بولے: یہ حدیث میری جیب سے نکلی ہے۔[4]

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، باب لاھامة، ج۴، ص۱۵۔ علاوہ ازیں بخاری نے اسی باب کے صفحہ ۱۳ پر مذکورہ دو احادیث میں سے ایک کو نقل کیا ہے۔

۲۔ احمد بن حنبل، مسند، ج۲، ص۲۵۲۔

۳۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب وجوب النفقة علی الاھل والعیال، ج۳، ص۱۹۱۔

۴۔ احمد بن حنبل، مسند، ج۲، ص۲۹۹۔

دوسرا نمونہ: عبداللہ بن عمرو اسرائیلی روایات کا مُروِّج

عبداللہ بن عمرو بن عاص المتوفی ۶۵ھ رسول خداؐ کے صحابی تھے۔ عبداللہ کو اپنے باپ کی میراث میں بہت زیادہ دولت ملی تھی اس لئے ان کا شمار "ملوک الصحابہ" یعنی سرمایہ دار صحابہ میں ہوتا تھا۔[1]

عبداللہ سریانی زبان جانتے تھے[2] جو کہ توراۃ کی اصل زبان تھی۔ ان کے باپ جنگِ یرموک میں سپہ سالار تھے اور یہ بھی اس جنگ میں شریک تھے۔ وہاں انہیں اہلِ کتاب کی کتابوں سے لدے ہوئے دو اُونٹ ملے تھے۔[3]

ذہبی لکھتے ہیں:

عبداللہ نے اہلِ کتاب سے روایت کی ہے اور وہ بڑے شوق سے اہلِ کتاب کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔[4]

ابن حجر عسقلانی صحیح بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں:

فتح شام کے موقع پر عبداللہ کو اہلِ کتاب کی کتابوں سے لدا ہوا ایک اونٹ غنیمت میں ملا۔ عبداللہ ان کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور مسلمانوں کے سامنے ان کے مطالب بیان کرتے تھے اس لئے تابعین ان سے روایت کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔[5]

احمد بن حنبل اپنی مسند میں لکھتے ہیں:

ایک شخص عبداللہ کے پاس آیا اور ان سے کہا: حَدِّثْنِیْ مَا سَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَلَا تُحَدِّثْنِیْ عَنِ التَّوْرَاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ. تم نے رسولِ خداؐ سے جو کچھ سنا ہے اسے میرے لئے بیان کرو اور توراۃ و انجیل سے میرے لئے روایت مت کرو۔

ایک اور روایت میں ہمیں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ "تم نے رسولِ خداؐ سے جو کچھ سنا ہے اسے میرے لئے بیان کرو اور جنگِ یرموک میں کتابوں کا لدا ہوا جو اونٹ تمہیں ملا تھا اس سے روایت نہ کرو۔"

۱۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی، سیر اعلام النبلاء، در احوال عبداللہ بن عمرو بن عاص، مطبوعہ بیروت ۱۴۰۱ھ۔

۲۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج ۴، ص ۲۶۱۔

۳۔ اسد الغابہ، ج ۳، ص ۲۳۴۔ فتح الباری، ج ۱، ص ۱۶۶۔

۴۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی، سیر اعلام النبلاء، ج ۳، ص ۸۱۔ علاوہ ازیں ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۲۷ پر یہ جملے لکھے ہیں: "اَصَابَ جُمْلَۃً مِنْ کُتُبِ اَھْلِ الْکِتَابِ وَاَدْمَنَ النَّظَرَ فِیْھَا وَرَاٰی فِیْھَا عَجَائِبَ." یعنی انہیں اہلِ کتاب کی کتابوں سے لدے ہوئے اونٹ ملے تھے۔ وہ ہمیشہ انہیں پڑھتے تھے اور انہیں ان میں عجیب وغریب چیزیں دکھائی دیں۔

۵۔ فتح الباری بشرح صحیح البخاری، ج ۱۱، ص ۲۱۷۔

ایک اور روایت میں ہے: مجھے ان ''دولدے ہوئے اونٹوں''[۱] کی روایتوں سے معاف رکھو جو تمہیں یرموک میں ملے تھے۔

اہلِ کتاب کی جو روایات اسلامی کتابوں میں دَر آئی ہیں، علماء انہیں ''اَخبارِ بنی اسرائیل'' یا ''اسرائیلیات'' کے نام سے یاد کرتے ہیں خواہ ان روایات کا تعلق براہِ راست توریت سے ہو یا اہلِ کتاب کی دوسری کتابوں سے۔

اللہ تعالیٰ کی تجسیم اور تشبیہ کی جو روایات ہمیں مکتبِ خلفاء میں دکھائی دیتی ہیں ان تمام روایات کا مآخذ بھی اخبارِ بنی اسرائیل ہیں۔

ان تمام روایات کا بانی مبانی کعب الاحبار تھا۔ پھر اس سے ابوہریرہؓ اور اس کے ہم مشرب افراد نے ان روایات کو نقل کر کے مسلمانوں کے عقائد کا حصہ بنا دیا۔

تیسرا نمونہ: مقاتل بن سلیمان بلخی، اِسرائیلی روایات کا مُروِّج

مقاتل کی کنیت ابوالحسن تھی اور وہ قبیلۂ اَزد کے آزاد شدگان میں سے تھا۔ اس کا وطنِ مالوف بلخ تھا۔ وہ روایتِ حدیث کے لئے بصرہ و بغداد گیا تھا۔ مکتبِ خلفاء میں اسے علوم قرآن کے حوالے سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس نے ۱۵۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ درج ذیل کتابیں اس کی تالیفات شمار ہوتی ہیں:

(۱) تفسیر کبیر[۲] (۲) نوادرالتفسیر (۳) الآیات المتشابھات (۴) الناسخ والمنسوخ (۵) القرآت (۶) الاشباہ والنظائرفی القرآن الکریم (۷) الجوابات فی القرآن۔[۳]

ابن خلکان نے ابن حبان کے حوالے سے مقاتل کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ علمِ قرآن یہود و نصاریٰ سے حاصل کرتا تھا اور اس انداز سے قرآن کی تفسیر کرتا تھا جو اُن کی کتابوں کے مطابق ہوتی تھی۔ ابن خلکان مزید لکھتے ہیں کہ مقاتل کا تعلق فرقہ مشبہہ سے تھا۔ وہ خداوندِ تعالیٰ کو مخلوقات سے تشبیہ دیتا تھا اور حدیث بیان کرنے میں جھوٹ بولتا تھا۔[۴]

۱۔ احمد بن حنبل، مسند، ج۲، ص۱۹۵، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۹۔ حافظ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۳، ص۱۰۲۔

۲۔ تفسیر مقاتل کا قلمی نسخہ اور ''الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم'' کا ایک قلمی نسخہ مصر میں ادارہ مخطوطات جامعۃ الدول العربیۃ میں موجود ہے۔

۳۔ ملاحظہ فرمائیں: ھدیۃ العارفین، ج۲، ص۴۷۰۔ الاشباہ والنظائر، تالیف مقاتل، مطبوعہ مصر، ۱۳۹۵ھ ص۸۰۔

۴۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان مطبوعہ مصر، ۱۳۶۷ھ ج۴، ص۳۴۳۔ ابن اثیر جزری، الکامل فی التاریخ، در ذکر حوادث، ۱۵۰ھ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب، ج۱۰، ص۲۷۹۔ ذہبی، میزان الاعتدال، ج۴، ص۱۷۳۔ خطیب، تاریخ بغداد، ج۱۳، ص۱۶۹۔

مقاتل کہا کرتا تھا: خدا کا جسم قابلِ محسوس ہے، اس کا چہرہ ہے، اس کے سر پر بال ہیں۔ اس کے جسم میں گوشت، خون، بال، ہڈیاں، ہاتھ، پاؤں، سر اور دو آنکھیں ہیں۔[۱]

حافظ ابوبکر احمد بن علی خطیب بغدادی المتوفی ۴۶۳ھ اپنی مشہور کتاب تاریخ بغداد میں لکھتے ہیں:

ایک دن محمد بن سائب کلبی المتوفی ۱۴۶ھ مقاتل کے پاس سے گزرا تو دیکھا کہ مقاتل اس کے حوالے سے روایت بیان کر رہا ہے۔ محمد بن سائب کلبی نے مقاتل سے کہا: میں ہی محمد بن سائب کلبی ہوں اور تو جو بات میرے حوالے سے روایت کر رہا ہے وہ میں نے کبھی نہیں کہی۔

مقاتل نے کہا: خاموش رہو! راویانِ حدیث کے نام ہماری حدیث کیلئے زینت ہوتے ہیں۔[۲]

مقاتل کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی طبع زاد باتوں کو راویانِ حدیث کے ناموں سے زینت دیتے ہیں۔

محمد بن سائب کلبی سے منقول ہے: كَذَبَ عَلَيَّ مَقَاتِلٌ فِيْ تَفْسِيْرِهٖ. یعنی مقاتل نے اپنی تفسیر میں مجھ سے جو روایتیں منسوب کی ہیں وہ میں نے بیان نہیں کیں اس نے مجھ پر جھوٹ باندھا ہے۔[۳]

دروغ گو را حافظہ نباشد

مقاتل کے حالات بیان کرتے ہوئے خطیب بغدادی نے لکھا کہ دو راویوں نے کہا کہ ہم نے مقاتل سے ایک حدیث کے متعلق پوچھا کہ تو نے یہ حدیث کس سے روایت کی ہے؟ تو مقاتل نے کہا: میں نے یہ حدیث ضحاک سے روایت کی ہے۔

پھر چند روز گزرنے کے بعد ہم نے اسی حدیث کے متعلق مقاتل سے پوچھا کہ تو نے یہ حدیث کس سے روایت کی ہے تو اس نے جواب میں کہا: میں نے یہ حدیث عطاء سے سنی ہے۔

خطیب بغدادی مزید لکھتے ہیں:

مقاتل سے کہا گیا کہ تو ضحاک سے روایت کرتا ہے جبکہ تو نے تو ضحاک کو دیکھا تک نہیں تو اس نے کہا: جی ہاں! میرے اور اس کے درمیان دروازہ بند ہو چکا ہے۔[۴]

۱۔ اشعری، مقالات الاسلامیین، ص۲۱۴، مطبوعہ مصر، ۱۹۵۰ء۔

۲۔ خطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص ۱۶۴، درحالات مقاتل۔

۳۔ یہ روایت خیر الدین المعروف بہ زرکلی نے الاعلام، ج ۸، ص ۲۰۶ کے حاشیے پر مقاتل کے حالات کے ضمن میں قبول الاخبار بلخی کے قلمی نسخے کے حوالے سے نقل کی ہے۔

۴۔ خطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص ۱۶۵۔ احمد بن محمد بن ابراہیم برمکی اربلی شافعی (ابن خلکان) وفیات الاعیان، ج ۴، ص ۳۴۲۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ "بندردروازہ" سے مقاتل کی مراد یہ تھی کہ ضحاک مدینے میں رہتے تھے جبکہ وہ خود کبھی مدینے نہیں گیا تھا۔ لیکن ابن خلکان نے یہ لکھ کر اصل حقیقت واضح کردی کہ "ضحاک بن مزاحم مقاتل کے پیدا ہونے سے چار سال قبل انتقال کر چکا تھا۔"

ابن خلکان مزید لکھتے ہیں:

مقاتل نے مجاہد سے بھی روایت نقل کی ہے جبکہ اس نے مجاہد کو دیکھا تک نہیں تھا۔[۱]

خطیب بغدادی نے مقاتل کے متعلق لکھا ہے کہ کسی نے مقاتل سے کہا کہ لوگ مجھ سے اصحابِ کہف کے کتے کا رنگ پوچھتے ہیں۔ ان کا یہ سوال سن کر میں حیران رہ گیا کہ انہیں کیا جواب دوں؟

مقاتل نے فوراً کہا: اگر تجھ سے یہی سوال دوبارہ کیا جائے تو کہنا کہ اس کا رنگ سیاہ وسفید تھا اور جب تو یہ جواب دے گا تو کوئی شخص تیری تکذیب نہیں کر سکے گا۔[۲]

خطیب نے منصور عباسی اور اس کے بیٹے مہدی عباسی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: مقاتل نے ہمیں یہ پیشکش کی تھی کہ اگر تم چاہو تو میں تمہارے دادا عباس بن عبدالمطلب کی شان میں حدیث بنا دیتا ہوں۔

ہم نے کہا: ہمیں ایسی کوئی حدیث نہیں چاہیے۔[۳]

مقاتل کی دروغ بافیوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

ہماری اس تمام تر گفتگو کا ماحصل یہ ہے:

مقاتل غُلاتِ مشبّہہ میں سے تھا۔ اس نے تفسیرِ قرآن کا علم اہلِ کتاب سے حاصل کیا تھا اور وہ اہلِ کتاب کے نظریات کے مطابق قرآن عظیم کی تفسیر بیان کرتا تھا۔ اس نے اہلِ کتاب کے بہت سے نظریات کو حدیثِ رسولؐ کے عنوان سے پیش کیا اور اس کے لئے جھوٹی اسناد تراش رکھی تھیں۔ اس نے اہلِ کتاب کے نظریات کے مطابق تفسیر اور دیگر علوم قرآن پر کئی کتابیں بھی تحریر کی تھیں۔

مقاتل کو تمام تر کذب بیانی کے باوجود مکتبِ خلفاء میں بیحد پذیرائی حاصل ہوئی۔ مکتبِ خلفاء کے علماء نے لکھا ہے کہ: اَلنَّاسُ کُلُّھُمْ عَیَالٌ عَلیٰ ثَلَاثَۃٍ. عَلیٰ مُقَاتِلِ بْنِ سُلَیْمٰنِ فِی التَّفْسِیْرِ وَ...."[۴] تمام لوگ تفسیر کے لئے مقاتل بن سلیمان کے دسترخوان کے خوشہ چین ہیں۔

۱۔ احمد بن محمد بن ابراہیم برمکی اربلی شافعی (ابن خلکان) التوفی ۶۸۱ھ، وفیات الاعیان، ج۴، ص۳۴۲۔

۲۔ کتے عام طور پر دو ہی رنگ کے ہوتے ہیں یا سیاہ یا سفید اور مقاتل نے ایسا جواب تراشا کہ سب کو راضی کردیا۔

۳۔ خطیب، تاریخ بغداد، ج۱۳، ص۱۶۷۔

۴۔ خطیب، تاریخ بغداد، ج۱۳، ص۱۶۱۔ ابن خلکان، التوفی ۶۸۱ھ، وفیات الاعیان، ج۴، ص۳۴۱۔ حافظ ابن کثیر شافعی، تاریخ، ج۱۰، ص۱۰۷۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی، میزان الاعتدال، ج۴، ص۱۷۳۔

مقاتل کی کچھ روایات کا نمونہ اور تجزیہ

خطیب بغدادی نے سَنَدِ متصل کے ساتھ تاریخِ بغداد میں یہ روایت نقل کی ہے کہ مقاتل نے کہا: میں نے ضحاک سے اور اس نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسولِ خداؐ سے کہا گیا: یارسول اللہؐ! آپ ہمارے لئے اپنا کوئی جانشین مقرر فرمادیں تاکہ ہم اسے پہچان لیں اور اپنے معاملات کے سلسلے میں اس سے رجوع کریں کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کے بعد حالات کیا رُخ اختیار کریں گے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر میں نے کسی کو اپنا جانشین نامزد کردیا اور اس نے تمہیں اطاعتِ خدا کا حکم دیا اورتم نے اس کی نافرمانی کی تو تم میرے نافرمان قرار پاؤ گے اور میری نافرمانی براہِ راست خدا کی نافرمانی ہے۔ اور اگر میرے جانشین نے بالفرض تمہیں خدا کی نافرمانی کا حکم دیا اورتم نے اس کی اطاعت کی تو روزِ حساب یہ بات میرے خلاف حُجّت بن جائے گی لہٰذا میں یہ کام نہیں کروں گا۔ میں تمہیں خدا کے حوالے کرکے جاتاہوں۔[1]

اس روایت کو خطیب نے اپنی تاریخ میں یہ ثابت کرنے کے لئے نقل کیا ہے کہ مقاتل کے بقول اس نے یہ روایت ضحاک سے سنی تھی جبکہ ضحاک کی وفات مدینے میں ہوئی اور مقاتل خراسان میں رہائش پذیر تھا۔ ابن خلکان کے بقول مقاتل کی پیدائش سے چار سال قبل ضحاک مدینے میں وفات پاچکا تھا۔

مقاتل نے یہ بے سروپا روایت صرف خلفاء کی تائید میں گھڑی تھی کیونکہ مکتبِ خلفاء کا نظریہ یہ ہے کہ رسولِ خداؐ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا اور آپ نے خلیفہ کا انتخاب امت کی صوابدید پر چھوڑا تھا۔

توَرات کی دو روایات

اسرائیلی نظریات کو جن لوگوں نے مسلمانوں میں فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ان کے نام یہ ہیں:
(۱) ابوہریرہ (۲) عبداللہ بن عمرو بن عاص اور (۳) مقاتل بن سلیمان۔

اب ہم توَرات سے بطورِ اختصار دو داستانیں نقل کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق مکتبِ خلفاء ان داستانوں سے کتنا متاثر ہوا ہے۔

(الف) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنی صورت پر بنایا اور پھر آدمؑ پر نیند طاری کی اور اس کی ایک پسلی سے حوّا کو بنایا۔ پھر آدمؑ وحوّا دونوں کو باغِ عدن میں ٹھہرایا۔ آدمؑ اور اس کی بیوی دونوں ننگے تھے اور شرماتے نہ تھے اور ان دونوں کو حکم دیا کہ وہ باغ کے بیچ والے درخت کا پھل نہ کھائیں ورنہ وہ مرجائیں گے۔

۱۔ خطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۳، ص ۱۶۵۔

سانپ نے حوّا کو بتایا کہ تم ہرگز نہ مروگے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی طرح نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔ پھر حوّا نے اس درخت کا پھل کھایا اور اپنے شوہر کو بھی کھلایا۔ پھل کھاتے ہی دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتّوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں اور انہوں نے خداوندِ خدا کی آواز سنی جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا اور آدمؑ اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔

تب خدا نے آدمؑ کو نہ پاکر آواز دی اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔ اس نے کہا کہ تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟

اس کے جواب میں آدمؑ نے سانپ اور اپنی بیوی کی داستان سنائی اور اللہ تینوں پر ناراض ہوا اور تینوں کے لئے علیحدہ علیحدہ سزا مقرر کی۔ اس کے بعد خداوند خدا نے کہا کہ دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک[1] کی مانند ہوگیا ہے اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لیکر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لئے خداوند خدا نے اس کو باغِ عدن سے باہر کردیا اور باغِ عدن کے مشرق کی طرف کروبیوں اور چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کو رکھا کہ وہ زندگی کے درخت کی راہ کی حفاظت کریں۔

(پیدائش باب۲۔۳ بطور خلاصہ)

(ب) خدا اور یعقوب کی کُشتی کی داستان

اور یعقوب اکیلا رہ گیا اور پو پھٹنے کے وقت تک ایک شخص وہاں اس سے کُشتی کرتا رہا اور جب اس نے دیکھا کہ وہ اس پر غالب نہیں ہوتا تو اس کی ران کو اندر کی طرف سے چھوا اور یعقوب کی ران کی نس اس کے ساتھ کُشتی کرنے میں چڑھ گئی اور اس نے کہا کہ مجھے جانے دے کیونکہ پو پھٹ چلی۔ یعقوب نے کہا کہ جب تک تو مجھے برکت نہ دے میں تجھے جانے نہیں دوں گا۔ تب اس نے اُس سے کہا کہ تیرا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یعقوب۔ اس نے کہا تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔ تب یعقوب نے اس سے کہا کہ میں تیری مِنّت کرتا ہوں کہ تو مجھے اپنا نام بتادے۔ اس نے کہا کہ تو میرا نام کیوں پوچھتا ہے؟ اور اس نے اسے برکت دی۔ یعقوب نے اس جگہ کا نام فنی ایل رکھا اور کہا کہ میں نے خدا کو روبرو دیکھا تو بھی میری جان بچ رہی۔ (پیدائش باب ۳۲)

۱۔ ''ہم میں سے ایک'' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ توارت میں بہت سے خداؤں کا اثبات کیا گیا ہے۔

توراۃ کی داستانوں کا ماحصل

توراۃ کے مطابق بنی اسرائیل کا خدا کم اندیش ہے۔ اس نے آدمؑ کو درختِ معرفت سے روکنے کے لئے حیلے سے کام لیا اور اس سے جھوٹ موٹ کہا کہ اگر انہوں نے اس کا پھل کھایا تو وہ مرجائیں گے لیکن سانپ نے خدا کا جھوٹ بھانپ لیا اور اس نے حوّا کو سچی بات بتا دی کہ اس میں مرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر انہوں نے یہ پھل کھالیا تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی اور وہ نیک و بد کو سمجھنے لگ جائیں گے۔ جب آدمؑ و حوّا نے اس درخت کا پھل کھایا تو انہیں اپنی برہنگی کا احساس ہوا اور وہ خدا کی آواز سنتے ہی درختوں میں چھپ گئے۔ پھر ''خداوند خدا'' نے سانپ، حوّا اور آدمؑ سے اپنے حکم کی خلاف ورزی کا جی کھول کر انتقام لیا اور ان سے کہا کہ وہ تمام عمر رنج اور عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

توراۃ کی ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا مجسّم ہے، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے، توراۃ کا خدا انسانوں سے کشتی لڑتا ہے اور اگر کوئی چھپ جائے تو وہ اسے دکھائی بھی نہیں دیتا۔

یہ داستانیں توراۃ میں تحریف کا بیّن ثبوت ہیں۔ ان داستانوں کا متن ہی پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ سب افسانہ طرازی ہے۔ ایک سانپ خدا کے جھوٹ کو بھانپ لیتا ہے اور آدمؑ و حوّا کو حقیقت بتا دیتا ہے۔

توراۃ کی داستانوں کے اثرات

تورات کے اس طرح کے بے سروپا افسانوں نے مختلف لوگوں کے اذہان پر مختلف اثرات مرتب کئے۔ اس کے اثرات کو بنیادی طور پر دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) کچھ لوگوں نے دیکھا کہ تورات و انجیل دنیا کے دو بڑے پیغمبروں — حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام — پر نازل ہوئی تھیں مگر یہ دونوں کتابیں حقائق کی دنیا سے کوسوں دور اور خلافِ عقل باتوں سے بھری ہوئی ہیں اور ان کی تعلیمات بھی اخلاقِ عالیہ سے گری ہوئی ہیں چنانچہ ان لوگوں نے نہ صرف یہ کہ ان دو کتابوں بلکہ تمام آسمانی کتابوں کا انکار کردیا اور مادہ پرستی اختیار کرلی۔

(۲) وہ لوگ جو ان باتوں سے متاثر تھے اور اپنے عقیدے پر قائم رہے ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) یہود—— موجودہ توراۃ کا اکثر و بیشتر حصہ یہودیوں کا اپنا ساختہ و پرداختہ ہے جوان کی ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے۔ آج تک یہودی یہی ذہنیت اپنی نسلوں کو منتقل کرتے آئے ہیں اور صدیوں سے اپنی نسل کو جھوٹ، مکّاری اور حیلہ بازی کی تعلیم دینے میں مصروف ہیں۔

یہودی آج تک اپنی نسل کو یہ باور کراتے آئے ہیں کہ وہ اسرائیل کی اولاد ہیں اور ان کے جدِامجد اتنے دلیر تھے کہ انہوں نے پوری رات خداوند خدا سے کُشتی لڑی اور اسے چت کردیا۔

اس داستان سے یہودی ذہنوں میں یہ خنّاس سما گیا کہ وہ ساری دنیا کے تمام انسانوں سے برتر ہیں اور اپنی برتری کو قائم رکھنے کے لئے وہ ہر طرح کے مکر و حیلے کو جائز تصور کرنے لگے۔ یہودی اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے لاکھوں انسانوں کا خون بہانا بھی صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ توراۃ میں ایسے بہت سے عجیب و غریب قصے موجود ہیں کہ ان کے انبیاء نے حیلہ و مکر سے اپنے مخالفین کو موت کے گھاٹ اتارا اور ان کا قتلِ عام کیا۔[۱]

(۲) نصاریٰ—— توراۃ خدا کے جسم کی قائل ہے یہی وجہ ہے کہ نصاریٰ نے خدا کے متعلق باپ اور حضرت عیسیٰ کے متعلق بیٹے کا عقیدہ اپنایا۔ اگر توراۃ میں خدا کے مجسّم ہونے کی عبارات موجود نہ ہوتیں تو نصرانی باپ بیٹے کا عقیدہ نہ رکھتے۔

یورپ میں مادّی مکاتبِ فکر کے وجود میں آنے اور فروغ پانے کا سبب بھی اسی توراۃ کو قرار دیا جاسکتا ہے اور ان کی موجودہ استحصالی سوچ کا سرچشمہ بھی توراۃ کی روایات ہیں۔

(۳) مُسلمان—— اسرائیلی افکار کے اثرات مسلمانوں کے مکتبِ خلفاء میں واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسرائیلی روایات کی بازگشت کے طور پر مکتبِ خلفاء میں تجسیم و تشبیہ اور خدا کو انسانی صفات سے موصوف سمجھنے کا عقیدہ وجود میں آیا اور اس عقیدے کی تفصیل آپ آگے ملاحظہ کریں گے۔

جی ہاں! جب خدا کے دین میں تحریف واقع ہوجائے تو اس سے انسانی معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مکتبِ خلفاء میں تجسیم خداوندی کا عقیدہ دراصل توراۃ کی بے سروپا روایات کی وجہ سے پیدا ہوا اور جب مکتبِ خلفاء نے اس عقیدے کو تسلیم کرلیا تو پھر انہوں نے اپنے غلط افکار کی تائید کے لئے قرآنی آیات کو استعمال کیا۔

اصلی مباحث شروع کرنے سے قبل ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حقیقت و مجاز کیا ہوتی ہے اور حقیقی اور مجازی معانی کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟

۱۔ توراۃ کے تکوین ۳۲۔ مثنیہ کی آیات ۲، ۳، ۲۰، صحیفہ یوشع آیات ۷، ۸، ۱۰ دیکھیں۔

مفہوم کی اَدائیگی میں اَلفاظ کا کِردار

حقیقت ومَجاز[1]

عربی اور دنیا کی دیگر زبانوں کا یہ مسلّمہ قاعدہ ہے کہ اگر کوئی لفظ اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوتو اسے استعمالِ حقیقی یا استعمالِ لغوی کہا جاتا ہے۔

مثلاً عربی میں لفظ "یَد" ہاتھ کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ اگر ہم قُطِعَتْ یَدُ السَّارِقِ (چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا) کہیں تو یہاں لفظ یَد اپنے حقیقی اور لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور اگر کوئی لفظ جملے میں اپنے حقیقی معنیٰ میں استعمال نہ ہو بلکہ کسی ایسے معنیٰ میں استعمال ہو جو اس کے حقیقی معنیٰ سے مناسبت رکھتا ہوتو اسے "استعمالِ مجازی" کہا جاتا ہے۔ مثلاً لفظ یَد بول کر اس سے ہاتھ کی بجائے قوت مراد لی جائے تو یہ استعمال مجازی ہوگا۔ مثلاً عربی میں یہ کہا جائے: فَوْقَ کُلِّ ذِیْ یَدٍ یَدٌ. یعنی ہر طاقت سے بڑھ کر کوئی نہ کوئی طاقت ہوتی ہے۔ اس جملے میں لفظ یَد اپنے حقیقی معنی میں استعمال نہیں ہوا اور اس سے مراد وہ ہاتھ نہیں ہے جو انسانی جسم کا ایک عضو ہوتا ہے۔ اس طرح کے غیر لغوی اور غیر حقیقی استعمال کو "استعمالِ مجازی" کہتے ہیں۔

اس طرح کا استعمال دنیا کی تمام زبانوں میں پایا جاتا ہے بالخصوص نظم ونثر کے شہ پاروں میں اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے جس سے گفتگو میں ایک حسن پیدا ہوجاتا ہے۔

قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا اور قرآن مجید عربی ادب کا بے نظیر، بے مثال اور لازوال شاہکار ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ مجازی معنیٰ میں استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً سورہَ بنی اسرائیل کی اس آیت کو

۱۔ اس بحث میں ہم نے لفظ مجاز کو "استعمالِ حقیقی" کے مقابلے میں استعمال کیا ہے اور ہم نے مَجاز، اِستعارہ اور کِنایہ کی جملہ انواع کی مثالوں کو مجاز کی مثال بنا کر پیش کیا ہے۔ ہماری اس بحث کا مقصد مجاز کی جملہ اقسام کو بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ علمِ بلاغت کا موضوع ہے۔ ہمارا مقصد صرف لفظ کے حقیقی اور غیر حقیقی استعمال کا فرق واضح کرنا ہے۔

ہی ملاحظہ کریں جس میں لفظ یَد استعمال ہوا ہے: وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُومًا مَّحۡسُورًا... (آیت ۲۹)

اب اگر اس آیت کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو وہ کچھ یوں بنتا ہے: "اپنے ہاتھ کو طوق و زنجیر میں جکڑ کر گردن سے نہ باندھو اور نہ بالکل کھول دو..."

الفاظ وتراکیب کو سمجھنے والا ہر شخص یہ جانتا ہے کہ یہاں الفاظ کے لغوی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ مقصودِ آیت یہ ہے کہ جُود و عطا میں ہاتھ نہ کھینچو اور بخل سے کام نہ لو مگر جوشِ عطا میں ہاتھ بالکل کھول ہی نہ دو کہ سبھی کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو کہ تم ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔

اس مفہوم کی وضاحت کے لئے ہم دوسری مثال پیش کرتے ہیں:

عربی زبان میں لفظ صِرَاط زمینی راستے کو کہا جاتا ہے لیکن سورۂ فاتحہ میں اس سے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں کیونکہ سورۂ فاتحہ میں ہم پڑھتے ہیں: اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيمَ○ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّينَ○

اب اگر ہم یہاں لغوی اور لفظی ترجمہ کرنا چاہیں تو وہ کچھ یوں ہوگا: خدایا! ہمیں زمینی راستے کی رہنمائی فرما۔ ہمیں ان لوگوں کے (زمینی) راستے کی رہنمائی فرما جن پر تو نے نعمت نازل کی ہے۔ ان لوگوں کے (زمینی) راستے کی ہدایت نہ فرما جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ان لوگوں کے (زمینی) راستے کی ہدایت فرما جو گمراہ ہیں۔

یہ بات انتہائی واضح ہے کہ اس آیت میں لفظ صِرَاط اپنے لغوی معنیٰ میں استعمال نہیں ہوا اور اس سے زمینی راستا مراد نہیں ہے۔ اس سے انبیائے کرام علیہم السلام کا وہ راستا مراد ہے جو خدا کی طرف جاتا ہے۔ اسی راستے کو اسلام کہا جاتا ہے اور اسلام ہی تمام انبیاء علیہم السلام کا راستا رہا ہے۔ چنانچہ آیاتِ بالا کا صحیح ترجمہ و مفہوم یہ ہے کہ "خدایا! ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔ ان کے طریقے کی رہنمائی فرما جن پر تو نے اپنا انعام کیا ہے اور ان لوگوں کے طریقے سے بچا جن پر تیرا غضب ہوا ہے اور جو گمراہ ہوئے ہیں۔"

خلاصۂ گفتگو

عربی داں حضرات پر یہ مخفی نہیں ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں بَسۡطِ یَد سے ہاتھ کا لمبا کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنیٰ "معنوی ہاتھ کا کھولنا" ہے جس کا مقصد سخاوت اور بخشش ہے۔ سورۂ فاتحہ کی آیات میں بھی صِرَاط سے زمینی راستا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے "راہِ انبیاءؑ اور راہِ اسلام" مراد ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں آیات میں لفظی کے بجائے مجازی معنی مراد ہیں۔

مکتبِ خلفاء کے تمام علماء ومفسّرین ہمارے بیان کردہ مفہوم کی تائید کرتے ہیں اور اس طرح کی آیات کے مجازی معنیٰ میں ہم سے متفق ہیں لیکن جب یَد "ہاتھ"، عَین "آنکھ"، وَجْہ "چہرہ" اور سَاق "پنڈلی"، جیسے الفاظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتے ہیں تو پھر مکتبِ خلفاء کے علماء ومفسّرین انہیں لغوی معانی پر محمول کر کے خدا کو جسم وجسمانیت سے وابستہ کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور ان الفاظ سے اعضائے بدن ہی مراد لیتے ہیں اور مجازی معنیٰ کو درست نہیں سمجھتے۔

مکتبِ خلفاء کی رَوِش کے برعکس مکتبِ اہلبیتؑ میں خداوندِ عالم کو جسم وجسمانیات سے مُنزّہ اور مُبّرا سمجھا جاتا ہے اسی لئے جہاں کہیں اس طرح کے الفاظ دکھائی دیتے ہیں تو مکتبِ اہلبیتؑ کے پیروکار علماء لغوی معنیٰ کے بجائے مجازی معنیٰ مراد لیتے ہیں۔

مکتبِ خلفاء اور مکتبِ اہلبیتؑ کے متضاد افکار کی تحقیق وتجزیہ کے لئے دونوں مکاتب کی حدیثوں کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے اور جن آیات سے استدلال کیا جاتا ہے ان آیات کا مطالعہ بھی ازبس ضروری ہے۔ ہم دونوں مکاتبِ فکر کی احادیث واستدلال کو سامنے رکھ کر صفاتِ باری کے متعلق ان کا موازنہ کرنا چاہتے ہیں۔

دونوں مَکاتبِ فکر کی کتاب توحید کا مُوازَنہ

صِفاتِ ربوبیت کے موازَنے کے لئے ہم نے دونوں مکاتب کی ایک ایک کتاب کا انتخاب کیا ہے۔ مکتبِ خلفاء کی کتابوں میں سے ہم نے ابن خزیمہ کی "کتاب التوحید" اور مکتبِ اہلبیتؑ کی کتابوں میں سے شیخ صدوق کی "کتاب التوحید" کا انتخاب کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں مؤلفین کی "کتاب التوحید" کا ایک ہی موضوع یعنی "یکتاپرستی" ہے۔ دونوں طرف کے اَفکار کے مُوازَنے سے قبل ہم دونوں مؤلفین کا مختصر تعارف بھی پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہمارے قارئین جان لیں کہ ہم نے دونوں طرف کے چوٹی کے علماء کا انتخاب کیا ہے۔

مکتبِ خلفاء میں ابن خُزیمہ کا مقام

مکتبِ خلفاء کے علماء نے محمد بن اسحاق بن خزیمہ نیشاپوری کو اِمامُ الائمہ، الحافظُ الکبیر، المُجتھدُ المطلق، بَحْرُ العلوم، رَاسُ المحدّثین، حِبرُ العلماءِ العاملین اور کَعْبۃُ العلماء لکھا ہے۔

ابن خزیمہ ۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۱۱ھ میں فوت ہوئے۔ ابن خزیمہ سے بہت سے علماء نے حدیث روایت کی۔ ابن خزیمہ کے خوشہ چینوں میں صحیح بخاری کے مؤلف محمد بن اسماعیل بخاری اور مسلم بن حجاج نیشاپوری

بھی شامل ہیں اور ابن خزیمہ نے بھی ان دونوں سے احادیث نقل کی تھیں۔

سوالات کے جواب میں لکھے گئے رسائل کے علاوہ ابن خزیمہ نے ایک سو چالیس مستقل کتابیں بھی لکھی تھیں۔ ان کی تالیفات میں ''صحیح ابن خزیمہ'' بھی شامل ہے جس کے متعلق مکتبِ خلفاء کے چند محدثین نے لکھا کہ ''صحیح ابن خزیمہ'' کا مقام صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے بڑھ کر ہے۔

ابن خزیمہ عقیدے میں ''سلفی'' اور فقہ میں ''شافعی'' تھے[1]

اس بحث کے لئے ہم نے ان کی تالیف کردہ ''کتاب التوحید'' کا انتخاب کیا ہے جس کی تحقیق و تصحیح جامعۃ الازہر قاہرہ کے اُصولِ دین کالج کے پروفیسر محمد خلیل ہراس نے کی ہے اور یہ کتاب، کتابخانہ الکلیات الازھریہ قاھرہ نے ۱۳۷۸ھ میں شائع کرائی تھی۔

مکتبِ اہلبیتؑ میں شیخ صدوقؒ کا مقام

آپ کا پورا نام ابوجعفر محمد بن علی بن حسین بن بابویہ قمی تھا اور آپ کا لقب ''صدوق'' تھا۔ آپ نے ۳۸۱ھ میں وفات پائی۔

شیخ صدوق کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انہوں نے حدیث میں دوسو سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔

اس وقت ہمارے پیش نظر ''کتاب التوحید صدوق'' کا جو نسخہ ہے اس کی تصحیح ''سید ہاشم حسینی تہرانی'' نے کی ہے اور یہ ۱۳۸۱ھ میں تہران سے شائع ہوا ہے۔

صفاتِ ربوبیت کے تقابلی مطالعہ کے لئے جہاں ہم نے مذکورہ دونوں کتابوں کو بنیادی کتابیں قرار دیا ہے وہاں ہم دونوں مکاتبِ فکر کی مستند کتابوں مثلاً صحیح بخاری میں سے کتاب التوحید اور صحیح مسلم میں سے کتاب التوحید کے بھی حوالے دیں گے تاکہ صفاتِ ربوبیت کے متعلق فریقین کا نکتۂ نظر سمجھنے میں آسانی ہو اور دونوں کے تقابلی مطالعہ و موازنہ کی تکمیل ہو سکے۔

۱۔ ہم نے ابن خزیمہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کے لئے ہم نے ان کی ''کتاب التوحید'' کے مقدمے سے صفحہ ا - غ سے استفادہ کیا ہے۔

دونوں مکاتبِ فکر میں خدا کی ہیئت

(ا) مکتبِ خلفاء میں خدا کی ہیئت

(۱) کتاب التوحید ابن خزیمہ، صحیح بخاری، صحیح مسلم کے علاوہ مکتبِ خلفاء کی دوسری کتبِ حدیث میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ، طُوْلُهٗ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا. فَلَمَّا خَلَقَهُ اللّٰهُ، قَالَ: اِذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلٰی اُولٰئِکَ النَّفَرِ مِنَ الْمَلَائِکَةِ جُلُوْسٍ فَاسْتَمِعْ مَا یُحَیُّوْنَکَ، فَاِنَّهَا تَحِیَّتُکَ وَتَحِیَّةُ ذُرِّیَّتِکَ. فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ. فَقَالُوا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ فَزَادُوْهُ "وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" فَکُلُّ مَنْ یَّدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلٰی صُوْرَةِ آدَمَ. فَلَمْ یَزَلِ الْخَلْقُ یَنْقُصُ بَعْدُ حَتَّی الْآنَ.[۱]

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر ساٹھ ہاتھ قامت کا پیدا کیا اس کے بعد اس سے فرمایا: فرشتے بیٹھے ہوئے ہیں تم انہیں سلام کرو اور وہ تمہیں جو جواب دیں اس کو غور سے سنو۔ ان کا جواب تمہارا اور تمہاری نسل کا سلام ہوگا۔ (آدمؑ گئے) اور کہا: "اَلسَّلامُ علیکم" فرشتوں نے جواب میں کہا: "وَعَلیکمُ السَّلامُ ورَحْمَةُ اللّٰه." ملائکہ نے ان کے جواب میں "وَرَحْمَةُ اللّٰه" کے الفاظ کا اضافہ کیا۔ جنت میں جو بھی جائے گا وہ آدمؑ کے قد و قامت کو لے کر جائے گا۔ پھر اس کے بعد انسانوں کے قد روز بروز آج تک گھٹتے گئے۔ (اور اس موجودہ صورت میں آ گئے)۔

(۲) اِذَا قَاتَلَ اَحَدُکُمْ اَخَاهُ فَلْیَجْتَنِبِ الْوَجْهَ. فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ.[۲]

ابوہریرہؓ سے منقول دوسری روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب بھی تم

۱۔ بخاری، کتابُ الاستئذان، بابُ بدءِ السلام، ج۲، ص۵۹۔ مسلم، کتابُ الجنة و صِفَة نعیمِها، باب یدخلُ الجنّةَ اَقوامٌ اَفْئِدَتُهُمْ مِثْلَ اَفْئِدَةِ الطیر، ص۲۱۸۳و۲۱۸۴، حدیث۲۸۔ توحید ابن خزیمہ، باب ذکر اخبار رؤیته عن النبی، ص۴۰و۴۱۔

۲۔ مسلم، کتاب البر و الصلة و الاداب، باب النهی عن ضرب الوجه، ص۲۰۱۶، حدیث۱۱۲و۱۱۶۔ مسند احمد، ج۲، ص۲۴۴...

میں سے کوئی اپنے بھائی کو مارے پیٹے تو اس کے چہرے کو مارنے سے پرہیز کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

ایک روایت میں فَلْیَتَّقِ الْوَجْهَ اور ایک دوسری روایت میں فَلَا یَلْطِمَنَّ الْوَجْهَ کے الفاظ آئے ہیں۔ تمام الفاظ کا مفہوم وہی ہے جو ہم نے اوپر لکھا ہے۔

ابوہریرہؓ کی مذکورہ بالا روایات میں جو کہا گیا ہے کہ ''اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا'' اس سلسلے کی اصل حقیقت کیا ہے۔ حقیقت کی تلاش کے لئے ہم احادیثِ اہلبیتؑ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(ب) روایاتِ اہلبیتؑ میں حقیقت کا انکشاف

ائمۂ اہلبیت علیہم السلام نے اس داستان کی حقیقت کو ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے:

(۱) حسین بن خالد کہتے ہیں کہ میں نے امام علی رضاؑ سے کہا: ''یَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! اِنَّ النَّاسَ یَرْوُوْنَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ. قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ. فَقَالَ: قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ! لَقَدْ حَذَفُوْا اَوَّلَ الْحَدِیْثِ. اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ مَرَّ بِرَجُلَیْنِ یَتَسَابَّانِ، فَسَمِعَ اَحَدَ هُمَا یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ: قَبَّحَ اللّٰهُ وَجْهَکَ، وَوَجْهَ مَنْ یُّشْبِهُکَ! فَقَالَ: (ص) یَاعَبْدَاللّٰهِ! لَا تَقُلْ هٰذَا لِاَخِیْکَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ.

اے فرزندِ رسولؐ! لوگ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔'' یہ سن کر امام علی رضاؑ نے فرمایا: ان پر خدا کی مار! انہوں نے حدیث کے ابتدائی حصے کو حذف کر دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ رسولِ خداؐ دو افراد کے پاس سے گزرے جو ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ ایک شخص دوسرے کو کہہ رہا تھا ''اللہ تیرے چہرے کو خراب کرے اور اس کے چہرے کو بھی خراب کرے جو تجھ سے مشابہت رکھتا ہو۔'' یہ سن کر رسولِ خداؐ نے فرمایا: اے بندۂ خدا! اپنے بھائی سے ایسی بات نہ کہو کیونکہ اللہ نے آدمؑ کو اس کی صورت پر پیدا کیا تھا۔ (یعنی آدمؑ کا چہرہ اس شخص کے چہرے کے مشابہ تھا)۔

(۲) ''ابوالورد بن ثمامہ''[۱] نے حضرت امیرالمومنینؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: سَمِعَ النَّبِیُّ(ص) رَجُلًا یَقُوْلُ لِرَجُلٍ: قَبَّحَ اللّٰهُ وَجْهَکَ، وَوَجْهَ مَنْ یُّشْبِهُکَ! فَقَالَ: (ص) مَهْ! لَا تَقُلْ هٰذَا، فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ.[۲] رسولِ خداؐ نے ایک شخص سے سنا جو دوسرے شخص سے کہہ رہا تھا کہ

۱۔ ابوالورد بن ثمامہ بن حزن، قشیری، بصری کا تعلق راویانِ حدیث کے ساتویں طبقے سے تھا۔ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب جلد ۲، ص ۲۸۶۔

۲۔ شیخ صدوق، کتاب توحید، ص ۱۵۲۔ علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۴، ص ۱۲۔

''خدا تیرے چہرے کو خراب کرے اور جس کا چہرہ تجھ سے ملتا ہو، خدا اسے بھی خراب کرے۔'' یہ سن کر رسولِ خداؐ نے فرمایا: خاموش ہو جاؤ! ایسی بات نہ کہو کیونکہ اللہ نے آدمؑ کو اس کی صورت پر پیدا کیا۔

(۳) مذکورہ دو روایات کے علاوہ ائمہ اہلبیتؑ سے ایسی روایات بھی بکثرت مروی ہیں جن میں انہوں نے مکمل اور مطلق طور پر خدا کے جسم و جسمانیت کی نفی کی ہے۔ بطورِ نمونہ یہ روایت ملاحظہ فرمائیں جس میں راوی کہتا ہے کہ میں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو خط لکھ کر ان سے تجسیم خداوندی کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے جواب میں لکھا: سُبْحَانَ مَنْ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ، لاَ جِسْمٌ وَلاَ صُوْرَةٌ. خدا وہ ہے جس کے مثل کوئی چیز نہیں، وہ نہ جسم ہے نہ صورت۔

(ج) مذکورۂ احادیث کا مُوازنہ اور تجزیہ

جب ابوہریرہؓ کی بیان کردہ روایات کا کتبِ اہلبیتؑ کی روایات سے موازنہ کیا جائے تو ہمیں ابوہریرہؓ کی روایات میں دو قسم کے اضافے اور ایک قسم کا حذف دکھائی دیتا ہے۔

(۱) حدیث کے ابتدائی حصّہ کا حَذف کرنا

ابوہریرہؓ کی روایت میں پیغمبرِ اکرمؐ کی مذکورہ حدیث کا پس منظر غائب ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ کا ایک جگہ سے گزر ہوا جہاں دو افراد آپس میں جھگڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو گالیاں بک رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا: خدا تیرے چہرے کو خراب کرے اور تیرے چہرے سے جو چہرہ مشابہ ہو، خدا اسے بھی خراب کرے۔ رسولِ خداؐ نے اس سے کہا: اپنے بھائی سے یہ بات مت کہو کیونکہ اللہ نے آدمؑ کو اس کی صورت پر پیدا کیا۔

ابوہریرہؓ کی حدیث میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے حدیث کا سِیاق و سَباق اور پس منظر غائب کر دیا اور حدیث کا پس منظر حذف کر کے رسولِ خداؐ کا یہ فرمان بیان کیا: اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ.

حدیث کے فیصلہ کُن پس منظر کی وجہ سے لفظ "صُوْرَتِهٖ" کی ضمیر کے مرجع کے متعلق یہ وہم پیدا ہو گیا کہ اس کا اشارہ اللہ کی طرف ہے اور حدیث کا معنی یہ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا: ''اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔''

اور توریت بھی بعَینہٖ یہی کہتی ہے کہ: خدا نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

اس پس منظر کے حذف کے متعلق تین احتمالات ممکن ہیں:

(۱) ابوہریرہؓ چونکہ اَن پڑھ تھے اور لکھنا نہیں جانتے تھے اس لئے وہ صرف اپنے حافظے پر انحصار کرتے تھے اور جب انہوں نے یہ حدیث بیان کی ہوگی تو اس وقت تک انہیں اس کا پس منظر بھول چکا ہوگا۔ اسی لئے انہوں

نے حدیث کا پس منظر بیان کرنے کی بجائے صرف حدیث کے الفاظ بیان کئے ہوں گے۔" یہ احتمال صرف اُس صورت میں قابلِ قبول ہے جب ہم ابوہریرہؓ کے متعلق حسنِ ظن رکھیں۔"

(۲) کعب الاحبار کو خلافت انتظامیہ کی نگاہوں میں بوجوہ چند در چند اہم مقام حاصل تھا اور اس کی روایات کو پذیرائی حاصل تھی اور ادھر ابوہریرہؓ بھی "کعب الاحبار" کے لائق شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ اتفاق سے ابوہریرہؓ نے بیس برس قبل متذکرہ بالا حدیث کا پس منظر اور حدیث کے الفاظ سنے تھے اور پھر کعب الاحبار نے محرّف توٗرات کی روایت پیش کی تو ابوہریرہؓ کو حدیثِ نبوی کا پس منظر بھول چکا تھا اور انہوں نے کعب الاحبار سے اس سلسلے کی تازہ روایت سنی تھی تو کعب کی تازہ حدیث ان کے ذہن میں رہ گئی اور یوں انہوں نے حدیثِ نبویؐ کا پس منظر بیان کرنے کی بجائے کعب الاحبار کے الفاظ کو ہی حدیثِ نبویؐ کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کردیا۔

(۳) اس سلسلے کا آخری احتمال یہ ہے کہ ابوہریرہؓ نے حدیث کو سِیاق وسَباق کے ساتھ بیان کیا ہو اور بعد میں محدثین کو اشتباہ لاحق ہوا ہو اور انہوں نے حدیث کے پس منظر کو حذف کردیا ہو۔

بہرنوع بات کوئی بھی کیوں نہ ہو نتیجہ سب کا یکساں برآمد ہوا۔

(۲) حدیثِ ابوہریرہؓ میں دو اضافے

(۱) پیغمبرؐ سے منقول مذکورہ دوسری حدیث میں ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "تم میں سے جب کسی کی اپنے بھائی سے لڑائی ہو تو چہرے پر تھپڑ نہ مارے۔" معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریف شدہ جملہ اُسی روایت کا حصہ ہے جس کے ایک حصہ کو حذف کیا گیا ہے۔

(۲) ابوہریرہؓ نے پہلی حدیث میں کہا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو ساٹھ ہاتھ (نوے فٹ) لمبا پیدا کیا..." جبکہ جدید سائنسی اور علمی تحقیقات سے یہ نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔

ابوہریرہؓ کی اس حدیث میں توٗرات کے افسانوں کی چھاپ نمایاں ہے۔ ابوہریرہؓ کے پاس اس طرح کے بہت سے افسانے موجود تھے۔ انہوں نے حدیثِ نبویؐ کا پس منظر حذف کر کے توٗرات کے مفہوم کو ادا کیا اور پھر انہوں نے حدیث کے ساتھ اپنے خودساختہ افسانے کا اضافہ کیا جس کا تعلق حضرت آدمؑ کی تخلیق سے تھا اور یوں اسرائیلی نظریات مسلمانوں میں منتقل کئے۔

اس حدیث کو ابوہریرہؓ جیسے مشہور صحابی نے روایت کیا۔ اسی وجہ سے مکتبِ خلفاء سے وابستہ لوگوں نے اسے اپنے دین کا جزو بنالیا اور انہوں نے خدا کو انسانی اعضاء کی طرح سے اعضاء کے ساتھ موصوف قرار دیا۔

اس عقیدے کا اثر یہ ہوا کہ قرآن حکیم میں جہاں کہیں خدا کے لئے لفظ "وَجہ" آیا تو مکتبِ خلفاء نے اس سے ظاہری چہرہ ہی مراد لیا ہے۔

دونوں مکاتبِ فکر میں وَجْہُ اللّٰہ کا مفہوم

(ا) مکتبِ خلفاء میں وَجْہُ اللّٰہ کا مفہوم

ابن خزیمہ کتاب التوحید کے دسویں صفحہ پر لکھتے ہیں:

بَابُ ذِکْرِ اِثْبَاتِ الْوَجْهِ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَصَفَهٗ بِالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ فِیْ قَوْلِهٖ:

"وَیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ." (سورہ رحمٰن: آیت ۲۷)

وَنَفٰی عَنْهُ الْهَلَاکَ... قَالَ جَلَّ وَعَلَا:

"کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهٗ." (سورہ قصص: آیت ۸۸)

اللہ تعالیٰ کے اس چہرے کے اثبات کا تذکرہ جس کی خدا نے اپنے اس فرمان میں جلالت و اکرام کے ساتھ صفت بیان کی ہے۔ خدا نے اس چہرہ سے ہلاکت کی نفی کرتے ہوئے کہا: اس کے چہرے کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

پھر ان آیات جیسی چند مزید آیات نقل کرنے کے بعد لکھا: فَاَثْبَتَ اللّٰهُ لِنَفْسِهٖ وَجْهًا وَصَفَهٗ بِالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ وَحَکَمَ لِوَجْهِهٖ بِالْبَقَاءِ وَنَفَی الْهَلَاکَ عَنْهُ. اللہ نے اپنے لئے چہرے کا اثبات کیا جس کی توصیف جلال و اکرام کے ساتھ فرمائی اور اپنے چہرے کے متعلق یہ فیصلہ دیا کہ وہ باقی رہے گا اور وہ فنا نہیں ہوگا۔

اس بحث کا نتیجہ انھوں نے یہ نکالا کہ اللہ نے جس چیز کا اپنے لئے اثبات کیا ہے ہم بھی اس کے لئے اسی چیز کا اثبات کرتے ہیں لیکن اس کے رخساروں کو اس کی مخلوق کے رخساروں سے تشبیہ نہیں دیتے۔

اس کے بعد ابن خزیمہ نے اپنی کتاب کے گیارہویں صفحہ سے لے کر اٹھارہویں صفحے تک پیغمبر اکرمؐ کی ان احادیث کو نقل کیا جن میں لفظ "وجہ" کا اطلاق کیا گیا ہے۔ مثلاً انھوں نے پہلی روایت میں آنحضرتؐ کی دعا کے یہ الفاظ نقل کئے: اَعُوْذُ بِوَجْهِکَ الْکَرِیْمِ. اس کا ترجمہ ابن خزیمہ نے یہ کیا: اے خداوندِ کریم میں تیرے چہرے کی پناہ چاہتا ہوں۔

ابن خزیمہ نے ایسی تمام آیات واحادیث کو جمع کیا جن میں "وَجْہُ اللّٰہ" یا "وَجْہُ الرَّبّ" کے الفاظ کا اطلاق ہوا ہے اور پھر انھوں نے ان آیات واحادیث کے نتیجے میں کہا کہ خدا کا بھی ایک چہرہ ہے اور وہ چہرہ اس کا ایک عضو ہے۔

"وَجْہُ اللّٰہ" کے متعلق آپ نے مکتبِ خلفاء کا نظریہ اور ان کا استدلال ملاحظہ کیا۔ آیئے دیکھیں اوصیائے پیغمبرؐ "وَجْہُ اللّٰہ" کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔

(ب) مکتبِ اہلبیتؑ میں وَجْہُ اللّٰہ کا مفہوم

اس بحث کے آغاز پر ہم حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ آپ نے اس حدیث میں صفاتِ ربوبیت اور فہمِ آیات کے متعلق دو علمی قوانین بیان فرمائے ہیں۔

ایک طویل روایت کے مطابق ایک سائل نے امام علی علیہ السلام کے سامنے قرآن مجید کی بہت سی آیات پڑھیں اور اس سلسلے میں اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کیا۔ اس نے اپنے استدلال میں یہ آیات پڑھیں:

(۱) وَجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا. تیرا رب اور فرشتے صف درصف آئیں گے۔ (سورۂ فجر: آیت ۲۲)

(۲) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ. (منکر) صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس ملائکہ آئیں یا تیرا رب آجائے یا تیرے رب کی کچھ آیات ان کے پاس آئیں۔ (سورۂ انعام: آیت ۱۵۸)

مذکورہ بالا دو آیات پڑھ کر سائل نے کہا کہ پہلی اور دوسری دونوں آیات میں اللہ کے آنے کا ذکر کیا گیا ہے (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا دوسرے اجسام کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے۔)

وصیِّ رسول امام علیؑ نے ان آیات کے متعلق فرمایا: اللہ نے سچ کہا ہے لیکن اللہ کی آمد کا وہ مفہوم نہیں ہے جو مخلوقات کی آمد کا ہے اور میں تمہیں بتا چکا ہوں (جواب کے پہلے حصے میں) کہ قرآن مجید میں بہت سے جملے اور کلمات ایسے بھی ہیں جن کی تاویل ان کی تنزیل سے جدا ہے اور (کلامِ الٰہی) انسانی کلام کے مشابہ اور اللہ کا فعل بندوں کے فعل کی مانند نہیں ہے۔ اس سلسلے میں تمہیں کچھ مقامات سے آگاہ کرتا ہوں تاکہ انشاء اللہ تم ان پر تکیہ کرسکو۔ ان مقامات میں سے ایک کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کے اس فرمان سے ہے جو انہوں نے کہا تھا:

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ. بے شک میں اپنے رب کی طرف جارہا ہوں وہی میری ہدایت کرے گا۔ (سورۂ صافات: آیت ۹۹)

اس آیت میں "رب کی طرف جانے کا" مقصد خدا کی طرف توجہ کرنا ہے اور عبادت وریاضت کے

ذریعے اس کا تقرب حاصل کرنا ہے۔ (یہاں ذِهَاب سے مراد قدم اٹھا کر رکھنا نہیں ہے) کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس آیت کے تنزیلی اور تاویلی مفہوم میں واضح فرق ہے؟ اس کے بعد امام علیؑ نے فرمایا:

اَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْاَ نْعَامِ ثَمَانِيَةَ اَزْوَاجٍ. اس نے تمہارے لئے جانوروں کے آٹھ جوڑے ''نازل'' کئے۔ (سورۂ زمر: آیت ٦)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ. اور ہم نے لوہا ''نازل'' کیا جس میں (امورِ جنگ کے لئے) شدید سختی ہے۔ (سورۂ حدید: آیت ٢٥)

امام عالی مقامؑ نے مذکورہ بالا دو آیات کے ''اَنْزَلَ اور اَنْزَلْنَا'' سے استدلال کیا کیونکہ اگر ان آیات سے لغوی معنی مراد لئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آٹھ قسم کے جانوروں کے جوڑے اور لوہے کو آسمان سے اتارا۔ ان دونوں آیات کی تلاوت کے بعد امامؑ نے فرمایا: ان آیات میں لفظ ''اَنْزَلَ'' کے معنی اتارنا نہیں بلکہ پیدا کرنا ہے۔[1] اور آیات کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے آٹھ قسم کے جانور پیدا کئے... اور لوہے کو پیدا کیا۔

وصیٔ رسولؐ نے اس حدیث میں ہمیں دو قوانین کی تعلیم دی ہے:

صِفاتِ پروردگار کی معرفت کا پہلا قانون

آپ نے اس قانون کو ان الفاظ میں بیان فرمایا: ''خدا کے افعال مخلوقات کے افعال کی مانند نہیں ہیں۔''

اس قاعدے کی تشریح کے لئے ہم مثالیں پیش کرتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ... اللہ نے سن لیا ہے... (سورۂ مجادلہ: آیت ۱)

''سننے'' کا لفظ اللہ سے مخصوص نہیں ہے۔ انسانوں اور حیوانوں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً فلاں شخص نے سنا، گائے نے مالک کی آواز سنی وغیرہ۔ سننے کے الفاظ کا اطلاق خدا پر بھی ہوتا ہے اور اس کی مخلوق پر بھی ہوتا ہے لیکن سننے کی کیفیت اور انداز میں واضح فرق ہے۔ مخلوق جب بھی کوئی آواز سنتی ہے تو وہ کانوں کے ذریعے سے سنتی ہے جبکہ خدا کانوں کا محتاج نہیں ہے۔

۱۔ شیخ صدوق، کتاب توحید، باب الرد علی الثنویۃ والزنادقۃ، حدیث ۵، ص ۲۶۵و۲۶۶۔ روایت کا آخری فقرہ روایت کے پہلے حصے سے ماخوذ ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

خَلَقْتُ بِیَدَیَّ... میں نے اسے (آدمؑ کو) اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا۔ (سورۂ ص: آیت ۷۵)

انسان کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے فلاں کام اپنے دونوں ہاتھوں سے انجام دیا۔

ہم اس مقام پر لفظ یَدُاللّٰہ کی بحث میں داخل نہیں ہونا چاہتے۔ انشاء اللہ آگے چل کر اس عنوان پر بھی تفصیلی بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ آیت مذکور میں جو ''دو ہاتھ'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس سے وہ دو ہاتھ مراد نہیں ہیں جو بدن کا حصہ ہوتے ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام سے فرمایا:

اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی. یقیناً میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ (سورۂ طٰہٰ: آیت ۴۶)

جبکہ بِعَیْنِہٖ یہی الفاظ ایک انسان کے متعلق بھی کہے جاتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں شخص کے ہمراہ ہے، وہ اس کی باتیں سنتا اور اس کے عمل کو دیکھتا ہے۔

یقیناً انسان کے ساتھ ہونے اور خدا کے ساتھ ہونے میں بڑا فرق ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں فلاں کے ساتھ ہے تو عام طور پر اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بدن کے ذریعے سے دوسرے شخص کے بدن کے ساتھ ہے لیکن جب ہم یہ الفاظ خدا کے متعلق کہیں گے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہوگا کہ خدا اپنے جسم سمیت موسیٰ و ہارون علیہم السلام کے ساتھ تھا۔ (مذکورہ تین مثالوں سے واضح ہوا کہ خدا اور مخلوق کے افعال کے متعلق اگرچہ لفظ یکساں ہوتے ہیں لیکن دونوں کے مطلب و مفہوم میں زمین و آسمان سے زیادہ کا فرق ہوتا ہے)۔

قرآنی آیات کو سمجھنے کا دوسرا قانون

رسولِ خداؐ کے وصیٔ برحق نے اپنی حدیث میں ہمیں یہ سمجھایا کہ قرآنِ مجید میں بہت سے کلمات اور جملات ایسے ہیں جن کی تاویل (مفہوم) ان کی تنزیل (لغوی معانی) سے علیحدہ ہوتی ہے۔

حضرت امیرالمومنینؑ نے اس قاعدے کی وضاحت کے لئے قرآن مجید سے دو مثالیں بیان فرمائیں:

پہلی مثال میں آپ نے حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول پیش کیا:

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ... میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں۔ (سورۂ صافات: آیت ۹۹)

امام علیؑ نے فرمایا: اس آیت میں جانے سے مراد خدا کی طرف توجہ کرنا اور اس کی عبادت کرنا ہے جبکہ یہ مفہوم لغوی معنی کے علاوہ ہے۔

دوسری مثال میں آپ نے قرآن کریم کی دو علیحدہ علیحدہ آیات میں سے لفظ اَنْزَلَ ''نازل کیا'' اور اَنْزَلْنَا ''ہم نے نازل کیا'' سے استدلال کیا کیونکہ ہر عقلمند جانتا ہے کہ جانوروں کے آٹھ جوڑے آسمان سے نہیں اتارے گئے اور لوہا بھی آسمان سے نہیں اترتا۔ مذکورہ آیات میں ''اتارنے'' سے مراد پیدا کرنا ہے۔

قرآن مجید میں ان دو مواقع کے علاوہ بھی بہت سی ایسی آیات ہیں جن سے لغوی نہیں بلکہ مجازی مفہوم مراد ہے۔ مذکورہ قسم کی آیات میں اگر ہم لفظی معانی پر ہی ضد کریں تو عجیب صورتحال پیدا ہو جائے گی اور ہماری یہ رَوِش غلط ہوگی اور اس کے بہت تباہ کن نتائج نکلیں گے اور گہرے اعتقادی انحرافات جنم لیں گے۔

اوصیائے رسولؐ نے ہمیشہ ان دو علمی قوانین سے استفادہ کیا اور صفاتِ پروردگار کے مباحث اور آیاتِ قرآنی کی تاویل کے لئے ائمہ اہلبیتؑ نے امام علی علیہ السلام کے علمی قواعد کو ہمیشہ مدنظر رکھا۔ آئندہ مباحث میں آپ کو اس رَوِش کی بہت سی مثالیں دکھائی دیں گی جبکہ سرِدست ہم لفظ وَجْهُ اللّٰهِ کے مفہوم کو اجاگر کرنے کیلئے ائمہ اہلبیتؑ کے چند فرامین نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

ظاہری چہرے کی نفی کی روایات

(۱) ابوحمزہ بیان کرتے ہیں:

قُلْتُ لِاَبِیْ جَعْفَرٍ قَوْلَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ''كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ؟'' قَالَ: فَیَهْلِكُ كُلُّ شَیْءٍ وَیَبْقَى الْوَجْهُ؟ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اَعْظَمُ مِنْ اَنْ یُّوْصَفَ بِالْوَجْهِ، وَلٰكِنْ مَعْنَاهُ: كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا دِیْنَهُ، وَالْوَجْهُ الَّذِیْ یُؤْتٰى مِنْهُ. میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ کا مفہوم پوچھا (کیونکہ باقی لوگ اُس وقت اس سے ظاہری چہرہ مراد لیتے تھے) امام علیہ السلام نے فرمایا: کیا وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا باقی جسم تو ہلاک ہو جائے گا لیکن اس کا چہرہ بچ جائے گا؟ اللہ اس بات سے کہیں بلند و برتر ہے کہ چہرے کے ساتھ اس کی توصیف کی جائے جبکہ آیت کا مفہوم و معنیٰ یہ ہے کہ خدا کے دین کے علاوہ ہر چیز ختم ہو جائے گی۔ بس خدا کا دین اور وہ سمت باقی رہے گی جو خدا کی طرف جاتی ہے۔

(۲) دوسری روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس آیت کا مفہوم یوں اجاگر فرمایا: عَنْ اَبِیْ بَصِیْرٍ: عَنِ الْحَارِثِ بْنِ الْمُغِیْرَةِ النَّصْرِیِ، قَالَ: سَاَلْتُ اَبَاعَبْدِاللّٰهِ عَنْ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ ''كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ.'' قَالَ: كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا مَنْ اَخَذَ طَرِیْقَ الْحَقِّ.[۱]

ابوبصیر نے حارث بن مغیرہ نصری سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا: میں نے امام صادقؑ سے كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ہر چیز فنا ہو جائے گی سوائے اس کے جو راہِ حق پر چلا۔

۱۔ شیخ صدوق، کتاب توحید، باب تفسیر قولِ اللّٰهِ عزوجل ''كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ''، ص۱۴۹، حدیث ۱ و ۲۔

مؤلّف کہتا ہے کہ دونوں احادیث کا مفہوم ایک ہی ہے کیونکہ راہِ حق وہی ''دینِ خدا'' ہے اور دینِ خدا ہی خدا کے تقرّب کا راستا ہے۔ مذہبِ اہلبیتؑ میں مسلمانوں کو وَجْہُ اللّٰہ کا یہ مفہوم بتایا گیا ہے۔

(ج) دونوں مَفاہیم کا تجزیہ اور مُوازَنہ

لفظ "وَجْہ" کے مفہوم کی وضاحت کے لئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس لفظ کا اطلاق کن معانی پر ہوتا ہے۔ جب ''وجہِ انسان'' کے الفاظ بیان کئے جائیں تو اس سے انسان کا چہرہ مہرہ مراد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان عرب میں اس لفظ کے کچھ اور معانی بھی ہیں جو کہ یہ ہیں:

۱۔ وَجْہ کسی چیز کے ابتدائی حصے کو کہا جاتا ہے۔ مثلاً عربی میں "وَجْہُ النَّھَار" کے الفاظ رائج ہیں جس کے معنی دن کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے۔[۱]

۲۔ وَجْہ حقیقتِ امر کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ عربوں کا مقولہ ہے کہ "اَصَابَ وَجْہَ الْمَسْأَلِۃ" اس نے مسئلہ کی حقیقت کو پالیا۔

۳۔ وَجْہ جہت، طرف اور ارادے کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہے مثلاً عرب کہتے ہیں: "اِتَّجَہَ لِلتِّجَارَۃ" اس نے تجارت کا ارادہ کیا اور تجارت کے لئے روانہ ہوا۔[۲]

۱۔ خدا نے یہودِ مدینہ کی مکاری کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے اس قول کو نقل کیا: ...اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْہَ النَّھَارِ وَاکْفُرُوْٓا اٰخِرَہٗ لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ. جو کچھ صاحبانِ ایمان پر نازل ہوا ہے، تم دن کے ابتدائی حصے میں اس پر ایمان لاؤ اور دن کے پچھلے حصے میں اس کا انکار کردو تاکہ وہ اس حیلے کی وجہ سے اپنے دین کو چھوڑ دیں۔ (سورۂ آل عمران: آیت۷۲)

۲۔ راغب اصفہانی نے اپنی کتاب ''مفردات'' میں وَجْہ کے یہی معانی بیان کئے ہیں۔ نیز معجم لالفاظ القرآن الکریم، تالیف ''الھیئۃ المصریۃ العامۃ للتالیف والنشر'' ۱۳۹۰ھ میں لفظ "اَلْوَجْہ" کے متعلق مذکور ہے:

اَلْوَجْہُ: اَلْجُزْءُ مِنَ الْحَیَوَانِ الَّذِیْ فِیْہِ الْفَمُ وَالْاَنْفُ وَالْعَیْنَانِ.

وَالْوَجْہُ: اَلذَّاتُ، وَھٰذَا مِنَ الْمَجَازِ مِنْ اِطْلَاقِ الْجُزْءِ عَلٰی کُلِّہٖ.

وَقَدْیَرِدُ الْوَجْہُ بِھٰذَا الْمَعْنٰی فِیْمَا لَیْسَ لَہٗ جَارِحَۃٌ کَالْبَارِیْ جَلَّ وَعَزَّ.

وَیُقَالُ: اَصَابَ وَجْہَ الْمَسْأَلِۃ: اَیْ ذَاتَھَا وَحَقِیْقَتَھَا.

وَالْوَجْہُ: صَدْرُ الشَّیْءِ یُتَوَجَّہُ اِلَیْہِ، کَالْقِبْلَۃِ... (ہم نے عبارتِ کتاب کو بطورِ اختصار یہاں نقل کیا ہے۔)

لفظ وَجْہ کا اطلاق جاندار کے اس حصے پر کیا جاتا ہے جس میں منہ، ناک اور دو آنکھیں ہوتی ہیں۔

لفظ وَجْہ کا اطلاق ذات پر ہوتا ہے اور یہ جز کا کُل پر اطلاق ہے اور اس کا تعلق بابِ مجاز سے ہے۔

اور جب عضو موجود نہ ہو جیسے اللہ تعالیٰ اعضاء نہیں رکھتا، اگر اس کے لئے لفظ وَجْہ کا اطلاق ہو تو اس سے ذات مراد ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے: اَصَابَ وَجْہَ الْمَسْأَلِۃ. یعنی اس نے مسئلہ کی ذات اور حقیقت کو پالیا ہے۔

لفظ وَجْہ کا اطلاق کسی چیز کے سامنے والے حصے کی طرف ہوتا ہے جس کی طرف توجہ کی جاتی ہے جیسا کہ قبلہ۔

اس بحث میں ہم "وَجْهُ الرَّبّ" اور "وَجْهُ الله" کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں۔ مکتبِ خلفاء سے وابستہ علماء نے آیات و احادیث میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کے وَجْه کا ذکر ہوا ہے ظاہری چہرہ مراد لیا ہے اور اس فکر کی وجہ سے انہوں نے خدا کے متعلق یہ عقیدہ قائم کیا کہ انسانوں کی طرح سے خدا کا بھی چہرہ ہے۔

مکتب اہلبیتؑ میں مولائے متقیان امام علیؑ نے ہمیں دو علمی قوانین کی تعلیم دی:

(۱) اللہ کے افعال وصفات کو مخلوقات کے افعال وصفات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) کبھی آیاتِ قرآن کی تاویل، تنزیل کے موافق نہیں ہوتی۔ یہ علمی قاعدہ علم بلاغت کا مسلمہ قاعدہ ہے اور علم بلاغت کی اصطلاح میں اسے ''استعمالِ مجازی'' کہا جاتا ہے جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں۔

۲۔ گزشتہ بحث میں ہم نے یہ دیکھا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنے جدامجد امام علیؑ کے بیان کردہ فرمان کے تحت خدا کے مخلوقات کی طرح سے جسم وجسمانیات کی نفی کی۔ ہم نے موجودہ بحث میں دیکھا کہ امام باقر اور امام صادق علیہما السلام نے اپنے دادا کے بیان کردہ قاعدے سے استفادہ کرتے ہوئے سورۂ قصص کی آیت ۸۸ کا یہ مفہوم بیان کیا: ہر چیز ہلاک ہوجائے گی مگر خدا کا دین اور سالکِ راہِ حق ہلاکت سے محفوظ رہے گا۔

نتیجۂ بحث

سابقہ بحث کے نتیجے میں دو باتیں ہمارے سامنے واضح ہوتی ہیں:

(۱) عربی میں "وَجْه" کے کئی معنی ہیں جن میں سے ایک معنی ہے انسان یا حیوان کا چہرہ۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ مکتبِ خلفاء نے "وَجْهُ الله" اور "وَجْهُ الرَّبّ" سے جو صرف ''چہرہ'' مراد لیا ہے اس تخصیص کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ مکتبِ خلفاء نے لفظ "وَجْه" کے ترجمے کے لئے ان روایات پر انحصار کیا ہے جو ابوہریرہؓ اور ان جیسے راویوں سے مروی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ان روایات کو بنیاد بنا کر "وَجْهُ الله" اور "وَجْهُ الرَّبّ" کا ترجمہ ''چہرہ'' کیا ہے۔

(۲) صفاتِ ربوبیت اور آیاتِ قرآنی کی تاویل وتفسیر کے لئے دونوں مکاتب کے افکار اس طرح سے واضح ہوتے ہیں:

(ا) خداوندِ عالم کے افعال اور صفات کی معرفت۔ اس سلسلے میں مکتبِ خلفاء کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں جہاں کہیں بھی خداوندِ عالم کی صفت یا کسی فعل کا تذکرہ ہوا ہے اس کا قیاس مخلوقات کے صفات و افعال پر کرنا چاہئے۔ جبکہ مکتبِ اہلبیتؑ کا نظریہ یہ ہے کہ خدا کے صفات وافعال کو مخلوقات کے صفات وافعال پر محمول نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان کو ایک دوسرے پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

(ب) قرآن عظیم کی تفسیر و تاویل کے متعلق ائمۂ اہلبیتؑ سے منقول ہے کہ بعض آیات کے لغوی معانی مراد نہیں لئے جاتے اور تاویلی معنیٰ لغوی معنیٰ سے جدا ہوتے ہیں۔

مؤلّف کہتا ہے کہ اس طرح کی آیات کو قرآنی اصطلاح میں ''آیاتِ متشابہات'' کہا جاتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ اٰيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ...

وہی تو ہے جس نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں سے کچھ آیتیں محکم اور واضح ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں۔ اب جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں تا کہ فتنہ برپا کریں اور من مانی تاویلیں کریں حالانکہ اس کی تاویل کا علم صرف خدا کو ہے...(سورۂ آل عمران: آیت ۷)

اللہ تعالیٰ نے آیاتِ قرآنی کے مطلب و مفہوم بیان کرنے کی ذمہ داری اپنے رسولؐ کو سونپی ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ... اور ہم نے آپ کی طرف قرآن اتارا تا کہ آپ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر واضح کریں...(سورۂ نحل: آیت ۴۴)

رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں مسلمانوں کو ہدایت کے لئے جس چیز کی ضرورت تھی آپ نے اسے مسلمانوں کے سامنے بیان فرمایا اور اپنے وصی سے ان ہدایات کو قلمبند کرا کے ''جامعہ'' میں محفوظ کرا دیا۔ یہی وجہ تھی کہ بعد رسولؐ جب بھی مسلمانوں کو تاویلِ قرآن کے متعلق کہیں دقت پیش آئی تو امام علیؑ نے اس کا تسلی بخش جواب دیا۔

امام علیؑ کی وفات کے بعد کتابِ جامعہ باری باری ان کے گیارہ معصوم فرزندوں کے ہاتھ میں پہنچی اور انھوں نے اس کے بہت سے مطالب و مفاہیم لوگوں کے سامنے بیان فرمائے۔

الغرض مکتبِ اہلبیتؑ میں آیاتِ قرآنی کی تاویل کی یہی روش ہے جو ہم نے بیان کی۔

مکتبِ خلفاء میں تاویلِ آیات کے لئے مفسّرین کے اجتہادات پر انحصار کیا جاتا ہے۔ مفسّرین اپنے نظریات کی بنیاد مکتبِ خلفاء کی کتابوں میں مذکور روایات پر رکھتے ہیں جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ مباحث میں بھی اس روش پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

دونوں مکاتبِ فکر میں عَینُ اللّٰہ کا مفہوم

(ا) مکتبِ خلفاء میں عَینُ اللّٰہ کا مفہوم

مکتبِ خلفاء کی حدیث، تفسیر اور عقائد کی کتابوں میں ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسولِ اکرمؐ کو دیکھا جب انہوں نے اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلَیٰ اَهْلِهَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِهِ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔ (اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کردیا کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ یقیناً اللہ تمہیں بہترین نصیحت کرتا ہے۔ بیشک اللہ سنتا اور دیکھتا ہے۔— سورۂ نساء: آیت ۵۸) کی آیت پڑھی تو اپنے انگوٹھے کو کان پر اور انگشتِ شہادت کو آنکھ پر رکھا۔

ابو ہریرہؓ جب بھی سَمِیع و بَصِیر کی آیت پڑھتے تھے تو اپنا انگوٹھا کان پر اور انگشتِ شہادت آنکھوں پر رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے پیغمبرِ اکرمؐ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

مؤلّف کہتا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے کان پر انگوٹھا اور آنکھ پر انگلی رکھ کر لوگوں کو یہ بتایا کہ پیغمبرِ اکرمؐ اللہ کے سمیع اور بصیر ہونے کے مفہوم میں تاکید پیدا کرنے کے لئے ایسا ہی کرتے تھے اور اس ذریعے سے ابو ہریرہؓ نے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اللہ سننے کے لئے کانوں اور دیکھنے کے لئے حاسۂ چشم کا محتاج ہے۔ اس طرح سے ابو ہریرہؓ نے خدا کے لئے کان اور آنکھ کا اثبات کیا۔

اس روایت کی بنیاد پر ابوداؤد نے اپنی سنن میں هٰذَا رَدٌّ عَلَی الْجَهمِیّة کے الفاظ لکھے۔ (کیونکہ فرقہ جہمیہ خدا کے اعضاء و جوارح کا منکر ہے) اس لئے اس روایت سے جہمیہ کے نظریے کی تردید ہوتی ہے۔

ابو ہریرہؓ کی اس روایت کا اثر یہ ہوا کہ قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی اللہ کے لئے لفظ "عَیْن" وارد ہوا ہے اس سے مکتبِ خلفاء کے پیروکاروں نے حاسۂ چشم مراد لیا ہے۔ چنانچہ مکتبِ خلفاء کے امام الائمہ ابن خزیمہ نے اپنی کتاب میں ایک باب قائم کیا جس کا عنوان ہے ذِکْرُ اِثْبَاتِ الْعَیْنِ لِلّٰہِ جَلَّ وَ عَلَا اللہ کے لئے آنکھ

کے اثبات کا تذکرہ۔ اس باب میں ابن خزیمہ لکھتے ہیں کہ خدا کے لئے حاسۂ چشم کا اثبات جس کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں اور رسول خداؐ نے اپنی احادیث میں کیا ہے۔[۱]

اس کے بعد ابن خزیمہ نے قرآن مجید کی ان آیات سے استدلال کیا:

۱۔ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا. (سورۂ طور: آیت ۴۸)

اس آیت میں حضرت رسول اکرمؐ کو خطاب کیا گیا ہے۔

۲۔ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا. (سورۂ ہود: آیت ۳۷)

۳۔ تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا. (سورۂ قمر: آیت ۱۴)

یہ دونوں آیات حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی سے متعلق ہیں۔

۴۔ وَ أَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَ لِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي. (سورۂ طٰہٰ: آیت ۳۹)

یہ آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے سے متعلق ہے۔

قرآن مجید کی ان آیات [۲] کی رو سے ہر مومن مسلمان پر واجب ہے کہ وہ پروردگار کے لئے اس صفت (آنکھ) کا اثبات کرے جس کا اثبات خود پروردگار عالم نے اپنے لئے کیا ہے۔

۱۔ مذکورہ بالا روایات کی عربی عبارت یہ ہے:

عَنْ اَبِیْ یُونُسَ، عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ فِیْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا.

رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ یَضَعُ اِبْهَامَهٗ عَلٰی اُذُنِهٖ وَ اِصْبَعَهُ الَّتِیْ تَلِیْهَا عَلٰی عَیْنِهٖ.

قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ: رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ یَفْعَلُ ذٰلِكَ.

حَدَّثَنِیْ اَبُوْیُوْنُسَ قَالَ: سَمِعْتُ اَبَاهُرَیْرَةَ یَقْرَأُ هٰذِهِ الْاٰیَةَ "اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَهْلِهَا" قَرَأَ اِلٰی "سَمِیْعًا بَصِیْرًا" فَیَضَعُ اِبْهَامَهٗ عَلٰی اُذُنِهٖ وَالَّتِیْ تَلِیْهَا عَلٰی عَیْنِهٖ.

وَیَقُوْلُ: هٰكَذَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ یَقْرَأُهَا وَ یَضَعُ اِصْبَعَیْهِ.

تفسیر ابن کثیر، تفسیر سیوطی اور مستدرک حاکم میں یہ روایت ان الفاظ سے مروی ہے: عن ابی یونس، سلیم بن جبیر مولیٰ ابی ھریرۃ... روایت کا اختتام ان الفاظ پر کیا گیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا. یعنی اِنَّ لِلّٰهِ سَمْعًا وَ بَصَرًا.

"اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا." کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے کان اور آنکھ ہیں۔ دیکھیں: ابن خزیمہ، کتاب التوحید، ص۴۲و۴۳۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی الجہمیہ، ج۴، ص۲۳۳۔ مستدرک حاکم، ج۱، ص۲۴۔ تفسیر ابن کثیر، مذکورہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں، ج۱، ص۵۱۶۔ تفسیر سیوطی، مذکورہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں، ج۲، ص۱۷۵و۱۷۶۔

۲۔ ابن خزیمہ نے اپنا سارا زور قلم قرآن مجید کے الفاظ "عَیْنِیْ" اور "اَعْیُنِنَا" پر صرف کیا ہے۔ لفظ عَیْن اور اَعْیُن انسانی آنکھ کے لئے استعمال ہوتا ہے اس بنا پر ابن خزیمہ کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے اس لفظ کے دوسرے معانی کو نظرانداز کر کے ہر قیمت پر ان الفاظ سے صرف آنکھ مراد لینے پر زور دیا ہے جبکہ لفظ "عَیْن" کے اور بھی کئی معانی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ابن خزیمہ لکھتے ہیں:

جس چیز کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے لئے ثابت کیا ہے اگر کوئی شخص اس چیز کی خدا سے نفی کرے تو اس شخص کو صاحبِ ایمان کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اکرمؐ کو قرآنِ مجید کے مطالب و مفاہیم بیان کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ... اور ہم نے آپؐ کی طرف قرآن اتارا تاکہ آپؐ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر واضح کریں... (سورۂ نحل: آیت ۴۴)

پیغمبرِ اکرمؐ نے آیاتِ قرآن کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا کی دو آنکھیں ہیں۔ پیغمبرِ اکرمؐ کا یہ فرمان قرآن مجید کی آیات سے مکمل مطابقت رکھتا ہے۔ جی ہاں! رسولِ اکرمؐ کا بیان اس قرآن کے عین مطابق ہے جو دو جلدوں کے درمیان میں لکھا گیا ہے اور جس کی مسجد و مکتب میں تلاوت ہوتی ہے۔[1]

ابن خزیمہ نے جن احادیث سے استدلال کیا ان میں ابوہریرہؓ کی بیان کردہ روایت بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ اس نے حسبِ ذیل حدیث سے بھی استدلال کیا ہے:

عَنْ نَافِعٍ، قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ: ذَكَرَ النَّبِيُّ يَوْمًا بَيْنَ ظَهْرَانَي النَّاسِ الْمَسِيحَ الدَّجَّالَ. فَقَالَ: اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِاَعْوَرَ، اَلَا اَنَّ الْمَسِيحَ الدَّجَّالَ اَعْوَرُ الْعَيْنِ الْيُمْنٰى كَاَنَّ عَيْنَهُ عِنَبَةٌ طَافِيَةٌ.[2]

عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک دن رسولِ اکرمؐ نے لوگوں کے درمیان مسیحِ دجّال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: خدا کانا نہیں ہے جبکہ مسیح دجال دائیں آنکھ سے کانا ہوگا اور اس کی دائیں آنکھ کا ڈیلا کسی پھولے ہوئے انگور کے دانے کی طرح سے باہر نکلا ہوا ہوگا۔

مکتبِ خلفاء کی روایات اور تاویلِ آیات کے تحت "عَيْنُ اللّٰه" سے ظاہری حاسۂ چشم مراد ہے اور مکتبِ خلفاء کا عقیدہ ہے کہ اللہ ظاہری آنکھیں رکھتا ہے۔

۱۔ ابن خزیمہ، کتاب توحید، ص۴۲۔

۲۔ ابن خزیمہ، کتاب توحید، ص۴۳و۴۴۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ، ج۲، ص۱۷۰۔ اور کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع، ج۳، ص۵۷۔ صحیح مسلم، كِتَابُ الْاِيمان، باب ذِكْرِ الْمَسِيحِ بْنِ مَرْيَمَ وَالْمَسِيحِ الدَّجَّال، ص۱۵۵، حدیث ۲۷۴۔

درج بالا روایت ہم نے صحیح مسلم سے نقل کی ہے۔ یہی روایت لفظی اختلاف کے ساتھ ان کتابوں میں بھی ہے: صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب ذکر الدجال، ج۴، ص۱۵۴۔ وکتاب التوحید، بَابُ قولِ اللّٰهِ تعالی "وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ"، ج۴، ص۱۵۸۔ صحیح مسلم، كتابُ الفِتَن وَاشراط الساعة، باب ذِكر الدَّجّال وَصِفَته، ص۲۲۴۷، حدیث۱۰۰۔

(ب) مکتبِ اہلبیتؑ میں عَیۡنُ اللّٰہ کا مفہوم

مکتبِ خلفاء نے "عَیۡنُ اللّٰہ" کا جو مفہوم سمجھا ہے ائمۂ اہلبیتؑ نے اس کی نفی کی ہے اور اس جیسے الفاظ کے لئے ایسے علمی قواعد بیان کیے ہیں جن کے لئے تفسیر وتشریح کی ضرورت ہے۔

مکتبِ خلفاء کی غلط فہمی کے جواب میں ہم "رؤیتِ خداوندی" کی بحث کے دوران ائمۂ اہلبیتؑ کا نکتۂ نظر بیان کر چکے ہیں۔ الحمدللہ کہ مؤلف مکتبِ اہلبیتؑ کا پیرو ہے اور مکتبِ خلفاء کی غلط تأویلات کا جواب آلِ محمدؐ سے مروی اَحادیث کے ذریعے دینے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔

(ج) عَیۡنُ اللّٰہ کے متعلق مکتبِ خلفاء کے اقوال کا تجزیہ

ابن خزیمہ نے اپنے تمام تر استدلال کی بنیاد قرآن مجید کے دو الفاظ عَیۡنِی اور اَعۡیُنِنَا پر رکھی اور اس طرح لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس سے مراد وہی آنکھ ہے جو انسان اور حیوان میں ہوتی ہے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں:

۱۔ لفظ "عَیۡن" عربی میں صِرف آنکھ کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ یہ کئی دوسرے حقیقی اور مجازی معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے[۱] جس میں سے ایک معنی انسان اور حیوان کا حاسۂ چشم بھی ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ حقیقی اور مجازی دونوں معانی میں استعمال ہوا ہے اور اکیس مرتبہ لفظ عَیۡن بصورتِ واحد وتثنیہ وجمع چشمہ اور نہر کے مَعانی میں استعمال ہوا ہے۔[۲]

سیدھی سی بات ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ "فلاں شخص آپ کی چشم کرم کا منتظر ہے" یا یہ کہا جائے کہ "فلاں شخص فلاں شخص کی آنکھ کے نیچے ہے" تو مذکورہ دونوں جملوں میں چشم اور آنکھ اپنے حقیقی لفظی معنی میں

۱۔ لفظ عَیۡن کے معانی کیلئے دیکھیں لسان العرب از ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم (المعروف بہ ابن منظور افریقی)۔
مشہور ماہرِ لُغت ابن فارس احمد بن زکریا المتوفی ۳۶۹ھ نے ایک قصیدہ کہا تھا جس کا قافیہ "عَیۡن" تھا اور ہر بیت میں اس نے لفظ "عَیۡن" کے علیحدہ معانی واضح کیے تھے۔ معجم الادباء تصحیح مرغلیوث، ج۲، ص۱۱۔ اسی طرح سے سید محسن امین نے ساٹھ ابیات پر مشتمل ایک قصیدہ لکھا تھا جس میں لفظ "عَیۡن" کے ساٹھ معانی واضح کیے تھے۔

۲۔ بطورِ نمونہ یہ تین آیات ملاحظہ فرمائیں:
عَیۡنٍ حَمِئَۃٍ. یعنی گرم چشمہ۔ (سورۂ کہف: آیت ۸۶)
فِیۡہِمَا عَیۡنٰنِ تَجۡرِیٰنِ. یعنی اس میں دو پانی کے چشمے بہتے ہیں۔ (سورۂ رحمٰن: آیت ۵۰)
فِیۡ جَنّٰتٍ وَّعُیُوۡنٍ. یعنی باغات اور چشموں میں۔ (سورۂ حجر: آیت ۴۵)

مستعمل نہیں ہیں اور ان جملوں سے وہ آنکھ مراد نہیں ہے جو ہر انسان اور جانور کے چہرے میں بطورِ حاسہ موجود ہوتی ہے۔ پہلے جملے کا مقصد یہ ہے کہ فلاں شخص آپ کے لطف و کرم کا منتظر ہے اور دوسرے جملے کا مقصد یہ ہے کہ فلاں شخص فلاں شخص کی حمایت اور پشت پناہی میں زندگی بسر کر رہا ہے اور وہ اس کی زیرِ حفاظت ہے۔

لفظ "عَیۡن و اَعۡیُن" جن سے ابن خزیمہ نے حاسۂ چشم کا استدلال کیا ہے ان کے متعلق مصر کے عربی لغت بورڈ نے "مُعۡجَمُ اَلۡفَاظِ الۡقُرۡآنِ الۡکَرِیۡم" میں لفظ عَیۡنٌ، عُیُوۡنٌ، اَعۡیُنٌ اور اَعۡیُنِنَا کے ضمن میں لکھا: ممکن ہے کہ ان تمام کلمات کی بنیاد لفظ "عین" میں ہو جس سے دیکھنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَعۡیُنٌ اور عُیُوۡن ہے اور مجازی طور پر ان الفاظ کا اطلاق حفاظت، نگہبانی اور خوش بختی کے لئے بھی کیا جاتا ہے۔

ان الفاظ کے بعد مصری ماہرینِ لغت کے بورڈ نے لکھا: یہ الفاظ قرآن مجید میں ان ہی (مجازی) معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔

اس کے بعد مصری علماء نے اس کی بہت سی مثالیں دیتے ہوئے لکھا: قرآن مجید کی آیات قُرَّتُ عَیۡنٍ لِّیۡ وَلَکَ اور قَرِّیۡ عَیۡنًا میں لفظ عَیۡن اگرچہ آنکھ کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مجازی طور پر خوشی اور مسرت مراد ہے۔[۱]

اس مطلب کو مزید واضح کرنے کے لئے ہم مذکورہ دو آیات کی مزید تشریح کرتے ہیں:

۱۔ جب حضرت موسیٰؑ کا صندوق دریا کی لہروں پر تیرتا ہوا فرعون کے محل کے پاس سے گزرا تو بی بی آسیہ کے حکم سے ان کے نوکروں نے صندوق کو دریا سے باہر نکال لیا۔ صندوق کھولا گیا تو اس میں ایک معصوم بچہ لیٹا ہوا تھا۔ بی بی آسیہ بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور انہوں نے فرعون سے کہا: قُرَّتُ عَیۡنٍ لِّیۡ وَلَکَ لَا تَقۡتُلُوۡهُ عَسٰۤی اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ. (یہ بچہ) میری اور تیری خوشی کا سبب ہے اسے قتل نہ کرنا امید ہے کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے گا یا ہم اسے بیٹا بنالیں گے اور انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ (سورۂ قصص: آیت ۹)

مصری ماہرینِ لغت بورڈ کے بقول اس آیت میں اگرچہ لفظ عَیۡن کا حقیقی معنی تو آنکھ ہے لیکن یہاں یہ لفظ خوشی اور مسرت کے مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۲۔ اس سلسلے کی دوسری آیت کا تعلق حضرت مریمؑ سے ہے اور اس آیت کے پس منظر میں یہ واقعہ بیان

۱۔ مصری ماہرینِ لغت کے بورڈ نے لفظ "عَیۡن" کے متعلق لکھا:

یُمۡکِنُ اَنۡ ترد المادۃُ اِلَی الۡعَیۡنِ: عُضۡوُالۡبَصَرِ وَ تجمعُ عَلٰی اَعۡیُنٍ وَ عُیونٍ وَ مِنۡهَا تَجِیۡءُ مَعان فِی الۡحِفۡظِ وَالکلاءَۃِ وَمِنَ الۡاَ بۡصَارِ لِلۡمَحۡفُوۡظِ وَ لِلۡغِبۡطَۃِ وَالسُّرُوۡرِ. پھر انہوں نے لکھا: "قُرَّۃُ عَیۡنٍ لِّیۡ وَلَکَ" هِیَ لِلۡبَاصِرَۃِ، بِمعنی السُّرُوۡرِ. "وَقَرِّیۡ عَیۡنًا" لِلۡبَاصِرَۃِ بِمعنَی السُّرُوۡرِ. معجم الفاظ القرآن الکریم، طبع دوم، قاہرہ ۱۳۹۰ھ، ج ۲، ص ۲۶۶ تا ۲۶۸۔

کیا گیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ بطورِ اعجاز پیدا ہوئے تو بی بی مریم بہت غمگین اور پریشان ہوئیں کیونکہ وہ باکرہ تھیں اور ان کا کسی سے رشتہ نہیں ہوا تھا اور اس حالت میں حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی تو انہیں یقین ہوگیا کہ اب لوگ ان کے کردار کی طرف انگلیاں اٹھائیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی پریشانی دیکھی تو ان سے فرمایا:

فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا. (تازہ کھجوریں) کھاؤ اور (چشمے کا پانی) پیو اور عیسیٰ کی وجہ سے اپنے دل کو خوش کرو۔ (سورۂ مریم: آیت ۲۶)

مصری ماہرینِ لغت کی جماعت نے لفظ "عَيْن" کے متعلق مذکورہ دو آیات پر اکتفا کی جبکہ قرآن مجید میں دوسری ایسی آیات بھی موجود ہیں جن میں لفظ "عَيْن" مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے اور ان میں ایسی بھی آیات شامل ہیں جن سے ابن خزیمہ نے استدلال کیا اور کہا کہ ان آیات میں لفظ "عَيْن" حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جن آیات سے ابن خزیمہ نے استدلال کیا ہے ان میں بھی لفظ "عَيْن" مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ علمِ لغت کے ماہر راغبؔ اصفہانی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا۔[1]

آپ کہتے ہیں: "فُلَانٌ بِعَيْنِي" تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص میری حفاظت و سرپرستی میں ہے اور اس جیسا ہی یہ جملہ ہے: "فُلَانٌ بِمَرْأًى مِنِّي وَ مَسْمَعٍ" فلاں شخص ہر وقت میری نگاہوں میں ہے اور اس کی آواز ہر وقت میرے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا اور تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا اور وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا اور ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں اور اس کی حفاظت کر رہا ہوں۔ اور فرمایا: وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي. میری حفاظت اور نگہبانی میں تمہاری پرورش ہوگی۔

اسی طرح عرب ایک دوسرے کو کہتے ہیں: عَيْنُ اللهِ عَلَيْكَ یعنی تم ہمیشہ خدا کی حِفظ و امان میں رہو۔

راغبؔ اصفہانی دنیائے اسلام کے عظیم دانشور، ادبیاتِ عرب کے مشہور عالم اور قرآن مجید کے مستند مترجم و مفسر گزرے ہیں۔ دنیائے اسلام کے عام علماء ان کے ترجمے و تفسیر کو تسلیم کرتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی نے ان چار آیات کے متعلق وضاحت کردی کہ ان آیات میں لفظ "عَيْن" اور "اَعْيُن" مجازی معنی میں استعمال ہوئے ہیں جبکہ ابن خزیمہ نے ان الفاظ سے حقیقی معنی مراد لیتے ہوئے حاسۂ چشم کا اثبات کیا ہے۔ راغب نے ابن خزیمہ کے ترجمے کو رد کیا اور کہا کہ ان آیات میں لفظ "عَيْن" اور "اَعْيُن" سے حِفظ و حراست مراد ہے۔

۱۔ راغب اصفہانی کے متعلق معجم المؤلفین، جلد۱، صفحہ۲۱۱ میں مذکور ہے: حسین بن مفضل، امام ابوالقاسم المعروف راغب اصفہانی نزیل بغداد المتوفی ۵۰۲ھ علم لغت کے مشہور امام تھے۔

اب مذکورہ آیات کا تفصیلی مطلب یہ ہوا:

۱۔ پہلی آیت میں رسولِ اکرمؐ کو کفار و مشرکین کی اذیتوں کے مقابلے میں تسلی دیتے ہوئے کہا گیا ہے: وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا. یعنی اے رسولؐ! آپؐ اپنے پروردگار کے حکم پر صبر کیجئے۔ آپؐ ہمارے منظورِ نظر ہیں اور ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ (سورۂ طور: آیت ۴۸)

۲۔ دوسری آیت میں حضرت نوحؑ سے فرمایا: وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا. (سورۂ ہود: آیت ۳۷) اور اسی سے ملتی جلتی ایک اور آیت میں فرمایا: اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا.(سورۂ مومنون: آیت ۲۷) ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اے نوحؑ! ہماری حفاظت میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔

۳۔ تیسری آیت بھی کشتیٔ نوحؑ سے متعلق ہے: تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا. (سورۂ قمر: آیت ۱۴) اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ کشتیٔ نوحؑ ہماری حفظ و امان میں ہونے کے سبب طوفان کے تھپیڑوں پر بھی رواں دواں تھی۔

۴۔ چوتھی آیت کا تعلق حضرت موسیٰؑ کی داستان سے ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:... وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِي. میں نے تمہارے لئے دلوں میں محبت ڈالدی تاکہ ہماری حفظ و امان میں تمہاری پرورش ہوسکے۔ (سورۂ طٰہٰ: آیت ۳۹)

ان قرآنی آیات کے تجزیے کے بعد ہم ان دو احادیث کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جنہیں ابن خزیمہ نے بطورِ دلیل پیش کیا ہے:

۱۔ دجّال کے متعلق عبداللہ بن عمرؓ کی روایت

ابن عمرؓ رسولِ اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ "دجال ایک آنکھ سے کانا ہوگا جبکہ خدا کانا نہیں ہے۔"

اگر اس روایت کو بفرضِ محال حدیثِ رسولؐ سمجھ لیا جائے تو بھی اس کا زیادہ سے زیادہ یہی مفہوم ہوگا کہ خدا دجال کی طرح سے کانا نہیں ہے۔ لیکن براہِ راست اس حدیث میں یہ دلالت موجود نہیں ہے کہ چونکہ دجّال کانا ہے اور اس کی ایک آنکھ ہے لہٰذا خدا کی دو آنکھیں ہیں۔

اور ابوہریرہؓ سے مروی حدیث کو زیادہ سے زیادہ دجّال کے یک چشم ہونے کی مؤید قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ ان روایات سے کسی طور پر بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہماری طرح سے دو آنکھیں ہیں۔

۲۔ روایتِ ابوہریرہؓ

ابوہریرہؓ کی روایت بتاتی ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے کان اور آنکھ پر انگلیاں رکھ کر امتِ اسلامیہ کو سمجھایا

کہ خدا سننے کے لئے کانوں اور دیکھنے کے لئے آنکھوں کا محتاج ہے۔

صاف لفظوں میں اگر کہا جائے تو اللہ کے لئے حاسۂ چشم اور حاسۂ سماعت کا اثبات ابوہریرہ کی اس جیسی روایات کا رہینِ منت ہے اور ابوہریرہ کی روایات کی وجہ سے ابنِ خزیمہ اور مکتبِ خلفاء کے دیگر علماء میں غلط فہمی پیدا ہوئی جو صدرِ اسلام سے شروع ہوئی اور اب تک جاری ہے۔

مؤلّف کی تحقیق کے مطابق شیخ المضیرہ ابوہریرہ کا نام نامی راویانِ حدیث کی فہرست میں ''گرانمایہ'' اور ''بلند پایہ'' نام نہیں ہے اور ان کا فرمایا ہوا ''مستند'' نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ کعب الاحبار کے ''شاگردِ رشید'' تھے۔ چنانچہ صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق ان کی تمام روایات میں تحریف شدہ توریت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

مؤلّف کی تحقیق کے مطابق ابوہریرہ کی روایات سرے سے اس لائق ہی نہیں ہیں کہ ان پر اسلامی عقائد اور احکام کی بنیاد رکھی جائے۔

یہاں تک آپ نے "عَینُ اللّٰہ" کی بحث ملاحظہ فرمائی اور اب ہم اِنشاءَ اللہ العزیز "یَدُاللّٰہ" کے متعلق دونوں مکاتبِ فکر کے نظریات پیش کرتے ہیں۔

دونوں مکاتب فکر میں یَدُاللّٰہ کا مفہوم

(ا) مکتبِ خلفاء میں یَدُاللّٰہ کا مفہوم

مکتبِ خلفاء کے حدیث اور اعتقاد کے منابع میں ابو ہریرہؓ سے چند روایات مروی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آدمؑ — ابوالبشر — اور حضرت موسیٰؑ نے ایک دوسرے سے مجادلہ کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے حضرت آدمؑ سے کہا: خدا نے تجھے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا..... اور تو نے اپنے گناہ کی وجہ سے لوگوں کو جنت سے نکلوا دیا۔

حضرت آدمؑ نے جواب میں کہا: اے موسیٰؑ! خدا نے تجھے اپنا منتخب بندہ بنایا اور خدا نے تجھ سے گفتگو کی اور تیرے لئے اپنے ہاتھ سے توریت لکھی۔[1]

ابو ہریرہؓ نے ایک اور روایت میں کہا: اللہ تعالیٰ آسمانِ اول پر اترتا ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو کھول دیتا ہے اور فرماتا ہے...

مکتبِ خلفاء میں خدا کی انگلیاں

خدا کی انگلیوں کے متعلق قرآن مجید میں کوئی آیت موجود نہیں اسی لئے ابن خزیمہ نے انگلیوں کے اِثبات کے لئے کسی آیت کو پیش نہیں کیا۔ البتہ انھوں نے پیغمبرِ اکرمؐ سے چند احادیث نقل کرنے پر اکتفا کیا جسے مکتبِ خلفاء کے محدّثین نے لکھا ہے۔ ان میں سے ایک حدیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

توحید ابن خزیمہ، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ، تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر اور تفسیر سیوطی

۱۔ ان دونوں روایات کے لئے دیکھیں: صحیح مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدمؑ و موسیٰؑ، ص۲۰۴۲، حدیث ۱۳، ۱۴، ۱۵۔ صحیح بخاری، کتاب القدر، باب تحاج آدمؑ و موسیٰؑ عنداللہ عزوجل، ص۹۸۔ کتاب التوحید، باب قولہ "وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا"، ص۱۹۹۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی القدر، ج۴، ص۲۲۲۔ ابن خزیمہ، کتاب التوحید، ص۵۴۔

کے مطابق عبداللہ کا بیان ہے: قَالَ: جَاءَ حِبْرٌ مِّنَ الْاَحْبَارِ اِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ. فَقَالَ: يَامُحمَّدُ، اِنَّا نَجِدُ اَنَّ اللّٰهَ يَجْعَلُ السمٰوٰتِ عَلٰى اِصْبَعٍ، والشَّجَرَ على اِصْبَعٍ، وَالمآءَ على اِصْبَعٍ وَالثَّرٰى عَلٰى اِصْبَعٍ وَ سَائِرَ الخَلَائِقِ على اِصْبَعٍ، فَيقولُ: اَنَا المَلِكُ. فَضَحِكَ النبيُّ حَتّٰى بَدَتْ نَواجِذُهٗ تَصْدِيقاً لِقَوْلِ الْحِبْرِ. ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ[1] یعنی ایک یہودی عالم رسولِ خداؐ کے پاس آیا اور ان سے کہا: اے محمدؐ! ہم توراۃ میں پڑھتے ہیں کہ (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ آسمان کو ایک انگلی پر اٹھائے گا، زمینوں کو ایک انگلی پر اٹھائے گا، درختوں کو ایک انگلی پر اٹھائے گا، پانی کو ایک انگلی پر اٹھائے گا اور دوسری تمام مخلوقات کو ایک انگلی پر اٹھا کر کہے گا کہ میں ہی (کائنات کا) مالک اور سلطان ہوں۔ پیغمبرِ اکرمؐ اس کی تصدیق کرنے کے لئے اتنا ہنسے کہ آپ کے دانت نمایاں ہوگئے۔ اس کے بعد رسولِ خداؐ نے اس یہودی عالم کی تائید میں اس آیت مجیدہ کی تلاوت فرمائی: ''انہوں نے خدا کو اس کی عظمت کے مطابق نہ پہچانا۔ قیامت کے دن زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان لپٹے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے۔'' (سورۂ زمر: آیت ۶۷)

ابوہریرہ کی ان روایات نے مکتبِ خلفاء کے عقیدے پر یہ اثر مرتب کیا کہ قرآنِ حکیم میں جہاں کہیں ''یَدُاللّٰہ'' کے الفاظ آئے ہیں تو انہوں نے اس سے جسمانی ہاتھ مراد لیا جیسا کہ ابن خزیمہ نے اپنی کتاب توحید میں لکھا: ''بَابُ اِثْبَاتِ الْيَدِ لِلخَالِقِ البَارِئِ جَلَّ وَ عَلَا'' اللہ تعالیٰ کے لئے ہاتھ ثابت کرنے کا باب۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ يَدَانِ كَمَا اَعْلَمَنَا فِيْ مُحْكَمِ تَنْزِيْلِهٖ. ''اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں جیسا کہ اس نے ہمیں قرآن مجید کی آیات کے ذریعے سے بتایا۔

اس کے بعد ابن خزیمہ نے چند آیات کو بطور دلیل پیش کیا مثلاً:

۱۔ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُاللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ... (سورۂ مائدہ: آیت ۶۴)

۱۔ ابن خزیمہ، کتاب التوحید، بابُ ذکرِ اثباتِ الیدِ للخالق الباریٔ جَلَّ وعَلا، ص۵۳ و ۵۷، و باب ذکر اِمساکُ اللّٰہِ تَبارکَ وتعالی اسْمہٗ وجَلّ ثناؤہ السمواتِ والارضَ ومَا علیھا علی اَصَابِعِہٖ، ص۷۶ تا ۷۹، و باب اثبات الاصابع لِلّٰہِ عزّوجلّ من سنۃ النبی قیلا لہ لاحکایۃ عن غیرہ، ص۷۹ تا ۸۲۔ ابن خزیمہ نے اللہ کے ہاتھ ثابت کرنے کے لئے تیرہ روایات نقل کی ہیں اور حسب ذیل کتابوں میں سے بعض میں ایک اور بعض میں ایک سے زیادہ روایات موجود ہیں۔

صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الزمر، باب وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ، ج ۳، ص ۱۲۲، اور کتاب التوحید، باب ''اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا''، ج ۴، ص ۱۹۲۔ صحیح مسلم، کتابُ صفۃ القیامۃِ وَالجنّۃِ وَالنارِ، حدیث ۱۹، ۲۰، ۲۲، ۲۳، ۲۵۔

۲۔ فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ. (سورہ یٰس: آیت ۸۳)

۳۔ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ. (آل عمران: آیت ۲۶)

مذکورہ بالا آیات کا لفظی اور لغوی معنی ترتیب وار یہ ہے:

۱۔ یہودیوں نے کہا: اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں جبکہ ان کے اپنے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور جو کچھ انہوں نے کہا اسکی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی بلکہ خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

۲۔ پاک و بے نیاز ہے وہ خدا جس کے ہاتھ میں ہر شے کا اقتدار ہے اورتم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

۳۔ تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ سب خیر تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہی ہر شے پر قادر ہے۔

مکتبِ خلفاء نے خدا کے لئے انسانی ہاتھوں جیسے ہاتھ ثابت کرنے کے لئے مذکورہ بالا آیات سے استدلال کیا ہے۔ اب آیئے دیکھیں کہ اوصیائے پیغمبرؐ نے ان کے نظریات کے ابطال میں کیا ارشاد فرمایا ہے۔

(ب) اہلبیتؑ کا جواب

پہلی حدیث:

راوی نے امام محمد باقرؑ سے اس آیت کے معنی پوچھے: قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ. خدا نے کہا کہ اے ابلیس! جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا۔ (سورہ ص: آیت ۷۵) تو امام محمد باقرؑ نے جواب میں فرمایا:

عربی زبان میں لفظ یَد کا اطلاق قوت اور نعمت پر بھی ہوتا ہے۔ اس کے بعد امام نے قرآن مجید میں سے لفظ یَد کے متعلق چند آیات تلاوت فرمائیں جنہیں ہم روایت کی ترتیب کے مطابق نقل کرتے ہیں۔

۱۔ وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَاالْاَیْدِ... یعنی آپ ہمارے بندے داوٗدؑ کو یاد کریں جو بہت سے ہاتھ رکھنے والے تھے۔ (سورہ ص: آیت ۱۷)

امام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے داوٗدؑ کو بہت سے ہاتھوں کا مالک بتایا اور لفظ "اَیْد" استعمال کیا جس کا واحد یَد ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قوت و طاقت کو مجازی طور پر ہاتھوں سے تعبیر کیا۔ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان طاقتوں کا تذکرہ کیا جو حضرت داوٗدؑ کو عطا ہوئی تھیں۔

۲۔ وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰھَا بِاَیْدٍ... ہم نے آسمان کو ہاتھوں سے بنایا۔ (سورہ ذاریات: آیت ۴۷) یعنی ہم

نے آسمان کو قوت و طاقت سے خلق کیا۔

۳۔ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ... اللہ نے اپنی روح سے ان کی مدد کی۔ (سورۂ مجادلہ: آیت۲۲) یعنی اللہ نے اپنی مخصوص روح کے ذریعے سے انہیں مدد فراہم کی اور تقویت بخشی۔

ان آیات کے بعد امام محمد باقرؑ نے کلامِ عرب سے دو استشہاد پیش فرمائے:

۱۔ عربی کا مقولہ ہے: لِفُلَانٍ عِنْدِیْ اَیَادِیْ کَثِیْرَۃٌ. مجھ پر فلاں کے بہت سے ہاتھ ہیں۔ یعنی فلاں شخص کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔

۲۔ عربی کا محاورہ ہے: لَهٗ عِنْدِیْ یَدٌ بَیْضَاءُ. فلاں شخص کا میرے ہاں سفید ہاتھ ہے۔ یعنی فلاں شخص نے مجھ پر انعام کیا ہے۔[1]

چنانچہ مذکورہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے ابلیس! جس کو میں نے اپنی قدرتِ کاملہ سے بنایا اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا؟

دوسری حدیث:

محمد بن عُبَیدہ نے کہا کہ میں نے امام علی رضا علیہ السلام سے قَالَ یَاۤ اِبْلِیْسُ مَا مَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ. کا مفہوم دریافت کیا تو امام علیہ السلام نے فرمایا: اس آیت میں ''دو ہاتھوں'' سے مراد قوت و قدرت ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے کہا: اے ابلیس! جس کو میں نے اپنی قوت و قدرت سے پیدا کیا ہے اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟[2]

تیسری حدیث:

عَنْ سُلیمَانَ بن مِهرَانَ قَالَ: سَاَلْتُ اَبَا عَبْدَاللّٰهِ عَنْ قَولِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ. فَقَالَ: یَعْنِیْ مِلْکُهٗ لَا یَمْلِکُهَا مَعَهٗ اَحَدٌ... قلتُ فقولهٗ عَزَّوَجَلَّ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِهٖ. قَالَ: اَلْیَمِیْنُ: اَلْیَدُ. وَالْیَدُ: اَلْقُدْرَۃُ وَالْقُوَّۃُ. یَقُوْلُ: عَزَّوَجَلَّ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِقُدْرَتِهٖ وَقُوَّتِهٖ

۱۔ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ مُسْلِمٍ سَاَلْتُ اَبَاجَعْفَرٍ فَقُلْتُ قَوْلُهٗ عَزَّوَجَلَّ "یَاۤ اِبْلِیْسُ مَا مَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ" فَقَالَ: اَلْیَدُ فِیْ کَلَامِ الْعَرَبِ، اَلْقُوَّۃُ وَالنِّعْمَةُ.... شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب تفسیر قولِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ یَاۤ اِبْلِیْسُ مَا مَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ، ص۱۵۳، حدیث۱۔

۲۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، بابُ تفسیرِ قولِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ یَاۤ اِبْلِیْسُ مَا مَنَعَکَ... ص۱۵۳، حدیث۲۔

"سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ."[1]

سلمان بن مہران کا بیان ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. "روزِ قیامت تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی" کا کیا مفہوم ہے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: تمام زمین براہِ راست اسی کی ملکیت میں ہوگی۔ اس دن کوئی بھی زمین پر خدا کے علاوہ حکمران نہیں ہوگا۔

پھر راوی کہتا ہے کہ میں نے آپ سے وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ "سارے آسمان اس کے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے" کا معنی دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: "يَمِيْن" ہاتھ کو کہتے ہیں اور ہاتھ سے مراد قوت وقدرت ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ نے مذکورہ عبارت کے بعد قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی: سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْن. "جو کچھ وہ شرک کر رہے ہیں اللہ اس سے پاک ومنزہ ہے۔"

اس آیت کے ذریعے سے امامؑ نے اللہ کے صاحبِ اعضاء ہونے کے غلط نظریات کی تردید فرمائی۔

(ج) یدُاللہ کی آیات کی تأویل اور روایات کا تجزیہ

ائمہ اہلبیتؑ نے لفظ یَد کی جو تاویل وتشریح کی ہے اس کا تعلق ان کی مخصوص کتاب "جامعہ" سے نہیں تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے آبائے طاہرینؑ کی بھی کوئی حدیث پیش نہیں کی تھی۔ انہوں نے لفظ یَد کی تأویل لغتِ عرب کے ایسے مسلّم مفاہیم کے تحت کی تھی جنہیں ہر عربی زبان بولنے والا جانتا تھا۔

چنانچہ راغبؔ اصفہانی نے مُفْرَداتُ القرآن اور مصری دانشوروں کی ایک جماعت نے مُعْجَمُ الفاظِ القرآنِ الکریم میں کہا: یَد ہاتھ کو کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ اس جزو بدن کے علاوہ اور معانی میں بھی مستعمل ہوتا ہے اور جب ایک چیز کسی کے دستِ تصرف ہو تو کہا جاتا ہے "فلاں چیز فلاں کے ہاتھ میں ہے" اور اسی طرح سے اگر کوئی چیز کسی کی ملکیت میں ہو یا کسی کے زیرِ فرمان ہو تو بھی یہی کہا جاتا ہے کہ "وہ اس کے ہاتھ میں ہے۔"

چنانچہ ایسے مقامات جہاں لفظ یَد سے عضوِ بدن مراد نہیں ہوتا اس سے قوت، قدرت، اختیار اور تصرف مراد ہوتا ہے۔ ان میں وہ تین آیات بھی شامل ہیں جن میں لفظ یَد قوت واختیار کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ "بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ" میں لفظِ یَد ظاہری ہاتھ کے معنی میں نہیں بلکہ دستِ قدرت وتصرف کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس آیت کے اس حصے کا مفہوم یہ ہے۔ اس کے دستِ تصرف میں ہر چیز کی باگ ڈور

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، بابُ تفسیرِ قولہٖ عزّوجل، وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ص۱۶۰ و۱۶۱۔

ہے اور کائنات ہستی کی سلطنت اس کے قبضہ اختیار میں ہے۔

دوسری آیت جس سے ابن خزیمہ نے استدلال کیا ہے تو اس سلسلے میں بھی حقیقت یہی ہے کہ بِیَدِکَ الْخَیْرُ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر قسم کی بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔

اسی طرح سے وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُاللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتَانِ یُنْفِقُ کَیْفَ یَشَآءُ... کا مفہوم یہ ہے کہ یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں یعنی وہ کچھ بھی خرچ نہیں کرسکتا۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اصل میں ان کے اپنے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کی وجہ سے وہ ملعون ٹھہرے جبکہ اللہ کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں وہ جیسے چاہے خرچ کرے۔

اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے اس آیت پر توجہ فرمائیں:

وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِکَ... اس آیت کا ظاہری ترجمہ یہ ہے کہ ''اپنے ہاتھ کو گردن سے مت باندھو'' مگر اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے ہاتھ کو انفاق فی سبیل اللہ سے مت روکو۔

مؤلف کہتا ہے کہ مکتب خلفاء کی منطق بڑی نرالی ہے۔ جب رسول خداؐ کے لئے یَدَکَ مَغْلُوْلَةً کے الفاظ وارد ہوئے تو انہوں نے اس سے عضو بدن مراد نہیں لیا بلکہ اس سے مرادی معنی کئے اور اگر خدا کے لئے یَدُاللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ کے الفاظ حکایت یہود کے تحت نازل ہوئے تو انہوں نے یہاں ضد کر کے عضو بدن مراد لیا۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اصل بات یہ ہے کہ مکتب خلفاء نے خدا کے لئے ہاتھ ثابت کرنے کا عقیدہ چند ایسے صحابہ کی روایات سے قائم کیا جن کے سرخیل ابوہریرہؓ تھے جو کعب الاحبار کے شاگرد خاص تھے۔

حضرت رسول اکرمؐ کے اوصیائے برحق نے لفظ ید اور قبضہ کے متعلق کلام عرب سے استشہاد کر کے امت اسلامیہ کو کج فکری سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن مکتب خلفاء نے اوصیائے رسولؐ کی تعلیمات کی طرف التفات نہیں کیا بلکہ تورات کے محرف نظریات کو اسلامی عقیدہ سمجھ کر قبول کیا اور خدا کے متعلق چہرے، آنکھ، کان اور ہاتھ کے عقیدے کے ساتھ ساتھ پاؤں اور پنڈلی رکھنے کا عقیدہ بھی اپنایا—— معاذ اللہ

دونوں مکاتبِ فکر میں خدا کے پاؤں اور سَاق کا مفہوم

(۱) خدا کے پاؤں کی روایات

ابن خزیمہ نے اپنی کتاب التوحید میں اس سلسلے کی کئی روایات نقل کی ہیں جن میں سے ابو ہریرہ کی روایت سب سے زیادہ مفصّل ہے۔ یہ روایت صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، مسند احمد کے علاوہ تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر، تفسیر سیوطی اور دیگر کتابوں میں موجود ہے۔

ابو ہریرہؓ نے پیغمبرِ اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جنت اور جہنم نے ایک دوسرے پر فخر و مباہات کیا۔ جہنم نے کہا: تمام گردن کش اور جبّار قسم کے افراد میرے اندر ہیں لہٰذا میں افضل ہوں۔

جنت نے کہا: مگر مجھ میں تو کمزور اور بے قدر اور اَبلہ قسم کے لوگ داخل ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جنّت سے فرمایا: "تو میری رحمت ہے، تیرے ذریعے سے میں اپنے بندوں میں سے جس کے متعلق چاہتا ہوں رحمت کرتا ہوں" اور جہنم سے کہا: "تو میرا عذاب ہے اور میں اپنے بندوں میں سے جس کے متعلق چاہتا ہوں اسے تیرے ذریعے سے عذاب دیتا ہوں۔ میں تم میں سے ہر ایک کو پُر کروں گا۔" مگر جہنم پُر نہ ہوگی یہاں تک کہ خداوندِ عالَم اپنا قدَم (اس میں) رکھے گا۔ (اس وقت) جہنم کہے گی کہ بس میں بھر گئی، بس میں بھر گئی۔ اس وقت جہنم بھر جائے گی اور اس کے حصے سکڑ کر ایک دوسرے سے پیوستہ ہو جائیں گے۔ اللہ اپنی مخلوق میں سے کسی پر ظلم نہیں کرتا اور جنت کو پُر کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات پیدا کرے گا جو اس میں داخل ہوں گی۔[۱]

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الجنّة وَ صِفة نعیمها، باب النار یدخلها الجبارون، حدیث۳۵، ۳۶، ۳۸، ص۲۱۸۶ تا ۲۱۸۸۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ ق، باب قوله "وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْد"، ج ۳، ص ۱۲۸، وکتاب التوحید، باب قوله تعالیٰ "وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ"، ج ۴، ص ۱۸۲۔ سنن ترمذی، کتاب الجنة، بَاب مَاجاءَ فِی خلودِ اَهلِ الجنةِ وَاَهلِ النارِ، ج ۴، ص ۶۹۲۔ ابن خزیمہ، کتاب التوحید، باب اثبات الرِّجلِ لِلّٰهِ عزوجل، ص ۹۲و۹۸۔ مسند احمد، ج ۲، ص ۲۷۶، ۳۱۴، ۵۰۷، ج ۳، ص ۱۳، ۱۴۱، ۲۳۰۔ تفسیر طبری، پارہ ۲۶، ص ۱۰۵۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۲۲۶۔ تفسیر سیوطی، ج ۶، ص ۱۰۶۔

(۲) مکتبِ خلفاء میں ساق کی روایات

صحیح بخاری، مُستدرکِ حاکم کے علاوہ تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر اور تفسیر سیوطی میں یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ۝ یعنی جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائے گا اور انہیں سجدے کے لئے بلایا جائے گا تو وہ سجدہ نہ کرسکیں گے۔ (سورۂ قلم: آیت۴۲) کے متعلق لکھا ہوا ہے کہ اس آیت کے تحت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسولِ خداؐ کو کہتے ہوئے سنا: ہمارا پروردگار پنڈلی نمایاں کرے گا۔ اس کے دیکھتے ہی تمام مومن مرد اور عورتیں خدا کو سجدہ کریں گے اور جس نے اس جہان میں رِیاکاری اور شہرت طلبی کیلئے سجدہ کیا ہوگا تو اس کی کمر بالکل سیدھی ہوجائے گی اور وہ سجدہ نہ کرسکے گا۔[1]

اس روایت کو تفصیل سے بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

قیامت کے دن آواز بلند ہوگی کہ جو جس کی بھی عبادت کرتا تھا وہ اس کے پیچھے چلا جائے۔ خدا پرست افراد اس آواز کے بعد عرصۂ محشر میں اپنے خدا کے انتظار میں کھڑے رہیں گے۔ پھر ان کا پروردگار ان کے پاس آئے گا اور ان سے پوچھے گا: کیا تمہارے اور تمہارے خدا کے درمیان پہچان کے لئے کوئی نشانی بھی مقرر تھی؟

وہ کہیں گے: ہاں! پنڈلی نشانی تھی۔

اس وقت اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کو ظاہر کرے گا جسے دیکھ کر ہر صاحبِ ایمان سجدے میں گر جائے گا۔ پھر وہ خدا کے پیچھے پیچھے چل پڑیں گے اور جنت میں پہنچ جائیں گے۔[2]

مؤلف کہتا ہے کہ مذکورہ حدیث کے متعلق چند سوالات پیدا ہوتے ہیں اور امید ہے کہ مکتبِ خلفاء سے وابستہ علماء ان کا جواب عنایت فرمائیں گے۔

(ا) مکتبِ خلفاء میں خدا کی پنڈلی کے متعلق مذکور ہے کہ وہ مومن کے لئے خدا شناسی کی علامت ہوگی۔ ہمیں بتایا جائے کہ وہ پنڈلی کیسی ہوگی؟

(ب) مکتبِ خلفاء کے مومنین نے خدا کی پنڈلی کہاں دیکھی تھی۔ اگر انہوں نے دنیا میں خدا کی پنڈلی نہیں دیکھی تھی تو قیامت کے دن پنڈلی دیکھنے سے انہیں کیسے معلوم ہوگا کہ یہ خدا کی پنڈلی ہے؟

۱۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ قلم، "یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ"، ج۳، ص۱۳۹، (حدیث کو بطور اختصار بیان کیا گیا ہے)۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب معرفة طریق الرؤیة، حدیث۳۰۲، ص۱۶۷و۱۶۸۔ سنن ابی داؤد، کتاب الرقائق، باب فی سجود المومنین یوم القیامة، ج۲، ص۳۲۶۔ مسند احمد، ج۳، ص۱۷۔ تفسیر طبری۲۹، ص۲۴۔ تفسیر ابن کثیر، ج۴، ص۴۰۷۔ تفسیر سیوطی، ج۶، ص۲۵۴ تا ۲۵۶۔

۲۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قوله تعالیٰ "وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" ج۴، ص۱۸۹۔

(ج) اگر مکتبِ خلفاء کے مومنین دنیا میں خدا کی پنڈلی کی زیارت کر چکے ہیں تو خدارا ہمیں بھی اس کی ہیئت سے آگاہ کریں؟

(د) خدا کی پنڈلی کے حجم کے متعلق بھی تفصیلات مطلوب ہیں۔ ہمیں بتایا جائے کہ اس پنڈلی کا حجم کیا تھا؟

یہاں تک آپ نے پنڈلی کے متعلق مکتبِ خلفاء کی آراء کا مطالعہ فرمایا۔ آیئے اب دیکھتے ہیں کہ ائمۂ اہلبیتؑ نے اس کے متعلق کیا فرمایا ہے:

احادیثِ اہلبیتؑ میں یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ کی تفسیر

عُبَیْد بن زُرارَہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ کے متعلق دریافت کیا تو امام علیہ السلام نے اپنے پیراہن کے دامن کو پنڈلی سے اٹھایا اور سر پر ہاتھ رکھ کر سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہا۔ مقصد یہ تھا کہ میرا رب ان باتوں سے پاک اور منزّہ ہے۔

شیخ صدوق اس روایت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ امامؑ نے سر پر ہاتھ رکھ کر اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ خدا کے متعلق ایسی بات جسارت اور بے باکی ہے۔[1]

اسی سلسلے کی دوسری روایت ملاحظہ فرمائیں:

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِیِّ الْحَلَبِی، عَنْ اَبِیْ عَبْدِاللّٰہِ فِیْ قَوْلِہٖ عَزَّوَجَلَّ "یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ." قَالَ: تَبَارَکَ الْجَبَّارُ. ثُمَّ اَشَارَ اِلٰی سَاقِہٖ فَکَشَفَ عَنْھَا الْاِزَارَ. قَالَ: "وَیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ" قَالَ: اُقْحِمَ الْقَوْمُ وَدَخَلَتْھُمُ الْھَیْبَۃُ وَشَخَصَتِ الْاَبْصَارُ، وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ تَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ وَّقَدْ کَانُوْا یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَھُمْ سَالِمُوْنَ. (سورۂ قلم: آیت ۴۳)

محمد بن علی حلبی کا بیان ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے "یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ" کے متعلق مکتبِ خلفاء کے نظریے کو سن کر فرمایا: تَبَارَکَ الْجَبَّارُ. "خدائے جبّار بلند و برتر ہے۔"

پھر آپ نے اپنی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا اور اپنے پیراہن کے دامن کو اٹھا کر پنڈلی کو ظاہر کیا اور کہا: انہیں سجدے کی دعوت دی جائے گی مگر وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔

پھر آپ نے فرمایا: لوگ خاموش ہوں گے اور ان کے دلوں میں رعب و ہیبت پیدا ہو جائے گی اور آنکھیں پتھرا جائیں گی اور دل خوف کے مارے حلق تک پہنچ جائیں گے۔ "ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور ان پر

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب تفسیر قولہ یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ. حدیث ۳، ص ۱۵۵۔ بحارالانوار، ج ۴، ص ۷، حدیث ۱۶۔

ذلت طاری ہوگی اور جب وہ صحیح سالم ہوتے تھے تو انہیں سجدے کے لئے بلایا جاتا تھا۔"

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد شیخ صدوق لکھتے ہیں:

امام جعفر صادقؑ نے پنڈلی سے کپڑا ہٹا کر اور تَبارَکَ الْجَبّارُ کہہ کر یہ بتایا کہ خدا اس بات سے پاک و منزّہ ہے کہ اس کی توصیف ان الفاظ سے بیان کی جائے۔[1]

پھر امام عالی مقام نے قیامت کی سختی کو ظاہر کرنے کے لئے آیت کے بقیہ حصے کی تلاوت کی اور فرمایا کہ اس وقت جبکہ ہولناکی اپنی انتہا کو چھو رہی ہوگی "وَيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ" انہیں سجدہ کی دعوت دی جائے گی لیکن وہ سجدہ کرنے پر قادر نہ ہوں گے۔ لوگ خاموش ہوں گے (کیونکہ ان پر حجت تمام ہوچکی ہوگی) اور ان کے پاس جواب دینے کے لئے کوئی لفظ نہیں ہوں گے اور اس دن کی ہیبت کی وجہ سے ان کے دل لرز رہے ہوں گے اور ان کی آنکھیں خیرہ ہوچکی ہوں گی اور (شدّتِ اضطراب و خوف کی وجہ سے) ان کے دل حلق تک پہنچ چکے ہوں گے۔ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَّقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سَالِمُوْنَ. ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی اور ان پر ذلت و مسکنت کی کیفیت طاری ہوگی۔ اور دنیا میں جب وہ تندرست تھے تو اس وقت انہیں خدا کے سجدے کی دعوت دی جاتی تھی (لیکن اس وقت وہ سرکشی کرتے تھے)۔

مؤلف کہتا ہے کہ سَاق کے متعلق ہم ان دو روایات پر اکتفا کرتے ہیں اور ان روایات کا ماحصل پیش کرتے ہیں:

(الف) راویوں نے ائمۂ اہلبیتؑ کے سامنے یہ آیت اس لئے پیش کی کہ وہ مکتبِ خلفاء سے وابستہ لوگوں سے اس کی تأویل سن چکے تھے۔

(ب) اس آیت کے سوال کے جواب میں (امام جعفر صادقؑ نے مکتبِ خلفاء کی تأویل کو غلط ثابت کرنے کے لئے عملی طور پر اپنا پیراہن پنڈلی سے ہٹایا اور اس طرح آپ نے سوال کرنے والوں کو یہ بتایا کہ مکتبِ خلفاء کا نظریہ یہ ہے کہ قیامت کے دن خدا کی پنڈلی بھی اسی طرح سے ظاہر کی جائے گی۔

راویوں نے اپنی خاموشی سے اس بات کی تصدیق کی کہ وہ بھی اسی مفہوم کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

(ج) پہلی حدیث کے الفاظ کے مطابق امام علیہ السلام نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر عملی طور پر بتایا کہ یہ عقیدہ انتہائی غیر منطقی اور غیر معقول ہے۔ پھر آپ نے زبان سے فرمایا: اللہ پنڈلی اور پاؤں کی توصیف سے کہیں بلند و برتر ہے۔

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب تفسیر قولہ "يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ." حدیث۲، ص۱۵۴و۱۵۵۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، کتاب التوحید، باب تاویل قولہ خَلَقْتُ بِيَدَيَّ..... ج۴، ص۷، حدیث۱۵۔

(د) دوسرے راوی کے جواب میں امام عالی مقامؑ نے علمی جواب دیا جبکہ پہلے راوی کے جواب میں آپ نے اس عقیدے کے انکار پر ہی اکتفا کیا۔

دونوں روایات کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مجلس میں پہلے راوی نے سوال کیا تھا وہ علمی مجلس نہیں تھی اور مجلس کے غیر علمی ہونے کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں:

۱۔ راوی زیادہ صاحبِ نظر نہیں ہوگا اسی لئے آپ نے اس کے سامنے علمی بحث سے گریز کیا۔

۲۔ اس مجلس میں حاضرین کی اکثریت گہرے علم وفہم سے عاری ہوگی جس کی وجہ سے آپ کو اس عقیدے کے انکار پر ہی اکتفا کرنا پڑا ہوگا جبکہ دوسری مجلس میں جب راوی نے سوال کیا تو امام عالی مقامؑ نے اس کا تفصیلی علمی جواب دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ راوی اور وہ محفل خالص علمی افراد پر مشتمل تھی۔

اب ہم لفظ ''کَشْفِ سَاق'' کی تشریح کرتے ہیں:

کَشْفِ سَاق کا مفہوم

قرآن مجید میں یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ کے الفاظ موجود ہیں جن کا لفظی ترجمہ ہے ''جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی۔'' آیئے دیکھیں کہ کَشْفِ سَاق کے محاورے کا مطلب کیا ہے؟

عربی زبان میں کَشْفِ سَاق ایک محاورہ ہے جو کسی امر کی شدّت کو بیان کرنے کیلئے بولا جاتا ہے۔

ابن عباسؓ[۱] فرماتے ہیں: جب قرآن مجید کا کوئی مفہوم تمہارے لئے واضح نہ ہو تو اشعارِ عرب سے مدد لو کیونکہ اشعارِ عرب ان کا دیوان ہیں۔ کیا تم نے عرب شاعر کا یہ شعر نہیں سنا وَقَامَتِ الْحَرْبُ بنا عَلٰی سَاقٍ جنگ میں شدت و دشواری پیدا ہوگئی۔ اس استشہاد کے بعد ابن عباسؓ نے کہا: یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے دن امرِ شدید اور ہولِ عظیم کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا جائے گا یعنی اس دن شدت اور ہولنا کی اپنی انتہا پر ہوگی۔[۲]

راغبؒ نے بھی اس آیت کی وہی تفسیر کی ہے جو ابن عباسؓ اور ان کے شاگردوں نے بیان کی تھی۔[۳]

۱۔ عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلبؓ، آنحضرتؐ کے اعلانِ نبوت کے دس برس بعد اور ہجرتِ مدینہ سے تین برس پہلے مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے اور ۶۸ھ کو شہر طائف میں فوت ہوئے۔ کتبِ خلفاء میں انہیں حَبْرُ الاُمّة یعنی امت کا ''علامہ'' کہا جاتا ہے۔ ابن عباسؓ خلفائے بنی عباس کے مُورثِ اعلیٰ تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کتبِ خلفاء میں ان کے خصوصی احترام کا یہی اصلی سبب ہو۔

۲۔ تفسیر سیوطی، ج ۶، ص ۲۵۴۔

۳۔ مفردات القرآن، مادہ ''سوق.''

مصر کے معاصر علمائے ادب کی جماعت نے مُعجمُ الفاظِ القرآنِ الکریم میں لکھا: یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ میں "کَشْفِ سَاق" شدّت اور سختی کا کنایہ ہے۔[1]

امام جعفر صادقؑ نے بھی اپنے علمی جواب میں اسی مفہوم کو واضح فرمایا تھا۔ صحابہ کے دَوْر سے لیکر آج تک کَشْفِ سَاق کا محاورہ عربی زبان میں رائج ہے اور اس سے کسی کام کی شدت اور سختی کو واضح کیا جاتا ہے۔

اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ فارسی زبان میں بھی اس جیسا محاورہ رائج ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ "جنگ بہ پا شد" یعنی جنگ چھڑ گئی۔ یہاں اس کا لفظی معنی مراد نہیں ہوتا کہ جنگ انسان اور حیوان کی طرح سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی۔

مذکورہ محاورے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ جنگ کے شعلے پوری طرح سے بھڑک اٹھے۔ "کَشْفِ سَاق" عرب زبان کا مشہور محاورہ ہے اور عرب دنیا میں چودہ صدیوں سے رائج ہے مگر عربی ادب کی موجودگی میں ابوہریرہؓ اور ان کے ہم مزاج صحابہ نے ایک روایت رائج کی اور عالَم اسلام کی بدقسمتی سے وہ روایت تفسیر و حدیث کی کتابوں میں بھی داخل ہوگئی اور عربی ادب کے بالکل متضاد یہ حدیث گھڑی گئی کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: قیامت کے دن خدا لوگوں کے سامنے اپنی پنڈلی ظاہر کرے گا اسے دیکھ کر مؤمن سجدہ کریں گے۔

اس طبع زاد روایت کی وجہ سے مکتبِ خلفاء میں یہ عقیدہ در آیا کہ خدا کے پاؤں اور پنڈلیاں بھی ہیں۔ (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذَا الْقَوْلِ)

مکتبِ خلفاء سے وابستہ علماء نے یہ سوچنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی کہ قرآن مجید کے الفاظ ان کی بیان کردہ روایت سے مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ قرآن مجید میں یُکْشَفُ مضارع مجہول کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں "نمایاں کی جائے گی" جبکہ مکتبِ خلفاء کی روایت کہتی ہے کہ اللہ خود نمایاں کرے گا۔

اگر یہی بات حقیقت پر مبنی ہوتی تو قرآن مجید میں اسے فعل مضارع مجہول کی بجائے فعل مضارع معلوم کے صیغے یَکْشِفُ یعنی خدا کھولے گا کے ساتھ ادا کیا جاتا۔ اگر یہ لفظ فعل مضارع معلوم کی صورت میں ہوتا تو مکتبِ خلفاء کی روایت کے لئے مفید ثابت ہوسکتا تھا لیکن اس صورت میں یہ لفظ مکتب خلفاء کی روایت کی ہرگز تائید نہیں کرتا۔

بطورِ خلاصہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس روایت سے اور اس جیسی دوسری روایات سے درج ذیل نقصانات ہوئے:

۱۔ معجم الفاظ القرآن الکریم، مادہ "سوق."

۱۔ ان روایات کی بنا پر قرآن مجید کی غلط تفسیر کی گئی۔

۲۔ سنتِ رسولؐ کے اہم رکن حدیث میں تحریف کی گئی۔

۳۔ ان روایات سے مسلمانوں میں ''تجسیم وتشبیہ'' کے نظریات کو فروغ دیا گیا۔

۴۔ ان روایات کی وجہ سے مسلمانوں کی صفوں میں شدید اختلاف پیدا کیا گیا۔

اس طرح کی غلط توجیہ وتفسیر کے مقابلے میں اوصیائے رسولؐ نے تین صدیوں تک سخت جدوجہد کی اور امتِ اسلامیہ کو ایسی آیات کی صحیح تفسیر سمجھائی اور اپنی شبانہ روز کوششوں سے پیغمبرِ اکرمؐ کی صحیح سنت مسلمان معاشرے کے حوالے کی۔

مکتبِ خلفاء میں خدا صرف چہرہ، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں ہی نہیں رکھتا بلکہ دیگر اجسام کی طرح اسے بھی مکان اور جگہ کی ضرورت ہے جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا۔

دونوں مکاتبِ فکر میں عرش و کُرسی کا مفہوم

مکتبِ خلفاء کی روایات سے خدا کے جو خدّوخال سامنے آتے ہیں اس کے مطابق اللہ کے ہاتھ، پاؤں، پنڈلی اور آنکھ وغیرہ ہیں اور ان اعضاء کے علاوہ اسے مکان (Space) کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

عثمان بن سعید دارمی المتوفی ۲۸۰ھ جو کہ اپنے دوَر میں فرقۂ مجسمہ کے امام تھے، انہوں نے اپنی کتاب "اَلردّ علی الجهمية" کے صفحہ ۹ پر لکھا ہے: اِنَّ لِلّٰہِ عَرْشًا مَعْلُوْمًا مَوْصُوْفًا فَوْقَ السَّمَآءِ السَّابِعَةِ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ. وَاللّٰهُ فَوْقَ كَمَا وَصَفَ نَفْسَهُ بَائِنٌ مِنْ خَلْقِهٖ. اللہ تعالیٰ کا عرش مشخص اور معلوم ہے اور وہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے جسے ملائکہ اٹھائے ہوئے ہیں اور اللہ اس عرش پر متمکن ہے جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے کہ وہ اپنی مخلوق سے جدا ہے۔

نیز یہ کہ انہوں نے اسی کتاب کے صفحہ ۱۳ پر ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے: "اِسْتِوَاءُ الرَّبِّ عَلَى الْعَرْشِ وَ ارْتِفَاعُهٗ اِلَى السَّمَاءِ وَ بَيْنُوْنَتُهٗ مِنَ الْخَلْقِ." خدا کے عرش پر متمکن ہونے اور اس کے آسمانوں میں بلند ہونے اور مخلوق سے جدا ہونے کا باب۔

ابن خزیمہ نے توحید کے صفحہ ۱۰۱ پر ایک باب کا یہ عنوان باندھا ہے "باب استوآء خالقنا العَلِیّ الاعلی الفعّال لما یشآءُ علیٰ عرشہٖ فکانَ فوقہٗ وفوق کلّ شیءٍ عالیًا." ہمارے خدائے علی و اعلیٰ جو کہ اپنی حیثیت کے مطابق عمل کرنے والا ہے کا عرش پر متمکن ہونے اور عرش پر قرار پکڑنے اور ہر چیز سے بلند ہونے کا باب۔"

دارمی نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۵ پر اَلرَّدُّعَلَى الْجَهْمِيَّةِ کے عنوان سے یہ حدیثِ رسولؐ نقل کی ہے: مَنی چالیس راتوں تک رحمِ مادر میں رہتی ہے۔ اس کے بعد وہ فرشتہ جو بنی آدم کے نفوس پر موکل ہے اس مَنی کو اللہ تعالیٰ کے پاس لے جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اے پروردگار! تیرا یہ بندہ مرد ہے یا عورت؟

اس روایت کے بعد دارمی فرقۂ جہمیہ سے کہتے ہیں: تمہارے جھوٹ کے مطابق اللہ رحم مادر میں اس مَنی کے ساتھ ہوتا ہے تو ہمیں بتاؤ جب خدا وہاں ساتھ رہتا ہے تو فرشتہ وہ منی لیکر بلندی کی طرف کیوں جاتا ہے؟

موصوف صفحہ ۱۹ پر لکھتے ہیں:

وہ پاک خدا جو اپنی مخلوق سے جدا رہتا ہے، بھلا اسے کیا پڑی ہے کہ وہ غلیظ اور نجس مقامات پر انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کے شکم میں قیام کرے اور ہر مقام پر اس کی ذات کا ایک جزو رہائش اختیار کرے؟

مجسمہ فرقے کے مخالفین کا یہ نظریہ ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ چنانچہ فرقۂ مجسمہ نے ان کے اس نظریے پر یہ طعنہ دیا کہ اگر ایسا مان لیا جائے تو اس سے لازم آئے گا کہ ہر مقام اور ہر جگہ پر خدا کے اجزاء میں سے کوئی نہ کوئی جزو موجود ہو۔ آخر خدا کو کیا پڑی ہے کہ وہ عرش سے اپنی ذاتِ مقدّس کے اجزاء کو کثیف مقامات پر لے آئے؟

دارمی اور ابن خزیمہ اور مکتبِ خلفاء کے دوسرے علماء نے عرش و کرسی کے متعلق کچھ آیات اور کچھ احادیث سے استدلال پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم بطورِ نمونہ ان میں سے کچھ دلائل نقل کرتے ہیں۔

مکتبِ خلفاء میں عرش و کرسی کا مفہوم

۱۔ عرشِ خدا کا مخلوقات کی پیدائش سے قبل ہونا

عَنْ اَبِیْ رَزِیْنٍ قَالَ: قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَیْنَ کَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ یَخْلُقَ خَلْقَہٗ؟ قَالَ: کَانَ فِیْ عَمَاءٍ مَا تَحْتَہٗ ھَوَآءٌ وَمَا فَوْقَہٗ ھَوَآءٌ وَمَا ثَمَّ خَلْقٌ، عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ۔[1] ابورزین کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خداؐ سے پوچھا: موجوداتِ عالم کو پیدا کرنے سے پہلے ہمارا خدا کہاں رہتا تھا؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: اس وقت وہ ایک بادل میں رہتا تھا جس کے نیچے ہوا نہیں تھی، اس کے اوپر بھی ہوا نہیں تھی اور اس وقت جہانِ ہستی میں کوئی مخلوق نہ تھی۔ اللہ کا عرش پانی پر متمکّن تھا۔

مکتبِ خلفاء سے وابستہ علماء نے اس حدیث سے وَکَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ۔ (سورۂ ہود: آیت ۷) کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ مخلوقات کی پیدائش سے قبل اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور اس مکتب کے علماء نے عرش کے لئے یہ روایت بیان کی ہے۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق میں عمران بن حصین سے اس مفہوم کی مفصل روایت مروی ہے۔ صحیح بخاری کے علاوہ دیکھئے: سنن ترمذی۔ کتاب التفسیر۔ باب تفسیر سورۂ ہود، جلد۵، ص۲۸۸۔ سنن ابن ماجہ المقدمة، باب فیما انکرت الجهمية، ج۱، ص۶۴ و۶۵، حدیث۱۸۲۔ (ہم نے حدیث سنن ابن ماجہ سے لی ہے)۔ تفسیر طبری، ج۱۲، ص۴۔ تفسیر ابن کثیر، ج۲، ص۴۳۷۔ تفسیر سیوطی، ج۳، ص۳۲۲۔ خازن، تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل، ج۲، ص۳۲۱۔ آلوسی، تفسیر روح المعانی، ج۱۲، ص۵ در تفسیر آیت ۷ سورۂ ہود۔ مسند احمد، ج۴، ص۱۱، ۱۲۔ ابن اثیر، نہایة اللغة، ج۳، ص۱۳۰ لفظ "عما"

۲۔ خدا کا عرش پہاڑی بکریوں کی پشت پر قائم ہے

ابوداؤد، ابن ماجہ اور احمد بن حنبل رقم طراز ہیں:

رسولِ خداؐ نے فرمایا: هَلْ تَدْرُوْنَ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ؟ قَالُوا: لَا نَدْرِي. قَالَ: بُعْدُ مَا بَيْنَهُمَا اِمَّا وَاحِدَةٌ اَوِ اثْنَتَانِ اَوْ ثَلَاثٌ وَّ سَبْعُوْنَ سَنَةً وَالسَّمَاءُ فَوْقَهَا كَذٰلِكَ — حَتّٰى عَدَّدَ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ — ثُمَّ فَوْقَ السَّابِعَةِ بَحْرٌ بَيْنَ اَسْفَلِهٖ وَ اَعْلَاهُ مِثْلَ مَا بَيْنَ سَمَاءٍ اِلٰى سَمَاءٍ. ثُمَّ فَوْقَ ذٰلِكَ ثَمَانِيَةُ اَوْعَالٍ، بَيْنَ اَظْلَافِهِمْ وَ رُكَبِهِمْ مِثْلَ مَا بَيْنَ سَمَاءٍ اِلٰى سَمَاءٍ. ثُمَّ عَلٰى ظُهُوْرِهِمُ الْعَرْشُ بَيْنَ اَسْفَلِهٖ وَ اَعْلَاهُ مِثْلَ مَا بَيْنَ سَمَاءٍ اِلٰى سَمَاءٍ. ثُمَّ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى فَوْقَ ذٰلِكَ.[1] یعنی کیا تم جانتے ہو کہ زمین و آسمان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ ہم نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: زمین و آسمان کے درمیان اکہتر یا بہتر یا تہتر سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور اسی طرح سے ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک کا بھی یہی فاصلہ ہے۔ یہاں تک کہ آپ نے سات آسمان گنوائے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ساتویں آسمان کے اوپر ایک وسیع و عریض سمندر ہے جس کے نچلے حصے اور اوپر کے حصے کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ ہے۔ پھر اس سمندر کے اوپر آٹھ پہاڑی بکریاں ہیں جن کے سم سے لے کر ان کے زانو کا فاصلہ دو آسمانوں کے مجموعی فاصلے کے برابر ہے اور ان پہاڑی بکریوں کی پشت پر اللہ کا عرش رکھا ہوا ہے اور عرش کا حجم دو آسمانوں کے مجموعی فاصلے کے برابر ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس عرش پر رہتا ہے۔

۳۔ خدا کے وزن کی سنگینی ''حدیثِ اطیط''

ابن خزیمہ، ابوداؤد، عثمان بن سعید دارمی کے علاوہ حافظ ابن اثیر نے اپنی نِهَايَةُ اللغة میں اور آلوسی نے اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کی:

رسولِ خداؐ نے اپنی انگلیوں سے ایک قبہ کی شبیہ بنائی اور اس کے بعد فرمایا: اِنَّ عَرْشَهُ عَلٰى سَمٰوَاتِهٖ كَهٰكَذَا، وَقَالَ بِاَصَابِعِهٖ مِثْلَ الْقُبَّةِ عَلَيْهِ، وَاِنَّهٗ لَيَئِطُّ اَطِيْطَ الرَّحْلِ بِالرَّاكِبِ. اللہ کا عرش آسمانوں پر اسی

۱۔ ابوداؤد، سنن، كتاب السنة، باب في الجهمية، ج۴، ص۲۳۱، حدیث۴۷۲۳۔ دارمی، الرد على الجهمية، باب استواء الربّ تبارك وتعالى عَلَى العرشِ... ص۱۹۔ ابن ماجہ، سنن، المقدمة، فيما انكرت الجهمية، ج۱، ص۶۹، حدیث۱۹۳۔ احمد بن حنبل، مسند، ج۱، ص۲۰۷۔ واضح ہو کہ دارمی نے الرد علی الجمیۃ، صفحہ۲۱ پر اور ابن خزیمہ نے کتاب التوحید کے صفحہ۱۰۶ پر ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی راہ کا فاصلہ ہے۔

طرح سے ہے جیسا کہ میں نے قبہ بنایا ہوا ہے اور (خدا کے وزن کی وجہ سے) اس سے اونٹ کے کجاوہ کی طرح سے چرچراہٹ کی آوازیں آتی ہیں۔

ابوداؤد سنن میں لکھتے ہیں:

اللہ عرش پر متمکن ہے اور عرش آسمانوں کے اوپر قائم ہے۔ خدا کے وزن کی وجہ سے عرش سے چرچراہٹ کی سی آوازیں نکلتی ہیں جیسے اونٹ کے کجاوے سے کسی بھاری شخص کے بیٹھنے پر نکلتی ہیں۔[1]

طبری، ابن کثیر اور سیوطی نے اپنی اپنی تفاسیر میں خلیفہ عمرؓ سے روایت کی ہے: ایک عورت رسولِ خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ سے جنت کی درخواست کی۔ رسول خداؐ نے پہلے تو اللہ کی عظمت بیان فرمائی۔ پھر فرمایا: اِنَّ کُرْسِیَّہٗ وَسِعَ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضَ وَاِنَّ لَہٗ اَطِیْطًا کَاَطِیْطِ الرَّحْلِ الْجَدِیْدِ اِذَا رُکِبَ مِنْ ثِقْلِہٖ مَا یَفْضُلُ مِنْہُ اَرْبَعُ اَصَابِعَ. اللہ کی کرسی آسمانوں اور زمین سے وسیع تر ہے اور جس طرح سے نئے بنے ہوئے کجاوے سے چرچراہٹ کی آواز بلند ہوتی ہے اسی طرح سے خدا کے وزن کی زیادتی کی وجہ سے کرسی سے بھی چرچراہٹ کی آوازیں نکلتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا جسم کرسی کی چاروں سمتوں سے چار چار انگلیاں لٹکا ہوا ہے۔

واضح الفاظ میں اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا جسم اتنا پھیلا ہوا ہے کہ وہ کرسی جو تمام آسمانوں اور زمینوں سے وسیع ہے، وہ نہ صرف خدا کے جسم سے بھری ہوئی ہے بلکہ خدا کا جسم اس پر بھی پوری طرح سمانے سے قاصر ہے اور کرسی سے بھی چار چار انگشت ہر سمت سے لٹکا ہوا ہے اور کرسی سے یوں چرچراہٹ کی آوازیں نکلتی ہیں جس طرح نئے کجاوے سے بلند ہوتی ہیں۔

اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ خدا انتہائی وزنی اور عَظِیْمُ الْجُثَّہ ہے۔ (مَعَاذَاللہ)

آیئے! اس چرچراہٹ والی حدیث کا سرچشمہ تلاش کریں اور دیکھیں کہیں یہ روایت کسی یہودی سے تو مروی نہیں ہے کیونکہ یہودی اس طرح کی دیومالائی باتیں کرنے کے عادی ہیں۔

۱۔ حافظ ابوداؤد سجستانی، سنن، کتاب السنۃ، باب فِی الجھمیۃ، ج۴، ص۲۳۲، حدیث۴۷۲۶۔ حافظ ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، سنن، کتاب الرقائق، باب فِیْ شَاْنِ السَّاعَۃ، ج۲، ص۳۲۵۔ عثمان بن سعید دارمی، الردّ علی الجھمیۃ، ص۱۹۔ ابن خزیمہ، کتاب التوحید، ص۱۰۱ تا ۱۱۰۔ ابن اثیر، نہایۃ اللغۃ در مادہ "اط"۔ تفسیر آلوسی، ج۱۶، ص۱۵۴، قال ابن بَشار فِی حدیثہ: اِنَّ اللہَ فَوْقَ عَرْشِہٖ وَعَرْشُہٗ فَوْقَ سَمٰوٰاتِہٖ... وساقَ الحدیث.

حدیثِ اطیط کعب الاحبار کی ساختہ و پرداختہ ہے

کعب الاحبار نے کہا:

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰاتٍ وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ ثُمَّ جَعَلَ مَابَیْنَ کُلِّ سَمَائَیْنِ کَمَا بَیْنَ السَّمَآءِ الدُّنْیَا وَالْاَرْضِ وَ کَثَفَھُنَّ مِثْلُ ذٰلِکَ. ثُمَّ رَفَعَ الْعَرْشَ فَاسْتَوٰی عَلَیْہِ. فَمَا فِی السَّمٰوٰاتِ سَمَآءٌ اِلاَّ وَلَھَا اَطِیْطٌ کَاَطِیْطِ الرَّحْلِ الْعَلاَ فِیْ اَوَّلُ مَایُرْ تَحَلُ مِنْ ثِقْلِ الْجَبَّارِ فَوْقَھُنَّ. اللہ تعالیٰ نے سات آسمان بنائے اور اتنی ہی زمینیں خلق کیں۔ پھر ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا وہی فاصلہ رکھا جو زمین اور آسمانِ دنیا کے درمیان رکھا ہے اور آسمانوں کی ضخامت زمین و آسمان کی باہمی مسافت کے برابر ہے۔ پھر اس نے عرش پیدا کیا اور عرش پر بیٹھ گیا۔ خداوندِ جبّار کے بوجھ کی وجہ سے تمام آسمانوں سے یوں چرچراہٹ کی آوازیں آتی ہیں جیسا کہ نئے کجاوے سے چرچراہٹ کی آوازیں نکلتی ہیں۔[۱]

مؤلف سمجھتا ہے کہ باقی روایات کا سرچشمہ کعب الاحبار کی روایت ہی ہے۔

۴۔ کرسی اور حاملینِ عرش کے متعلق ایک روایت

مقاتل نے وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضَ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۵۵) کے ضمن میں لکھا ہے کہ کرسی کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ پہلا فرشتہ جو انسان سے مشابہ ہے وہ اللہ تعالیٰ سے انسانوں کے لئے رزق طلب کرتا ہے۔ دوسرا فرشتہ جو بیل نما ہے وہ اللہ تعالیٰ سے چوپایوں کے لئے رزق طلب کرتا ہے۔ تیسرا فرشتہ جو عقاب سے مشابہ ہے وہ اللہ تعالیٰ سے پرندوں کے لئے رزق طلب کرتا ہے۔ چوتھا فرشتہ جو شیر سے مماثل ہے وہ اللہ تعالیٰ سے درندوں کے لئے رزق طلب کرتا ہے۔[۲]

مکتبِ خلفاء میں عرش و کرسی کی روایات بہت زیادہ ہیں جن میں سے بعض روایات کو ہم اِنْشَاءَ اللّٰہ ''عقیدہ رؤیت'' کے ضمن میں بیان کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسی ہی روایات کی وجہ سے مکتبِ خلفاء کے پیروکار عرش و کرسی کو مادی چیز سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے کہ اللہ تعالیٰ عرش و کرسی پر متمکن ہے۔

۱۔ عثمان بن سعید دارمی، کتاب الرد علی الجھمیۃ، صفحہ ۲۳

۲۔ تفسیر مقاتل، ج ۱، ص ۱۲۲۔ بنا بر نقل مؤلف کتاب الاسرائیلیات، ص ۲۲۳۔

ابن خزیمہ اپنی کتاب توحید میں لکھتے ہیں:

اس باب میں ذکر ہے کہ خالق علیِّ اعلیٰ عرش پر متمکن ہے اور وہ ہر چیز سے بلند ہے جیسا کہ اس نے ہمیں خود خبر دی ہے اور ارشاد فرمایا ہے: اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی. (سورۂ طٰہٰ: آیت ۵)

پھر ابن خزیمہ نے کچھ اور آیات بھی پیش کی ہیں جن میں ان دو آیات کا بھی ذکر ہے:

۱۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ الرَّحْمٰنُ. یعنی پھر رحمٰن عرش پر مستوی ہوا۔ (سورۂ فرقان: آیت ۵۹)

۲۔ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ. یعنی وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں بنایا اور اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ (سورۂ ہود: آیت ۷)

مکتبِ خلفاء کے دوسرے دانشوروں نے بھی ایسی ہی آیات سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''خدا عرش پر رہتا ہے۔''[۱]

اور جہاں تک ''کُرْسِیّ'' کا تعلق ہے تو قرآن مجید میں اس کے متعلق صرف ایک آیت ہے: وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ. خدا کی کرسی آسمانوں اور زمین سب پر محیط ہے۔

عربی زبان میں ''کُرْسِی'' اس چارپائی کو کہا جاتا ہے جو سلاطین کے تخت کے سامنے رکھی جاتی ہے اور سلاطین اس پر اپنے پاؤں دراز کر کے بیٹھتے ہیں۔ مکتبِ خلفاء کے اہلِ علم کا ایک گروہ اس آیت سے ایسی ہی کرسی مراد لیتا ہے۔[۲] اور کچھ علماء نے کرسی سے عرش ہی مراد لیا ہے۔[۳]

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ مکتبِ خلفاء کے مشہور اہلِ دانش عرش و کرسی کو ایک مادّی جسم کی حیثیت دیتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ خدا بھی نعوذُ باللہ ایک مادّی جسم رکھتا ہے اور وہ مادّی اجسام کی طرح سے عرش پر متمکن ہے۔ ان لوگوں نے سابقہ آیات اور ان جیسی دیگر آیات کی تأویل اپنے نظریات کے تحت کی ہے۔[۴]

یہاں تک آپ نے عرش و کرسی کے متعلق مکتبِ خلفاء کے نظریات اور ان کی روایات اور تأویلِ آیات کا مشاہدہ کیا۔ آیئے! اب دیکھیں کہ مکتبِ اہلبیتؑ میں ''عرش و کرسی'' کا کیا مفہوم بیان کیا گیا ہے؟

۱۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی نے اپنی کتاب العلو العال لِلعلیِ الغفّار، کے صفحہ۱۵۔ عثمان بن سعید دارمی نے الرد علی الجهمية کے صفحہ ۱۳ پر ان ہی نظریات کا اظہار کیا ہے۔

۲۔ تفسیر طبری، ج۳، ص۹ تا ۱۱۔ تفسیر ابن کثیر، ج۱، ص۵۴۹۔

۳۔ تفسیر طبری، ج۳، ص۱۵۔ تفسیر ابن کثیر، ج۱، ص۵۵۱۔

۴۔ ابن خزیمہ، کتاب التوحید، ص۱۰۱۔ عثمان بن سعید دارمی، الردّ علی الجهمية، باب استواء الربِّ علَی العرشِ وارتفاعه اِلَی السماءِ و بینونته مِن الخلقِ، ص۱۳۔

مکتبِ اہلبیتؑ میں کرسی کا مفہوم

شیخ الطائفہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ کتاب التوحید میں لکھتے ہیں:

راوی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ کے معنی دریافت کئے تو آپؑ نے اس کے جواب میں فرمایا: ''کرسی'' علم خدا (کا نام) ہے۔

امام صادق علیہ السلام کے بیان کردہ مفہوم کے مطابق اس آیتِ قرآنی کا ترجمہ یہ بنتا ہے کہ ''اللہ کا علم زمین اور آسمان پر محیط ہے۔''

اس کے علاوہ شیخ صدوق نے امام جعفر صادقؑ سے چار اور احادیث بھی نقل کی ہیں جن کے مطابق یہ کہنا صحیح ہے کہ ان احادیث میں بھی یہی مطلب ومفہوم بیان کیا گیا ہے۔ ان احادیث میں سے ایک حدیث میں آپ نے فرمایا: آسمان وزمین اور ہر چیز ''کُرْسِی'' میں ہے۔[1]

اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ اللہ کا علم آسمانوں، زمینوں اور ہر چیز پر محیط ہے۔

مکتبِ اہلبیتؑ میں عرش کا مفہوم

شیخ الطائفہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ کتاب التوحید میں لکھتے ہیں:

راوی نے امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا کہ ... كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ. کے کیا معنی ہیں؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

راوی نے کہا: وہ کہتے ہیں کہ ''عرش پانی پر تھا اور اللہ تعالیٰ عرش پر تھا۔''

امام علیہ السلام نے فرمایا: انہوں نے جھوٹ کہا اور جس نے بھی یہ نظریہ رکھا تو اس نے خدا کو محمول ''اٹھایا جانے والا'' قرار دیا (اور اس نے گمان کیا کہ ایک چیز نے خدا کو اٹھا رکھا ہے)۔ اس نے مخلوقات کی صفت کی نسبت خالق کی طرف دی۔ ایسے شخص کو یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ جس چیز نے خدا کو اٹھایا ہے وہ خدا سے زیادہ طاقت رکھتی ہے۔

راوی نے کہا: مولا! میں آپ پر قربان جاؤں، آپ ہی میرے لئے اس مفہوم کی وضاحت فرمائیں۔[2]

مؤلف کہتا ہے کہ امام عالی مقام کے تفصیلی جواب کا نچوڑ یہ ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوقات میں سب سے

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب معنی قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ''، ص ۳۲۷ و ۳۲۸۔

۲۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب معنی قولہ ''وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ''، حدیث ۱، ص ۳۱۹۔

پہلے پانی کو پیدا کیا۔

شیخ الطائفہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ کتاب التوحید میں ایک اور روایت نقل کرتے ہیں کہ:

مامون رشید نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا. کے متعلق پوچھا توامام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے عرش، پانی اور ملائکہ کو آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق سے پہلے پیدا کیا۔[1]

راوی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرش وکرسی کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: عرش کے متعدد اور مختلف اوصاف ہیں اور قرآن مجید میں یہ لفظ جدا جدا معانی میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید میں جہاں رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ. (سورۂ توبہ: آیت ۱۲۹) آیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ''خدا ملک عظیم کا مالک ہے۔'' اور جہاں اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى. (سورۂ طٰہٰ: آیت ۵) آیا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''خدا کی قدرت اس کے پورے ملک پر محیط ہے۔''[2]

دونوں مَکاتبِ فکر کی روایات اور تأویل آیات کا مُوازَنہ

(۱) مکتبِ خلفاء میں عرش وکرسی کا مفہوم

قرآن مجید میں بیس مقامات پر لفظ ''عَرْش'' اور صرف ایک مرتبہ لفظ ''کُرْسِی'' آیا ہے۔

ابن خزیمہ اور مکتبِ خلفاء کے دیگر علماء نے عرش وکرسی کو ایک مادّی جسم سے تعبیر کیا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنا یہ عقیدہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش وکرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے قرآن مجید کی اُن سات آیات سے استدلال کیا ہے جن میں لفظ ''عَرْش'' کے ساتھ ''اِسْتَوٰی'' بھی آیا ہے اور مذکورہ سات آیات میں لفظ ''اِسْتَوٰی'' سے انہوں نے یہ مفہوم مراد لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا ہے۔

مذکورہ علماء نے وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ سے مراد ایک محسوس کرسی لی ہے جو کہ آسمانوں اور زمینوں سے وسیع وعریض ہے۔

اس سلسلے میں مکتبِ خلفاء کی مذکورہ روایات اس طرح سے تشکیل دی گئیں:

(۱) مخلوقات کی تخلیق سے قبل اللہ تعالیٰ ایک بادل میں رہتا تھا اور اس کا عرش پانی پر قائم تھا۔

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب معنی قولہ ''وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ''، حدیث۲، ص۱۰۔

۲۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب العرش وصفاتہ، ص۳۱۱ تا ۳۲۴۔

(۲) مکتبِ خلفاء نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کی کہ آپؐ نے فرمایا:

زمین، آسمانِ اول کے نیچے ہے اور پہلا آسمان دوسرے آسمان کے نیچے اور یوں چھ آسمان ساتویں آسمان کے نیچے ہیں اور ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے اور اس سمندر کے اوپر آٹھ پہاڑی بکریاں ہیں اور ان بکریوں نے عرشِ الٰہی کو اٹھایا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر بیٹھا ہوا ہے۔

(۳) مکتبِ خلفاء کے علماء نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

اللہ کا عرش آسمانوں کے اوپر ہے اور اللہ کے وزن کی وجہ سے اس سے چرچراہٹ کی ایسی آوازیں آتی ہیں جیسی کجاوے سے آتی ہیں۔

(۴) مکتبِ خلفاء کے علماء نے روایت کی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

اللہ کرسی پر متمکّن ہے اور ہر سمت سے اس کا گوشت چار چار انگلیوں کی مقدار میں بڑھا ہوا ہے اور کرسی سے چرچراہٹ کی آوازیں نکلتی ہیں۔

مذکورہ روایات کے راوی سے ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ ہمیں یہ بتائے:

۱۔ جس خدا کا جسم کرسی کی ہر سمت سے چار انگلیوں کے برابر لٹکا ہوا ہے کیا اس کی صورت مربع ہے کیونکہ کرسی کے چار کنارے ہوتے ہیں۔

۲۔ خدا کا جسم کرسی کے ہر کنارے سے چار چار انگلی لٹکا ہوا ہے، تو کیا چار انگلیاں انسانوں کی انگلیوں کے برابر ہیں یا وہ خدا کی اپنی انگلیوں کے برابر ہیں کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی انگلیاں اتنی بڑی ہیں کہ وہ ایک انگلی پر سمندر رکھے گا، ایک انگلی پر کائنات کے درخت رکھے گا، ایک انگلی پر زمین رکھے گا وغیرہ وغیرہ۔ **تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُهُ الْجَاهِلُوْنَ۔**

۳۔ مکتبِ خلفاء کی جملہ روایات میں بتایا گیا ہے کہ عرش آسمانِ ہفتم کے اوپر ہے اور آسمانِ ہفتم، آسمانِ ششم کے اوپر اور یوں بالترتیب آسمانِ اول تمام آسمانوں کے نیچے واقع ہے اور آسمانِ اول زمین کے اوپر واقع ہے۔ بالفاظ دیگر زمین پست تر ہے اور ساتواں آسمان بلند تر ہے مگر عرشِ الٰہی ساتویں آسمان سے بھی بلند ہے اور عرش پر اللہ تعالیٰ تشریف فرما ہے۔ نعوذ باللہ۔

مختصر یہ کہ اس طرح کی روایات ہیئتِ قدیم کے مطابق تو درست قرار دی جاسکتی ہیں اور بطلیموسی نظریے میں تو ان افکار کی گنجائش ہے کیونکہ بطلیموس کے مطابق کائنات کی سات یا آٹھ منزلیں ہے اور اس عمارت کی پہلی منزل زمین اور آخری منزل عرش ہے۔

جدید علمِ ہیئت نے بطلیموسی نظریے کو فرسودہ اور غلط قرار دیا ہے اور اس نے اپنے سائنسی مشاہدوں سے واضح کیا ہے کہ ہماری زمین ہمارے سورج کے گرد گھومنے والا ایک سیارہ ہے اور ہمارے سورج جیسے کئی ملین سورج ہیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں مذکورہ روایات کی توجیہ کیسے کی جائے گی؟

(۲) مکتبِ اہلبیتؑ میں عرش و کُرسی کا مفہوم

ہماری بیان کردہ سابقہ روایات کی رُو سے مکتبِ خلفاء سے وابستہ افراد نے عرش و کرسی کو ایک مادّی جسم سے تعبیر کیا جبکہ ائمۂ اہلبیتؑ نے اس نظریے کی پرزور تردید کی ہے اور انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جس شخص نے یہ نظریہ رکھا تو اس نے خدا کو محمول (اٹھایا جانے والا) قرار دیا اور اس نے خدا کو مخلوقات کی طرح سے سمجھا۔ نیز ائمۂ اہلبیتؑ نے لوگوں کو بتایا کہ ایسی سوچ ہی غلط ہے کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا کسی چیز پر بیٹھا ہوا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس چیز نے خدا کو اٹھایا ہوا ہے وہ خدا سے زیادہ طاقتور ہے۔

ائمۂ اہلبیتؑ نے فرمایا: عرش کی متعدد صفتیں ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ لفظ عرش کے بہت سے مفہوم و مطالب ہیں مثلاً رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ کا معنی یہ ہے کہ ''خدا ملکِ عظیم کا مالک ہے۔''

علاوہ ازیں وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ کا مفہوم یہ ہے کہ زمین و آسمان سے پہلے خدا نے پانی کو پیدا کیا اور پانی سب سے پہلے خدا کے زیرِ فرمان تھا۔

ائمۂ اہلبیتؑ کی تعلیمات کا ماحصل یہ ہے کہ زمین اور آسمان کی تخلیق سے پہلے پانی پر اللہ تعالیٰ کی حکومت، سلطنت اور قدرت تھی۔

ائمۂ اہلبیتؑ نے فرمایا: ''کرسیِ خدا'' علمِ خدا کے معنی میں ہے اور وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کا مطلب ہے کہ اللہ کا علم آسمانوں اور زمینوں پر محیط ہے۔

اس مقام پر ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ احادیثِ اہلبیتؑ کی تائید کے لئے عربی زبان سے استدلال کیا جائے اور اس مقام پر ہم اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عرش و کرسی کے متعلق جو کچھ ائمۂ اہلبیتؑ نے فرمایا ہے وہ ان کے ذاتی اجتہاد پر مبنی نہیں تھا بلکہ لغتِ عرب میں بھی اس کے یہی معانی ہیں۔

عربی لُغت میں عرش و کرسی کے معنی

عربی زبان میں ایسی جگہ کو عرش کہا جاتا ہے جس پر چھت ہو۔ اس کے علاوہ کچھ اور معانی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جن میں سے ایک لفظ عَرْشِ سُلطان ہے جس کے معنی ہیں بادشاہ کا تخت۔ نیز یہ لفظ عرش

مملکت، سلطنت اور اقتدار کے لئے بھی بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے۔[۱]

قرآن مجید میں چھ مقامات (سورۂ اعراف: آیت۵۴، سورۂ یونس: آیت۳، سورۂ رعد: آیت۲، سورۂ فرقان: آیت۵۹، سورۂ سجدہ: آیت۴، سورۂ حدید: آیت۴) پر اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ اور ایک مقام (سورۂ طٰہٰ: آیت۵) پر اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی استعمال ہوا ہے۔

راغب اصفہانی مفردات القرآن میں "اِسْتَوٰی" کی شرح میں لکھتے ہیں:

مَتٰی عُدِّیَ بِعَلٰی اِقْتَضٰی مَعْنَی الْاِسْتِیْلَاءِ، کَقَوْلِهٖ "اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی." جب لفظ "اِسْتَوٰی" لفظ "عَلٰی" کے ساتھ استعمال ہو تو یہ لفظ استیلاء کے معنی میں آتا ہے۔

مفردات کے مطابق اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا: "رحمٰن عرش پر مسلط ہوا۔"

اور شعر عرب میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے عراق کے امیر "بشر" کی مدح میں کہا تھا۔[۲]

قَدِ اسْتَوٰی بَشَرٌ عَلَی الْعِرَاقِ
مِنْ غَیْرِ سَیْفٍ وَ دَمٍ مُهْرَاقِ

یعنی تلوار چلائے اور خون بہائے بغیر "بشر" عراق پر مسلط ہوگیا۔

عربی زبان میں کرسی اس چارپائی کو کہا جاتا ہے جو بادشاہ کے تخت کے نیچے پاؤں کے سامنے رکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ لفظ "کُرْسِی" سے علم بھی مراد لیا جاتا ہے۔[۳]

چونکہ کاپی میں بھی علم لکھا جاتا ہے اسی لئے عربی زبان میں کاپی کو "کُرَّاسَة" کہا جاتا ہے اور علماء کو "کراسی" کہا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

تَحُفُّ بِهِمْ بَیْضُ الْوُجُوْهِ وَ عُصْبَةٌ
کُرَاسِیُّ بِالْاَحْدَاثِ حِیْنَ تَنُوْبُ[۴]

۱۔ راغب اصفہانی، مفردات القرآن، مادہ "عرش"، کتاب الزینة فی الکلمات الاسلامیة العربیة، تالیف ابوہاشم احمد بن حمدان رازی، المتوفی ۳۲۲ھ، مطبوعہ قاہرہ، ۱۹۷۵ء، ج۲، ص۱۵۵ تا ۱۵۸۔ جوہری، لسان العرب اور صحاح اللغة مادۂ عرش۔

۲۔ بشر بن مروان، عبدالملک بن مروان کا بھائی تھا اور عبدالملک نے اسے ۷۱ھ میں عراق کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس نے بصرے میں وفات پائی تھی۔ دیکھیں ابن عساکر، تاریخ مدینة دمشق۔ علاوہ ازیں اس شعر کو قاضی عبدالجبار المتوفی ۴۱۵ھ نے اپنی کتاب تنزیہ القرآن، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۹ھ، صفحہ ۱۵۷ و ۱۵۹ میں نقل کیا ہے۔ عبدالرحمٰن بن احمد المعروف، ایجی المتوفی ۷۵۶ھ نے المواقف، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۷ھ، صفحہ ۲۹۷ پر نقل کیا ہے اور اس نے بشر کی بجائے "عمرو" لکھا ہے۔

۳۔ تفسیر طبری، ج۳، ص۹ تا ۱۱۔

۴۔ کتاب الزینة، ج۲، ص۱۵۱۔ شرح لغت "کرسی" در کتاب اساس البلاغہ۔

یعنی ان کے گرد سفید نورانی چہرے والوں کا ہجوم ہے اور ایسے گروہ نے انہیں گھیر رکھا ہے جو حوادث کے نازل ہونے کے متعلق علم و آگہی رکھتے ہیں۔

اس شعر سے ثابت ہوا کہ کرسی علم کو کہا جاتا ہے اور عُلماء کو "کراسی" کہا جاتا ہے لہٰذا سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۵ میں وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کا علم آسمانوں اور زمین پر محیط ہے۔

اسی مفہوم کو زیادہ سہل الفاظ میں قرآن مجید کی کچھ دیگر آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ بطورِ مثال ہم یہاں چار آیات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا. میرے رب کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ (سورۂ انعام: آیت ۶)

۲۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا. ہمارے پروردگار کا علم تمام اشیاء پر وسیع و محیط ہے۔ (سورۂ اعراف: آیت ۸۹)

۳۔ اللہ تعالیٰ نے حاملینِ عرش ملائکہ کے اس قول کو نقل کیا: رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا. اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ (سورۂ مومن: آیت ۷)

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا. بس تمہارا معبود وہی اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی قابلِ عبادت نہیں ہے اس کا علم تمام اشیاء پر وسعت رکھتا ہے۔ (سورۂ طٰہٰ: آیت ۹۸)

مذکورہ آیات کا معنیٰ و مفہوم یہ ہوگا: وَسِعَ عِلْمُهٗ كُلَّ شَیْءٍ. "اس کا علم ہر چیز کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔"

اس مفہوم کی از سرِ نو وضاحت کے لئے ہم مزید تجزیہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" سورۂ بقرہ کی ۲۵۵ ویں آیت کا ایک ٹکڑا ہے اور باقی آیت سے جدا کر کے اس کے معنیٰ نہیں کیے جاسکتے۔ مکمل آیت یہ ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ یَعْلَمُ مَابَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَاشَآءَ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ○

خدا (معبودِ برحق ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ زندہ بھی ہے اور اسی سے کُل کائنات قائم ہے۔ اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔ کون ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس سے (کسی کی) سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے رُوبرُو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے

پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے اور یہ اس کے علم کے ایک حصے کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جس قدر چاہے۔ اس کی کرسیٔ علم زمین و آسمان سے وسیع تر ہے اور اسے ان کی حفاظت کچھ بھی دشوار نہیں۔ وہ بڑا عالی رتبہ اور صاحبِ عظمت ہے۔

آیۃ الکرسی میں چند موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک موضوع ''علمِ خدا'' ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا یَعْلَمُ مَابَیْنَ اَیْدِیْھِمْ. یعنی مخلوقات سے پہلے جو کچھ تھا اور جو کچھ ان کے بعد وقوع پذیر ہوگا، وہ سب کا سب علمِ الٰہی میں ہے۔ خدا کے علم پر کسی کو دسترس نہیں ہے مگر وہ جس قدر چاہے، عطا کردے۔ خدا کا علم آسمانوں اور زمینوں پر محیط ہے۔ یہاں وَسِعَ عِلْمُہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کی بجائے وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ ''خدا کی کرسی زمین و آسمان پر محیط ہے۔''

عربی زبان میں علم کو کُرْسِی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

نتیجۂ بحث

زبانِ عرب میں ''عَرْش'' بادشاہ کے تخت کو کہا جاتا ہے اور اکثر مقامات پر اس کا معنیٰ سلطنت، حکومت اور بادشاہی ہوتا ہے اور قرآن کریم میں ''عرشِ خدا'' سے تمام مخلوقات پر خدا کی قدرت و حکومت مراد ہے۔

لفظ ''اِسْتَوٰی'' کے متعلق ہم نے یہ دیکھا کہ اگر اس لفظ کے بعد ''عَلٰی'' استعمال ہو تو اس کا معنیٰ تسلط و استیلاء ہوتا ہے۔

اسلامی اصطلاح میں لفظ ''رَحْمٰن'' خدا کے لئے مخصوص ہے اور یہ نام اس مفہوم کو ظاہر کرتا ہے کہ خدا کی صفتِ رحمت ہر چیز پر محیط ہے جیسا کہ حاملینِ عرش کا یہ قول قرآن میں مذکور ہے: رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَۃً وَّعِلْمًا. اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ (سورۂ مومن: آیت ۷)

اللہ کی رحمت — اس کے علم کی طرح — تمام مخلوقات پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ رحمٰن ہے یعنی موسیٰ کو بھی عطا کرتا ہے اور فرعون کو بھی، ابراہیمؑ کو بھی عطا کرتا ہے اور نمرود کو بھی لہٰذا اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی کا معنیٰ یہ ہے کہ ''رحمتِ الٰہی ہر مخلوق پر سایہ فگن ہے۔''

اور اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ الرَّحْمٰنُ... کا مفہوم یہ ہے کہ ''خدا وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ مراحل میں پیدا کیا۔ اس کے بعد صفتِ رحمانیت کے ذریعے سب پر حکومت کی۔''

ہمارے بیان کا ماحصل یہ ہے:

(۱) عَرش ایک اسلامی اِصطلاح ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں ''ہر چیز پر خدا کی قدرت، سلطنت اور حکومت۔''

اسی طرح سے لفظ رَحمٰن بھی اسلامی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں ''وہ خدا جس کی رحمت تمام مخلوقات کو گھیرے ہوئے ہے۔''

اور اِسْتَوٰی عَلٰی عربی زبان میں مسلّط ہونے کے معنی میں آتا ہے اور عربی لُغت میں کُرسِی کا لفظ عِلم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۲) کرسیَ خدا سے مراد خدا کا علم ہے اور ایک لحاظ سے یہ عرشِ الٰہی کا ایک حصہ ہے یعنی قدرتِ خداوندی کا ایک جزو ہے اور قدرتِ خداوندی کا ایک اور جزو اس کی صفتِ تخلیق ہے۔

عرشِ خدا جو کہ قدرت خدا سے عبارت ہے وہ بھی ایک طرح سے علمِ خدا کا ایک حصہ ہے اور علمِ خدا کا ایک اور جزو مثلاً بعض انسانوں کے ظلم کے متعلق خدا کا علم خدا کے فعل کا جزو قرار نہیں پاتا۔[۱]

ہماری اس تشریح سے عرش و کرسی کے متعلق ائمۂ اہلبیتؑ کی بعض روایات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ لیکن ہم نے اُن احادیث کو اس بحث میں اس لئے نقل نہیں کیا کہ ان کی وضاحت کے لئے مفصل علمی بحث کی ضرورت تھی۔

(۳) عَرش، کُرسِی اور اِسْتِوَاء کے جو مَعانی ہم نے نقل کئے ہیں، عربی زبان سے شناسائی رکھنے والا ہر شخص ان مَعانی سے آگاہ ہے۔ مگر ان واضح مَعانی و مَطالب کو مکتبِ خلفاء سے وابستہ افراد نے اپنی چند ساختہ پرداختہ روایات کی وجہ سے قبول نہیں کیا اور انہوں نے اپنی روایات کو مدنظر رکھ کر قرآنی آیات کی تاویل کی اور اسے عقیدے کے طور پر قبول کیا اور انہوں نے اپنے نظریے کو امتِ اسلامیہ میں رائج کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ جب مکتبِ خلفاء نے اسلامی اِصطلاحات کو غلَط معانی دیئے تو ائمۂ اہلبیتؑ نے ان کے غلَط نظریات کے اِبطال کے لئے بھرپور کوششیں کیں اور انہوں نے قرآن حکیم کی آیات کا حقیقی مفہوم امتِ تک پہنچایا۔

۱۔ منطقی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ''عَام خَاص مِنْ وَجْہٍ'' کی نسبت کارفرما ہے۔

دونوں مَکاتبِ فکر میں مَکانِ خدا کا مفہوم

اس بحث کے آغاز پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ فرقۂ مجسمہ اور مشبہہ کے عقیدے کو واضح کریں کیونکہ مذکورہ فرقوں کے عقائد سلفیوں اور وہابیوں میں موجود ہیں۔ مذکورہ فرقوں کے عقائد کی وضاحت کے بعد ہم ان کے دلائل بیان کریں گے اور ائمہ اہلبیتؑ نے ان کی تردید میں جو احادیث بیان کی ہے انہیں پیش کریں گے۔

فرقۂ مجسمہ و مشبّہہ کے اقوال

سابقہ روایات کو صحیح ماننے کی وجہ سے فرقۂ مجسمہ و مشبہہ نے خدا کے متعلق یہ عقیدہ قائم کیا کہ خدا انسانوں کی طرح شکل وصورت سے متّصف ہے اور انسانوں کی طرح اس کا بھی چہرہ، آنکھیں، کان، ہاتھ اور پاؤں ہیں۔ ان گروہوں کا یہ عقیدہ ہے کہ معرفتِ الٰہی کا کمال یہ ہے کہ انسان یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ عرش و کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔

جبکہ مذکورہ نظریات کے مخالف یہ کہتے ہیں کہ:

''اللہ کسی خاص جگہ اور مکان میں نہیں رہتا بلکہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔'' تو ان کا مقصد یہی واضح کرنا ہوتا ہے کہ وہ فرقۂ مجسمہ کی طرح سے خدا کی جسمانیت کے قائل نہیں ہیں، وہ خدا کو جسم و جسمانیات سے منزّہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا ''جسم'' نہیں جو کسی مخصوص جگہ میں ہی موجود ہو۔

ہماری نقل کردہ سابقہ روایات کے علاوہ مکتبِ خلفاء کی اُمّہاتُ الکتب میں ایسی روایات بھی موجود ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ثابت ہوتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ سابقہ روایات کی طرح اس مفہوم کی روایات کا سرچشمہ بھی ابوہریرۂ کی روایات ہی ہیں جن میں سے چند ایک ہم بطورِ نمونہ یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) خدا کا عرش سے اُتر کر آسمانِ اوّل پر آنا

مکتبِ خلفاء کی صحاح میں ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

یَنْزِلُ اللّٰهُ فِی السَّمَآءِ الدُّنْیَا لِشَطْرِ اللَّیْلِ اَوْ لِثُلُثِ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ فَیَقُوْلُ: مَنْ یَّدْعُوْنِیْ فَاَسْتَجِیْبَ لَهٗ اَوْ یَسْاَلُنِیْ فَاُعْطِیَهٗ؟ ثُمَّ یَقُوْلُ: مَنْ یُّقْرِضُ غَیْرَ عَدِیْمٍ وَّلَا ظَلُوْمٍ... ثُمَّ یَبْسُطُ یَدَیْهِ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی وَیَقُوْلُ مَنْ یُّقْرِضُ غَیْرَ عَدُوْمٍ وَّلَا ظَلُوْمٍ... رات کے ایک حصے میں یا رات کے آخری تہائی حصے میں اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا (آسمانِ اول) پر اترتا ہے اور کہتا ہے کہ ہے کوئی جو مجھ سے دعا مانگے تو میں اس کی دعا قبول کروں یا ہے کوئی جو مجھ سے سوال کرے تو میں اسے عطا کروں؟ اس کے بعد خدا کہتا ہے کہ کوئی ہے جو دولت مند اور ظلم نہ کرنے والے کو قرض دے؟

روایت کے آخر میں ہے: پھر اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ کھول دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہے کوئی جو غنی و عادل خدا کو قرض دے؟[1]

عرش سے آسمانِ دنیا پر خدا کے اترنے کی بہت سی احادیث اختلاف لفظی کے ساتھ ابوہریرہؓ سے بہت سی کتابوں میں مذکور ہیں۔[2]

ان روایات میں سے کچھ روایات میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کی آخری تہائی حصے میں آسمانِ دنیا پر اترتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ پہلی تہائی ختم ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر اترتا ہے اور بعض

۱۔ صحیح مسلم، کتابُ صَلاةِ المسَافِرِین وَ قَصرِهَا، بابُ الترغیبِ فِی الدعاءِ والذکرِ فِی آخرِ اللیلِ وَالاجابة فیهِ، ص۵۲۱تا۵۲۳، حدیث۱۷۱۔

۲۔ (۱) صحیح بخاری، کتابُ التهجد، بابُ الدعاء والصلاة من آخرِ اللیل، ج۱، ص۱۳۹۔ و کتابُ الدعوَات، بابُ الدعاءِ نِصفِ اللیلِ، ج۴، ص۶۹۔ و باب حدیث ینزلُ ربُّنا کل لیلة اِلَی السمآءِ الدنیا، ج۱۳، ص۳۰۔ و کتاب التوحید، باب قولهِ تعالیٰ: "یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلَامَ اللّٰهِ"، ج۴، ص۱۹۶۔ (۲) سنن ابوداؤد، کتابُ السنّة، باب فِی الردّ علَی الجَهمیةِ، ج۴، ص۲۳۴، حدیث۴۷۳۲۔ (۳) سنن ابن ماجہ، کتابُ اقامةِ الصلاةِ، بابُ مَا جآءَ فِی ایّ سَاعَات اللیلِ اَفضل، ج۱، ص۴۳۵، حدیث۱۳۶۶ و بابُ مَا جآءَ فِی لیلةِ النصفِ مِن شَعبانَ، ج۱، ص۴۴۴، حدیث۱۳۸۸ و ۱۳۸۹۔ (۴) سنن ترمذی، کتابُ الصلاة، بابُ ماجآءَ فِی نزُولِ الربِّ اِلَی سماءِ الدنیا کلّ لیلةٍ، ج۲، ص۲۳۳ و کتابُ الصّوم، باب مَا جآءَ فِی لیلةِ النصفِ مِن شعبانَ، ج۳، ص۲۷۵ و کتابُ الزهدِ، باب مَا جآءَ فِی الریاءِ وَالسمْعَةِ، ج۹، ص۲۲۹۔ (۵) سنن حافظ ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، و کتابُ الصّلاة، باب یَنْزِل اللّٰهُ اِلَی السمآءِ الدنیا، ج۱، ص۳۳۶۔ (۶) موطا مالک، کتاب القرآن، بابُ مَاجآءَ فِی الدعاءِ، ج۱، ص۲۱۵و۲۱۶۔ (۷) مسند احمد، ج۲، ص۲۶۴، ۲۶۷، ۲۸۲، ۴۱۹، ۴۳۳، ۴۸۷، ۵۰۴، ۵۲۱، و ج۳، ص۳۴، و ج۴، ص۱۶۔

روایات میں ہے کہ رات کا کچھ حصہ گزرنے کے بعد اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر اترتا ہے۔

ہم اختصار کو مدِنظر رکھتے ہوئے مذکورہ احادیث کے باہمی تضاد کا تجزیہ نہیں کرتے اور اسی طرح روزِ عرفہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اترنے کی حدیث کو بھی موضوعِ بحث نہیں بنانا چاہتے۔

الغرض ابوہریرہؓ اور ان جیسے افراد کی اس طرح کی روایات سے مکتبِ خلفاء میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے مکان اور جگہ کے عقیدے نے جنم لیا جیسا کہ حسبِ ذیل روایات سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے:

(۲) ملائکہ کا خدا کے پاس آنا جانا

دارمی اور ابن خزیمہ نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسولِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

دن اور رات کے فرشتے روزانہ صبح اور عصر کے وقت ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب رات کے فرشتے اوپر جارہے ہوتے ہیں اور دن کے فرشتے اتر رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ رات کے فرشتوں سے فرماتا ہے: جب تم میرے بندوں سے جدا ہوئے تھے اس وقت وہ کس حال میں تھے؟ ملائکہ جواب میں کہتے ہیں: جب ہم ان کے پاس نازل ہوئے تھے اس وقت وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان سے جدا ہوئے تو اس وقت بھی وہ نماز میں مصروف تھے۔

اس روایت کو نقل کر کے ابن خزیمہ نے لکھا:

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے اور اس عقیدے کی تصدیق ہوتی ہے کہ خدا آسمان میں رہتا ہے اور ملائکہ دنیا سے اس کی طرف اوپر جاتے ہیں۔ اس حدیث سے فرقۂ جہمیہ کے غلط عقائد کا بطلان واضح ہوتا ہے کیونکہ اس فرقے نے صفاتِ خدا کو باطل کردیا ہے اور یہ گروہ کہتا ہے کہ ''خدا آسمان اور زمین دونوں جگہ موجود ہے۔ اگر یہی بات ہوتی تو فرشتوں کو اوپر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ملائکہ خدا سے باتیں کرنے کے لئے اس سے زمین پر ہی رابطہ کرلیتے یا طبقات زمین کے نیچے چلے جاتے۔ اللہ فرقۂ جہمیہ پر مسلسل اور لگاتار لعنت نازل کرے۔''

دارمی نے ''نزولِ قرآن'' کے سلسلے میں اَنزَلْنَا، نَزَّلْنَا اور نَزَّلَ جیسی کچھ آیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس طرح کی بہت سی آیات قرآن مجید میں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس سے اور آسمان سے قرآن مجید کو ''نازل'' کیا ہے۔ چنانچہ اگر فرقۂ جہمیہ کی یہ بات صحیح ہوتی کہ خدا آسمان کے علاوہ زمین بلکہ زیرِ زمین بھی موجود ہے اور وہ آسمانِ ہفتم اور عرشِ بریں کی بلندی پر بھی موجود ہے تو اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے لئے اَنزَلْنَا، نَزَّلْنَا اور نَزَّلَ جیسے الفاظ بھی استعمال نہ فرماتا۔

فرقۂ جہمیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا ہر جگہ بلکہ طبقاتِ زمین کے نیچے بھی موجود ہے صحیح ہوتا تو اللہ تعالیٰ اَنۡزَلۡنَا کی بجائے اَخۡرَجۡنَا کہتا یعنی کہتا کہ ہم نے یہ قرآن زمین کے نیچے سے برآمد کیا ہے جبکہ اس نے ایسے لفظ نہیں کہے۔ قرآن کا ظاہر و باطن ہمارے بیان کردہ عقیدے کی گواہی دیتا ہے اور اسی پر دلالت کرتا ہے اور اس کے لئے کسی تفسیر کی ضرورت تک نہیں ہے اور قرآن کے ان الفاظ کو ہر خاص و عام سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے لئے کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔[1]

(۳) حدیثِ معراج

عثمان بن سعید دارمی اپنے عقیدے کے ثبوت میں لکھتے ہیں:

ذَكَرَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ مِنۡ قِصَّتِهٖ حِيۡنَ اَسۡرٰى بِهٖ فَعَرَجَ بِهٖ اِلٰى سَمَآءٍ بَعۡدَ سَمَآءٍ حَتّٰى انۡتَهٰى بِهٖ اِلٰى سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى الَّتِىۡ يَنۡتَهِىۡ اِلَيۡهَا عِلۡمُ الۡخَلَائِقِ فَوۡقَ سَبۡعَ سَمَاوَاتٍ. وَلَوۡ كَانَ فِىۡ كُلِّ مَكَانٍ كَمَا يَزۡعَمُ هٰؤُلَاءِ مَاكَانَ لِلۡاِسۡرَاءِ وَالۡبُرَاقِ وَالۡمِعۡرَاجِ اِذًا مِنۡ مَّعۡنٰى وَاِلٰى مَنۡ يَعۡرُجُ بِهٖ اِلَى السَّمَآءِ وَهُوَ بِزَعۡمِكُمُ الۡكَاذِبِ مَعَهٗ فِىۡ بَيۡتِهٖ فِى الۡاَرۡضِ لَيۡسَ بَيۡنَهٗ وَ بَيۡنَهٗ سِتۡرٌ؟[2]

رسولِ اکرمؐ نے واقعۂ معراج بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں کس طرح ایک آسمان سے دوسرے آسمان پر لے جایا گیا اور پھر سات آسمانوں کے بعد انہیں "سِدۡرَةُ الۡمُنۡتَهٰى" لے جایا گیا اور یہ وہ مقام ہے جہاں مخلوقات کے علم کی انتہا ہوتی ہے۔ اب اگر جہمیہ فرقے کا نظریہ صحیح مان لیا جائے تو پھر رسولِ اکرمؐ کے اِسراء، براق اور معراج کا تو کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہے گا اور اگر ان کے غلط عقیدے کے مطابق اللہ تبارک و تعالیٰ، رسولِ اکرمؐ کے گھر میں ہی موجود تھا اور رسولِ اکرمؐ اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں تھا تو پھر معراج میں رسولِ اکرمؐ کو کس کے پاس لے جایا گیا تھا؟

اس کے بعد عثمان بن سعید دارمی نے معراج کے واقعات حضرت ابوذر غفاریؓ کی زبانی نقل کئے۔ ایسی ہی روایات کی وجہ سے مکتبِ خلفاء کے علماء نے قرآن مجید کی آیات کی تاویل عقیدۂ تجسیم کے تحت کی جیسا کہ دارمی نے اپنی کتاب کے باب النزول میں اسی روش کو اپنایا اور لکھا:

وہ لوگ جو خدا کے نزول کے منکر ہیں ان کی تردید کے لئے حسب ذیل آیات کو پیش کیا جاسکتا ہے:

۱۔ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ... کیا یہ لوگ اس بات کے

۱۔ ابن خزیمہ، کتاب التوحید، ص ۳۸۰ و ۳۸۱۔ دارمی، الرد علی الجهمية، ص ۲۳ و ۲۶ و ۲۷۔

۲۔ دارمی، الرد علی الجهمية، ص ۲۸۔ ایسے ہی خیالات کا اظہار ابن خزیمہ نے کتاب التوحید کے صفحہ ۱۱۹ پر بھی کیا ہے۔

منتظر ہیں کہ بادلوں کے سائے میں خدا اور فرشتے ان کے پاس آئیں۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۱۰)

۲۔ وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ تمہارا پروردگار جلوہ فرما ہوگا اور فرشتے قطار باندھ باندھ کر آجائیں گے۔ (سورۂ فجر: آیت ۲۲)

اس آیت کا تعلق قیامت کے حالات سے ہے۔ اس دن اللہ نیچے آجائے گا اور وہ بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ وہ خدا جو قیامت کے دن اتر کر زمین پر آسکتا ہے اور اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرسکتا ہے تو کیا وہ خدا ہر رات ایک آسمان سے دوسرے آسمان پر نہیں اتر سکتا؟[۱]

خدا کے مکان اور نقلِ مکان کی ردّ میں اوصیائے پیغمبرؐ کی روایات

ائمۂ اہلبیتؑ نے ذاتِ باری تعالیٰ کے مکان اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی نفی کی ہے۔ انہوں نے آیاتِ متشابہات کی تأویل بیان کی ہے۔ اس سلسلے میں ان سے بہت زیادہ روایات مروی ہیں جن میں سے کچھ روایات کی تشریح و توضیح کی ضرورت ہے اور کچھ مفصل ہیں۔ بہرحال ہم بعض روایات ہی پیش کریں گے اور بعض روایات کے کچھ اجزاء نقل کرنے پر اکتفا کریں گے۔

(۱) وَجَآءَ رَبُّكَ کی تأویل

راوی کہتا ہے کہ میں نے امام رضا علیہ السلام سے وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ کا مفہوم پوچھا تو آپ نے فرمایا: آنے جانے کے الفاظ سے اللہ کی توصیف نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ نقلِ مکانی سے منزّہ ہے۔ اسی لئے مفہومِ آیت بس یہی ہے کہ "اس وقت تمہارے رب کا اَمر فرشتوں کے ساتھ صف در صف آئے گا۔"[۲]

(۲) آسمانِ اوّل پر نزولِ خدا کی حقیقت

عَنْ عَبدِالعظیمِ بْنِ عَبداللّٰہِ الْحَسَنِیِّ عَنْ ابراھیمَ بْنِ اَبِی مَحمودٍ، قَالَ قُلْتُ لِلرِّضاؑ: یَا ابْنَ رَسُولِ اللّٰہِ! مَا تَقُولُ فِی الْحَدیثِ الَّذِی یَرْوِیہِ النَّاسُ عَنْ رَّسُولِ اللّٰہِؐ اِنَّہٗ قَالَ: "اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی یَنْزِلُ کُلَّ لَیلَۃٍ اِلَی السَّمَآءِ الدُّنیَا؟" فَقَالَ: لَعَنَ اللّٰہُ الْمُحَرِّفِیْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ. وَاللّٰہِ مَا قَالَ رَسُوْلُ

۱۔ عثمان بن سعید دارمی، الرد علی الجھمیۃ، ص۳۱۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین، ج۵، ص۵۷۴، حدیث ۲۰ در تفسیر "وجآء ربک"۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب تفسیر قولہ "وَجَآءَ رَبُّکَ..." ص۱۶۲۔

اللّٰہِ کَذٰلِکَ اِنَّمَا قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی یُنزِلُ مَلَکًا اِلَی السَّمَآءِ الدُّنْیَا کُلَّ لَیْلَۃٍ فِی الثُّلُثِ الْاَخِیْرِ، وَ لَیْلَۃَ الْجُمُعَۃِ فِیْ اَوَّلِ اللَّیْلِ، فَیَاْمُرُہٗ فَیُنَادِیْ: ھَلْ مِنْ سَائِلٍ فَاُعْطِیَہٗ؟ ھَلْ مِنْ تَائِبٍ فَاَتُوْبَ عَلَیْہِ؟ ھَلْ مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ فَاَغْفِرَلَہٗ؟ یَا طَالِبَ الْخَیْرِ اَقْبِلْ، یَا طَالِبَ الشَّرِّ اَقْصِرْ. فَلَا یَزَالُ یُنَادِیْ بِھٰذَا، حَتّٰی یَطْلُعَ الْفَجْرُ. فَاِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ عَادَ اِلٰی مَحَلِّہٖ مِنْ مَّلَکُوْتِ السَّمَآءِ. حَدَّثَنِیْ بِذٰلِکَ اَبِیْ، عَنْ جَدِّیْ، عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ[1]

حضرت عبدالعظیم بن عبداللہ حسنی نے ابراہیم بن ابی محمود سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ اس حدیث کے متعلق کیا فرماتے ہیں جسے لوگ رسولِ خداؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر رات آسمانِ دنیا پر اترتا ہے؟''

یہ سن کر امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا: اللہ ان لوگوں پر لعنت کرے جو کلمات کو اس کے مقام سے ہٹا دیتے ہیں۔ خدا کی قسم! رسولِ خداؐ نے یہ نہیں کہا تھا۔ آپؐ نے تو یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کی آخری تہائی میں ایک فرشتے کو آسمانِ دنیا پر نازل کرتا ہے اور شبِ جمعہ اس فرشتے کو رات کے ابتدائی حصے میں نازل کرتا ہے اور وہ خدا کے حکم سے یہ ندا دیتا ہے کہ ''ہے کوئی سوال کرنے والا جسے میں عطا کروں؟ ہے کوئی توبہ کرنے والا جس کی میں توبہ قبول کروں؟ ہے کوئی اِستغفار کرنے والا جس کی میں مغفرت کروں؟ اے نیکی کے طلبگار! آگے بڑھ، اے برائی کے طلبگار! باز آ۔'' وہ فرشتہ اس طرح سے ندا دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے اور جب فجر طلوع ہوتی ہے تو وہ اپنی جگہ پر واپس چلا جاتا ہے۔

میرے والد نے میرے دادا سے اور انہوں نے رسولِ اکرمؐ سے یہی روایت کی ہے۔

(۳) حدیثِ معراج

شیخ الطائفہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

عَنْ یُوْنُسَ بْنِ عَبدِالرحمٰنِ، قَالَ: قُلْتُ لِاَبِی الْحَسَنِ مُوسَی بْنِ جَعْفَرٍ: لِاَیِّ عِلَّۃٍ عَرَجَ اللّٰہُ بِنَبِیِّہٖ اِلَی السَّمَآءِ، وَ مِنْھَا اِلٰی سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی وَ مِنْھَا اِلٰی حجبِ النُّوْرِ، وَ خَاطَبَہٗ وَ نَاجَاہُ ھُنَاکَ، وَاللّٰہُ لَا یُوْصَفُ بِمَکَانٍ؟ فَقَالَ: اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی لَا یُوْصَفُ بِمَکَانٍ، وَلَا یَجْرِیْ عَلَیْہِ زَمَانٌ. وَ لٰکِنَّہٗ عَزَّوَجَلَّ اَرَادَ اَنْ یُّشَرِّفَ بِہٖ مَلَآئِکَتَہٗ وَ سُکَّانَ سَمٰوَاتِہٖ وَ یُکَرِّمَھُمْ بِمُشَاھَدَتِہٖ، وَ یُرِیَہٗ مِنْ عَجَائِبِ عَظَمَتِہٖ مَا یُخْبِرُ بِہٖ بَعْدَ ھُبُوْطِہٖ وَ لَیْسَ ذٰلِکَ عَلٰی مَایَقُوْلُ الْمُشَبِّھُوْنَ. سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ تَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ.[2]

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب نفی المکان و... ص۱۷۶، حدیث ۷۔ ۲۔ ایضاً ص۱۷۵، حدیث ۵۔

یونس بن عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ میں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے کس لئے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آسمان کی بلندیوں پر بلایا؟ اور پھر وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ تک لے گیا اور وہاں سے حجاباتِ نور تک لے گیا (اور پھر ان مراحل کے بعد) ان سے گفتگو فرمائی جبکہ اللہ کی توصیف ''مکان'' کے ساتھ نہیں کی جاسکتی؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ کی توصیف مکان کے ساتھ نہیں کی جاسکتی اور اس پر زمانہ طاری نہیں ہوتا۔ معراج کا مقصد یہ تھا کہ خدا اپنے حبیبؐ کے دیدار سے فرشتوں اور ساکنانِ آسمان کو شرفیاب فرمائے اور نبیؐ اکرمؐ کی زیارت سے فرشتوں کی عزت افزائی فرمائے۔ اور یہ کہ نبیؐ اکرمؐ کو اپنے عجائباتِ عظمت دکھائے تاکہ آنحضرتؐ سفرِ معراج سے واپسی پر لوگوں کو ان عجائبات کی خبر دیں اور جس طرح سے مشبہہ اس مطلب کو بیان کرتے ہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جو کچھ وہ شرک کرتے ہیں اللہ اس سے کہیں بلند و برتر ہے۔

حدیثِ معراج کے ایک شبہہ کا جواب

شیخ الطائفہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

عَنْ زَیْدِ بْنِ عَلِیٍّ قَالَ: سَاَلْتُ اَبِیْ سَیِّدَ الْعَابِدِیْنَ فَقُلْتُ لَہٗ: یَا اَبَہ اَخْبِرْنِیْ عَنْ جَدِّنَا رَسُوْلِ اللّٰہِ لَمَّا عَرَجَ بِہٖ اِلَی السَّمَآءِ وَ... فَقُلْتُ لَہٗ یَااَبَہ اَلَیْسَ اللّٰہُ تَعَالٰی ذِکْرُہٗ لَا یُوْصَفُ بِمَکَانٍ؟ فَقَالَ: بَلٰی، تَعَالَی اللّٰہُ عَنْ ذٰلِکَ. فَقُلْتُ: فَمَا مَعْنٰی قَوْلِ مُوْسٰیؑ: اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ؟ فَقَالَ: مَعْنَاہُ مَعْنٰی قَوْلِ اِبْرَاھِیْمَ "اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ" (سورۂ صافات: آیت۹۹) وَ مَعْنٰی قَوْلِ مُوْسٰیؑ: "وَعَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی" (سورۂ طٰہٰ: آیت۸۴) وَ مَعْنٰی قَوْلِہٖ عَزَّوَجَلَّ "فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ" (سورۂ ذاریات: آیت۵۱) یعنی: حِجُّوْا اِلٰی بَیْتِ اللّٰہِ. یَابُنَیَّ! اِنَّ الْکَعْبَۃَ بَیْتُ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ بَیْتَ اللّٰہِ فَقَدْ قَصَدَ اِلَی اللّٰہِ وَالْمَسَاجِدُ بُیُوْتُ اللّٰہِ، فَمَنْ سَعٰی اِلَیْھَا فَقَدْ سَعٰی اِلَی اللّٰہِ وَ قَصَدَ اِلَیْہِ وَالْمُصَلِّیْ مَادَامَ فِیْ صَلَاتِہٖ فَھُوَ وَاقِفٌ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ جَلَّ جَلَالُہٗ وَ اَھْلُ مَوْقِفِ عَرَفَاتٍ وُقُوْفٌ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ. وَاِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی بِقَاعًا فِیْ سَمَاوَاتِہٖ. فَمَنْ عُرِجَ بِہٖ اِلَیْھَا فَقَدْ عُرِجَ بِہٖ اِلَیْہِ. اَلَا تَسْمَعُ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ یَقُوْلُ: "تَعْرُجُ الْمَلَآئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ" (سورۂ معارج: آیت۴) وَ یَقُوْلُ عَزَّوَجَلَّ: "اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ" (سورۂ فاطر: آیت۱۰)۔[1]

حضرت امام زین العابدینؑ کے فرزند زیدِ شہیدؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا:

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب نفی المکان و..... ص۱۷۶ اور ۱۷۷، حدیث ۸۔

حدیث معراج میں بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولِ خداؐ کی امت پر پچاس نمازیں فرض کیں اور رسولِ خداؐ یہ فریضہ لے کر واپس آرہے تھے کہ ان کی حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی اور حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ آپ اپنے رب کے پاس واپس جائیں (اور اس سے نمازیں کم کرنے کی درخواست کریں) تو باباجان! کیا اللہ تعالیٰ کی مکان اور جگہ سے توصیف کی جاسکتی ہے؟

میرے والد نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے کہیں بلند و بالا ہے۔

میں (زید شہیدؒ) نے کہا: پھر حضرت موسیٰؑ کے فرمان اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ کا کیا مقصد ہے؟

میرے پدر بزرگوار امام زین العابدینؑ نے فرمایا: اس کا وہی مطلب ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے قول اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ کا ہے یعنی میں اپنے پروردگار کی طرف جارہا ہوں وہی میری ہدایت کرے گا۔ اور شب معراج حضرت موسیٰؑ کے قول کا بھی وہی مقصد ہے جو وَعَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی کا ہے یعنی اے پروردگار! میں نے تیری طرف جلدی کی تاکہ تو راضی ہو جائے۔ اور حضرت موسیٰؑ کے اس قول کا وہی مطلب ہے جو فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰهِ کا ہے یعنی تم خدا کی طرف دوڑو۔ اس آیت کا مقصود یہ ہے کہ تم خانۂ خدا کا ارادہ کرو (یعنی حج بیت اللہ کے لئے جاؤ)۔ اے میرے فرزند! (یاد رکھو کہ زمین پر) کعبۃ اللہ کا گھر ہے پس جو کوئی کعبۃ جانے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کی طرف چلتا ہے وہ دراصل اللہ کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ جب تک کوئی نمازی اپنی نماز میں کھڑا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہوا ہے اور جو لوگ میدانِ عرفات میں دعا و مناجات میں مصروف ہوتے ہیں وہ بھی گویا دربارِ الٰہی میں ہی کھڑے ہوتے ہیں۔ (اسی طرح) آسمان میں بھی ایسے مقامات ہیں کہ اگر کوئی ان میں جائے تو گویا وہ خدا کے سامنے گیا۔ کیا تم نے خدا کا یہ فرمان نہیں سنا: تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ ملائکہ اور روح الامین بلند ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ اچھی گفتگو اسی کی طرف بلند ہوتی ہے اور نیک عمل اسے اوپر لے جاتا ہے۔

(۴) خُدا کی مکانیت کی مکمل نفی

شیخ الطائفہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ بَصِیْرٍ عَنِ الصَّادِقِ قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی لَا یُوْصَفُ بِزَمَانٍ وَّلَامَکَانٍ وَّلَا حَرَکَةٍ وَّلَا اَنْتِقَالٍ وَلَا سُکُوْنٍ بَلْ هُوَ خَالِقُ الزَّمَانِ وَالْمَکَانِ وَالْحَرَکَةِ وَالسُّکُوْنِ تَعَالَی اللّٰهُ عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا۔[1]

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب نفی المکان و... ص۱۸۳و۱۸۴، حدیث۲۰۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: زمان، مکان، حرکت، انتقال اور سکون کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی توصیف نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ زمان و مکان اور حرکت و سکون کا خالق ہے اور جو کچھ ظالم کہہ رہے ہیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس سے کہیں بلند و بالا ہے۔

یہاں تک ہم نے خداوندِ عالم کے صاحبِ مکان ہونے کے متعلق مکتبِ خلفاء کی اساسی کتابوں سے چند روایات نقل کیں اور اس کے جواب میں مکتبِ اہلبیتؑ کی مستند کتابوں سے ان کی نفی کی کچھ روایات نقل کیں۔ اب ہم دونوں مذاہب کے نظریۂ مکان کا تجزیہ پیش کرتے ہیں:

تحقیق اور موازنہ

مکتبِ خلفاء کے پیروکار — بالخصوص سلفی اور وہابی — سابقہ روایات کی وجہ سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ایک مادی جسم ہے -- اور عرش و کرسی پر جلوہ افروز ہے۔ (معاذ اللہ) یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ان کے مخالفین کے مطابق خدا جسم مادی کے ساتھ ہر جگہ اور ہر آن موجود ہے۔

ہماری نقل کردہ روایات اور اس مفہوم کی دوسری روایات کی وجہ سے مکتبِ خلفاء سے وابستہ افراد اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُوْنَ.

باری تعالیٰ کے منتقل ہونے کا مضمون ابوہریرہؓ کی روایات میں مختلف الفاظ سے مروی ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا: اللہ رات کے ایک حصے میں آسمانِ دنیا پر اترتا ہے۔ یا رات کے آخری تہائی حصے میں آسمانِ اول پر اترتا ہے اور اپنے ہاتھ کھول کر اپنے بندوں سے خطاب کرتا ہے۔ روزِ عرفہ نازل ہوتا ہے اور شبِ جمعہ کے ابتدائی حصے میں آسمانِ اول پر اتر آتا ہے۔

ابوہریرہؓ نے یہ بھی کہا ہے کہ دن رات کے فرشتے جدا جدا ہیں اور جب وہ زمین چھوڑ کر خدا کی طرف جارہے ہوتے ہیں تو اِدھر خدا کی طرف سے فرشتوں کا ایک گروہ اتر رہا ہوتا ہے اور دونوں گروہوں کی راستے میں ملاقات ہوتی ہے اور جب فرشتوں کا گروہ خدا کی بارگاہ میں پہنچتا ہے تو خدا ان سے پوچھتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کیسا پایا؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ جب ہم زمین پر گئے تھے تو اس وقت تیرے بندے نماز پڑھ رہے تھے اور اب جبکہ ہم ان سے جدا ہو کر آئے ہیں تو بھی وہ نماز میں ہی مصروف تھے۔

اس کے علاوہ حدیثِ معراج جیسی روایات کی وجہ سے ''ابن خزیمہ'' اور ''دارمی'' نے ان روایات سے یہ عقیدہ قائم کیا کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر رہتا ہے اور ابوہریرہؓ کی روایات کے تناظر میں ہی مکتبِ خلفاء کے مفسرین نے جَآءَ رَبُّكَ اور يَاْتِيَهُمُ اللّٰهُ جیسی آیات کی تاویل کی اور مذکورہ آیات کو ابوہریرہؓ کی روایات سے منطبق

کرکے یہ نتیجہ نکالا کہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔

مکتبِ اہلبیتؑ کے ضمن میں ہم نے اوصیائے پیغمبرؐ کی رَوش کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ انہوں نے خدا کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی نفی فرمائی ہے:

۱۔ امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا: جَآءَ رَبُّکَ کا معنی جَآءَ اَمْرُ رَبِّکَ ہے یعنی تمہارے پروردگار کا امر، تمہارے پروردگار کا فرمان اور تمہارے پروردگار کے فیصلے کا وقت ہوجائے گا۔

۲۔ امام علی رضا علیہ السلام نے ان روایات کی تردید کی جن میں کہا گیا ہے کہ خدا رات کے ایک حصے میں آسمانِ دنیا پر اترتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا: اس حدیث میں لوگوں نے جان بوجھ کر تحریف کی ہے۔ پیغمبرِ اکرمؐ نے تو فرمایا تھا کہ روزانہ رات کے ایک حصے میں اللہ تعالیٰ اپنے ایک مقرب فرشتے کو آسمان دنیا پر نازل کرتا ہے اور وہ طلوعِ فجر تک بندگان خدا کو صدائیں دیتا رہتا ہے۔

۳۔ ایک راوی نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے پوچھا کہ جب اللہ مکان اور مکانیت سے پاک ہے تو پھر وہ اپنے حبیبؐ کو آسمانوں، سدرۃ المنتہیٰ اور مقامِ قَابَ قوسین تک کیوں لے گیا؟ اس کے جواب میں امامؑ نے فرمایا: اللہ نے اپنے حبیبؐ کو اس لئے معراج کرائی تاکہ فرشتے ان کی زیارت سے مشرف ہوسکیں اور وہ خود عجائباتِ قدرت کا مشاہدہ کرسکیں اور پھر ان عجائبات کو اہلِ زمین کے سامنے بیان کریں۔

۴۔ حضرت زید شہیدؒ نے اپنے والد ماجد سے پوچھا کہ جب خدا کی مکان کے ساتھ توصیف نہیں کی جاسکتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قول کا کیا مفہوم ہوگا جو انہوں نے رسولِ خداؐ سے شبِ معراج کہا تھا کہ ''آپ اپنے رب کے پاس واپس جائیں۔'' اس کے جواب میں امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ان کے اُس قول سے مشابہ ہے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''میں نے تیری رضا کے لئے تیری طرف آنے میں جلدی کی۔''

جانِ پدر! کعبہ خدا کا گھر ہے اور مَساجد بھی خدا کے مَساکن ہیں اور جو شخص خدا کے گھر کا رخ کرتا ہے تو وہ اللہ کی طرف رخ کرتا ہے۔ اسی طرح نمازی نماز میں اور حاجی عرَفات میں جب مصروفِ دعا ہوتا ہے تو وہ خدا کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے جس طرح سے کعبہ، مَساجد، عرَفات سب خدا کی ''بارگاہ'' ہیں اسی طرح سے آسمان میں بھی ایسے کئی مقامات ہیں کہ ان پر جانے والا خدا کی ''درگاہ'' میں پیش ہونے والا تصور کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں یہ دکھائی دیتا ہے کہ فرشتے اس کی طرف جاتے ہیں اور کلماتِ طیبہ بھی اسی کی طرف بلند ہوتے ہیں تو اس سے مراد آسمانوں کے وہ مخصوص مقامات ہیں جنہیں ''بیت اللہ'' کا شرف حاصل ہے۔

۵۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو زَمان، مَکان، حرَکت، سکون، نقل و انتقال سے

موصوف نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سب کا پیدا کرنے والا ہے۔

ہم یہاں امام علی رضا علیہ السلام کے اس جواب کی تھوڑی سی تشریح کرنا چاہتے ہیں جس میں انہوں نے جَآءَ رَبُّکَ سے جَآءَ اَمْرُ رَبِّکَ مراد لیا ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے ان مباحث کی ابتدا میں امیر المومنین علیہ السلام کا وہ فرمان نقل کیا تھا جس میں آپ نے دو علمی قوانین بیان فرمائے تھے اور ان دو میں سے ایک قانون آپ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ کبھی قرآن کی تاویل اس کے لفظی معنی کے عین مطابق نہیں ہوتی۔ یہاں وَجَآءَ رَبُّکَ میں بھی یہی قانون کارفرما ہے کیونکہ اس جملے کا لفظی معنی تو یہی ہے کہ "تمہارا رب آئے گا" لیکن امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "تمہارے رب کا اَمر آئے گا" نہ کہ "تمہارا پروردگار آئے گا۔" یہاں پر لفظِ اَمر "مقدر" ہے۔

امام علی رضا علیہ السلام کے فرمان کی دلیل سورۂ ہود کی وہ آیات ہیں جن میں آیا ہے کہ فرشتے قومِ لوطؑ کو عذاب دینے کی غرض سے نازل ہوئے لیکن وہ حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان بننے سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمان بنے اور انہیں بیٹے کی بشارت دی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ حضرت لوط علیہ السلام کی بدقماش قوم کو تباہ کرنے جارہے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملائکہ سے کافی بحث مباحثہ کیا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ جواب ملا: یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّکَ وَ اِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ۝ اے ابراہیمؑ اپنی اس خواہش کو جانے دو۔ قومِ لوطؑ کے متعلق تمہارے رب کا فیصلہ طے پاچکا ہے۔ ان پر نہ ٹلنے والا عذاب آنے والا ہے۔ (سورۂ ہود: آیت ۷۶)

آیتِ بالا کے علاوہ اسی سورۂ ہود میں نافرمان اقوام پر عذابِ الٰہی کے نزول کو لفظ "اَمْر" سے تعبیر کیا گیا جیسا کہ قومِ نوحؑ کے متعلق فرمان ہے: ...حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ... جب قومِ نوحؑ (پر عذاب) کے لئے ہمارا حکم آپہنچا اور تنور سے پانی ابلنے لگا۔ (سورۂ ہود: آیت ۴۰)

یقیناً تنور سے پانی کا ابلنا عذابِ الٰہی کی علامت تھا اور آیتِ بالا میں اَمْرُنَا سے مراد عذابِ الٰہی ہے۔

اور قومِ ہودؑ پر نازل ہونے والے عذاب کو بھی اللہ تعالیٰ نے لفظ "اَمْر" سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے: وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ. اور جب ہمارا اَمر آیا تو ہم نے حضرت ہودؑ کو اور جو اُن پر ایمان لائے تھے انہیں بچالیا۔ (سورۂ ہود: آیت ۵۸)

اس کے علاوہ قومِ شعیبؑ اور قومِ صالحؑ پر نازل ہونے والے عذاب کو بھی لفظ اَمْر سے تعبیر کیا گیا ہے: فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ. اور جب ہمارا امر آیا تو ہم نے حضرت صالحؑ کو اور جو اُن پر ایمان لائے تھے انہیں بچالیا۔ (سورۂ ہود: آیت ٦٦)

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ. اور جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے حضرت شعیبؑ کو اور جو اُن پر ایمان لائے تھے انہیں بچالیا۔ (سورۂ ہود: آیت ۹۴)

اللہ تعالیٰ نے ظالم اور مجرم اقوام کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد فرمایا: وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ... (ہم نے انہیں ہلاک کیا) ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ ان اقوام نے اپنے اوپر خود ہی ظلم کیا تھا اور جب تمہارے پروردگار کا امر (عذاب) آپہنچا تو وہ خدا کے علاوہ جن معبودوں کو پکارا کرتے تھے، وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے اور ان سے عذاب دور نہ کیا...(سورۂ ہود: آیت ۱۰۱)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس سورۂ مبارکہ میں عذاب کے نازل ہونے کو جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی لئے امام علی رضا علیہ السلام نے بھی سورۂ فجر کی آیت مبارکہ وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا○ وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ کے متعلق فرمایا کہ یہاں رب کے آنے سے امرِ رب کا آنا مقصود ہے کیونکہ ان آیات کا تعلق روزِ آخرت سے ہے اور ان میں حساب و کتاب اور دوزخ کے لائے جانے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور آیات کے سیاق و سباق میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا:

''اس وقت تمہارے پروردگار کا امر (بُرے لوگوں کو عذاب دینے کے لئے) ملائکہ کی صفوں کے ساتھ آئے گا اور اس دن دوزخ کو لایا جائے گا۔''

اس ''تقدیر'' کو ''حذفِ مضاف'' کہا جاتا ہے اور قرآن مجید میں ''حذفِ مضاف'' کی بہتیری مثالیں موجود ہیں جیسا کہ برادرانِ یوسفؑ نے اپنے والد حضرت یعقوبؑ سے کہا تھا: وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا. یعنی آپ اس بستی سے پوچھیں جہاں ہم موجود تھے۔

آیت کا مقصد ہے کہ آپ اہلِ قریہ سے دریافت کریں۔ اس آیت میں لفظ ''قَرْيَة'' سے پہلے لفظ ''اَهْل'' کو حذف کیا گیا ہے۔ قرآن مجید حذفِ مضاف کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے اور زرکشی نے لکھا ہے:

حَذْفُ الْمُضَافِ وَ اِقَامَةُ الْمُضَافِ اِلَيْهِ مَقَامَهٗ... وَفِى الْقُرْاٰنِ مِنْهُ زهاء الف مَوْضِع... وَ حَذْفُ الْمُضَافِ مَجَازٌ.[۱] قرآن مجید میں ایک ہزار کے قریب ایسے مقامات ہیں جہاں مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنایا گیا ہے.... علمائے بلاغت اس کو مجاز کی ایک قسم شمار کرتے ہیں۔

۱۔ بدرالدین محمد بن عبداللہ زرکشی، البرهان فی علوم القرآن، مطبوعہ مصر ۱۳۷۶ھ، ج ۳، ص ۱۳۶۔

دونوں مکاتبِ فکر میں حجابِ خدا کا مفہوم

مکتبِ خلفاء کی روایات اور تأویل آیات کا بیان

عثمان بن سعید دارمی نے باب الاحتجاب میں پیغمبرِ اکرمؐ سے تین روایات نقل کی ہیں:[۱]

۱۔ جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: مَا كَلَّمَ اللّٰهُ اَحَدًا قَطُّ اِلاَّ مِنْ وَرَآءِ حِجَابٍ. اللہ نے آج تک پردے کی اوٹ کے علاوہ کسی سے بات نہیں کی۔

اس روایت میں اس آیۂ کریمہ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلاَّ وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ. (سورۂ شوریٰ: آیت۵۱) کی طرف اشارہ ہے۔ اس آیت کا لغوی معنی یہ ہے کہ ''کسی بشر کو یہ حق نہیں کہ اس سے خدا کلام کرے مگر وحی کے ذریعے سے یا پردے کی اوٹ سے۔''

۲۔ ابوموسیٰ اشعری کا بیان ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا: آگ پروردگار کا حجاب ہے۔

۳۔ زرارہ بن اوفیؓ سے منقول ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے جبرئیلِ امینؑ سے پوچھا: کیا تم نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ جبرئیلِ امینؑ نے کہا: اے محمدؐ! میرے اور اس کے درمیان نور کے ستر پردے حائل ہیں اور اگر میں پہلے پردے کے قریب ہونے کی کوشش کروں تو جل جاؤں۔

مذکورہ تین احادیث کے علاوہ دارمی نے عبداللہ بن عمرؓ سے یہ بات نقل کی کہ اللہ اور بندوں کے درمیان آگ، تاریکی اور نور کے حجابات حائل ہیں اور وہ ان حجابوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔

پھر دارمی نے کچھ اور صحاب کے اقوال نقل کئے اور لکھا:

حضرت جبرئیلؑ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حجاب کے پیچھے ہے اور اپنی مخلوقات سے جدا ہے اور اگر اللہ بندوں کے ساتھ ہوتا تو اس حجاب کا کوئی معنی و مفہوم نہ ہوتا۔

۱۔ دارمی، الردّ علَی الجَهمیة، ص۳۰۔ دوسری حدیث کو بیہقی نے کتابُ الاسمآءِ والصفاتِ کے بَاب مَاجآءَ فِی اِثباتِ البَصَرِ، ص۱۸۱ پر نقل کیا ہے اور اس نے ''حجابِ نار'' کی بجائے ''حجابِ نور'' لکھا ہے۔

مکتبِ خلفاء سے وابستہ علماء نے اپنے عقیدے کے اِثبات کے لئے قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا ہے: کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ. (سورۂ مطففین: آیت ۱۵) اس آیتِ مجیدہ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "ہرگز نہیں! وہ اس روز اپنے پروردگار سے محجوب ہوں گے۔"

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی شافعی اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں: ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس آیت کا یہ مفہوم سمجھیں کہ کفار پروردگار کے دیدار سے محجوب (یعنی محروم) ہوں گے۔

رازی نے "مقاتل" کا یہ قول بیان کیا: اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ عرصۂ محشر میں حساب کتاب کے بعد کفار خدا کو نہیں دیکھ سکیں گے جبکہ اہلِ ایمان خدا کو دیکھیں گے۔[1]

فقہ مالکیہ کے امام مالک بن انسؒ سے منقول ہے: خدا قیامت کے دن دشمنوں سے حجاب میں ہوگا اور اپنے دوستوں کے لئے تجلّی فرمائے گا یہاں تک کہ وہ اسے دیکھ لیں گے۔

فرقہ شافعیہ کے امام محمد بن ادریس نے اس آیت کی تفسیر میں کہا: اللہ تعالیٰ کا دشمنوں پر غضب ہوگا اسی لئے وہ ان سے حجاب میں ہوگا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنے دوستوں سے راضی ہوگا اور انھیں اپنا دیدار کرائے گا۔[2]

ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے اور انہوں نے شافعی کے قول کی تحسین و تصویب کی ہے۔[3]

خدا کے پس پردہ ہونے اور کَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ کے متعلق مکتبِ خلفاء کے استدلال کے بعد اب ہم بتائیدِ الٰہی اوصیائے پیغمبرؐ کے فرامین نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

اَوصیائے رَسُولؐ کا موقف

۱۔ اس سلسلے کے لئے ہم سب سے پہلے امیرالمومنین علیہ السلام کی ایک دلچسپ داستان اپنے قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ اس داستان کو شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے یوں نقل کیا ہے:

عَنِ الْحَارِثِ الْاَعْوَرِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِي طَالِبٍؑ اَنَّهُ دَخَلَ السُّوْقَ فَاِذَا هُوَ بِرَجُلٍ مُوَلِّيهِ ظَهْرَهُ يَقُوْلُ: لَا، وَالَّذِي احْتَجَبَ بِالسَّبْعِ! فَضَرَبَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ثُمَّ قَالَ: مَنِ الَّذِي احْتَجَبَ بِالسَّبْعِ؟ قَالَ: اَللّٰهُ

۱۔ حافظ ابن کثیر نے اسی تفسیر کو حسن بصری سے نقل کیا ہے۔
۲۔ فخرالدین رازی، تفسیر کبیر، طبع اول مصر، ج ۳۱، ص ۹۶۔
۳۔ تفسیر ابن کثیر، مطبوعہ بیروت ۱۳۸۵ھ، ج ۷، ص ۲۴۱۔

يَااَمِيْرَالْمُؤْمِنِيْنَ! قَالَ عَلِيٌّ: اَخْطَأْتَ ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَيْسَ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ خَلْقِهِ حِجَابٌ لِاَنَّهُ مَعَهُمْ اَيْنَمَا كَانُوْا. قَالَ: مَا كَفَّارَةُ مَا قُلْتُ؟ يَااَمِيْرَالْمُؤْمِنِيْنَ. قَالَ عَلِيٌّ: اَنْ تَعْلَمَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَكَ حَيْثُ كُنْتَ. قَالَ: اُطْعِمُ الْمَسَاكِيْنَ؟ قَالَ عَلِيٌّ: لَا! اِنَّمَا حَلَفْتَ بِغَيْرِ رَبِّكَ.[1]

حارث بیان کرتے ہیں کہ امیرالمومنین علیہ السلام بازارِ کوفہ میں وارد ہوئے۔ وہاں ایک شخص جس کی پشت آپ کی طرف تھی کسی سے کہہ رہا تھا: نہیں! اُس ذات کی قسم! جو سات آسمانوں کے پردوں میں محجوب ہے!

امام علیؑ نے اس کی پشت پر ہاتھ مار کر پوچھا: سات آسمانوں کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے؟

اس شخص نے کہا: یاامیرالمومنینؑ! اللہ تعالیٰ۔

آپ نے فرمایا: تیری ماں تجھے روئے، تو نے غلطی کی۔ خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ وہ ہر جگہ اُن کے ساتھ ہے۔

اس شخص نے کہا: میری اس گفتگو کا کیا کفارہ ہے؟

آپ نے فرمایا: اس کا کفارہ بس یہی ہے کہ تم یہ عقیدہ رکھو کہ تم جہاں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہے۔

اس شخص نے کہا: کیا میں مساکین کو کھانا کھلاؤں؟

آپ نے فرمایا: نہیں! کیونکہ تم نے تو غیراللہ کی قسم کھائی ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جس شخص نے غلط قسم کھائی تھی اسے آپ نے صحیح عقیدے کی تعلیم دی اور بتایا کہ وہ اپنے عقیدے کی اصلاح کرے اور اس عقیدے کو چھوڑ دے کہ اللہ سات آسمانوں کی اوٹ میں چھپا بیٹھا ہے اور اس کے ساتھ آپ نے اسے یہ عقیدہ تعلیم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مکان سے مُبَرّا ہے وہ مکان میں محدود نہیں بلکہ تمام مکانات پر محیط ہے وہ ہر جگہ ہے اور ہر کسی کے ساتھ ہے۔ اسے مکان محدود نہیں کرسکتا۔

دوسری طرف اس شخص نے یہ گمان کیا کہ اس پر غلط قسم کی وجہ سے کفّارہ واجب ہوچکا ہے اس لئے اس نے آپ سے پوچھا کہ کیا میں مساکین کو کھانا کھلاؤں؟ اس کے جواب میں حضرت نے فرمایا کہ نہیں! تمہیں کسی طرح کے کفّارے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کفّارے کی ضرورت تب پڑتی کہ اگر تم نے اللہ کی قسم کھائی ہوتی لیکن تم نے جو قسم کھائی ہے وہ تو سرے سے اللہ کی قسم ہی نہیں ہے لہٰذا تم پر کوئی کفّارہ نہیں۔

۲۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے امام علی رضا علیہ السلام سے قرآن مجید کی اس آیت كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ. کا مفہوم دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: مکان میں رہنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توصیف

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب نفی المکان، ص۱۸۴، حدیث۱۲۔

نہیں کی جاسکتی۔ اسی لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حجاب کی اوٹ میں بندوں سے محجوب ہوگا۔ آیت کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ پروردگار کے ثواب اور انعام سے محجوب (محروم) ہوں گے۔ (اور انہیں ثوابِ خداوندی تک دسترس نہ ہوگی)۔[1]

امامؑ سے قرآن مجید کی اس آیت هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ... (سورۂ بقرہ: آیت ۲۱۰) کی تفسیر پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: "يَنْزِلُ اَمْرُ اللّٰهِ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ" اللہ کا امر (عذاب) بادلوں کے سائے میں فرشتوں کے ساتھ نازل ہوگا۔[2]

مذکورہ عقائد کی تحقیق و موازنہ

مکتبِ خلفاء کا عقیدہ ہے کہ اللہ اپنی مخلوقات سے پردے کی اوٹ میں ہوگا اور اس عقیدے کے لئے وہ دو طرح کے ثبوت پیش کرتے ہیں:

۱۔ "...اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ." کی آیت کریمہ۔

۲۔ وہ روایات جو ہم نے اوپر نقل کی ہیں۔

اس سلسلے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ عقیدے کا سبب وہ روایات ہیں جنہیں ہم آئندہ رؤیتِ خداوندی کی بحث میں ذکر کریں گے۔

اِس عقیدے کو وصیِّ پیغمبرؐ نے یہ کہہ کر مسترد کیا کہ "اللہ اور اس کی مخلوق کے بیچ کوئی پردہ نہیں ہے۔ وہ ہر وقت اور ہر جگہ اپنی مخلوق کے ساتھ موجود ہے۔"

حضرت کا یہ فرمان قرآن مجید کی حسبِ ذیل دو آیات کی تفسیر ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا۝ یہ لوگوں کی نظروں سے تو چھپتے ہیں اور خدا سے نہیں چھپتے حالانکہ جب وہ راتوں کو ایسی باتوں کے مشورے کیا کرتے ہیں جن کو وہ پسند نہیں کرتا تو ان کے ساتھ ہوا کرتا ہے اور خدا ان کے تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ (سورۂ نساء: آیت ۱۰۸)

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب تفسیر قولہٖ تعالیٰ: "كَلَّآ اِنَّهُمْ"، ص۱۶۲۔ تفسیر برہان، ج۴، ص۴۳۲۔ تفسیر نور الثقلین، ج۵، ص۵۳۲ در تفسیر آیت ۱۵ از سورۂ مطففین۔

۲۔ تفسیر برہان، ج۱، ص۲۰۹۔ تفسیر نور الثقلین، ج۱، ص۱۷۳ در تفسیر آیت ۲۱۰ از سورۂ بقرہ

۲۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ...مَا یَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۝ کہیں بھی تین آدمیوں میں صلاح مشورہ نہیں ہوتا مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے اور نہ کہیں پانچ کا مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم یا زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے خواہ وہ کہیں ہوں۔ پھر جو کام یہ کرتے رہے ہیں قیامت کے دن وہ ایک ایک ان کو بتائے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ (سورۂ مجادلہ: آیت ۷)

''خدا ان کے ساتھ ہوتا ہے'' سے مراد یہ ہے کہ کوئی چیز خدا سے پوشیدہ نہیں ہے جیسا کہ پہلی آیت کا تتمّہ یہ ہے: وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا. ''خدا ان کے تمام اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے'' یعنی اس کا علم ساری کائنات کے اعمال و افعال کو گھیرے ہوئے ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

دوسری آیت کا آغاز ان الفاظ سے کیا گیا: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ. کیا تم نے نہیں دیکھا یعنی کیا تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ آسمان اور زمین کی تمام چیزوں کو اللہ جانتا ہے۔

اوصیائے رسولؐ نے مکتبِ خلفاء کی طرف سے استدلال میں پیش کردہ آیت: اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ. کے متعلق فرمایا کہ اس میں کلمہ ''ثواب'' مقدور و محذوف ہے اور اس آیتِ مجیدہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے رب کے ثواب سے محروم ہوں گے۔

صفحہ ۳۲۴ پر میں نے زرکشی کے حوالے سے بتایا تھا کہ قرآن مجید میں ''حذفِ مضاف'' کی ایک ہزار کے قریب مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی وہی قاعدہ کارفرما ہے۔

مکتبِ خلفاء کے محدّث، مفسّر اور ان کے فقہی مذاہب کے امام اس بات کے قائل تھے کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے حجاب کی اوٹ میں ہوگا جبکہ مومن قیامت کے دن اسے دیکھ سکیں گے۔

دونوں مکاتبِ فکر میں دیدارِ خدا کا مفہوم

مکتبِ خلفاء میں خدا کا دیدار

خداوندِ عالَم کے دیکھے جانے کی بحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) پیغمبرِ اکرمؐ نے شبِ معراج اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا۔

(۲) امتِ رسولؐ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گی۔

(۳) امتِ رسولؐ کو جنت میں اللہ تعالیٰ اپنا دیدار کرائے گا۔

(۱) پیغمبرِ اکرمؐ نے شبِ معراج اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا

اس سلسلے کی روایات کو ابن خزیمہ نے ابن عباسؓ، ابوذر غفاریؓ اور انَس بن مالکؓ سے نقل کیا ہے [۱]

ابن خزیمہ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو شرفِ خُلّت اور حضرت موسیٰؑ کو شرفِ تکلّم اور حضرت محمدؐ کو اپنے دیدار کا شرف عطا فرمایا۔

اس روایت کی اکثر اَسناد ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام عکرمہ پر منتہی ہوتی ہیں اور اس کے متعلق علمائے رجال میں یہ بات مُسَلَّم ہے کہ وہ ابن عباسؓ پر جھوٹ باندھا کرتا تھا۔

علاوہ ازیں ابن عباسؓ، امام علیؑ کے ابنِ عم اور ان کے شاگرد تھے لہٰذا ان سے مروی جو بھی روایت امام علیؑ کے فرمان کے مخالف ہوگی وہ جھوٹی متصوّر ہوگی۔

اصل بات یہ ہے کہ اس عقیدے کا بانی کعب الاحبار تھا جیسا کہ ابن خزیمہ نے اس سے یہ روایت نقل کی ہے: اِنَّ اللّٰهَ قَسَّمَ رُؤْيَتَهٗ وَ كَلَامَهٗ بَيْنَ مُوْسٰى وَ مُحَمَّدٍ فَرَاٰهُ مُحَمَّدٌ مَرَّتَيْنِ وَ كَلَّمَ مُوْسٰى مَرَّتَيْنِ. [۲]
اللہ تعالیٰ نے اپنے دیدار اور اپنے کلام کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمدؐ میں تقسیم کیا۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ نے دو مرتبہ

۱۔ ابن خزیمہ، کتاب التوحید، ص ۲۲۱ تا ۲۲۸۔ ۲۔ ایضاً، ص ۲۰۲۔

اس کا دیدار کیا ہے اور حضرت موسیٰؑ نے دو بار اس سے کلام کیا ہے۔

مکتبِ خلفاء کی بیشتر شخصیات نے اس عقیدے کا انکار کیا اور کہا کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ رسولِ خداؐ نے شبِ معراج خدا کا دیدار کیا تھا۔ انکار کرنے والوں میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سرِفہرست تھیں لیکن ابن خزیمہ نے حضرت عائشہؓ کے خیالات کی تردید کی اور کہا کہ آنحضرتؐ نے اللہ کا دیدار کیا تھا۔

چونکہ مکتبِ خلفاء سے وابستہ افراد کی اکثریت نے اس عقیدے کو مسترد کر دیا ہے اس لئے ہم رؤیت کی دوسری اور تیسری قسم پر ہی اپنی بحث کو مرکوز رکھیں گے۔

(۲) اُمّتِ رسولؐ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گی

مکتبِ خلفاء کے عقیدے کے مطابق خدا کا جسم اور مکان ہے۔ وہ کبھی کبھی نقل مکانی کرتا ہے اور مزید یہ کہ وہ حجاب کی اوٹ میں ہوگا۔ البتہ اس کا دیدار بھی کبھی کبھی ہوگا۔

اس سلسلے میں بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی، احمد بن حنبل اور سیوطی نے ابوہریرہؓ سے یہ روایت کی ہے۔ ہم اس روایت کو صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ اُنَاسٌ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ نَرٰی رَبَّنَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ؟

فَقَالَ: هَلْ تَضَارُّوْنَ فِی الشَّمْسِ لَیْسَ دُوْنَهَا سَحَابٌ؟ قَالُوْا: لَا، یَارَسُوْلَ اللّٰهِ!

قَالَ: هَلْ تَضَارُّوْنَ فِی الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ لَیْسَ دُوْنَهٗ سَحَابٌ؟ قَالُوْا: لَا، یَارَسُوْلَ اللّٰهِ!

قَالَ: فَاِنَّكُمْ تَرَوْنَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ كَذٰلِكَ، یَجْمَعُ اللّٰهُ النَّاسَ فَیَقُوْلُ: مَنْ كَانَ یَعْبُدُ شَیْئًا فَلْیَتَّبِعْهُ فَیَتَّبِعُ مَنْ كَانَ یَعْبُدُ الشَّمْسَ وَ یَتَّبِعُ مَنْ كَانَ یَعْبُدُ الْقَمَرَ وَ یَتَّبِعُ مَنْ كَانَ یَعْبُدُ الطَّوَاغِیْتَ وَ تَبْقٰی هٰذِهِ الْاُمَّةُ فِیْهَا مُنَافِقُوْهَا.

فَیَاْتِیْهِمُ اللّٰهُ فِیْ غَیْرِ الصُّوْرَةِ الَّتِیْ یَعْرِفُوْنَ، فَیَقُوْلُ: اَنَا رَبُّكُمْ. فَیَقُوْلُوْنَ: نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ! هٰذَا مَكَانُنَا حَتّٰی یَاْتِیَنَا رَبُّنَا فَاِذَا اَتَانَا رَبُّنَا، عَرَفْنَاهُ. فَیَاْتِیْهِمُ اللّٰهُ فِی الصُّوْرَةِ الَّتِیْ یَعْرِفُوْنَ، فَیَقُوْلُ: اَنَا رَبُّكُمْ. فَیَقُوْلُوْنَ: اَنْتَ رَبُّنَا. فَیَتَّبِعُوْنَهٗ وَیُضْرَبُ جِسْرُ جَهَنَّمَ... وَیَبْقٰی رَجُلٌ مُقْبِلٌ بِوَجْهِهٖ عَلَی النَّارِ، فَیَقُوْلُ: یَارَبِّ، قَدْ قَشَبَنِیْ رِیْحُهَا وَ اَحْرَقَنِیْ ذَكَاؤُهَا فَاصْرِفْ وَجْهِیْ عَنِ النَّارِ! فَلَا یَزَالُ یَدْعُوالله. فَیَقُوْلُ: لَعَلَّكَ اِنْ اَعْطَیْتُكَ اَنْ تَسْاَلَنِیْ غَیْرَهٗ. فَیَقُوْلُ: لَا وَعِزَّتِكَ لَا اَسْاَلُكَ غَیْرَهٗ، فَیُصْرَفُ وَجْهُهٗ عَنِ النَّارِ ثُمَّ یَقُوْلُ بَعْدَ ذٰلِكَ: یَارَبِّ قَرِّبْنِیْ اِلٰی بَابِ الْجَنَّةِ.

فَیَقُوْلُ: اَلَیْسَ قَدْ زَعَمْتَ اَنْ لَا تَسْاَلَنِیْ غَیْرَهٗ؟ وَیْلَكَ ابْنَ اٰدَمَ! مَا اَغْدَرَكَ! فَلَا یَزَالُ یَدْعُوْ.

فَيَقُوْلُ: لَعَلِّيْ اِنْ اَعْطَيْتُكَ ذٰلِكَ، تَسْاَلُنِيْ غَيْرَهُ؟

فَيَقُوْلُ: لَا وَعِزَّتِكَ لَا اَسْاَلُكَ غَيْرَهُ. فَيُعْطِي اللّٰهَ مِنْ عُهُوْدٍ وَّ مَوَاثِيْقَ اَنْ لَّا يَسْاَلَهُ غَيْرَهُ. فَيُقَرِّبُهُ اِلٰى بَابِ الْجَنَّةِ فَاِذَا رَاٰى مَا فِيْهَا سَكَتَ مَاشَآءَ اللّٰهُ اَنْ يَّسْكُتَ ثُمَّ يَقُوْلُ: رَبِّ اَدْخِلْنِي الْجَنَّةَ!

ثُمَّ يَقُوْلُ: اَوَلَيْسَ قَدْ زَعَمْتَ اَنْ لَّا تَسْاَلَنِيْ غَيْرَهُ وَيْلَكَ يَا بْنَ اٰدَمَ! مَا اَغْدَرَكَ.

فَيَقُوْلُ: يَارَبِّ لَا تَجْعَلْنِيْ اَشْقٰى خَلْقِكَ فَلَا يَزَالُ يَدْعُوْ حَتّٰى يَضْحَكَ فَاِذَا ضَحِكَ مِنْهُ اَذِنَ لَهُ بِالدُّخُوْلِ فِيْهَا فَاِذَا دَخَلَ فِيْهَا قِيْلَ تَمَنَّ مِنْ كَذَا فَيَتَمَنّٰى ثُمَّ يُقَالُ لَهُ تَمَنَّ مِنْ كَذَا فَيَتَمَنّٰى حَتّٰى تَنْقَطِعَ بِهِ الْاَمَانِيُّ. فَيَقُوْلُ لَهُ هٰذَا لَكَ وَ مِثْلُهُ مَعَهُ.

قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ وَ ذٰلِكَ الرَّجُلُ آخِرُ اَهْلِ الْجَنَّةِ دُخُوْلًا۔[1]

کچھ لوگوں نے رسولِ خداؐ سے پوچھا: کیا ہم قیامت کے دن اپنے پروردگار کو دیکھیں گے؟

رسولِ خداؐ نے ان کے جواب میں فرمایا: تو کیا جس دن ابر نہ ہو تو تمہیں سورج کے دیکھنے میں بھی کوئی شک ہوتا ہے؟ لوگوں نے کہا: نہیں، یارسول اللہ۔

پھر رسولِ خداؐ نے فرمایا: تو کیا چودھویں کے چاند کے سامنے جب کوئی بادل نہ ہو تو تمہیں چاند کے دیکھنے میں کوئی تردّد ہوتا ہے؟ لوگوں نے کہا: نہیں، یارسول اللہ۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: تم خدا کو بھی سورج اور چاند کی طرح کسی شک کے بغیر دیکھو گے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو جمع کرے گا اور کہے گا کہ جو کوئی کسی کی عبادت کرتا تھا وہ اس کے پیچھے چلا جائے۔ (اس فرمان کے بعد) کچھ لوگ سورج کے پیچھے چل پڑیں گے اور کچھ لوگ چاند کے پیچھے چل پڑیں گے اور ایک

۱۔ (۱) صحیح بخاری، کِتابُ الْاَذَانِ، باب فَضْلِ السُّجُوْدِ، ج۱، ص۱۰۲ و کتابُ التفسیر تفسیرُ سورۃِ النسآء، بابُ قولہٖ تعالٰی: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ يعنى زِنَةَ ذَرَّةٍ، ج۳، ص۸۰و۸۱ و کتابُ الرِّقَاق، بابُ الصراط جِسْرُ جَهَنَّمَ، ج۴، ص۹۳و۹۴ و کتابُ التوحید، بابُ قولِ اللّٰہِ تعالٰی: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ، ج۴ ص۱۸۸و۱۸۹۔

(۲) صحیح مسلم، کتابُ الایمان، بابُ معرفۃِ طریق الرؤیۃ، ص۱۶۳تا۱۶۶، حدیث۲۹۹، ص۱۶۷تا۱۷۱، حدیث۳۰۲ و ص۱۶۷، حدیث۳۰۰ میں روایت کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ (۳) سنن ابی داوٗد، کتابُ السنۃ، باب فی الرؤیۃ، ج۴، ص۲۳۳و۲۳۴، حدیث۴۷۲۹، ۴۷۳۰ و۴۷۳۱۔ اس میں گناہگار شخص کی داستان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ (۴) سنن ابن ماجہ، کتاب المقدمۃ، باب مَا اَنْكَرَتِ الْجَهْمِيَّةُ، ص۶۳و۶۴، حدیث از ۱۷۷تا۱۸۰۔ اس میں گناہگار شخص کی داستان مذکور نہیں ہے۔ (۵) سنن ترمذی، کتابُ الجَنَّۃ، باب مَاجآءَ فِي رُؤْيَةِ الرَّبِّ، ج۱۰، ص۱۹، وَ بَابُ مَاجَآءَ فِي خُلُوْدِ اهلِ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، ج۱۰، ص۲۱۔ (۶) مسند احمد، ج۳، ص۱۶و۱۷، ج۴، ص۱۲۔ (۷) جلال الدین سیوطی، تفسیر درمنثور، تفسیر آیت ۲۲ از سورۂ قیامت، ج۶، ص۲۹۰و۲۹۱۔ (۸) علاؤالدین علی بن محمد بغدادی، تفسیر الخازن، ج۴، ص۲۹۸و۲۹۹ و ۳۳۶و۳۳۷۔

تیسرا گروہ طواغیت کے پیچھے چل پڑے گا۔ اس وقت عرصۂ محشر میں صرف میری امت کے افراد باقی رہ جائیں گے اور ان میں منافق بھی شامل ہوں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ ان کے پاس ایک ایسی صورت میں آئے گا جسے وہ نہ پہچانتے ہوں گے اور وہ ان سے کہے گا: میں تمہارا خدا ہوں۔

میری امت کے افراد کہیں گے: ہم تجھ سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں۔ ہم یہاں کھڑے رہیں گے اور خدا کے آنے تک اِدھر اُدھر نہیں ہوں گے اور جیسے ہی ہمارا خدا آئے گا ہم اسے اچھی طرح سے پہچان لیں گے۔

پھر خدا ان کے پاس ایسی شکل وصورت میں آئے گا جسے وہ پہچانتے ہوں گے اور وہ ان سے کہے گا کہ ''میں تمہارا خدا ہوں۔''

میری امت کے افراد کہیں گے: بے شک تو ہمارا خدا ہے۔ اس کے بعد وہ خدا کے پیچھے چل پڑیں گے۔ پھر دوزخ پر ایک پل نصب کیا جائے گا۔

(اس کے بعد ابو ہریرہؓ نے دوزخ کے عذاب کی تفصیل بیان کی اور اس کے ضمن میں یہ بھی بتایا کہ توحید پرست دوزخ سے کیسے نجات پائیں گے۔ اس کے بعد ابو ہریرہؓ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:)

اہلِ محشر میں سے دوزخ میں صرف ایک شخص بچ جائے گا جس کا چہرہ آگ کی طرف ہوگا۔ وہ فریاد کرے گا: خدایا! دوزخ کی عفونت نے مجھے مسموم کردیا ہے اور اس کے شعلوں نے مجھے جلا ڈالا ہے۔ میرا چہرہ آگ سے ہٹا دے۔ چنانچہ وہ مسلسل دعا کرتا رہے گا اور اپنی درخواست دہراتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: اگر میں تیری درخواست مان لوں تو تُو کچھ اَور مانگنے لگے گا۔

وہ کہے گا: نہیں! مجھے تیری عزّت کی قسم میں تجھ سے اس کے علاوہ اور کسی چیز کا تقاضا نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو دوزخ سے ہٹا دے گا۔

پھر وہ شخص درخواست کرے گا: خدایا! مجھے جنت کے دروازے کے قریب کردے۔

اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا: کیا تو نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں اَور کچھ نہیں مانگوں گا؟ اے فرزندِ آدم! تجھ پر افسوس، تو کتنا بڑا فریبی ہے۔

وہ شخص مسلسل اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا رہے گا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا: اگر میں تیری یہ دعا قبول کرلوں تو پھر تو مجھ سے کچھ اَور طلب کرنے لگ جائے گا۔

وہ کہے گا: نہیں تیری عزت کی قسم! میں اس کے علاوہ اَور کچھ بھی طلب نہیں کروں گا۔

اللہ تعالیٰ اس سے پختہ وعدہ لے گا کہ وہ اس کے بعد اَور کچھ بھی نہیں مانگے گا۔ اس کے بعد اسے

جنت کے دروازے کے قریب کردیا جائے گا۔

جب وہ جنّت کی اندرونی نعمات کو دیکھے گا تو کچھ عرصہ تو خاموش رہے گا مگر پھر عرض کرے گا: خدایا! مجھے جنّت میں داخل فرما۔

اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا: کیا تو نے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ اس کے علاوہ تو مجھ سے اَور کچھ نہیں مانگے گا۔ اے فرزندِ آدم! تجھ پر افسوس، تو کتنا بڑا چالاک اور مکّار ہے۔

وہ کہے گا: خدایا! مجھے اپنے تمام بندوں میں سے محروم ترین بندہ نہ بنا اور پھر وہ اتنی مسلسل درخواست کرتا رہے گا کہ خدا کو ہنسی آجائے گی اور جیسے ہی خدا کو ہنسی آئے گی تو اسے جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے گی۔

جب وہ جنّت میں داخل ہوگا تو اس سے کہا جائے گا کہ تیرے جی میں جو بھی خواہش ہو وہ بیان کر۔ وہ جو کچھ بھی خواہش رکھتا ہوگا تمام خواہشات خدا کے سامنے بیان کرے گا۔ اس کے بعد اسے دوبارہ کہا جائے گا کہ جو تیرے جی میں ہو وہ مانگ لے۔ وہ اس کے بعد اپنی تمام دلی خواہشات پیش کرے گا یہاں تک کہ اس کی خواہشات پوری ہوجائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: تو نے جتنی بھی خواہشات کا اظہار کیا ہے میں تجھے ان سے بھی دوگنا عطا کرتا ہوں۔

پھر ابوہریرہؓ نے کہا: وہ جنّت میں داخل ہونے والا آخری شخص ہوگا۔

مکتبِ خلفاء کی احادیث کے ایک حصے کی چند روایات کو ہم نے بطورِ نمونہ بیان کیا ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن امت کے افراد خدا کو دیکھیں گے۔

اب ہم خدا کی مدد سے اس عقیدے کے متعلق اوصیائے رسولؐ کا موقف پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

مکتبِ اہلبیتؑ میں دیدارِ خدا کی نفی

رسولِ اکرمؐ کے اوصیاء نے رؤیتِ الٰہی کی نفی کے لئے دو قسم کی رہنمائی فرمائی۔ انہوں نے امتِ اسلامیہ کو یہ پیغام دیا کہ خدا کو دیکھنا محال اور ناممکن ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مکتبِ خلفاء کے غلط دلائل کا بھی جواب دیا۔ ہم بطورِ نمونہ یہاں دونوں طرح کی رہنمائی پر مشتمل احادیث میں سے ایک ایک روایت نقل کرتے ہیں۔

۱۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا

ایک حبر یعنی اہلِ کتاب کا ایک عالم امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے کہا: آپ جس خدا کی عبادت کرتے ہیں کیا آپ نے اسے دیکھا بھی ہے؟

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: تجھ پر افسوس! میں اَن دیکھے خدا کی عبادت نہیں کرتا۔

اس نے کہا: آپ نے اسے کیسے دیکھا ہے؟

حضرت نے جواب میں فرمایا: تجھ پر افسوس! اسے آنکھیں اپنے ڈیلوں کے ذریعے سے نہیں دیکھ سکتیں لیکن دِل اسے حقائقِ ایمان کی وجہ سے دیکھتے ہیں۔[۱]

۲۔ امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا

شیخ الطائفہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

عَنْ صَفْوَانَ بْنِ یَحْیٰی اَنَّهٗ قَالَ: سَاَلَنِیْ اَبُوْقرۃَ الْمُحَدِّثُ اَنْ اُدْخِلَهٗ عَلٰی اَبِی الْحَسَنِ الرِّضَاؑ فَاسْتَاْذَنْتُهٗ فِیْ ذٰلِکَ. فَاَذِنَ لِیْ. فَدَخَلَ عَلَیْهِ فَسَاَلَهٗ عَنِ الْحَلَالِ وَ الْحَرَامِ وَالْاَحْکَامِ حَتّٰی بَلَغَ سُؤَالُهُ التَّوْحِیْدَ.

فَقَالَ اَبُوْقرۃ: اِنَّا رُوِیْنَا اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَسَّمَ الرُّؤْیَةَ وَالْکَلَامَ بَیْنَ اثْنَیْنِ فَقَسَّمَ لِمُوْسٰیؑ الْکَلَامَ وَ لِمُحَمَّدٍ الرُّؤْیَةَ.

فَقَالَ اَبُوالْحَسَنِ: فَمَنِ الْمُبَلِّغُ عَنِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اِلَی الْجِنِّ وَالْاِنْسِ "لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ. وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا. وَ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ." اَلَیْسَ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ؟

قَالَ: بَلٰی.

قَالَ: فَکَیْفَ یَجِیْءُ رَجُلٌ اِلَی الْخَلْقِ جَمِیْعًا فَیُخْبِرُهُمْ اَنَّهٗ جَاءَ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ وَاَنَّهٗ یَدْعُوْهُمْ اِلَی اللّٰهِ بِاَمْرِاللّٰهِ وَیَقُوْلُ: "لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ" وَ "لَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا" وَ "لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ" ثُمَّ یَقُوْلُ اَنَا رَاَیْتُهٗ بِعَیْنِیْ وَ اَحَطْتُّ بِهٖ عِلْمًا وَهُوَ عَلٰی صُوْرَةِ الْبَشَرِ؟

اَمَا تَسْتَحْیُوْنَ؟ مَا قَدَرَتِ الزَّنَادِقَةُ اَنْ تَرْمِیَهٗ بِهٰذَا اَنْ یَکُوْنَ یَاْتِیْ عَنِ اللّٰهِ بِشَیْءٍ ثُمَّ یَاْتِیْ

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب ماجآء فی الرؤیۃ، ص۱۰۹، حدیث۶۔

بِخِلافِهِ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ.

قَالَ اَبُوقُرة: فَاِنَّهُ يَقُوْلُ! "وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى" (سورۂ نجم: آیت ۱۳)

فَقَالَ اَبُوالْحَسَنِ: اِنَّ بَعْدَ هٰذِهِ الْاٰيَةِ مَا يَدُلُّ عَلٰى مَارَاٰى حَيْثُ قَالَ: "مَاكَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰى" (سورۂ نجم: آیت ۱۱) يَقُوْلُ: مَا كَذَبَ فُؤَادُ مُحَمَّدٍ مَارَاَتْ عَيْنَاهُ.

ثُمَّ اَخْبَرَ بِمَا رَاٰى فَقَالَ: "لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى" (سورۂ نجم: آیت ۱۸) فَاٰيَاتُ اللّٰهِ غَيْرُ اللّٰهِ. وَقَدْ قَالَ: "وَلَايُحِيطُوْنَ بِهِ عِلْمًا" فَإِذَا رَاَتْهُ الْاَبْصَارُ فَقَدْ اَحَاطَتْ بِهِ الْعِلْمُ وَ وَقَعَتِ الْمَعْرِفَةُ.

فَقَالَ اَبُوقُرة: اَتُكَذِّبُ بِالرِّوَايَاتِ؟

فَقَالَ اَبُوالْحَسَنِ: اِذَا كَانَتِ الرِّوَايَاتُ مُخَالِفَةً لِلْقُرْآنِ كَذَّبْتُ بِهَا.[1]

صفوان بن یحییٰ نے کہا کہ مکتبِ خلفاء کے ایک محدّث ابوقرہ نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے لئے امام علی رضا علیہ السلام سے ملاقات کی اجازت حاصل کروں۔ میں نے امام عالیمقامؑ سے ان کے آنے کی اجازت طلب کی اور امامؑ نے انھیں اذنِ ملاقات مرحمت فرمایا۔

ابوقرہ امام علی رضاؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حلال وحرام اور احکام کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ اثنائے گفتگو میں مسئلہ توحید زیر بحث آیا۔

ابوقرہ نے کہا: ہم تک رسولِ خداؐ کی ایک حدیث پہنچی ہے کہ اللہ نے دیدار اور کلام کو دو انبیاءؑ میں تقسیم کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حصے میں کلام آیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصے میں دیدار آیا۔

یہ سن کر امام علی رضاؑ نے فرمایا: اچھا ذرا یہ تو بتاؤ کہ "لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُوَهُوَيُدْرِكُ الْاَبْصَارَ" آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ آنکھوں کا اِدراک کرتا ہے اور "وَلَايُحِيطُوْنَ بِهِ عِلْمًا" وہ علمی طور پر خدا کا اِحاطہ نہیں کرسکتے اور "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" کوئی چیز اس کی مانند نہیں ہے جیسی آیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان اور جنّات تک آنحضرتؐ نے نہیں پہنچائی تھیں؟

ابوقرہ نے کہا: جی ہاں! یہ آیات حضور نبی کریمؐ نے ہم تک پہنچائی ہیں۔

امام علی رضاؑ نے فرمایا: (ذرا انصاف سے بتاؤ) یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص لوگوں کے پاس آکر کہے کہ "مجھے خدا نے بھیجا ہے اور میں خدا کے حکم سے اس کی طرف دعوت دیتا ہوں" اور وہ کہے کہ "آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ آنکھوں کا اِدراک کرتا ہے" اور پھر کہے کہ اللہ کہتا ہے کہ "اس کا علمی اِحاطہ نہیں کیا جاسکتا" اور پھر کہے کہ وہ کہتا ہے کہ "وہ بے مثل و بے مثال ہے" یہ سب کچھ کہنے کے بعد اگر وہی شخص کہہ دے

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب ما جآء فی الرؤیۃ، ص ۱۱۰ تا ۱۱۲، حدیث ۹۔

کہ میں نے خدا کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور اُس کا علمی احاطہ کیا ہے اور یہ کہ اس کی صورت انسانوں کی سی ہے تو اس کے بارے میں تم کیا کہو گے؟[۱] کیا تمہیں ایسی بات کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ کیونکہ زنادقہ نے بھی رسولِ خداؐ پر یہ تہمت نہیں لگائی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے پیغام کچھ لاتے ہیں اور امت کو کچھ پہنچاتے ہیں۔

ابوقرۃ نے کہا: مگر خدا خود کہتا ہے: وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى. ''انہوں نے اسے دوسری بار دیکھا۔''[۲]

امام علی رضاؑ نے فرمایا: اس آیت سے مَاقبل و مابعَد جو آیات ہیں انہیں بھی تو پڑھو۔ اگر اس آیت کو اس کے سِیاق و سَباق میں رکھ کر پڑھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰى" اس آیت کا مقصد یہ ہے "مَا كَذَبَ فُؤَادُ مُحَمَّدٍ مَا رَاَتْ عَيْنَاهُ." جو کچھ (حضرت) محمدؐ کی آنکھوں نے دیکھا، (حضرت) محمدؐ کے دل نے اسے نہ جھٹلایا اور اس کا انکار نہ کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ (حضرت) محمدؐ کی آنکھوں نے کیا دیکھا تھا۔ چنانچہ فرمایا "لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى. یعنی (حضرت) محمدؐ نے خدا کی بہت بڑی نشانیاں ملاحظہ فرمائیں۔ رسولِ خداؐ نے اللہ تعالیٰ کی عظیم آیات دیکھیں نہ کہ اللہ کو دیکھا کیونکہ اللہ کی نشانیاں — اَور ہیں اور — اللہ اور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''لوگ اللہ کا علمی اِحاطہ نہیں کر سکتے'' اور اگر آنکھیں اللہ کو دیکھ لیں تو اس کا احاطہ ہو جائے گا۔

ابوقرہ نے کہا: تو کیا آپ اس سلسلے کی روایات کی تکذیب کرتے ہیں؟

امام علی رضاؑ نے فرمایا: اگر روایات قرآن مجید کے خلاف ہوں گی تو میں ان کی تکذیب ہی کروں گا۔

مذکورہ روایات کا تجزیہ اور موازنہ

یہاں ہم رؤیت کی دو قسموں (۱) رسولِ اکرمؐ نے خدا کو دیکھا تھا اور (۲) قیامت کے دن اُمّتِ رسولؐ بھی خدا کا دیدار کرے گی کا تجزیہ کریں گے۔

شبِ معراج کیا حضورِ اکرمؐ نے اللہ کا دیدار کیا تھا؟ اس کے متعلق مکتبِ خلفاء کی روایات اور نظریات میں تضاد پایا جاتا ہے اور اس سلسلے کی ایک روایت وہ ہے جو کعب الاحبار سے مروی ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو کلام سے سرفراز کیا اور حضرت محمدؐ کو دیدار سے مشرف کیا۔

۱۔ مکتبِ خلفاء کے پیروکار بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے خدا کو ایک جوان کی صورت میں دیکھا۔

۲۔ مکتبِ خلفاء کے پیروکار "رَاٰهُ" کی ضمیر کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی لئے وہ اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ ''رسولِ اکرمؐ نے خدا کو دیکھا'' جبکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''رسولِ اکرمؐ نے اسے دیکھا۔'' اسی لئے ابوقرہ نے اپنے موقف کے استدلال کے لئے اس آیت کو امام علی رضا علیہ السلام کے سامنے پیش کیا تھا۔

قیامت کے دن امتِ رسولؐ کو اللہ کا دیدار نصیب ہوگا۔ اس سلسلے کے لئے ہم مکتبِ خلفاء کی ایک مفصل اور صحیح حدیث اپنے قارئین کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور اس روایت میں ابوہریرہؓ نے رسولِ خداؐ کی زبانی یہ الفاظ کہے تھے کہ جس طرح سے تم بادل کے بغیر سورج کو دیکھتے ہو اور جس طرح سے تم بادلوں کے بغیر چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہو اسی طرح سے تم اپنے خدا کو بھی دیکھو گے اور قیامت کے دن ہر شخص اپنے معبود کے پیچھے چلے گا اور دوزخ میں پہنچ جائے گا اور پھر جب عرصۂ محشر میں صرف امتِ رسولؐ ٹھہری ہوئی ہوگی تو اس وقت اللہ تعالیٰ ایک ایسی شکل وصورت میں آئے گا کہ جسے وہ نہیں پہچانتے ہوں گے اور ان سے کہے گا کہ میں تمہارا خدا ہوں۔ اس وقت امتِ رسولؐ یہ کہے گی کہ ہم تیرے شر سے بچنے کے لئے خدا کی پناہ چاہتے ہیں۔ ہم اپنے خدا کی آمد تک یہیں کھڑے رہیں گے اور جب ہمارا خدا آئے گا تو ہم اسے اچھی طرح سے پہچان لیں گے۔

اس کے بعد خدا ان کے پاس اس شکل وصورت میں آئے گا جسے وہ پہچانتے ہوں گے اور وہ آکر ان سے کہے گا کہ میں تمہارا خدا ہوں۔ امتِ رسولؐ اسے پہچان لے گی اور کہے گی کہ بے شک تو ہی ہمارا خدا ہے۔ پھر وہ خدا کے پیچھے چل پڑیں گے اور جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

روایت کے آخر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص عرصۂ محشر میں باقی رہ جائے گا جس کا چہرہ دوزخ کی طرف ہوگا۔ پھر وہ خدا کو دھوکہ فریب دے کر جنت کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائے گا اور جب وہ جنت کے دروازے پر پہنچے گا تو اپنی باتوں سے خدا کو ہنسا دے گا اور جب خدا ہنسے گا تو اسے جنت میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے گی۔

پھر جب وہ جنت میں داخل ہوگا تو اس سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تیری تمنا ہو وہ بیان کر۔ جب وہ اپنی تمام دلی تمنائیں بیان کردے گا تو اسے ندائے قدرت سنائی دے گی کہ ہم نے تجھے تیری تمناؤں سے دوگنی نعمتیں عطا کی ہیں۔

درج بالا روایت کو صحیح سمجھنے والوں سے ہماری درخواست ہے کہ خدارا ہمیں ان سوالات کے جواب دے کر مطمئن فرمائیں۔

۱۔ اس روایت میں ابوہریرہؓ نے بیان کیا ہے کہ ''خدا اپنی شکل وصورت بدل کر میدانِ حشر میں آئے گا'' کیا خدا کسی ڈرامے کا کردار ہے کہ وہ ہر بار شکل وصورت بدل کر آتا ہے؟ (نعوذ باللہ)

۲۔ ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ''پھر خدا اُس شکل وصورت میں آئے گا جسے وہ جانتے پہچانتے ہوں گے'' اس جملے سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ اس ملاقات سے قبل لوگ اللہ تعالیٰ کو دیکھ چکے ہوں گے۔ ہم برادرانِ اہلسنت سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں بھی بتائیں کہ اس کی شکل وصورت کیسی ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی

بتائیں کہ انہوں نے خدا کو کب دیکھا ہے؟ بچپنے میں یا بڑھاپے میں، رات میں یا دن میں، گھر میں یا مسجد میں، بیداری میں یا نیند میں؟

۳۔ کیا خدا انسانوں جیسا جسم رکھتا ہے اور کیا اس کی مخصوص شکل وصورت ہے؟ اور وہ آگے چلنے لگتا ہے اور مکتبِ خلفاء کے پیروکار اس کے پیچھے چلنے لگتے ہیں؟

۴۔ کیا خدا کو ہنسی بھی آتی ہے اور کیا خدا کسی مکّار کے ہتھے بھی چڑھ جاتا ہے؟ اور یہ کیا بات ہوئی کہ ایک فریبی اور مکّار نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے خدا کو ہنسا دیا اور جنت میں چلا گیا؟ اگر یہ بات سچ ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ حسابِ قیامت کیا ہے اور اعمال کے ثواب وعقاب کا کیا مفہوم ہے؟

قارئینِ کرام! سچ تو یہ ہے کہ اس جیسے بے سروپا افسانے تحریف شدہ توراۃ وانجیل میں بھی نہیں ہیں۔ ایسے افسانے بوڑھی عورتیں سردیوں کی لمبی راتوں میں اپنے پوتے پوتیوں کو سنا کر ان کا دل بہلایا کرتی ہیں جبکہ بوڑھی عورتوں کے افسانوں کا ''ہیرو'' خدا نہیں ہوتا اور ابوہریرہؓ کے بیان کردہ بے سروپا افسانوں کا ''ہیرو'' خدا ہے۔

آہ! اس سے بڑھ کر اسلام کی بیچارگی اور کیا ہوسکتی ہے کہ علمائے حدیث نے اس طرح کے بے سروپا قصوں کو کتبِ حدیث میں ''کتابُ الایمان'' اور ''کتابُ التوحید'' کے زیرِ عنوان نقل کیا ہے اور ایسی بے سروپا روایات کو صحیح ماننے کی وجہ سے سلفی اور وہابی فرقے خدا کی تجسیم کا عقیدہ رکھنے پر مجبور ہوگئے۔

اوصیائے پیغمبرؐ نے امتِ اسلامیہ کو اس گمراہی سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی اور رسولِ اکرمؐ کے پہلے وصی امام علی علیہ السلام نے یہ کہہ کر رویتِ خدا کی نفی کردی کہ خدا کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا، ہاں حقائقِ ایمان سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح سے امام علیؑ نے امت کو یہ پیغام دیا کہ جہاں کہیں بھی ''رویتِ باری تعالیٰ'' کا ذکر دکھائی دے تو اس سے بصارت کی بجائے بصیرت مقصود ہے۔

امام علی رضا علیہ السلام کی حدیث کی روشنی میں ہم یہ کہتے ہیں:

''دیکھا جانا'' مادّی اجسام کا خاصہ ہے اور جو چیزیں مادّی نہ ہوں انہیں دیکھا نہیں جاسکتا۔ مثلاً روح کو نہیں دیکھا جاسکتا۔ اسی طرح سے بجلی کی قوت کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ روح اور بجلی کی قوت کو دیکھنا محال ہے۔ البتہ ان کے آثار دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہم بجلی کی قوت کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ برقی چراغ کے ذریعے سے اس کی روشنی کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کے ذریعے سے دیوہیکل مشینوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح سے ہم روح کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے البتہ جانداروں کو روح کی قوت سے چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ۔ جَلَّتْ عَظَمَتُہٗ۔ جسم نہیں ہے اس لئے ہم اسے مادّی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔

البتہ ہم اس کے آثارِ قدرت وعلم وحکمت کو ضرور دیکھ سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہم اس کی دیگر صفاتِ ربوبیت کا بھی مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

اسی طرح سے ہم نے امام علی رضا علیہ السلام کے متعلق یہ روایت بھی نقل کی کہ جب ان کے سامنے مکتبِ خلفاء کے ایک نامور محدث نے یہ کہا کہ روایات میں مذکور ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو شرفِ تکلم بخشا اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کو دیدار سے مشرف فرمایا تو امامِ عالیمقامؑ نے ان کے نظریے اور ان کی بیان کردہ روایت کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بتاؤ کہ انسانوں اور جنوں تک خدا کا یہ پیغام کس نے پہنچایا ہے کہ اللہ نے فرمایا:

(۱) آنکھیں اس کا اِدراک نہیں کرسکتیں جبکہ وہ آنکھوں کا اِدراک کرتا ہے۔

(۲) مخلوق اس کے وجودِ مقدس کے اِدراک سے قاصر ہے۔

(۳) کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہے۔

کیا یہ تینوں آیات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں پہنچائی تھیں؟ اور جب تینوں آیات آنحضرتؐ نے ہی مخلوقِ خدا تک پہنچائی ہیں تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خود لوگوں سے یہ کہیں کہ میں خدا کا سفیر بن کر تمہیں اس کا یہ پیغام پہنچا رہا ہوں کہ ''آنکھیں اس کے اِدراک سے قاصر ہیں، علمِ خَلق اس کے احاطے سے عاجز ہے اور وہ کسی کی مثل نہیں ہے'' اور مذکورہ پیغامات پہنچانے کے بعد وہ یہ کہیں کہ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ انسانی شکل وصورت رکھتا ہے؟

زندیق اپنی تمام تر گمراہیوں کے باوجود بھی رسولِ اکرمؐ پر آج تک یہ الزام نہیں لگا سکے کہ آپؐ خداوندِ عالم کی طرف سے کچھ کہتے ہیں اور اپنی طرف سے کچھ اور کہتے ہیں۔

مکتبِ خلفاء کے محدّث کو مجبور ہوکر یہ کہنا پڑا کہ کیا آپ روایات کی تکذیب کرتے ہیں؟ یعنی دیدارِ خداوندی کے متعلق تو ہمارے ہاں بہت سی روایات پائی جاتی ہیں تو کیا آپ ان تمام روایات کو جھٹلاتے ہیں؟

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا: جب (تمہاری) روایات قرآن کے برخلاف ہوں گی تو میں انہیں ضرور جھٹلاؤں گا۔

مؤلف کہتا ہے کہ حضرت کی یہ حدیث اتنی جامع ہے کہ اس کی تشریح کے لئے پوری ایک کتاب درکار ہے لیکن میں یہاں چند نکات بیان کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں:

۱۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی پیمانہ ہوتا ہے جس سے اشیاء کی کمی بیشی وغیرہ معلوم کی جاتی ہے۔ ٹھوس اشیاء کے وزن کے لئے ایک مخصوص ترازو ہوتا ہے۔ کپڑے وغیرہ کا ترازو گز یا میٹر ہے۔ مائع اشیاء کا ترازو لیٹر ہے۔ گرمی سردی ماپنے کے لئے تھرمامیٹر ہوتا ہے۔ اشعار کے وزن کے لئے علم عروض کی بحریں ہوتی ہیں۔ غرضیکہ ہر

چیز کو جانچنے کے لئے میزان کا ہونا ضروری ہے۔ اگر میزان ٹوٹ جائے تو غلط چیز صحیح چیز کی جگہ لے لیتی ہے اور معاشرے میں ابتری پھیل جاتی ہے۔

چشمِ فلک گواہ ہے کہ رسول الثقلینؐ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کی سعادت کے لئے "ثقلین" [۱]

۱۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

(۱) یَاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ تَرَکْتُ فِیکُمْ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ بِہٖ لَنْ تَضِلُّوا، کِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ.

دیکھئے صحیح ترمذی، ج۵، ص۳۲۸، حدیث۳۸۷۴، مطبوعہ دارالفکر بیروت اور ج۱۳، ص۱۹۹، مطبوعہ الصاوی مصر اور ج۲، ص۳۰۸، طبع بولاق مصر. نظم دررالسمطین زرندی حنفی، ص۳۲۳، مطبوعہ القضاء نجف، ینابیع المودۃ، سلیمان ابراھیم قندوزی حنفی، ص۳۳، ۴۵، ۴۴۵، مطبوعہ الحیدریہ، اور ص۳۰، ۴۱، ۳۷۰، طبع استنبول. کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برھانپوری، ص۴۴، جلداول، طبع اول، اور ص۱۵۳، طبع دوم. تفسیرابن کثیر، ج۴، ص۱۱۳، مطبوعہ دار احیاء الکتب العربیہ مصر. مصابیح السنہ، بغوی، ص۲۰۶، طبع قاھرہ. اور ج۲، ص۲۷۹، مطبوعہ محمد علی صبیح. جامع الاصول، ابن اثیر جزری، ج۱، ص۱۸۷، حدیث۶۵، طبع مصر. معجم الکبیر، ابوالقاسم سلیمان بن احمد خمی طبرانی، ص۱۳۷. مشکوۃ المصابیح، ج۳، ص۲۵۸، طبع دمشق. فصل الخطاب (مخطوط)، خواجہ محمد بخاری حنفی. احیاء المیت، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، برحاشیہ الاتحاف بحب الاشراف، ص۱۱۴، مطبوعہ الحلبی. مفتاح النجا (مخطوط)، بدخشی، الفتح الکبیر، نبھانی، ج۱، ص۵۰۳، مطبوعہ دارالکتب العربیہ، اور ج۳، ص۳۸۵، طبع مصر، ارجح المطالب، شیخ عبیداللہ امرتسری حنفی، ص۳۳۶، طبع لاھور. رفع اللبس والشبھات، ادریسی، ص۱۱و۱۵، طبع مصر. السیف الیمانی المسلول، ص۱۰، مطبوعہ الترقی دمشق۔

(۲) اِنِّیْ تَارِکٌ فِیکُمْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِہٖ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَحَدُھُمَا اَعْظَمُ مِنَ الْاٰخَرِ کِتَابَ اللّٰہِ حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ وَ عِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ وَلَنْ یَتَفَرَّقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ فَانْظُرُوْا کَیْفَ تَخْلُفُوْنِیْ فِیْھِمَا.

صحیح ترمذی، ج۵، ص۳۲۹، حدیث۳۸۷۶، مطبوعہ دارالفکر بیروت، اور ج۲، ص۳۰۸، مطبوعہ بولاق مصر، اور ج۱۳، ص۲۰۰، مطبوعہ مکتبہ الصاوی مصر. نظم دررالسمطین زرندی حنفی، ص۲۳۱، مطبوعہ القضا نجف. الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، ج۶، ص۷و۳۰۶، طبع مصر. ذخائر العقبی، ص۱۶، مطبوعہ مکتبۃ القدسی. الصواعق المحرقہ فی الرد علی اھل البدعۃ والزندقۃ، شھاب الدین ابن حجر مکی ھیثمی، ص۱۴۷و۲۲۶، مطبوعہ المحمدیہ، اور ص۸۹، مطبوعہ المیمنیہ مصر. ینابیع المودہ، سلیمان ابراھیم قندوزی حنفی، ص۳۳، ۴۰، ۲۲۶، ۳۵۵، مطبوعہ الحیدریہ، اور ص۳۰، ۳۶، ۱۹۱، ۲۹۶، طبع استنبول. معجم الصغیر، ابوالقاسم سلیمان بن احمد خمی طبرانی، ج۱، ص۱۳۵، مطبوعہ دارالنصرمصر. اسدالغابہ فی معرفۃ الصحابہ، ابن اثیر جزری شافعی، ج۲، ص۱۲، آفسٹ طبع مصر. تفسیرابن کثیر، ج۴، ص۱۱۳، مطبوعہ داراحیاء الکتب العربیہ مصر. عبقات الانوار، حامد حسین موسوی ہندی، ج۱، ص۲۵، طبع اصفھان. کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برھانپوری، ج۱، ص۴۴، حدیث۸۷۴، طبع اول، جلداول، طبع دوم، ص۱۵۴. الفتح الکبیر، نبھانی، ج۱، ص۴۵۱، مطبوعہ دارالکتب العربیہ مصر.

یعنی قرآن مجید اور اپنی عترت اہلبیتؑ کو بطور نعمت ہدایت چھوڑا تھا، انہیں ہمدوش اور شناخت اسلام کا ترازو قرار دیا تھا تا کہ امت گمراہی سے بچی رہے مگر مسلمانوں کی اکثریت نے عترت کو شناخت اسلام کے ترازو کے طور پر قبول نہیں کیا۔ البتہ قرآن کے ترازو ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

تفسیرالخازن، علاؤالدین علی بن محمد بغدادی، ج۱، ص۴، مطبوعه مصطفی محمدمصر. مصابیح السنه، بغوی، ص۲۰۶، مطبوعه الخیریه مصر، اور ج۲، ص۲۷۹، مطبوعه محمد علی صبیح مصر. الجمع بین الصحاح (مخطوط)، عبدری. جامع الاصول، ابن اثیرجزری، ج۱، ص۱۸۷، حدیث۶۶، طبع مصر. المنتقی فی سیرة المطفیؐ (مخطوط)، شیخ سعید شافعی. علم الکتاب، سید خواجه حنفی، ص۲۶۴، طبع دهلی. منتخب تاریخ، ابوالقاسم علی بن حسن المعروف به ابن عساکر دمشقی شافعی، ج۵، ص۴۳۶، طبع دمشق. مشکوٰة المصابیح، عمری، ج۳، ص۲۵۸، طبع دمشق (بحواله احقاق الحق، ج۹). تیسیر الوصول ابن دیبع، ج۱، ص۱۶، مطبوعه نول کشور، لکهنؤ. التاج الجامع للاصول، ج۳، ص۳۰۸، طبع قاهره. رقع اللبس والشبهات، ص۵۲، طبع مصر. ارجح المطالب، شیخ عبدالله امرتسری حنفی، ص۳۳۶، طبع لاهور. السیف الیمانی المسلول، ص۱۰، مطبوعه ترقی دمشق.

(۳) اِنِّیْ تَارِکٌ فِیکُمْ خَلِیْفَتَیْنِ: کِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مَا بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ _ اَوْ مَا بَیْنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ _ وَعِتْرَتِیْ اَهْلُ بَیْتِیْ، وَاِنَّهُمَا لَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ.

مسنداحمد بن حنبل، ج۵، ص۱۸۲و۱۸۹، مطبوعه المیمنیه. تفسیر درمنثور، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، ج۲، ص۶۰، طبع مصر. احیاء المیت، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، برحاشیه الاتحاف بحب الاشراف، ص۱۱۶، مطبوعه الحلبی مصر. ینابیع الموده، سلیمان ابراهیم قندوزی حنفی، ص۳۸و۲۱۷، طبع استنبول، اور ص۴۲، ۲۱۷، مطبوعه الحیدریه. مجمع الزوائد و منبع الفوائد، حافظ نورالدین علی بن ابی بکر هیثمی شافعی، ج۹ ص۱۶۲، مطبوعه القدسی. کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برهانپوری، ج۱، ص۴۴، حدیث ۸۷۳، طبع اول، اور ج۱، ص۱۵۴، طبع دوم. عبقات الانوار، حامد حسین موسوی هندی،ج۱، ص۱۶، طبع اصفهان. جامعه الصغیر، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، ج۱، ص۳۵۳، طبع مصر. کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برهانپوری، ج۱، ص۱۵۴، حدیث۸۷۳، ۹۴۸، طبع دوم. مفتاح النجا (مخطوط)، بدخشی، ص۹. فتح الکبیر، نبهانی، ج۱، ص۴۵۱، مطبوع دارالکتب مصر. ارجح المطالب، شیخ عبدالله امرتسری حنفی، ص۳۳۵، طبع لاهور.

(۴) اِنِّیْ تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَیْنِ: کِتَابُ اللّٰهِ وَاَهْلُ بَیْتِیْ، وَاِنَّهُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ.

مستدرک علی الصحیحین، محمد بن عبدالله حاکم نیشاپوری، ج۳، ص۱۴۸، طبع حیدرآباد دکن. تلخیص المستدرک، ذهبی، بذیل المستدرک، مناقب علی ابن ابی طالبؑ، شیخ علی بن محمد بن مغازلی شافعی، ص۲۳۴، حدیث۲۸۱، طبع اول تهران. المناقب، خطیب خوارزمی حنفی، ص۲۲۳، مطبوعه حیدریه. فرائد السمطین، حموینی شافعی، ج۲، باب۳۳، وَعِتْرَتِیْ اَهْلُ بَیْتِیْ کے بعد یہ الفاظ ہیں: اَلَا وَهُمَا الْخَلِیْفَتَانِ مِنْ بَعْدِیْ (مخطوط).

ہم نے سابقہ تمام مباحث میں اس امر کا مشاہدہ کیا ہے کہ مکتب خلفاء سے وابستہ علماء نے قرآن کو روایات کا ترازو نہیں بنایا بلکہ قرآن کو روایات کے ترازو میں تولنے کی کوششیں کی ہیں۔ انہوں نے تأویلِ قرآن کے لئے اپنی روایات پر انحصار کیا ہے اور اس کوشش میں یہ دیکھنے کی کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ یہ عقیدہ اور یہ مطلب آیاتِ قرآن اور مزاجِ قرآن کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔

---

(۵) اِنِّیْ اُوْشِکُ اَنْ اُدْعٰی، فَاُجِیْبَ وَاِنِّیْ تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَیْنِ: کِتَابَ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَعِتْرَتِیْ کِتَابُ اللّٰہِ حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ... الخ.

مسند احمد بن حنبل، ج۳، ص۱۷، ۲۶، مطبوعه المیمنیه مصر. کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برهانپوری، ج۱، ص۴۷، طبع اول، جلداول، ص۱۶۵، حدیث۹۴۵، طبع دوم، مناقب علی بن ابی طالبؑ. شیخ علی بن محمد بن مغازلی شافعی، ص۲۳۵، حدیث۲۸۳، طبع اول تهران. الصواعق المحرقه فی الرد علی اهل البدعة والزندقه، شهاب الدین ابن حجر مکی هیثمی، ص۱۴۸، مطبوعه المحمدیه، اس اشاعت میں لَمْ یَفْتَرِقَا ہے جبکہ طبع اول، ص۸۹، مطبوعه المیمنیه مصر میں لفظ لَنْ یَّفْتَرِقَا لکھا ہے۔ ذخائر العقبی، ص۱۶، مطبوعه مکتبة القدسی اور دارالمعرفه. اسعاف الراغبین، محمد علی صبان مصری شافعی حاشیه بر نورالابصار، ص۱۰۸، مطبوعه السعیدیه مصر، اور ص۱۰۱، مطبوعه العثمانیه مصر. ینابیع المودة، سلیمان ابراهیم قندوزی حنفی، ص۳۵، ۴۰، ۳۵۵، ۲۲۶، مطبوعه الحیدریه، اور ص۳۱، ۳۶، ۱۹۱، ۲۶۹، طبع استنبول. السیرة النبویة، مفتی مکه احمد زینی دحلان شافعی، برحاشیه السیرة الحلبیة، ج۳، ص۳۳۱، مطبوعه البهیة مصر. المعجم الصغیر، ابوالقاسم سلیمان بن احمد خمی طبرانی، ج۱، ص۱۳۱، مطبوعه دارالنصر مصر، اور ص۷۳، طبع دهلی. مقتل الحسین، خطیب خوارزمی حنفی، ج۱، ص۱۰۴، مطبوعه الزهرا. مجمع الزوائد و منبع الفوائد، حافظ نورالدین علی بن ابی بکر هیثمی شافعی، ج۹، ص۱۶۳، مطبوعه القدسی. احیاء المیت، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، برحاشیه الاتحاف بحب الاشراف، ص۱۱۱، مطبوعه الحلبی. طبقات الکبری، محمد بن سعد بصری، ج۲، ص۱۹۴، مطبوعه دارصادر بیروت. اور ج۲، ق۲، ص۲، طبع لیڈن. جامع الاصول، ابن اثیر جزری، ج۱، ص۱۸۷، مطبوعه السنة المحمدیة. رموز الاحادیث، شیخ احمد حنفی، ص۱۴۴، مطبوعه الاستانة. ارجح المطالب، شیخ عبدالله امرتسری حنفی، ص۱۳۶، طبع لاهور. الانوار المحمدیه، نبهانی، ص۴۳۵، مطبوعه الادبیه بیروت.

(۶) کَاَنِّیْ دُعِیْتُ فَاَجَبْتُ اِنِّیْ قَدْ تَرَکْتُ فِیکُمُ الثَّقَلَیْنِ، اَحَدُهُمَا اَکْبَرُ مِنَ الْاٰخَرِ: کِتَابُ اللّٰہِ تَعَالٰی وَعِتْرَتِیْ... الخ (خطبۂ غدیر)

مستدرک علی الصحیحین، محمد بن عبدالله حاکم نیشاپوری، ج۳، ص۱۰۹، طبع حیدرآباد دکن. تلخیص المستدرک، ذهبی، بذیل المستدرک. خصائص امیرالمومنین، حافظ ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب نسائی شافعی، ص۲۱، مطبوعه التقدم مصر. اور ص۹۳، مطبوعه الحیدریه. اور ص۳۵، طبع بروت. المناقب، خطیب خوارزمی حنفی، ص۹۳، مطبوعه الحیدریه. الصواعق المحرقه فی الرد علی اهل البدعة والزندقه، شهاب الدین ابن حجر مکی هیثمی، ص۱۳۶، مطبوعه المیمنیه مصر. اور ص۲۲۶، المحمدیه مصر. ینابیع المودة، سلیمان ابراهیم قندوزی حنفی، ص۳۲، طبع استنبول. اور ص۳۶، مطبوعه الحیدریه. الغدیر فی الکتاب والسنة والادب، علامه عبدالحسین احمد امینی، ج۱، ص۳۰، طبع بیروت. کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برهانپوری، ج۱، ص۱۶۷، حدیث۹۵۴، اور ج۱۵، ص۹۱، حدیث۲۵۵، طبع دوم.

ان لوگوں نے ابوہریرہؓ اور اس کے ہم مشرب افراد کی روایات کو اپنے لئے ترازو کا درجہ دے رکھا ہے جبکہ اصولی طور پر ان کی روایات قابلِ اعتماد نہیں ہیں اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ابوہریرہؓ کی روایات کو سنّتِ نبویؐ کہہ کر متعارف کرایا گیا اور اس سنّت سے تمسک کی وجہ سے ان لوگوں نے اپنے آپ کو اہلسنت کا نام دیا۔

---

(۷) اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ؟ قَالُوْا: بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ. قَالَ: فَاِنِّیْ سَائِلُکُمْ عَنِ اثْنَیْنِ اَلْقُرْآنِ، وَعِتْرَتِیْ.

مجمع الزوائد و منبع الفوائد، حافظ نورالدین علی بن ابی بکر هیثمی شافعی، ج۵ ص۱۹۵، مطبوعه القدسی. اسدالغابه فی معرفة الصحابه، ابن اثیر جزری، ج۳، ص۱۴۷، طبع مصر. احیاء المیت، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، برحاشیه الاتحاف بحب الاشراف، ص۱۱۵، مطبوعه الحلبی مصر. عبقات الانوار، حامد حسین موسوی هندی، ج۲، مجلد۱۲، ص۶۲۵.

(۸) اَیُّهَا النَّاسُ یُوْشِکُ اَنْ اُقْبَضَ قَبْضًا سَرِیْعًا، فَیُنْطَلَقُ بِیْ، وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمُ الْقَوْلَ مَعْذِرَةً اِلَیْکُمْ، اَلَا اِنِّیْ مُخْلِفٌ فِیْکُمْ کِتَابَ اللّٰهِ (رَبِّیْ) عَزَّوَجَلَّ، وَعِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ، پھر آنحضرت نے حضرت علیؑ کا ہاتھ بلند کیا اور فرمایا: هٰذَا عَلِیٌّ مَّعَ الْقُرْآنِ، وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِیٍّ، لَا یَفْتَرِقَانِ حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ...الخ.

الصواعق المحرقه فی الرد علی اهل البدعة والزندقه، شهاب الدین ابن حجر مکی هیثمی، ص۱۲۴، اور ص۷۵، مطبوعه المیمنیه مصر. ینابیع الموده، سلیمان ابراهیم قندوزی حنفی، ص۲۸۵، طبع استبول. اور ص۳۴۲، مطبوعه الحیدریه.

(۹) اَیُّهَا النَّاسُ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ رَسُوْلُ رَبِّیْ فَاُجِیْبَ، وَاَنَا تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ: اَوَّلُهَا کِتَابُ اللّٰهِ فِیْهِ الْهُدٰی وَالنُّوْرُ فَخُذُوْا بِکِتَابِ اللّٰهِ وَاسْتَمْسِکُوْا بِهٖ فَحَثَّ عَلٰی کِتَابِ اللّٰهِ فِیْهِ وَرَغَّبَ فِیْهِ، ثُمَّ قَالَ: وَاَهْلُ بَیْتِیْ، اُذَکِّرُکُمُ اللّٰهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ، اُذَکِّرُکُمُ اللّٰهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ، اُذَکِّرُکُمُ اللّٰهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ.

صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضائل علی بن ابی طالبؑ، ج۲، ص۳۶۲، مطبوعه عیسی الحلبی، اور ج۷، ص۱۲۲، مطبوعه محمد علی صبیح، اور ج۱۵، ص۱۷۹، ۱۸۰، درشرح نووی، طبع مصر. مصابیح السنة بغوی شافعی، ج۲ ص۲۷۸، مطبوعه محمد علی صبیح، اور ج۲، ص۲۰۵، مطبوعه الخیریه مصر. نظم درر المسطین، زرندی حنفی، ص۲۳۱، مطبوعه القضاء نجف. تفسیر الخازن، علاؤالدین علی بن محمد بغدادی، ج۱، ص۴، مطبوعه مصطفی محمد. تفسیر ابن کثیر، ج۴، ص۱۱۳، طبع دوم، داراحیاء الکتب العربیه. مشکوٰة المصابیح، عمری، ج۳، ص۲۵۵، طبع دمشق. اور ص۵۶۸، طبع دهلی. اسعاف الراغبین صبان شافعی برحاشیه نورالابصار، ص۱۰۰، مطبوعه العثمانیه. اور ص۱۰۸، مطبوعه السعیدیه. ینابیع الموده، سلیمان ابراهیم قندوزی حنفی، ص۲۹، ۱۹۱، ۲۹۶، طبع استنبول. اور ص۲۳، ۲۲۶، ۳۵۵، مطبوعه الحیدریه. السیرة النبویه، مفتی مکه احمد زینی دحلان شافعی، برحاشیه سیرت حلبیه، ج۳، ص۳۳۰، مطبوعه البهیه مصر. الفتح الکبیر، نبهانی، ج۱، ص۲۵۲، مطبوعه داراحیاء الکتب العربیه مصر.

مکتبِ خلفاء — روایت پرستی کی رو میں اتنا بہہ گیا کہ اس نے قرآن کریم کی آیاتِ بینات کو نظرانداز کر دیا اور معارفِ الٰہی سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف روایات کو ہی حق و باطل کا ترازو قرار دیا۔

امام علی رضا علیہ السلام نے روایت پرست محدث کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی کہ جب روایات قرآن کے خلاف ہوں تو وہ قابل قبول نہیں ہوتیں۔ اسی لئے ایسی روایات کو چھوڑنے میں ہی

مناقب علی ابن ابی طالبؑ، شیخ علی بن محمد بن مغازلی شافعی، ص۲۳۶، حدیث۲۸۴، طبع اول تہران. الاتحاف بحب الاشراف شبراوی شافعی، ص۲، مطبوعه مصطفی الحلبی مصر. ذخائرعقبی، احمدبن عبداللّٰه محب طبری شافعی، ص۱۶، مطبوعه القدسی. کفایت الطالب فی مناقب علی ابن ابی طالبؑ، ابوعبداللّٰه محمد بن یوسف کنجی شافعی، ص۵۳، مطبوعه الحیدریه. اور ص۱۲، مطبوعه الغری.

(۱۰) اَلَا وَ اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ: اَحَدُهُمَا کِتَابُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ (اِلٰی اَنْ قَالَ الرَّاوِیْ عَنْ زَیْدِ بْنِ اَرْقَم) فَقُلْنَا مَنْ اَهْلُ بَیْتِهٖ؟ نِسَاؤُهٗ؟ قَالَ: لَا، وَاَیْمُ اللّٰهِ اِنَّ الْمَرْاَةَ تَکُوْنُ مَعَ الرَّجُلِ الْعَصْرَ مِنَ الدَّهْرِ ثُمَّ یُطَلِّقُهَا فَتَرْجِعُ اِلٰی اَبِیْهَا...الخ.

صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضائل علی ابن ابی طالبؑ، ج۲، ص۳۶۲، مطبوعه عیسی الحلبی، اور ج۷، ص۱۲۳، مطبوعه محمدعلی صبیح، اور ج۱۵، ص۱۸۱، طبع مصر، درشرح نووی. الصواعق المحرقه فی الرد علی اهل البدعة والزندقه، شهاب الدین ابن حجر مکی هیثمی، ص۱۴۸، مطبوعه المحمدیه مصر، اور ص۸۹، مطبوعه المیمنیه مصر،

(۱۱) مُشِیْرًا اِلَی الثَّقَلَیْنِ: اَلْقُرْآنُ وَ عِتْرَتُهٗ: فَلَا تُقَدِّمُوْهُمَا فَتَهْلِکُوْا، وَلَا تُقَصِّرُوْا عَنْهُمَا فَتَهْلِکُوْا، وَلَا تُعَلِّمُوْهُمْ فَاِنَّهُمْ اَعْلَمُ مِنْکُمْ.

الصواعق المحرقه فی الرد علی اهل البدعة والزندقه، شهاب الدین ابن حجر مکی هیثمی، ص۱۴۸، ۲۲۶، مطبوعه المحمدیه. اور ص۸۹، ۱۲۶، مطبوعه المیمنیه. مجمع الزوائد و منبع الفوائد، حافظ نورالدین علی بن ابی بکر هیثمی شافعی، ج۹، ص۱۶۳، طبع بیروت. ینابیع المودة، سلیمان ابراهیم قندوزی حنفی، ص۴۱، ۳۵۵، مطبوعه الحیدریه. اور ص۳۷، ۲۹۶، طبع استنبول. الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، ج۲، ص۶۰، طبع مصر. الغدیر فی الکتاب والسنة والادب، علامه عبدالحسین احمد امینی، ج۱، ص۳۴، اور ج۳، ص۸۰، طبع بیروت. کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برهانپوری، ج۱، ص۱۶۸، حدیث۹۵۸، طبع دوم.

اس حدیثِ متواترہ کے لئے مزید دیکھیں:

احقاق الحق، قاضی نوراللّٰه حسینی تستری شهید، ۹، ص۳۰۹-۳۷۵. فضائل الخمسه من الصحاح السته، علامه مرتضی حسینی فیروزآبادی، ج۲، ص۴۳-۵۶، طبع بیروت. شرح نهج البلاغه ابن ابی الحدید، ج۲، ص۱۳۰، طبع مصر اور ج۶، ص۳۷۵، طبع مصر، بتحقیق محمد ابوالفضل اور اضواء علی السنة المحمدیه شیخ محمد ابوریّه، ص۴۰۴، طبع سوم، دارالمعارف مصر. ترجمه الامام علی ابن ابی طالبؑ من تاریخ مدینة الدمشق، ابوالقاسم علی بن حسن المعروف به ابن عساکر دمشقی شافعی، ج۲، ص۳۶، حدیث ۵۳۴، ۵۴۵. انساب الاشراف، احمد بن یحیی بن جابر بلاذری، ج۲، ص۱۱۰، طبع بیروت.

عافیت ہے اور اس کے برعکس ان روایات کو فوقیت دے کر قرآن کو ان کے پیچھے چلانے کی ہر کوشش گمراہی اور بے دینی ہے۔ اس لئے امتِ اسلامیہ کو یہ رَوِش اختیار نہیں کرنی چاہئے۔

اس کے ساتھ امام عالیمقامؑ نے تمام امتِ اسلامیہ کو اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ جب آیاتِ قرآنی میں تشابُہ دکھائی دے تو مسلمانوں کو دوسری ترازو یعنی عترت اہلبیتؑ کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاکہ آیاتِ متشابہات کی تأویل رَاسِخِین فِی العلم سے حاصل ہو سکے۔

سورہ نجم کی مذکورہ آیات سے امام علیہ السلام نے جس خوبصورتی کے ساتھ استدلال فرمایا وہ یقیناً ان کا ہی حصہ تھا اور ان کا استدلال زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ لوگو آؤ دیکھو علومِ قرآن کے وارث ایسے ہوتے ہیں۔

۲۔ امامِ عالیمقامؑ نے سائل کو اسی جانب توجہ دلائی کہ وہ اور ان کے ہم عقیدہ افراد اس طرح کے عقائد کو رواج دے کر نہ صرف سنّتِ پیغمبرؐ کی کوئی خدمت نہیں کر رہے بلکہ ان کی مقدس شخصیت کو بھی داغدار بنا رہے ہیں اور ان پر تضاد بیانی کا الزام لگا رہے ہیں۔

۳۔ آپ نے اپنے جواب سے واضح کیا کہ مکتبِ خلفاء کے پیروکار جھوٹی احادیث کی نشر و اشاعت سے زنادقہ اور دیگر دشمنانِ اسلام سے بھی زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔

۴۔ آپ نے اپنے واضح اور غیر مبہم جواب سے امتِ اسلامیہ کو یہ درس دیا کہ رؤیتِ خداوندی کی جملہ روایات پیغمبرِ اکرمؐ پر تہمت و افترا ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مکتبِ خلفاء کے مُسلّمہ عقیدے کو اس طرح سے کھلے عام چیلنج کرنا وصیٔ رسولؐ کو ہی زیب دیتا تھا۔ اس سے قبل ہم نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے متعلق یہ پڑھا تھا کہ انہوں نے مکتبِ خلفاء کے کچھ نظریات کو مسترد کرتے ہوئے ہاتھ سر پر رکھا اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلیٰ کہہ کر خدا کی تنزِیہ بیان کی اور فرمایا جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں خدا اس سے پاک و پاکیزہ ہے۔

مکتبِ خلفاء میں رؤیت کی دو اقسام کی بحث کے بعد ہم ''اہلِ جنت کے ساتھ خدا کی ہم نشینی'' کے مسئلے کو واضح کریں گے اور اس ضمن میں رؤیتِ خداوندی سے متعلق تیسری قسم پر بھی بحث کریں گے۔ انشاء اللہ۔

لسان العرب، ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم المعروف ابن منظور افریقی، ج۱۳، ص۹۳، مطبوعہ بولاق مصر. نہایة الارب، نویری، ج۱۸، ص۳۷۷، مطبوعہ وزارة الثقافہ مصر. تاج العروس، محب الدین ابوالفیض سید محمد مرتضی حسینی واسطی زبیدی حنفی، ج۷، ص۲۴۵، مطبوعہ الخیریہ مصر. حلیة الاولیاء، حافظ ابونُعیم اصفہانی، ج۱، ص۳۵۵، مطبوعہ الساعدہ. القاموس، فیروز آبادی شافعی، ج۳، ص۳۴۲، مطبوعہ الحسینیہ مصر (مادہ ثقل). محمد و علی و بنوہ الاوصیاء عسکری، ج۱، ص۱۷۱ تا ۲۳۹، مطبوعہ الاداب. اور محمد و علی وحدیث الثقلین، ص ۱ تا ۱۲۷، مطبوعہ الاداب. کتاب حدیث الثقلین. محمد قوام الدین، طبع مصر.

دونوں مکاتبِ فکر میں خدا کی ہم نشینی کا مفہوم

مکتبِ خلفاء میں ہم نشینی کا عقیدہ

مکتبِ خلفاء کے منابع و مصادر میں ایسی بہت سی روایات وارد ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کو جنت میں خدا کا دیدار نصیب ہوگا۔ ذیل میں ہم اس مضمون کی چند روایات نقل کرتے ہیں:

(۱) جنت میں خدا کے دیدار اور اس کی ہم نشینی کا عقیدہ (معاذ اللہ) ابن ماجہ اور ترمذی نے اپنی اپنی سنن میں روایت کیا ہے کہ ابوہریرہؓ نے سعید بن مسیب سے کہا:

اَسْاَلُ اللّٰهَ اَنْ يَّجْمَعَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ فِيْ سُوْقِ الْجَنَّةِ. قَالَ سَعِيْدٌ: اَوَ فِيْهَا سُوْقٌ؟

قَالَ: نَعَمْ! اَخْبَرَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ. اِنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ اِذَا دَخَلُوْهَا، نَزَلُوْا فِيْهَا بِفَضْلِ اَعْمَالِهِمْ. فَيُؤْذَنُ لَهُمْ فِيْ مِقْدَارِ يَوْمِ الْجُمُعَةِ مِنْ اَيَّامِ الدُّنْيَا. فَيَزُوْرُوْنَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَ يُبْرِزُ لَهُمْ عَرْشَهٗ وَيتبدى لَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ. فَتُوْضَعُ لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ، وَمَنَابِرُ مِنْ لُؤْلُؤٍ، وَمَنَابِرُ مِنْ يَاقُوْتٍ، وَمَنَابِرُ مِنْ زَبَرْجَدٍ، وَمَنَابِرُ مِنْ ذَهَبٍ، وَمَنَابِرُ مِنْ فِضَّةٍ، وَ مَجْلِسُ اَدْنَاهُمْ —وَمَا فِيْهِمْ دَنِيٌّ— عَلٰى كُثْبَانِ الْمِسْكِ وَالْكَافُوْرِ، مَا يَرَوْنَ اَنَّ اَصْحَابَ الْكَرَاسِيِّ بِاَفْضَلَ مِنْهُمْ مَجْلِسًا.

قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ: قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ نَرٰى رَبَّنَا؟

قَالَ: نَعَمْ هَلْ تَتَمَارَوْنَ فِيْ رُؤْيَةِ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ؟

قُلْنَا: لَا.

قَالَ: كَذٰلِكَ لَا تَتَمَارَوْنَ فِيْ رُؤْيَةِ رَبِّكُمْ عَزَّوَجَلَّ وَلَا يَبْقٰى فِيْ ذٰلِكَ الْمَجْلِسِ اَحَدٌ اِلَّا حَاضَرَهُ اللّٰهُ مُحَاضَرَةً، حَتّٰى اَنَّهٗ يَقُوْلُ لِلرَّجُلِ مِنْكُمْ: اَلَا تَذْكُرُ —يَا فُلَانُ— يَوْمَ عَمِلْتَ كَذَا وَكَذَا (يُذَكِّرُهٗ بَعْضَ غَدَرَاتِهٖ فِي الدُّنْيَا) فَيَقُوْلُ: يَا رَبِّ اَفَلَمْ تَغْفِرْلِيْ.

فَيَقُوْلُ: بَلٰى. فَبِسَعَةِ مَغْفِرَتِىْ بَلَغْتَ مَنْزِلَتَكَ هٰذِهٖ. فَبَيْنَمَاهُمْ كَذٰلِكَ، غَشِيَتْهُمْ سَحَابَةٌ مِنْ فَوْقِهِمْ فَاَمْطَرَتْ عَلَيْهِمْ طِيْبًا لَمْ يَجِدُوْا مِثْلَ رِيْحِهٖ شَيْئًا قَطُّ. ثُمَّ يَقُوْلُ: قُوْمُوْا اِلٰى مَا اَعْدَدْتُ لَكُمْ مِنَ الْكَرَامَةِ فَخُذُوْا مَا اشْتَهَيْتُمْ.

(قَالَ:) فَنَاْتِىْ سُوْقًا قَدْ حَفَّتْ بِهِ الْمَلَآئِكَةُ. فِيْهِ مَالَمْ تَنْظُرِ الْعُيُوْنُ اِلٰى مِثْلِهٖ وَلَمْ تَسْمَعِ الْاٰذَانُ، وَلَمْ يَخْطُرْ عَلَى الْقُلُوْبِ.

(قَالَ:) فَيَحملُ لَنَا مَا اشْتَهَيْنَا، لَيْسَ يُبَاعُ فِيْهِ شَىْءٌ وَّلَا يُشْتَرٰى. وَفِىْ ذٰلِكَ السُّوْقِ يَلْقٰى اَهْلُ الْجَنَّةِ بَعْضُهُمْ بَعْضًا، فَيقبلُ الرَّجُلِ ذُوالْمَنْزِلَةِ الْمُرْتَفِعةِ فَيَلْقٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ —وَمَا فِيْهِمْ دَنِىٌّ— فَيروعهٗ مَا يَرٰى عَلَيْهِ مِنَ اللِّبَاسِ. فَمَا يَنْقَضِىْ اٰخِرُ حَدِيْثِهٖ يَتَمَثَّلُ لَهٗ عَلَيْهِ اَحْسَنَ مِنْهُ. وَ ذٰلِكَ اَنَّهٗ لَا يَنْبَغِىْ لِاَحَدٍ اَنْ يَّحْزَنَ فِيْهَا.

قَالَ: ثُمَّ نَنْصَرِفُ اِلٰى مَنَازِلِنَا، فَتَلْقَانَا اَزْوَاجُنَا فَيَقُلْنَ: مَرْحَبًا وَ اَهْلًا لَقَدْ جِئْتَ وَاِنَّ بِكَ مِنَ الْجَمَالِ وَالطِّيْبِ اَفْضَلَ مِمَّا فَارَقْتَنَا عَلَيْهِ! فَنَقُوْلُ: اِنَّا جَالَسْنَا الْيَوْمَ رَبَّنَا الْجَبَّارَ عَزَّوَجَلَّ وَ يحِقُّنَا اَنْ نَنْقَلِبَ بِمِثْلِ مَا انْقَلَبْنَا.[1]

میں خدا سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تجھے اور مجھے جنت کے بازار میں اکٹھا کرے۔

سعید نے کہا: کیا وہاں بازار بھی ہوگا؟

ابوہریرہؓ نے کہا: ہاں! رسولِ خداؐ نے مجھے بتایا تھا کہ جب جنتی جنت میں داخل ہوں گے تو انہیں ان کے اعمال کے مطابق جنت میں مقام دیا جائے گا۔ پھر انہیں دنیا کے ایک روزِ جمعہ کی مقدار میں اپنے پروردگار کے دیدار کی اجازت دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے اپنا عرش ظاہر کرے گا اور وہ جنت کے ایک باغ میں ظاہر ہوگا اور اس باغ میں اہلِ جنت کے لئے نور، موتی، یاقوت، زبرجد، سونے اور چاندی کے منبر نصب کئے جائیں گے۔ ان میں سے سب سے کم درجہ رکھنے والا بھی کستوری اور کافور کے ٹیلے پر بیٹھا ہوگا اور وہ اہلِ کرسی کو بلحاظِ نشست اپنے سے بہتر نہیں سمجھے گا۔

ابوہریرہؓ نے کہا: میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ! کیا ہم اپنے رب کو دیکھیں گے؟

رسولِ خداؐ نے فرمایا: ہاں! کیا تمہیں سورج اور چودھویں رات کے چاند میں بھی کوئی شک ہوتا ہے؟

میں نے کہا: نہیں۔

۱۔ حافظ محمد بن یزید بن ماجہ قزوینی التوفی ۲۵۹ھ، سنن، کتابُ الزھد، بابُ صِفَةِ الجنة، ص ۱۴۵۱ و ۱۴۵۲، حدیث ۴۳۳۶۔
حافظ محمد بن عیسیٰ سُلَمی ترمذی التوفی ۲۷۹ھ، سنن، کتابُ صِفَةِ الجنة، بابُ مَاجآءَ فِی سُوقِ الجنة، ج ۱۰، ص ۱۶ و ۱۷۔

رسولِ خداؐ نے فرمایا: اسی طرح سے تم اپنے پروردگار کے دیدار میں بھی شک نہیں کرو گے۔ اس مجلس میں اللہ تعالیٰ ہر شخص سے بنفسِ نفیس گفتگو فرمائے گا۔ یہاں تک کہ وہ تم میں سے ایک شخص سے کہے گا کہ اے فلاں! تجھے یاد ہے کہ تو نے فلاں دن ایسا ایسا کام کیا تھا (اسے اس کی کچھ غلطیاں یاد دلائے گا) وہ شخص کہے گا کہ اے پروردگار! کیا تو نے مجھے وہ غلطیاں معاف نہیں کی ہیں؟

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیوں نہیں! میری مغفرت کی وسعت کی وجہ سے تو تُو اس مقام پر پہنچا ہے اور ابھی اس کی باتیں ہو رہی ہوں گی کہ ان کے اوپر ایک بادل چھا جائے گا جس سے خوشبو کی بارش ہوگی اور اہلِ جنت نے اس جیسی خوشبو کبھی نہیں سونگھی ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ ان سے کہے گا کہ اٹھو اور میں نے جو کرامت تمہارے لئے تیار کی ہے اسے اپنی مرضی کے مطابق اٹھالو۔

پھر ہم ایک بازار میں جائیں گے جسے ملائکہ نے گھیر رکھا ہوگا۔ اس میں ایسی اشیاء ہوں گی کہ اس جیسی اشیاء نہ کبھی آنکھوں نے دیکھی ہوں گی اور نہ کانوں نے کبھی ان کے متعلق سنا ہوگا۔ وہاں جو ہم چاہیں گے وہ ہمارے لئے اٹھالیا جائے گا۔ وہاں کسی چیز کی خرید و فروخت نہیں ہوگی۔

اس جنت میں اہلِ جنت ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے اور وہاں ایک بلند منزلت رکھنے والا جنتی کم درجہ رکھنے والے سے ملاقات کرے گا — حالانکہ ان میں کوئی بھی کم درجہ نہیں ہوگا — چنانچہ وہ بلند مرتبہ رکھنے والے جنتی کے لباس کو دیکھ کر حیران ہوگا۔ ابھی اس کی گفتگو ختم نہ ہوئی ہوگی کہ وہ محسوس کرے گا کہ اس کا لباس بلند درجہ رکھنے والے سے بھی بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت میں کسی طرح کا حزن و ملال نہیں ہوگا۔

(راوی نے کہا): پھر ہم اپنے گھروں کو لوٹیں گے تو ہماری بیویاں ہم سے ملاقات کریں گی اور وہ ہمیں خوش آمدید کہنے کے بعد کہیں گی: جب تم ہم سے رخصت ہوئے تھے تو تمہارے پاس اتنی خوبصورتی اور خوشبو نہیں تھی اور اب جبکہ تم واپس آئے ہو تو بہت زیادہ حسن و جمال اور خوشبو لیکر آئے ہو۔ ہم کہیں گے کہ آج ہم خدا کے ساتھ بیٹھے رہے اس لئے جس طرح سے ہم لوٹے ہیں یہ ہمارا حق ہے۔

اصل میں ابوہریرہؓ کی روایت کعب الاحبار کی روایت کا چربہ ہے۔ عثمان بن سعید دارمی نے کعب الاحبار کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے:

عَنْ كَعْبٍ قَالَ: مَا نَظَرَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلَى الْجَنَّةِ اِلَّا قَالَ: طِيْبِيْ لِاَهْلِكِ. فَزَادَتْ طِيْبًا عَلٰى مَا كَانَتْ وَمَا مَرَّ يَوْمٌ كَانَ لَهُمْ عِيْدًا فِى الدُّنْيَا، اِلَّا يَخْرُجُوْنَ فِيْ مِقْدَارِهٖ فِيْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ يَبْرُزُ لَهُمُ الرَّبُّ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ وَ تَسْفِيْ عَلَيْهِمُ الرِّيْحُ بِالطِّيْبِ وَالْمِسْكِ، فَلَا يَسْاَلُوْنَ رَبَّهُمْ شَيْئًا اِلَّا اَعْطَاهُمْ. فَيَرْجِعُوْنَ اِلٰى اَهْلِيْهِمْ وَقَدِ ازْدَادُوْا عَلٰى مَا كَانُوْا عَلَيْهِ مِنَ الْحُسْنِ وَ الْجَمَالِ سَبْعِيْنَ ضِعْفًا.

کعب نے کہا: اللہ تعالیٰ بہشت پر نظر نہیں کرے گا مگر اس سے کہے گا کہ تو اہلِ جنت کے لئے خوشبو بن جا۔ اس حکم کے بعد اس کی خوشبو میں مزید اضافہ ہو جائے گا اور جس دن وہ دنیا میں عید مناتے تھے تو اس دن کی مقدار کے برابر وہ جنت کے باغات میں (سیر و تفریح کے لئے) جائیں گے۔ وہاں اللہ تعالیٰ ان کے لئے ظاہر ہوگا وہ اللہ کو دیکھیں گے۔ اور وہاں بھینی بھینی معطّر معطّر فرحت بخش ہَوا چلے گی۔ وہ اپنے رب سے جو کچھ طلب کریں گے وہ انہیں عطا کرے گا اور جب وہ اپنے خاندان میں واپس آئیں گے تو اس وقت ان کے حسن و جمال میں ستّر گنا اضافہ ہو چکا ہوگا۔[1]

مکتبِ خلفاء میں صرف اس طرح کی روایات سازی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انہوں نے قرآن مجید کی کچھ آیات کی تأویل کرتے وقت بھی ایسی ہی روایات کو مدنظر رکھا اور خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں کے بمصداق قرآنی آیات کی حسبِ دلخواہ تأویل کی مثلاً۔

(۲) مکتبِ خلفاء سے وابستہ علماء و مفسّرین نے جن آیات سے دیدارِ خداوندی کے لئے استدلال کیا ہے ان آیات میں یہ آیتِ مجیدہ بھی شامل ہے: **لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ٥** جن لوگوں نے نیکوکاری کی (آخرت میں) انہیں نیک بدلہ دیا جائے گا اور اس پر ''اضافہ'' بھی دیا جائے گا۔ ان کے چہروں پر ذِلّت و رُسوائی کی گرد نہ بیٹھے گی۔ وہی لوگ جنتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (سورۂ یونس: آیت ۲۶)

مکتبِ خلفاء کے مفسّرین نے لفظ ''زِيَادَةٌ'' کی تفسیر کرتے ہوئے کہا: اہلِ جنت کو اضافے میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں طبری نے چار صحابہ اور سیوطی نے نو صحابہ سے روایت کی کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا: لفظ ''زِيَادَةٌ'' سے مراد اہلِ بہشت کا خدا کو دیکھنا ہے۔[2]

ہم یہاں پر صرف دو روایات نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ ابوموسیٰ اشعری کا بیان ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک منادی کو حکم دے گا اور وہ اہلِ جنت کو ندا دے گا جسے اول سے لے کر آخر تک سب سنیں گے، وہ کہے گا: **اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمُ الْحُسْنٰى وَزِيَادَةً**. اللہ نے تم سے اچھے بدلے اور ''اضافے'' کا وعدہ کیا تھا۔ اچھا بدلہ تو تمہارے لئے جنت ہے اور اضافہ رحمٰن کے چہرے کا دیدار کرنا ہے۔[3]

۱۔ عثمان بن سعید دارمی، الرد علی الجهمية، ص ۵۳۔

۲۔ طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۱۱، ص ۷۳ تا ۷۶۔ جلال الدین سیوطی، تفسیر درمنثور، ج ۳، ص ۳۰۵ و ۳۰۶۔

۳۔ طبری، تفسیر، ج ۱۱، ص ۷۴۔ سیوطی، تفسیر، ج ۳، ص ۳۰۵۔ حافظ ابن کثیر، تفسیر، ج ۳، ص ۴۹۷۔

۲۔ ابوسلمان بن داؤد طیالسی المتوفی ۲۰۴ھ اور (امام) احمد بن حنبل شیبانی مروزی المتوفی ۲۴۱ھ نے اپنی اپنی مسند میں، مسلم نے اپنی صحیح میں، ترمذی و ابن ماجہ نے اپنی اپنی سنن میں اور طبری و سیوطی نے اپنی اپنی تفاسیر میں نیز دیگر مفسّرین و محدّثین نے صہیبؓ سے روایت کی ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا: جب اَبرار، جنّت میں اور فُجّار، جہنّم میں چلے جائیں گے تو اس وقت ایک منادی پکارے گا کہ اے اہلِ جنت! تمہارے لئے خدا کے ذمے ایک وعدہ ابھی تک باقی ہے جسے وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔

اہلِ جنت کہیں گے کہ وہ وعدہ کیسا ہے؟ کیا اس نے ہمارے میزانِ اعمال کو وزنی نہیں کیا اور ہمارے چہروں کو روشن نہیں بنایا؟ کیا اس نے ہمیں جنّت عطا نہیں کی؟ اور دوزخ کو ہم سے دور نہیں کیا؟

اس وقت خدا اپنے حجاب کو الٹ دے گا اور ان کی نگاہیں خدا کو دیکھیں گی۔ واللہ! پروردگار کے چہرے کے دیدار سے بڑھ کر انہیں اور کوئی دِل خوش کن نعمت عطا نہیں کی گئی ہوگی۔[1]

اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

بہشت میں اہلِ ایمان کو جو سب سے بڑی نعمت ملے گی وہ خدا کے چہرے کا دیدار ہوگا اور یہ تفسیر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ... سے منقول ہے۔

ابن کثیر نے پندرہ صحابہ و تابعین کے نام لکھے ہیں جنہوں نے اس آیت کی یہی تفسیر بیان کی ہے۔ اس کے بعد ابن کثیر نے مذکورہ دو احادیث اور کچھ دوسری روایات سے بھی استدلال کیا۔

فخر الدین رازی نے بھی اپنی تفسیر میں اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔

(۳) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (سورۂ قیامت: آیات ۲۲و۲۳) کی تفسیر میں پیغمبرِ اکرمؐ سے کچھ روایات نقل کی گئی ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

روایت۱۔ اَنس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: روزِ قیامت ہر جمعے کو اہلِ ایمان خدا کا دیدار کریں گے اور مومن عورتیں عیدِ فطر اور عیدِ قربان کے موقع پر خدا کا دیدار کریں گی۔

۱۔ طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج۱۱، ص۷۵۔ حافظ ابن کثیر، تفسیر، ج۷، ص۱۷۱، تفسیر وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ... نَاظِرَةٌ. جلال الدین سیوطی، الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، ج۳، ص۳۰۵۔ عثمان بن سعید دارمی، الرد علی الجھمیۃ، ص۳۶۔ ابوالحسن مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری، کتاب الایمان، باب اثبات رؤیۃ المؤمنین فی الاخرۃ ربھم، ص۱۲۳، حدیث۲۹۷و۲۹۸۔ حافظ محمد بن یزید بن ماجہ قزوینی، سنن، المقدمہ، باب فی ما انکرت الجھمیۃ، ج۱، ص۶۷، حدیث۱۸۷۔ احمد بن حنبل، مسند، ج۴، ص۳۳۲و۳۳۳، ج۶، ص۱۵و۱۶۔ بیہقی، الاسماء و الصفات، ص۳۰۷۔

روایت۲- انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ...کی آیت میرے سامنے تلاوت کی اور فرمایا: خدا کی قسم! یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ وہ خدا کا دیدار کریں گے۔ خدا انہیں سامانِ خورد ونوش اور خوشبو اور زیور عطا کرے گا۔ ان کے اور خدا کے درمیان پڑا ہوا حجاب اٹھا دیا جائے گا۔ وہ خدا کو دیکھیں گے اور خدا انہیں دیکھے گا اور وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا○ انہیں وہاں صبح وشام کھانا دیا جائے گا۔ (سورۂ مریم: آیت۶۲) کا یہی مفہوم ہے۔

روایت۳- جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو اپنا عمومی دیدار کرائے گا اور ابوبکر صدیقؓ کو خصوصی دیدار کرائے گا۔[1]

روایت۴- عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جنت میں مومن کا پست ترین درجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے نوکروں اور اپنے اوپر ہونے والی نعمتوں کو ہزار سال کی مسافت کے فاصلے تک دیکھے گا اور جنت میں جن لوگوں کو اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہوگا وہ روزانہ صبح وشام خدا کے چہرے کا دیدار کریں گے۔[2]

طبری نے وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ کی تفسیر میں چار صحابہ سے اور سیوطی نے چھ صحابہ سے رسولِ اکرمؐ کی زبانی اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کی یہ تفسیر نقل کی ہے کہ ''اہلِ ایمان جنت میں خدا کو دیکھیں گے۔''

علاوہ ازیں بہت سے تابعین سے بھی یہی بات منقول ہے۔[3]

فخرالدین رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

رؤیتِ خداوندی کے علاوہ اس آیت کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہے۔[4]

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ'' اَیْ تَرَاهُ عَیْنًا... وَقَدْ ثَبَتَتْ رُؤْیَةُ الْمُؤْمِنِیْنَ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فِی الدَّارِ الْاٰخِرَةِ فِی الْاَحَادِیْثِ الصِّحَاحِ. یعنی اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور صحیح احادیث میں مومنوں کے لئے اللہ کا دیدار ثابت ہے۔[5]

۱۔ مذکورہ تینوں آیات سیوطی کی درمنثور، ج۶، ص۲۹۲ پر اور تیسری حدیث ص۲۹۱ پر بھی مذکور ہے۔

۲۔ حافظ جلال الدین سیوطی، الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، ج۶، ص۲۹۰۔

۳۔ طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج۱۸، ص۱۱۹۔ حافظ جلال الدین سیوطی، الدر المنثور، ج۶، ص۲۹۰ تا ۲۹۲۔

۴۔ فخرالدین رازی، تفسیر کبیر، ج۲۹، ص۲۲۸۔ وَالَّذِیْ نَدَّعِیْهِ اِنَّ النَّظَرَ الْمَقْرُوْنَ بِحَرْفِ ''اِلٰی'' الْمُعَدی اِلَی الْوُجُوْهِ لَیْسَ اِلَّا بِمَعْنَی الرُّؤْیَةِ

۵۔ تفسیر ابن کثیر، ج۷، ص۱۷۰ و۱۷۱۔

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ مقاتل المتوفی ۱۵۰ھ سے لے کر سیّد قطب[1] المقتول ۱۳۸۶ھ تک مکتب خلفاء کے مفسّرین نے ان آیات کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

سیّد قطب اس آیت کی تفسیر میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اِنَّ هٰذَا النَّص لَيُشِيْرُ اِشارَةً سَرِيْعَةً اِلٰى حَالَةٍ تَعْجِزُ الْكَلِمَاتُ عَنْ تَصْوِيْرِهَا، كَمَا يَعْجِزُ الْاِدْرَاكُ عَنْ تَصَوُّرِهَا بِكُلِّ حَقِيْقَتِهَا. ذٰلِكَ حِيْنَ يَعِدُالْمَوْعُوْدِيْنَ السُّعَدَاءِ بِحَالَةٍ مِّنَ السَّعَادَةِ لَا تَشْبَهُهَا حَالَةٌ. حَتّٰى لَتَتَضَآلَ اِلٰى جِوَارِهَا الْجَنَّة بِكُلِّ مَافِيْهَا مِنَ اَلْوَانِ النَّعِيْمِ! هٰذِهِ الْوُجُوْهُ النَّاضِرَةُ... نَضُرُهَا اَنَّهَا اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ، اِلٰى رَبِّهَا؟... فَاَيُّ مُسْتَوٰى مِّنَ الرِّفْعَةِ هٰذَا؟ اَیُّ مُسْتَوٰى مِّنَ السَّعَادَةِ؟

اِنَّ رُوْحَ الْاِنْسَانِ لَتَسْتَمْتِعُ اَحْيَانًا بِلَمْحَةٍ مِّنْ جَمَالِ الْاِبْدَاعِ الْاِلٰهِيِّ فِي الْكَوْنِ اَوِ النَّفْسِ، تَرَاهَا فِي اللَّيْلَةِ الْقَمْرَاءِ اَوِ اللَّيْلِ السَّاجِي، اَوِ الْفَجْرِ الْوَلِيْدِ اَو... فَتَغْمُرُهَا النَّشْوَةُ وَ تَفِيْضُ بِالسَّعَادَةِ... وَ...

فَكَيْفَ؟ كَيْفَ بِهَا وَهِيَ تَنْظُرُ لَا اِلٰى جَمَالِ صُنْعِ اللّٰهِ، وَلٰكِنْ اِلٰى جَمَالِ ذَاتِ اللّٰهِ... "وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ. اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ."

وَمَالَهَا لَا تَتَنَضَّرُ وَهِيَ اِلٰى جَمَالِ رَبِّهَا تَنْظُرُ؟... فَمَا تَبْلُغُ الْكَيْنُوْنَةُ الْاِنْسَانِيَّةُ ذٰلِكَ الْمَقَامِ، اِلَّا وَقَدْ خَلَصَتْ مِنْ كُلِّ شَائِبَةٍ تَصُدُّهَا عَنْ بُلُوْغِ ذٰلِكَ الْمُرْتَقٰى الَّذِيْ يَعِزُّ عَلَى الْخَيَالِ كُلُّ شَائِبَةٍ لَافِيْمَا حَوْلَهَا فَقَطْ، وَلٰكِنْ فِيْهَا هِيَ ذَاتُهَا مِنْ دَوَاعِي النَّقْصِ وَالْحَاجَةُ اِلٰى شَيْءٍ مَاسِوَى النَّظَرِ اِلَى اللّٰهِ...

فَمَا بَالُ اُنَاسٍ يَحْرِمُوْنَ اَرْوَاحَهُمْ اَنْ تُعَانِقَ هٰذَا النُّوْرَ الْفَائِضَ بِالْفَرَحِ وَالسَّعَادَةِ، وَ يُشْغِلُوْنَهَا بِالْجَدَلِ حَوْلَ مُطْلَقٍ لَا تُدْرِكُهُ الْعُقُوْلُ الْمُقَيَّدَةُ بِمَا لَوْفَاتَ الْعَقْلُ وَ مُقَرَّرَاتُهُ...

فَلْنَتَطَلَّعَ اِلٰى فَيْضِ السَّعَادَةِ الْغَامِرِ الْهَادِيْ وَ فَيْضِ الْفَرَحِ الْمُقَدَّسِ الطَّهُوْرِ الَّذِيْ يَنْطَلِقُ مِنْ مُجَرَّدِ تَصَوُّرِنَا لِحَقِيْقَةِ الْمَوْقِفِ عَلٰى قَدْرِ مَا نَمْلِكُ. وَ لْنُشْغِلَ اَرْوَاحَنَا بِا لِتَطَلُّعِ اِلٰى هٰذَا الْفَيْضِ. فَهٰذَا التَّطَلُّعُ ذَاتُهُ نِعْمَةٌ لَا تَفُوْقُهَا اِلَّا نِعْمَةُ النَّظَرِ اِلٰى وَجْهِهِ الْكَرِيْمِ.[2]

''اِن آیات کا اشارہ روزِ قیامت کے خصوصی حالات کی طرف ہے اور ان میں قیامت کے دن کی ایسی حالت کو بیان کیا گیا ہے جس کا ادراک کرنا انسان کے لئے دشوار ہے۔ اس میں ایک ایسی حالت کا ذکر کیا گیا

۱۔ سیّد قطب مصری جماعت اخوان المسلمین کے سربراہ تھے اور وہ مصر میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کے خواہش مند تھے۔ جمال عبدالناصر نے ۱۳۸۶ھ میں انہیں ان کے چند دیگر ساتھیوں سمیت قتل کروا دیا تھا۔

۲۔ تفسیر فی ظِلالِ القرآنِ سیّد قطب، طبع اول قاہرہ، ج۲۹، ص۲۰۸ تا ۲۱۰۔

ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ وہ ایسی حالت ہے جس کے سامنے جنت کی ہر نعمت پست ہے۔ وہ ایک ایسی حالت ہے کہ اہلِ ایمان کے چہرے شاداں و تاباں ہوں گے۔ ان کی خوشی کا راز پروردگار کا دیدار کرنا ہوگا۔ ''جی ہاں باری تعالیٰ کو دیکھنا۔'' اس کے کیا ہی کہنے، وہ کیا خوبصورت منظر ہوگا اور کیا بہتر حالت ہوگی، وہ کتنی بڑی سعادت ہوگی اور مومنین کے لئے یہ کتنا بڑا درجہ ہے جو انہیں قیامت کے دن نصیب ہوگا۔

انسان کبھی کبھی مناظرِ فطرت کا حسن دیکھتا ہے۔ چودھویں شب کی چاندنی، آدھی رات کے وقت ستاروں کی ضوفشانی، پہاڑوں کی چوٹیاں اور ان کے دامن میں پھوٹنے والے پھولوں کو دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوجاتی ہے اور انسان پر وجُد کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اور وہ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

جب انسان مظاہرِ فطرت کو دیکھ کر کیف و سرور میں ڈوب جاتا ہے تو نہ جانے اس وقت کیا حالت ہوگی جب وہ ان مناظر کے خالق کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا؟

جی ہاں! آخر وہ خوش کیوں نہ ہو جبکہ اس کی آنکھیں ذاتِ اقدس الٰہی کے دیدار سے روشن ہوچکی ہیں۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ۞ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۞ میں اسی حالت کی عکاسی کی گئی ہے۔

جب تک انسان کا نفس ہر عیب و نقص سے پاک اور منزّہ نہ ہوجائے تو اس وقت تک اسے یہ بلند و برتر مقام نصیب نہیں ہوسکتا اور عیب و نقص اس مقام کے حصول میں بڑی رکاوٹ ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ بعض افراد اس حقیقت کو ماننے پر آمادہ نہیں ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی روح اس حقیقت سے آشنائی حاصل کرے اور وہ اپنے آپ کو جمالِ پروردگار کے نور سے محروم رکھتے ہیں اور جب وہ اس خوشخبری کو سنتے ہیں تو وجودِ مطلق کے بارے میں جنگ و جدال میں مشغول ہو جاتے ہیں (اور ان کا مباحثہ کچھ اتنا بے جا بھی نہیں کیونکہ) وہ ایسا وجود ہے کہ فکر و عقل کی پرواز وہاں تک ممکن نہیں ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اس جہان کی طرف متوجہ رکھے اور اپنے ذہن کو اس کے تصور میں مشغول رکھے کیونکہ یہ توجہ بھی بذاتِ خود نعمت ہے اور خدا کے چہرے کے دیدار کے بعد یہی تصور ہی سب سے بڑی نعمت ہے۔''

یہاں تک آپ نے ایسی آیات کی تأویل و تفسیر اور ان روایات کا مشاہدہ کیا جن میں کہا گیا ہے کہ اہلِ ایمان جنت میں خدا کو دیکھیں گے۔ اب ہم اس عقیدے کی نفی میں ان روایات کو بیان کریں گے جو اوصیائے پیغمبرؐ سے مروی ہیں۔

مکتبِ اہلبیتؑ میں خدا کے دِیدار کا مفہوم

اس سلسلے میں ہم امام علی رضا علیہ السلام کی ایک مفصّل حدیث بیان کریں گے۔ اس حدیث میں امامؑ

نے مکتب خلفاء کے چند شبہات کا جواب بھی دیا ہے اور اس کے بعد ہم مذکورہ بالا دو آیات کی تفسیر کے لئے ائمۂ اہلبیتؑ کا نکتۂ نظر ازروئے روایات پیش کریں گے۔

جنت میں دیدار الٰہی کی روایات کا جواب

(۱) ابوصلت ہروی نے کہا:

قُلْتُ لِعَلِيِّ بْنِ مُوسَى الرِّضاؑ: يَا ابْنَ رَسُولِ اللّٰهِ! مَا تَقُولُ فِي الْحَدِيثِ الَّذِي يَرْوِيهِ أَهْلُ الْحَدِيثِ أَنَّ الْمُؤْمِنِينَ يَزُورُونَ رَبَّهُمْ مِنْ مَنَازِلِهِمْ فِي الْجَنَّةِ؟

فَقَالَؑ: يَا أَبَاالصَّلْتِ، إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى فَضَّلَ نَبِيَّهُ ؐ عَلَى جَمِيعِ خَلْقِهِ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالْمَلَائِكَةِ، وَجَعَلَ طَاعَتَهُ طَاعَتَهُ، وَ مُتَابَعَتَهُ مُتَابَعَتَهُ، وَ زِيَارَتَهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ زِيَارَتَهُ.

فَقَالَ عَزَّوَجَلَّ: "مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ."

وَقَالَ: "إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ يَدُاللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ."

وَقَالَ النَّبِيُّ: مَنْ زَارَنِي فِي حَيَاتِي أَوْ بَعْدَ مَوْتِي فَقَدْ زَارَ اللّٰهَ.

دَرَجَةُ النَّبِيِّ فِي الْجَنَّةِ أَرْفَعُ الدَّرَجَاتِ. فَمَنْ زَارَهُ إِلَى دَرَجَتِهِ فِي الْجَنَّةِ مِنْ مَنْزِلِهِ فَقَدْ زَارَ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى.

قَالَ: فَقُلْتُ لَهُ: يَا ابْنَ رَسُولِ اللّٰهِ فَمَا مَعْنَى الْخَبَرِ الَّذِي رَوَوْهُ أَنَّ ثَوَابَ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" النَّظَرُ إِلَى وَجْهِ اللّٰهِ.

فَقَالَ: يَا أَبَاالصَّلْتِ! مَنْ وَصَفَ اللّٰهَ بِوَجْهٍ كَالْوُجُوهِ، فَقَدْ كَفَرَ، وَلٰكِنْ وَجْهُ اللّٰهِ: أَنْبِيَاؤُهُ وَرُسُلُهُ وَحُجَجُهُ —صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ— هُمُ الَّذِينَ بِهِمْ يُتَوَجَّهُ إِلَى اللّٰهِ وَإِلَى دِينِهِ وَ مَعْرِفَتِهِ.

وَقَالَ عَزَّوَجَلَّ: "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ○ وَّ يَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ..."

وَقَالَ عَزَّوَجَلَّ: "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ."

فَالنَّظَرُ إِلَى أَنْبِيَاءِ اللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَ حُجَجِهِ (ع) فِي دَرَجَاتِهِمْ، ثَوَابٌ عَظِيمٌ لِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ: "مَنْ أَبْغَضَ أَهْلَبَيْتِي وَ عِتْرَتِي لَمْ يَرَنِي وَلَمْ أَرَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ."

وَقَدْ قَالَ: "إِنَّ فِيكُمْ مَنْ لَا يَرَانِي بَعْدَ أَنْ يُفَارِقَنِي."

يَا أَبَاالصَّلْتِ! إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى لَا يُوصَفُ بِمَكَانٍ وَلَا يُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَالْأَوْهَامُ۔[1]

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب ما جاء فی الرؤیۃ، ص ۱۱۷ و ۱۱۸، حدیث ۲۱۔

میں نے امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: اے فرزندِ رسولؐ! آپ اس حدیث کے متعلق کیا فرماتے ہیں جسے (مکتبِ خلفاء کے) محدّثین روایت کرتے ہیں کہ "اہلِ ایمان جنت کے مکانات میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے؟"

امامؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو تمام نبیوں اور فرشتوں پر فضیلت دی ہے اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت اور ان کی پیروی کو اپنی پیروی اور ان کی دنیا و آخرت میں زیارت کو اپنی زیارت کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ (سورۂ نساء: آیت ۸۰)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُاللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ. (اے رسولؐ!) جو لوگ آپ کی بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ کی بیعت کر رہے ہیں۔ (اور بیعت لیتے وقت) ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ (سورۂ فتح: آیت ۱۰)

نبی اکرمؐ نے فرمایا: جس نے میری زندگی میں یا وفات کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی زیارت کی۔ (یہ امر اس لئے ہے کہ) نبی اکرمؐ جنت کے بلند ترین درجے میں ہوں گے اور جو اس درجے سے نبی اکرمؐ کی زیارت کرے گا گویا وہ اللہ کی زیارت کرے گا۔

ابوصلت کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے فرزندِ رسولؐ! یہ جو روایت کی جاتی ہے کہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کہنے کے ثواب میں خدا کے چہرے کا دیدار نصیب ہوگا، اس روایت کا کیا مفہوم ہے؟

امام علی رضاؑ نے فرمایا: اے ابوصلت! جو شخص خدا کے لئے یہ وصف بیان کرے کہ وہ دوسرے چہروں کی طرح سے چہرہ رکھتا ہے تو اس نے کفر کیا۔ وَجْہُ اللّٰہ سے مراد خدا کا ذاتی چہرہ نہیں بلکہ وَجْہُ اللّٰہ سے مراد انبیاء و مرسلین اور خدا کی حجتیں ہیں صَلَوٰاتُ اللّٰہِ علیہم اَجمعین۔ یہی وہ ذواتِ عالیہ ہیں (جن کی مدد اور رہنمائی کی وجہ سے) اللہ کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ (اللہ کے قرب کا راستا طے کیا جاتا ہے اور اس کا قرب حاصل کیا جاتا ہے) اور ان کے ذریعے سے اللہ کی اور اللہ کے دین کی معرفت کا راستا نصیب ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ○ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ... زمین پر رہنے والی ہر چیز فنا ہوجائے گی اور تمہارے پروردگار تک جانے والا راستا باقی رہے گا۔ (سورۂ رحمٰن: آیت ۲۷)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ. تمام چیزیں ختم ہوجائیں گی سوائے اس تک جانے والے راستے کے۔ (سورۂ قصص: آیت ۸۸)

اسی لئے قیامت کے دن مومنین جب انبیاء و مرسلین اور حُجَجِ خدا کو ان کے بلند درجات میں دیکھیں

گے تو انہیں عظیم ثواب ہوگا اور (غیر مومن افراد کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوگی)۔

نبی اکرمؐ نے فرمایا: جو بھی میرے اہلبیتؑ سے دشمنی رکھے گا وہ مجھے قیامت کے دن ہرگز نہیں دیکھے گا اور نہ ہی میں اسے دیکھوں گا۔

صحابہ سے خطاب کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: تم میں ایسے افراد موجود ہیں کہ جب وہ (اس دنیا میں) مجھ سے جدا ہوں گے تو پھر کبھی مجھے نہیں دیکھ سکیں گے۔

اے ابوصلت! جگہ اور مکان کے ساتھ اللہ کی توصیف نہیں ہو سکتی (اس لئے جنت میں بھی اس بات کا امکان نہیں ہے کہ اللہ مومنین کے سامنے اپنے آپ کو ظاہر کرے اور وہ اس کا دیدار کریں یا وہ اس کے ساتھ ہم نشینی کا اعزاز حاصل کریں) آنکھیں اور اوہام اسے نہیں پاسکتے اور طائرانِ عقل اس تک پر نہیں مار سکتے۔

(۲) ابراہیم بن ابی محمود کا بیان ہے کہ امام علی رضا علیہ السلام نے وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ○ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ○ کے متعلق فرمایا: مُشْرِقَةٌ تَنْتَظِرُ ثَوَابَ رَبِّهَا. یعنی اس دن چہرے روشن و درخشاں ہوں گے اور وہ اپنے پروردگار کے ثواب کے منتظر ہوں گے۔[۱]

(۳) لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ... کا مفہوم تین اوصیائے پیغمبرؐ نے ایک ہی بیان کیا ہے۔

(الف) امیرالمومنین علی علیہ السلام نے فرمایا: اَلْحُسْنٰی هِیَ الْجَنَّةُ وَ الزِّیَادَةُ هِیَ الدُّنْیَا.[۲]

"حُسْنٰی" سے مراد جنت ہے اور زِیَادَةٌ سے مراد دنیاوی زندگی کی آسائش ہے۔ امام علی علیہ السلام کے بیان کے مطابق اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کی جزا جنت ہے اور دنیا میں بھی انہیں اضافی بدلہ دیا جائے گا۔"

(ب) امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: اَلزِّیَادَةُ هِیَ مَا اَعْطَاهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَلَمْ یُحَاسِبْهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَنِ الزِّیَادَةِ... اضافی جزا سے مراد دنیا کی وہ نعمتیں ہیں جو اللہ نے انہیں عطا کی ہیں اور آخرت میں ان کا حساب نہ لیا ہو۔[۳]

مقصد یہ ہے کہ نیکی کرنے والوں کو آخرت میں جنت کی شکل میں جزا دی جائے گی اور آخرت سے

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، باب ما جآء فی الرؤیة، ص۱۱۶، حدیث۱۹۔

۲۔ ثقفی المتوفی ۲۸۳ھ، کتاب الغارات، مطبوعہ تہران ۱۳۹۵ھ، ج۱، ص۲۳۵۔ شیخ طوسی، امالی، مطبوعہ نجف سال ۱۳۸۴ھ، ج۱، ص۲۵۔ تفسیر آیت مذکورہ در تفسیر نورالثقلین، ج۲، ص۳۰۱۔ تفسیر برہان، ج۲، ص۱۸۳۔ امام علیؑ نے جب محمد بن ابی بکرؓ کو مصر کا حاکم بنایا تو آپ نے ایک عہد نامہ لکھ کر ان کے حوالے کیا جس میں آپ نے اس آیت کے مفہوم کی طرف اشارہ فرمایا۔

۳۔ تفسیر آیت در تفسیر نورالثقلین، ج۲، ص۳۰۱، بنقل از تفسیر علی بن ابراہیم قمی و تفسیر برہان، ج۲، ص۱۸۳ بحوالہ تفسیر طبرسی۔

پہلے انہیں دنیاوی انعامات کی شکل میں بھی نیکیوں کا بدلہ دیا جائے گا اور ان کے دنیاوی حصے میں کسی طرح کی کمی روا نہ رکھی جائے گی۔

(ج) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اَلزِّيَادَةُ فِي الدُّنْيَا: مَا اَعْطَاهُمُ اللّٰهُ فِيهَا، وَلَمْ يُحَاسِبْهُمْ فِي الْآخِرَةِ، وَ يَجْمَعُ لَهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَ يُثِيبُهُمْ بِاَحْسَنِ اَعْمَالِهِمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. اضافے کا تعلق دنیا سے ہے اور اس سے مراد خدا کی وہ نعمتیں ہیں جو اس نے انہیں دنیا میں عطا کی تھیں اور آخرت میں ان سے ان کا حساب نہ لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے لئے دنیا و آخرت کی جزا جمع کرے گا اور انہیں دنیا و آخرت میں ان کے اچھے اعمال کی بہترین جزا دے گا۔

مذکورہ روایات کا تجزیہ اور موازنہ

مکتبِ خلفاء کی معتبر کتابوں سے آپ نے ابو ہریرہؓ اور دیگر صحابہ کی روایت پڑھی جس کا ماحصل یہ تھا:

پروردگار جنت میں ایک نشست سجائے گا جس میں اہلِ جنت شریک ہوں گے اور اس نشست میں اللہ تعالیٰ ایک ایک شخص سے گفتگو کرے گا اور تمام اہلِ جنت کو اللہ کا دیدار نصیب ہوگا۔ اس نشست کے خاتمے پر مومن اپنے گھروں کی طرف واپس جائیں گے تو ان کے چہروں کی نورانیت اور ان کے جسم کی خوشبو میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہوگا۔ ان کی ازواج ان سے کہیں گی کہ تم یہ حسن و جمال اور خوشبو کہاں سے لائے ہو؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ آج ہماری خدا سے نشست ہوئی اور یہ حسن و جمال اور خوشبو ہمیں وہیں سے نصیب ہوئی۔

اس روایت کی بنیاد کو کعب الاحبار کی گفتگو میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ روایت دراصل کعب الاحبار کے افکار کی ''ترقی یافتہ'' شکل ہے۔

مکتبِ خلفاء سے وابستہ افراد جو ابو ہریرہؓ کی مذکورہ روایت پر ایمان رکھتے ہیں ان سے ہمیں کچھ سوالات کرنا ہیں۔ امید ہے کہ وہ ان کا تسلی بخش جواب عنایت کریں گے۔

۱۔ مومنین کے ساتھ خدا کی مذکورہ نشست کب تشکیل پائے گی؟ آیا یہ نشست روزانہ ہوگی یا ہفتہ وار ہوگی یا ہر ماہ ہوگی یا پھر کبھی کبھی ہوگی؟

۲۔ ابو ہریرہؓ اور کعب الاحبار نے اپنی روایات میں مومن عورتوں کے متعلق اس طرح کی نشست کا تذکرہ کیوں نہیں کیا اور انہوں نے مومن عورتوں کا تذکرہ نہ کر کے انہیں دیدارِ الٰہی سے محروم رکھنا کیسے گوارا کر لیا؟

۳۔ خدا کے جثے کے متعلق خلفاء کی کتابوں میں اس طرح کی روایات دکھائی دیتی ہیں کہ زمین سے آسمانِ اول ستر سے کچھ زیادہ سالوں کی مسافت پر واقع ہے۔ آسمانِ اول سے آسمانِ دوم کا بھی اتنا ہی فاصلہ ہے اور

اسی طرح سے ساتویں آسمان تک یہی فاصلہ کارفرما ہے۔ ساتویں آسمان کے بعد ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنے ہی سالوں کی مسافت پر واقع ہے۔ اس سمندر کی سطح پر پہاڑی بکریاں ہیں جن کے سم اور زانو کا اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا ہے اور ان کی پشت پر اللہ کا عرش واقع ہے۔ اللہ کے عرش کی موٹائی دو آسمانوں کے برابر ہے اور اس عرش پر اللہ کی رہائش ہے۔ اللہ اتنا وزنی ہے کہ اس کے وزن کی وجہ سے عرش اور آسمانوں سے چرچراہٹ کی آوازیں نکلتی ہیں۔ اللہ کا وجود اس عرش کے چاروں کونوں سے چار چار انگلیوں کی مقدار میں لٹکا ہوا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جو خدا اتنا عظیم جثہ رکھتا ہے وہ ڈیڑھ میٹر قد رکھنے والے جنتی سے نشست و برخاست کیسے کرے گا؟

یہاں تک آپ نے مکتبِ خلفاء کی جنت میں خدا کے دیدار کے متعلق روایات کا تجزیہ ملاحظہ فرمایا۔ مذکورہ روایات کے علاوہ مکتبِ خلفاء کے مفسّرین نے قرآن مجید کی کچھ آیات کی تأویل سے بھی اپنے عقیدے کو ثابت کرنے کا ''تکلف'' کیا ہے اور اس سلسلے میں وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ٥ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ٥ سے استدلال کرنے کی ناکام کوشش کی ہے اور اس کا مفہوم انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ''مومن جنت میں اپنے پروردگار کے چہرے کا دیدار کریں گے۔''

امامِ اول اور امامِ ہشتم نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰی ثَوَابِ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ. یعنی اس دن چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف سے ملنے والے ثواب کے منتظر ہوں گے۔

ائمۂ اہلبیتؑ کے فرمان کی تشریح کچھ اس طرح سے ہے:

عربی زبان میں لفظ نَاظِرَة کا کئی معانی پر اطلاق ہوتا ہے مثلاً

(۱) نَاظِرَةٌ یعنی نظر کرنے والی

(۲) نَاظِرَةٌ یعنی انتظار کرنے والی [۱]

قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ بلقیس کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ وہاں ملکہ بلقیس کی زبانی قرآن مجید میں یہ الفاظ مذکور ہیں: اِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ فَنَاظِرَةٌ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ٥ میں ان کی طرف کچھ تحفہ بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لاتے ہیں۔ (سورۂ نمل: آیت ۳۵)

یہاں نَاظِرَةٌ انتظار کرنے والی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ المعجم الوسیط اور مفردات راغب میں مادہ "نظر" دیکھیں۔

اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ میں لفظ ثواب ''مقدر اور محذوف'' ہے اور یوں آیت کا معنی یہ بنے گا: اِلٰی ثَوَابِ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ یعنی اس دن لوگ اپنے پروردگار کے ثواب کے منتظر ہوں گے۔

اور ہم ''دونوں مکاتب فکر میں مکانِ خدا کا مفہوم'' کے تحت ''حذف و تقدیر'' کے قانون پر کافی بحث کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں مکتب خلفاء نے لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ سے استدلال کرنے کی ناکام کوشش کی اور کہا کہ حُسْنٰی سے مراد جنت ہے اور زِیَادَةٌ سے مراد خدا کا دیدار ہے۔

ائمۂ اہلبیتؑ میں سے پہلے، پانچویں اور چھٹے امام نے اس مفروضے کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا ہے کہ زِیَادَةٌ یعنی جنت کے علاوہ اہل ایمان کے لئے اضافی انعام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کے نیک اعمال کے بدلے انہیں دنیا میں نعمتیں عطا فرمائے گا۔

ائمۂ اہلبیتؑ کے فرمان کی مزید وضاحت کے لئے ہم قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر قرآن مجید کی دوسری آیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ اس آیت مجیدہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ○ جن لوگوں نے نیکوکاری کی (آخرت میں) انہیں نیک بدلہ دیا جائے گا اور اس پر ''اضافہ'' بھی دیا جائے گا۔ ان کے چہروں پر ذلت و رسوائی کی گرد نہ بیٹھے گی۔ وہی لوگ جنتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (سورۂ یونس: آیت ۲۶)

۲۔ اب آپ قرآن مجید کی یہ آیت دیکھیں جس میں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت کی وضاحت یوں کی ہے:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ○ نیکوکاروں کیلئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو بہت ہی اچھا ہے اور متقین کا گھر بہت خوب ہے۔ (سورۂ نحل: آیت ۳۰)

اس آیت میں نیکوکاروں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی نوید سنائی گئی ہے۔

ائمۂ ہدیٰ علیہم السلام کے فرمان کی مزید وضاحت کے لئے ہم عرض کرتے ہیں کہ نیکوکاروں کا بدلہ جنت ہے اور اس بدلے کو سورۂ یونس میں لفظ الحُسْنٰی سے تعبیر کیا گیا ہے اور لفظ الحُسْنٰی کی اس تفسیر پر دونوں مکاتبِ فکر متفق ہیں۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیکوکاروں کو جنت کے علاوہ ''اضافی نعمت'' بھی عطا کی جائے گی اور ائمۂ اہلبیتؑ نے فرمایا کہ ''اضافی نعمت'' سے مراد دنیا کی آسائش بھری زندگی ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے "صلۂ رحم" کے فوائد پر توجہ فرمائیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: صلۂ رحمی قیامت کے حساب کو آسان بناتی ہے۔[1]

یہ صلۂ رحمی کا اُخروی صلہ ہے لیکن کیا صلۂ رحمی کا فائدہ صرف آخرت تک ہی محدود ہے؟ نہیں! ایسا نہیں ہے۔ صلۂ رحمی کا فائدہ دنیا میں بھی ہے اور اس کا دنیا میں اضافی فائدہ یہ ہے کہ اس سے عمر لمبی ہوتی ہے اور مال میں برکت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کا یہ فائدہ آخرت کے فائدے کے علاوہ ایک اضافی فائدہ ہے۔

اوصیائے پیغمبرؑ کی نظر میں رؤیتِ الٰہی کا مفہوم

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم یہ گزارش کریں گے کہ اوصیائے پیغمبرؐ نے رؤیتِ باری تعالیٰ کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ مکتبِ خلفاء کے مفہوم سے بالکل جداگانہ ہے۔

امام علی رضا علیہ السلام کے فرامین کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ صفتِ مکان سے موصوف نہیں ہے اور حاسۂ چشم اور افکار و اوہام اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ نیز انبیاء و مرسلین اور اس کی حجتیں — علیہم السلام اجمعین ہی اللہ کا چہرہ ہیں کیونکہ وہی اللہ کی طرف جانے کا سیدھا راستا ہیں اور ان کی رہنمائی سے ہی خدا کی طرف جانے والے راستے کا سفر طے کیا جاسکتا ہے اور جو کچھ بھی زمین پر موجود ہے وہ سب کچھ ختم ہوجائے گا مگر اللہ کی طرف جانے والا راستا باقی رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو بھی میرے رسولؐ کی بیعت کرتا ہے وہ درحقیقت میری بیعت کرتا ہے اور بیعت کرنے والے کے ہاتھ پر اگرچہ ظاہری طور پر رسول اللہؐ کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے اور جو رسول اللہؐ کی زندگی میں ان کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے تو وہ گویا اللہ کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے اور جو بہشت میں رسول اللہؐ کی زیارت کرے تو گویا اس نے اللہ کی زیارت کی ہے۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے:

"جو شخص میری عترت و اہلبیتؑ سے دشمنی رکھے گا اسے قیامت کے دن میرا دیدار نصیب نہیں ہوگا۔"

بزمے کہ دران سفرہ کشد جلوۂ دیدار
کونین غبارے ست کہ از بال مگس ریخت

۱۔ سفینۃ البحار در مادہ "رحم"۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ، باب صلۃ الرحم، ص۱۹۸۲، حدیث۲۰و۲۱۔

عقیدۂ توحید کی حیاتِ نو

مکتبِ خلفاء میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ایسی بہت زیادہ روایات پائی جاتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی جسمانیت کا تذکرہ ہے۔ ان روایات کے مطابق انسان کی طرح سے اللہ تعالیٰ کا بھی چہرہ، پاؤں، پنڈلی، انگلیاں اور ہاتھ ہیں۔

وہ عرش و کرسی پر بیٹھا ہے اور اتنا عظیمُ الجثّہ ہے کہ کرسی کے چاروں اَطراف و اَکناف سے اس کا وجود چار چار انگشت لٹکا ہوا ہے۔ اس کی کرسی آٹھ پہاڑی بکریوں کے اوپر قائم ہے اور وہ بکریاں ایک وسیع و عمیق سمندر کی سطح پر کھڑی ہیں۔ وہ سمندر سات آسمانوں کے اوپر ہے اور زمین و آسمانِ دنیا کا فاصلہ اکہتّر، بہتّر یا تہتّر سال کی مسافت کے برابر ہے۔ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک کا یہی فاصلہ ہے۔ ساتویں آسمان تک یہی مسافت قائم ہے اور پھر ساتویں آسمان کے اوپر جو سمندر ہے اس کی گہرائی بھی اتنی ہی مسافت کے برابر ہے۔ اس سمندر کی سطح پر جو آٹھ پہاڑی بکریاں ہیں ان کے سم سے لے کر زانو تک کا اتنا ہی فاصلہ ہے۔

خدا کے عظیمُ الجثّہ ہونے کے سبب کرسی سے چرچراہٹ کی ویسی ہی آوازیں نکلتی ہیں جیسی کہ اونٹ کے کجاوے پر بھاری سامان رکھنے کے سبب نکلتی ہیں۔ مکتبِ خلفاء کے علماء کا عقیدہ ہے کہ خدا کبھی کبھی عرش و کرسی کو چھوڑ کر آسمانِ اول پر آتا ہے اور بندوں کو ندا دے کر کہتا ہے کہ وہ اس سے حاجات طلب کریں۔ قیامت کے دن خدا ندا دے گا کہ ہر شخص اپنے اپنے معبود کے پیچھے چلا جائے۔ اس کے بعد جنہوں نے غیرُ اللہ کی پوجا کی ہوگی وہ اپنے معبودانِ باطل کے پیچھے چل کر دوزخ کا ایندھن بن جائیں گے اور آخر کار عرصۂ محشر میں صرف امتِ رسولِ مقبولؐ کھڑی رہ جائے گی۔ اس وقت خدا ان کے پاس ایسی شکل و صورت میں آئے گا جو اُن کے لئے نامانوس ہوگی اور وہ امتِ رسولِ مقبولؐ سے تقاضا کرے گا کہ وہ اس کے پیچھے چلے۔

امتِ رسولِ مقبولؐ اس کی بات ماننے سے انکار کردے گی اور کہے گی کہ ہم اپنے خدا کے آنے تک یہیں رہیں گے۔ جب وہ آئے گا تو ہم اس کے پیچھے چل پڑیں گے۔ خدا ان سے پوچھے گا کہ کیا تمہارے اور

تمہارے خدا کے درمیان کوئی علامت بھی مقرر ہے تو وہ کہیں گے کہ جی ہاں! پنڈلی نشانی ہے۔ اس وقت خدا اپنی پنڈلی ظاہر کرے گا اور افرادِ امت پنڈلی دیکھ کر اسے اپنا رب مان لیں گے۔ پھر خدا آگے چل پڑے گا اور یہ امت اس کے پیچھے چل پڑے گی اور یوں جنت میں پہنچ کر دم لے گی۔

علاوہ ازیں جنت میں کبھی کبھی خدا ان کے پاس آئے گا اور ہر ایک کے پاس بیٹھ کر گفتگو کرے گا۔

مکتبِ خلفاء میں اس مفہوم کی بہت زیادہ روایات موجود ہیں اور افسوس تو یہ ہے کہ ان بے سروپا روایات کو ''توحید و ایمان کی روایات'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ابن خزیمہ اس مکتبِ فکر کے ایک سربرآوردہ عالم ہیں۔ انھوں نے اس طرح کی تمام روایات کو یکجا کر کے اس کا نام ''کتاب التوحید'' رکھا ہے۔

ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری نے صحیح بخاری کے ایک باب میں ان روایات کو یکجا کیا اور اس کا نام ''کتابُ التوحید'' رکھا ہے۔

ابوالحسن مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری نے اپنی صحیح میں اس طرح کی روایات کو جمع کر کے اس کا نام ''کتابُ الایمان'' رکھا ہے۔

اس طرح کی بیشتر روایات ''ابوہریرہ دوسیؓ'' اور ان کے یہودی استاد ''کعب الاحبار'' سے مروی ہیں۔

اس سلسلے کی اصل حقیقت یہی ہے کہ مذکورہ روایات ابوہریرہؓ نے اپنے استاد کعب الاحبار سے سنی تھیں اور کعب نے مذکورہ روایات تحریف شدہ توراۃ اور دیگر یہودی کتب سے اخذ کی تھیں اور اس شاطر یہودی نے مذکورہ طرفہ روایات ابوہریرہؓ کو تعلیم کی تھیں اور ابوہریرہؓ نے انہیں ''ترقی'' دے کر ''حدیثِ رسولؐ'' کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ علمی دنیا میں ان روایات کو ''اخبارِ بنی اسرائیل'' یا ''اسرائیلیات'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہودی کتب سے مستعار لی گئی روایات کی وجہ سے مکتبِ خلفاء میں ''تجسیمِ خداوندی'' کا عقیدہ در آیا اور جب مکتبِ خلفاء نے اپنا عقیدہ بنالیا تو عقیدے کی تائید کے لئے قرآن و حدیث میں سے ''وَجْهُ اللّٰه اور یَدُاللّٰه'' جیسے الفاظ سے استدلال کیا اور قرآن مجید کے وہ الفاظ جو خالصتاً مجازی معنوں میں استعمال ہوئے تھے، مکتبِ خلفاء نے انہیں حقیقی مفہوم پر محمول کیا اور ان الفاظ سے سچ مچ کے اعضائے بدن مراد لئے اور پھر ان الفاظ پر انحصار کر کے انہوں نے اپنے عقیدے کا ان الفاظ سے اعلان کیا کہ انسانوں کی طرح سے خدا بھی اعضا و جوارح رکھتا ہے۔ پھر مختلف سیاسی وجوہات کی بنا پر ایسے ہی عقائد کو دربارِ خلافت میں پذیرائی بخشی گئی اور یوں مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے اسے اسلامی عقیدے کے طور پر قبول کرلیا اور صفاتِ ربوبیت کے متعلق مسلمانوں کی اکثریت کو اس کے علاوہ اور کسی مفہوم کا پتا تک نہیں تھا۔

جب مکتب خلفاء میں عقیدۂ توحید میں اس طرح کی اوہام پرستی کو تقدس کا درجہ حاصل ہوا تو ائمۂ اہلبیتؑ نے یعنی پہلے امام سے لے کر آٹھویں امام[1] تک سب نے مسلسل لوگوں کو اصل حقیقت سے باخبر کیا اور تحریف شدہ احادیث کی نشاندہی کی۔

مثلاً مکتبِ خلفاء میں ایک حدیث بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری حصے میں آسمانِ دنیا پر اترتا ہے اور لوگوں کو ندا دیتا ہے۔

ائمۂ اہلبیتؑ نے فرمایا کہ اس حدیث میں تحریف کی گئی ہے اور صحیح حدیث یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ہر رات کی آخری تہائی میں ایک فرشتے کو آسمانِ دنیا پر بھیجتا ہے جو لوگوں سے اسی طرح کی گفتگو کرتا ہے۔''

اس طرح سے ائمۂ اہلبیتؑ نے مکتبِ خلفاء کی بہت سی روایات کی تردید کی اور قرآن مجید کی آیات کے صحیح مفہوم کے لئے عربی زبان کے قواعد سے دلائل فراہم کئے۔ ائمۂ ہدیٰ علیہم السلام کی ان تھک کوششوں کی وجہ سے لوگوں کو انحرافی تفسیر کا پتا چلا اور حقیقی تفسیر منظر عام پر آئی۔

پھر ائمۂ ہدیٰ علیہم السلام کی تعلیماتِ عالیہ سے اِلہام پا کر مکتبِ اہلبیتؑ کے علماء نے عقیدۂ توحید کے متعلق صحیح روایات اور صحیح تأویل کو یکجا کر کے کتابیں لکھیں جو متلاشیانِ حق کے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں شیخ الطائفہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ کی ''کتاب التوحید'' اور شیخ الاسلام علامہ مجلسی کی بحارالانوار میں ''کتاب التوحید'' ایک زبردست علمی کاوش کا درجہ رکھتی ہیں۔

اور یوں ائمۂ ہدیٰ علیہم السلام کی شبانہ روز کوششوں اور ان کے اصحاب کی عرق ریزیوں اور ان کے مکتب کے علماء کی مسلسل جدوجُہد سے ربّ العالمین کی توحید کے عقیدہ کو حیاتِ نو نصیب ہوئی اور جو شخص بھی حقیقی توحید کا طلبگار تھا اس کے لئے سامانِ ہدایت فراہم کیا گیا۔

ہم یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ائمۂ اہلبیتؑ نے جس عقیدۂ توحید کو اَز سرِ نو زندہ کیا تھا آج ہم اللہ کے فضل سے اسی صحیح عقیدۂ توحید پر قائم ہیں اور ہم نے یہ عقیدہ ائمۂ اہلبیتؑ سے حاصل کیا۔ وَلِلّٰہِ الْحَمْد۔

ہم نے سابقہ مَباحث میں یہ بھی دیکھا کہ ائمۂ اہلبیتؑ نے اپنی تعلیمات کے دوران ہمیں کئی علمی قوانین سے بھی روشناس کرایا اور انہوں نے ہمیں صِفاتِ پروردگار اور انبیاءؑ و اوصیاءؑ کے مقام کی شناخت کے لئے علمی ترازو بھی عطا کیا اور ہم اس ترازو کی مدد سے آیاتِ قرآنی کے حقائق اور ان کے صحیح مَعانی کا اِدراک کرسکتے ہیں اور اسی ترازو کی مدد سے ہمیں احادیثِ رسولؐ سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔

۱۔ ہم نے آٹھ ائمہ تک کے الفاظ صرف اس لئے لکھے کہ امام علی رضا علیہ السلام کے بعد تین ائمہ یعنی امام محمد تقیؑ، امام علی نقیؑ، اور امام حسن عسکریؑ کو حکمرانوں نے تبلیغ کا وقت ہی نہیں دیا اور تینوں ائمہ کی پوری زندگی عباسی بادشاہوں کی نظر بندی میں گزری۔

ائمۂ طاہرینؑ کی ان تعلیمات عالیہ کے نتیجے میں مسلمانوں میں ایک مکتب فکر وجود میں آیا جسے **مکتب اہلبیتؑ** کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مکتب کے افراد صفات ربوبیت اور انبیاءؑ و اوصیاءؑ کے مقام کی پہچان اور قرآنی آیات اور حدیث پیغمبرؐ کے انہیں معانی و مفاہیم کے قائل ہیں جو اہلبیتؑ نے بیان فرمائے تھے۔ اس مکتب کی پیروی کرنے والے افراد کو "پیروان مکتب اہلبیتؑ" کہا جاتا ہے۔

دل چاہتا ہے کہ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم ائمہ معصومینؑ پر — جو زمین پر خدا کا نور، تمام اہل عالم پر خدا کی حجت کاملہ، فضائل انسانی کا بلند ترین نکتۂ کمال، اچھائیوں اور نیکیوں کا مجموعہ اور خدا سے واصل انسانوں کا کامل نمونہ ہیں — **زیارت جامعہ** کے ان الفاظ میں سلام عقیدت پیش کریں:

اَلسَّلاَمُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ بَيْتِ النُّبُوَّةِ... وَخُزَّانَ الْعِلْمِ

اَلسَّلاَمُ عَلٰى اَئِمَّةِ الْهُدٰى وَ مَصَابِيحِ الدُّجٰى...

اَلسَّلاَمُ عَلٰى مَحَالِّ مَعْرِفَةِ اللّٰهِ...

اَلسَّلاَمُ عَلَى الدُّعَاةِ اِلَى اللّٰهِ... وَالْمُخْلِصِيْنَ فِيْ تَوْحِيْدِ اللّٰهِ...

رَضِيَكُمْ... اَنْصَارًا لِدِيْنِهِ... وَ تَرَاجِمَةً لِوَحْيِهِ وَ اَرْكَانًا لِتَوْحِيْدِهِ...

وَ دَعَوْتُمْ اِلٰى سَبِيْلِهِ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ...

فَثَبَّتَنِيَ اللّٰهُ اَبَدًا مَا حَيِيْتُ عَلٰى مُوَالاَتِكُمْ وَ مَحَبَّتِكُمْ وَ دِيْنِكُمْ...

وَجَعَلَنِيْ مِمَّنْ يَقْتَصُّ آثَارَكُمْ وَ يَسْلُكُ سَبِيْلَكُمْ وَ يَهْتَدِيْ بِهُدَاكُمْ...

خاندان نبوتؐ آپ پر سلام... اے علم و معرفت کے خزینہ دارو آپ پر سلام...

راہ ہدایت کے رہبروں پر سلام... اور تاریکیوں کے چراغوں پر سلام...

(ان دلوں پر) سلام جو معرفت خدا کا مقام ہیں...

خدا کی طرف دعوت دینے والوں پر سلام... اور ان پر سلام جو خدا کی توحید میں مخلص ہیں...

اللہ نے آپ کو دین کے مددگاروں کے طور پر چنا ہے... اور آپ کو اپنی وحی کا ترجمان قرار دیا ہے اور آپ کو اپنی توحید کا ستون قرار دیا ہے...

آپ نے لوگوں کو حکمت اور اچھے مواعظ سے اللہ کی راہ کی دعوت دی ہے...

جب تک میں زندہ رہوں خدا مجھے آپ کی دوستی، آپ کی محبت اور آپ کے دین پر ثابت قدم رکھے۔

مجھے ان لوگوں میں سے قرار دے جو آپ کے نقش قدم پر چلتے ہیں، آپ کا راستا اختیار کرتے ہیں اور آپ کی ہدایت سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

قرآن قدیم ہے یا مخلوق؟

در مکتبِ خلفاء

مکتبِ خلفاء کے فرقوں کے مابین صرف خدا کی صفات اور خدا کے صاحبِ اعضاء ہونے یا نہ ہونے کے متعلق ہی اختلاف نہیں بلکہ اس عقیدے کے ذیل میں اُن کے درمیان ایک اور بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک فرقہ جو خدا کے لئے ہاتھ، پاؤں اور آنکھ وغیرہ کا قائل ہے کلامِ خدا کو بھی صفاتِ خدا کا حصہ سمجھتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ جس طرح خدا اور اس کی صفات ''قدیم'' ہیں اسی طرح سے قرآن مجید — جو کہ خدا کا کلام ہے — ''قدیم'' ہے۔ پس جو شخص قرآن مجید کو مخلوق کہتا ہے وہ صفاتِ باری میں سے ایک صِفَت کو مخلوق سمجھتا ہے اور ایسا شخص اس عقیدے کی بنا پر کافر ہے۔

مکتبِ خلفاء کے دوسرے فرقے کا موقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ''ذات'' کے علاوہ کوئی چیز ''قدیم'' نہیں ہے اور قرآن مجید مخلوق ہے۔ جو شخص قرآن مجید کو ''قدیم'' کہتا ہے تو وہ اللہ کے ساتھ ''ایک اور قدیم'' ماننا ہے اور ''دو قدیم'' ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے حالانکہ خدا کے ساتھ ''ایک اور قدیم'' ماننا شرک ہے لہٰذا جو شخص قرآن مجید کو قدیم سمجھتا ہے وہ مشرک ہے۔ پہلا فرقہ مجسمہ اور مشبّہ کا تھا اور دوسرا فرقہ جہمیہ کا تھا۔ رفتہ رفتہ جہمیہ معتزلہ ہوگئے اور بعدازاں ان دو ابتدائی فرقوں کی کوکھ سے دیگر فرقے پیدا ہوئے۔[1]

قرآن کے متعلق اختلاف کب پیدا ہوا؟

اس اختلاف کی شروعات مقاتل بن سلیمان — المتوفی ۱۵۰ھ جس کا تعلق حشویہ اہلحدیث سے تھا— اور جہم بن صفوان — المتوفی ۱۲۸ھ جو کہ اہلِ کلام کا پیشرو تھا— کے درمیان مباحثوں سے ہوئی۔ پھر اس بحث کا

۱۔ اسفرائنی، الفَرق بین الفِرَق، ص ۱۱۴۔۱۸۳۱، ۲۱۱۔۲۲۸ اور شہرستانی، الملل والنحل، جلد ۱، ص ۹۳۔۱۰۳۔

سلسلہ چل نکلا اور اس موضوع پر معتزلہ، اشاعرہ اور اہلحدیث کے درمیان طویل مناظرے ہوئے جیسا کہ ہم مسلمان فرقوں کے تعارف میں بتا چکے ہیں۔

پھر آہستہ آہستہ ان مباحثوں نے اتنا زور پکڑا کہ اس کے سبب مسلمانوں میں گشت و خون ہونے لگا۔ خونریزی کا یہ سلسلہ عباسی خلیفہ مامون رشید المتوفی ۲۱۸ھ کے دور میں شروع ہوا اور پورے تیس سال یعنی معتصم باللہ، واثق باللہ اور متوکّل کے دوٗر تک جاری رہا۔ اس سلسلے کا آغاز اس وقت ہوا جب مامون نے ۲۱۱ھ میں معاویہ کی مدح پر حکمِ امتناعی جاری کرتے ہوئے ایک فرمان میں اپنا یہ عقیدہ تحریر کیا کہ بعداز پیغمبر اسلامؐ، حضرت علیؑ تمام صحابہ سے افضل ہیں اور معاویہ کی ستائش کرنے والے کا خون بہانا جائز ہے۔[1]

پھر اس نے ۲۱۲ھ میں یہ فرمان جاری کیا کہ قرآن مجید اللہ کی مخلوق ہے اور حضرت علیؑ، ابوبکرؓ و عمرؓ سے افضل ہیں۔ اس فرمان سے مکتبِ خلفاء کے پیروکاروں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی اور قریب تھا کہ فتنہ بپا ہوجائے اس لئے مامون نے خاموشی اختیار کرلی لیکن ۲۱۸ھ میں پھر اس نے قرآن مجید کے متعلق اپنے نظریے کا دوبارہ اظہار کیا۔[2] اس نے شام کے شہر ''رقّہ'' سے والیٔ بغداد کے نام اپنا مفصّل فرمان جاری کیا اور لکھا:

''بے خبر گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید قدیم ہے اور اللہ نے قرآن مجید کو خلق نہیں فرمایا۔''

(پھر اس نے اپنے خط میں بطور دلیل چند آیات تحریر کیں جو ہم آگے نقل کریں گے۔)

خلیفہ مامون نے اپنے فرمان میں مزید لکھا:

یہ لوگ جو اپنے آپ کو اہلسنت والجماعت کہتے ہیں اور اپنے مخالفین کو کافر اور باطل پرست خیال کرتے ہیں وہ خود عقیدۂ توحید میں ناقص ہیں اس لئے ان لوگوں پر دینی امور میں بھروسا نہیں کیا جاسکتا حتیٰ کہ ان کی گواہی کو بھی قبول نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ شخص کائنات کا جھوٹا ہے جو وحیُ خداوندی کے متعلق جھوٹ کہے۔ پس تم تمام قاضیوں کو جمع کرو اور ان کے سامنے عقیدۂ خلقِ قرآن کا اعلان کرو اور اس عقیدے کے لئے ان کا امتحان لو۔ انہیں میری طرف سے کھلے لفظوں میں بتادو کہ میں حکومت کی ذمہ داری ایسے افراد کے سپرد نہیں کرسکتا جن کی دینداری پر اعتماد نہ ہو۔ گواہوں کی موجودگی میں ان سے قرآن مجید کے متعلق سوال کرو اور ہمارے اس

۱۔ وَفِیْ سَنَةِ اِحْدٰی عَشْرَةَ اَمَرَ الْمَامُوْنُ بِاَنْ یُّنَادٰی: بَرِئَتِ الذِّمَّةُ مِمَّنْ ذَکَرَ مُعَاوِیَةَ بِخَیْرٍ وَاَنَّ اَفْضَلَ الْخَلْقِ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ. سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۸۔

۲۔ وَفِیْ سَنَةِ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَظْهَرَ الْمَامُوْنُ الْقَوْلَ بِخَلْقِ الْقُرْآنِ مُضَافًا اِلٰی تَفْضِیْلِ عَلِیٍّ عَلٰی اَبِیْ بَکْرٍ وَّ عُمَرَ، فَاشْمَأَزَّتِ النُّفُوْسُ مِنْهُ، وَکَادَ الْبَلَدُ یَفْتَتِنُ، وَلَمْ یَلْتَئِمْ لَهٗ مِنْ ذٰلِکَ مَا اَرَادَ، فَکَفَّ عَنْهُ اِلٰی سَنَةِ ثَمَانِ عَشْرَةَ.

فرمان کو پورے ملک میں جاری کرو اور پھر حکومت کے کار پردازوں سے رپورٹ لے کر ہمیں ارسال کرو۔[۱]

خلیفہ کا فرمان ملتے ہی والیٔ بغداد نے مکتبِ خلفاء کے علماء کو طلب کیا اور ان سے تفصیلی گفتگو کی جس کی تفصیل طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر نے نقل کی ہے۔

پھر والیٔ بغداد نے علماء سے گفتگو کی روداد مامون کو لکھ بھیجی جس کے بعد مامون نے اسے حکم دیا کہ جو کوئی قرآن مجید کو مخلوق ماننے پر تیار نہ ہو اس کی گردن مار دو کیونکہ وہ مشرک ہے۔ علاوہ بریں کچھ لوگوں کو میرے پاس یہاں ''رقہ'' بھیج دو کہ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس کے باوجود بھی انہوں نے میرا نظریہ قبول نہ کیا تو میں انہیں قتل کر دوں گا۔

اس فرمان کے بعد والیٔ بغداد نے دوبارہ تمام علماء کو اپنے پاس بلایا اور انہیں خلیفہ کا حکم پڑھ کر سنایا۔ جب علماء نے خلیفہ کا یہ تاکیدی حکم سنا تو (امام) احمد بن حنبل اور ایک دوسرے شخص کے علاوہ سب نے کہا کہ ہم قرآن کو مخلوق تسلیم کرتے ہیں۔

---

[۱] تاریخ الخلفاء میں سیوطی کی مفصل عبارت حسب ذیل ہے:

وفي سنة ثمان عشرة امتحن الناس بالقول بخلق القرآن، فكتب إلى نائبه على بغداد و اسحاق بن ابراهيم الخزاعي بن عم طاهر بن الحسين في امتحان العلماء كتابا يقول (هذا الكتاب في تاريخ الطبري، ۱۰/۲۸۴) فيه وقد عرف امير المؤمنين ان الجمهور الأعظم والسواد الأكبر من حشوة الرعية وسفلة العامة ممن لا نظر له ولا رؤية ولا استضاءة بنور العلم و برهانه اهل جهالة بالله وعمي عنه و ضلالة عن حقيقة دينه، و قصور ان يقدروا الله حق قدره و يعرفوه كنه معرفته و يفرقوا بينه وبين خلقه و ذلك انهم ساووا بين الله و بين ما انزل من القرآن، فاطبقوا على انه قديم لم يخلقه الله و يخترعه و قد قال الله تعالى: (انا جعلناه قرآنا عربيا) فكل ما جعله الله فقد خلقه كما قال تعالى: (وجعل الظلمات والنور) وقال: (كذلك نقص عليك من انباء ما قد سبق) فاخبر انه قصص لامور احدثه بعدها وقال: (احكمت آياته ثم فصلت) والله محكم كتابه و مفصله فهو خالقه و مبتدعه. ثم انتبوا الى السنة و اظهروا انهم اهل الحق والجماعة، وان من سواهم اهل الباطل والكفر فاستطالوا بذلك و غروا به الجهال، حتى مال قوم من اهل السمت الكاذب التخشع لغير الله الى موافقتهم، فتركوا الحق الى باطلهم و اتخذوا دون الله وليجة الى ضلالهم، الى ان قال: فرأى امير المؤمنين ان اولئك شر الامة المنقوصون من التوحيد حظا و اوعية الجهالة واعلام الكذب ولسان ابليس الناطق في اوليائه والهائل على اعدائه من اهل دين الله واحق من يتهم في صدقه و تطرح شهادته ولا يوثق به من عمي عن رشده و حظه من الايمان (بالله و) بالتوحيد، وكان عما سوى ذلك اعمى واضل سبيلا. و لعمر امير المؤمنين ان اكذب الناس من كذب على الله و وحيه و تخرص الباطل ولم يعرف الله حق معرفته، فاجمع من بحضرتك من القضاة فاقرأ عليهم كتابنا و امتحنهم فيما يقولون و اكشفهم عما يعتقدون في خلقه واحداثه و اعلمهم اني غير مستعين في عملي ولا واثق بمن لا يوثق بدينه، فاذا اقروا بذلك و افقوا بنص من بحضرتهم من الشهود و مسألتهم عن علمهم في القرآن و ترك شهادة من لم يقر انه مخلوق و اكتب الينا بما يأتيك عن قضاة اهل عملك في مسائلهم والامر لهم بمثل ذلك.

والیٔ بغداد نے (امام) احمد بن حنبل اور دوسرے شخص کو خلیفہ کے پاس روانہ کردیا لیکن ابھی وہ دونوں راستے ہی میں تھے کہ مامون کی وفات ہوگئی۔[۱]

اس معرکے کی شدت

اس معرکے کی آگ کو بھڑکانے میں مامون کے مشیر خاص احمد بن ابی داوٗد المتوفی ۲۴۰ھ[۲] نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ مامون نے حالت نزع میں اپنے ولی عہد اور اپنے بھائی معتصم کو وصیت کرتے ہوئے کہا: احمد بن ابی داوٗد کو اپنے سے کبھی جدا نہ کرنا اور تمام امور مملکت میں اس سے مشورہ کرتے رہنا کیونکہ وہ مشورہ دینے کا اہل ہے اور میرے مرنے کے بعد اس کے علاوہ کسی کو وزیر نہ بنانا۔[۳]

مامون کی اس خصوصی وصیت کی وجہ سے احمد بن ابی داوٗد معتصم کا مشیر خاص اور قاضی القضاۃ بن گیا۔

۱۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۶۔۳۱۲، مطبوعہ مصر ا۱۳۷ھ درحالات مامون الرشید۔
سیوطی کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

ثم کتب المامون کتابا اخر من جنس الاول الی اسحاق و امره باحضار من امتنع، فاحضر جماعة منهم احمد بن حنبل و بشر بن الولید الکندی وابوحسان الزیادی و علی بن ابی مقاتل و الفضل بن غانم و عبدالله بن عمر القواریری و علی بن الجعد و سجادة والزیال بن الهیثم و قتیبة بن سعید و سعدویه الواسطی و اسحاق بن ابی اسرائیل و ابن الهرس و ابن علیة الاکبر و محمد بن نوح العجلی و یحیٰی بن عبدالرحمٰن العمری و ابونصر التمار و ابو معمر القطیعی و محمد بن حاتم بن میمون وغیرهم و عرض علیهم کتاب المامون فعرّضوا و ورّوا ولم یجیبوا ولم ینکروا فقال لبشر بن الولید: ما تقول؟ قال: قد عرفت امیرالمؤمنین غیر مرة قال: و الآن فقد تجدد من امیرالمؤمنین کتاب، قال: اقول: کلام الله، قال: لم اسألک بهذا، مخلوق هو؟ قال: ما احسنُ غیر ما قلت لک وقد استعهدت امیرالمؤمنین ان لا اتکلم فیه. ثم قال لعلی بن ابی مقاتل: ما تقول؟ قال: القرآن کلام الله وان امرنا امیرالمؤمنین بشیءٍ سمعنا و اطعنا و اجاب ابوحسان الزیادی بنحو من ذلک. ثم قال لاحمد بن حنبل: ما تقول؟ قال: کلام الله، قال: امخلوق هو؟ قال: کلام الله لازید علی هذا ثم امتحن الباقین و کتب بجواباتهم، ثم بلغ المامون ان الذین اجابوا انما اجابوا مکرهین فغضب و امر باحضارهم الیه فحملوا الیه فبلغتهم وفاة المامون قبل وصولهم الیه ولطف الله بهم و فرج عنهم.

۲۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، ج ا، ص ۶۷، درحالات احمد بن ابی داوٗد۔ حافظ سیوطی، تاریخ الخلفاء، درحالات واثق باللہ، ص ۳۴۱۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج ا، ص ۱۴۲۔

۳۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، ج ا، ص ۶۷، فاختار خمسة فیهم ابن ابی داؤد و اتصل امره و اسند المامون وصیته عندالموت الی اخیه المعتصم وقال فیها: وابوعبدالله احمدبن بی داؤد لایفارقک الشرکة فی المشورة فی کل امرک،فانه موضع ذلک ولاتتخذن بعدی وزیرًا۔

وہ اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔[۱]

معتصم نے بھی ۲۱۸ھ میں اپنے تمام گورنروں کو فرمان جاری کیا کہ وہ قرآن کے مخلوق ہونے کی بابت مسلمانوں کا امتحان لیں اور اساتذہ کو چاہئے کہ وہ اپنے شاگردوں کو اس عقیدے کی تعلیم دیں۔ اس نے لکھا کہ جو علماء اس عقیدے کی مخالفت کریں انہیں بے دریغ قتل کردیا جائے۔[۲]

احمد ابن ابی داؤد کے حکم سے ۲۲۰ھ میں (امام) احمد بن حنبل کو گرفتار کیا گیا اور اس الزام کے تحت انہیں کوڑے مارے گئے کہ وہ قرآن مجید کو مخلوق تسلیم نہیں کرتے تھے۔[۳]

پھر ۲۲۷ھ میں معتصم مرگیا اور اس کا بیٹا واثق باللہ اس کا جانشین ہوا۔ واثق کے دورِ خلافت میں احمد بن ابی داؤد کے اثر و نفوذ میں مزید اضافہ ہوگیا۔[۴]

مامون اور معتصم کی طرح واثق نے بھی ۲۳۱ھ میں والیٔ بصرہ کو ایک خط میں یہ حکم دیا کہ ائمۂ جماعت اور موذنین کا عقیدۂ خلقِ قرآن کے لئے امتحان لو۔[۵]

اور اسی سال احمد بن نصر خزاعی کو جو اہلحدیث تھا اور قرآن مجید کو قدیم مانتا تھا، طوق و زنجیر میں جکڑ کر

۱۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، جلد۱، ص۶۷، درحالات احمد بن ابی داؤد۔ وَلَمَّا وَلِيَ الْمُعْتَصِمُ الْخِلَافَةَ جَعَلَ ابْنَ اَبِي دَاؤُدَ قَاضِيَ الْقُضَاةِ وَعَزَلَ يَحْيَى بْنَ اَكْثَمَ وَخَصَّ بِهِ اَحْمَدَ حَتّٰى كَانَ لَايَفْعَلُ فِعْلًا بَاطِنًا وَلَا ظَاهِرًا اِلَّا بِرَأْيِهِ.

۲۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص۳۳۵، درحالات معتصم۔ بُوْيِعَ لَهٗ بِالْخِلَافَةِ بَعْدَ الْمَاْمُوْنِ فِيْ شَهْرِ رَجَبَ سَنَةَ ثَمَانَ عَشَرَةَ وَمِائَتَيْنِ فَسَلَكَ مَاكَانَ الْمَاْمُوْنُ عَلَيْهِ وَ خَتَمَ بِهٖ عُمْرَهٗ مِنْ اِمْتِحَانِ النَّاسِ بِخَلْقِ الْقُرْآنِ فَكَتَبَ اِلَى الْبِلَادِ بِذٰلِكَ وَ اَمَرَ الْمُعَلِّمِيْنَ اَنْ يُّعَلِّمُوا الصِّبْيَانَ ذٰلِكَ وَقَاسَى النَّاسُ مِنْهُ مَشَقَّةً فِيْ ذٰلِكَ وَقَتَلَ عَلَيْهِ خَلْقًا مِّنَ الْعُلَمَاءِ.

۳۔ سیوطی، تاریخ خلفاء، درحالات معتصم۔ وَضُرِبَ الْاِمَامُ اَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ كَانَ ضَرْبُهٗ فِيْ سَنَةِ عِشْرِيْنَ وَمِائَتَيْنِ.

ابن خلکان، وفیات الاعیان، ج۱، ص۶۷ درحالات احمد بن ابی داؤد اور درحالات احمد بن حنبل، ص۴۸۔

وَامْتَحَنَ ابْنُ اَبِيْ دَاؤُدَ الْاِمَامَ اَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ وَ اَلْزَمَهُ الْقَوْلَ بِخَلْقِ الْقُرْآنِ الْكَرِيْمِ وَ ذٰلِكَ فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ سَنَةَ عِشْرِيْنَ وَمِائَتَيْنِ.

خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، جلد۴، ص۴۲۲۔ اَخْبَرَنَا عَلِيُّ بْنُ اَحْمَدَ بْنِ عُمَرَ الْمُقْرِي اَخْبَرَنَا اَبُوْبَكْرٍ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ الشَّافِعِيُّ، حَدَّثَنَا اَبُوْغَالِبٍ ابْنُ بِنْتِ مُعَاوِيَةَ حَدَّثَنَا اَبُوْعَبْدِاللّٰهِ اَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ حَنْبَلٍ الشَّيْبَانِيُّ. وَوُلِدَ سَنَةَ اَرْبَعٍ وَّ سِتِّيْنَ وَمِائَةٍ وَضُرِبَ بِالسِّيَاطِ فِي اللّٰهِ فَقَامَ مَقَامَ الصِّدِّيْقِيْنَ فِيْ عَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ سَنَةَ عِشْرِيْنَ وَمِائَتَيْنِ.

۴۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان، جلد۱، ص۶۷۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص۳۴۱۔ وَلَمَّامَاتَ الْمُعْتَصِمُ وَ تَوَلّٰى بَعْدَهٗ وَلَدُهُ الْوَاثِقُ بِاللّٰهِ حَسُنَتْ حَالُ ابْنِ اَبِيْ دَاؤُدَ عِنْدَهٗ.

۵۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص۳۴۰۔ وَفِيْ سَنَةِ اِحْدٰى وَثَلَاثِيْنَ وَرَدَ كِتَابُهٗ اِلٰى اَمِيْرِ الْبَصْرَةِ يَاْمُرُهٗ اَنْ يَّمْتَحِنَ الْاَئِمَّةَ وَالْمُؤَذِّنِيْنَ بِخَلْقِ الْقُرْآنِ وَكَانَ قَدْ تَبِعَ اَبَاهُ فِيْ ذٰلِكَ ثُمَّ رَجَعَ فِيْ آخِرِ اَمْرِهٖ.

واثق کے پاس سامرا لایا گیا۔

واثق نے اس سے پوچھا: قرآن کے متعلق تیرا کیا عقیدہ ہے؟

احمد نے کہا: قرآن مخلوق نہیں ہے۔

واثق نے کہا: قیامت کے دن رؤیت باری کے متعلق تیرا کیا عقیدہ ہے؟

احمد نے کہا: یہ عقیدہ روایات سے ثابت ہے۔ پھر اس نے اس مفہوم کی ایک روایت بھی پڑھی۔

واثق نے کہا: تو جھوٹ بولتا ہے۔

احمد نے کہا: میں نہیں، تو جھوٹ بولتا ہے۔

واثق نے کہا: تجھ پر افسوس! کیا خدا جسم محدود کی طرح سے دیکھا جائے گا اور کیا وہ ایک جگہ میں محدود ہوگا اور کیا تو حاسۂ چشم سے ایک مخصوص جگہ پر دیکھے گا؟

احمد نے کہا: میں ان صفات سے متصف خدا کی عبادت نہیں کرتا۔

اس مجلس میں موجود معتزلی علماء نے فوراً فتویٰ دیا کہ اس کا خون حلال ہے۔

واثق نے تلوار طلب کی اور حاضرین سے کہا: جب میں اسے قتل کرنے کے لئے اٹھوں تو تم میں سے کوئی بھی میری مدد کے لئے نہ اٹھے۔ میں تن تنہا اسے قتل کروں گا اور اس کافر کو قتل کرنے کے لئے جتنے بھی قدم اٹھاؤں گا وہ سب خدا کے ہاں ذخیرۂ ثواب ثابت ہوں گے۔ یہ کافر جس خدا کی عبادت کرتا ہے ہم اس کی عبادت نہیں کرتے اور یہ خدا کے متعلق جن صفات کا عقیدہ رکھتا ہے ہم ان صفات کا عقیدہ نہیں رکھتے۔

پھر اس نے کہا: چمڑے کا فرش بچھایا جائے۔ خلیفہ کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ چمڑے کا فرش بچھایا گیا اور پابندِ سلاسل احمد کو اس پر بٹھا دیا گیا۔ خلیفہ تلوار لے کر آگے بڑھا اور چشم زدن میں اس کا سر قلم کر دیا۔

اس کے بعد خلیفہ نے حکم دیا کہ اس کے سر کو بغداد کے مرکزی چوک پر آویزاں کیا جائے۔ ایک تحریر لکھی گئی جس میں یہ الفاظ مرقوم تھے: ''یہ احمد کا سر ہے جسے امام — واثق باللہ — نے عقیدۂ خلق قرآن اور خداوندِ عالم کو اس کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ سے نفی کی دعوت دی لیکن اُس نے اِس دعوت کو قبول نہیں کیا جس کی خدا نے اُسے سزا دی ہے۔''

مذکورہ تحریر اس کے کان کے ساتھ لٹکا دی گئی اور احمد کا سر پورے چھ برس تک بغداد میں لٹکتا رہا۔ واثق کی موت کے بعد جب متوکل خلیفہ بنا تو اس نے حکم دیا کہ اس سر کو اتار کر دفن کر دیا جائے۔

۲۳۱ھ میں رومیوں کے ساتھ ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت ۱۶۰۰ مسلمان قیدیوں کو رہائی ملنی تھی۔ اس موقع پر احمد بن ابی داؤد نے حکم دیا کہ قیدیوں کی واپسی کے موقع پر مسلمان قیدیوں کا امتحان لیا جائے اور جو

قیدی خلق قرآن کے عقیدے کا قائل ہو اسے رومیوں سے آزاد کرایا جائے اور اسے دو دینار بھی دیے جائیں اور جو قیدی خلقِ قرآن کے عقیدے کو تسلیم نہ کرے اسے رومیوں کے پاس رہنے دیا جائے۔[1]

پھر ۲۳۲ھ میں واثق مرگیا اور اس کا بھائی متوکل خلیفہ بنا۔

متوکل اپنے پیشرو تین خلفاء سے بالکل مختلف عقیدہ رکھتا تھا۔ وہ مامون، معتصم اور واثق کے عقائد کا شدید مخالف تھا۔ وہ حشویہ اہلحدیث تھا لہٰذا اس نے قرآن مجید کو قدیم ماننے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور اسے مخلوق کہنے والوں کو خوب ذلیل و رسوا کیا۔ دوسرے حشویہ اہلحدیث کی طرح وہ بھی حضرت علیؑ اور ان کے خاندان سے شدید دشمنی رکھتا تھا۔ اہلبیتِ اطہارؑ سے اس کی دشمنی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے امام حسینؑ کی قبرِ مطہرؑ کا نام ونشان مٹانے کے لئے اس پر دریا کا پانی چھوڑ دیا تھا۔

متوکل نے اپنے مخصوص نظریات کی وجہ سے (امام) احمد بن حنبل کی قدردانی کی اور دربارِ شاہی میں انہیں بڑی عزّت نصیب ہوئی۔ ۲۴۱ھ میں جب ان کی وفات ہوئی تو بغداد میں ان کا جنازہ دھوم دھام سے اٹھایا گیا۔ مؤرخین کے بقول آٹھ لاکھ مردوں اور ساٹھ ہزار عورتوں نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔ موت کے بعد ایک عرصے تک ان کی قبر زیارت گاہِ خلائق بنی رہی۔[2]

۱۔ مذکورہ تینوں واقعات کو سیوطی نے تاریخ الخلفاء ص۳۴۰ پر اور خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد ج۴، ص۱۴۱ پر نقل کیا ہے۔ تاریخ بغداد کی عبارت یہ ہے:

وفی هذه السنة قتل احمد بن نصر الخزاعی وکان من اهل الحدیث قائمًا بالامر بالمعروف والنهی عن المنکر احضره من بغداد الی سامرا مقیدًا مسأله عن القرآن فقال: لیس بمخلوق، وعن الرؤیة فی القیامة، فقال: کذا جاءت الروایة وروی له الحدیث، فقال الواثق له: تکذب، فقال للواثق: بل تکذب انت، فقال ویحک! یُرٰی کما یُرٰی المحدُودُ المتجسم و یَحویه مکان ویحصره الناظر؟ انما کفرت برب صفته ما تقولون فیه؟ فقال جماعة من فقهاء المعتزلة الذین حوله: هو حلال الضرب، فدعا بالسیف وقال: اذا قمت الیه فلا یقومنّ احدٌ معی فانی احتسب خطای الی هذا الکافر الذی یعبد ربًا لا نعبُدُه ولا نعرفُه بالصفة التی وصفه بها. ثم امر بالنطع فاجلس علیه وهو مقید فمشی الیه فضرب عنقه وامر بحمل رأسه الی بغداد فصلب بها وصلبت جثته فی سر من رأی واستمرّ ذلک ست سنین الی ان ولی المتوکل فانزله و دفنه ولما صلب کتب ورقة و علقت فی اُذنه فیها: هذا رأس احمد بن نصر ابن مالک دعاه عبدالله الامام واثق الی القول بخلق القرآن ونفی التشبیه فابی الا المعاندة فعجله الله الی ناره.

وفی هذه السنة استفک من الروم الفًا وستة مائة اسیر مسلم، فقال ابن ابی داؤد قبحه الله! من قال من الاساری "القرآن مخلوق" خلصوه واعطوه دینارین و من امتنع دعوه فی الاسر.

۲۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج۴، ص۴۲۲۔ عن البغوی ان بنان بن احمد القصبانی اخبرهم انه حضر جنازة احمد بن حنبل مع من حضر، قال فکانت الصفوف من المیدان الی قنطرة ربع القطیعة و حزر من حضرها من الرجال ثمانمأة الف، ومن النساء ستین الف امرأة وکان دفنه یوم جمعة، قال: وصلی علیه محمد بن عبدالله بن طاهر.

پھر ۲۴۷ھ میں متوکل مر گیا۔ متوکل کی موت کے ساتھ قرآن کے قدیم یا مخلوق ہونے کا مسئلہ بھی دب گیا اور آنے والے خلفاء نے اس مسئلے سے کوئی تعرض نہ کیا۔ حکومتی سطح پر تو یہ مسئلہ ختم ہوگیا لیکن عوامی سطح پر یہ مسئلہ باعثِ نزاع بنا رہا اور اس کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کو ایک مدت تک لعنت ملامت کرتے رہے۔

قرآن کو مخلوق ماننے والوں کے دلائل

یہاں تک آپ نے مکتبِ خلفاء کے دو گروہوں کے نظریاتی تصادم کی تاریخ کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ اس گھر کو گھر کے چراغ سے کیسے آگ لگی؟ اب ہم آپ کے سامنے دونوں گروہوں کے دلائل پیش کرتے ہیں۔

عباسی خلیفہ مامون نے والئ بغداد کے نام اپنے فرمان میں اپنے نظریے کی صداقت کے لئے مضبوط ترین دلائل دیئے اور بزعم خویش یہ ثابت کیا کہ قرآن کسی بھی قیمت پر قدیم نہیں بلکہ مخلوق ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے خط میں لکھا: ''ان لوگوں نے خدا کے نازل کردہ قرآن کو خدا کے مساوی بنا دیا ہے۔[1] اور کہا ہے کہ قرآن قدیم ہے مخلوق نہیں جبکہ اللہ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

۱۔ اِنَّا جَعَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا. ہم نے اسے عربی قرآن بنایا۔ (سورۂ زخرف: آیت ۳)

اور جَعَلَ بنانے اور پیدا کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

۲۔ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوۡرَ. اور اس نے اندھیرا اور اجالا بنایا۔ (سورۂ انعام: آیت ۱)

۳۔ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ مَا قَدۡ سَبَقَ. اس طرح ہم تم سے وہ واقعات بیان کرتے ہیں جو گزر چکے ہیں۔ (سورۂ طٰہٰ: آیت ۹۹)

ان آیات میں اللہ سبحانہٗ نے گزرے ہوئے واقعات بیان فرمائے ہیں اور یہ آیات واقعات کے بعد نازل ہوئیں یعنی واقعات پہلے ظہور پذیر ہوئے اور آیات میں ان کے متعلق بعد میں بتایا گیا اور وہ واقعات قدیم نہیں تھے اس لئے ماننا پڑے گا کہ جن آیات میں مذکورہ واقعات بیان ہوئے ہیں وہ بھی قدیم نہیں ہیں۔

۴۔ كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ. یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات کو محکم کیا گیا پھر ان کی تفصیل بیان کی گئی۔ (سورۂ ہود: آیت ۱)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کا خالق و موجد ہے۔''[2]

قرآن کو قدیم ماننے والوں کی دلیل

قرآن کو قدیم ماننے والوں نے ویسے تو بہت سے دلائل دیئے ہیں لیکن ان کی مضبوط ترین دلیل صرف ایک ہے اور یہ دلیل (امام) احمد بن حنبل نے دی تھی۔

۱۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج ۴، ص ۱۵۳۔ ۲۔ حافظ سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۸۔

تاریخ بغداد میں ہے کہ (امام) احمد بن حنبل سے پوچھا گیا کہ جو شخص قرآن کو مخلوق مانے اس کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟ احمد نے کہا: وہ کافر ہے۔ سائل نے کہا: ابن ابی داؤد کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ احمد نے کہا: وہ خدائے بزرگ و برتر کا منکر ہے۔ سائل نے کہا: آخر وہ کافر کیوں ہے؟ احمد نے کہا: قرآن کہتا ہے وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآئَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآئَکَ مِنَ الْعِلْمِ... ''اگر آپ ''علم'' آجانے کے بعد بھی اُن کی خواہشوں پر چلے...'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۰) اور یہاں ''علم'' سے مراد قرآن ہے اور قرآن علمِ خدا کا حصہ ہے پس جو شخص علمِ خدا کو مخلوق سمجھے وہ کافر ہے۔[1]

در مکتبِ اہلبیتؑ

۱۔ اصبغ بن نباتہ بیان کرتے ہیں کہ جب خوارج نے اپنی جداگانہ جماعت بنائی تو حضرت علیؑ ان کے پاس تشریف لے گئے اور آپ نے انہیں وعظ و نصیحت کی اور جنگی عزائم سے باز رہنے کی تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

تم کو مجھ پر کیا اعتراض ہے؟ کیا میں خدا اور اس کے رسولؐ پر سب سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا۔ خوارج نے کہا: آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن آپ نے اللہ کے دین میں ابوموسیٰ اشعری کو حکم بنایا (اس لئے ہم آپ سے الگ ہوگئے)۔ آپ نے فرمایا: میں نے مخلوق کو نہیں بلکہ قرآن کو ہی حَکَم بنایا ہے۔ میں تو ویسے ہی جنگ بندی پر رضا مند نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ جنگ اس وقت تک جاری رہے جب تک اللہ کی بات بلند اور اللہ کا دین فتحیاب نہ ہوجائے اگرچہ وہ بات کافروں اور جاہلوں پر ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔ لیکن مجھے میرے کام میں مغلوب بنادیا گیا اور میری رائے کی مخالفت کی گئی۔[2]

۱۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج ۴، ص ۱۵۲۔

حدثنا الحسن بن ثواب، قال: سألت احمد بن حنبل عمن یقول القرآن مخلوق؟ قال: کافر. قلت: فابن ابی داؤد؟ قال: کافر باللّٰہ العظیم. قلت: بماذا کفر؟ قال: بکتاب اللّٰہ تعالیٰ قال اللّٰہ تعالیٰ: ولئن اتبعت اھوآئھم بعد الذی جآئک من العلم. فالقرآن من علم اللّٰہ، فمن زعم ان علم اللّٰہ مخلوق فھو کافر باللّٰہ العظیم.

۲۔ شیخ صدوق، توحید، باب القرآن ماھو، حدیث ۶، ص ۲۲۵۔

عن الاصبغ بن نباتة، قال: لما وقف امیرالمؤمنین علی بن ابی طالبؑ علی الخوارج و وعظھم و ذکرھم وحذرھم القتال قال لھم: ما تنقمون منی؟ الا انی اول من امن باللّٰہ ورسوله فقالوا: انت کذالک و لکنک حکمت فی دین اللّٰہ اباموسی الاشعری فقال علیه السلام: واللّٰہ ما حکمت مخلوقًا وانما حکمت القرآن ولولا انی غلبت علی امری و خولفت فی رأیی لما رضیت ان تضع الحرب اوزارھا بینی وبین اھل حرب اللّٰہ حتی أعلی کلمة اللّٰہ و انصر دین اللّٰہ ولو کرہ الکافرون والجاھلون.

حضرت امیرؑ کے مذکورہ فرمان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کو مخلوق نہیں کہا جاسکتا کیونکہ آپ نے فرمایا کہ ''میں نے مخلوق کو نہیں بلکہ قرآن کو ہی حَکَم بنایا ہے۔''

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ قرآن مجید خالق ہے یا مخلوق ہے؟

حضرت نے جواب میں فرمایا: لَیْسَ بِخَالِقٍ وَّلَا مَخْلُوْقٍ وَّلٰـکِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰہِ. یعنی قرآن نہ تو خالق ہے اور نہ ہی مخلوق ہے۔ یہ خدا کا کلام ہے۔[۱]

۳۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے ایک تفصیلی خط میں یہ جملے تحریر فرمائے: ''اَلْقُرْاٰنُ کَلَامُ اللّٰہِ مُحْدَثٌ غَیْرُ مَخْلُوْقٍ وَّ غَیْرُ اَزَلِیٍّ مَّعَ اللّٰہِ تَعَالٰی ذِکْرُهٗ.'' یعنی قرآن اللہ کا کلام ہے۔ یہ نہ تو قدیم ہے اور نہ ہی مخلوق ہے اور نہ ہی ازل سے خدا کے ساتھ تھا۔

آپ نے اسی خط میں یہ جملہ بھی تحریر فرمایا: اُنْزِلَ مِنْ عِنْدِاللّٰہِ عَلٰی مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ (ص). ''قرآن اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہؐ پر نازل ہوا۔''[۲]

۴۔ راوی نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے پوچھا: اے فرزندِ رسولؐ! ہمارے شہر کے لوگ قرآن کے متعلق اختلاف کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے اور ایک گروہ کہتا ہے کہ قرآن مخلوق نہیں ہے۔ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: ''جو کچھ وہ کہتے ہیں میں قرآن کے متعلق وہ کچھ نہیں کہتا لیکن میں یہی کہتا ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔''[۳]

۱۔ دارمی، کتابُ الرَّدِّ عَلَی الْجَهْمِیَّة، ص۸۸۔ شیخ صدوق، توحید، بابُ القرآن ماهُوَ، حدیث ۳، ص۲۲۴۔

۲۔ شیخ صدوق، توحید، باب القرآن ماهو، حدیث ۷، ص۲۲۷۔

حضرت کے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں: وَسَاَلْتَ رَحِمَکَ اللّٰہُ عَنِ الْقُرْاٰنِ وَاخْتِلَافِ النَّاسِ قَبْلَکُمْ فَاِنَّ الْقُرْاٰنَ کَلَامُ اللّٰہِ مُحْدَثٌ غَیْرُ مَخْلُوْقٍ وَغَیْرُ اَزَلِیٍّ تَعَالٰی ذِکْرُهٗ وَتَعَالٰی عَنْ ذٰلِکَ عُلُوًّا کَبِیْرًا کَانَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ وَلَا شَیْءَ غَیْرُ اللّٰہِ مَعْرُوْفٌ وَّلَا مَجْهُوْلٌ کَانَ عَزَّوَجَلَّ وَلَا مُتَکَلِّمٌ وَّلَا مُرِیْدٌ وَّلَا مُتَحَرِّکٌ وَّلَا فَاعِلٌ جَلَّ وَعَزَّ رَبُّنَا فَجَمِیْعُ هٰذِهِ الصِّفَاتِ مُحْدَثَةٌ عِنْدَ حُدُوْثِ الْفِعْلِ مِنْهُ جَلَّ وَعَزَّ رَبُّنَا وَالْقُرْاٰنُ کَلَامُ اللّٰہِ غَیْرُ مَخْلُوْقٍ فِیْهِ خَبَرُ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ وَ خَبَرُ مَا یَکُوْنُ بَعْدَکُمْ اُنْزِلَ مِنْ عِنْدِاللّٰہِ عَلٰی مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ.

۳۔ شیخ صدوق، توحید، باب القرآن ماهو، حدیث ۵، ص۲۲۴۔

حَدَّثَنَا الْحُسَیْنُ بْنُ ابراهیمَ بْنِ اَحْمَدَ بْنِ هِشَامِ الْمُؤَدِّبِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اَبِیْ عبدِاللّٰہِ الکوفِیِّ، قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اسماعیلَ البرمکِیِّ، قَالَ: حَدَّثَنَا عبدُاللّٰہِ بْنُ احمدَ، قَالَ: حَدَّثَنِیْ سلیمانُ بْنُ جعفرِ الجعفرِیِّ، قَالَ: قُلْتُ لِاَبِی الحسنِ موسیَ بنِ جعفرٍ علیهما السَّلَامُ: یَابْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ مَاتَقُوْلُ فِی الْقُرْاٰنِ فَقَدِ اخْتَلَفَ فِیْهِ مَنْ قَبْلَنَا؟ فَقَالَ قَوْمٌ: اِنَّهٗ مَخْلُوْقٌ، وَقَالَ قَوْمٌ: اِنَّهٗ غَیْرُ مَخْلُوْقٍ، فَقَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ: اَمَا اِنِّیْ لَا اَقُوْلُ فِیْ ذٰلِکَ مَا یَقُوْلُوْنَ، وَلٰکِنِّیْ اَقُوْلُ: اِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰہِ.

۵۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے امام علی رضا علیہ السلام سے کہا: اے فرزند رسولؐ! مجھے قرآن کی حقیقت کے متعلق بتائیں کہ قرآن خالق ہے یا مخلوق ہے؟

حضرت امام علی رضاؑ نے فرمایا: قرآن نہ خالق ہے اور نہ ہی مخلوق ہے وہ کلام اللہ ہے۔[1]

۶۔ ایک اور راوی کا بیان ہے کہ میں نے امام علی رضاؑ سے کہا: آپ قرآن کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: ''قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کچھ نہ کہو اور قرآن کے علاوہ کسی اور جگہ سے ہدایت تلاش نہ کرو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔''[2]

۷۔ راوی کہتا ہے کہ امام علی نقی علیہ السلام نے بغداد میں اپنے ''ایک شیعہ'' کو یہ خط تحریر فرمایا:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں فتنہ سے محفوظ رکھے۔ اگر اس نے ہمیں فتنہ سے محفوظ رکھا تو یہ اس کی عظیم عنایت ہوگی اور اگر اس نے ہمیں محفوظ نہ رکھا تو ہلاکت یقینی ہو جائے گی۔ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ قرآن کے متعلق مباحثہ کرنا بدعت ہے اور سوال کرنے والا اور جواب دینے والا اس بدعت میں برابر کے شریک ہیں کیونکہ سوال کرنے والا ایسے امر کے متعلق سوال کرتا ہے جس کا اسے حق نہیں ہے اور جواب دینے والا اپنے آپ کو ایسے کام میں داخل کرتا ہے جس کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی خالق نہیں ہے اور تمام اشیاء اس کی مخلوق ہیں۔ قرآن کلام اللہ ہے اور اپنی طرف سے قرآن کا کوئی اور نام مت رکھو ورنہ گمراہوں میں سے ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں ان لوگوں میں سے قرار دے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور قیامت کا بھی خوف رکھتے ہیں۔[3]

۱۔ توحید صدوق، باب القرآن ماھو، حدیث ۱، ص ۲۲۳۔

حدّثنا احمدُ بنُ زیادِ بنِ جعفرِ الھمدانی رَضِیَ اللّٰہُ عنہ، قال: حدثنا عَلِیُّ بْنُ ابراھیمَ عن ابیہِ ابراھیمَ بنِ ھاشمٍ عن علیِ بْنِ معبدٍ عن الحسینِ بن خالدٍ، قال: قُلْتُ لِلرِّضَا عَلِیّ بنِ موسٰی علیھمَا السلامُ: یَا ابنَ رسُولِ اللّٰہِ اَخْبِرْنِیْ عَنِ القرآنِ اَخَالِقٌ اَوْمَخْلُوْقٌ؟ فَقَالَ: لَیْسَ بِخَالِقٍ وَلَا مَخْلُوْقٍ وَلٰکِنَّہٗ کَلَامُ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ.

۲۔ توحید صدوق، باب القرآن ماھو، حدیث ۲، ص ۲۲۳۔

حدّثنا جعفرُ بنُ محمدِ بنِ مسرورٍ رضیَ اللّٰہُ عنہ، قَالَ: حدّثنا محمدُ بنُ عبداللّٰہ ابنِ جعفرِ الحِمْیَرِیّ، عن ابیہ، عن ابراھیمَ بنِ ھاشمٍ، عن الرَیّانِ بنِ الصَّلْتِ، قَالَ: قلتُ لِلرِّضَا علیہ السلامُ: مَاتَقُوْلُ فِی الْقُرْآنِ؟ فَقَالَ: کَلَامُ اللّٰہِ لَا تَتَجَاوَزُوْہُ، تَطْلُبُوا الْھُدٰی فِیْ غَیْرِہٖ فَتَضِلُّوْا.

۳۔ بِسمِ اللّٰہِ الرحمنِ الرحیم. عَصِمَنَا اللّٰہُ وَاِیَّاکَ مِنَ الْفِتْنَۃِ فَاِنْ یَفْعَلْ فَقَدْ اَعْظَمَ بِھَا نِعْمَۃً وَاِنْ لَّا یَفْعَلْ فَھِیَ الْھَلَکَۃُ نَحْنُ نَرٰی اَنَّ الْجِدَالَ فِی الْقُرْآنِ بِدْعَۃٌ اشْتَرَکَ فِیْھَا السَّائِلُ وَالْمُجِیْبُ فَیَتَعَاطَی السَّائِلُ مَا لَیْسَ لَہٗ وَیَتَکَلَّفُ الْمُجِیْبُ مَا لَیْسَ عَلَیْہِ وَلَیْسَ الْخَالِقُ اِلَّا اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ وَمَا سِوَاہُ مَخْلُوْقٌ وَالْقُرْآنُ کَلَامُ اللّٰہِ لَا تَجْعَلْ لَہٗ اِسْمًا مِنْ عِنْدِکَ فَتَکُوْنَ مِنَ الضَّالِّیْنَ، جَعَلَنَا اللّٰہُ وَاِیَّاکَ مِنَ "الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَھُمْ مِنَ السَّاعَۃِ مُشْفِقُوْنَ."

اس خط کا پس منظر

راوی نے اپنی روایت میں اس خط کا پس منظر بیان نہیں کیا اور یہ بھی واضح نہیں کیا کہ حضرت امام علی نقی علیہ السلام نے کس موقع پر اپنے کون سے شیعہ کو یہ خط تحریر فرمایا تھا۔ نیز اس خط کا لب ولہجہ بھی خاصا مخاصمانہ ہے اور اس میں فتنہ، بدعت اور گمراہوں جیسے الفاظ دکھائی دیتے ہیں جبکہ ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ ائمۂ اہلبیتؑ اپنے شیعوں سے شفقت آمیز گفتگو کیا کرتے تھے۔

ان دونوں مشکلات کو ابن خلکان نے اپنی کتاب ''وفیات الاعیان'' میں احمد بن ابی داؤد کے حالات میں یوں حل کیا ہے:

ابن ابی داؤد نے ''اہلِ مدینہ'' میں سے ایک شخص کو خط لکھا۔ خطیب بغدادی کا خیال ہے کہ اس نے یہ خط عبداللہ بن امام موسیٰ کاظمؑ کو لکھا تھا۔ اس خط میں اُس نے لکھا: ''اگر آپ قرآن کے مخلوق ہونے کے عقیدے پر امیر المومنین کی بیعت کریں گے تو ان کی طرف سے اچھا بدلہ پائیں گے اور اگر آپ اس سے انکار کریں گے تو ان کی اذیت سے محفوظ نہیں رہیں گے۔''[1]

عبداللہ بن امام موسیٰ کاظمؑ نے جواب میں لکھا: اللہ ہمیں اور تمہیں فتنہ سے محفوظ رکھے...الخ

ابن خلکان نے اس خط کا پس منظر بالکل صحیح لکھا ہے کہ یہ خط احمد بن ابی داؤد کے خط کے جواب میں لکھا گیا اور ہم پہلے ہی یہ عرض کر چکے ہیں کہ اس بحث کا محرکِ اعلیٰ اپنے دَور کا قاضی القضاۃ احمد بن ابی داؤد تھا جو لوگوں کو قرآن کے مخلوق ہونے کے عقیدے کی دعوت دیتا تھا۔ اس نے اپنی رَوِش کو جاری رکھتے ہوئے اس طرح کا ایک خط مدینہ بھی روانہ کیا تھا۔

ابن خلکان نے ابن ابی داؤد کے خط کے مخاطب کو متعین نہیں کیا البتہ یہ کہا کہ خطیب بغدادی کا خیال ہے کہ اس نے یہ خط عبداللہ بن امام موسیٰ کاظمؑ کو لکھا تھا۔ **مؤلف** کہتا ہے کہ خطیب بغدادی کا خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ ابن ابی داؤد دربار خلافت کا سب سے بااثر شخص تھا جبکہ امام موسیٰ کاظمؑ کا بیٹا عبداللہ معروف اور اہم شخص نہیں تھا۔ امام موسیٰ کاظمؑ کے اٹھارہ یا بقولے اکیس بیٹے تھے اور وہ بھی ان میں سے ایک بیٹا تھا۔ اسے کوئی خصوصی مقام حاصل نہیں تھا جس کی وجہ سے دربارِ خلافت کا ایک مؤثر ترین شخص اسے خط لکھتا۔

۱۔ تاریخ بغداد در حالات ابن ابی داؤد، جلد ۴، ص ۱۵۱۔

حدثنی محمد بن علی الصوری اخبرنا محمد بن احمد بن جمیع الغسانی اخبرنا ابوروق الهزانی قال: حکی لی ابن ثعلبة الحنفی عن احمد بن المعدل انه قال: کتب ابن ابی داؤد الی رجل من اهل المدینة- یتوهم انه عبدالله بن موسی ابن جعفر بن محمد- ان بایعت امیرالمومنین فی مقالته استوجبت منه حسن المکافاة، وان امتنعت لم تامن مکروهه فکتب الیه: عصمنا الله وایاک من کتاب بلیغ الفتنة...

علاوہ ازیں خط میں نَحْنُ نَرٰی جیسے الفاظ عبداللہ جیسا غیر اہم شخص اپنے دَوْر کے قاضی القضاۃ کو لکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ نَحْنُ نَرٰی یعنی ''ہمارا نظریہ یہ ہے'' اور ''قرآن کے متعلق مباحثہ کرنے کو ہم بدعت سمجھتے ہیں'' صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے جسے دین میں اہم اور خصوصی مقام حاصل ہو۔ اس لئے خط کے لب و لہجے سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ خط عبداللہ بن امام موسیٰ کاظمؑ نے نہیں بلکہ امام علی نقیؑ نے ابن ابی داؤد کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔

اس سے قبل اسی بدبخت قاضی القضاۃ کی چغل خوری کی وجہ سے امام محمد تقی علیہ السلام کو ۲۱۹ھ یا ۲۲۰ھ میں زہر دیا گیا تھا اور امام محمد تقی علیہ السلام کے بعد امام علی نقی علیہ السلام ہی امتِ اسلامیہ کے حقیقی امام اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصی تھے۔

ادھر ائمۂ اہلبیتؑ اپنے دَوْر کے گمنام افراد نہیں تھے۔ خلافت کا ادارہ انہیں اچھی طرح سے جانتا پہچانتا تھا۔ اسی لئے مامون نے امام علی رضاؑ کو خراسان بلا کر اور معتصم نے امام محمد تقیؑ کو بغداد بلا کر زہرِ جفا سے شہید کیا تھا اور پھر متوکّل نے امام علی نقیؑ کو سامرا طلب کر کے انہیں قید خانے میں زہر دے دیا تھا۔ چنانچہ حالات و واقعات کے پس منظر کو سامنے رکھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ خط امام علی نقیؑ نے ۲۲۰ھ کے قریب قریب اس وقت لکھا تھا جب معتصم نے ابھی سامرا کو اپنا دارالحکومت قرار نہیں دیا تھا اور وہ بغداد میں ہی رہائش پذیر تھا۔ اور یہ کہ دربارِ خلافت کے ایک بااثر شخص کو ایسا جواب صرف امام علی نقی علیہ السلام ہی لکھ سکتے تھے۔

توحید شیخ صدوقؒ سے ہم نے مذکورہ خط ''لکھنے والے'' کا پتہ چلایا اور ابن خلکان کی وفیاتُ الاعیان میں خطیب بغدادی کی روایت سے ہمیں خط کے ''مخاطب'' کا علم ہوا۔ اس بحث کے آخر میں ہم اِنشاء اللہ اس خط کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

مُوازَنہ و تجزیہ

مکتبِ خلفاء کے کچھ فرقے قرآن مجید کو قدیم اور کچھ فرقے مخلوق قرار دیتے تھے۔ آپس کے اس اختلاف کی وجہ سے لاکھوں انسان زندان میں ڈالے گئے اور ہزاروں قتل کئے گئے۔

مذکورہ دو نظریات کے برعکس اوصیائے پیغمبرؐ نے کہا کہ قرآن مجید کو نہ تو قدیم کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے مخلوق کہنا مناسب ہے۔ اسے صرف ''کلام اللہ'' کے الفاظ سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ائمۂ اہلبیتؑ نے اپنے ماننے والوں کو تلقین کی کہ خبردار اپنی طرف سے قرآن کا (قدیم و مخلوق جیسا) کوئی نام تجویز نہ کرنا ورنہ گمراہ ہوجاؤ گے اور مزید یہ کہ اس کے لئے جھگڑنے والے دونوں فریق ہی دین میں بدعت ایجاد کر رہے ہیں۔

یہاں تک آپ نے دونوں مکاتبِ فکر کی آراء کا خلاصہ ملاحظہ کیا۔ اب ہم احیائے سنتِ پیغمبرؐ کے حوالے سے اوصیائے پیغمبرؐ کے تین فرامین کی تشریح بیان کرتے ہیں:

(ا) قرآن کو قدیم کیوں نہیں کہا جا سکتا؟

اول: آخر قرآن مجید کو قدیم کہنے کی ممانعت کیوں ہے؟

مکتبِ خلفاء کے جو فرقے قرآن مجید کو قدیم قرار دیتے تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ قرآن مجید خدا کی طرح ازل سے موجود تھا اور یہ نظریہ دو وجوہات کی بنا پر باطل ہے:

(۱) اگر قرآن مجید کی ازلیت کو مان لیا جائے تو بیک وقت خدا اور قرآن دونوں کو ازلی ماننا پڑے گا۔

(۲) قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیات ہیں جو قدمِ قرآن کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً سورۂ انفال کی پہلی آیت:

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ. ''لوگ آپؐ سے غنائم کی تقسیم کے بارے میں پوچھتے ہیں۔''

یہ آیت اس وقت اتری تھی جب اللہ کی مدد سے مسلمانوں کو جنگِ بدر میں غیر متوقع فتح نصیب ہوئی تھی اور ان کے ہاتھ بہت سا مالِ غنیمت آ گیا تھا۔ پھر اس غنیمت کے متعلق اہلِ بدر میں اختلاف پیدا ہوا تو انہوں نے رسولِ خداؐ سے غنائم کی تقسیم کے متعلق پوچھا تھا۔ چونکہ جنگِ بدر قدیم نہیں تھی اور مالِ غنیمت قدیم نہیں تھا اور مجاہدینِ بدر کا اختلاف بھی قدیم نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ ایک وقتی واقعے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا جس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تھی۔ اگر قرآن مجید کی اس آیت کو قدیم مان لیا جائے تو اس کے ساتھ ساتھ جنگِ بدر، بدر کے مالِ غنیمت کے حصول اور صحابۂ بدر کے اختلاف کو بھی قدیم ماننا پڑے گا اور کوئی بھی عقلمند اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح سے قرآن مجید کی وہ چودہ آیات جو کہ یَسْئَلُوْنَکَ یا یَسْتَفْتُوْنَکَ جیسے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی واقعے اور مسئلے کے جواب میں نازل ہوئی تھیں۔ پس اگر قرآن مجید کو قدیم مان لیا جائے تو ان چودہ قسم کے سوال کرنے والے صحابہ کو بھی قدیم ماننا پڑے گا اور یہ چیز قابلِ قبول نہیں ہے۔

اسی طرح سے اوس بن صامت کی بیوی خولہ نے رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے شوہر کی شکایت کی تھی جس کے جواب میں سورۂ مجادلہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں کہ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُکَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَکِیْٓ اِلَی اللّٰهِ... ''اے پیغمبرؐ! اللہ نے اس عورت کی گفتگو سن لی جو آپؐ سے اپنے شوہر کے متعلق جھگڑا کر رہی تھی اور خدا کے حضور اپنے شوہر کے رویہ کی شکایت کر رہی تھی...''

قرآن مجید کو قدیم ماننے والوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر قرآن قدیم ہے تو یقیناً یہ آیت بھی قدیم

ہے اور جس عورت نے اپنے شوہر کے رویے کی شکایت کی تھی کیا وہ عورت اور اس کا شوہر بھی قدیم اور ازلی ہیں اور اگر یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ قرآن مجید بھی قدیم نہیں ہے (اور نہ ہی عربی زبان) ۔

الغرض قرآن مجید میں ایسی سیکڑوں آیات موجود ہیں جو کسی مخصوص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا اگر قرآن کو قدیم مان لیا جائے تو ان واقعات کو بھی قدیم ماننا پڑے گا اور پھر ہمیں یہ عقیدہ قائم کرنا پڑے گا کہ صحابہ بھی قدیم تھے اور وہ واقعات وحالات جن کی وجہ سے آیات نازل ہوئیں، وہ بھی قدیم اور ازلی تھے۔

یقیناً ایسا سمجھنا کوتاہ فکری ہے لہٰذا کوئی بھی ذی شعور مسلمان ایسا نظریہ اپنانے پر تیار نہیں ہوسکتا۔

(ب) قرآن کو مخلوق کیوں نہیں کہا جاسکتا؟

لفظ ''خلق'' اور اس کے مشتقات کے عربی میں کچھ معانی ہیں جن میں سے دو معانی زیادہ مشہور ہیں:

(۱) خَلَقَ اللّٰہُ کے معنی ہیں اللہ نے پیدا کیا[۱] جیسا کہ قرآن کی تیرہ آیات میں خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ کے الفاظ آئے ہیں یعنی اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ خَلْقُ اللّٰہ سے اللہ کی پیدا کردہ چیزیں مراد ہیں۔

(۲) جب کلام عرب میں کسی کلام کو لفظ خَلْق سے تعبیر کیا جائے تو اس سے جھوٹی اور خودساختہ گفتگو مراد لی جاتی ہے۔ مثلاً اگر قصیدۂ مخلوقہ کہا جائے تو اس سے وہ قصیدہ مراد ہوتا ہے جس کی کسی کی طرف جھوٹی نسبت دی گئی ہو اور اگر محدّثین کی کسی کتاب میں اِخْتَلَقَ حَدِیْثًا[۲] کے الفاظ آجائیں تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی نے جھوٹی روایت گھڑ کر نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کردی ہے۔

اسی طرح سورۂ عنکبوت میں وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا... (آیت ۱۷) کے الفاظ آئے ہیں جس کے معنی ہیں کہ تم جھوٹ تراشتے ہو اور سورۂ ص میں اِنْ هٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ. (آیت ۷) کے الفاظ دکھائی دیتے ہیں جس کے معنی ہیں یہ بالکل بنائی ہوئی بات ہے۔ اسی لئے ہم قرآن مجید کو قدیم نہیں کہہ سکتے کیونکہ ازلی صرف خداوندِ عالم کی ذاتِ اقدس ہے اس کے سوا کوئی چیز ازلی نہیں ہے اور آیاتِ قرآنی پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ قرآن ازلی اور قدیم نہیں ہے۔

جس طرح سے قرآن کو لفظ ''قدیم'' سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا اسی طرح سے اسے ''مخلوق'' کے لفظ سے بھی تعبیر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جب قرآن کو لفظ ''مخلوق'' سے تعبیر کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ قرآن مجید خدا کا کلام ہی نہیں ہے اور اسے خدا کی طرف غلط نسبت دی گئی ہے۔

۱۔ ان تمام تعریفات کو عام فہم بنانے کے لئے ہم نے گہری علمی بحثوں سے جان بوجھ کر اجتناب کیا ہے۔

۲۔ لفظ خلق کی تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیں: راغب کی مفردات اور محاضرات کے علاوہ المعجم الوسیط اور اقرب الموارد۔ (اِنَّ الْكَلَامَ مَتٰى وُصِفَ بِالْخَلْقِ فَهُوَ مَكْذُوْبٌ) و (قصیدة مخلوقة) یعنی اِنَّهَا كَذِبٌ.

دوم: ہم اپنی طرف سے قرآن کے لئے کوئی نام تجویز کیوں نہیں کر سکتے؟

اس حقیقت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ علمی زبان میں نام رکھنے کے عمل کو ''اصطلاح'' کہا جاتا ہے اور ہر مکتبِ فکر اپنے نظریات و اُفکار کے اظہار کے لئے خود ہی نام وضع کرتا ہے اور اصطلاحات مقرر کرتا ہے جس سے اس مکتب کے اُفکار و نظریات واضح اور روشن ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں ہر علم کی بھی اپنی اپنی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں اور اگر کسی علم اور کسی مکتب کے اُفکار و آراء کو ظاہر کرنے کے لئے ہم دوسری اصطلاحات سے کام لینا شروع کر دیں تو اس مکتب اور علم کے صحیح افکار کا اظہار نہیں ہو سکے گا اور ہماری خودساختہ اصطلاحات سے بہت سی غلط فہمیاں اور کج فہمیاں جنم لیں گی۔

ہر علم اور ہر مکتب کی طرح سے اسلام میں انسان کے لئے کچھ احکام مقرر کئے گئے ہیں اور ان احکام کے مخصوص نام رکھے گئے ہیں۔ مثلاً صلاۃ، صوم، حج، رکوع اور سجود وغیرہ۔ یہ مخصوص نام اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرمائے ہیں اور حبیبِ خداؐ نے ان احکام کے نام اور ان کے طریقۂ کار سے ہمیں مطلع فرمایا۔

اسلام ایک خاص طرز کی جہاں بینی کا قائل ہے اور پھر اس نے ہر جہاں کی مختلف کیفیات کے نام بھی خود ہی مقرر کئے ہیں۔ اگر ہم مخصوص اسلامی نام کو چھوڑ کر اپنی طرف سے کوئی نام مقرر کر دیں تو اس سے فکری انتشار جنم لے گا اور ہم حقیقت کے اِدراک سے قاصر رہیں گے۔ اسی لئے قرآن مجید کے لئے ہم اپنی طرف سے کوئی نام رکھنے کے مجاز نہیں ہیں۔

قرآن کا نام ''کلام اللہ'' ہے اور یہ نام زبانِ شرع میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ... اور اگر کوئی مشرک آپ سے پناہ مانگے تو آپ اسے پناہ دیں یہاں تک کہ وہ ''کلام اللہ'' کو سنے...(سورۂ توبہ: آیت ۶)

اور اگر ہم قرآن مجید کو ''کلام اللہ'' کے علاوہ لفظ ''قدیم'' یا ''مخلوق'' سے تعبیر کرنے لگیں تو اس سے فکری انتشار پیدا ہوگا اور فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا ملے گی جس سے تکفیر کی فضا پیدا ہوگی۔ اسی لئے پیغمبرِ اسلامؐ کے اوصیائے برحق نے یہ تعلیم دی ہے کہ خودساختہ نام رکھنا اور پھر ان پر بحث و جِدال کرنا بدعت ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہر مکتبِ فکر اور ہر فن کی اصطلاح کو صرف وہاں تک رہنے دیا جائے۔ اس میں خواہ مخواہ کی توسیع نہیں کرنی چاہئے جیسا کہ آج کل شیعہ معاشرے میں عالم دین کو ''روحانی'' اور علم دین کو ''روحانیت'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ رَوِش اچھی نہیں ہے کیونکہ ''روحانی'' عیسائی مکتبِ فکر کی ایک مخصوص اصطلاح ہے اور عیسائیت میں تارکُ الدنیا راہب کو روحانی کہا جاتا ہے اور عیسائی روحانی شادی بیاہ کے کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑتے اور وہ دنیاوی کاموں مثلاً سیاست، زراعت اور تجارت سے بھی منسلک نہیں ہوتے۔

ان کا کام صرف خدا کو یاد کرنا اور دعا کرنا ہوتا ہے۔ جبکہ دینِ مقدس اسلام میں رہبانیت کا سرے سے کوئی تصور موجود ہی نہیں ہے۔ چنانچہ اس رَوِش کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے اور علمائے دین کو ''روحانی'' کہنے سے اجتناب برتنا چاہیے۔ چونکہ اس مخصوص لفظ سے اسلامی معاشرے میں کج فہمی پیدا ہوتی ہے لہٰذا اس لفظ کو ترک کر دینا چاہیے۔

اسی طرح سے دولت مند شخص کے لئے اسلام کی ایک مخصوص اصطلاح ''غنی'' موجود ہے۔ اس لفظ کی بجائے اگر ہم ''سرمایہ دار'' قسم کے الفاظ استعمال کرنے لگیں تو احکام اسلامی کو سمجھنے میں یقیناً دقت پیدا ہوگی۔

اس کی ایک اور مثال لفظ ''رِسالت'' ہے۔ شریعتِ اسلام میں یہ لفظ خدا کی طرف سے پیغام لانے کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مگر ہمیں یہ دیکھ کر شدید صدمہ ہوتا ہے کہ آج کل اس لفظ کو عام کر دیا گیا ہے اور ہمارے روزمرہ کے محاوروں میں لفظ ''رِسالت'' فریضہ کی ادائیگی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ مثلاً آج کل فارسی زبان میں ہمیں اس طرح کے محاوروں سے سابقہ پڑتا ہے: ''فلاں روزنامہ نگار رسالت خود را ادا کرد۔'' یعنی فلاں اخبار کے نامہ نگار نے اپنا فرض ٹھیک طرح سے ادا کیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ رَوِش کسی طور بھی مستحسن نہیں ہے اور اس رَوِش کے نقصانات کی وضاحت کے لئے ایک تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔ دعا ہے کہ خداوندِ منّان ہمیں اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔

سوم: قرآن کے قدیم یا مخلوق ہونے کی بحث کو بدعت کیوں کہا گیا؟

لفظ ''بِدعت'' ایک اسلامی اصطلاح ہے جس کے معنی دین میں نئی چیز داخل کرنے کے ہیں۔ اس لفظ کے متعلق ہم جلد اول میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن کے قدیم یا مخلوق ہونے کی بحث کو کس دلیل کے تحت بدعت قرار دیا جاسکتا ہے؟

اس سلسلے میں ہم اس بحث کے محرکِ اعلیٰ کی گواہی کو یہاں پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

اس بحث کا محرکِ اعلیٰ احمد بن ابی داؤد کہتا ہے: وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا.

خطیب بغدادی نے واثق کے بیٹے مہتدی کی زبانی احمد بن ابی داؤد کے حالات میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے باپ کا دستور تھا کہ جب وہ کسی کو قتل کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو ہمیں بھی اپنے دربار میں طلب کیا کرتے۔ چنانچہ ایک دن میرے باپ نے ہمیں بلایا۔ پھر میرے باپ نے کہا کہ احمد بن ابی داؤد اور اس کے دوستوں کو بلاؤ۔ چنانچہ وہ بھی دربار میں آئے۔ ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بوڑھے کو زنجیروں میں قید کر کے لایا گیا۔ اس بوڑھے نے اپنی داڑھی اور بالوں پر مہندی لگائی ہوئی تھی۔

بوڑھے نے آتے ہی میرے باپ کو اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَمِيْرَ المومنین کہہ کر سلام کیا۔

میرے باپ نے اس کے جواب میں کہا لَا سَلَّمَ اللّٰهُ عَلَيْكَ خدا تجھ پر کوئی سلامتی نازل نہ کرے۔

بوڑھے نے میرے باپ سے کہا: تیرے مربّی نے تیری اِنتہائی غلط تربیت کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا ۔ ''جب تم پر سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر لفظوں میں اس کا جواب دو یا وہی الفاظ لوٹا دو...'' (سورۂ نساء: آیت ۸۶) خدا کی قسم میں نے تجھ پر سلام کیا ہے لیکن تو نے نہ تو بہتر الفاظ سے جواب دیا اور نہ ہی میرے الفاظ مجھے لوٹائے۔

بوڑھے کا قرآنی استدلال سن کر ابن ابی داؤد نے کہا: اے امیرالمومنین! یہ شخص علم کلام سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔

میرے باپ نے کہا: تم خود ہی اس سے گفتگو کرو۔

ابن ابی داؤد نے کہا: اے شیخ! تم قرآن کے متعلق کیا کہتے ہو؟

بوڑھے نے کہا: تم نے انصاف نہیں کیا۔ یہی سوال مجھے تم سے کرنا چاہئے تھا۔

ابن ابی داؤد نے کہا: اچھا تم سوال کرو۔

بوڑھے نے کہا: تم قرآن کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہو؟

ابن ابی داؤد نے کہا: قرآن مخلوق ہے۔

بوڑھے نے کہا: جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا پیغمبرِ اکرمؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؑ اور دوسرے خلفائے راشدین بھی اس نکتے سے واقف تھے یا نہیں؟

ابن ابی داؤد نے کہا: وہ اس سے واقف نہیں تھے۔

بوڑھے نے کہا: سبحان اللہ! جس نکتے کا پیغمبرِ اکرمؐ اور خلفائے راشدین کو علم نہیں تھا تمہیں کیسے پتا چلا؟

ابن ابی داؤد شرمندہ ہوکر بولا: شاید میں صحیح جواب نہیں دے سکا اس لئے تم دوبارہ سوال کرو۔

بوڑھے نے اپنا سوال پھر دہرایا: تم قرآن کے متعلق کیا نظریہ رکھتے ہو؟

ابن ابی داؤد نے کہا: قرآن مخلوق ہے۔

بوڑھے نے کہا: کیا پیغمبرِ اکرمؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؑ ودیگر خلفائے راشدین یہ بات جانتے تھے؟

ابن ابی داؤد نے کہا: ہاں! وہ جانتے تھے لیکن انہوں نے لوگوں کو اس عقیدے کی دعوت نہیں دی تھی۔

بوڑھے نے کہا: جب اُنہوں نے اس کی دعوت نہیں دی تھی تو تم کو اس کا اختیار کیسے مل گیا؟

خلیفہ واثق کا بیٹا مہتدی باللہ کہتا ہے کہ بوڑھے کی یہ بات سن کر میرے باپ نے دربار برخاست کردیا اور گھر آکر خلوت میں چت لیٹ گئے اور ان الفاظ کو دہرانے لگے۔ ''جس بات کو پیغمبرِ اکرمؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؑ اور دیگر خلفائے راشدین نہیں جانتے تھے وہ بات تم نے کیسے جان لی؟ سبحان اللہ۔ اور جس امر کو وہ جانتے تھے

مگر انہوں نے تو کسی کو اس کی دعوت نہیں دی تو تمہیں یہ دعوت دینے کا اختیار کیسے مل گیا؟''

اس کے بعد میرے باپ نے دربان کو طلب کیا اور حکم دیا کہ اس بوڑھے کو زنجیروں سے آزاد کردے اور اسے چارسو دینار دے کر گھر جانے کی اجازت دیدے۔

اس کے بعد میرے باپ کی نگاہوں میں احمد بن ابی داؤد کا مقام گر گیا۔[1]

اس مناظرے کے تین نکات قابل توجہ ہیں:

۱۔ اس مناظرے میں احمد بن ابی داؤد کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ خَلقِ قرآن کے عقیدے کی دعوت دینا اس کی اپنی اختراع ہے اور یہ دین میں نئی چیز کو داخل کرنا ہے اور دین میں نئی چیز داخل کرنے کو بدعت کہا جاتا ہے جیسا کہ امام علی نقی علیہ السلام نے اپنے خط میں اس کی وضاحت کی تھی کہ اس معاملے کے متعلق بحث کرنا سرے سے بدعت ہے۔

۲۔ اس مناظرے کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ جس شخص کو کافر سمجھ کر دربار میں قتل کے لئے لایا گیا تھا اسے رہائی نصیب ہوئی اور وہ خلیفہ جس نے اس سے قبل ایک محدّث کو اپنے ہاتھوں سے صرف اس لئے قتل کیا تھا کہ اس کے ذخیرۂ ثواب میں اضافہ ہو اس کی سوچ کا محور اچانک ہی بدل گیا اور اس نے بوڑھے کو معاف کردیا اور اپنے دستِ راست اور اس وقت کے قاضی القضاۃ سے بدظن ہوگیا۔

۳۔ اس سے قبل مکتبِ خلفاء کے کسی عالم نے یہ دلیل پیش نہیں کی تھی اور جب یہ دلیل پیش کی گئی تو پورا ماحول ہی بدل گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دلیل اس شیخ کی اپنی نہیں تھی۔ یہ دلیل اہلبیتِ طاہرینؑ کی تعلیمات بالخصوص امام علی نقی علیہ السلام کے نامۂ مبارک سے اخذ کی گئی تھی۔ جبکہ امام علی نقی علیہ السلام نے اس دلیل کو احمد بن ابی داؤد کے نام اپنے ایک خط میں تحریر کیا تھا مگر قاضی القضاۃ نے امامؑ کے خط کا خلیفہ سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور جب امامؑ کی بیان کردہ دلیل شیخ کے ہاتھوں میں آئی تو معصومؑ کی دلیل نے دربارِ خلافت کو متزلزل کر کے رکھ دیا اور امامؑ کی ایک ہی دلیل سے امتِ اسلامیہ کو اس فتنے سے رہائی نصیب ہوگئی۔

چہارم: ائمۂ اہلبیتؑ نے اس غلط رَوِش کی اصلاح کیسے کی؟

قرآن مجید کے مسئلے پر مکتبِ خلفاء دو گروہوں میں تقسیم ہوگیا اور نظریاتی اختلافات نے جدال وقتال کی صورت اختیار کرلی جبکہ دونوں گروہ غلطی پر تھے۔ ان کا یہ مباحثہ دین میں بدعت گزاری کو ظاہر کرتا تھا۔ جس دَور میں مکتبِ خلفاء کے متحارب فریق ایک دوسرے کو قتل کرنا عبادت قرار دیتے تھے اس دَور میں ائمۂ اہلبیتؑ نے

۱۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، جلد۴، ص۱۵۱۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص۳۴۱۔ واضح رہے کہ شیخ کا نام ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن محمد اذری تھا اور وہ ابوداؤد اور نسائی کے استاد تھے۔

اپنے ماننے والوں کو مسئلے کی اصل حقیقت سے باخبر کر دیا تھا۔ اس لئے اس مباحثے کی وجہ سے جہاں ہزاروں افراد قتل ہوئے وہاں مکتبِ اہلبیتؑ کے پیروکار اس سے محفوظ رہے اور اپنے صحیح نظریے کی وجہ سے حکومت کے عتاب سے امان میں رہے۔

اس موقع پر پیغمبرِ اکرمؐ کی اس حدیث کی صداقت کھل کر لوگوں کے سامنے آ گئی: ''میرے اہلبیتؑ کی مثال سفینۂ نوحؑ کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو پیچھے رہا وہ غرق ہوا۔'' بعض روایات میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں: ''میرے اہلبیتؑ کی مثال بنی اسرائیل کے بابِ حطّہ کی سی ہے۔''[۱]

اگر تمام مسلمان پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرامینِ عالیہ پر عمل کرتے ہوئے قرآن مجید اور اہلبیتؑ کے دامنِ حق سے وابستہ ہو جاتے تو دینی معاملات میں ہر طرح کی جہالت سے محفوظ و مامون رہتے اور ان میں کسی طرح کا اختلاف پیدا نہ ہوتا۔

اور آج بھی مسلمانوں کی وحدت صرف اسی میں مضمر ہے کہ وہ امورِ اسلام کے لئے تعلیماتِ اہلبیتؑ کو اپنے لئے منارۂ نور اور مشعلِ ہدایت قرار دیں۔

سعدیؔ اگر عاشقی کنی و جوانی
عشقِ محمدؐ بس است و آلِ محمدؐ

۱۔ مزید تفصیل کے لئے ہماری کتاب معالم المدرستین، طبع چہارم، جلد ۱، ص ۵۰۷ دیکھیں۔
امام علی علیہ السلام اور ابوذر غفاری، سعید خدری، ابن عباس اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: ''مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِيْ كَسَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَا وَ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ. اور ''وَمَثَلُ بَابِ حِطَّةٍ فِيْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ.''

انسان مجبُور ہے یا مُختار؟

جبرؔ و اِختیار کے مسئلے کا تعلق بھی ان مَباحث سے ہے جن کا تعلق صِفاتِ ربوبیت سے ہے۔ مسلمان فرقوں میں جبرؔ و اختیار کے متعلق اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ صرف مسلمان فرقوں تک ہی یہ اختلاف محدود نہیں بلکہ غیر مسلموں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

جبرؔ و اِختیار کے متعلق فلاسفہ، متکلّمین اور محدّثین نے اپنے اپنے نظریات کے اثبات کیلئے بہت سے دلائل دیئے ہیں۔ یہاں ہم فریقین کے تمام دلائل نقل کرنے کی بجائے صرف چند احادیث پر اکتفا کریں گے اور پھر انشاء اللہ مذکورہ روایات کا موازنہ اور تجزیہ کریں گے اور یہ بھی بتائیں گے کہ اس اختلاف کا سرچشمہ کیا ہے؟

اس مسئلے کے متعلق تین نظریات پائے جاتے ہیں:

(۱) مجبرہ کہتے ہیں کہ کائنات کا ہر وجود خدا کا تخلیق کردہ ہے اور اجزائے کائنات میں انسانوں کے اعمال وافعال بھی شامل ہیں لہٰذا جو کچھ ہم کرتے ہیں اس پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا بلکہ ہم مجبور ہیں کیونکہ خدا کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اس عقیدے کو مکتبِ خلفاء میں ''ایمان بالقدر'' کہا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں رہ کر جتنے بھی اچھے یا برے کام کرتا ہے خدا نے وہ تمام کام اس کے مقدّر میں لکھ دیئے ہوتے ہیں۔ پس جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ خدا اپنے بندوں کے کام چلاتا ہے اور بندوں کو اس ضمن میں کوئی اختیار نہیں یعنی انسان مجبورِ محض ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے کاموں کو اپنے کچھ اولیاء کے سپرد کر دیا ہے اور ایک دوسرے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تمام کام انسانوں کے سپرد کر دیئے ہیں اور انسان اس دنیا میں جو کچھ بھی کرتا ہے وہ خالص اس کا اپنا کیا دھرا ہوتا ہے خدا کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا یعنی انسان ہر لحاظ سے مختار ہے۔

(۳) انسان اپنے افعال میں نہ تو مجبور محض ہے اور نہ ہی مختار کل بلکہ انسانی افعال کی حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے۔

پہلے عقیدے کو علم کلام اور حدیث کی اِصطلاح میں ''جَبر'' کہا جاتا ہے اور مکتبِ خلفاء کے پیروکاروں کی

اکثریت اسی عقیدے پر یقین رکھتی ہے۔

دوسرے عقیدے کو "تفویض" کہا جاتا ہے۔ ماضی بعید میں مکتبِ خلفاء کے کچھ پیروکاروں کا یہی نظریہ تھا۔

تیسرے عقیدے کو اوصیائے پیغمبرؐ نے یوں واضح کیا ہے: لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِیْضَ بَلْ اَمْرٌ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ. انسان نہ تو مجبور ہے اور نہ ہی مختار بلکہ وہ جبر و اختیار کے درمیان میں ہے۔

مکتبِ خلفاء میں جبر کا عقیدہ

اس مسئلے کی گہری تحقیق سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ امتِ اسلامیہ میں عقیدۂ جبر کی حکومتوں نے آبیاری کی کیونکہ اس عقیدے کی وجہ سے انہیں ہر طرح کی تنقید سے آزادی حاصل ہو جاتی تھی اور لوگ ان کے مظالم کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر خاموش رہنے میں ہی اپنے ایمان کی عافیت سمجھتے تھے۔ عقیدۂ جبر کو رواج دینے میں بنی امیہ کی ظالم حکومتوں نے اہم کردار ادا کیا۔ جب کربلا کے واقعۂ فاجعہ کے بعد آلِ محمدؐ کا لُٹا پٹا قافلہ قید ہو کر کوفے میں ابن زیاد کے دربار میں پہنچا تو ابن زیاد نے حضرت زینب سلام اللہ علیہا سے کہا: اَلْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِیْ فَضَحَکُمْ وَقَتَلَکُمْ وَاَکْذَبَ اُحْدُوْثَتَکُمْ. شکر ہے اس خدا کا جس نے تمہیں رسوا کیا، تمہیں قتل کیا اور تمہارے جھوٹ کو ظاہر کیا۔ (نعوذ باللہ)

شیرِ خداؑ کی شیر دل بیٹی حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا نے مضبوط لہجے میں فرمایا: اَلْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِیْ اَکْرَمَنَا بِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ وَطَھَّرَنَا تَطْھِیْرًا، لَا کَمَا تَقُوْلُ. تمام شکر و سپاس اس خدا کے لئے ہے جس نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعے ہمیں عزت عطا فرمائی اور ہر طرح کی ناپاکی سے ہمیں پاک و پاکیزہ رکھا۔ ایسا نہیں جیسا کہ تو کہہ رہا ہے۔

ابن زیاد نے کہا: فَکَیْفَ رَأَیْتِ صُنْعَ اللّٰہِ بِاَھْلِ بَیْتِکِ؟ تو نے دیکھا کہ خدا نے تیرے خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے فرمایا: کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقَتْلُ فَبَرَزُوْا اِلٰی مَضَاجِعِھِمْ وَسَیَجْمَعُ اللّٰہُ بَیْنَکَ وَبَیْنَھُمْ. خدا نے ان کی تقدیر میں شہادت لکھی تھی اس لئے وہ خود چل کر اپنی شہادتگاہ تک گئے اور خدا عنقریب فیصلے کے لئے تجھے اور انہیں جمع کرے گا۔

ابن زیاد نے امام سجادؑ سے کہا: تمہارا کیا نام ہے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: میں علیؑ بن الحسینؑ ہوں۔

ابن زیاد نے کہا: اَوَلَمْ یَقْتُلِ اللّٰہُ عَلِیَّ بْنَ الْحُسَیْنِ؟ کیا خدا نے علیؑ بن الحسینؑ کو قتل نہیں کیا؟

اس کی جسارت آمیز گفتگو سن کر امام سجادؑ خاموش رہے۔

ابن زیاد نے کہا: تم بولتے کیوں نہیں؟

اس وقت امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا: قَدْ کَانَ لِیْ اَخٌ یُقَالُ لَهُ اَیْضًا عَلِیٌّ، فَقَتَلَهُ النَّاسُ. میرے ایک بھائی کا نام بھی علیؑ تھا جسے لوگوں نے قتل کردیا۔

ابن زیاد نے کہا: اِنَّ اللّٰهَ قَدْ قَتَلَهُ. نہیں! اسے لوگوں نے نہیں خدا نے قتل کیا۔

تب امام سجادؑ نے کہا: اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا... (خدا موت کے وقت لوگوں کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی روحیں سوتے میں قبض کر لیتا ہے)(سورۂ زمر: آیت ۴۲) اور وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ. (کسی شخص میں طاقت نہیں کہ خدا کے حکم کے بغیر مرجائے) (سورۂ آل عمران: آیت ۱۴۵)

اس کے بعد ابن زیاد نے مسجدِ کوفہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَظْهَرَ الْحَقَّ وَ اَهْلَهُ وَ نَصَرَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ یَزِیْدَ بْنَ مُعَاوِیَةَ وَ حِزْبَهُ وَ قَتَلَ الْکَذَّابَ الْحُسَیْنَ بْنَ عَلِیٍّ وَ شِیْعَتَهُ. خدا کا شکر ہے کہ اس نے حق اور اہلِ حق کو ظاہر کیا اور امیر المومنین یزید بن معاویہ اور اس کے گروہ کی مدد کی اور حسینؑ بن علیؑ اور اس کے شیعوں کو قتل کیا۔[1]

کربلا میں روا رکھے جانے والے ظلم وستم کے لئے یزید کا نکتۂ نظر ملاحظہ فرمائیں:

یزید نے امام سجادؑ سے کہا: تمہارے والد نے مجھ سے قطع رحمی کی اور میرے حق کا انکار کیا اور میری سلطنت میں مجھ سے جھگڑا کیا۔ اس کے عوض خدا نے ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو تم نے دیکھ لیا۔

امام سجادؑ نے اس کے جواب میں فرمایا: مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا. ارضِ وطن پر اور تم پر کوئی مصیبت نہیں پڑتی مگر پیشتر اس کے کہ ہم اسے پیدا کریں وہ کتابِ الٰہی میں مقدّر ہو چکی ہوتی ہے۔ (سورۂ حدید: آیت ۲۲)

اس کے بعد یزید نے اپنے بیٹے خالد سے کہا کہ تم اس کا جواب دو۔ خالد سے کوئی جواب نہ بن سکا تو یزید نے خالد سے کہا کہ کہو: وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ. تم پر جو مصیبت آئی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔ (سورۂ شوریٰ: آیت ۳۰)[2]

ابن زیاد اور یزید نے واقعۂ کربلا کی نسبت خدا سے دی اور کہا کہ کربلا کا تمام تر ظلم وستم خدا نے کیا

۱۔ اس گفتگو کی تفصیل ہماری کتاب معالم المدرستین، جلد۳، ص ۱۸۶ تا ۱۸۹ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ طبری، تاریخ الامم والملوک، جلد۵، ص ۴۶۱۔ اور مطبوعہ یورپ، جلد۲، ص ۳۷۷۔

جبکہ امام سجّادؑ اور حضرت زینب عالیہ سلام اللہ علیہا نے کہا کہ ہم پر یہ ظلم وستم خدا نے نہیں کیا بلکہ تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے کیا ہے۔

مکتبِ خلفاء کے محدثین نے عقیدۂ جبرؔ کے اثبات کے لئے پیغمبر اکرمؐ سے کئی روایات منسوب کی ہیں۔ اس باب میں عبداللہ بن عمرؓ کا قول قابلِ غور ہے۔ صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان سے کہا گیا: اے ابوعبدالرحمٰن! بعض لوگ جو تلاوتِ قرآن کے رسیا اور علم کے جویا ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ تقدیر کا کوئی وجود نہیں ہے اور انسان اپنے کاموں میں مختار ہیں۔ یہ سن کر عبداللہ بن عمرؓ برہم ہوئے اور کہا: اس ذات کی قسم کہ جس کی عبداللہ بن عمرؓ قسم کھایا کرتا ہے اگر وہ لوگ کوہِ اُحد کے برابر سونا بھی راہِ خدا میں خرچ کردیں تب بھی خدا اُسے قبول نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ ''قدر'' پر ایمان لائیں۔ پھر انہوں نے کہا: میرے والد عمر بن خطابؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک دن ہم رسولِ خداؐ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص سفید براق کپڑے پہنے ہوئے آیا جس کے بال کافی کالے تھے۔ وہ مسافر بھی نہیں لگتا تھا اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہیں تھا۔ وہ شخص رسولِ اکرمؐ کے زانو سے زانو ملا کر بالکل قریب بیٹھ گیا اور اپنی دونوں ہتھیلیاں آپؐ کے زانو پر رکھ کر بولا: اے محمدؐ! بتائیے اسلام کیا ہے؟ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی توحید اور میری رسالت کی گواہی دو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، ماہِ رمضان کے روزے رکھو اور اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔ اس نے کہا: آپؐ نے سچ کہا۔

ہمیں اس کے اس انداز پر بڑا تعجب ہوا کیونکہ وہ سوال بھی کر رہا تھا اور تصدیق بھی کر رہا تھا۔ پھر اس نے کہا: یارسول اللہؐ! ایمان کیا ہے؟ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روزِ آخرت پر ایمان لاؤ اور خیر و شر کی تقدیر پر ایمان لاؤ۔ اس نے کہا: آپؐ نے سچ کہا۔[1]

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث ۱۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب ۱۶۔ سنن ترمذی، کتاب الایمان، باب ۴۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ: اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ! اِنَّہٗ قَدْ ظَهَرَ قِبَلَنَا نَاسٌ یَقْرَؤُوْنَ الْقُرْآنَ وَ یَتَقَفَّرُوْنَ الْعِلْمَ. وَ ذَكَرَ مِنْ شَاْنِهِمْ وَ اَنَّهُمْ یَزْعَمُوْنَ اَنْ لَّا قَدَرَ، وَاَنَّ الْاَمْرَ اُنُفٌ. قَالَ: فَاِذَا لَقِیْتَ اُولٰئِكَ فَاَخْبِرْهُمْ اَنِّیْ بَرِیْءٌ مِّنْهُمْ وَاَنَّهُمْ بُرَآءُ مِنِّیْ وَالَّذِیْ یَحْلِفُ بِهٖ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ لَوْ اَنَّ لِاَحَدِهِمْ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فَاَنْفَقَهٗ مَا قَبِلَ اللّٰهُ مِنْهُ حَتّٰى یُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ. ثُمَّ قَالَ: حَدَّثَنِیْ اَبِیْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَالَ: بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ذَاتَ یَوْمٍ اِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیْدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ شَدِیْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا یُرٰى عَلَیْهِ اَثَرُ السَّفَرِ وَلَا یَعْرِفُهٗ مِنَّا اَحَدٌ حَتّٰى جَلَسَ اِلَى النَّبِیِّ فَاَسْنَدَ رُكْبَتَیْهِ اِلٰى رُكْبَتَیْهِ وَوَضَعَ كَفَّیْهِ عَلٰى فَخِذَیْهِ. وَقَالَ: یَا مُحَمَّدُ! اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ تُقِیْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِیَ الزَّكٰوةَ وَ تَصُوْمَ رَمَضَانَ وَ تَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا. قَالَ: صَدَقْتَ. قَالَ: فَعَجِبْنَا لَهٗ یَسْاَلُهٗ وَ یُصَدِّقُهٗ. قَالَ: فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ. قَالَ: اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَیْرِهٖ وَ شَرِّهٖ. قَالَ: صَدَقْتَ.

یہی روایت لفظی تغیر کے ساتھ ابوہریرہ سے یوں مروی ہے:

رسول اکرمؐ نے ایک بار فرمایا: "سَلُوْنِیْ" مجھ سے پوچھو مگر لوگ جلالتِ نبوّت سے خاموش رہے۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور آپؐ کے زانو کے قریب بیٹھ گیا اور اس نے پوچھا: یارسول اللہ! اسلام کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا: خدا کا شریک نہ ٹھہرانا، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ماہِ رمضان کے روزے رکھنا۔

اس نے کہا: آپؐ نے سچ کہا۔ پھر اس نے پوچھا یارسول اللہ! ایمان کیا ہے؟

آپؐ نے فرمایا: خدا پر اور اس کے فرشتوں، اس کی کتاب، اس کے سامنے حاضر ہونے، اس کے رسولوں کو ماننے، قبروں سے دوبارہ جی اٹھنے اور پوری تقدیر پر ایمان رکھنے کا نام ایمان ہے۔ اس نے کہا: آپؐ نے سچ کہا۔[1]

علاوہ ازیں صحیح مسلم کی ''کتابُ القدر'' میں موجود ابتدائی نو احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ جیسے ہی کوئی جنین شکمِ مادر میں قرار پکڑتا ہے تو خدا فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس کی روزی، اخلاق و عادات کو لکھ دیں اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیں کہ آیا وہ خوش بخت ہے یا بدبخت۔ ہر انسان کے متعلق جب وہ شکمِ مادر میں ہوتا ہے فیصلہ کردیا جاتا ہے کہ وہ جنّتی ہے یا جہنّمی اور اس فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔[2]

مکتبِ اہلبیتؑ میں جبر و اختیار کا مفہوم

۱۔ اوصیائے پیغمبرؐ کی متعدد روایات میں یہ الفاظ مروی ہیں: لَاجَبْرَ وَلَا تَفْوِیْضَ بَلْ اَمْرٌ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ. نہ جبر ہے نہ تفویض ہے بلکہ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے۔[3]

۱۔ مسلم بن حجاج نیشاپوری، المتوفی ۲۶۱ھ، صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث ۷۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ: سَلُوْنِیْ، فَھَابُوْہُ اَنْ یَسْاَلُوْہُ. فَجَاءَ رَجُلٌ فَجَلَسَ عِنْدَ رُکْبَتَیْہِ. فَقَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَا الْاِسْلَامُ؟ قَالَ: لَا تُشْرِکُ بِاللّٰہِ شَیْئاً وَّ تُقِیْمُ الصَّلَاۃَ وَ تُؤْتِی الزَّکٰوۃَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ. قَالَ: صَدَقْتَ. قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَاالْاِیْمَانُ؟ قَالَ: اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَ مَلَائِکَتِہٖ وَ کِتَابِہٖ وَ لِقَائِہٖ وَرُسُلِہٖ وَ تُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ وَ تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ کُلِّہٖ. قَالَ: صَدَقْتَ.

۲۔ مسلم بن حجاج نیشاپوری، المتوفی ۲۶۱ھ، صحیح مسلم کتاب القدر، حدیث ۱تا۹، ص ۲۰۳۶ تا ۲۰۳۹۔ حافظ محمد بن عیسیٰ سُلمی ترمذی، المتوفی ۲۷۹ھ، سنن ترمذی کتاب القدر، باب ۱۰ و کتاب الایمان، باب ۴۔ حافظ ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی شافعی، المتوفی ۳۰۳ھ، سنن نسائی کتاب الایمان، باب ۵و۶۔ ابن ماجہ، المتوفی ۲۷۳ھ، سنن ابن ماجہ، مقدمہ، ص ۱۰۹۔ احمد بن محمد بن حنبل شیبانی مروزی، المتوفی ۲۴۱ھ، مسند احمد، جلد۱، ص ۲۸۔ ۵۲۔ ۹۷۔ جلد۲، ص ۱۰۷۔ ۱۸۱۔ ۲۱۲۔ جلد۴، ص ۱۲۹۔ ۱۶۴، جلد۵، ص ۱۸۵۔ ۳۱۷۔

۳۔ شیخ صدوق، توحید، بَابُ نَفْیِ الْجَبْرِ وَالتَّفْوِیْضِ، ص ۳۵۹ تا ۳۶۳۔ علامہ مجلسی، بحارالانوار، باب نفی الظلم وَالجَوْرِ عَنْہُ تَعَالٰی وَاِبْطَالُ الْجَبْرِ وَالتَّفْوِیْضِ، جلد۵، ص ۲۔ عَنْ اَبِیْ عَبْدِاللّٰہِ قَالَ: لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِیْضَ وَلٰکِنْ اَمْرٌ بَیْنَ اَمْرَیْنِ.

۲۔ اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ النَّاسَ فِی الْقَدْرِ عَلٰی ثَلَاثَةِ اَوْجُهٍ: رَجُلٌ یَزْعَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اَجْبَرَ النَّاسَ عَلَی الْمَعَاصِیْ فَهٰذَا قَدْ ظَلَمَ اللّٰهَ فِیْ حُکْمِهٖ فَهُوَ کَافِرٌ، وَ رَجُلٌ یَزْعَمُ اَنَّ الْاَمْرَ مُفَوَّضٌ اِلَیْهِمْ فَهٰذَا قَدْ اَوْهَنَ اللّٰهَ فِیْ سُلْطَانِهٖ فَهُوَ کَافِرٌ وَّ رَجُلٌ یَزْعَمُ اَنَّ اللّٰهَ کَلَّفَ الْعِبَادَ مَا یُطِیْقُوْنَ وَلَمْ یُکَلِّفْهُمْ مَالَا یُطِیْقُوْنَ وَ اِذَا اَحْسَنَ حَمِدَ اللّٰهَ وَ اِذَا اَسَاءَ اسْتَغْفَرَ اللّٰهَ فَهٰذَا مُسْلِمٌ بَالِغٌ.

عقیدۂ تقدیر کے متعلق لوگوں کے تین نکتہ ہائے نظر ہیں:

(ا) جو یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے بندوں کو اپنی نافرمانی پر مجبور کیا ہے اس نے خدا پر ظلم کیا اور وہ کافر ہوگیا۔

(ب) جو یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے تمام معاملات بندوں کو سونپ دیئے ہیں اور وہ اپنے بندوں کے کاموں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا اس نے خدا کی فرمانروائی کی توہین کی اور وہ کافر ہوگیا۔

(ج) جو یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے بندوں کو ان کاموں کا حکم دیا ہے جن کو کرنے کی ان میں طاقت وصلاحیت موجود ہے اور ان کاموں کا حکم ہی نہیں دیا جن کو کرنے کی ان میں طاقت وصلاحیت موجود نہیں ہے۔ ایسا شخص جب کوئی اچھا کام کرتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور جب اس سے کوئی برا کام ہوجاتا ہے تو وہ خدا سے معافی مانگتا ہے۔ ایسا شخص سچا اور کامل مسلمان ہے۔

۳۔ ایک دن (امام) ابوحنیفہؒ، حضرت امام جعفر صادقؑ کے گھر سے نکل رہے تھے کہ حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سامنے آگئے۔ اس وقت آپؑ بہت کم عمر تھے۔ (امام) ابوحنیفہؒ نے ان سے کہا: بیٹا! یہ بتاؤ کہ گناہ کس کی طرف سے وقوع پذیر ہوتا ہے؟

امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا: اے شیخ! اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

(ا) یا تو— گناہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور بندے کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یہ خدا کی شان کریمی کے خلاف ہے کہ وہ اپنے بندے کا اس عمل پر مؤاخذہ کرے جو اس نے کیا ہی نہیں۔

(ب) یا پھر— خدا گناہ میں اپنے بندے کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ اس صورت میں خدا طاقتور اور بندہ کمزور شریک ہے۔ اور طاقتور کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے کمزور شریک کے اُس فعل کا محاسبہ کرے جس میں وہ بھی شریک ہو۔

(ج) یا— گناہ بندہ کرتا ہے اور خدا کا گناہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر اگر خدا بندے کو عذاب دے تو یہ اس کا عدل ہوگا اور اگر معاف کردے تو یہ اس کا فضل ہوگا۔

امام موسیٰ کاظمؑ کا جواب سن کر ابوحنیفہؒ یوں خاموش ہوگئے گویا ان کے منہ میں گھنگھنیاں بھری ہوئی ہوں۔[۱]

۱۔ علامہ مجلسی، بحارالانوار، جلد۵، ص۴۔ ۲۷ منقول از احتجاج طبرسی۔ شیخ صدوق نے بھی اس روایت کو کتاب التوحید، عیون الاخبار الرضاؑ اور امالی میں نقل کیا ہے۔

۴۔ ایک مرتبہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے سامنے جبر و اختیار کا ذکر ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

اَلاَ اُعْطِیْکُمْ فِیْ ھٰذَا اَصْلاً لاَ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ وَلاَ یُخَاصِمُکُمْ عَلَیْہِ اَحَدٌ اِلاَّ کَسَرْتُمُوْہُ؟ قُلْنَا: اِنْ رَاَیْتَ ذٰلِکَ، فَقَالَ: اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ لَمْ یُطَعْ بِاِکْرَاہٍ وَلَمْ یُعْصَ بِغَلَبَۃٍ وَلَمْ یُھْمِلِ الْعِبَادَ فِیْ مُلْکِہٖ، ھُوَ الْمَالِکُ لِمَا مَلَّکَھُمْ وَالْقَادِرُ عَلٰی مَا اَقْدَرَھُمْ عَلَیْہِ، فَاِنِ ائْتَمَرَ الْعِبَادُ بِطَاعَتِہٖ لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ عَنْھَا صَادًّا وَلاَ مِنْھَا مَانِعًا، وَاِنِ ائْتَمَرُوْا بِمَعْصِیَتِہٖ فَشَآءَ اَنْ یَحُوْلَ بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ ذٰلِکَ فَعَلَ، وَاِنْ لَمْ یَحُلْ وَ فَعَلُوْہُ فَلَیْسَ ھُوَ الَّذِیْ اَدْخَلَھُمْ فِیْہِ، ثُمَّ قَالَ: مَنْ یَضْبِطُ حُدُوْدَ ھٰذَا الْکَلاَمِ فَقَدْ خَصَمَ مَنْ خَالَفَہٗ۔

کیا میں تمہیں ایک ایسا قاعدہ نہ بتادوں کہ جس کے بعد اس مسئلے میں تم میں اختلاف نہ رہے اور جس کی موجودگی میں تم اپنے مقابل کو لاجواب کرسکو۔

حاضرین نے کہا: یہ آپ کا احسان ہوگا۔

امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا: یاد رکھو! خدا کسی کو اپنی اطاعت پر مجبور نہیں کرتا اور کوئی بھی خدا سے غالب ہو کر اس کی نافرمانی نہیں کرتا۔ خدا نے اپنے بندوں کو مکمل طور پر آزاد بھی نہیں چھوڑا۔ جو قوتیں اس نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہیں ان قوتوں کا مالک وہ ہے اور اس نے اپنے بندوں کو جو بھی قدرت دی ہے اس قدرت کا مالک بھی وہی ہے۔ اگر بندے اس کی اطاعت کریں تو وہ اطاعت میں رکاوٹ نہیں ڈالتا اور انہیں اطاعت سے جبراً نہیں روکتا اور اگر بندے اس کی نافرمانی کریں اور وہ انہیں روکنا چاہے تو روک دیتا ہے اور اگر وہ انہیں نہ روکنا چاہے اور بندے نافرمانی کریں تو اس نے انہیں نافرمانی میں داخل نہیں کیا ہوتا۔

پھر آپؑ نے فرمایا: جو کوئی اس بات کو گرہ میں باندھ لے گا وہ اپنے مخالفین پر غالب رہے گا۔[1]

(۵) امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لاَ جَبْرَ وَلاَ تَفْوِیْضَ وَلٰکِنْ اَمْرٌ بَیْنَ اَمْرَیْنِ. قَالَ: قُلْتُ وَمَا اَمْرٌ بَیْنَ اَمْرَیْنِ؟ قَالَ: مَثَلُ ذٰلِکَ مَثَلُ رَجُلٍ رَاَیْتَہٗ عَلٰی مَعْصِیَۃٍ فَنَھَیْتَہٗ فَلَمْ یَنْتَہِ فَتَرَکْتَہٗ فَفَعَلَ تِلْکَ الْمَعْصِیَۃَ. فَلَیْسَ حَیْثُ لَمْ یَقْبَلْ مِنْکَ فَتَرَکْتَہٗ اَنْتَ الَّذِیْ اَمَرْتَہٗ بِالْمَعْصِیَۃِ.

نہ جبر ہے اور نہ تفویض ہے بلکہ معاملہ دونوں کے درمیان ہے۔

راوی نے پوچھا: "معاملہ دونوں کے درمیان میں ہے" کا کیا مطلب ہے؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: اس کی مثال یوں سمجھو کہ تم نے ایک شخص کو خدا کی نافرمانی کرتے ہوئے دیکھا تو تم نے اسے غلط کاری سے منع کیا لیکن اس نے تمہاری بات نہیں مانی۔ تم اسے چھوڑ کر چل دیئے اور اس

۱۔ بحارالانوار، جلد ۵، ص ۱۶، منقول از کتاب التوحید و عیون الاخبار الرضاؑ۔

نے نافرمانی کی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اس سے نافرمانی کرائی ہے۔[1]

۶۔ جبر وتفویض کے تمام سوالات اور ان کے جوابات کو سمجھنے کے لئے امام علی علیہ السلام کے اس خطبے کو سمجھنا ضروری ہے۔

جب حضرت امیر المومنینؑ جنگِ صفّین سے کوفے واپس آئے تو ایک شخص نے پوچھا: یاامیر المومنینؑ! بتایئے کہ ہم نے اہلِ شام سے جو جنگ کی ہے کیا وہ قضاء وقدر کے موافق تھی؟ حضرت امیرؑ نے فرمایا: تم اس سفر کے دوران جس ٹیلے پر چڑھے اور جس وادی میں اترے وہ سب قضاء وقدر کے موافق تھا۔ اس شخص نے کہا: تو پھر ہمیں کوئی ثواب بھی نہیں ملا۔ یہ سن کر حضرت امیرؑ نے فرمایا: تم نے ایسا کیوں سمجھ لیا؟ اس شخص نے کہا: اگر قضاء وقدر کے فیصلوں سے مجبور ہو کر ہم نے یہ سب کچھ کیا تو پھر اطاعت پر ثواب نہیں اور معصیت پر عذاب نہیں۔ حضرت امیرؑ نے فرمایا: شاید تم نے سمجھ لیا ہے کہ قضاء وقدر نے لازمی اور حتمی فیصلہ کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر جزا و سزا کا سوال ہی نہیں ہوتا اور نہ وعدہ وعید کا کچھ مطلب ہوتا۔ یہ قول ہے بُت پرستوں، شیطان کے بھائیوں، خدا کے دشمنوں، قدریوں اور اس امت کے مجوسیوں[2] کا۔ خدا نے جن کاموں کا حکم دیا ہے انسان کو اُن کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار بھی دیا ہے اور جن کاموں سے منع کیا ہے ان کا نقصان بھی بتادیا ہے۔ اس نے انسان کو آسان کاموں کا مکلف ٹھہرایا ہے اور کوئی مشکل کام نہیں بتلایا۔ نہ کسی پر خدا کی اطاعت کے لئے زبردستی ہے اور نہ کوئی اس کی نافرمانی پر مجبور ہے۔ خدا نے آسمانوں کو، زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ یہ تو کافروں کا گمان ہے اور ان کافروں کی تو دوزخ میں شامت آجائے گی۔

اس شخص نے کہا: یاامیر المومنینؑ! آپ جس قضاء وقدر کو بتا رہے ہیں اس کی وضاحت فرمایئے؟

حضرت امیرؑ نے فرمایا: قضاء وقدر کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اپنی اطاعت کا حکم دیا اور اپنی نافرمانی سے منع فرمایا۔[3] اس نے نیکی کرنے اور برائی سے بچنے کی طاقت دی۔ جو کام اس کی قربت کا ذریعہ ہیں وہ انہیں انجام دینے میں انسان کی مدد کرتا ہے۔ جو کوئی اس کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ اسے اس کے نفس کے سپرد کردیتا ہے۔ خدا نے نیک کاموں کے لئے جزا کی نوید سنائی ہے اور برے کاموں پر عذاب کا وعدہ کیا ہے اور ڈرایا بھی ہے۔[4] یہ ہمارے اعمال میں خدا کی قضاء اور تقدیر ہے۔ اس کے علاوہ قضاء وقدر کا کوئی اور مفہوم

۱۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار، جلد ۵، ص ۱۷، منقول از کتاب التوحید۔

۲۔ شاید حضرت نے قدریہ کو مجوس سے اس لئے تشبیہ دی ہو کہ انہوں نے خدا کے دین میں اتنی تحریف کی کہ محارم کے ساتھ نکاح کو جائز سمجھ لیا تھا۔

۳۔ یہاں قضا کے معنی ہیں فیصلہ کیا۔

۴۔ یہاں قدر کے معنی ہیں اس نے امور کو اس طرح سے مقدّر کیا ہے۔

مت سمجھو ورنہ تمہارے نیک عمل ضائع ہو جائیں گے۔[1]

حضرت علیؑ کی یہ گفتگو سن کر اس شخص نے کہا: اے امیرالمومنینؑ! آپ نے میرا غم زائل کر دیا۔ خدا آپ سے غموں کو دور رکھے۔ اس کے بعد اس شخص نے حضرت امیرؑ کی مدح میں چند شعر کہے۔[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے اس سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے آنے جانے پر تمہارے لئے بہت بڑا اجر مقرر کیا ہے۔ تم نے مجبور ہو کر کوئی کام نہیں کیا۔

اس شخص نے کہا: اے امیرالمومنینؑ! ہم مجبور کیسے نہیں تھے جبکہ ہم تو قضاء و قدر کے قیدی تھے اور ہم وہاں قضاء و قدر کی وجہ سے گئے؟

اس شخص کے جواب میں حضرت نے مذکورۃ الصدر کلمات ارشاد فرمائے۔[3]

مؤلف کہتا ہے کہ اس مفہوم کی ستر سے زائد روایات مکتبِ اہلبیتؑ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ البتہ ہم یہ بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مکتبِ خلفاء کے نظریات پر مبنی کچھ روایات اہلبیتؑ کے نام سے منسوب ہو کر مکتبِ اہلبیتؑ کی کچھ کتابوں میں دَر آئی ہیں۔ جن پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ البتہ ہم یہاں تمام افتراء پردازیوں کے جواب کے لئے صرف ایک روایت پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۷) غُلات کے متعلق امام علی رضا علیہ السلام کا ناطق فیصلہ:

عَنْ اَبِی الْحَسَنِ عَلِیِّ بْنِ مُوْسَی الرِّضَا عَلَیْهِ السَّلَامُ قَالَ: قُلْتُ لَهُ: یَابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! اِنَّ النَّاسَ یَنْسُبُوْنَنَا اِلَی الْقَوْلِ بِالتَّشْبِیْهِ وَالْجَبْرِ لِمَارُوِیَ مِنَ الْاَخْبَارِ فِیْ ذٰلِکَ عَنْ اٰبَائِکَ الْاَئِمَّةِ. فَقَالَ:

۱۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ "جو شخص ایمان کا منکر ہوا اس کے عمل ضائع ہو گئے۔" (سورۂ مائدہ: آیت ۵)

۲۔ بحارالانوار، جلد ۵، ص ۱۲۵، باب قضاء و قدر، حدیث ۴۷، بحوالہ ارشاد شیخ مفید۔

۳۔ اس روایت کو علامہ مجلسی نے باختلافِ لفظی بحارالانوار کی جلد ۵، ص ۱۲۵ میں احتجاج طبرسی سے نقل کیا ہے اور حدیث اول کی مشابہ روایات کو چار اسناد کے ساتھ کتاب العدل، جلد ۷، ص ۱۲ تا ۱۵ اور عیون الاخبار الرضاؑ سے حدیث ۱۹ کو نقل کیا ہے۔

قوله علیه السلام: اِذَا اَخْطَأَ الْقَضَاءُ یُمْکِنُ اَنْ یُقْرَأَ بِغَیْرِ هَمْزٍ: وَالْمَعْنَی اِذَا جَاوَزَ اَمْرٌ مِنَ الْاُمُوْرِ الَّتِیْ شُرِعَ فِیْ تَهْیِئَةِ اَسْبَابِ وُجُوْدِهِ الْقَضَاءَ وَلَمْ یَصِرْ مَقْضِیًّا فَلَا یَتَجَاوَزُ عَنِ الْقَدَرِ، وَلَا مُحَالَةَ یَدْخُلُ فِی التَّقْدِیْرِ وَاِنَّمَا یَکُوْنُ الْبَدَاءُ بَعْدَ التَّقْدِیْرِ وَاِذَا لَمْ یَخُطَّ مِنَ الْمُضَاعَفِ بِمَعْنَی الْکِتَابَةِ اَیْ اِذَا لَمْ یُکْتَبْ شَیْءٌ فِیْ لَوْحِ الْقَدَرِ لَا یُکْتَبُ فِیْ لَوْحِ الْقَضَاءِ اِذْهُوَ بَعْدَ الْقَدَرِ وَاِنَّمَا الْخَلْقُ مِنَ الْقَضَاءِ اَیْ اِذَا لُوْحِظَتْ عِلَلُ الْخَلْقِ وَالْاِیْجَادِ فَفِی التَّرْتِیْبِ الصُّعُوْدِیِّ یَتَجَاوَزُ مِنَ الْقَضَاءِ اِلَی الْقَدَرِ وَالتَّخَطِّیْ وَالْبَدَاءُ اِنَّمَا یَکُوْنُ بَعْدَ الْقَدَرِ قَبْلَ الْقَضَاءِ الاظهر انه کَانَ وَاِذَا اَخْطَاءَ الْقَدَرِ مَکَانَ "وَاِذَا لَمْ یَخْطَءِ الْقَدَرُ" وَیَکُوْنُ مِنَ الْخَطَاءِ لَا مِنَ الْخَطِّ. فَالْمَعْنَی اِنَّ کُلَّ مَا یُوْجَدُ مِنَ الْاُمُوْرِ اِمَّا مُوَافِقٌ لِلَوْحِ الْقَضَاءِ، اَوْلِلَوْحِ الْقَدَرِ عَلٰی سَبِیْلِ مَنْعِ الْخُلُوِّ، فَاِذَا وَقَعَ الْبَدَاءُ فِیْ اَمْرٍ وَلَمْ یَقَعْ عَلٰی مَا اَثْبَتَ فِی الْقَدَرِ یَکُوْنُ مُوَافِقًا لِلْقَضَاءِ وَلَعَلَّ ظَاهِرَ هٰذَا الْخَبَرِ تَقَدُّمُ الْقَضَاءِ عَلَی الْقَدَرِ وَیَحْتَمِلُ اَنْ یَکُوْنَ الْقَضَاءُ فِی الْاُوْلٰی بِمَعْنَی الْاَمْرِ وَفِی الثَّانِیْ بِمَعْنَی الْحَتْمِ فَیَسْتَقِیْمُ مَا فِی الرِّوَایَةِ مِنَ النَّفْیِ.

يَا ابْنَ خَالِدٍ! اَخْبِرْنِي عَنِ الْاَخْبَارِ الَّتِي رُوِيَتْ عَنْ آبَائِي الْاَئِمَّةِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ فِي التَّشْبِيْهِ وَالْجَبْرِ اَكْثَرُ اَمِ الْاَخْبَارُ الَّتِي رُوِيَتْ عَنِ النَّبِيِّ فِي ذٰلِكَ؟ فَقُلْتُ: بَلْ مَارُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ فِي ذٰلِكَ اَكْثَرُ. قَالَ: فَلْيَقُوْلُوْا: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ كَانَ يَقُوْلُ بِالتَّشْبِيْهِ وَالْجَبْرِ اِذًا. فَقُلْتُ لَهُ: اِنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَمْ يَقُلْ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا وَاِنَّمَا رُوِيَ عَلَيْهِ. قَالَ: فَلْيَقُوْلُوْا فِي آبَائِي اِنَّهُمْ لَمْ يَقُوْلُوْا مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا وَاِنَّمَا رُوِيَ عَلَيْهِمْ. ثُمَّ قَالَ: مَنْ قَالَ بِالتَّشْبِيْهِ وَالْجَبْرِ فَهُوَ كَافِرٌ مُشْرِكٌ وَنَحْنُ مِنْهُ بُرَاءٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ يَا ابْنَ خَالِدٍ! اِنَّمَا وَضَعَ الْاَخْبَارَ عَنَّا فِي التَّشْبِيْهِ وَالْجَبْرِ الْغُلَاةُ الَّذِيْنَ صَغَّرُوْا عَظَمَةَ اللّٰهِ. فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَقَدْ اَبْغَضَنَا وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَقَدْ اَحَبَّنَا وَمَنْ وَالَاهُمْ فَقَدْ عَادَانَا وَمَنْ عَادَاهُمْ فَقَدْ وَالَانَا وَمَنْ وَصَلَهُمْ فَقَدْ قَطَعَنَا وَمَنْ قَطَعَهُمْ فَقَدْ وَصَلَنَا وَمَنْ جَفَاهُمْ فَقَدْ بَرَّنَا وَمَنْ بَرَّهُمْ فَقَدْ جَفَانَا وَمَنْ اَكْرَمَهُمْ فَقَدْ اَهَانَنَا وَمَنْ اَهَانَهُمْ فَقَدْ اَكْرَمَنَا وَمَنْ قَبِلَهُمْ فَقَدْ رَدَّنَا وَمَنْ رَدَّهُمْ فَقَدْ قَبِلَنَا وَمَنْ اَحْسَنَ اِلَيْهِمْ فَقَدْ اَسَاءَ اِلَيْنَا وَمَنْ اَسَاءَ اِلَيْهِمْ فَقَدْ اَحْسَنَ اِلَيْنَا وَمَنْ صَدَّقَهُمْ فَقَدْ كَذَّبَنَا وَمَنْ كَذَّبَهُمْ فَقَدْ صَدَّقَنَا وَمَنْ اَعْطَاهُمْ فَقَدْ حَرَمَنَا وَمَنْ حَرَمَهُمْ فَقَدْ اَعْطَانَا. يَا ابْنَ خَالِدٍ مَنْ كَانَ مِنْ شِيْعَتِنَا فَلَا يَتَّخِذَنَّ مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا [1]

ابن خالد کا بیان ہے کہ میں نے امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی: اے فرزندِ رسولؐ! لوگ ہماری طرف تشبیہ اور جبر کا عقیدہ منسوب کرتے ہیں کیونکہ اس سلسلے کی بہت سی روایات آپ کے آبائے طاہرینؑ سے روایت کی گئی ہیں۔ یہ سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا: اے ابن خالد! بھلا یہ بتاؤ جبر و تشبیہ کی روایات میرے آبائے طاہرینؑ سے زیادہ مروی ہیں یا رسولِ خداؐ سے؟

میں نے کہا: رسولِ خداؐ سے اس مفہوم کی روایات زیادہ مروی ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: پھر تو انہیں یہ کہنا چاہیے کہ رسولِ خداؐ (نعوذ باللہ) جبر و تفویض کے قائل تھے۔

میں نے کہا: وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ روایات جھوٹی ہیں اور رسولِ خداؐ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: تو اسی طرح انہیں یہ بھی کہنا چاہیے کہ ائمۂ اہلبیتؑ نے بھی یہ باتیں نہیں کہی تھیں یہ ان پر تراشی گئی ہیں۔ پھر امامؑ نے فرمایا: جو بھی تشبیہ اور جبر کا عقیدہ رکھے وہ شخص کافر و مشرک ہے اور ہم دنیا و آخرت میں اس سے بیزار ہیں۔ اے ابن خالد! تشبیہ اور جبر کی روایات ان غالیوں نے ہماری طرف منسوب کی ہیں جنہوں نے اللہ کی عظمت کو کم سمجھا۔ جان لو کہ جس نے غالیوں سے محبت رکھی اس نے ہم سے

---

[1] علامہ مجلسی نے اس حدیث کو بحارالانوار، جلد ۷، ص ۵۲ پر کتاب العدل کے شمارہ ۸۸ میں عیون الاخبار الرضاؑ اور توحید صدوق کے صفحہ ۳۶۳ و ۳۶۴ کے حوالے سے تفصیلاً نقل کیا ہے اور بحار کی کتاب التوحید باب نفی الجسم، جلد ۳، ص ۲۹۲ پر مذکورہ دو کتابوں اور احتجاج کے حوالے سے مختصر روایت بھی نقل کی ہے۔

بغض رکھا اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے ہم سے محبت رکھی۔ جس نے ان سے دوستی رکھی اس نے ہم سے دشمنی رکھی اور جس نے ان سے دشمنی رکھی اس نے ہم سے دوستی رکھی۔ جس نے ان سے رشتہ جوڑا اس نے ہم سے رشتہ توڑا اور جس نے ان سے رشتہ توڑا اس نے ہم سے رشتہ جوڑا۔ جس نے ان پر جفا کی اس نے ہم پر احسان کیا اور جس نے ان پر احسان کیا اس نے ہم پر جفا کی۔ جس نے ان کا احترام کیا اس نے ہماری توہین کی اور جس نے ان کی توہین کی اس نے ہمارا احترام کیا۔ جس نے ان کی بات قبول کی اس نے ہماری بات رد کی اور جس نے ان کی بات رد کی اس نے ہماری بات قبول کی۔ جس نے ان سے بھلائی کی اس نے ہم سے برائی کی اور جس نے ان سے برائی کی اس نے ہم سے بھلائی کی۔ جس نے ان کی تصدیق کی اس نے ہماری تکذیب کی اور جس نے ان کی تکذیب کی اس نے ہماری تصدیق کی۔ جس نے ان پر بخشش کی اس نے ہمیں محروم رکھا اور جس نے انہیں محروم رکھا اس نے ہم پر بخشش کی۔ اے ابن خالد! جو بھی ہمارا شیعہ ہو وہ انہیں دوست اور مددگار نہ بنائے۔

مُوازَنہ و تجزیہ

ایسی آیات و روایات جن سے جبرؔ و اختیار کا استدلال کیا جاتا ہے ان کی تحقیق کے لئے ہمیں دو مَباحث کی ضرورت ہے:

اول: انسان کس طرح سے سعید یا شقی بنتا ہے۔

دوم: انسان مجبور ہے یا مختار اور انسان کی سعادت و شقاوت کے حوالے سے آیات و روایات میں استعمال ہونے والے الفاظ اور اصطلاحات سے آشنائی۔

قضا وقدر اور جبرؔ و اختیار کے موضوع کی مزید تفہیم کے لئے ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی کی کتاب ثم اهتديت اور مجمع علمی اسلامی دیکھئے۔

انسان کی سعادت اور شقاوت

ہم انسان کی خوش نصیبی اور بدنصیبی کا تین عوالم میں مطالعہ کرنا چاہتے ہیں:

۱۔ عالمِ نُطفہ

۲۔ عالمِ دنیا

۳۔ عالمِ آخرت

(۱) عالمِ نُطفہ

انسان کی جسمانی اور روحانی خصوصیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ اکثر افراد کی شکل وصورت، ذہانت یا ذہنی پسماندگی، خوش مزاجی یا تندخوئی حتیٰ کہ جسمانی اور نفسیاتی بیماریاں بھی موروثی ہوتی ہیں۔ بعض افراد کو یہ تمام چیزیں اپنے ماں باپ یا قریبی عزیزوں سے ورثے میں ملتی ہیں۔

علاوہ ازیں میاں بیوی کی خوراک کا بھی نطفے پر اثر ہوتا ہے اور حقوقِ زوجیت کے وقت والدین کی نفسیاتی حالت بھی جنین پر اثرانداز ہوتی ہے۔ جب نطفہ ٹھہرتا ہے تو ماں کی خوراک اور اس کی ذہنی وقلبی کیفیات بھی جنین پر اثر ڈالتی ہیں۔ اگر میاں بیوی اچھی اور متوازن غذا کھائیں تو اس کے نتیجے میں جو نطفہ بنے گا وہ تندرست اور اس سے پیدا ہونے والا بچہ بھی صحتمند ہوگا اور اگر انعقادِ نطفہ سے قبل کی غذا اچھی نہ ہو یا انعقادِ نطفہ کے بعد ماں کی غذا متوازن نہ ہو تو بچہ کمزور اور بیمار پیدا ہوگا۔

جس طرح سے اچھی اور متوازن غذا انعقادِ نطفہ سے قبل ضروری ہے اور انعقادِ نطفہ کے بعد ماں کی غذا کا بھی متوازن ہونا ضروری ہے جس سے بچہ جسمانی طور پر تندرست پیدا ہوتا ہے اسی طرح سے بعض غذائیں بچے کی نفسیات پر مضر اثرات مرتب کرتی ہیں۔ مثلاً جس بچے کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک شراب پیتا ہو یا نشہ کرتا ہو تو اس نشے کے مضر اثرات ہونے والے بچے پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ سؤر کا

گوشت کھانے سے بچے میں بے غیرتی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔[۱]

یہی وجہ ہے کہ جن غذاؤں کو اسلام نے حلال قرار دیا ہے وہ انہیں "طیبات" کہتا ہے اور اسلام کی حلال کردہ غذائیں بچے کی روحانی سلامتی کی ضامن ہوتی ہیں۔

انعقادِ نطفہ کے وقت والدین کی کیفیت بھی بچے پر اثر کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مرد اور عورت زنا کریں تو اس وقت ان دونوں کے ذہن میں یہ تصور ہوتا ہے کہ ہم خیانت کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو ہم مجرم ٹھہرائے جائیں گے۔ چونکہ نفسیاتی طور پر اس وقت وہ دونوں افرادِ شرفاء سے سخت نفرت میں مبتلا ہوتے ہیں اس لئے اگر ان کے گناہ کے نتیجے میں کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو اس ولدالزنا کے ذہن میں بھی شرفاء کے لئے نفرت ہوگی۔ یہ ایک فطری اور نفسیاتی اصول ہے۔

(۲) عالَمِ دُنیا

دنیا میں آنے والا ہر بچہ جب آتا ہے تو اپنے ساتھ ماں باپ اور دادا دادی سے ملنے والی کچھ صفات بطورِ میراث اپنے وجود کے ساتھ لیکر آتا ہے۔ اسی طرح ہر بچہ اپنی جسمانی اور روحانی خصوصیات شکمِ مادر سے ساتھ لیکر آتا ہے جیسا کہ علم المیراث میں تجربات سے ثابت ہو چکا ہے۔ اب یہاں اس کے متعلق دو نکات واضح ہو کر سامنے آتے ہیں:

۱۔ بعض بچے جسمانی طور پر معذور پیدا ہوتے ہیں مثلاً اندھے، بہرے اور گونگے وغیرہ جبکہ بعض بچے پیدائشی طور پر معذور تو نہیں ہوتے لیکن قدرتی آفات مثلاً زلزلے، سیلاب اور جنگ وغیرہ میں ان کا خاندان ہلاک جاتا ہے اور وہ سرپرستی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کو شدید احساسِ محرومی کے سبب پیدائشی طور پر معذور بچوں کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ بعض بچے روحانی نقائص کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں مثلاً پسماندگی یا روحانی بیماری کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔

کیا معذوری کے ساتھ پیدا ہونے والے بچے پر جو پوری زندگی جسمانی معذوری کے ساتھ بسر کرتا ہے اس بچے کے مقابلے میں جو تندرست و توانا پیدا ہوا ہے ظلم نہیں؟ اسی طرح کیا وہ بچہ جس کا خاندان قدرتی آفت میں ہلاک ہو گیا اور وہ بھری دنیا میں تنہا رہ گیا مظلوم نہیں؟ آخر قدرت کی طرف سے اس کی تلافی کیسے ہوگی؟

۱۔ خنزیر صرف غلاظت ہی نہیں کھاتا بلکہ اپنی مادہ کیلئے انتہائی بے غیرت بھی ہوتا ہے۔ اور وہ ہم جنس پرست بھی ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک بچہ فطری طور پر خلقِ خدا سے دشمنی لے کر پیدا ہوتا ہے اور اس کے برعکس ایک اور بچہ جسمانی صحت وسلامتی اور روحانی مسرت لے کر پیدا ہوتا ہے تو اگر کج ادا بچہ دنیا میں رہ کر بدکردار اور ظالم بنے تو اس میں اُس کا کیا قصور ہے؟ کیونکہ یہ اس بچے کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا اور اس کے اختیار سے باہر تھا۔

اسی طرح سے وہ بچہ جو برے ماحول میں پیدا ہوتا ہے اور جس کی پرورش بھی برے ماحول میں ہوتی ہے اگر وہ اس ماحول میں تربیت کی وجہ سے مجرم اور ظالم بن جاتا ہے تو اس میں اُس کا کیا قصور ہے؟ اس کے برعکس جو بچہ اچھے معاشرے میں آنکھ کھولتا ہے اور معاشرہ بھی اسے اچھائی اور سچائی سکھاتا ہے اگر وہ اپنے اچھے ماحول میں تربیت کی وجہ سے اچھا انسان بن جاتا ہے تو کیا وہ برے ماحول میں پلنے والے پر اس کی برائی کے سبب اعتراض کرنے کا حق رکھتا ہے؟

خداوندِ عالم کی مدد سے ہم ان سوالات کے جواب دیتے ہیں:

پہلے سوال کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سوال ممکن ہے کسی مسلمان کے لئے پیش آئے۔ اگرچہ پیدائشی طور پر معذور افراد کی عالمِ نطفہ اور عالمِ دنیا میں تو تلافی کا کوئی انتظام نہیں ہے لیکن اگر وہ اس دنیا سے ایمان کے ساتھ رخصت ہوجائے تو عالمِ آخرت میں اس کی تلافی کا سامان یقیناً موجود ہے۔ اس طرح کے سوال کا جواب حسبِ ذیل آیات وروایات میں بطریقِ احسن دیا گیا ہے۔

(۳) عالَمِ آخرت

سکراتِ موت کے ساتھ ہی عالَمِ آخرت کا سفر شروع ہوجاتا ہے۔ انسان اس دنیا میں رہ کر ہی اپنی آخرت کو سنوار سکتا ہے جیسا کہ قرآن کی آیات اور ہادیانِ دین کی روایات میں ہے کہ ''عالَمِ آخرت میں ان لوگوں کو اچھا بدلہ دیا جائے گا جو اس جہان میں باایمان رہے ہوں گے اور جنہوں نے اُن مصائب پر صبر کیا ہوگا جو اُن کے پیدا کردہ نہیں ہوں گے۔''

درحقیقت ہر انسان اس دنیا میں رہ کر ہی عالَمِ آخرت کو سدھارتا ہے جو تجسم اعمال کا عالَم ہے۔ یعنی انسان نے اس دنیا میں جو کام کیے ہوں گے آخرت میں اس کے وہی اعمال مجسم ہوکر اس کے سامنے آئیں گے جیسا کہ سورۂ زلزال میں ارشاد ہے:

(۱) فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ. جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔

(ب) سورۂ طور اور سورۂ تحریم میں ارشاد ہے:

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

(ج) سورۂ یٰسں میں ارشاد ہے:

وَلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. تمہیں تمہارے اپنے ہی اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

قرآن مجید کی بہت سی دیگر آیات میں بھی یہی مفہوم بیان ہوا ہے۔

(د) سورۂ بقرہ کی ۱۵۵ تا ۱۵۷ ویں آیت میں ارشاد ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ○ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ○

اور ہم یقیناً تمہیں کسی قدر خوف، بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے آزمائیں گے۔ اے پیغمبرؐ! آپ ان صبر کرنے والوں کو بشارت دیدیں جو مصیبت پڑنے کے بعد کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور ہم اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

(ہ) امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت میں مذکور ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا نُشِرَتِ الدَّوَاوِيْنُ وَ نُصِبَتِ الْمَوَازِيْنُ لَمْ يُنْصَبْ لِاَهْلِ الْبَلَاءِ مِيْزَانٌ وَلَمْ يُنْشَرْ لَهُمْ دِيْوَانٌ وَ تَلَا هٰذِهِ الْاٰيَةَ "اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ."[۱]

قیامت کے دن جب لوگوں کے نامۂ اعمال کھولے جائیں گے اور میزانِ عمل نصب کئے جائیں گے تو معذور افراد کا نہ تو نامۂ اعمال کھولا جائے گا اور نہ ہی ان کے لئے میزان نصب کیا جائے گا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ. جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔

(و) امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ مَكْفُوْفًا مُحْتَسِبًا مُوَالِيًا لِآلِ مُحَمَّدٍ لَقِيَ اللّٰهَ وَلَا حِسَابَ عَلَيْهِ. آلِ محمدؐ سے محبت کرنے والا اور دنیا میں صبر کرنے والا نابینا جب خدا کے حضور پیش ہوگا تو اس سے کوئی حساب نہیں لیا جائے گا۔

۱۔ بحارالانوار، جلد ۸۲، ص ۱۴۵، بحوالہ جوامع الجوامع۔

آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ چار اوقات میں دیا جائے گا۔
(۱) سکرات میں (۲) قبر میں (۳) قیامت میں (۴) جنّت یا دوزخ میں۔

۱۔ روایات میں مذکور ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ اَدْخَلَ عَلیٰ مُؤْمِنٍ سُرُوْرًا خَلَقَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مِنْ ذٰلِکَ السُّرُوْرِ خَلْقًا فَیَلْقَاهُ عِنْدَ مَوْتِهٖ فَیَقُوْلُ لَهٗ: اَبْشِرْ یَا وَلِیَّ اللّٰهِ بِکَرَامَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ، ثُمَّ لَا یَزَالُ مَعَهٗ حَتّٰی یُدْخِلَهٗ قَبْرَهٗ (یَلْقَاهُ) فَیَقُوْلُ لَهٗ مِثْلَ ذٰلِکَ فَیَقُوْلُ لَهٗ: مَنْ اَنْتَ رَحِمَکَ اللّٰهُ؟ فَیَقُوْلُ: اَنَاالسُّرُوْرُ الَّذِیْ اَدْخَلْتَهٗ عَلٰی فُلَانٍ.[1]

جو شخص کسی مومن کو خوش کرتا ہے تو خدا اس خوشی سے ایک مخلوق پیدا کرتا ہے جو موت کے وقت اس کے پاس آ کر کہتی ہے: اے ولیُ خدا! تجھے خدا کی طرف سے عزّت اور رضامندی مبارک ہو۔ خدا کی یہ مخلوق اس وقت بھی اس کے ساتھ ہوگی جب وہ قبر میں اتارا جائے گا۔ قبر میں بھی وہ اس کو ان ہی لفظوں میں بشارت دے گی۔ اور قیامت کے دن جب وہ قبر سے اٹھایا جائے گا تو وہ اسے ہر خوف و وحشت کے وقت تسلّی دے گی۔ تب وہ شخص اس سے پوچھے گا کہ خدا تجھ پر رحم کرے تو کون ہے؟ جواب میں وہ کہے گی کہ میں وہی خوشی ہوں جو تو نے فلاں مومن کو دی تھی۔

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اِنَّ الْمُتَکَبِّرِیْنَ یُجْعَلُوْنَ فِیْ صُوْرَةِ الذَّرِّ یَتَوَطَّاهُمُ النَّاسُ حَتّٰی یَفْرَغَ اللّٰهُ مِنَ الْحِسَابِ.[2]

متکبر قیامت کے دن چھوٹی چیونٹیوں کی شکل میں اٹھائے جائیں گے اور حساب کتاب ختم ہونے تک لوگ انہیں اپنے پاؤں تلے روندتے رہیں گے۔

۳۔ جو لوگ اپنے پاس سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کے انجام کے متعلق ارشاد ہے:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ○ یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ○ اور جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے عذابِ الیم کی خبر سنا دیجئے۔ جس دن وہ سونا چاندی آتشِ دوزخ میں تپایا جائے گا اور اس سے

۱۔ اصول کافی، جلد۲، ص۱۹۲۔

۲۔ ثواب الاعمال صدوق، ص۵۰۲۔

ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ یہی وہ ذخیرہ ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ سو جو تم جمع کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔ (سورۂ توبہ: آیت ۳۴و۳۵)

ان آیات و روایات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات و روایات سے دو امور واضح ہوتے ہیں:

۱۔ ہر انسان اس دنیا میں رہ کر اپنی اخروی زندگی کا سامان فراہم کرتا ہے۔

۲۔ عالم آخرت میں ہر شخص کے اعمال مجسم ہو کر اس کے سامنے آئیں گے خواہ اعمال نیک ہوں یا برے دونوں قسم کے اعمال مجسم ہو کر آئیں گے۔

الفاظ و اصطلاحات سے آشنائی

جبر و اختیار کی بحث میں تین الفاظ بار بار استعمال ہوئے ہیں: (۱) قضاء (۲) قدر (۳) فتنہ۔ مذکورہ الفاظ کی تشریح یہ ہے:

۱۔ قضاء

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

وَالْقَضَاءُ عَلٰی اَرْبَعَةِ اَوْجُهٍ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ جَلَّ وَ عَزَّ النَّاطِقِ عَلٰی لِسَانِ سَفِیْرِهِ الصَّادِقِ(ص).
مِنْهَا قَضَاءُ الْخَلْقِ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: "فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ" مَعْنَاهُ خَلَقَهُنَّ.
وَالثَّانِیْ قَضَاءُ الْحُکْمِ وَهُوَ قَوْلُهٗ: "وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ" مَعْنَاهُ حُکِمَ.
وَالثَّالِثُ قَضَاءُ الْاَمْرِ وَهُوَ قَوْلُهٗ: "وَقَضٰی رَبُّکَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ" مَعْنَاهُ اَمَرَ رَبُّکَ.
وَالرَّابِعُ قَضَاءُ الْعِلْمِ وَهُوَ قَوْلُهٗ: "وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ فِی الْکِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ" مَعْنَاهُ عَلِمْنَا مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ.[۱]

کتاب خدا میں لفظ قضاء کے چار معانی ہیں:

۱۔ قضاء بمعنی خلق۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ" اللہ نے دو دنوں (دو مرحلوں) میں سات آسمان بنا دیئے۔

۲۔ قضاء بمعنی فیصلہ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ" ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا۔

۳۔ قضاء بمعنی حکم۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَقَضٰی رَبُّکَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ" تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔

۱۔ بحار الانوار، جلد ۵، ص ۱۲۴ و ۱۲۵، باب القضاء والقدر، حدیث ۷۳، بحوالہ فقہ الرضاؑ۔

۴۔ قضاء بمعنی علم و آگاہی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ" ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں آگاہ کیا کہ تم ضرور زمین میں دو مرتبہ فساد مچاؤ گے۔

شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے لفظ قضاء کے دس معانی لکھے ہیں لیکن ان کی بازگشت ان ہی چار معانی کی طرف ہے۔[1]

۲۔ قدر

لفظ قدر عربی زبان میں حسب ذیل معانی میں استعمال ہوتا ہے:

۱۔ قدر بمعنی تنگی۔ جیسا کہ فرمان خداوندی ہے: قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ. اس پر روزی تنگ کردی گئی۔ (سورۃ طلاق: آیت ۷)

۲۔ قدر و حرمت کو پہچاننا۔ جیسا کہ فرمان خداوندی ہے: وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ. ان لوگوں نے خدا کی

۱۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید، ص ۳۸۵ و ۳۸۶۔

وَسَمِعْتُ بَعْضَ أَهْلِ الْعِلْمِ يَقُولُ: إِنَّ الْقَضَاءَ عَلَىٰ عَشَرَةِ أَوْجُهٍ.

فَأَوَّلُ وَجْهٍ مِنْهَا الْعِلْمُ وَهُوَ قَوْلُ اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ: "إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا" يَعْنِي عَلِمَهَا.

وَالثَّانِي: الْإِعْلَامُ وَهُوَ قَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: "وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ" وَقَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: "وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَٰلِكَ الْأَمْرَ" أَيْ أَعْلَمْنَاهُ.

وَالثَّالِثُ: الْحُكْمُ وَهُوَ قَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: "وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ" أَيْ يَحْكُمُ بِالْحَقِّ.

وَالرَّابِعُ: الْقَوْلُ وَهُوَ قَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: "وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ" أَيْ يَقُولُ الْحَقَّ.

وَالْخَامِسُ: الْحَتْمُ وَهُوَ قَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: "فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ" يَعْنِي حَتَمْنَا فَهُوَ الْقَضَاءُ الْحَتْمُ.

وَالسَّادِسُ: الْأَمْرُ وَهُوَ قَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: "وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ" يَعْنِي أَمَرَ رَبُّكَ.

وَالسَّابِعُ: الْخَلْقُ وَهُوَ قَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ" يَعْنِي خَلَقَهُنَّ.

وَالثَّامِنُ: الْفِعْلُ وَهُوَ قَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ أَيِ افْعَلْ مَا أَنْتَ فَاعِلٌ.

وَالتَّاسِعُ: الْإِتْمَامُ وَهُوَ قَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: "فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ" وَقَوْلُهُ حِكَايَةً عَنْ مُوسَىٰ: "أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ" أَيْ أَتْمَمْتُ.

وَالْعَاشِرُ الْفَرَاغُ مِنَ الشَّيْءِ وَهُوَ قَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ: "قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ" يَعْنِي فُرِغَ لَكُمَا مِنْهُ وَقَوْلُ الْقَائِلِ قَدْ قَضَيْتُ لَكَ حَاجَتَكَ، يَعْنِي فَرَغْتُ لَكَ مِنْهَا فَيَجُوزُ أَنْ يُقَالَ إِنَّ الْأَشْيَاءَ كُلَّهَا بِقَضَاءِ اللَّهِ وَ قَدَرِهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَىٰ بِمَعْنَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ عَلِمَهَا وَعَلِمَ مَقَادِيرَهَا وَلَهُ عَزَّوَجَلَّ فِي جَمِيعِهَا حُكْمٌ مِنْ خَيْرٍ أَوْ شَرٍّ فَمَا كَانَ مِنْ خَيْرٍ فَقَدْ قَضَاهُ بِمَعْنَىٰ أَنَّهُ أَمَرَ بِهِ وَ حَتَمَهُ وَ جَعَلَهُ حَقًّا وَ عَلِمَ مَبْلَغَهُ وَ مِقْدَارَهُ وَمَا كَانَ مِنْ شَرٍّ فَلَمْ يَأْمُرْ بِهِ وَلَمْ يَرْضَهُ وَلٰكِنَّهُ عَزَّوَجَلَّ قَدْ قَضَاهُ وَ قَدَّرَهُ بِمَعْنَىٰ أَنَّهُ عَلِمَهُ بِمِقْدَارِهِ وَ مَبْلَغِهِ وَحَكَمَ فِيهِ بِحُكْمِهِ.

قدر جیسے جاننی چاہئے تھی نہ جانی۔ (سورۂ انعام: آیت ۹۲)

۳۔ کسی کام پر قدرت حاصل کرنا۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ. اس سے پہلے کہ وہ تمہارے قابو آ جائیں۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۳۴)

۴۔ کسی چیز کا ایک اندازہ مقرر کرنا۔ جیسا کہ فرمان خداوندی ہے: فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُوْنَ. ہم نے رحم میں اندازہ مقرر کیا اور ہم کیا ہی خوب اندازہ مقرر کرنے والے ہیں۔ (سورۂ مرسلات: آیت ۲۳)

۵۔ کسی کام کو انجام دینے کے لئے سوچ بچار کرنا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ولید بن مغیرہ کے بارے میں فرمایا: اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ. اُس نے قرآن میں غور و فکر کیا کہ وہ اس کے متعلق کیا کہے۔ (سورۂ مدثر: آیت ۱۸)

۳۔ فِتْنَہ

لفظ فتنہ بھی عربی زبان میں کئی مَعانی کے لئے استعمال ہوتا ہے:

۱۔ امتحان لینا۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ. کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی؟ (سورۂ عنکبوت: آیت ۲)

۲۔ آگ میں جلانا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ. اس دن جب ان کو آگ میں عذاب دیا جائے گا۔ (سورۂ ذاریات: آیت ۱۳)

۳۔ گمراہ کرنے کو بھی عربی زبان میں فتنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ. ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ گمراہ کرنا چھوڑ دیں۔ (سورۂ انفال: آیت ۳۹)

شیخ صدوق نے لفظ فتنہ کے بھی دس معانی بیان کئے ہیں۔[1]

۱۔ شیخ صدوق، کتاب توحید، ص۳۸۶ و ۳۸۷۔ شیخ صدوق کے علاوہ راغب اصفہانی نے بھی مفردات القرآن میں لفظ فتنہ کے بڑے دقیق معانی بیان کئے ہیں جو کہ عام قارئین کی سطح سے بلند ہیں اس لئے ہم انہیں یہاں نقل نہیں کر رہے۔

وَالْفِتْنَةُ علی عَشَرَةِ اَوْجُهٍ فَوَجْهٌ مِنْهَا الضَّلَالُ.

وَالثَّانِي الْاِخْتِبَارُ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى: "وَفَتَنَّاكَ فُتُوْنًا" يَعْنِي اخْتَبَرْنَاكَ اخْتِبَارًا وَقَوْلُهٗ عَزَّوَجَلَّ: "الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ." اَيْ لَا يُخْتَبَرُوْنَ.

وَالثَّالِثُ الْحُجَّةُ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى: "ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ."

وَالرَّابِعُ الشِّرْكُ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى: وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ."

وَالْخَامِسُ الْكُفْرُ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى: اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا" يَعْنِي فِي الْكُفْرِ.

مذکورہ تین الفاظ قضاء، قدر اور فتنہ جیسے کثیر المعانی الفاظ جب قرآن مجید میں استعمال ہوں تو ان آیات کے متعلق ایک احتمال یہ ہوتا ہے کہ وہ آیات متشابہات سے ہو۔ آیاتِ متشابہات کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے: مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ. ان آیات کی بازگشت کو اللہ ہی جانتا ہے۔

آیاتِ متشابہات کی تأویل کے لئے اَلرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کی طرف رجوع کرنا چاہئے کیونکہ راسخون فی العلم مذکورہ آیات کی تأویل اپنے صفائے باطن کی وجہ سے براہِ راست اللہ تعالیٰ سے حاصل کرتے ہیں۔

راسخون فی العلم کی روایت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان سے نقل شدہ روایت صحیح ہو۔ اسی لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے روایت کی تحقیق کرلینی چاہئے کہ آیا یہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔

ہم نے مکتبِ خلفاء کے مصادر سے گزشتہ صفحات میں یہ روایت نقل کی تھی کہ ہر شخص کے متعلق شکمِ مادر میں ہی فیصلہ کردیا جاتا ہے کہ وہ بدبخت ہوگا یا نیک بخت ہوگا اور مزید یہ کہ وہ جنّتی ہوگا یا دوزخی ہوگا اور اس میں کسی طرح کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

اس طرح کی روایت کی تحقیق کیلئے ہم دونوں مکاتبِ فکر کی کتبِ حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اِعْتِذار

طویل بیماری اور کمزوری کی وجہ سے اس بحث کی تکمیل سے معذرت چاہتا ہوں اور جو اوراق موجود تھے انہیں ہی فی الحال طباعت کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے ہی صحت عطا فرمائی تو میں اس کی تکمیل کی کوشش کروں گا۔ (مؤلف)

وَالسَّادِسُ الْاِحْرَاقُ بِالنَّارِ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: "اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ...." یَعْنِیْ اَحْرَقُوا.

وَ السَّابِعُ الْعَذَابُ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: "یَوْمَ هُمْ عَلَی النَّارِ یُفْتَنُوْنَ" یَعْنِیْ یُعَذَّبُوْنَ وَقَوْلُهٗ تَعَالٰی: "ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ" یَعْنِیْ عَذَابَكُمْ. وَقَوْلُهٗ تَعَالٰی: "وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ (یَعْنِیْ عَذَابَهٗ) فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا."

وَالثَّامِنُ الْقَتْلُ وَهُوَ قَوْلُهٗ تَعَالٰی: "اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا" یَعْنِیْ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّقْتُلُوْكُمْ وَقَوْلُهٗ عَزَّوَجَلَّ: "فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓی اِلَّا ذُرِّیَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهِمْ اَنْ یَّفْتِنَهُمْ" یَعْنِیْ اَنْ یَّقْتُلَهُمْ.

وَالتَّاسِعُ الصَّدُّ وَهُوَ قَوْلُهٗ عَزَّوَجَلَّ: "وَاِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ" یَعْنِیْ لِیَصُدُّوْنَكَ.

وَالْعَاشِرُ شِدَّةُ الْمِحْنَةِ وَهُوَ قَوْلُهٗ عَزَّوَجَلَّ: "رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا" وَقَوْلُهٗ عَزَّوَجَلَّ: "رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ" اَیْ مِحْنَةً فَیُفْتَنُوْا بِذٰلِكَ وَیَقُوْلُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ: لَمْ یَقْتُلْهُمْ اِلَّا دِیْنُهُمُ الْبَاطِلُ وَ دِیْنُنَا الْحَقُّ فَیَكُوْنَ ذٰلِكَ دَاعِیًا لَهُمْ اِلَی النَّارِ عَلٰی مَا هُمْ عَلَیْهِ مِنَ الْكُفْرِ وَ الظُّلْمِ.

پیشِ گفتار

دینِ اسلام میں حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ رسالت کی صحیح پہچان کے لئے اور قرآن و سنت کے تحفظ و تبلیغ کے لئے سیرتِ طیّبہ کے گہرے مطالعے کے ساتھ بارہ اوصیائے پیغمبرؐ کی سیرت کے عمیق مطالعے کی ضرورت ہے۔

مسلمان محققین نے سیرتِ رسولؐ کے موضوع پر انتہائی خوبصورت علمی بحثیں کی ہیں اور نہایت عمدہ کتابیں تالیف کی ہیں لیکن بارہ اوصیائے پیغمبرؐ کی سیرت کے ضمن میں اکثر مؤلفین نے صرف ائمۂ طاہرینؑ کے حَسَب و نَسَب، ان کے فضائل و مناقب، معجزات اور ولادت و شہادت کی جگہ اور تاریخ پر ہی اکتفا کیا ہے جبکہ مغربی مستشرقین اور ان کے مشرقی شاگردوں نے کتبِ سیرت سے چند تحریف شدہ واقعات کو اسلام شناسی کے نام سے متعارف کرایا اور ان کی مذموم کوششوں کی وجہ سے اسلام فہمی کے لئے بالعموم اور مکتبِ اہلبیتؑ کے سمجھنے میں بالخصوص مشکلات پیدا ہوئیں۔

ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کا یہی طریقہ ہے کہ دینِ اسلام کے اِحیاء کیلئے ائمۂ ہُدیٰ کی کوششوں کو زیادہ سے زیادہ بیان کیا جائے۔ اس اسلامی فرض کی ادائیگی کے لئے ''احیائے دین میں ائمۂ اہلبیت کا کردار'' کے حوالے سے مَباحث کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا تھا جو ہم نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ کتاب کے اس حصے میں ہم احیائے دین اور سنت و شریعت رسولؐ کے تحفظ و تبلیغ کے لئے امام علی علیہ السلام کی خدماتِ جلیلہ کا ایک جائزہ پیش کر رہے ہیں تاکہ تشیع اور حقیقی اسلام کا فہم حاصل ہو سکے۔ چونکہ ان مباحث کو کیسٹ سے منتقل کر کے کتابی شکل دی گئی ہے اس لئے آپ کو کہیں کہیں تکرار نظر آئیگی جو کہ بحث کو نتیجہ خیز بنانے کیلئے ضروری تھی۔

آخر میں ہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بیماری کے سبب گزشتہ بحث میں جو باتیں تشنہ رہ گئی تھیں بتائیدِ خداوندِ متعال ہم ان کو مکمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

چند ضروری اصطلاحات

(۱) نبی (۲) رَسول (۳) وصی پیغمبر (۴) امام (۵) خلیفۃ اللہ (۶) اہلبیت

بحث کے آغاز میں صحیح مَطالب کے سمجھنے کی غرض سے ہم مندرجہ بالا چند اسلامی اصطلاحات کا سادہ اور مختصر مفہوم بیان کرنا چاہتے ہیں:

(۱) نبی: اللہ تعالیٰ کا وہ برگزیدہ بندہ جس پر وحی نازل ہوتی ہے۔

(۲) رَسول: وہ نبی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت اور وحی الٰہی کی تبلیغ کرتا ہے۔

(۳) وصی پیغمبر: اللہ تعالیٰ کا وہ برگزیدہ شخص جو معاشرے میں اپنے نبی کی شریعت کی نگہبانی کرتا ہے اور اس شریعت کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ حضرت یوشع بن نون، حضرت داوٗد اور حضرت سلیمان علیہم السلام بھی صاحبِ شریعت پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی تھے۔ امام علیؑ اور ان کے گیارہ فرزند خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصی تھے۔

رسول اور وصی کا فرق یہ ہے کہ رسول شریعت کو براہِ راست وحی کے ذریعے خداوندِ عالم سے حاصل کرتا ہے جبکہ وصی اس شریعت کی تبلیغ کرتا ہے۔

(۴) امام: اس رسول اور وصی کو امام کہا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے نمونہ قرار دیا ہو۔ امام اسلام اور اللہ کے دین کو عملی طور پر پیش کرتا ہے۔ اسی لئے اس کا قول اور فعل لوگوں کے لئے حجّت ہوتا ہے۔

کچھ انبیاء اوران کے کچھ اوصیاء کو اللہ تعالیٰ نے امامت سے بھی سرفراز فرمایا جیسا کہ حضرت ابراہیم[۱] حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام[۲] اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نبی و رسول ہونے کے ساتھ ساتھ امام بھی تھے۔

(۵) خلیفۃُ اللہ: جس امام کو خدا نے لوگوں کا پیشوا بنا کر لوگوں میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا ہو اُسے خلیفۃ اللہ کہا جاتا ہے۔[۳]

(۶) اہلبیت: یہ لفظ بھی اسلام کی مخصوص اصطلاح ہے۔ اس سے مراد چودہ معصوم ہیں یعنی حضرت رسولِ اکرمؐ حضرت فاطمہ زہراؑ اور بارہ امام۔ جب لفظ اہلبیت کی اضافت لفظ نبی یا رسول اللہؐ کی طرف ہو تو پھر رسولِ اکرمؐ کے علاوہ اس سے تیرہ معصوم مراد لئے جائیں گے[۴] اور آیۂ تطہیر میں اہلبیت سے یہی نفوسِ قدسیہ مراد ہیں۔

۱۔ وَاِذِابْتَلٰی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا... (سورۂ بقرہ: آیت۱۲۴)

۲۔ وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِیْنَ. وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا... (سورۂ انبیاء: آیت۷۲)

۳۔ وضاحت کیلئے معالم المدرستین جلد اول میں خلیفۃ اللہ کی بحث ملاحظہ فرمائیں۔

۴۔ مؤلف کی کتاب شواہدِ تحریف میں ''حدیثِ کساء'' کی بحث ملاحظہ فرمائیں۔

مذکورہ بالا اصطلاحات کے معانی پر توجہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ نبوت، رسالت، وصایت، امامت اور خلافت کا منصب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے اور اس منصب کو کوئی غاصب غصب نہیں کرسکتا۔ مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص نبی کی نبوّت کو اور رسول کی رسالت کو، وصی کی وصایت کو، امام کی امامت کو اور خلیفۃ اللہ کی خلافت کو غصب نہیں کرسکتا۔ البتہ ان مناصب کے حامل افراد کو قتل کیا جاسکتا ہے، انہیں زندانوں میں ڈالا جاسکتا ہے لیکن ان کے منصب کو چھینا نہیں جاسکتا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ''خلافت غصب کرلی گئی'' صحیح نہیں ہے البتہ یہ کہنا چاہئے کہ حکومت غصب کرلی گئی۔

ہم یہ واضح کرچکے ہیں کہ خلافت ایک اسلامی اصطلاح ہے اور اس کے معنی حکومت نہیں ہے۔

سیرتِ ائمہ اہلبیتؑ کا دائرہ کار

سیرتِ ائمہ اہلبیت کے حوالے سے اس نکتے کی وضاحت اہم ترین ہے کہ ائمہ نے اپنے اپنے زمانہ خلافتِ الٰہیہ و وصایتِ نبویہ میں دین کے تحفظ اور سنتِ رسولؐ کی نشرواشاعت میں کیا کردار ادا کیا۔ الغرض ہر ہر امام کے متعلق اس طرح کی بحث کی شدید ضرورت ہے کہ اس نے امام سابق کے بعد جب منصبِ امامت سنبھالا تو دین کے لیے کون کون سی خدمات سرانجام دیں؟ اس باب میں ہم ائمہ ہدیٰ کی مکمل سوانح حیات کو اپنا موضوع نہیں بنائیں گے بلکہ صرف اسی ایک نکتے پر بحث کریں گے کہ امام علی علیہ السلام نے نازش گنجینۂ کونین رسولؐ کی رحلت کے بعد جب منصبِ امامت سنبھالا تو اس وقت سے لے کر مسجدِ کوفہ میں شہادت تک اسلام کی تبلیغ اور تحفظ کا فرض کیسے ادا کیا تاکہ یہ امر واضح ہوسکے کہ آپؑ اسلام کی تبلیغ اور تحفظ کے مسئول تھے اور آپ کی زندگی قابلِ تقلید نمونے کی حیثیت رکھتی تھی۔

ائمۂ اہلبیتؑ کا اصلی کردار

اس حقیقت سے ہم سب باخبر ہیں کہ دینِ مبین اسلام کی تعلیمات کا منبع قرآن مجید اور سنتِ رسولؐ ہے۔ متنِ قرآن کے تحفظ کی ذمہ داری خود خداوندِ عالَم نے لی ہے جیسا کہ ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۝ بیشک قرآن کو ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ (سورۂ حجر: آیت ۹)

قرآن مجید کے بعد تعلیماتِ اسلام کا دوسرا منبع سنّت ہے۔ سنّت سے مراد حضرت رسولِ اکرمؐ کی حدیث اور سیرت ہے جو کہ قرآن مجید کی تشریح اور توضیح ہے۔

ہمیں یہ کہتے ہوئے انتہائی دکھ ہے کہ عقائد سے لے کر احکام تک سنّت کا کوئی بھی حصہ تحریف سے

محفوظ نہیں رہا اور جب سنّت میں تحریف واقع ہوئی تو رسولِ اکرمؐ کے بارہ اوصیاء نے جو کہ شریعتِ رسولؐ کی حفاظت اور تبلیغ کے ذمہ دار تھے اپنی ذمہ داریاں بطریقِ احسن ادا کیں اور اپنی انتھک کوششوں سے سنّت کو زندہ کیا اور دین کی گم گشتہ اور محرّف تعلیمات کو صحیح صورت دے کر اسلامی معاشرے کے حوالے کیا۔

اس حقیقت کو ہم تمثیلی انداز میں یوں بیان کرسکتے ہیں کہ اسلام ایک ایسی کشتی ہے جو ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے ساحل پر وزنی زنجیر کے ساتھ بندھی ہوئی ہے جس کی بارہ کڑیاں ہیں۔ اگر اس زنجیر کی ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو یہ کشتی ساحل سے دور ہوجائے گی اور متلاطم موجوں میں ڈوب جائے گی۔ بالکل اسی طرح بارہ امام سفینۂ اسلام کی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ اگر ان میں سے ایک امام بھی نہ ہوتا تو دینِ اسلام باقی نہ رہتا۔

ہماری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اسلام کے تحفظ و تبلیغ کے لئے امام علیؑ کی کوششیں نہ ہوتیں تو امام حسنؑ اور باقی ائمہؑ کشتیٔ اسلام کو ہرگز نہیں بچا سکتے تھے۔ اگر امام علیؑ اور امام حسنؑ کی کوششیں شامل نہ ہوتیں تو امام حسینؑ اور باقی ائمہؑ اسلام کی حفاظت نہیں کرسکتے تھے۔ اگر امام علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی جدوجہد نہ ہوتی تو امام سجّادؑ اور باقی ائمہؑ دین کو تحفظ فراہم نہیں کرسکتے تھے اور اگر باقی ائمۂ ہدیٰ کی اپنے اپنے دَور میں جانفشانیاں نہ ہوتیں تو آج اسلام کا نام ونشان تک دکھائی نہ دیتا۔

یہاں زیارتِ جامعہ کے کچھ جملے دہرانا انتہائی مناسب معلوم ہوتا ہے اور یاد رکھیں کہ زیارتِ جامعہ اہلبیتؑ کا بہترین تعارف ہے اور امام شناسی کے لئے بہترین دستاویز ہے۔ زیارتِ جامعہ کے ان جملوں سے ائمۂ طاہرینؑ کا کردار متعین ہوکر ہمارے سامنے آتا ہے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَهْلَ بَیْتِ النُّبُوَّةِ....	سلام ہو آپ پر اے نبوت کے گھر والو!
اَشْهَدُ اَنَّکُمْ...	میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے ...
جَاهَدْتُمْ فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ	خدا کی راہ میں جہاد کرنے کا ایسا حق ادا کیا
حَتّٰی اَعْلَنْتُمْ دَعْوَتَهُ	کہ دین کا پیغام ہر طرف عام ہوگیا۔
وَ بَیَّنْتُمْ فَرَائِضَهُ	آپ نے اس کے فرائض کو بیان کیا۔
وَ اَقَمْتُمْ حُدُوْدَهُ	آپ نے اس کی حدود کو قائم کیا۔
وَ نَشَرْتُمْ شَرَائِعَ اَحْکَامِهِ	آپ نے اس کے احکام کو پھیلایا۔
وَ سَنَنْتُمْ سُنَّتَهُ	آپ نے اس کی سنتوں کو زندہ کیا۔
وَ صِرْتُمْ فِیْ ذٰلِکَ مِنْهُ اِلَی الرِّضَا....	آپ نے اس مقصد کے لئے خود کو راضی برضا رکھا۔
فَالرَّاغِبُ عَنْکُمْ مَارِقٌ	پس جو آپ سے منہ موڑے وہ دین سے خارج ہے۔
وَاللَّازِمُ لَکُمْ لَاحِقٌ	اور جو آپ سے وابستہ رہے وہ کامیاب ہے۔

زیارتِ جامعہ کے ان جملوں میں کسی ایک امام کی بجائے تمام ائمہ کو خطاب کیا گیا ہے کیونکہ حضرت امیر علیہ السلام سے لے کر حضرت مہدی علیہ السلام تک تمام ائمہ نے دین کی حفاظت وتبلیغ کے سلسلے میں خدماتِ جلیلہ سرانجام دیں۔

رسولِ اکرمؐ کے بعد اگر ائمۂ اہلبیتؑ کی مخلصانہ خدمات شامل نہ ہوتیں تو آج دنیا میں نہ مکتبِ خلفاء کا اسلام موجود ہوتا اور نہ ہی مکتبِ اہلبیتؑ کے اسلام کا کوئی نام لیوا ہوتا۔ آج دنیا میں نہ تو صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مَسانید وسُنن کی احادیث ہوتیں اور نہ ہی کافی، من لایحضرہُ الفقیہ، تہذیب اور اِستبصار کی روایات نظر آتیں۔

ائمۂ اہلبیتؑ کے ذمہ دو طرح کی خدمات اور دو طرح کے فرائض تھے۔ ایک کا تعلق ان کے اپنے مخصوص زمانے سے جبکہ دوسرے کا تعلق اسلام کی ابدیت سے ہوتا تھا۔ اسی لئے ممکن ہے کہ ان کے بعض کارناموں کی حیثیت وقتی اور عارضی ہو وگرنہ ان کے اکثر کارناموں کا تعلق دین کی ابدی بقا سے ہے۔

امام علیؑ کی خدمات کی ایک جھلک

ائمۂ ہدیٰ کی اصل ذمہ داری یعنی تحفظِ دین اور اشاعتِ سنّت کے حوالے سے ہم امام علی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمات کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں اور آگے چل کر ہم انشاء اللہ اس کی تفصیلات پیش کریں گے۔

(۱) **جمع قرآن:** بعد رسولؐ آپؑ نے قرآن مجید کو رسولِ خداؐ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق جمع کیا۔

(۲) **خلفاء کی رہنمائی:** جب جب خلفاء نے عدالتی فیصلے میں غلطی کی تو آپؑ نے ان کی رہنمائی کی۔

(۳) **اہلِ کتاب علماء کے سوالوں کے جوابات:** جب اسلام جزیرہ نمائے عرب سے باہر روم اور ایران تک پھیل گیا تو یہودی اور نصرانی عالم اسلام کی تحقیق کے لئے مدینے آتے تھے۔ وہ رسول اللہؐ اور ان کے اوصیاء کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی خواہش کرتے تھے۔ دوسری طرف حکام چونکہ مَعارفِ اسلامی کے ماہر نہیں تھے اس لئے جب ان سے علمائے اہلِ کتاب کے سوالوں کے جوابات نہ بن پاتے تو وہ مجبور ہو کر امام علیؑ سے رجوع کرتے تھے۔ امام علی مُشکل کُشاؑ ان کے جوابات دیتے تھے اور ان کی علمی مشکلات کو حل فرماتے تھے۔

(۴) **اِقتصادی سرگرمیاں:** بعد رسولؐ حکومت نے بنی ہاشم اور اہلبیتِ رسولؐ کو اقتصادی طور پر مفلوج کرنے کی ہر ممکن تدبیر کی اور انہیں ان کے مالی حقوق سے محروم کردیا۔ امام علیؑ نے متبادل ذرائع اختیار کر کے ان کی تدابیر کو ناکام بنادیا تھا۔

(۵) طبقاتی نظام کا خاتمہ: خلفائے ثلاثہ نے سیاسی ضرورت کے تحت بیت المال کی منصفانہ تقسیم کی بجائے طبقاتی نظام کو رواج دیا تھا۔ انہوں نے قریش کو تمام عرب پر اور عرب کو غیر عرب پر برتری دی تھی۔ امام علیؑ نے اپنے دَورِ حکومت میں اس نظام کو ختم کر دیا تھا اور عادلانہ تقسیم کے ذریعے ناجائز امتیازات کو مٹا دیا تھا۔

(۶) صحیح اسلام کی تبلیغ: خلفاء نے صحابۂ کرامؓ کو نقلِ حدیث سے روک دیا تھا اور انہوں نے اپنی طرف سے بعض احکامِ الٰہی میں تبدیلیاں بھی کی تھیں جن کی وجہ سے سنّتِ پیغمبرؐ میں تحریف ہوئی اور سنّت میں تحریف کی وجہ سے احکام اسلام میں تحریف واقع ہوئی تھی۔ امام علیؑ نے اپنے دَورِ اقتدار میں خطبوں کے ذریعے سے اسلام کے صحیح عقائد و احکام بیان فرمائے اور صحابہ کو نشرِ حدیث کی آزادی دے دی جس کی وجہ سے معاشرے کو معارفِ اسلام سے آگاہی نصیب ہوئی۔ ان اقدامات کے ذریعے آپ نے گم گشتہ مَعارفِ دین معاشرے کو واپس لوٹانے میں اپنا تاریخی کردار ادا کیا۔

(۷) سیرتِ خلفاء کی حُجیّت کی نفی: احکامِ اسلام کا مأخذ صرف قرآن و سنّت ہے لیکن حضرت عمرؓ نے خلیفۂ سوم کو منتخب کرانے کے لئے ''سیرتِ شیخین'' کی غیر ضروری شرط کا اضافہ کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ قرآن و سنّت کے مقابل شیخین نے جو اجتہادات کئے تھے انہیں قانون کی چھتری فراہم ہوجائے اور ان کو دین کا حصہ تسلیم کیا جائے۔ شوریٰ کے وقت امام علیؑ نے اس شرط کو غیر ضروری قرار دے کر مسترد کر دیا اور پھر اپنے دَورِ اقتدار میں اس شرط سے انحراف کر کے شیخین کی سیرت کو جزوِ دین نہ بننے دیا۔ اس طرح آپ نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ احکامِ اسلامی کا سرچشمہ صرف اور صرف قرآن و سنّت ہی ہیں۔

ہم امام علی علیہ السلام کی سیرت کا حسبِ ذیل تین فصول میں مطالعہ کریں گے:

۱۔ خلفائے ثلاثہ کے دَور میں آپؑ کی حیاتِ طیبہ کا جائزہ

۲۔ آپؑ کی حکومت کے دَور میں آپؑ کی حیاتِ طیبہ کا جائزہ

۳۔ معاشرے کو مَعارفِ اسلام لوٹانے میں آپؑ کی خدمات کا جائزہ

امام علیؑ خلافتِ ثلاثہ میں

اسلام کی خدمات کے متعلق امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے کردار کو سمجھنے کے لئے سقیفۂ بنی ساعدہ کی روداد کا گہرا مطالعہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔

رُودادِ سقیفہ

خلفاء کے اقتدار حاصل کرنے کی بنیاد رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں ہی رکھی جاچکی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ایک مرتبہ جب حضرت عمرؓ شام گئے تو اتفاق سے ایک گرجے میں بھی گئے۔ اس گرجے کے عیسائی راہب نے انہیں دیکھ کر یہ پیشگوئی کی کہ ان کی قسمت میں اقتدار لکھا ہے۔ پھر اس نے ان سے کہا کہ وعدہ کیجئے کہ جب بھی آپ کو حکومت ملے تو آپ اس گرجے کو اور اس سے ملحقہ عمارات کو منہدم نہیں کریں گے۔[۱]

معروف شاعر ازرقی نے اس واقعے کو خوبصورت انداز میں نظم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انہوں نے راہب کی پیشگوئی سے متاثر ہو کر ہی اسلام قبول کیا تھا۔

اس بات کی مزید تائید اُس واقعے سے ہوتی ہے جس کی طرف سورۂ تحریم میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سورے کی تیسری اور چوتھی آیت کہتی ہے کہ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ○ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ○ یعنی جب نبیؐ نے اپنی ایک بیوی سے ایک راز کی بات کہی تو اُس نے دوسری (بیوی) کو وہ بات بتادی اور راز کو راز نہیں رکھا۔ پس جب اُس نے اِس راز کو افشا کردیا تو خدا نے اس بابت اپنے نبیؐ کو بتادیا۔ پیغمبرؐ نے (ان بیوی کو یہ بات) کچھ تو جتائی اور کچھ نہ بتائی۔ جب وہ بات ان کو جتائی تو وہ کہنے لگیں کہ آپ کو یہ کس نے بتایا؟ پیغمبرؐ نے کہا کہ مجھے اُس نے بتایا ہے جو جاننے والا خبردار ہے۔

۲۔ سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۲۶۹۔

اب تم دونوں خدا کے آگے توبہ کرو کیونکہ تمہارے دل ٹیڑھے ہوگئے ہیں۔ اور اگر تم نے اُس کے خلاف چڑھائی کی تو یاد رکھو کہ خدا، جبرئیلؑ اور صالح المومنین اُس کے حامی ہیں اور ان کے علاوہ (اور) فرشتے بھی اُس کے پشت پناہ ہیں۔

آیت میں تَظَاهَرَا کا لفظ آیا ہے اور اس کا مادہ مجرد ظهر ہے جس کے معنی پشت کے ہیں اور تَظَاهَرَا کے معنی پشت پناہی کی وجہ سے کسی کے خلاف چڑھائی کرنے کے ہوتے ہیں۔

خدارا ہمیں بتایا جائے کہ اگر دو ازواجِ رسولؐ کی پشت پر کوئی بھی نہیں تھا اور یہ صرف میاں بیوی کا گھریلو معاملہ تھا تو اللہ نے یہاں پشت پناہی کی وجہ سے چڑھائی کرنے کے الفاظ کیوں بیان فرمائے ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ اتنا سادہ ہرگز نہیں تھا۔ اندرونِ خانہ کوئی کھچڑی پک کر تیار ہونے ہی والی تھی۔

ان آیات کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک دن رسولِ اکرمؐ نے بی بی حفصہؓ کو بتایا کہ میرے بعد عائشہؓ کے والد تمہارے والد کی مدد سے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے (اور اس کے بعد تمہارے والد حکومت حاصل کریں گے) پھر آپؐ نے بی بی حفصہؓ سے فرمایا کہ یہ راز ہے اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔

مگر بی بی حفصہؓ نے اس راز کو فاش کردیا اور جا کر بی بی عائشہؓ کو یہ بات بتادی۔ اور بی بی عائشہؓ نے یہی بات اپنے والد سے جا کر کہی اور انہوں نے حضرت عمرؓ کو بتادی۔

پھر حضرت عمرؓ نے اپنی صاحبزادی بی بی حفصہؓ سے کہا کہ ہمیں بھی وہ راز بتاؤ تاکہ ہم ابھی سے حصولِ حکومت کی کوششیں شروع کردیں۔ بی بی حفصہؓ نے سارا ماجرا اپنے والد کے گوش گزار کردیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاکؐ کو وحی کے ذریعے بتا دیا کہ آپؐ کا راز اب راز نہیں رہا کیونکہ آپؐ کی بیویوں نے اسے افشا کردیا ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے بی بی حفصہؓ سے راز افشا کرنے کی شکایت کی۔

بی بی حفصہؓ نے کہا کہ آپؐ سے کس نے کہا ہے کہ میں نے آپؐ کا راز فاش کردیا ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مجھے اس نے خبر دی ہے جو سب کچھ جانتا ہے اور ہر بات سے باخبر ہے۔ آپؐ نے جو حصہ نہیں بتایا تھا وہ یقیناً یہی تھا کہ تم دونوں کے والد نے ابھی سے اپنی کوششوں کا آغاز کردیا ہے۔

ابن عباسؓ سورۂ تحریم کی شانِ نزول سے واقف تھے لیکن وہ یہی بات حضرت عمرؓ سے سننے کے خواہش مند تھے۔ ایک بار انہوں نے بڑی دانش مندی سے حضرت عمرؓ سے کہا کہ میں ایک سال سے آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں لیکن جب بھی اس کا ارادہ کرتا ہوں تو آپ کی ہیبت آڑے آجاتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے کہا: کیا پوچھنا چاہتے ہو؟

ابن عباسؓ نے کہا: میں قرآن مجید کی ایک آیت کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے کہا: تم تو جانتے ہو کہ میرے پاس قرآن کا علم ہے۔ پھر کیوں نہیں پوچھتے؟
ابن عباسؓ نے کہا: یہ بتائیں کہ سورۂ تحریم کس کے متعلق نازل ہوئی تھی؟
حضرت عمرؓ نے کہا: یہ سورت عائشہؓ اور حفصہؓ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔
اس روایت کو طبری اور سیوطی نے نقل کیا ہے۔[1]

ازروئے تاریخ شیخین نے حکومت حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اس منصوبے کے ایک حصے کا تعلق حیاتِ پیغمبرؐ کے زمانے سے اور دوسرے حصے کا تعلق رحلتِ پیغمبرؐ کے زمانے سے تھا۔ اس وقت ہماری بحث رحلتِ پیغمبرؐ کے بعد کے منصوبے سے متعلق ہے جس پر سقیفہ کے سائے میں عمل کیا گیا۔ (سقیفائی حکومت کسی اتفاق کے نتیجے میں برسرِ اقتدار نہیں آئی تھی بلکہ اس کے لئے پہلے سے منصوبہ بندی کی گئی تھی)۔

ابوبکر، عمر، عثمان، ابوعبیدہ بن جراح اور سالم آزاد کردۂ ابوحذیفہ نے ایک اجلاس منعقد کیا تھا جس میں انہوں نے قسم کھائی تھی کہ رحلتِ رسولؐ کے بعد وہ ہر صورت اقتدار پر قبضہ کریں گے۔ پھر انہوں نے اپنے اس منصوبے کو ایک عہدنامے کی شکل دی اور اس عہدنامے کی دستاویز ابوعبیدہ بن جراح کے پاس رکھوا دی۔ اسی لئے حضرت عمرؓ ابوعبیدہ بن جراح کے متعلق کہا کرتے تھے کہ وہ اس امت کے امین ہیں۔ اسی عہدنامے کی وجہ سے حضرت عمرؓ بار بار کہا کرتے تھے کہ اگر ابوعبیدہ یا سالم میں سے کوئی زندہ ہوتا تو میں خلافت اس کے حوالے کر دیتا۔ حضرت عمرؓ کی مجبوری یہ تھی کہ مذکورہ دونوں افراد اُن کی زندگی میں ہی وفات پا چکے تھے اور عہدنامے میں شریک پانچ افراد میں سے صرف حضرت عثمانؓ بقیدِ حیات تھے۔

اگر حضرت ابوبکرؓ کی زندگی کے آخری لمحات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو بھی اس منصوبے کے خدوخال کافی حد تک اُجاگر ہو سکتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے زندگی کے آخری لمحات میں حضرت عثمانؓ کو وصیت لکھنے کے لئے طلب کیا۔ جب وہ آئے تو انہوں نے کہا کہ لکھو: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم۔ یہ وہ چیز ہے جس کی ابوبکر بن ابی قحافہؓ مسلمانوں کو وصیت کر رہا ہے۔ امابعد!... ابھی حضرت عثمانؓ نے اتنا ہی لکھا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ پر مرض کی شدت سے غشی طاری ہوگئی۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی طرف سے لکھا: ''میں اپنے بعد عمر بن خطابؓ کو خلیفہ نامزد کر رہا ہوں اور میں نے تمہاری خیرخواہی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔''

جب حضرت عثمانؓ یہ لکھ چکے تو حضرت ابوبکرؓ ہوش میں آئے اور بولے کہ مجھے عبارت پڑھ کر سناؤ۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی تحریر کردہ عبارت سنائی تو حضرت ابوبکرؓ نے تکبیر بلند کی اور کہا: کیا تمہیں خدشہ ہو چلا تھا کہ

۱۔ طبری، جامعُ البیان فِی تفسیرِ القرآن۔ سیوطی، الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، تفسیر سورۂ تحریم۔

کہیں مسلمان میرے بعد اختلاف کا شکار نہ ہو جائیں؟ میں بھی تم سے یہی کچھ لکھوانا چاہتا تھا۔[۱]

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ تو بیہوش ہو گئے تھے اور حضرت عمرؓ کی نامزدگی کی عبارت حضرت عثمانؓ نے اپنی طرف سے لکھی اور جب حضرت ابوبکرؓ ہوش میں آئے تو انہوں نے کہا کہ میں بھی تم سے یہی لکھوانا چاہتا تھا۔ آخر حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی خواہش کو کیسے جان لیا تھا جبکہ وہ تو ان کا حالِ دل نہیں جانتے تھے؟ سیدھی سی بات ہے کہ جب پانچ افراد نے حیاتِ پیغمبرؐ میں حصولِ حکومت کا منصوبہ بنایا تھا تو اس منصوبے میں حضرت عثمانؓ موجود تھے اس لئے انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے کہنے کا انتظار تک نہیں کیا تھا۔

منصوبے کے خدوخال یہ ہوں گے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ کو اقتدار سونپیں گے اور حضرت عمرؓ، سالم کو اور سالم، ابوعبیدہ کو اور ابوعبیدہ، حضرت عثمانؓ کو حکومت سونپیں گے۔ جب حضرت عمرؓ کی عینِ حیات میں اس منصوبے کے دو شرکاء یعنی سالم اور ابوعبیدہ دنیا سے چلے گئے تو حضرت عمرؓ نے اپنے منصوبے کو کامیاب کرنے کے لئے ایسی مجلس شوریٰ تشکیل دی کہ حضرت عثمانؓ کے سوا کوئی اور اقتدار میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔

آیئے مجلس شوریٰ کے متعلق امام علی علیہ السلام کے تأثرات خود ان کی زبانی سنیں:[۲]

جب حضرت عمرؓ نے خلافت کے لئے چھ افراد یعنی علیؑ، عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف پر مشتمل شوریٰ بنائی تو اس وقت ہی امام علیؑ نے اپنے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب سے کہہ دیا تھا کہ عمرؓ نے میرے ساتھ ان افراد کو شامل کر کے خلافت کو بنی ہاشم سے دور کر دیا ہے۔

حضرت عباسؓ نے کہا: آپ یہ بات کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟

امام علیؑ نے فرمایا: سعد، عبدالرحمٰن کی مخالفت نہیں کرے گا کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے چچازاد ہیں، دونوں کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے اور دونوں ایک ہی رائے رکھتے ہیں۔ عبدالرحمٰن، عثمانؓ کا بہنوئی ہے۔[۳] یہ تینوں یک رائے ہوں گے۔ اب اگر بالفرض طلحہ اور زبیر میرا ساتھ دینا بھی چاہیں تو ان کی حمایت مجھے کوئی فائدہ نہیں دیگی کیونکہ عمرؓ نے یہ فارمولا تشکیل دیا ہے کہ اگر دونوں اطراف سے برابر رائے ہو تو پھر خلیفہ وہ بنے گا جس کی حمایت عبدالرحمٰن کرے گا۔ ویسے بھی طلحہ کا تعلق قبیلۂ تیم سے تھا اور وہ عثمانؓ کی طرف زیادہ مائل تھا۔

امام علیؑ نے حالات وشخصیات کے تناظر میں جو پیشگوئی کی تھی وہ حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔ حضرت عمرؓ کے ذہن رسا نے عبدالرحمٰن کو صرف اس لئے خلیفہ گر بنایا تھا کہ خلافت حضرت عثمانؓ کو مل سکے۔

۱۔ محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک، ج ۱، ص ۲۱۳۸۔

۲۔ احمد بن یحییٰ بلاذری، انساب الاشراف، ج ۵، ص ۱۹۔

۳۔ عبدالرحمٰن کی بیوی کا نام ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط تھا اور وہ حضرت عثمانؓ کی مادری بہن تھیں۔

حسبِ ذیل واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ، حضرت عمرؓ کی زندگی میں ہی تیسرے خلیفہ متعین ہو چکے تھے۔

ابن سعد نے سعید بن عاص اموی سے روایت کی ہے کہ اس نے حضرت عمرؓ سے اپنے گھر کی توسیع کے لئے ساتھ والی زمین کی بخشش کا مطالبہ کیا تھا کیونکہ حضرت عمرؓ وقتاً فوقتاً لوگوں کو جاگیریں دیتے رہتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے اس سے کہا: نمازِ فجر کے بعد آنا تا کہ میں تمہارا کام کرسکوں۔

دوسرے دن سعید نمازِ فجر کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس گیا اور ان کو مطلوبہ زمین پر اپنے ساتھ لے آیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے پاؤں سے زمین پر لکیر کھینچ کر کہا کہ "یہ تیری ملکیت ہے۔"

سعید نے کہا: آپ تو جانتے ہیں کہ میں عیال دار ہوں مجھے کچھ زیادہ زمین عنایت کریں۔

حضرت عمرؓ نے کہا: تمہارے لئے یہی کافی ہے۔ البتہ میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں اور تم اسے راز ہی رکھنا۔ میرے بعد جو شخص برسراقتدار آئے گا وہ تم سے صلہ رحمی کرے گا اور تمہاری خواہش پوری کرے گا۔

سعید بن عاص کہتا ہے کہ میں حضرت عمرؓ کے پورے دَورِ خلافت میں انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ عثمانؓ خلیفہ مقرر ہوئے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے فرمان کے بموجب مجھ سے صلہ رحمی کی اور میری خواہش پوری کی۔[1]

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۂ دوم نے مستقبل کی خلافت کے لئے جو نقشہ کشی کی تھی اس کے تحت وہ جانتے تھے کہ سعید اموی کے قریبی عزیز، عثمانؓ اموی ہی آئندہ خلیفہ ہوں گے۔

خلیفۂ دوم کا پروگرام یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے بعد معاویہ کو اقتدار ملے۔ ہمارے اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد عام الرعاف کے سال حضرت عثمانؓ بھی نکسیر کی بیماری میں ایسے مبتلا ہوئے کہ انہیں اپنی موت نظر آنے لگی۔ انہوں نے اس حالت میں عبدالرحمٰن کی تقرری کا وصیت نامہ لکھ کر خاموشی سے ان کے پاس بھیج دیا۔ اس پر عبدالرحمٰن سخت برافروختہ ہوئے اور کہا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں نے تو عثمانؓ کو برسرِعام خلیفہ مقرر کیا تھا لیکن وہ مجھے خفیہ طور پر خلیفہ بنانا چاہتا ہے۔ اس معمولی سے واقعے کی وجہ سے دونوں میں شدید رنجش پیدا ہوگئی اور یوں امام علی علیہ السلام کی وہ بددعا پوری ہوئی جو انہوں نے اس وقت دی تھی جب عبدالرحمٰن نے عثمانؓ کی بیعت کی تھی۔ امام علی علیہ السلام نے کہا تھا کہ "خدا تمہارے درمیان اختلاف پیدا کرے۔"

بعد میں خدا کا کرنا یہ ہوا کہ عبدالرحمٰن حضرت عثمانؓ کی زندگی میں ہی فوت ہوگئے۔

حالات و واقعات کے تسلسل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ جانتے تھے کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کے بعد

۱۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ج۵، ص۲۰ و ۲۲۔

خلافت کے لئے ان ہی کی باری ہے اور عبدالرحمٰن نے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنانے میں ویسی ہی کوشش کی تھی جیسی حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرؓ کی خلافت کے لئے کی تھی۔

آیئے ذرا دیکھیں کہ معاویہ کس طرح سے حضرت عمرؓ کی طرف سے خلافت کا امیدوار تھا؟

حضرت عمرؓ کی اس خواہش کا اس واقعے سے کچھ نہ کچھ اظہار ضرور ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا دستور تھا کہ وہ اپنے گورنروں کو وقتاً فوقتاً بلا کر ان کا احتساب کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کا ایک گورنر قیمتی لباس پہن کر مدینے آیا تو اس کا کرّوفر دیکھ کر حضرت عمرؓ بہت ناراض ہوئے اور اس سے قیمتی لباس اتروا لیا اور اون کا موٹا لباس پہنا کر اسے حکم دیا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے مدینے سے باہر چراگاہ میں بھیڑ بکریاں چرائے۔ چنانچہ اس نے کئی دن بھیڑیں چرائیں اور حضرت عمرؓ سے اپنے رویے کی معافی مانگی۔ بالآخر حضرت عمرؓ نے اسے معاف کر دیا اور سابقہ منصب پر بحال کر دیا۔

اب تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ شام گئے تو معاویہ شاہانہ کرّوفر کے ساتھ ان کے استقبال کو آیا۔ اُسے دیکھ کر حضرت عمرؓ نے کہا: یہ شخص عرب کا کسریٰ ہے۔[1]

حضرت عمرؓ نے معاویہ کا کرّوفر دیکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی جبکہ ایک اور گورنر سے کئی دنوں تک بھیڑیں چروائی تھیں۔

اصل بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ والئ حمص[2] کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ بہت اچھا انسان تھا اور اچھے انسان کم ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی ایک اچھے انسان ہو لیکن تمہارے متعلق مجھے ہمیشہ ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ اگر میں تمہیں وہاں کا گورنر بنا دوں تو تمہارا کیا خیال ہے؟

ابن عباسؓ نے کہا: جب تک آپ اپنے دل کی خلش مجھے نہیں بتائیں گے اس وقت تک میں کوئی عہدہ قبول نہیں کروں گا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: آخر تم کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو؟

ابن عباسؓ نے کہا: میں اپنے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔ اگر میرے اندر عیب ہوا تو میں اس کی اصلاح کروں گا اور اگر مجھ میں وہ عیب نہ ہوا تو میں اپنا دفاع کروں گا کیونکہ آپ کی یہ عادت ہے کہ جس کام کا تہیہ کرتے ہیں اسے ضرور پورا کرتے ہیں۔

۱۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ج۱، ص۲۵۳۔ ابن حجر عسقلانی، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، ج۳، ص۴۱۳۔

۲۔ حمص شہر، شام، بصرہ، کوفہ اور اسکندریہ کی طرح ایک بڑی فوجی چھاؤنی تھا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: اے ابن عباسؓ! مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ اگر تم والیٔ حمص ہوئے اور مجھے موت آ گئی تو تم کہیں یہ کہنے نہ لگ جاؤ کہ "اے لوگو! تم ہم بنی ہاشم کی طرف آؤ۔" لوگوں کو تمہاری طرف ہرگز نہیں آنا چاہئے۔ میں نے دیکھا ہے کہ رسولِ اکرمؐ دوسروں کو عہدوں پر فائز کرتے تھے اور تمہیں نظر انداز کرتے تھے۔ اب بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے؟

ابن عباسؓ نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ میں تمہاری طرف سے حمص کا گورنر نہیں بننا چاہتا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: کیوں؟

ابن عباسؓ نے کہا: اگر میں نے یہ عہدہ قبول کرلیا تو آپ کے دل میں یہ خلش آنکھ کے تنکے کی طرح کھٹکتی رہے گی۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے انہیں گورنر نہیں بنایا۔[۱]

حضرت عمرؓ کے رویے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی زندگی میں بنی ہاشم کو اقتدار سے باہر رکھنا چاہتے تھے بلکہ ان کی خواہش تھی کہ ان کے بعد بھی بنی ہاشم اقتدار میں نہ آئیں۔

یہاں ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ کہنا صحیح نہیں تھا کہ رسولِ اکرمؐ بنی ہاشم کو انتظامی اور فوجی عہدوں پر مقرر نہیں کرتے تھے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ نے کئی بار امام علیؑ کو امیرِ لشکر اور حاکم مقرر کیا تھا۔ اس طرح کے واقعات سے مکتبِ خلفاء کی کتبِ سیرت و تاریخ بھری پڑی ہیں۔

تاریخوں میں مذکور ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے امام علیؑ کو غزوۂ طے کے لئے امیرِ لشکر مقرر کیا تھا۔ انہوں نے بڑی کامیاب جنگ لڑی اور اپنے ساتھ بہت سے قیدی لے کر مدینے آئے۔ علاوہ ازیں ہجرت کے دسویں سال میں آنحضرتؐ نے انہیں والی، امیرِ لشکر اور قاضی بنا کر یمن بھیجا تھا۔ آپ نے وہاں سے خمس اور خراج کی رقم حاصل کی اور رسولِ اکرمؐ کے پاس مدینے روانہ فرمائی۔ اس کے علاوہ غزوۂ تبوک کے موقع پر رسولِ اکرمؐ نے امام علیؑ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔[۲]

رسولِ اکرمؐ نے امام علیؑ کے بڑے بھائی حضرت جعفرؓ کو غزوۂ موتہ کے موقع پر امیرِ لشکر مقرر کیا تھا اور جب حضرت جعفر ذوالجناحینؑ شہید ہوئے تو اس وقت فوج کی سالاری ان کے پاس تھی۔

یہ واقعات تاریخ کے مسلّمہ حقائق ہیں اور ان حقائق کے برعکس یہ کہنا کہ "رسولِ اکرمؐ بنی ہاشم کو انتظامی

۱۔ علی بن حسین مسعودی شافعی المتوفی ۳۴۶ھ، مروج الذہب، ج ۲، ص ۳۲۱ و ۳۲۲۔

۲۔ امام احمد بن حنبل، مسند، ج ۱، ص ۱۷۷۔

اور فوجی عہدوں پر تعینات نہیں کرتے تھے'' مسلّمات تاریخ کا انکار ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم سقیفہ کی روداد کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت رسولِ اکرمؐ کی وفات حسرت آیات کے بعد جبکہ امام علیؑ، رسولِ اکرمؐ کے غسل و تجہیز کے مراسم میں مشغول تھے دستاویز لکھنے والے پانچ افراد جمع ہوئے اور انہوں نے حصولِ حکومت کے لئے آپس میں تبادلۂ خیال کیا۔ ابھی وہ تبادلۂ خیال سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ انصار سقیفہ میں جمع ہو چکے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی پانچوں افراد سقیفہ پہنچ گئے۔ سقیفہ میں کوئی علمی گفتگو نہیں کی گئی تھی، صرف قبیلے کے حوالے سے ہی دونوں طرف سے گفتگو ہوئی۔ انصار کا دعویٰ یہ تھا کہ خلیفہ اَوس یا خَزرج سے ہونا چاہئے اور مہاجرین کا موقف یہ تھا کہ خلیفہ ہر قیمت پر مہاجر قریشی ہونا چاہئے۔

یقیناً قبیلہ نوازی کی یہ رسم کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور زمانۂ جاہلیت کی تمام تر سرگرمیوں کا محور قبیلہ ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ سقیفہ میں وہی ''قوم و قبیلہ'' کی سیاست زیرِ بحث لائی گئی اور دوْرِ جاہلیت کی بازگشت دہرائی گئی۔ یوں قرآن مجید کی اس آیت کی صداقت دنیا کے سامنے عیاں ہوئی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ...

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) تو صِرف (خدا کے) رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ہیں۔ بھلا اگر یہ مرجائیں یا مارے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۴۴)

سقیفہ میں دونوں طرف سے قبیلہ پرستی کے نعرے لگائے گئے اور ان نعروں کا مقصد خدا و رسولؐ کے دین کی سربلندی کی بجائے اپنے قبیلے کی سربلندی تھا۔ انصار نے جو کہ سعد بن عبادہؓ کے گرد جمع ہو چکے تھے اپنے امیدوارِ خلافت کے لئے یہ نہیں کہا کہ سعدؓ کے متعلق خدا و رسولؐ نے یہ کچھ فرمایا ہے۔ اس کی بجائے ان کا دعویٰ صرف یہی تھا کہ چونکہ سعدؓ کا تعلق انصار سے ہے اس لئے اسے ہی خلیفہ ہونا چاہئے۔ اس کے جواب میں مہاجرین کا موقف بھی ان سے ہرگز منفرد نہیں تھا۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ خلیفہ ہر قیمت پر مہاجرین بالخصوص قریش میں سے ہونا چاہئے۔

ابن ابی الحدید کے بقول قریشیوں نے یہ نعرہ لگایا کہ خلافت کو قریش کی تمام شاخوں میں گردش دینا چاہئے اور ہر شاخ سے باری باری خلیفہ منتخب ہونا چاہئے لیکن بس ایک یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ خلافت بنی ہاشم میں نہ جانے پائے کیونکہ اگر خلافت بنی ہاشم میں چلی گئی تو پھر وہاں سے باہر نہیں جاسکے گی۔[۱] (کیونکہ وہ خلافت کے اصل حقدار ہیں اور اگر انہیں اقتدار مل گیا تو لوگ ان کے علاوہ کسی اور کو برسرِاقتدار نہیں آنے دیں گے)۔

اور ان کا یہ خیال بالکل صحیح تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایک عرصے کے بعد ابن عباسؓ سے کہا تھا کہ قریش اس

۱۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۲، ص ۱۸۔

بات کو ہرگز پسند نہیں کرتے کہ نبوت اور خلافت ایک ہی گھرانے میں جمع ہوجائے۔ ابن عباسؓ نے ان کے اس موقف کا مُدلّل جواب دیا تھا۔

قبیلۂ قریش حضرت ابوبکرؓ کی مدد کے لئے وہاں آ گیا۔ قبیلۂ اَوس نے جب یہ دیکھا کہ اگر سعد بن عبادہؓ خلیفہ بن گئے تو تمام تر اقتدار ان کے سابقہ حریف قبیلۂ خَزرج میں چلا جائے گا جبکہ زمانۂ جاہلیت میں اَوس وخَزرج ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہا کرتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی عافیت اس میں سمجھی کہ خَزرج کی خلافت سے ان کے لئے قریش کی خلافت زیادہ موزوں ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی قریش کے ساتھ مل کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی۔

اس وقت قبیلۂ اسلم کے ہزاروں افراد غلّہ حاصل کرنے مدینے آئے ہوئے تھے اور مدینے کی گلیاں ان سے بھری ہوئی تھیں۔ اربابِ سقیفہ ان کے پاس گئے اور کہا کہ آپ لوگ حضرت ابوبکرؓ کی بیعتِ خلافت کے لئے ہماری مدد کریں تو ہم اس کے بدلے آپ کو مفت غلّہ فراہم کریں گے۔

یہ پیشکش سنتے ہی انہوں نے اپنی عربی عباؤں کو کمر سے باندھ لیا اور دامن کو اوپر کر کے ایک منظم جلوس کی شکل میں حضرت ابوبکرؓ کے پیچھے چلنے لگے۔ راستے میں انہیں جو بھی آدمی دکھائی دیتا وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر رکھتے تھے۔

اس دن حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا کام مکمل ہوگیا اور پھر دوسرے دن لوگ مسجد میں جمع ہوئے جہاں حضرت ابوبکرؓ کی دوبارہ بیعت کی رسم ادا کی گئی۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے اپنی کامیابیوں پر ناز کرتے ہوئے کہا تھا: مَاهُوَ اِلَّا اَنْ رَاَیْتُ اَسْلَمَ فَلَیْقَنْتُ بِالنَّصْرِ. سقیفہ کی کارروائی کے بعد میں نے جیسے ہی قبیلۂ اسلم کو دیکھا تو مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہوگیا۔[1]

اور یہ روایت بظاہر صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت علیؑ، سلمانؓ، ابوذرؓ اور کچھ دوسرے صحابہؓ نے مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر حضرت ابوبکرؓ کی حکومت پر اعتراض کیا تھا اور اسے آئینِ اسلام کے خلاف قرار دیا تھا کیونکہ سقیفہ کی کارروائی بذاتِ خود ایک غیر آئینی اقدام تھا۔ اسے آپ یوں سمجھیں کہ جب عبدالکریم قاسم نے ایک بغاوت (Coup d'état) کے ذریعے شاہِ عراق کا تختہ الٹ کر ملک کے اقتدارِ اعلیٰ پر قبضہ کیا تھا تو اگر کوئی شخص اُس سے کہتا کہ آپ کا یہ اقدام عراق کے آئین کے خلاف ہے تو وہ جواب میں یہی کہتا کہ آپ کس آئین کی بات کر رہے ہیں؟ ہم نے تو یہ بغاوت کی ہی اس آئین کے خلاف ہے تاکہ اس آئین اور اس کے زیرِ سایہ قائم بادشاہت کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک انقلابی حکومت قائم کریں۔

۱۔ محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک، ج ۲، ص ۴۵۸۔

اصول یہ ہے کہ جب بھی کسی قانون کے خلاف Coup ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت کے سربراہ کو قانون کا حوالہ دینا ہی بنیادی طور پر صحیح نہیں ہوتا۔

سقیفائی حکومت کے کارپرداز جب امام علیؑ کو حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے لئے مسجد میں لائے تو امام علیؑ نے ان کی بیعت نہیں کی اور بیعت کئے بغیر اپنے گھر واپس چلے گئے۔ اور جب تک حضرت سیدہ فاطمۂ زہراؑ زندہ رہیں اس وقت تک امام علیؑ، بنی ہاشم اور کچھ دیگر صحابۂ کرامؓ نے بھی بیعت نہیں کی تھی۔[1] رسول اللہؐ کی رحلت کے بعد صرف حضرت سیدہ فاطمہؑ ہی آنحضرتؐ کی واحد زندہ اولاد تھیں اور مسلمان دل کی گہرائیوں سے آپؑ کا احترام کرتے تھے۔

سقیفائی حکومت نے امام علیؑ کو بیعت پر مجبور کرنے کے لئے رسول اللہؐ کی پارۂ جگر حضرت سیدہ فاطمہؑ کے بیت الشرف کی بے ادبی کی۔ حکومت کے کارپردازوں نے حضرت سیدہ فاطمہؑ کے گھر پر یورش کی اور ان کے دردولت کو نذر آتش کیا اور اس ہنگامۂ داروگیر میں بنتِ رسولؐ کے ایک جنین کا اسقاط ہوا۔ لیکن اس حملے کے باوجود بھی اربابِ سقیفہ امام علیؑ سے بیعت لینے میں کامیاب نہ ہوسکے اور اس اقدام کی وجہ سے انہیں مسلمانوں کی نفرت کا نشانہ بننا پڑا۔ انصار حضرت ابوبکرؓ کی بیعت پر پشیمانی محسوس کرنے لگے۔ ہوا کا رخ بدلتا دیکھ کر ابوبکرؓ اور عمرؓ کو مجبور ہو کر سیدہ فاطمہؑ کی عیادت اور عذرخواہی کے لئے ان کے گھر آنا پڑا۔

شیخین نے امام علیؑ سے درخواست کہ وہ حضرت زہراؑ کی عیادت کے لئے ان کے گھر آنا چاہتے ہیں۔ امام علیؑ پہلے تو راضی نہ ہوئے لیکن جب ان دونوں کا اصرار زیادہ بڑھا تو آپؑ نے ان سے فرمایا: میں بنتِ رسولؐ سے پوچھوں گا اگر وہ راضی ہوئیں تو میں ان سے تمہاری ملاقات کرادوں گا۔

امام علیؑ نے حضرت زہراؑ سے فرمایا کہ شیخین آپ کی عیادت کے لئے آنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کی اجازت ہے۔ حضرت زہراؑ نے فرمایا کہ میں انہیں اپنے گھر میں آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ امام علیؑ نے باصرار فرمایا کہ میں ان دونوں سے وعدہ کرچکا ہوں۔ حضرت زہراؑ نے فرمایا کہ اگر آپ وعدہ کر ہی چکے ہیں تو یہ گھر آپ کا ہی گھر ہے اور میں آپ کی ہی زوجہ ہوں، جیسا آپ مناسب سمجھیں، کریں۔

امام علیؑ نے شیخین کو گھر آنے کی اجازت دے دی۔ جب جگر فگار حضرت زہراؑ نے ان دونوں کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو اپنا رخ دیوار کی طرف پھیر لیا اور کہا: اے علیؑ! آپ ان دونوں سے پوچھیں کہ کیا انہوں نے رسولِ خداؐ سے یہ سنا تھا کہ فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّی مَنْ آذَاهَا فَقَدْ آذَانِی وَمَنْ آذَانِی فَقَدْ آذَی اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ؟ یعنی فاطمہؑ میرے جگر کا ٹکڑا ہے جس نے اسے اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی اور جس نے

۱۔ ہماری کتاب عبداللہ بن سبا، ج ۱، ص ۱۳۵ تا ۱۳۶ دیکھیں۔

مجھے اذیت پہنچائی اس نے خدائے عزوجل کو اذیت پہنچائی۔[1]

شیخین نے کہا: ہاں! ہم نے رسول خداؐ سے یہ سنا تھا۔

حضرت فاطمہؑ نے کہا: میں اپنے خدا کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ تم نے مجھے اذیت پہنچائی ہے۔ خدا کی قسم! میں تم سے اب کوئی بات نہیں کروں گی یہاں تک کہ اپنے خدا سے ملاقات کروں اور اس کے حضور تمہاری شکایت کروں۔[2]

حضرت سیدہؑ کا یہ جواب سن کر وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ اصل میں شیخین عیادت کے بہانے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ حضرت سیدہؑ سے ان کی صلح صفائی ہوگئی ہے۔ حضرت سیدہؑ کو لوگوں کی نگاہوں میں ایک مقام حاصل تھا اور جب آپ گفتگو کرتی تھیں تو لوگوں کے دل اس سے متاثر ہوتے تھے۔ حضرت سیدہؑ کے لئے ضروری تھا کہ لوگوں کے سامنے خاندانِ اہلبیتؑ کی مظلومیت بیان کریں اور رسولِ خداؐ نے حضرت سیدہؑ کو صبر کا حکم بھی نہیں دیا تھا جبکہ امام علیؑ کو آنحضرتؐ صبر کی وصیت کر گئے تھے اور وصیتِ رسولؐ کے تحت آپؑ مجبور تھے۔ اسی لئے آپؑ نے خلافت حاصل کرنے کی کوئی خاص جدوجہد نہیں کی تھی جبکہ حضرت سیدہؑ نے اپنے آتشیں خطبات سے لوگوں کے خفتہ ضمیر جگانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

جب اہلِ حکومت نے حضرت سیدہؑ کے مسلمہ حق ''فدک'' پر قبضہ کیا تو انہوں نے اپنے حق کا دفاع کیا اور پرزور طریقے سے اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ آپؑ اپنے غصب شدہ حق کی بازیابی کے لئے مسجد میں تشریف لے گئیں اور پردے کے پیچھے کھڑے ہوکر حاکم وقت سے سخت احتجاج کیا اور اپنا مشہور خطبہ ارشاد فرمایا۔

نیز آپؑ امام علیؑ اور حسنین کریمینؑ کو ساتھ لیکر انصارِ مدینہ کے گھروں میں بھی تشریف لے گئیں اور انہیں اپنے خاندان کی مدد کی دعوت دی۔ آپ کی بات سن کر انصار نے انتہائی شرمندہ ہوکر کہا کہ اے بنتِ رسولؐ! اب تو ہم ابوبکرؓ کی بیعت کا جوا اپنی گردنوں میں ڈال چکے ہیں اور ہمارے لئے بیعت توڑنا بڑا مشکل ہے۔

انصار کا یہ جواب عرب نفسیات کے عین مطابق تھا کیونکہ عربوں کی نفسیات یہ ہے کہ جب وہ کسی سے قول وقرار کرلیں تو وہ اپنے قول پر کٹ مرتے ہیں لیکن منحرف نہیں ہوتے چاہے ان کا قول وقرار اچھائی کے لئے ہو یا برائی کے لئے۔ وہ بہرنوع اپنے قول پر جان دیتے ہیں اور اپنے قول سے انحراف کو اپنی مردانگی کی توہین سمجھتے ہیں۔ دورِ جاہلیت میں متبنٰی گیری کی رسم ان کی نفسیات کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اس عرب نفسیات کے تحت انصار اپنی بیعت پر پشیمان ضرور تھے لیکن وہ بیعت شکنی پر آمادہ نہیں تھے۔

۱۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۱۶، ص۲۷۳۔

۲۔ ابن قتیبہ دینوری، الامامۃ والسیاسۃ، ج۱، ص۱۴۔ عمر رضا، اعلام النساء، ج۳، ص۱۲۱۴۔

الغرض نورِ چشم رحمۃ اللعالمینؐ نے امام علیؑ کا دفاع کیا اور ان کے یہ کارنامے بھی بعد میں آنے والے ائمہ کے کارناموں کی طرح سے انتہائی مؤثر تھے۔

امام علی علیہ السلام کو رسول خداؐ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ انہوں نے تمام ناگوار حادثات و واقعات پر صبر کرنا ہے۔ اسی لئے امام علیؑ نے ہر ظلم وستم کے موقع پر بہترین صبر کا مظاہرہ کیا اور کسی بھی مقام پر صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ حد یہ ہے کہ جب حکومت کے کارپرداز انہیں کھینچ کر مسجد میں لے گئے تو اُس روز بھی انہوں نے صبر جمیل کا مظاہرہ کیا اور اپنا دفاع تک نہ کیا۔ ایسے تمام حالات میں امام علیؑ نے وصیت رسولؐ کو مدنظر رکھا اور تلوار خارا شگاف کو نیام سے باہر نہ کیا حالانکہ نہ تو آپ کمزور تھے اور نہ ہی بزدل (جیسا کہ دنیا نے پچیس برس بعد ذوالفقار علیؑ کو جمل وصفین اور نہروان میں ہزاروں کی فوج کے مقابل برق خاطف کی طرح چمکتے ہوئے دیکھا تھا)۔ اس روز آپ کا صبر کرنا عمرو بن عبدوُد جیسوں سے لڑنے سے زیادہ مشکل تھا۔

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

بہرنوع ابوبکرؓ حکومت سے حضرت سیدہؑ نے جو ٹکر لی اس نے خلافت کی چولیں ہلا کر رکھ دیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابوبکرؓ کو اپنے مرض الموت میں یہ کہنا پڑا: ''اے کاش! میں فاطمہؑ کے گھر کا دروازہ نہ کھولتا اور لوگوں کو اُسے توڑنے کیلئے نہ بھیجتا اگرچہ وہ میرے خلاف آمادۂ جنگ ہی کیوں نہ ہوتے۔''[1]

تاریخ کی آنکھ نے یہ روزِ بد بھی دیکھا کہ ''شمع رسالت کے پروانوں'' نے رسالت مآبؐ کی پارۂ جگر کے درِ دولت پر حملہ کیا اور امام علیؑ کو وہاں سے کشاں کشاں مسجد میں بھی لے گئے مگر اس کے باوجود وہ امام علیؑ اور ان کے ساتھیوں سے بیعت لینے میں کامیاب نہ ہوئے اور انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

حضرت سیدۃ النساء العالمینؑ کی المناک رحلت سے حضرت علیؑ کا مضبوط سہارا چھن گیا اور امام علیؑ کو اسلام کی حفاظت اور مرتدین کے فساد کو دور کرنے کے لئے مجبوراً ابوبکرؓ کی بیعت کرنا پڑی کیونکہ اس وقت مدینے سے باہر کچھ افراد نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ مثلاً مسیلمۂ کذاب نے رسول خداؐ کی زندگی کے آخری ایام میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور بعد رسولؐ اس کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اس نے قرآن مجید کا خاکہ اڑاتے ہوئے مسجع ابیات موزوں کئے اور یہ اعلان کیا کہ ایک نبی ہمارے قبیلے سے ہوگا اور ایک قبیلۂ قریش سے ہوگا اس لئے اس کے قوم قبیلے والوں نے اس کی نبوت کو مان لیا تھا۔ اس کی قوت آہستہ آہستہ اتنی بڑھی کہ اس کے

۱۔ محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک، ج ۳، ص ۶۱۹۔ ''کاش میں فاطمہؑ کا گھر نہ کھولتا اگرچہ وہ لوگ جنگ کے لئے اس کا دروازہ بند کرتے۔'' تاریخ طبری، ج ۲، ص ۲۷۵، نفیس اکیڈمی کراچی۔

پاس چالیس ہزار جنگجو افراد جمع ہوگئے جو کسی بھی وقت مدینے پر چڑھائی کر سکتے تھے اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ مدینے پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادیں۔

اگر خدانخواستہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوجاتے تو سب سے پہلے وہ امام علیؑ اور حسنینِ کریمینؑ کو شہید کرتے اور نبیٔ اکرمؐ کی قبرِ مطہر کا نام ونشان مٹا دیتے۔ اس دوَر میں صرف مَردوں نے ہی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ بنی تمیم کی سجاح نامی عورت نے بھی نبوت کا اعلان کردیا تھا۔ اس نے بھی بیعت سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

ان مدعیانِ نبوت کے علاوہ عرب کے کئی قبائل اسلام چھوڑ کر مرتد ہوگئے تھے۔ بنی تمیم کے نعمان بن منذر ساوی نے بحرین میں تاج شاہی پہن لیا تھا اور اسی طرح بنی ناجیہ کے لقیط بن مالک نے عمان میں اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا تھا اور لوگ اسے ''ذوالتاج'' کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ جب پورے عرب پر کفر و ارتداد کی آندھیاں چلنے لگیں تو اس وقت حضرت عثمانؓ، امام علیؑ کو منانے آئے اور کہنے لگے کہ اے ابن عم! اس وقت آپ گرد و پیش کے حالات دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ نے بیعت نہیں کی تو مبادا اسلام مٹ جائے گا۔

ان ہی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے امام علیؑ نے یہ ارشاد فرمایا تھا:

فَأَمْسَكْتُ يَدِي حَتّٰى رَأَيْتُ رَاجِعَةَ النَّاسِ قَدْ رَجَعَتْ عَنِ الْإِسْلَامِ يَدْعُوْنَ إِلَى مَحْقِ دِيْنِ مُحَمَّدٍ -صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ- فَخَشِيْتُ إِنْ لَمْ أَنْصُرِ الْإِسْلَامَ وَ أَهْلَهُ أَنْ أَرٰى فِيْهِ ثَلْمًا أَوْهَدْمًا تَكُوْنُ الْمُصِيْبَةُ بِهِ عَلَيَّ أَعْظَمَ مِنْ فَوْتِ وِلَايَتِكُمُ الَّتِيْ إِنَّمَا هِيَ مَتَاعُ أَيَّامٍ قَلَائِلَ...[1] ان حالات میں، میں نے اپنا ہاتھ روکے رکھا یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ مرتد ہونے والے اسلام سے مرتد ہوکر محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دین کو مٹا ڈالنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اب میں ڈرا کہ کوئی رخنہ یا خرابی دیکھتے ہوئے میں اسلام اور اہلِ اسلام کی مدد نہ کروں گا تو یہ میرے لئے اس سے بڑھ کر مصیبت ہوگی جتنی یہ مصیبت کہ تمہاری یہ حکومت میرے ہاتھ سے چلی جائے جو تھوڑے دنوں کا اثاثہ ہے اور اس کی ہر چیز زائل ہوجائے گی اس طرح جیسے سراب بے حقیقت ثابت ہوتا ہے یا جس طرح بدلی چھٹ جاتی ہے۔ چنانچہ میں ان بدعتوں کے ہجوم میں اٹھ کھڑا ہوا یہاں تک کہ باطل دب کر فنا ہوگیا اور دین محفوظ ہوکر تباہی سے بچ گیا۔

حالات کی سنگینیوں کو دیکھ کر اور دین کو محفوظ رکھنے کی غرض سے امام علی علیہ السلامؑ نے ابوبکرؓ کی بیعت کی کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اگر ان حالات میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے مقابلے پر نیام سے نکل آئیں تو ارتداد و نفاق کی قوتیں مل کر اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹادیں گی۔ اسی لئے آپ نے

۱۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۶۲ سے اقتباس۔

تلوار کا سہارا لینے کی بجائے مصالحت کا راستا اختیار کیا کیونکہ آپ کو ظاہری اقتدار اتنا عزیز نہ تھا جتنی ملت کی فلاح و بہبود عزیز تھی ۔ منافقین کی ریشہ دوانیوں کے سدباب اور فتنہ پردازوں کے عزائم کو ناکام بنانے کے لئے آپ کے پاس مصالحت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ جب آپ نے اسلام کے وسیع تر مفاد کے لئے حکومت سے مصالحت کرلی تو حضرت ابوبکرؓ نے مدینے سے باہر لشکر روانہ کئے۔ جب تک امام علیؑ نے ان سے مصالحت نہیں کی تھی اس وقت تک مسلمانوں کا ایک بھی لشکر باہر نہیں گیا تھا اور یوں آپؑ کے اس عمل نے اسلام کو قوت عطا کی اور اسلام مرتدین کے حملوں سے محفوظ ہوگیا۔

خلفاء کے بعض اقدامات کا جواب

یہاں ہم یہ بتاتے چلیں کہ جب بھی خلفاء کی طرف سے اسلامی احکام اور عقائد میں تغیّر و تبدّل کیا گیا تو امام علیؑ خاموش نہیں رہے تھے۔ اور یہ بتانا اس لئے ضروری ہے کہ کہیں ذہنوں میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ آپؑ نے گوشہ نشینی کے پچیس سال انفرادی امور میں صرف کردیئے اور اس طویل عرصے میں اسلام اور مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کی۔

حقیقت یہ ہے کہ پچیس سال کے پورے عرصے میں آپؑ نے اپنی شرعی ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن ادا کیا اور ایک وصیٔ رسول کی حیثیت سے ہر ممکن طریقے سے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کی۔

مدنی مخالفین سے سلوک

سابقہ صفحات میں ہم بتاچکے ہیں کہ جب تک حضرت سیدہ سلامُ اللہ علیہا زندہ رہیں اس وقت تک امام علیؑ ، بنی ہاشم اور دوسرے کئی صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی اور وہ حضرت زہراؑ کے گھر میں اجلاس منعقد کرتے تھے۔

حکومت نے لوگوں کو بنی ہاشم سے اور خاص کر اہلبیتؑ سے دور رکھنے کے لئے اقتصادی ناکہ بندی کا حسب ذیل لائحہ عمل اختیار کیا۔

(۱) رسولِ اکرمؐ نے اپنی حینِ حیات میں حضرت فاطمہ زہراؑ کو جاگیر فدک ہبہ فرمائی تھی مگر سقیفائی حکومت نے اہلبیتؑ کو اپنا سیاسی حریف سمجھتے ہوئے ان سے وہ جاگیر چھین لی۔ اس قضیہ کا تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ بی بی کے سوا آنحضرتؐ نے کچھ املاک ام المومنین عائشہؓ، ام المومنین حفصہؓ اور ابوبکرؓ و عمرؓ اور دیگر صحابہ کو بھی عنایت فرمائی تھیں لیکن سقیفائی حکومت نے ان کی املاک کو ہاتھ تک نہ لگایا اور نہ ان سے کوئی گواہ طلب کیا۔ جاگیر فدک

مسلسل تین سال سے حضرت سیدہؑ کے تصرف میں تھی اور ان کے مزارعین وہاں پر کام کرتے تھے۔ اس کے باوجود حضرت صدیقۂ کبریٰ سے ہبہ نامہ مانگا گیا اور گواہ طلب کیے گئے۔ ہبہ نامہ اور گواہ پیش کرنے کے باوجود بنتِ رسولؐ کا دعویٰ مسترد کردیا گیا۔ تب حضرت سیدہؑ نے مسجد نبوی کے بھرے اجتماع میں خطبۂ غرا ارشاد فرمایا جس میں آپ نے اپنے دعویٰ کے حق میں مضبوط دلائل دیئے مگر انہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ آخر کار بنتِ رسولؐ دلگرفتہ وملول ہوکر واپس آگئیں۔

(۲) حضرت سیدہؑ کو ان کے والد کی میراث سے محروم کردیا گیا اور حدیثِ لاوارثی تراش کر یہ دعویٰ کیا گیا کہ انبیاءؑ کی سرے سے میراث ہی نہیں ہوتی۔

(۳) آیتِ خمس میں ذوی القربیٰ کے الفاظ کے تحت اہلبیتِ طاہرینؑ کا حق بنتا تھا مگر اہلبیتؑ کو سیاسی حریف سمجھ کر انہیں ان کے قرآنی حق سے محروم کردیا گیا اور خمس کو ہمیشہ کے لئے احکام اسلام سے حذف کردیا گیا۔[۱] جس کی وجہ سے خاندانِ اہلبیتؑ اقتصادی مشکلات سے دوچار ہوگیا۔

الغرض حکومت نے چاروں طرف سے اہلبیتؑ کی معاشی ناکہ بندی کردی تھی جو تقریباً ساڑھے چوبیس سال تک جاری رہی۔ حضرت امیرالمومنینؑ نے ان اقتصادی مشکلات پر قابو پانے کے لئے محنت مزدوری کی جس کی وجہ سے خاندانِ اہلبیتؑ باعزت روزی کے قابل ہوگیا۔ آپ نے دیکھا کہ مدینے کے گردونواح میں زمین بنجر پڑی ہوئی ہے جس کا کوئی مالک اور دعویدار نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے اس بنجر زمین میں کنوئیں کھودے اور چشمے نکالے جس کی وجہ سے بنجر زمین لہلہا اٹھی۔ آپ نے اس بنجر زمین پر کھجوروں کے باغ لگائے اور پھر ان باغات کو اہلبیتؑ اور اپنی اولاد کیلئے وقف کیا۔ امام علیؑ کے بعد ائمۂ طاہرینؑ ان باغات کی آمدنی کو تبلیغ اسلام اور محتاجوں اور اپنے ماننے والوں کی امداد پر خرچ کیا کرتے تھے۔ یوں امام علیؑ نے اپنا پسینہ بہا کر حکومتی منصوبہ ناکام بنادیا۔[۲]

غیر مدنیوں سے سلوک

مالک بن نویرہؓ، رسول اکرمؐ کے ایک محترم صحابی تھے۔ رسول اکرمؐ نے انہیں ان کی قوم کا عاملِ زکوٰۃ مقرر کیا تھا۔ جب آنحضرتؐ کی وفات ہوئی تو مالکؓ وصیِ رسولؐ کے دیدار کے لئے مدینے آئے۔ جب انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو منبرِ رسولؐ پر بیٹھا ہوا دیکھا تو معترض ہوئے اور انہیں حدیثِ غدیر یاد دلائی کیونکہ وہ حضرت

۱۔ اس معاملے کی تفصیل کے لئے دیکھیں ہماری کتاب معالم المدرستین، ج ۲، ص ۱۳۰ تا ۱۹۷۔

۲۔ حضرت کے آباد کردہ نخلستانوں میں عین ابی نیزر اور عین بغیبغہ بڑے مشہور تھے اور ان کے مجموعہ کو "صدقاتِ علیؑ" کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مدینے کے قریب وادی عقیق میں بھی آپ نے ایک نخلستان آباد کیا تھا۔

علیؑ کے حمایتی تھے۔ جب وہ واپس گئے تو انہوں نے اپنے قبیلے کی زکوٰۃ حضرت ابوبکرؓ کو نہیں بھیجی۔

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے "منکرینِ زکوٰۃ" کی سرکوبی کے لئے خالد بن ولید کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کردیا۔ خالد نے وہاں پہنچ کر پہلے تو فریب سے کام لیتے ہوئے عام امان کا اعلان کیا۔ پھر موقع پاتے ہی شب خون مارا اور مالک بن نویرہؓ اور ان کے قبیلے کے بہت سے لوگوں کو قتل کردیا۔ ابھی مالکؓ کی لاش تڑپ رہی تھی کہ خالد نے ان کی بیوی کو دلہن بنالیا اور شبِ زفاف منائی۔ اس نے مالکؓ کا سر دیگ کے نیچے آگ میں جلایا۔ اس کے بعد مالِ غنیمت اور قبیلے کی عورتوں کو قید کر کے مدینے لے آیا۔[1]

خلیفۂ اول ہی کے دَور میں یمن کے عاملِ زکوٰۃ نے قبیلۂ کندہ کے ایک آدمی سے زکوٰۃ کی مد میں ایک اونٹ لے لیا۔ وہ اونٹ اسے بہت پیارا تھا۔ اس نے عامل کی منت سماجت کی کہ آپ یہ اونٹ رہنے دیں اور میرے گلّے سے کوئی دوسرا اونٹ لے لیں مگر عاملِ زکوٰۃ اپنی بات پر اَڑ گیا کہ میں تو یہی اونٹ لوں گا۔

اس شخص نے اپنی قوم کے سردار سے کہا کہ خدارا آپ مجھے عاملِ زکوٰۃ سے وہ اونٹ واپس دلوائیں۔ اس کی قوم کا سردار عاملِ زکوٰۃ کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ آپ اس شخص کا یہ اونٹ واپس کردیں اور اس کے بدلے میں دوسرا اونٹ لے لیں مگر وہ عامل ان کی بات نہ مانا۔ جب سردار نے اپنی یہ بے عزتی دیکھی تو اس نے وہ اونٹ کھول کر اس شخص کے حوالے کردیا۔ عاملِ زکوٰۃ نے یہ ماجرا خلیفہ کو لکھ بھیجا اور خلیفہ نے ان کے مقابلے کے لئے مدینے سے ایک لشکر روانہ کردیا۔ ادھر قبائلِ یمن بھی خم ٹھونک کر مقابلے پر آگئے اور یوں فریقین میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ جب یمن کے مرکزی شہر "دبا" کے باشندوں نے دیکھا کہ حکومت کی فوج قبائلِ کندہ سے مصروفِ پیکار ہے تو انہوں نے شورش کر کے حضرت ابوبکرؓ کے مقرر کردہ والی کو اپنے شہر سے نکال دیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے امیر لشکر کو لکھا کہ فی الحال قبائل سے تصادم چھوڑ دو اور ان کے مرکزی شہر کا محاصرہ کر کے اسے دوبارہ سلطنت میں شامل کرو۔ سالار نے شہر "دبا" کا محاصرہ کیا اور جب اہلِ شہر محاصرے کی وجہ سے تنگ آگئے تو انہوں نے سالارِ لشکر کو صلح کا پیغام بھیجا کہ ہم خلیفہ کی اطاعت کریں گے اور زکوٰۃ بھی دیں گے لہٰذا تم یہ محاصرہ اٹھالو۔ سالارِ لشکر نے کہا کہ تم سے صلح صرف اس شرط پر ہوسکتی ہے کہ پہلے تم اس بات کا اقرار کرو کہ ہم حق پر ہیں اور تم باطل پر ہو اور اگر ہماری فوج میں سے کوئی قتل ہوا تو وہ شہید اور جنتی ہے اور اگر تمہارا کوئی آدمی قتل ہوا تو وہ دوزخی ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں ہمارا ہر حکم ماننا پڑے گا۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق محصورین کو ان کی تمام شرائط ماننا پڑیں۔ تب سالارِ لشکر نے حکم دیا کہ تمام اہلِ شہر ہتھیار پھینک کر شہر سے نکل جائیں۔ جب اہلِ شہر غیر مسلح ہو کر باہر آگئے تو یہ لشکر فاتحانہ انداز میں شہر میں

۱۔ اس روداد کی تفصیل کے لئے دیکھیں ہماری کتاب عبداللہ بن سبا، ج ۱، ص ۱۹۹ تا ۲۰۷۔

داخل ہوا اور اس نے شہر کے تمام بزرگوں کو تہ تیغ کر دیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا اور انہیں مالِ غنیمت بنا کر دربارِ خلافت میں بھیج دیا۔ شہر فتح کرنے کے بعد سرکاری لشکر نے قبائلِ کندہ کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا اور اشرافِ قبیلہ کو قتل کر دیا اور بقیۃ السیف کو مدینے بھیج دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا تمام عرصہ اس طرح کے چھوٹے بڑے واقعات سے بھرا ہوا ہے۔[1]

سقیفائی حکومت اپنے مخالفین کے ساتھ کسی رُو رعایت کی قائل نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے مسلمان اور مرتد مخالفین سے یکساں سلوک کیا۔ جس قبیلے کے خلاف بھی فتح حاصل کی اس کی اکثریت کو تہ تیغ کیا، ان کے اموال پر قبضہ کر لیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو کنیز اور غلام بنالیا۔ حکومت کا یہ طرزِ عمل اسلامی احکام سے کچھ بھی میل نہیں کھاتا تھا اور اسی کے سبب یہ الزام لگایا گیا کہ اسلام تلوار کا دین ہے اور جبر و استبداد سے پھیلا ہے کیونکہ حکومت نے اسلام کے حسین چہرے کو بدنما بنا دیا تھا اور لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کیا اسلام اسی جبر و استحصال کا نام ہے؟ اور کیا اسلام میں انسانی حقوق کا کہیں گزر نہیں ہے؟

ہم اِنشاء اللہ جنگِ جَمَل کی بحث میں حضرت علیؑ کا یہ نکتۂ نظر بیان کریں گے کہ اسلام ان تہمتوں سے پاک ہے اور اسلام میں جہاد، غنیمت اور قیدی بنانے کے کیا احکام ہیں۔

نقلِ حدیث پر پابندی

سقیفائی حکومت نے احادیث لکھنے اور بیان کرنے پر سخت پابندی لگا رکھی تھی۔ ہم سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ قرآن مجید میں اصولِ اسلام بیان کئے گئے ہیں جبکہ ان کی توضیح و تشریح سنتِ رسولؐ یعنی حدیث اور سیرتِ پاک میں بیان کی گئی ہے جیسا کہ فرمانِ قدرت ہے: وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ... ہم نے آپؐ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ ان احکامات کی وضاحت کریں جو لوگوں کے لئے نازل ہوئے ہیں... (سورۂ نحل: آیت ۴۴)

قرآن مجید میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، طلاق، میراث، وصیت وغیرہ کے اصول بیان کئے گئے ہیں لیکن ان کی تفصیلات اور جزئیات پیغمبرِ اکرمؐ کی سنت میں بیان کی گئی ہیں۔

خلفاء کی حکومت کو سنت کی اشاعت پر پابندی کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ان کی حکومت کو کچھ اسلامی احکام اور سنّت سے اختلاف تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کا آسان حل یہ نکالا کہ حدیث کی نشر و اشاعت پر پابندی لگا دی جائے تاکہ کوئی ان لوگوں پر اعتراض ہی نہ کر سکے۔ روایتِ حدیث پر پابندی کی چند روایات

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیں ہماری کتاب عبداللہ بن سباء، ج۱، صفحہ ۱۸۵ تا ۲۳۷۔ ج۲، صفحہ ۵۱ تا ۷۷۔

حسب ذیل ہیں:

حضرت ابوبکرؓ نے صحابۂ کرامؓ سے کہا: اِنَّکُمْ تُحَدِّثُوْنَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ اَحَادِیْثَ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْھَا وَالنَّاسُ بَعْدَکُمْ اَشَدُّ اخْتِلَافًا فَلَا تُحَدِّثُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ شَیْئًا فَمَنْ سَأَلَکُمْ فَقُوْلُوْا بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ کِتَابُ اللّٰہِ فَاسْتَحِلُّوْا حَلَالَہٗ وَ حَرِّمُوْا حَرَامَہٗ. یعنی تم لوگ رسول اللہؐ سے حدیث نقل کرتے ہو اور اس میں اختلاف کرتے ہو، جب تمہاری یہ حالت ہے تو بعد میں آنے والے لوگ تو اور زیادہ اختلاف میں مبتلا ہوں گے لہٰذا تم آنحضرتؐ سے کوئی حدیث بیان نہ کرو اور اگر کوئی شخص تم سے پوچھے تو کہہ دو کہ ہمارے تمہارے درمیان قرآن موجود ہے پس تم اس کے حلال کو حلال جانو اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔"[۱]

جب حضرت عمرؓ کا دورِ حکومت آیا تو انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا۔

طبقاتِ ابن سعد میں ہے کہ اِنَّ الْاَحَادِیْثَ کَثُرَتْ عَلٰی عَھْدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَانْشَدَ النَّاسَ اَنْ یَّاْتُوْہُ بِھَا فَلَمَّا اَتَوْہُ بِھَا اَمَرَ بِتَحْرِیْقِھَا. یعنی حضرت عمرؓ کے عہد میں احادیث کی اتنی کثرت ہوگئی کہ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے مجموعہ ہائے حدیث لے آئیں۔ (لوگوں نے سمجھا کہ خلیفہ اُن سے استفادہ کرنا چاہتے ہوں گے) جب لوگ اپنے مجموعے لے آئے تو حضرت عمرؓ نے انہیں جلانے کا حکم صادر کیا۔[۲]

اس کے علاوہ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن حذیفہؓ، ابودرداءؓ، ابوذر غفاریؓ اور عقبہ بن عامرؓ جیسے صحابہ کو جو کہ مختلف شہروں میں رہ کر حدیثِ پیغمبرؐ کی نشر و اشاعت میں مصروف تھے اپنے پاس مدینے آنے کا حکم جاری کیا اور جب وہ صحابہ مدینے پہنچ گئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا:

مَاھٰذِہِ الْاَحَادِیْثُ الَّتِیْ اَفْشَیْتُمْ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ فِی الْآفَاقِ؟ قَالُوْا: تَنْھَانَا؟ قَالَ: لَا، اَقِیْمُوْا عِنْدِیْ لَا وَاللّٰہِ لَا تُفَارِقُوْنِیْ مَا عِشْتُ فَنَحْنُ اَعْلَمُ مَا نَاْخُذُ مِنْکُمْ. یہ کون سی احادیثِ رسولؐ تم لوگوں نے شہروں میں پھیلا رکھی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ کیا آپ ہمیں نقلِ حدیث سے منع کرتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں! تم یہیں میرے پاس مدینے میں رہو۔ خدا کی قسم! جب تک میں زندہ ہوں تم لوگ میری نظروں سے دور نہیں جاؤ گے۔ اور یہ کہ ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ تم سے کون سی حدیث لیں۔[۳]

چنانچہ حضرت عمرؓ کی وفات تک وہ لوگ ان کے پاس ٹھہرے رہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دور حکومت میں ابن مسعودؓ، ابودرداءؓ اور ابومسعود انصاریؓ کو یہ کہہ کر نظر بند کردیا تھا: اَکْثَرْتُمُ الْحَدِیْثَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ. تم رسول اللہؐ سے زیادہ روایات نقل کرتے ہو۔[۴]

۱۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی، تذکرہ الحفاظ، ج ۱، ص ۲-۳
۲۔ محمد بن سعد بصری المتوفی ۲۳۰ھ، طبقات الکبریٰ، ج ۵، ص ۱۴۰
۳۔ ملا علی متقی ہندی، کنز العمال، ج ۵، ص ۲۳۹۔
۴۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۷۔

حدیث کے متعلق حضرت عثمانؓ کا رویّہ بھی اپنے پیشرووں سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ چنانچہ وہ جیسے ہی خلیفہ بنے تو انہوں نے حکم جاری کیا کہ صرف وہی احادیث بیان کی جاسکتی ہیں جو ابوبکرؓ اور عمرؓ کے عہدِ حکومت میں بیان کی جاتی تھیں۔

اس مطلب کی تائید کے لئے ہم درج ذیل روایت بیان کرتے ہیں:

حضرت عثمانؓ کے دَور میں مناسِک حج کے دوران حضرت ابوذر غفاریؓ جمرات کے مقام پر لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ان سے شرعی مسائل پوچھ رہے تھے اور ابوذرؓ ان کو جواب دے رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک شخص ان کے سر پر آ کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا کہ کیا تمہیں فتویٰ دینے سے منع نہیں کیا گیا؟ حضرت ابوذر غفاریؓ نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا: اگر تم میری گردن پر تلوار رکھ دو تب بھی میں حدیثِ پیغمبرؐ بیان کرنے سے باز نہیں آؤں گا۔[1]

روایتِ حدیث کے جرم میں حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو شام جلا وطن کردیا تھا لیکن وہ شام میں بھی اپنے پیارے رسولؐ کی حدیث بیان کرنے سے باز نہ آئے۔ اس لئے معاویہ نے لوگوں کو ابوذرؓ کے ساتھ بیٹھنے سے منع کردیا تھا۔ ان تمام تر سختیوں کے باوجود بھی ابوذرؓ اِعلائے کلمۃ الحق میں مصروف رہے اور وہ عثمانؓ اور معاویہ کے غیر شرعی احکام کے خلاف احادیث بیان کرتے رہے جس کی وجہ سے معاویہ ان سے تنگ آ گیا اور اس نے انہیں دوبارہ مدینے بھیج دیا جہاں ان کے اور حضرت عثمانؓ کے درمیان تلخ کلامی ہوئی جس پر حضرت عثمانؓ نے انہیں ایک بے آب وگیاہ مقام "ربذہ" جلا وطن کردیا اور وہیں پر ان کی وفات ہوئی۔

نشرِ حدیث پر پابندی کی ایک وجہ حکمرانوں کا وہ خوف تھا کہ اگر احادیث نقل ہوئیں تو لوگ امام علیؑ کے فضائل ومناقب جان جائیں گے۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ امام علیؑ نے صدرِ اسلام میں بہت سے قریشی سرداروں کو جو طبقۂ حکام کے قریبی عزیز تھے غزوات میں قتل کیا تھا اس لئے ہر قریشی یہی چاہتا تھا کہ خلافت امام علیؑ کو نہ ملے۔[2] علاوہ ازیں امام علیؑ کے حق میں کئی آیات بھی نازل ہوئی تھیں جن کی تاؤیل اور شانِ نزول رسول اللہؐ بتاچکے تھے اس لئے حکومت کو یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ اگر نشرِ حدیث پر پابندی نہ لگائی گئی تو لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ حضرت علیؑ کی شان میں قرآنی آیات بھی نازل ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ فضائلِ علیؑ کی احادیث خود قریش کے لئے حصول اقتدار میں رکاوٹ تھیں کیونکہ رسول اللہؐ پہلے ہی بحیثیت ولی الامر، خلیفہ اور وصی امام علیؑ کا تعارف کراچکے تھے۔

۱۔ عثمان بن سعید دارمی، سنن، ج۱،ص۱۳۶ و ۱۳۷۔ محمد بن سعد، طبقات الکبریٰ، ج۲،ص۳۵۶۔ صحیح بخاری، ج۱،ص۱۲۱۔

۲۔ تفصیل کیلئے دیکھیں ڈاکٹر سید جعفر شہیدی کی کتاب پس از پنجاہ سال (اردو ترجمہ بنائے کربلا مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی)

حکومتی اقدامات کا اثر یہ ہوا کہ ایک شخص کا بیان ہے کہ میں سعد بن ابی وقاص کے ساتھ مدینے سے مکہ گیا اور پھر مکے سے واپس مدینے آیا مگر اس سارے سفر میں سعد نے میرے سامنے ایک بھی حدیثِ پیغمبرؐ نقل نہیں کی۔[1]

ایک دوسرے راوی کا بیان ہے کہ میں نے پورا ایک سال عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ گزارا مگر انہوں نے اس پورے عرصے میں میرے سامنے ایک بھی حدیث بیان نہ کی۔[2]

ابوہریرہؓ نے یہ اعتراف کیا کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں ہم قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ نہیں کہہ سکتے تھے۔[3]

حکومتی اقدامات کے نتیجے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو احادیث مدینے میں موجود اصحابؓ کے پاس تھیں وہ ان کے سینوں میں ہی رہیں اور ان کی وفات کے ساتھ ہی دفن ہوگئیں۔

عُذرِ گناہ بدتر از گناہ

امتناعِ حدیث کے اِس غلط اِقدام کو شرعی جواز فراہم کرنے کے لئے معاویہ کے دَورِ حکومت میں بڑی کوششیں رُوبعمل لائی گئیں اور بزرگوں کی غلطی کو سَندِ جواز دینے کے لئے کچھ خود ساختہ احادیث وضع کی گئیں۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: مجھ سے کوئی چیز نہ لکھو جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھا ہو تو وہ اسے مٹا دے۔[4] یا جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ رسولِ اکرمؐ سے ان کی احادیث لکھنے کی اجازت طلب کی گئی تو انہوں نے اجازت نہیں دی۔[5] (امام) احمد بن حنبل نے مسند میں لکھا کہ زید بن ثابت کا بیان ہے: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ نَھٰی اَنْ یُکْتَبَ شَیْئًا مِنْ حَدِیْثِہٖ. رسول اللہؐ نے اپنی حدیث لکھنے سے منع کیا۔[6]

مسند احمد اور سُنَنِ ابی داؤد میں ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

کُنَّا قُعُوْدًا نَکْتُبُ مَا نَسْمَعُ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ فَخَرَجَ عَلَیْنَا فَقَالَ مَا ھٰذَا تَکْتُبُوْنَ؟ فَقُلْنَا مَا نَسْمَعُ مِنْکَ فَقَالَ اَکِتَابٌ مَّعَ کِتَابِ اللّٰہِ... اُکْتُبُوْا کِتَابَ اللّٰہِ اَمْحِضُوْا کِتَابَ اللّٰہِ فَقَالَ فَجَمَعْنَا مَا کَتَبْنَا فِیْ صَعِیْدٍ وَّاحِدٍ ثُمَّ اَحْرَقْنَاہُ بِالنَّارِ. یعنی ہم بیٹھے ہوئے تھے اور ہم رسول اللہؐ سے سنی ہوئی

۱و۲۔ عثمان بن سعید دارمی، سنن، ج۱، ص۸۴ و ۸۵۔

۳۔ حافظ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ (تاریخ ابن کثیر)، ج۸، ص۱۰۷۔

۴۔ مسلم بن حجاج نیشاپوری، صحیح، ج۴، ص۹۷۔ سلیمان بن اشعث ازدی حنبلی سجستانی، سنن ابی داؤد، ج۱، ص۱۱۹۔ امام احمد بن حنبل، مسند، ج۳، ص۱۲۔ ۳۹۔ ۵۶۔ لَاتَکْتُبُوْا عَنِّیْ وَمَنْ کَتَبَ عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْآنِ فَلْیَمْحَہٗ.

۵۔ عثمان بن سعید دارمی، سنن، مقدمہ باب ۴۲۔ اِسْتَاْذَنُوا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ فِیْ اَنْ یَّکْتُبُوْا عَنْہُ فَلَمْ یَاْذَنْ لَھُمْ.

۶۔ امام احمد بن حنبل، مسند، ج۳، ص۱۲ و ۱۳۔

حدیث لکھ رہے تھے۔ اتنے میں آنحضرتؐ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: تم یہ کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے کہا: ہم آپؐ سے سنی ہوئی احادیث لکھ رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب بھی؟ تم صرف کتاب اللہ لکھو۔ کتاب اللہ کو خالص رکھو۔ ابو ہریرہؓ نے کہا کہ ہم نے جو کچھ لکھا تھا اسے ایک جگہ جمع کر کے جلا دیا۔[1] (اس روایت کے جعلی ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس حدیث کے راوی ابو ہریرہؓ ہیں جو اَن پڑھ تھے اور لکھنا نہیں جانتے تھے)۔

خلفاء نے اپنے اقدامات کے ذریعے سے سنتِ پیغمبرؐ کو مدینے تک محدود کر دیا تھا — اور وہ بھی سینوں میں — اور مدینے سے باہر کے لوگوں کو حدیث کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ البتہ جن احادیث سے خلیفہ اور اس کی حکومت کو کوئی خطرہ نہ ہوتا تھا تو ایسی بے ضرر احادیث کے بیان کرنے پر پابندی نہیں تھی۔

اگر خلفاء کی یہ رَوِش باقی رہتی تو آج اسلام کے حقیقی عقائد اور احکام بالکل ناپید ہو جاتے لیکن خلفاء کے طرزِ عمل کے مقابلے میں حضرت امیر علیہ السلام اور ائمۂ اطہارؑ نے نامساعد حالات میں احادیث کی نشر و اشاعت کا کٹھن کام سرانجام دے کر حقیقی اسلام کی حفاظت و تبلیغ کی۔

قرآن کی تفسیر ختم کرنے کیلئے قرآن جلانے کی سیاست

اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولِ اکرمؐ پر جتنا قرآن مجید نازل ہوتا وہ آپؐ لوگوں کو پڑھ کر سناتے اور لوگوں کے سامنے اس کے معانی بھی بیان کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک صحابی کا بیان ہے:

رسولِ اکرمؐ ہمیں دس دس آیات یاد کراتے تھے اور ہم ان دس آیات سے اس وقت تک آگے نہیں جاتے تھے جب تک آنحضرتؐ ہمیں ان آیات کے احکام تعلیم نہیں کر دیتے تھے۔[2] مقصد یہ ہے کہ آیات کے متعلق جتنی معلومات کی ضرورت ہوتی تھی رسولِ اکرمؐ ہمیں اس کی تعلیم دیتے تھے۔

آنحضرتؐ کا بیان بھی خدا کی طرف سے ہوتا تھا جو کہ جبرئیلِ امینؑ کے ذریعے سے بطورِ وحی نازل ہوتا تھا۔ آنحضرتؐ کے اس طریقۂ تدریس کی وجہ سے سیکڑوں افراد نے قرآن معنیٰ و تفسیر کے ساتھ یاد کر لیا تھا اور اس طبقۂ حفاظ کو ''قاریانِ قرآن'' کہا جاتا تھا۔ قاریانِ قرآن میں سے جو افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے وہ قرآنی آیات اور رسولِ اکرمؐ کی تشریحات اور لغوی معانی، شانِ نزول اور احکام کو چمڑے، لکڑی یا گوسفند کی باریک ہڈی پر لکھ لیتے تھے۔ صحابہؓ کے ان مجموعوں کو ''مصاحف'' کہا جاتا تھا۔ رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں صرف قرآن مجید کی

۱۔ امام احمد بن حنبل، مسند، ج ۵، ص ۱۸۲۔ ابوداؤد، سنن، ج ۳، ص ۳۱۹۔

۲۔ امام احمد بن حنبل، مسند، ج ۵، ص ۴۱۰۔

آیات ہی نہیں لکھی جاتی تھیں بلکہ آیات کے ساتھ رسول اکرمؐ کی بیان کردہ تشریح بھی لکھی جاتی تھی۔[1]

ان مصاحف کا انداز کیسا ہوتا تھا اس کے لئے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

اِنَّ شَانِئَکَ هُوَالْأَبْتَرُ کی آیت کے بعد یہ الفاظ لکھے گئے تھے کہ "نبی اکرمؐ کی عیب گوئی کرنے والا عمرو بن عاص کا باپ عاص بن وائل تھا۔" اور اِنْ جَآئَکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ کی آیت کے تفسیری نوٹ میں لکھا تھا کہ "اس آیت میں ولید بن عقبہ کو فاسق کہا گیا ہے۔" اور وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ کے آگے تفسیری نوٹ میں لکھا گیا تھا کہ "بنوامیہ شجرۂ ملعونہ ہیں۔"

قرآن مجید میں اس طرح کی دسیوں آیات موجود ہیں جن میں قریش پر تنقید کی گئی ہے اور مذکورہ تفسیر صحابہؓ کے مصاحف میں آیات کے پہلو بہ پہلو موجود تھی اور پھر عجیب اتفاق یہ ہوا کہ صحابہؓ کے مصاحف کے تفسیری حصوں میں جن لوگوں کی مذمّت مرقوم تھی، دوّرِ خلفاء میں وہ خود یا ان کی اولاد میں سے کچھ لوگ فوج کے سپہ سالار یا کسی صوبے کے والی بنائے گئے تھے۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص کا بیان ہے کہ میں رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیّبہ میں احادیثِ رسولؐ لکھا کرتا تھا۔ قریش نے مجھے لکھنے سے منع کیا۔ (منع کرنے والے وہی تھے جن کی مذمّت میں آیاتِ خداوندی نازل ہوئی تھیں) اور مجھ سے کہا کہ تو پیغمبرؐ کی ہر بات لکھتا ہے؟ پیغمبرؐ بھی انسان ہیں، وہ کچھ باتیں غصے میں کہتے ہیں اور کچھ باتیں رضامندی میں کہتے ہیں۔ یعنی عام انسانوں کی طرح پیغمبرؐ جب کسی سے خوش ہوتے ہیں تو اس کی خواہ مخواہ تعریف کردیتے ہیں اور جب ناراض ہوتے ہیں تو اس کی مذمت اور بدگوئی کردیتے ہیں۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص کا بیان ہے کہ پھر میں نے احادیث لکھنا چھوڑ دیں۔ اس کے بعد میں نے یہی بات رسولِ اکرمؐ کو بتائی۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا کہ میری باتیں لکھا کرو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میرے منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔[2]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش رسولِ اکرمؐ کی زندگی ہی میں نہیں چاہتے تھے کہ ان کی مذمت پر مبنی کوئی حدیث لکھی جائے اور حد یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے آخری لحات میں انہوں نے "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ" کہہ کر رسولِ اکرمؐ کی حدیث لکھنے اور سننے سے انکار کردیا تھا۔

رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد جب اقتدارِ اعلیٰ قریش کے ہاتھوں میں منتقل ہوا تو انہوں نے سوچا

۱۔ تفصیل کے لئے ہماری کتاب القرآن الکریم و روایات المدرستین جلد اول میں مصطلحاتِ قرآنی دیکھیں۔

۲۔ دارمی، سنن، ج۱، ص۱۲۵۔ ابوداؤد، سنن، ج۲، ص۱۲۶۔ امام احمد بن حنبل، مسند، ج۲، ص۱۶۲ و ۲۰۷ و ۲۱۶۔ مستدرک حاکم، ج۱، ص۱۰۵ و ۱۰۶۔

کہ قرآن مجید کے تفسیری حواشی سے نجات حاصل کرنی چاہئے اور قرآن کو شرح وتفسیر کے بغیر منظرعام پر لانا چاہئے کیونکہ اس وقت کے مصاحف کے تفسیری حواشی ادارۂ خلافت کی رَوِش سے مطابقت نہیں رکھتے تھے کیونکہ اس وقت کے مصاحف میں یَآ اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ کے تفسیری حاشیے میں "فِیْ عَلِیٍّ" لکھا ہوا تھا۔

اس طرح کی تفسیر خلافت کے ادارہ کے مزاج کے مطابق نہیں تھی۔ اسی لئے حضرت ابوبکرؓ کے دَوْرِ حکومت سے قرآن کو تفسیری حواشی سے صاف کرنے کے کام کا آغاز کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دَوْرِ حکومت میں حکم صادر کیا تھا کہ قرآن مجید کو تفسیری حواشی کے بغیر لکھا جائے۔ چنانچہ اس وقت جو قرآن مجید ہمارے پاس موجود ہے وہ اسی حکم کا عکاس ہے اور حواشی سے معرّیٰ قرآن مجید مرتب کرا کے ان کی صاحبزادی ام المومنین بی بی حفصہؓ کے پاس رکھا گیا تا کہ کسی مناسب موقع پر اسے مصاحفِ صحابہؓ کی جگہ متعارف کرایا جاسکے۔

اس کے علاوہ حضرت عمرؓ نے اپنے والیوں کو بھی حکم دیا کہ وہ لوگوں کو قرآن میں مشغول رکھیں اور انہیں حدیث کی طرف متوجہ نہ ہونے دیں۔ چنانچہ صحابیٔ رسول قرظہ بن کعبؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب مجھے کوفے کا والی بنایا تو وہ مجھے رخصت کرنے کے لئے مدینے کے باہر تک آئے اور جب ہم مدینے سے باہر نکل آئے تو انہوں نے کہا: جانتے ہو میں تمہیں الوداع کہنے کے لئے اتنا دور کیوں آیا ہوں؟

میں نے کہا: اس لئے کہ ہم پیغمبر اکرمؐ کے صحابی ہیں، آپ ہمارے احترام میں یہاں تک آئے ہیں۔

انہوں نے کہا: جی ہاں! یہ سچ ہے لیکن اس کے علاوہ مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ تم اُس شہر کی طرف جارہے ہو جہاں کے لوگ قرآن کی زیادہ تلاوت کرتے ہیں اور ان کی تلاوت کی آوازیں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح بلند ہوتی رہتی ہیں۔ تم انہیں قرآن کی تلاوت سے ہٹا کر حدیثِ پیغمبرؐ میں مشغول نہ کرنا۔

قرظہ کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں نے خلیفہ کے خوف سے نبی اکرمؐ کی کوئی حدیث بیان نہیں کی۔[۱]

ابوموسیٰ اشعری کا بیان ہے:

حضرت عمرؓ نے جب مجھے بصرہ کا والی بنایا تو وصیت کی کہ لوگوں کو صرف قرأتِ قرآن میں مصروف رکھوں۔[۲]

آیاتِ قرآنی کو تفسیرِ نبوی سے علیحدہ کرنے کی وجہ سے حالت یہ ہوگئی کہ خود حضرت عمرؓ کو قران کی آیت وَفَاکِهَةً وَّاَبًّا کے معنی معلوم نہیں تھے اور انہوں نے منبر پر کہا وَفَاکِهَةً وَّاَبًّا کیا ہے؟ بعد میں کہا کہ عمرؓ تجھے

۱۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج۱، ص۴ و ۵۔ دارمی، سنن، ج۱ص۸۵۔

۲۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج۸، ص۱۰۷۔

اس کا صحیح معنی معلوم نہیں ہے۔ اے لوگو! تمہیں قرآن کا جو مفہوم معلوم ہو اس پر عمل کرو اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام جانو۔[1]

حضرت عمرؓ تفسیرِ قرآن کے لئے کبھی کعب الاحبار اور کبھی ابن عباسؓ سے رجوع کرتے تھے۔ خلیفہ کے ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان صرف قرآن پڑھنے میں مصروف ہوگئے اور ان صحابہؓ کو جنہوں نے عہد نبوی میں مصاحف مرتب کئے تھے تفسیرِ قرآن بیان کرنے کا حق نہیں تھا۔ حسبِ ذیل واقعے سے اس دور کے حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔

قرآن کے ایک طالب علم کا حشر

بصرہ کے صبیغ بن عسل تمیمی کا شمار بنی تمیم کے سربرآوردہ افراد میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کا شیخ تھا۔ اسے فہم قرآن کا بیحد شوق تھا۔ وہ فہمِ قرآن کی غرض سے کوفہ، بصرہ، دمشق، حمص اور اسکندریہ میں صحابہ کے پاس جاکر آیاتِ قرآنی کے معانی دریافت کرتا تھا۔

عمرو بن عاص نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ یہاں ایک شخص آیا ہوا ہے جو قرآن کی تفسیر کے متعلق سوال کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اسے یہاں مدینے بھیج دو۔ چنانچہ عمرو بن عاص نے اسے مدینے بھیج دیا۔ جب وہ مدینے پہنچا اور خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوا تو اس نے خلیفہ سے کہا کہ وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا کے کیا معنی ہیں؟

حضرت عمرؓ نے جیسے ہی اس کا سوال سنا تو کہا: اچھا تو وہی شخص ہے؟ آگے آجا۔ وہ بے چارہ بڑھا تو انہوں نے اپنی آستینیں چڑھالیں اور اسے کھجور کے خوشے کی چھڑیوں سے سو بار پیٹا اور اس کے سر پر اتنی ضربیں لگائیں کہ وہ خون آلود ہوگیا۔

اس نے کہا: اے امیر المومنین! میرے سر میں جو سودا سمایا ہوا تھا اب وہ نکل گیا ہے۔

خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے زندان میں ڈال دیا جائے۔ لوگ اسے وہاں سے اٹھا کر زندان کی طرف لے چلے تو اس کا قمیض خون سے تربتر تھا۔ کچھ عرصے وہ زندان میں رہا۔

جب وہ زخموں سے شفایاب ہوگیا تو خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے دوبارہ ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ جب اسے پیش کیا گیا تو اب کی بار خلیفہ نے اس کی کمر پر ایک سو دُرّے مارے جس سے اس کی کھال جگہ جگہ سے اُدھڑ گئی۔ پھر خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے دوبارہ زندان میں ڈال دیا جائے۔ اس کو زندان میں ڈال دیا گیا

۱۔ حافظ سیوطی، تفسیر درمنثور، ج ۶، ص ۳۱۷۔ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری، مستدرک، ج ۲، ص ۵۱۴۔ محمد بن جریر طبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، ص ۱۳۸۔ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۴، ص ۴۷۳۔ حافظ سیوطی، الاتقان، ج ۱، ص ۱۱۵۔

پھر کچھ دنوں بعد تیسری بار خلیفہ کے سامنے لایا گیا تو اس نے کہا: اے امیرالمومنین! اگر آپ مجھے مارنا ہی چاہتے ہیں تو ایک ہی دفعہ مار ڈالیں۔ بار بار کی اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔

حضرت عمرؓ نے اسے رہا کر کے واپس بصرہ بھیج دیا اور ابوموسیٰ اشعری کو لکھا کہ اس شخص سے کسی کا گفتگو کرنا یا مل بیٹھنا ممنوع ہے۔ اس لئے اگرچہ وہ شخص جماعت میں شریک ہوتا تھا لیکن کوئی اس سے گفتگو نہیں کرتا تھا۔ پھر کچھ دنوں بعد وہ ابوموسیٰ اشعری کے پاس گیا اور بولا کہ میں اس بائیکاٹ سے تنگ آ چکا ہوں۔ آپ خلیفہ سے میری سفارش کریں۔ ابوموسیٰ نے خلیفہ کو لکھا کہ صبیغ بن عسل تمیمی نے توبہ کرلی ہے۔ اب لوگوں کو اس سے نشست و برخاست کی اجازت دیدیں۔ حضرت عمرؓ نے اجازت دیدی۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ صبیغ کا شمار اشرافِ قوم میں ہوتا تھا لیکن اس واقعے کے بعد وہ ذلیل ہوگیا اور اس کی عزت جاتی رہی۔[1] یہ تھے اُس وقت کے مسلمان معاشرے اور قریشی خلافت کے حالات۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات میں قبیلۂ قریش کی اسلام دشمنی بیان کی گئی تھی اور پیغمبرِ اکرمؐ کی احادیث میں ایذا دینے والے دشمنانِ اسلام کے نام بھی بتائے گئے تھے اور پھر پیغمبرِ اسلامؐ کے بعد ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حکومت قریش کو منتقل ہوگئی اور مصاحفِ صحابہؓ میں جن لوگوں کے نام دشمنانِ اسلام کی حیثیت سے لکھے ہوئے تھے وہ افراد یا ان کے قریبی عزیز ادارۂ خلافت کے روحِ رواں تھے اور جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ صحابہ کے مصاحف میں خود اُن کی یا اُن کے بزرگوں کی اسلام دشمنی کا تذکرہ موجود ہے تو وہ شرمندہ ہوتے تھے۔ اسی لئے خلافت کے مرکز کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ قرآن مجید کو اس کی تفسیر سے جدا کر کے پڑھا جائے اور قرآن کے ساتھ پیغمبرِ اکرمؐ کی احادیث کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ شیخین کا عہدِ حکومت اسی کدوکاوش کی نذر ہوا۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو لوگ اُن کی اقرباء پروری اور ان کے رشتہ داروں کے استحصالی ہتھکنڈوں سے تنگ آگئے تو منہ پر لگے ہوئے تالے آہستہ آہستہ کھلنے لگے اور مصاحفِ صحابہ میں سے ولید بن عقبہ، سعید بن عاص، معاویہ بن ابی سفیان اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق جو کچھ تحریر تھا منظرِ عام پر آنے لگا اور لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے رشتہ داروں کی حقیقت معلوم ہونے لگی تو حضرت عثمانؓ نے سوچا کہ جب تک مصاحفِ صحابہ موجود رہیں گے اس وقت تک ان کے خاندان پر تنقید ہوتی رہے گی لہٰذا انہوں نے بی بی حفصہؓ کے پاس موجود معریٰ قرآن طلب کیا اور اس کی چھ نقول تیار کرا کے مکہ، شام، کوفہ، بصرہ، حمص اور اسکندریہ روانہ کیں اور ایک نسخہ اپنے پاس مدینے میں رکھا۔ اس کے بعد تمام صحابہ سے مصاحف لیکر انہیں جلادیا اور یوں مسلمانوں کے ہاتھ

---

[1] دارمی، سنن، ج۱، ص۵۴۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۴، ص۲۳۲۔ حافظ جلال الدین سیوطی، الاتقان، ج۲، ص۴۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی المتوفی ۶۷۱ھ، تفسیر الجامع لاحکام القرآن، ج۱۸، ص۲۹۔

میں تفسیر سے خالی قرآن مجید کا نسخہ رہ گیا۔

صاحبانِ مصاحف میں سے صرف عبداللہ بن مسعودؓ ہی وہ واحد صحابی تھے جنہوں نے اپنا مصحف حکومت کے حوالے نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے اس عظیم صحابی پر —— مکتبِ خلفاء کے علماء نے —— یہ تہمت لگائی کہ انہوں نے اس لئے اپنا مصحف حکومت کے حوالے نہیں کیا تھا کہ اس میں فلاں فلاں سورت موجود نہیں تھی یا اس میں فلاں چیز کا اضافہ تھا۔

یہاں تک آپ نے خلفائے ثلاثہ کے عہد میں قرآن مجید کی داستانِ مظلومیت ملاحظہ فرمائی۔ آگے چل کر ہم آپ کو بتائیں گے کہ حضرتِ امیر علیہ السلام نے اپنے دورِ حکومت میں صحابۂ کرامؓ کو نشرِ حدیث کی اجازت دے کر اور اپنے بلند پایہ خطبات ارشاد فرما کر کس طرح سے معاشرے کو تفسیرِ قرآن واپس لوٹائی۔

دوَرِ خلفاء میں قرآن کے حقائق و معَارف سے جو سلوک کیا گیا، ہم اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم یہ بات پہلے عرض کر چکے ہیں کہ خلیفۂ دوم نے حدیثِ رسولؐ کی نشر و اشاعت کے لئے صحابۂ کرامؓ پر پابندیاں عائد کر دی تھیں اور صحابہ کے مقابلے میں تفسیرِ قرآن اور مَعارفِ قرآن بیان کرنے کے لئے دو نومسلم افراد یعنی کعب الاحبار اور تمیم داری کو اجازت دی گئی تھی۔ کعب الاحبار ایک یہودی عالم تھا جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمان ہوگیا تھا اور اس نے دربارِ خلافت میں اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی حکومت میں وہ سرکاری ترجمان تھا۔ اور حضرت عمرؓ مَعارفِ قرآن کے لئے اس نومسلم سے سوال کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی اس سے یہ بھی پوچھتے تھے کہ فلاں مسئلے پر توریٰت کا کیا حکم ہے؟

یہی صورتحال حضرت عثمانؓ کے عہد میں بھی جاری رہی۔ حسبِ ذیل واقعے پر توجہ فرمائیں:

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب عبدالرحمٰن بن عوف کا انتقال ہوا اور ان کا ترکہ تقسیم کے لئے خلیفہ کے پاس لایا گیا تو اس میں سونے چاندی کا اتنا بڑا ڈھیر شامل تھا کہ ایک طرف بیٹھا ہوا شخص دوسری طرف بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ (عبدالرحمٰن کی چار بیویاں تھیں اور ہر بیوی کا حصہ ۱/۳۲ تھا۔ اس ۱/۳۲ کے حساب سے ان کی ہر بیوی کو ۸۴ ہزار دینار طلائی ملے تھے)۔ اتفاق سے یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت ابوذرؓ کو شام سے معاویہ نے جلاوطن کر کے مدینے بھیجا تھا اور اونٹ کی ننگی پشت پر مسلسل سفر کے سبب ان کی رانیں زخمی ہوگئی تھیں۔ چنانچہ ابوذرؓ بھی زخمی حالت میں دربارِ خلافت میں موجود تھے۔

حضرت عثمانؓ نے کعب الاحبار سے کہا: جو شخص میراث میں اتنا سونا چھوڑ کر مرے، کیا اس سے بھی کوئی پُرسش ہوگی؟

کعب الاحبار نے کہا: نہیں۔

حضرت ابوذرؓ یہ بات برداشت نہ کر سکے اور اپنا عصا کعب کے سر پر مار کر کہا: اے یہودی کی اولاد!

کیا تو ہمیں ہمارا دین سکھانے آیا ہے؟ پھر انہوں نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ۝ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے آپ ان کو دردناک عذاب کی خبر سنادیں۔ جس دن وہ سونا چاندی دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ سو جو تم جمع کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔ (سورۂ توبہ: آیات ۳۴و۳۵) [۱]

دربارِ خلافت کا دوسرا ترجمان تمیم داری تھا جو پہلے ایک عیسائی راہب تھا۔ وہ پیغمبرِ اکرمؐ کے زمانے میں خیانت کا مرتکب ہوا تھا اور پیغمبرِ اکرمؐ نے اس سے فرمایا تھا کہ اسلام قبول کرلے کیونکہ اسلام قبول کرنے سے سابقہ گناہ ختم ہو جاتے ہیں چنانچہ اس نے اسلام قبول کرلیا۔

جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو تمیم داری حضرت عمرؓ سے اجازت پاکر جمعہ کے دن خطبۂ نماز سے قبل منبر پر جاتا اور لوگوں سے خطاب کرتا تھا۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو تمیم داری ہفتے میں دو بار مسجدِ نبوی میں لوگوں سے خطاب کیا کرتا تھا۔

کعب الاحبار اور تمیم داری نے رسولِ خداؐ کی احادیث نہیں سنی تھیں اور وہ آنحضرتؐ کی ان احادیث سے بے خبر تھے جو قبیلۂ قریش کے بعض افراد کی مذمت میں کہی گئی تھیں۔ اگر بر سبیلِ تذکرہ انہوں نے کسی سے اس مضمون کی کچھ حدیثیں سنی بھی تھیں تو بھی وہ ایسی احادیث کو زیرِ بحث لانا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی بجائے دونوں افراد توراۃ کی تحریف شدہ داستانیں سنا کر لوگوں کا دل بہلایا کرتے تھے۔ ان کے ذریعے سے توراۃ کی تحریف شدہ روایات اسلام میں داخل ہوئیں اور مسلمانوں کے عقائد میں تبدیلی کا باعث بنیں اور آہستہ آہستہ صفاتِ خدا کے متعلق مسلمانوں کے اذہان سے قرآنی تعلیمات محو ہوتی گئیں اور ان کی جگہ توراۃ کی تحریف شدہ روایات عقیدے کا جزو بنتی گئیں چونکہ توراۃ میں خدا کا جو تصور ہے اس سے جسم و جسمانیت کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ آج وہابیوں کے ہاں جو صفاتِ خداوندی کا تصور پایا جاتا ہے یہ دراصل یہودیت کی تحریف شدہ روایات کا ایک عکس ہے۔

اگر آج وہابی خدا کے لئے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں، چہرہ اور پنڈلی مانتے ہیں تو اسے توراۃ کی صدائے بازگشت پر محمول کرنا چاہئے۔ آج کا وہابی قرآن کے خدا اور توراۃ کے خدا کو یکساں قرار دیتا ہے

۱۔ علی بن حسین مسعودی، مروج الذہب و معادن الجوہر، ج ۲، ص ۳۳۹۔

حالانکہ خدا کے متعلق جو تصوّر توراۃ نے دیا ہے وہ قرآن کے تصورِ خدا سے بالکل مختلف ہے۔

قرآن جو کہ لفظی تحریف سے تو محفوظ ہے مگر مکتبِ خلفاء کی تاویلات کی وجہ سے معنوی تحریف سے محفوظ نہیں۔ اسی دور کو مدنظر رکھ کر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا: سَيَأْتِيْ عَلٰى اُمَّتِيْ زَمَانٌ لَايَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُهٗ. یعنی عنقریب میری امت پر ایک ایسا دَور آئے گا کہ اسلام میں سے اس کے نام کے سوا اور قرآن میں سے اس کے رسم الخط کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔[1]

احکام میں تبدیلیاں

خلفاء کے دَور میں بالعموم اور خلیفۂ ثانی کے دَور میں بالخصوص اسلامی احکام میں کئی تبدیلیاں کی گئیں۔ خدا و رسولؐ کے بیان کردہ قطعی حکم کے مقابلے میں اپنی فکر پر مبنی احکام تراشے گئے اور لوگوں کو یہ دعوت دی گئی کہ وہ خدا و رسولؐ کے احکام کے مقابلے میں ان کے خودساختہ احکام کی پیروی کریں۔

اس کام کو یقیناً اسلام اور احکامِ اسلام میں تحریف اور تغیر سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس طرح کے اقدامات سے دین کی حقیقت اور قدر و قیمت مخدوش ہوجاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کی پابندی اس وقت فائدہ مند ہوسکتی ہے جب دین اللہ کا نازل کردہ ہو اور محفوظ عن الخطا نبیؐ کی وساطت سے امت تک پہنچا ہو۔ اگر اس کے برعکس دین محدود سوچ رکھنے والے افراد بالخصوص اہل اقتدار کے ہاتھوں میں کھلونا بن جائے تو دین کا اعتبار ہی ختم ہو جائے گا اور اس میں کمی بیشی کا احتمال پیدا ہو جائے گا۔ ایسا دین جس میں انسانوں کی مداخلت کارفرما ہو نہ صرف یہ کہ انسان کے کمال اور نجات کا ضامن نہیں ہوگا بلکہ اس کی گمراہی کا باعث بنے گا۔

مکتبِ اہلبیتؑ اور مکتبِ خلفاء کے بنیادی اختلافات میں سے ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ مکتبِ اہلبیتؑ صرف قرآن اور سنت کو احکامِ الٰہی کا سرچشمہ سمجھتا ہے کیونکہ نبی اکرمؐ معصوم اور آیاتِ الٰہی کے نگہبان ہیں۔ ان کی زبان ہر لغزش سے محفوظ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى○ (ہمارا نبیؐ) اپنی خواہشِ نفس سے کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ (قرآن) تو حکمِ خدا ہے جو اُن کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔ (سورۂ نجم: آیت ۳و۴)

اِک لفظ بھی کہتے نہیں بے وحیِ الٰہی — اللہ کا فرمان ہے فرمانِ محمدؐ
محفل سے اُٹھادیں تو بفرمانِ الٰہی — داخل جسے کرلیں وہ ہے سلمانِ محمدؐ — نجم الہ آبادی

مذہبِ شیعہ کا عقیدہ ہے کہ نبی اکرمؐ کے بعد ان کے بارہ جانشین بھی معصوم ہیں۔ انہوں نے اپنے اپنے

۱۔ شیخ الطائفہ شیخ صدوق، ثواب الاعمال، ص ۳۰۱۔ شیخ الاسلام علامہ مجلسی، بحارالانوار، ج ۵۲، ص ۱۹۰۔ منتخب الاثر، ص ۴۲۷۔

دور میں رسول خداؐ کی سکھائی ہوئی تعلیمات اصل حالت میں لوگوں تک پہنچائیں۔ جبکہ مکتبِ خلفاء قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ سیرتِ خلفاء بالخصوص سیرتِ شیخین کو بھی اسلامی احکام کا مأخذ و مدرک قرار دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ خداو رسولؐ کے احکام کے برخلاف اگر خلفاء نے کچھ احکام وضع کئے ہیں یعنی انہوں نے نص Text کے مقابل اجتہاد کیا ہے تو ان امور میں بھی مکتبِ خلفاء ان کی اطاعت کو واجب سمجھتا ہے۔ خلفاء کی تاریخ میں اس طرح کے اجتہادات بکثرت دکھائی دیتے ہیں۔[1]

برسبیل تذکرہ نص کے مقابلے میں اجتہاد کا یہ نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

عُمرۂ تَمَتُّع

اسلام میں ایک عمرۂ مفردہ ہے اور ایک حج ہے۔ اور حج کی تین قسمیں ہیں:

(۱) حجِ قِران (۲) حجِ اِفراد (۳) حجِ تَمَتُّع۔

عمرۂ مفردہ سال کے تمام مہینوں میں کیا جاسکتا ہے۔ اس میں میقات سے احرام باندھا جاتا ہے اور طوافِ کعبہ، نمازِ طواف، صَفا و مَرْوہ کے درمیان سعی، تقصیر، طواف النساء، اور طواف النساء کی نماز جیسے اعمال شامل ہیں۔

حجِ افراد ان لوگوں کے لئے ہے جو مکے میں اور مکے سے بارہ میل کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ ایسے لوگ حج کے مہینے میں اپنے گھر سے احرام باندھتے ہیں اور عرَفات، مَشْعر اور مِنیٰ جاتے ہیں اور وہاں کے مَناسک ادا کرنے کے بعد واپس مکہ آتے ہیں جہاں وہ طواف اور سعی بجالاتے ہیں اور پھر عمرۂ مفردہ ادا کرتے ہیں۔

حجِ تمتّع دور دراز کے مسلمانوں کے لئے ہے اور یہ حج کے مخصوص مہینے میں ادا کیا جاتا ہے۔ حجاج عمرہ اور حج دونوں بجالاتے ہیں۔ حجِ تمتّع کا طریقہ یہ ہے کہ حجاج میقات سے عمرۂ حجِ تمتّع کا احرام باندھ کر مکہ جاتے ہیں جہاں وہ خانۂ کعبہ کا طواف اور نمازِ طواف بجالاتے ہیں۔ صَفا و مَرْوہ کے درمیان سعی کرتے ہیں اور اس کے بعد تقصیر کراتے ہیں۔ تقصیر کے ساتھ ہی وہ احرام سے باہر آجاتے ہیں اور احرام کی وجہ سے ان پر جو پابندیاں ہوتی ہیں وہ ختم ہوجاتی ہیں۔ پھر وہ ۸/ ذی الحجہ تک مکے میں رہتے ہیں۔ پھر اس دن حج کا احرام باندھتے ہیں اور عرَفات، مَشْعر اور مِنیٰ جاتے ہیں اور وہاں کے مَناسک سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ مکہ آجاتے ہیں جہاں وہ طوافِ حج اور نمازِ طواف اور صَفا و مَرْوہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ پھر طواف النساء اور طواف النساء کی نماز بجالاتے ہیں اور یوں عمرہ اور حج کی تکمیل کرتے ہیں۔

---

[1] مرحوم سید شرف الدینؒ کی النص والاجتہاد کے نام سے ایک جامع کتاب موجود ہے۔ کچھ ایسے خودساختہ اجتہادات کا تذکرہ ہم نے اپنی کتاب معالم المدرستین کی جلد دوم میں بھی کیا ہے۔

اس طرح کے حج کو ''حج تمتع'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ عمرہ کی ادائیگی کے بعد انسان ''مُحِل'' ہو جاتا ہے اور احرام کی وجہ سے حرام ہونے والے تمام امور بشمول حقوقِ زوجیت اس پر حلال ہو جاتے ہیں۔

حجِ قران ان لوگوں کے لئے ہے جو میقات سے اپنے ساتھ قربانی لے کر آئیں اور اس حج کے اعمال بھی حجِ اِفراد کی طرح سے ادا کئے جاتے ہیں۔

چونکہ اہلِ مکہ زمانۂ جاہلیت میں تجارت کرتے تھے اس لئے وہ دینی احکام میں بھی اپنا فائدہ دیکھتے تھے۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ سال میں دو مرتبہ مکہ آؤ۔ ایک مرتبہ عمرۂ مفردہ کے لئے اور دوسری مرتبہ ذی الحجہ میں حج کے لئے۔ اور یہ کہ حج و عمرہ دونوں کو جمع نہ کرو۔

ابن عباسؓ نے مشرکینِ مکہ کا نظریہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا: كَانُوْا يَرَوْنَ الْعُمْرَةَ فِي اَشْهُرِ الْحَجِّ مِنْ اَفْجَرِ الْفُجُوْرِ فِي الْاَرْضِ... وَيَقُوْلُوْنَ: اِذَا بَرَاَ الدُّبُرُ وَ عَفَا الْاَثَرُ وَ انْسَلَخَ صَفَرُ حَلَّتِ الْعُمْرَةُ لِمَنِ اعْتَمَرَ یعنی حج کے مہینوں میں وہ عمرہ ادا کرنے کو روئے زمین کا بدترین گناہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ جب مسافت کی وجہ سے اونٹوں کی زخمی پیٹھیں مندمل ہو جائیں، راستوں کے نشان مٹ جائیں اور ماہ صفر گزر جائے تو پھر عمرہ کرنا جائز ہو جاتا ہے۔[1]

ہجرت کے بعد پیغمبرِ اکرمؐ کئی بار عمرۂ مفردہ بجالائے تھے اور ۱۰ھ میں آپ نے تمام قبائل عرب کو پیغام بھیجا کہ وہ مناسکِ حج کی تعلیم کے لئے تیار ہو جائیں اور جس کسی کو خدا نے حج کی استطاعت دی ہے وہ ہمارے کاروانِ حج میں شامل ہو جائے۔

مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ ستر ہزار سے ایک لاکھ تیس ہزار افراد آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ اگر ہم ستر ہزار کی تعداد کو بھی معتبر مان لیں تب بھی یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ الغرض پیغمبرِ اکرمؐ ہزاروں افراد کے جلو میں حج پر تشریف لے گئے اور مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے آپؐ کو مناسک حج ادا کرتے ہوئے دیکھا۔

جو حجاج پیغمبرِ اکرمؐ کی طرح اپنی قربانیاں ساتھ لے کر روانہ ہوئے تھے جب وہ مدینے سے باہر (آبیارِ علیؑ کے مقام پر) پہنچے تو انہوں نے ''حجِ قران'' کی نیت کی۔ جن کے ساتھ قربانیاں نہیں تھیں انہوں نے ''حجِ اِفراد'' کی نیت کی اور جب نبیٔ اکرمؐ مکہ اور مدینہ کے درمیان وادیٔ عقیق میں پہنچے تو آپ نے عمر بن الخطابؓ سے فرمایا: اَتَانِيْ آتٍ مِّنْ رَّبِّيْ فَقَالَ... وَقُلْ عُمْرَةٌ فِيْ حَجَّةٍ فَقَدْ دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِي الْحَجِّ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. میرے پروردگار نے یہ وحی بھیجی ہے کہ آپؐ کہہ دیں کہ عمرہ حج میں شامل ہے اور میں نے عمرہ کو قیامت تک کے لئے حج میں داخل کر دیا ہے۔[2]

۱۔ صحیح بخاری کتاب الحج، فتح الباری، ج۴، ص ۱۶۸۔ مسند احمد بن حنبل، ج۱، ص ۲۴۹ و ۳۳۲۔ سنن بیہقی، ج۴، ص ۳۴۵۔

۲۔ صحیح بخاری، ج۱، ص ۱۸۶۔ سنن ابوداؤد، ج۲، ص ۱۵۹۔ سنن بیہقی، ج۵، ص ۱۳ و ۱۴۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم پہلی بار نازل ہوا تھا کہ مکے سے دور رہنے والوں کے لئے حج مفردہ نہیں ہے بلکہ ان کے لئے حج وعمرہ دونوں کا حکم ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس حکمِ پروردگار کے متعلق رسولِ خداؐ نے سب سے پہلے حضرت عمرؓ کو ہی اطلاع دی تھی۔ (اور اس میں بھی ایک راز تھا جو بعد میں ظاہر ہوگا)۔

جب رسولِ خداؐ حاجیوں کے قافلے کو لے کر ''عسفان'' پہنچے تو جناب سراقہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ مناسکِ حج کو ہمارے لئے یوں کھول کر بیان کریں جیسے ہم آج ہی پیدا ہوئے ہوں۔

سراقہؓ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم پہلے جیسے بھی حج کرتے تھے سو کرتے تھے۔ ہمیں اپنے سابقہ طریقوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ آپؐ ہمیں یہ بتائیں کہ ہمیں اب کیا کرنا ہے؟

رسولِ خداؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس حج میں عمرہ کو داخل کردیا ہے۔ جب تم مکے پہنچ جاؤ تو خانۂ کعبہ کا طواف اور صَفا و مَروہ کے درمیان سعی اور تقصیر کرلو تو تم اِحرام سے آزاد ہوجاؤ گے۔[1]

بی بی عائشہؓ کا بیان ہے کہ کچھ اصحاب نے رسولِ خداؐ کے اس حکم پر عمل کیا اور کچھ نے نہیں کیا۔[2]

رسولِ اکرمؐ جب بطحا مکے میں پہنچے تو آپؐ نے دوبارہ اعلان کیا: مَنْ شَآءَ اَنْ یَّجْعَلَهَا عُمْرَةً فَلْیَجْعَلْهَا تم میں سے جو مکے آنے کے اِحرام کو عمرہ کا اِحرام قرار دینا چاہے وہ ایسا کرلے۔[3]

اس نکتے پر خصوصی توجّہ کی ضرورت ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کا اندازِ تبلیغ یہ ہوتا تھا کہ جو چیز لوگوں کے لئے گراں ہوتی تھی آپؐ اسے تدریجاً بیان فرمایا کرتے تھے۔ حج وعمرہ کا یکجا ہونا مہاجرینِ قریش کی صدیوں پرانی نفسیات کے خلاف تھا اس لئے رسولِ اکرمؐ نے یہ خبر سب سے پہلے حضرت عمرؓ کو اور پھر جناب سراقہؓ کو سنائی۔ پھر جیسے ہی مکے کی حدود میں آپؐ نے پہلا قدم رکھا تو تمام حجاج کے سامنے اعلان کیا کہ تم میں سے جو قربانی لے کر نہیں آیا وہ حج کی نیت کو عمرہ سے بدل سکتا ہے۔

آپؐ نے وُرودِ مکّہ کے وقت حجاج سے یہ نہیں کہا کہ ایسا کرنا واجب ہے اور جب آپؐ خانۂ کعبہ کا طواف کرچکے اور صَفا و مروہ کے درمیان سعی سے فارغ ہوگئے تو اس وقت حضرت جبرئیلِ امینؑ، اللہ تعالیٰ کا حتمی فیصلہ لے کر نازل ہوئے۔ آپؐ نے مَروہ کی سعی کے آخری چکر میں صحابہؓ سے فرمایا: تم میں سے جو قربانی لے کر نہیں آیا اسے چاہئے کہ اپنے حج کی نیّت کو عمرہ میں بدل دے اور تقصیر کے بعد اِحرام کھول دے۔

۱۔ سنن ابوداؤد، ج ۱، ص ۱۵۹۔

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَدْخَلَ عَلَیْكُمْ فِیْ حَجِّكُمْ هٰذَا عُمْرَةً فاذا قَدِمْتُم فَمَنْ تطوَّفَ بِالْبَیْتِ وَبَیْنَ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةِ فَقَدْ حَلَّ

۲۔ صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۸۹۔ صحیح مسلم، ص ۸۷۵۔ سنن بیہقی، ج ۴، ص ۳۵۶۔

۳۔ سنن بیہقی، ج ۵، ص ۴۔

جناب سراقہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! حج و عمرہ جمع کرنے کا حکم صرف اس سال کے لئے ہے یا یہ ہمیشہ کے لئے نازل ہوا ہے؟

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: نہیں! یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہے۔ پھر آپؐ نے اپنی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر فرمایا کہ عمرہ حج میں داخل ہو چکا ہے۔[1]

پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ جتنے بھی حجاج تھے سب نے زبانِ نبوت سے یہ پیغام سنا۔ البتہ پیغمبر اکرمؐ چونکہ مدینے سے قربانیاں ساتھ لے کر چلے تھے اس لئے آپؐ نے حج قران ادا کیا اور آپؐ احرام میں باقی رہے۔

وہ قریشی مہاجرین جو حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا دنیا کا بدترین گناہ سمجھتے تھے ان کو آپؐ کا یہ فرمان گراں گزرا اور انہوں نے اس کیلئے اپنے دلوں میں تنگی محسوس کی۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا: یارسول اللہؐ! اب اگر ہم اسے عمرہ سمجھ کر احرام سے باہر آجائیں تو یہ بتایئے کہ ہمارے لئے کیا چیز حلال ہوگی؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ عمرہ تمتع ہے۔ جو اپنے ساتھ قربانی نہیں لایا وہ جیسے ہی احرام سے باہر آئے گا "محل" ہو جائے گا۔ آج کے بعد عمرہ قیامت تک حج میں داخل ہو چکا ہے۔[2]

حضرت جابرؓ سے منقول ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: اَحِلُّوْا مِنْ اِحْرَامِكُمْ فَطُوْفُوْا بِالْبَيْتِ وَ بَيْنَ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةِ وَ قَصِّرُوْا وَاَقِيْمُوْا حَلَالًا حَتّٰى اِذَا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ فَاَهِلُّوْا بِالْحَجِّ وَ اجْعَلُوا الَّتِيْ قَدِمْتُمْ مُتْعَةً قَالُوْا: كَيْفَ نَجْعَلُهَا مُتْعَةً وَقَدْ سَمَّيْنَا الْحَجَّ؟ قَالَ: اِفْعَلُوْا مَا اٰمُرُكُمْ. جب تم بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کر چکو تو تقصیر کر کے احرام کھول دو اور روزِ ترویہ (۸/ ذی الحج کو) حج کا احرام باندھو اور جو عمل تم نے پہلے کیا ہے اسے حج تمتع کا عمرہ قرار دو۔ کچھ لوگوں نے رسولِ خداؐ سے کہا کہ ہم اسے عمرہ کیسے قرار دے سکتے ہیں جبکہ ہم نے میقات پر جو لبیک کہی تھی وہ تو حج کی نیت سے تھی؟ رسولِ خداؐ نے فرمایا: میں تمہیں جو حکم دے رہا ہوں تم اس پر عمل کرو۔[3]

بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: تم احرام سے باہر آجاؤ اور اپنی بیویوں سے ہمبستری کرو۔

۱۔ صحیح مسلم، ص۸۸۶ تا ۸۸۸۔ سنن ابوداؤد، ج۲، ص۱۸۳۔ سنن ابن ماجہ، ص۱۰۲۲۔ مسند احمد، ج۳، ص۳۲۔ سنن دارمی، ج۳، ص۴۴۔ سنن بیہقی، ج۵، ص۷۔ صحیح بخاری، ج۲، ص۱۲۶۔ فَشَبَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ اَصَابِعَهٗ وَاحِدَةً فِي الْاُخْرٰى وَقَالَ: "دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِي الْحَجِّ" مَرَّتَيْنِ "لَا، بَلْ لِاَبَدِ الْاَبَدِ"

۲۔ صحیح مسلم، ص۹۱۱۔ سنن ابی داؤد، ج۲، ص۱۵۶۔ سنن بیہقی، ج۵، ص۱۸۔ هٰذِهٖ عُمْرَةٌ اِسْتَمْتَعْنَا بِهَا فَمَنْ لَمْ يَكُنْ عِنْدَهُ الْهَدْيُ فَلْيَحِلَّ الْحِلَّ كُلَّهٗ فَاِنَّ الْعُمْرَةَ قَدْ دَخَلَتْ فِي الْحَجِّ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

۳۔ صحیح بخاری، ج۱، ص۱۹۰۔ صحیح مسلم، ص۸۸۴۔

اس پر کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم ایسا کیسے کریں جبکہ ہمارے اور عرفہ کے درمیان صرف پانچ دنوں کا فاصلہ باقی ہے؟

رسولِ خداؐ نے فرمایا: احرام سے باہر آ جاؤ۔

پھر آنحضرتؐ کھڑے ہوئے اور فرمایا: بَلَغَنِیْ اَنَّ اَقْوَامًا یَقُوْلُوْنَ کَذَا وَ کَذَا وَاللّٰہِ لَاَنَا اَبَرُّ وَاَتْقٰی اللّٰہِ مِنْھُمْ. یعنی مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ کچھ لوگ ایسی ویسی باتیں کر رہے ہیں۔ خدا کی قسم! میں ان تمام افراد سے زیادہ نیکی کرنے والا اور خدا کا خوف رکھنے والا ہوں۔[1]

لوگوں نے کہا: یارسول اللہؐ! کیا یہ بات زیب بھی دیتی ہے کہ ہم میں سے لوگ "منیٰ" اس حالت میں جائیں کہ ان سے منی کے قطرے ٹپک رہے ہوں؟ (یعنی بیوی سے ہمبستر ہونے کے بعد ہم منیٰ کیسے جائیں؟)

نبی اکرمؐ نے فرمایا: ہاں۔[2]

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عمرۂ تمتع کی تبلیغ کی تھی اور اس مسئلے پر آنحضرتؐ اور صحابہؓ میں جتنا تفصیلی مکالمہ ہوا تھا اتنا کسی اور مسئلے میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ آنحضرتؐ نے صحابہؓ کے تمام اعتراضات کے جواب دے کر حکمِ شرعی کی اس طرح سے وضاحت کردی تھی کہ کسی کو کبھی بھول نہیں سکتی تھی۔

رسولِ اکرمؐ کے بعد عُمرۂ تمتع پر پابندی

۱۰ھ میں رسولِ خداؐ نے مسلمانوں کو حجِ تمتع کے آداب سکھائے تھے اور اس کے کچھ عرصے بعد ہی آپ رفیقِ اعلیٰ کے پاس چلے گئے۔ آپؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے تو وہ زمانۂ جاہلیت میں دستورِ قریش کے مطابق حجِ مفردہ بجالاتے رہے۔ اگرچہ انہوں نے حجِ تمتع نہیں کیا تھا لیکن وہ حجِ تمتع سے منع بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو وہ بھی حجِ مفردہ بجالائے۔ لیکن جب ان کی حکومت مستحکم ہوگئی تو انہوں نے یہ حکم جاری کیا کہ مسلمان حج کے مہینے میں صرف حجِ مفردہ بجالائیں اور عمرہ کے لئے حج کا مہینہ گزرنے کے بعد مکہ آئیں۔

حضرت عمرؓ کا گورنرِ بصرہ ابوموسیٰ اشعری بصرہ سے بہت سے عازمینِ حج کو لیکر مکہ آیا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ میں حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیمؑ کے درمیان لوگوں کو مسائلِ حج بتا رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے

۱۔ صحیح بخاری، ج۲، ص۵۲۔ صحیح مسلم، ص۸۸۳۔ احمد بن حنبل، مسند، ج۳، ص۳۵۶۔ فتح الباری، ج۷، ص۱۰۸۔ سنن بیہقی، ج۴، ص۳۳۸۔

۲۔ صحیح مسلم، ص۸۸۴۔ سنن بیہقی، ج۴، ص۳۵۶۔ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ یَرُوْحُ اِلٰی مِنٰی وَ ذَکَرُہٗ یَقْطُرُ مَنِیًّا؟ قَالَ: نَعَمْ.

آہستہ سے مجھ سے کہا کہ "فتویٰ نہ دینا امیرالمومنین نے مناسکِ حج میں تبدیلی کردی ہے۔"

میں نے لوگوں سے کہا: امیرالمومنین آنے والے ہیں تم خود ان ہی سے مسائل دریافت کرو اور ان کا اتباع کرو۔ اتنے میں حضرت عمرؓ آگئے۔

میں نے ان سے کہا: اے امیرالمومنین! کیا آپ نے مناسکِ حج میں کچھ تبدیلی کردی ہے؟

میری بات پر حضرت عمرؓ کو غصہ آگیا اور انہوں نے کہا: اگر ہم چاہیں کہ قرآن مجید پر عمل کریں تو قرآن حج اور عمرہ کو علیحدہ علیحدہ ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ (ان کا اشارہ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ کی طرف تھا) تمہیں حج کو عمرہ سے جدا رکھنا چاہئے اور حج کے مہینے میں حج اور باقی مہینوں میں عمرہ کرنا چاہئے۔ قریش کے ہاں فصلیں نہیں ہوتیں اور ان کی کمائی کا ذریعہ تو بس یہی ہے کہ لوگ ایک سال میں دو مرتبہ مکہ آئیں تاکہ ان کی زندگی میں آسانی پیدا ہو اور وہ گزر بسر کرسکیں۔ (مقصد یہ ہے کہ جب لوگ دو مرتبہ مکہ آئیں گے تو قریش کی تجارت دوگنی ہوگی اور اگر لوگ سال میں ایک بار آکر حج اور عمرہ کر کے چلے جائیں گے تو قریش کہاں سے کھائیں گے؟)

امام علی علیہ السلام نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: رسولِ خداؐ نے حج اور عمرہ کو جمع کیا تھا۔

حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ امام علیؑ کی دلیل بڑی وزنی اور منطقی ہے تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ امام علیؑ کو دیکھ کر دوسرے لوگوں نے بھی اعتراضات شروع کردیئے چنانچہ انہوں نے سرکاری حکم جاری کرتے ہوئے کہا: مُتْعَتَانِ كَانَتَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَاَنَا اَنْهٰى عَنْهُمَا وَاُعَاقِبُ عَلَيْهِمَا مُتْعَةُ الْحَجِّ وَ مُتْعَةُ النِّسَآءِ. رسولِ خداؐ کے عہد میں دو متعہ جائز تھے، یعنی مُتعةُ الحج اور مُتعةُ النساء اور میں ان دونوں سے منع کر رہا ہوں اور جو اُن پر عمل کرے گا سزا پائے گا۔[1]

حضرت عمرؓ کی اس گفتگو سے مکتبِ خلفاء کی وہ روایت باطل ہوجاتی ہے کہ رسولِ خداؐ نے حج مفردہ کی ادائیگی کا حکم دیا تھا۔

امام علی علیہ السلام نے خلیفہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسلام کے شرعی حکم کی وضاحت کردی اور اپنی تنقید سے تمام حجاج کو عملی طور پر بتا دیا کہ اسلام کا حقیقی حکم کچھ اور ہے اور خلیفہ کا حکم کچھ اور ہے۔

خلیفہ کے سخت حکم کے بعد عملی طور پر حج تمتع ختم ہوگیا اور جو بھی حج پر جاتا تھا وہ صرف حج کر کے آجاتا تھا اور ماہ صفر گزرنے کے بعد عمرہ ادا کرنے دوبارہ مکہ جاتا تھا۔

۱۔ بدایة المجتهد، ابن رشد قرطبی، ج۱، ص۳۴۶۔ محلی، ابن حزم، ج۷، ص۱۰۷۔ مغنی، ابن قدامہ، ج۷، ص۵۲۷۔ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج۳، ص۱۶۷۔ زاد المعاد، ج۲، ص۲۰۵۔

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ برسرِ اقتدار آئے اور ان کو سیرتِ شیخین کی پیروی کے وعدے پر حکومت نصیب ہوئی تھی لہٰذا وہ سنتِ عمرؓ سے انحراف کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے بھی سنتِ عمرؓ پر عمل جاری رکھا لیکن خود اُن کے اندر حضرت عمرؓ جیسا رعب و دبدبہ نہیں تھا اور جب ان کی خلافت کے چھ سال گزر گئے تو ان کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑگئی تھی اور لوگ ان کی بہت سی غلط پالیسیوں سے نالاں تھے۔[1]

امام علی علیہ السلام نے موقع کو غنیمت جانا اور ان سے کئی بار حجِ تمتع کے اثبات کیلئے مباحثے کیے۔

عبداللہ بن زبیرؓ کا بیان ہے:

حج کے ایام میں حضرت عثمانؓ اور کچھ اہلِ شام جُحفہ میں بیٹھے تھے کہ حجِ تمتُّع کی بحث چھڑ گئی۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ ادا نہ کرو۔ اگر تم عمرہ کو مؤخر کردو گے تو تمہیں سال میں دو مرتبہ بیت اللہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوگا اور یہ بہتر طریقہ ہے۔

جب یہ گفتگو ہو رہی تھی تو اس وقت امام علیؑ جنگل میں اپنے اونٹوں کو گھاس کھلا رہے تھے۔ کسی نے ان کو حضرت عثمانؓ کی گفتگو کی اطلاع دی۔ امام علیؑ وہاں سے سیدھے حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور ان کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا کہ کیا تم لوگوں کو سنتِ رسولؐ پر عمل کرنے سے روک رہے ہو اور اُس عبادت سے منع کر رہے ہو جس کی ادائیگی کی اجازت اللہ نے قرآن میں دی ہے؟

پھر امام علیؑ نے لوگوں کے سامنے حجِ تمتّع کے عمرہ کا اِحرام باندھا اور حج اور عمرہ کو مقرون کر کے رسولِ خداؐ کے فرمان کے مطابق تلبیہ کہی۔

امام علیؑ کے عمل سے حضرت عثمانؓ کو شکست ہوئی اور انہوں نے لوگوں سے کہا: میں حجِ تمتّع سے لوگوں کو نہیں روکتا البتہ یہ میری رائے ہے جو چاہے اس پر عمل کرے اور جو چاہے نہ کرے۔[2]

دوسری روایت میں ہے کہ جب جُحفہ میں شام کے حجاج سے حضرت عثمانؓ کی مذکورہ گفتگو ہوئی تو اس وقت امام علیؑ اپنے اونٹوں کو گھاس اور بھو کھلا رہے تھے کہ حضرت مقدادؓ نے آ کر آپ سے کہا کہ عثمانؓ لوگوں کو حج اور عمرہ جمع کرنے سے روک رہے ہیں۔ امام علیؑ یہ سنتے ہی اس حال میں حضرت عثمانؓ کے پاس آئے کہ چارہ ان کے ہاتھوں پر لگا ہوا تھا۔ آپؑ نے آتے ہی ان سے پوچھا: کیا تم لوگوں کو حج اور عمرہ جمع کرنے سے روکتے ہو؟

حضرت عثمانؓ نے کہا: یہ میرا نظریہ ہے۔

امام علیؑ ناراض ہو کر حج اور عمرہ کی تلبیہ کہتے ہوئے باہر آ گئے۔[3]

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیں خلافت و ملوکیت از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور خلافت و ملوکیت کا تجزیہ از ملک برکت علی۔

۲۔ مسند احمد، ج ۱، ص ۹۲۔ ۳۔ موطا مالک، ص ۳۳۶۔ البدایہ والنہایہ، ابن کثیر، ج ۵، ص ۱۲۵۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ امام علیؑ اور حضرت عثمانؓ دونوں حج کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں حضرت عثمانؓ لوگوں کو حجِ تمتع سے منع کرتے رہے۔

امام علیؑ نے ان سے فرمایا: جب عثمانؓ سوار ہوں تو تم بھی اپنی سواری پر سوار ہو جانا۔

جب پورا کارواں سفر کے لئے تیار ہوگیا تو امام علیؑ لوگوں کے سامنے آئے اور عمرۂ تمتع کی تلبیہ کہی۔ امام علیؑ کے ساتھیوں نے بھی ان کے ساتھ عمرۂ تمتع کی تلبیہ کہی۔ حضرت عثمانؓ نے کسی کو منع نہیں کیا۔

پھر امام علیؑ نے ان سے کہا: میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں کو عمرۂ تمتع سے منع کرتے ہو؟

حضرت عثمانؓ نے کہا: ہاں۔

امام علیؑ نے کہا: کیا تم نے نہیں سنا تھا کہ رسولِ خداؐ نے عمرۂ تمتع کے لئے تلبیہ کہی تھی؟

حضرت عثمانؓ نے کہا: ہاں! میں نے سنا تھا۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ حجِ تمتع کے موضوع پر جب امام علیؑ اور حضرت عثمانؓ میں بحث ہوئی تو حضرت عثمانؓ نے امام علیؑ سے ایک جملہ کہا جسے محدّثین نے نقل نہیں کیا۔ اس کے بعد محدّثین نے لکھا کہ امام علیؑ نے حضرت عثمانؓ سے کہا: تمہیں یاد ہے کہ ہم نے رسولِ خداؐ کے ساتھ حجِ تمتع ادا کیا تھا۔

حضرت عثمانؓ نے کہا: ہاں! لیکن اس وقت ہم خوف زدہ تھے۔[2]

(خدا جانے کہ ستر ہزار صحابہ کی موجودگی میں انہیں کس بات کا خوف تھا جبکہ مکہ بھی فتح ہو چکا تھا اور رسولِ خداؐ بھی موجود تھے۔ اس کے باوجود خطرے کا کیا جواز تھا؟)

ایک اور روایت میں ہے کہ مقام عسفان پر امام علیؑ اور حضرت عثمانؓ کے درمیان تبادلۂ خیال ہوا۔ حضرت عثمانؓ حجِ تمتع سے منع کر رہے تھے۔ امام علیؑ نے ان سے فرمایا: کیا تم رسولِ خداؐ کی سنّت سے منع کر رہے ہو؟

حضرت عثمانؓ نے کہا: آپ ہمیں معاف رکھیں۔

امام علیؑ نے فرمایا: مگر میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ پھر آپ نے حج اور عمرہ دونوں کے لئے لبیک کہی۔[3]

امام علیؑ نے اپنے مجاہدانہ کردار سے لوگوں کو اسلامی حکم سے مطلع کیا اور معاشرے کو سنتِ رسولؐ واپس لوٹائی۔ جب آپ کو حکومت ملی تو آپ نے حجِ تمتع کو باقی رکھا اور آپ اپنے امیر حج کو حکم دیتے تھے کہ وہ حجِ تمتع بجالائے۔

۱۔ سنن نسائی، ج ۲، ص ۱۵۔ مسند احمد، ج ۱، ص ۵۷۔ البدایہ والنہایہ، ابن کثیر، ج ۵، ص ۱۳۶۔

۱۔ صحیح مسلم، ص ۸۹۶۔ مسند احمد، ج ۱، ص ۹۷۔ سنن بیہقی، ج ۵، ص ۲۲۔

۲۔ صحیح مسلم، ص ۸۹۷۔ صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۹۰۔ مسند احمد، ج ۱، ص ۱۳۶۔ سنن بیہقی، ج ۵، ص ۲۲۔ مسند طیالسی، ج ۱، ص ۱۶۔

امام علیؑ کی المناک شہادت کے بعد معاویہ نے خلفائے ثلاثہ کی سنّت کو زندہ کرنے کے لئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے لیکن وہ اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکا کیونکہ امام علیؑ کی جرأت و شہامت کی وجہ سے لوگوں میں اتنی اخلاقی جرأت پیدا ہو چکی تھی کہ وہ معاویہ اور اس کے ہمنواؤں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنتِ نبوی کو بیان کر سکیں اور اس کے سامنے سیرتِ شیخین کا انکار کر سکیں۔

بطورِ مثال یہ روایت ملاحظہ فرمائیں:

سعد بن ابی وقاص نے حجِ تمتع کی تلبیہ کہی تو معاویہ کی فوج کے سالار ضحاک بن قیس نے کہا کہ حج اور عمرہ کو جمع وہی کر سکتا ہے جسے خدا کے فرمان کا علم نہ ہو۔

سعد نے کہا: بھتیجے! تو نے بہت بری بات کہی۔

ضحاک نے کہا: عمر بن الخطابؓ نے اس سے منع کیا تھا۔

سعد نے کہا: مگر رسول اللہؐ نے ایسا کیا تھا اور ہم نے آنحضرتؐ کے ساتھ حج اور عمرہ کو جمع کیا تھا۔[1] جبکہ اُس وقت یہ (معاویہ) کافر تھا۔[2]

اس واقعے میں یہ نکتہ انتہائی دلچسپ ہے کہ سعد بن ابی وقاص نے معاویہ کے بارے میں بڑی جرأت دکھائی جبکہ اسی سعد کے متعلق ہم بتا چکے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے حدیث کی نشر و اشاعت پر پابندی عائد کی تھی تو اس نے مدینہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ تک کے سفر میں رسول اللہؐ کی ایک بھی حدیث بیان نہیں کی تھی۔ آخر سعد میں یہ جرأت کہاں سے آ گئی تھی؟

اصل بات یہ ہے کہ اس میں یہ جرأت امام علی علیہ السلام کے موقف کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اگر امام علیؑ نے حضرت عثمانؓ کے سامنے جرأت نہ دکھائی ہوتی تو دین کا یہ حکم ہمیشہ کے لئے سینوں میں دفن ہو جاتا۔ امام علیؑ نے اپنی جرأت سے حجِ تمتع کی تلبیہ کہہ کر اسلامی شریعت کے ایک اَبدی حکم کو نہ صرف ہمیشہ کے لئے زندگی عطا کی بلکہ دوسروں میں بھی جرأتِ اظہار پیدا کی۔

ہمیں کو جرأتِ اظہار کا سلیقہ ہے
صدا کا قحط پڑے گا تو ہم ہی بولیں گے

معاویہ نے خلفائے ثلاثہ کی سنت کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی آخری کوشش کرتے ہوئے لوگوں سے کہا:

اے لوگو! یہ بتاؤ کیا رسولِ خداؐ نے حج اور عمرہ جمع کرنے سے منع نہیں کیا تھا؟

۱۔ موطا مالک، ج ۱، ص ۳۴۴۔ سنن نسائی، ج ۲، ص ۱۵۔ سنن ترمذی، ج ۴، ص ۳۸۔ سنن بیہقی، ج ۵، ص ۱۷۔

۲۔ صحیح مسلم، ص ۸۹۸۔ البدایہ والنہایہ، ابن کثیر، ج ۵، ص ۱۲۷ و ۱۳۵۔

لوگوں نے کہا: نہیں! آنحضرتؐ نے منع نہیں کیا تھا۔

ہمیں مکتبِ خلفاء کے علماء کی رَوِش پر تعجب ہوتا ہے کہ اس تاریخی حقیقت کے باوجود کہ حجِ تمتّع امام علیؑ کی کوششوں سے دوبارہ رائج ہوا تھا انہوں نے امام علیؑ پر یہ بہتان لگایا کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا: بُنَیَّ اَفْرِدِ الْحجَّ. بیٹا! حجِ مفردہ بجالانا۔ (یعنی ایک سفر میں حج اور عمرہ کو جمع نہ کرنا)۔

اس روایت کے جھوٹا ہونے پر وہ متعدد روایات دلالت کرتی ہیں جن سے کتبِ حدیث بھری ہوئی ہیں اور ان میں سے چند روایات ہم نے یہاں بھی بیان کی ہیں کہ امام علیؑ نے حضرت عثمانؓ سے اس مسئلے پر کھل کر اختلاف کیا تھا اور ان کی ممانعت کے باوجود انہوں نے حجِ تمتّع کے لئے تلبیہ کہی تھی۔

امام علیؑ کی بیان کردہ احادیث کی وجہ سے حجِ تمتّع کو بقا نصیب ہوئی اور یہ آپ ہی کا احسان ہے کہ آج مکتبِ خلفاء کا ایک گروہ ــــ بالخصوص وہابی ــــ حجِ تمتّع ہی بجالاتا ہے۔

خلفاء کے غلَط فیصلوں کی اِصلاح

امام علی علیہ السلام نے خلفاء کے حجِ تمتّع کے غلَط موقف سے ہی اختلاف نہیں کیا تھا بلکہ آپؑ نے خلفاء کے اَور بھی بہت سے غلَط فیصلوں کی اِصلاح کی تھی اور ان کی رہنمائی کی تھی۔ ہم یہاں بطورِ نمونہ صرف دو واقعات پیش کرتے ہیں۔

(۱) ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک حاملہ عورت کو سنگسار کرنے کیلئے لے جایا جارہا تھا۔ راستے میں امام علیؑ سے حکومتی اہلکاروں کی ملاقات ہوگئی۔ جب آپ کو واقعات کا علم ہوا تو آپ نے ان سے فرمایا کہ اسے واپس عمرؓ کے پاس لے جاؤ۔ وہ اس عورت کو واپس لے آئے۔ امام علیؑ بھی وہاں پہنچے اور آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: اس عورت پر زنا کی وجہ سے حد جاری کرنا تو صحیح ہے لیکن اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کا کیا قصور ہے؟ جب تک اس کے بچہ پیدا نہ ہوجائے اس وقت تک اس پر حد جاری نہیں کی جاسکتی۔ جب وضعِ حمل ہو جائے تب تم اس پر حد جاری کرنا۔[1]

(۲) ایک مرتبہ ایک دیوانی عورت کو سنگسار کرنے کے لئے لے جایا جارہا تھا کہ امام علیؑ کا وہاں سے گزر ہوا۔ آپ نے اہلکاروں سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟ جب آپ کو واقعات کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا: اسے خلیفہ کے پاس واپس لے جاؤ۔ پھر آپ بھی وہاں آئے اور آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: کیا تمہیں رسولِ خداؐ کا وہ قول یاد نہیں کہ ''دیوانے کے لئے کوئی حکم نہیں جب تک وہ ہوش وحواس میں نہ آجائے، خوابیدہ کے لئے کوئی حکم نہیں جب تک وہ بیدار نہ ہوجائے اور کمسن کے لئے کوئی حکم نہیں جب تک وہ بالغ نہ ہوجائے؟''

۱۔ محبّ طبری، الریاض النضرہ، ج ۲، ص ۱۹۶۔ محمد بن طلحٰہ شافعی، مطالب السؤل، ص ۱۳۔

حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں! پھر انہوں نے اس عورت کو آزاد کرنے کا حکم دے دیا۔[1]

خلفائے ثلاثہ کے دور کی تاریخ اس طرح کے واقعات کے ذکر سے لبریز ہے اور ایسے ہی واقعات کی بنا پر حضرت عمرؓ کو کئی بار یہ کہنا پڑا تھا کہ لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَکَ عُمَرُ اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔

قرآن وسنّت کی طرح سیرتِ شیخین کو اَحکام کا سرچشمہ قرار دینا

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں خلفاء نے اپنے اپنے دور میں حسبِ منشاء اسلامی اَحکام میں تغیّر وتبدّل کیا تھا اور مسلمانوں کو مجبور کیا تھا کہ وہ ان کے اجتہاد کی پیروی کریں۔

کچھ لوگوں نے حکومت کے جبر کی وجہ سے اور کچھ نے مال و منصب کے لالچ میں ان کی پیروی کی تھی۔ ساکنانِ مدینہ — صحابہ و غیر صحابہ — بالخصوص وہ جن کا تعلق قبائلِ انصار سے نہیں تھا اسلام سے پہلے مہینوں تک گوشت اور گندم جیسی غذا سے محروم تھے۔ وہ کھاری یا کڑوا پانی پیتے تھے اور سختی میں زندگی گزارتے تھے۔ ایسے ہی کچھ لوگوں کو جب خلیفۂ دوم اور خلیفۂ سوم کی طرف سے مصر، شام، عراق اور ایران میں سیاسی اور انتظامی عہدوں پر مقرر کیا گیا تو دیکھتے ہی دیکھتے ان کے شب و روز بدل گئے اور وہ غربت کی لکیر سے امارت کی بلندیوں تک جا پہنچے۔ علاوہ ازیں خلفاء گاہے بگاہے اپنے وفاداروں پر عنایاتِ خسروانہ بھی کیا کرتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ لوگ خلیفہ سے جب کبھی کچھ مانگتے تو وہ انہیں محروم نہیں رکھتے تھے۔ یوں بہت سے معمولی لوگ خلفاء کی نوازشات کی وجہ سے بہت کچھ بن گئے۔ بعض لوگ تو اس قدر دولت مند ہوگئے کہ جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ایسے ہی مراعات یافتہ طبقے میں ابوہریرہ، عمرو بن العاص اور ابوموسیٰ اشعری شامل تھے۔ اس لئے خلفاء کے مراعات یافتہ اس طبقے کو خلفاء کی اطاعت پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا؟ اسلامی حکومت میں ہونا تو یہ چاہئے کہ حق کی پاسداری اور قانون کی پابندی کے سوا کوئی شخص کسی اور بات کے لئے مجبور نہ ہو حتیٰ کہ خود خلیفہ کی ذاتی اور شخصی خوشی کی رعایت کا بھی کوئی شخص پابند نہ ہو۔ حکومت کی یہی وہ صورت تھی جو بدل گئی۔ لوگوں کے لئے صرف خلیفہ کی خواہشوں اور مصلحتوں کا خیال رکھنا اور ان کا احترام کرنا ہی ضروری رہ گیا تھا۔ محروم طبقات خوف و جبر کی فضا میں خلفاء کی اطاعت پر مجبور تھے کیونکہ صرف خلیفہ کا ہی حکم چلتا تھا حتیٰ کہ خلیفہ کے حکم کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث وسنّت کو بھی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں حجۃ الوداع میں کم از کم ستر ہزار افراد شریک تھے اور سب نے رسولِ اکرمؐ کی زبانی حجِ تمتع کے احکام سنے تھے۔ لیکن جب خلیفۂ دوم نے حجِ تمتع پر پابندی عائد کی تو ان کے حکم کے

۱۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۱، ص ۱۴۰ و ۱۵۲۔ مستدرک حاکم، ج ۴، ص ۳۸۹۔ سنن ابوداؤد، ج ۴، ص ۱۳۹۔

مقابلے میں سنّتِ رسولؐ کو فراموش کردیا گیا اور خلیفہ کے حکم کی اطاعت ہونے لگی۔ آج سیکڑوں برس بعد بھی مکتبِ خلفاء کی اکثریت عمرہ کو حج کے ساتھ ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کی شخصیت اتنی بلند و بالا ہوچکی تھی کہ انہوں نے اپنی زبانی خود کہا تھا: ''آج خدا کے سوا کوئی مجھ سے بلند نہیں ہے۔'' [۱]

خلیفۂ ثانی کا ہر قول و فعل اسلام کا قانون اور سنّت ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد چھ افراد پر مشتمل شوریٰ میں سے اس کی بیعت کی گئی جس نے یہ اقرار کیا تھا کہ وہ قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ ''سیرتِ شیخین'' کی بھی پابندی کرے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ سیرتِ شیخین کو اسلام کا مأخذ قرار دینا اسلام کیلئے تحریف سے بھی زیادہ نقصان دِہ ثابت ہوا کیونکہ یہ بات عین ممکن ہے کہ ایک حاکم — سنّتِ پیغمبرؐ کے خلاف کوئی حکم دے تو اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کے حکم کو ترک کر کے دوبارہ سنّتِ رسولؐ پر عمل پیرا ہوجائیں لیکن اگر حاکم کے متعلق یہ نظریہ قائم کرلیا جائے کہ اس کا ہر حکم بھی قرآن و سنّت کے مساوی ہے تو پھر اس کا حکم اس کے مرنے کے بعد بھی معاشرے میں جاری و ساری رہے گا۔ خلفائے ثلاثہ نے بھی اپنے ذاتی فکر و اجتہاد سے بہت سے احکامات کو رواج دیا تھا۔ اگر ان کے احکامات کو شریعت کا مأخذ تسلیم نہ کیا جاتا تو ممکن تھا کہ ان کے بعد ان کے احکامات بھی متروک ہوجاتے۔ لیکن یہاں شخصیت پرستی نے ذہنوں کو اتنا فتح کرلیا تھا کہ خلفاء کے جملہ احکام کو بھی جزوِ دین مان لیا گیا اور بعد میں آنے والے خلفاء نے اپنے پیشروؤں کی اقتدا کو دین کا حصہ قرار دیا تھا۔

اس سلسلے میں خطرناک رَوِش یہ اختیار کی گئی کہ دَورِ معاویہ میں خلفاء کے احکام کو شریعت کا حصہ بنانے کے لئے جھوٹی احادیث تیار کی گئیں مثلاً یہ کہا گیا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے: **عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ.** تمہیں میری اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنا چاہئے۔ [۲]

اس حدیث کو اگر صحیح مان لیا جائے تو پھر شریعت اسلام کے تین ماخذ ماننا پڑیں گے:

(۱) قرآن (۲) سنتِ رسولؐ (۳) سنتِ خلفائے ثلاثہ۔

اسی طرح کی ایک اور حدیث یہ گھڑی گئی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: **مَثَلُ اَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِاَيِّهِمِ اقْتَدَيْتُمِ اهْتَدَيْتُمْ.** میرے صحابہ کی مثال ستاروں جیسی ہے تم جس کی اقتدا کروگے ہدایت پالوگے۔ [۳]

۱۔ طبری، تاریخ الامم والملوک، ج۱، ص۲۷۶۴، در سیرت عمرؓ۔

۲۔ مسند احمد، ج۴، ص۱۲۶۔ سنن دارمی، ج۱، ص۴۴۔

۳۔ محمد بن احمد ذہبی، میزان الاعتدال، ج۱، ص۴۱۳ و ۶۰۷۔ ابن حجر عسقلانی، لسان المیزان، ج۲، ص۵۸۸۔

اس طرح کے "مقدمات" سے خلفاء کے اعمال سنّت کا حصہ بن گئے حتیٰ کہ سنتِ رسولؐ کے علی الرغم واجب الاجراء ہوگئے اور مکتبِ خلفاء میں خلفاء کو مجتہد علی الاطلاق کا درجہ دینے کے بعد یہ عقیدہ قائم کرلیا گیا کہ خلفاء کے اجتہادات بھی دین کا حصہ ہیں اور یوں خلفاء کو بھی خدا اور رسولؐ کی طرح قانون ساز کا درجہ دیدیا گیا۔ خلفاء کے اجتہادات کے اثرات آج بھی اسلامی معاشرے میں دیکھے اور محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

حضرت امیرؑ اور ان کی نسل سے ہونے والے ائمہؑ نے اپنی انتھک کوششوں سے لوگوں کو صحیح اسلام کا راستا تو دکھایا لیکن وہ لوگوں کو جبراً صحیح راستے پر چلا نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ آج مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت خلفاء کے اجتہادات پر کاربند دکھائی دیتی ہے۔

امام علیؑ نے اپنے ایک خطبے میں سابقہ خلفاء کی طرف سے احکام میں تبدیلی کا شکوہ تو کیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا کہ میں ان غلطیوں کی نشاندہی تو کرسکتا ہوں لیکن انہیں جبراً صحیح نہیں کرسکتا۔

ذیل میں ہم تبدیل شدہ احکام کی ایک مختصر فہرست پیش کرتے ہیں:

تبدیل شدہ احکام

(۱) مقامِ ابراہیمؑ کی تبدیلی: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف تعمیر کیا اور اس کی دیواریں آپ کے قد سے اونچی ہوگئیں تو اسے مزید اونچا کرنے کے لئے آپ کو ایک پتھر پر کھڑا ہونا پڑا۔ آج بھی اس پتھر پر آپ کے قدموں کے نشان ثبت ہیں۔ رسولِ خداؐ کے زمانے میں وہ پتھر بیت اللہ شریف کے بالکل ساتھ تھا اور قرآن مجید میں اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى. مراسمِ حج میں طواف مکمل کرنے کے بعد مقامِ ابراہیمؑ پر نماز پڑھو۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۵)

قارئین کرام! اس وقت وہ پتھر جسے قرآن میں "مقامِ ابراہیمؑ" کہا گیا ہے خانۂ کعبہ کی عمارت سے چند گز کی دوری پر نصب ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسے خانۂ کعبہ سے ہٹوا کر اس جگہ نصب کرایا تھا۔ اگر پتھر کا یہی صحیح مقام ہوتا تو معمارِ کعبہ حضرت ابراہیمؑ اس پتھر پر کھڑے ہوکر کعبے کی دیواروں کو کیسے بلند کرسکتے تھے؟

(۲) غصبِ فدک: اس کا خلاصہ صفحہ ۴۲۶ پر "مدنی مخالفین سے سلوک" کے ضمن میں بیان ہوچکا ہے۔

(۳) صاعِ پیغمبرؐ میں تبدیلی: رسولِ اکرمؐ کے دور میں زکوٰۃ کے لئے ایک مخصوص پیمانہ ہوا کرتا تھا۔ خلفاء نے اس پیمانے میں تبدیلی کی۔

(۴) جعفرِ طیارؑ کے گھر کو مسجدِ نبوی میں شامل کرنا: حضرت جعفر طیارؑ کے گھر کو ان کے ورثاء سے زبردستی

خالی کرا کر (یعنی بحق سرکار ضبط کر کے) مسجد نبوی میں شامل کر دیا گیا۔

(۵) غیر عادلانہ فیصلے: خلفاء نے منصب قضاوت میں بھی کئی تصرفات کئے۔ چونکہ وہ احکام الٰہی سے پوری طرح باخبر نہیں تھے اس لئے انہوں نے کئی غلط فیصلے کئے۔ چند مواقع پر تو امام علیؑ نے پہنچ کر ان کے فیصلوں کی اصلاح کی لیکن ہر فیصلے کے وقت امام علیؑ موجود نہیں ہوتے تھے اس لئے ان کے اکثر فیصلوں کی اصلاح نہیں ہو سکتی تھی۔

(۶) غلط شادیاں: ہم "غیر مدنیوں سے سلوک" کے ذیل میں بتا چکے ہیں کہ بہت سے قبائل نے حضرت ابوبکرؓ کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ حکومت نے ان پر مرتد ہونے کا فتویٰ لگا کر ان سے جنگ کی جس میں ہزاروں افراد کھیت رہے اور ان کے بیوی بچوں کو کنیز اور غلام بنا لیا گیا۔ پھر ان کی بیویوں کو بازاروں میں فروخت کر دیا گیا یا اپنے منظور نظر افراد میں تقسیم کر دیا گیا جبکہ ان میں ایسی بھی بہت سی عورتیں تھیں جن کے شوہر زندہ تھے اور یوں غلط شادیوں کی وجہ سے کئی ناجائز بچے پیدا ہوئے۔

(۷) طبقاتی نظام کا قیام: پیغمبر اکرمؐ کی حیات طیبہ میں مال غنیمت مجاہدین میں مساوی طور پر تقسیم ہوتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے دور میں مساوات کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔ بعض افراد کا سالانہ وظیفہ بارہ ہزار درہم جبکہ بعض کا صرف دو سو درہم تھا۔ وظائف کی اس غیر منصفانہ تقسیم سے طبقاتی نظام وجود میں آیا جس سے امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہو گیا۔

(۸) مسجد نبوی میں تبدیلی: خلفاء نے مسجد نبوی میں بھی تصرفات کئے۔ عہد رسالت میں جو دروازے بند تھے انہیں مسجد میں کھول دیا گیا اور جو دروازے پیغمبر اکرمؐ نے مسجد میں کھولے تھے انہیں بند کر دیا گیا۔

(۹) موزوں پر مسح: حضرت عمرؓ نے مقیم کے لئے ایک دن اور مسافر کے لئے تین دن تک چمڑے کے جوتوں یا موزوں پر مسح کرنے کا قانون جاری کیا۔

(۱۰) نبیذ پر سے حد کا خاتمہ: ایک خاص قسم کی شراب — نبیذ — پر سے شرعی حد ختم کر دی گئی اور کہا گیا کہ شرعی حد کا نفاذ شراب پر ہوتا ہے نبیذ پر نہیں۔

(۱۱) متعۃ الحج اور متعۃ النساء پر پابندی: اس کا ذکر تفسیر احکام کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

(۱۲) تکبیرات جنازہ میں کمی: عہد رسالت میں نماز میت میں پانچ تکبیرات کہی جاتی تھیں جبکہ حضرت عمرؓ نے چار تکبیرات کو متعارف کرایا۔

(۱۳) بسم اللہ کو بالجہر نہ پڑھنا: مکتب خلفاء کے پیروکار نماز میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کو آہستہ پڑھتے ہیں اور کچھ تو بالکل ہی نہیں پڑھتے۔ جبکہ سورۂ توبہ کے علاوہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تمام سورتوں کا

جزو ہے۔ روایات کے مطابق معاویہ بن ابی سفیان نے اپنے دورِ حکومت میں مسجد نبوی میں صحابہ کو نماز پڑھائی تھی جس میں اس نے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نہیں پڑھی تھی اور آج تک یہ سنتِ معاویہ باقی ہے۔

(۱۴) احکامِ طلاق میں تبدیلی: اسلام میں تین طلاقوں کے بعد بیوی شوہر پر حرام ہوجاتی ہے۔ یہ طلاقیں تین علیحدہ علیحدہ مجلسوں میں ہونی چاہئیں۔ شوہر دو طلاقوں کے بعد بیوی سے رجوع کرسکتا ہے۔ اگر کوئی شوہر دو طلاقوں کے بعد بھی رجوع نہ کرے اور تیسری طلاق جاری کردے تو پھر شوہر اور بیوی میں جدائی ہوجاتی ہے۔ لیکن خلفاء نے اسلام کے اس حکم کو بدل دیا اور کہا کہ اگر کوئی شوہر ایک مجلس میں اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے تب بھی طلاق مؤثر ہوگی اور شوہر اور بیوی ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے پر حرام ہوجائیں گے۔ مثلاً اگر کوئی شوہر ایک مجلس میں بیوی سے کہے کہ میں نے تجھے تین طلاقیں دیں تو بیوی اس پر حرام ہوجاتی ہے۔

(۱۵) صدقات کے احکام میں تبدیلی: خلفاء نے زکوٰۃ کی نو مخصوص چیزوں کے علاوہ گھوڑوں پر بھی زکوٰۃ لینے کا حکم جاری کیا تھا۔

(۱۶) نفلی نماز کو باجماعت ادا کرنا: امام علیؑ نے اپنے خاص اصحاب کو خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: اگر میں تحریفات کو دور کر کے اسلام کے اصلی حکم کا نفاذ کروں تو جو لشکر میرے گرد جمع ہے وہ مجھ سے علیحدہ ہوجائے گا۔ خدا کی قسم! جب میں نے لوگوں سے کہا کہ رمضان میں فرض نمازوں کے سوا باقی نمازوں کے لئے جماعت نہ کرو کیونکہ نفلی نماز کی جماعت بدعت ہے تو کچھ سپاہی جو میرے گرد لڑتے ہیں، چیخ کر کہنے لگے کہ ''اے اہل اسلام! سنتِ عمرؓ میں تبدیلی کی جارہی ہے۔ علیؑ ہمیں تراویح سے روک رہے ہیں۔'' مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے لشکر میں بغاوت ہی نہ پھیل جائے۔[۱]

۱۔ روضہ کافی، ۵۸ تا ۶۳۔ سیوطی، تاریخ الخلفاء، ص۱۳۶۔ اَرَاَیْتُمْ لَوْ اَمَرْتُ بِمَقَامِ اِبْرَاھِیْمَ فَرَدَدْتُہٗ اِلَی الْمَوْضِعِ الَّذِیْ وَضَعَہٗ فِیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَرَدَدْتُ فَدَکَ اِلٰی وَرَثَۃِ فَاطِمَۃَ وَرَدَدْتُ صَاعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ کَمَا کَانَ... وَرَدَدْتُ دَارَ جَعْفَرٍ اِلٰی وَرَثَتِہٖ وَھَدَمْتُھَا مِنَ الْمَسْجِدِ وَرَدَدْتُ قَضَایَا مِنَ الْجَوْرِ قُضِیَ بِھَا وَ نَزَعْتُ نِسَاءً مِنْ تَحْتِ رِجَالٍ بِغَیْرِ حَقٍّ وَرَدَدْتُھُنَّ اِلٰی اَزْوَاجِھِنَّ... وَ مَحَوْتُ دَوَاوِیْنَ الْعَطَایَا وَ اَعْطَیْتُ کَمَا کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ یُعْطِیْ بِالسَّوِیَّۃِ وَلَمْ اَجْعَلْھَا دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ... وَرَدَدْتُ مَسْجِدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ اِلٰی مَا کَانَ عَلَیْہِ وَ سَدَدْتُ مَا فُتِحَ فِیْہِ مِنَ الْاَبْوَابِ وَ فَتَحْتُ مَا سُدَّ مِنْہُ وَ حَرَّمْتُ الْمَسْحَ عَلَی الْخُفَّیْنِ وَ حَدَدْتُ عَلَی النَّبِیْذِ وَ اَمَرْتُ بِاِحْلَالِ الْمُتْعَتَیْنِ وَ اَمَرْتُ بِالتَّکْبِیْرِ عَلَی الْجَنَائِزِ خَمْسَ تَکْبِیْرَاتٍ وَ اَلْزَمْتُ النَّاسَ الْجَھْرَ بِبِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ... وَحَمَلْتُ النَّاسَ... الْقُرْاٰنَ وَعَلَی الطَّلَاقِ عَلَی السُّنَّۃِ وَاَخَذْتُ الصَّدَقَاتِ عَلٰی اَصْنَافِھَا وَ حُدُوْدِھَا... اِذًا لَتَفَرَّقُوْا عَنِّیْ وَاللّٰہِ لَقَدْ اَمَرْتُ النَّاسَ اَنْ لَا یَجْتَمِعُوْا فِیْ شَھْرِ رَمَضَانَ اِلَّا فِیْ فَرِیْضَۃٍ وَ اَعْلَمْتُھُمْ اَنَّ اجْتِمَاعَھُمْ فِی النَّوَافِلِ بِدْعَۃٌ فَتَنَادٰی بَعْضُ اَھْلِ عَسْکَرِیْ مِمَّنْ یُقَاتِلُ مَعِیْ: یَا اَھْلَ الْاِسْلَامِ غُیِّرَتْ سُنَّۃُ عُمَرَ یَنْھَانَا عَنِ الصَّلٰوۃِ فِیْ شَھْرِ رَمَضَانَ تَطَوُّعًا وَلَقَدْ خِفْتُ اَنْ یَثُوْرُوْا فِیْ نَاحِیَۃِ جَانِبِ عَسْکَرِیْ...

جی ہاں! امام علیؑ کو زیادہ دکھ تو اسی بات کا تھا کہ سیرتِ خلفاء کو قرآن و سنّت کی طرح جزوِ دین تسلیم کرلیا گیا تھا کیونکہ اس کا انجام اسلام کی نابودی کی صورت میں نکلنے کا امکان تھا اس لئے امام علی علیہ السلام نے مسلمانوں کو درس دیا کہ اسلام کا منبع و مأخذ صرف قرآن و سنّت ہے، سیرتِ شیخین اسلام کا منبع و مأخذ نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی بحث آگے آتی ہے۔

(۱۷) نژادپرستی کو رواج دینا: قرآن و سنّت تمام مسلمانوں کو حقوق اور عدلِ اجتماعی و اقتصادی کے معاملے میں یکساں قرار دیتا ہے لیکن حضرت عمرؓ نے اس معاملے میں بھی معاشرے میں طبقات پیدا کردیئے۔ انہوں نے غیر عرب شہریوں کو تیسرے درجے کا شہری قرار دیا۔ عربوں کو ان پر فوقیت دی پھر عربوں میں سے قریش کو فوقیت دی۔ اس ''پان عرب ازم'' کا اظہار انہوں نے اپنے اس حکم نامے سے کیا کہ ابولؤلؤ اور شوش و شوستر کے سابق فرمانروا ہرمزان اور اس کے چند ساتھیوں کے سوا کسی غیر عرب کو مدینے میں رہنے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ ہم ''قوم پرستی کو فروغ دینے کی پالیسی'' کے ضمن میں صفحہ۹۶ پر لکھ چکے ہیں۔

ہرمزان کو بھی انہوں نے مدینے میں اس لئے رہنے کی اجازت دی تھی کہ وہ اس سے فتوحاتِ ایران کے متعلق مشورے لیا کرتے تھے۔ انہوں نے حضرت سلمانؓ اور حضرت بلالؓ کو مدینے میں رہائش سے منع نہیں کیا تھا کیونکہ وہ دونوں صحابیِ رسولِ اکرمؐ کے زمانے سے مدینے میں رہائش پذیر تھے۔ ان افراد کے علاوہ کسی بھی غیر عرب مسلمان کو مدینے میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔

انہوں نے یہ حکم بھی جاری کیا تھا کہ کوئی غیر عرب کسی بھی عرب عورت سے شادی نہیں کرسکتا اور کوئی عرب کسی بھی قریشی عورت سے شادی نہیں کرسکتا۔ حضرت عمرؓ قریش ہی سے سپہ سالارِ لشکر مقرر کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بعد خلافت کے لئے جو شوریٰ تشکیل دی تھی اس میں بھی صرف قریش کے ہی افراد شامل تھے۔

خلیفۂ دوم کے ان اقدامات کی وجہ سے اسلامی معاشرے میں فطری وسعت ختم ہوگئی اور وہ ایک نسل پرست معاشرہ بن کر رہ گیا۔ اس طرح اسلامی معاشرے میں اور اس سے قبل کے ایرانی اور رومی معاشروں میں عملی طور پر کوئی فرق باقی نہ رہا۔ اس طرزِ عمل سے نقصان یہ ہوا کہ جو غیر عرب شہزادے، سپاہی، کاریگر اور تعلیم یافتہ افراد اسلام قبول کرتے تھے انہیں ہر طرف عربوں کی اجارہ داری نظر آتی تھی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتے تھے کہ ان کے اور اسلامی معاشرے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اسلام کی ابتدائی جنگوں کے بعد حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ ایرانی سرحد کے قریب کوفہ و بصرہ میں نئے شہر بسائے جائیں اور مصر میں اسکندریہ کے قریب نیا شہر آباد کیا جائے۔ جب نئے شہر بس گئے تو حضرت عمرؓ نے ان شہروں میں عربوں کو رہائش دی لیکن قریش کو مدینے ہی میں رکھا اور مدینے کی اراضی بھی ان میں تقسیم کردیں۔

سعد بن ابی وقاص، عمرو بن عاص، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عثمان کے مدینے سے باہر جانے پر پابندی عائد کردی۔[۱] یعنی آج کل کی زبان میں ان کے نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ پر تھے۔ اور ان لوگوں کو جن پر انہیں پورا اعتماد تھا مختلف انتظامی عہدوں پر فائز کر کے باہر بھیجا۔

آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ امام علیؑ نے کس طرح نسل پرستانہ معاشرے کو تبدیل کیا اور کس طرح اشرافیہ کو عوامی طبقے میں تبدیل کیا؟ حالانکہ ان کے ان ہی اقدامات کی وجہ سے ان پر جمل وصفین کی جنگیں مسلط کی گئیں مگر ان تمام مشکلات کے باوجود انہوں نے اسلامی عدل و انصاف کو رائج کیا اور قریش کی جھوٹی انا کے بت کو پاش پاش کردیا۔

بنی امیہ کیلئے حکومت کی راہ ہموار کرنا

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ظاہری طور پر زیادہ نام ونمود کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے دولت مندوں کی مسرفانہ پالیسیوں کو رواج نہیں دیا تھا اور وہ اشرافیہ پر بھی مکمل انحصار نہیں کرتے تھے۔ (البتہ معاویہ کے متعلق ان کی پالیسی مختلف تھی) لیکن جب حضرت عثمانؓ برسراقتدار آئے تو انہوں نے تمام کلیدی مناصب پر اپنے رشتہ داروں کو مسلط کردیا جبکہ ان کے تمام رشتہ دار فاسد اور عیاش ذہن کے مالک تھے۔ وہ حدودِ الٰہی کو کھلم کھلا پامال کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے لہٰذا وہ خلافت جو شیخین کے عہد میں قریشی خلافت تھی، حضرت عثمانؓ کے عہد حکومت میں اموی حکومت میں تبدیل ہوگئی۔

آیئے کچھ دیر کے لئے عثمانی عمال کی تخصیت کا جائزہ لیں:

حضرت عثمانؓ نے مروان بن حکم کو اپنا معتمدِ خاص مقرر کیا تھا اور اس نے کھل کر عوام پر زیادتیاں کیں۔ اس کے علاوہ اس کے بھائی اور اپنے داماد حارث بن حکم کو بازارِ مدینہ کا انچارج مقرر کیا اور وہ دکانداروں سے جبراً بھتہ وصول کیا کرتا تھا۔ شیخین نے معاویہ کو شام (سوریہ، لبنان، اردن اور فلسطین) کا گورنر مقرر کیا تھا، حضرت عثمانؓ نے اسے اس عہدے پر نہ صرف بحال رکھا بلکہ اس کی حدود میں توسیع بھی کی جبکہ عوام کو اس سے بہت سی شکایات تھیں اور ان کی شکایات کا کوئی ازالہ نہیں کیا گیا۔

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے رسولِ خداؐ کی زندگی میں اسلام قبول کیا تھا لیکن بعد میں مرتد ہوگیا تھا اور مکے بھاگ گیا تھا۔ وہ لوگوں سے کہتا تھا کہ میں جو کچھ بھی کہتا تھا محمدؐ اسے قبول کر لیتے تھے اور میرے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو قرآن میں داخل کردیتے تھے۔ فتح مکہ

۱۔ معالم المدرستین، ج۲، ص۴۵۔ کنز العمال، ج۵، ص۲۳۹، حدیث ۴۸۵۰۔

کے موقع پر رسولِ خداؐ نے جہاں تمام خون کے پیاسوں کو عام معافی دی تھی وہاں آپ نے اس کا خون مباح قرار دیا تھا اور فرمایا تھا کہ عبداللہ بن ابی سرح اگر غلافِ کعبہ سے بھی چمٹا ہوا ملے تو اسے قتل کردیا جائے۔

حضرت عثمانؓ نے سعد بن ابی وقاص کو معزول کر کے اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ یہ وہی ولید ہے جسے رسولِ خداؐ نے قبیلۂ بنی مصطلق کے صدقات وصول کرنے کے لئے مامور فرمایا تھا۔ مگر یہ اس قبیلے کے علاقے میں پہنچ کر استقبال کے لئے آنے والے ہجوم سے ڈر گیا کیونکہ اس نے ان کا جرم کیا ہوا تھا اس لئے دور ہی سے ان لوگوں سے ملے بغیر مدینہ واپس آ کر یہ رپورٹ دیدی کہ بنی مصطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا اور مجھے مارڈالنے پر تل گئے۔ رسول اللہؐ اس پر غضبناک ہوئے اور آپؐ نے ان کے خلاف ایک فوجی مہم روانہ کردی۔ قریب تھا کہ ایک سخت حادثہ پیش آ جاتا لیکن بنی مصطلق کے سرداروں کو بروقت علم ہوگیا اور انہوں نے مدینہ حاضر ہو کر عرض کیا کہ یہ صاحب تو ہمارے پاس آئے ہی نہیں ہم تو منتظر ہی رہے کہ کوئی آ کر ہم سے زکوٰۃ وصول کرے۔ اس پر سورۂ حجرات کی یہ آیت نازل ہوئی: یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَھَالَۃٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ○ اے ایمان والو! اگر کوئی بدکردار اور فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کرلیا کرو مبادا کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچادو۔ پھر تم کو اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے۔ اس آیت کے متعلق تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ کے متعلق نازل ہوئی تھی اور اس آیت کے نزول کے بعد وہ ''فاسق'' کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔

ولید نے اپنی گورنری کے دوران یہ شگوفہ کھلایا کہ بطرونی نامی ایک شعبدہ باز کو کوفہ بلوایا اور اسے اپنے فن کی نمائش کا حکم دیا۔ اہلِ شہر اس کا فن دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے۔ بطرونی نے شعبدہ کے زور پر بہت سے چشمے نکال کر دکھائے۔ پھر حاضرین میں سے ایک شخص کو اپنے پاس بلایا اور لوگوں کی نظربندی کر کے انہیں یہ منظر بھی دکھایا کہ گویا اس نے تلوار سے اُس شخص کا سر اُڑادیا ہے اور پھر کچھ منتر پڑھ کر تلوار اس مقتول کے سر پر رکھی تو وہ زندہ سلامت ہو کر اٹھ آیا۔

تماش بینوں میں ایک شخص کو جس کا نام جندب تھا بطرونی کا یہ شعبدہ پسند نہیں آیا اور اُس نے شعبدہ بازی کو خلافِ اسلام سمجھتے ہوئے چشم زدن میں اپنی تلوار سے بطرونی کا سر اُڑادیا۔

ولید کو جندب کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری اور اس نے جندب کو قتل کرنے کا حکم دیدیا لیکن جندب کا خاندان اس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا جس کی وجہ سے ولید نے اس کی سزائے موت کو قید میں تبدیل کردیا۔

ولید بن عقبہ بن ابی معیط کی غیر اخلاقی داستانیں بڑی طویل ہیں۔ ایک دفعہ ولید نے بیت المال کے خزانچی عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک لاکھ درہم کی خطیر رقم خزانے سے یہ کہہ کر نکلوائی کہ میں یہ رقم واپس کردوں گا

لیکن اس نے وہ رقم واپس نہ کی۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کو ایک خط لکھ کر حالات سے آگاہ کیا جس کے جواب میں حضرت عثمانؓ نے انہیں لکھا: تم ہمارے خزانچی ہو۔ ہم بیت المال سے جتنا چاہیں لیں تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔

جب ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کا یہ خط پڑھا تو مسجدِ کوفہ میں برسرِعام کہا: اے لوگو! میں سمجھتا تھا کہ میں تمہارے بیت المال کا خزانچی ہوں لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ میں تمہاری بجائے بنی امیہ کا خازن ہوں۔ پھر انہوں نے بیت المال کی چابیاں پھینک دیں اور کہا کہ میں بنی امیہ کا خازن بن کر نہیں رہنا چاہتا۔

چنانچہ ولید نے انہیں مدینے بھیج دیا۔ جب وہ مدینے پہنچے تو حضرت عثمانؓ نے اپنے غلام یحموم کو حکم دیا کہ انہیں تنبیہ کی جائے۔ حضرت عثمانؓ کا حکم سن کر یحموم نے ابن مسعودؓ کو اٹھا کر زور سے زمین پر پٹخ دیا جس کی وجہ سے ابن مسعودؓ اپاہج ہوگئے۔ وہ دو سال تک صاحب فراش رہے اور اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان دو سالوں میں حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ کا سرکاری وظیفہ بند رکھا۔[1]

ولید کی شراب نوشی

ولید کے ویسے تو سیاہ کارنامے بہت ہیں لیکن ہم یہاں ایک کا ذکر کر رہے ہیں۔

ولید نے اپنے ایک عیسائی دوست ابوزبید کو عقیل بن ابی طالب کا گھر خرید کر بخش دیا تھا، جہاں ولید اور ابوزبید رات بھر شراب سے دل بہلاتے تھے۔ وہ مسجد میں بھی مستی و خمار کی حالت میں آجاتے تھے۔ یوں لوگوں کو ولید کی شراب نوشی کا علم ہوگیا۔

ایک دفعہ تو حد ہوگئی کہ ولید شراب کے نشے میں دھت نمازِ فجر پڑھانے آیا اور اس نے نماز میں سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت کی بجائے یہ شعر پڑھا:

عَلِّقَ الْقَلْبُ الرَّبَابَا   بَعْدَ اَنْ شَبَّتْ وَ شَابَا

دل رباب کی محبت میں اٹکا ہوا ہے۔ آج رباب بھی جوان ہے اور دل بھی جوان ہے۔

پھر اس نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی اور پلٹ کر لوگوں سے پوچھا: اگر یہ کم ہوں تو اور پڑھاؤں؟ اس کے بعد وہ نشے میں مدہوش ہو کر گر پڑا تو لوگوں نے اس کے ہاتھ سے سرکاری مہر والی انگوٹھی اتار لی اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔

اس واقعے کی شکایات مدینہ تک پہنچیں اور لوگوں میں اس کا عام چرچا ہونے لگا۔ بہت سے چشم دید

۱۔ انساب الاشراف، ج ۵، ص ۳۶۔ کنز العمال، ج ۷، ص ۵۴۔ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۴۷۔ مستدرک، ج ۳، ص ۱۳۔

گواہ وہ انگوٹھی لے کر حضرت عثمانؓ کے پاس گئے اور ان سے ولید کی شراب نوشی کی شکایت کی اور ثبوت کے طور پر سرکاری مہر والی انگوٹھی بھی دکھائی۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے بھائی ولید کا محاسبہ تو نہ کیا البتہ شکایت کرنے والوں کو اپنے ہاتھوں سے دھکے دے کر مسجد سے نکال دیا۔

شکایت کنندگان حضرت عائشہؓ کے دروازے پر گئے اور ان سے خلیفہ کی بے انصافی کی شکایت کی۔ اس زمانے میں بی بی عائشہؓ کے حکومت سے تعلقات بیحد کشیدہ تھے۔ چنانچہ بی بی عائشہؓ نے اپنا سر حجرے سے نکال کر مسجد کی طرف کیا اور حضرت عثمانؓ سے کہا: حدودِ شرعی کو ترک کر رہے ہو اور گواہوں کو ذلیل کر رہے ہو۔ مگر شکایت کنندگان کی کسی نے دادرسی نہ کرائی۔

جب امام علیؑ نے خدائی احکام کو یوں پامال ہوتے دیکھا تو حضرت حسنؑ کے پاس تشریف لے گئے اور ان پر زور دیا کہ وہ ولید پر شراب نوشی کی حد جاری کریں۔ امام علیؑ کے پُرزور مطالبے پر حضرت عثمانؓ کو مجبور ہونا پڑا اور مجمع عام میں ولید پر مقدمہ قائم کیا گیا۔ حضرت عثمانؓ نے ولید کو نمدے کی طرح سے موٹا اونی لباس پہنوایا تاکہ اس پر کوڑے کم سے کم اثر کریں اور اسے حد شرعی کے لئے باہر لے آئے۔ پھر بڑے رعونت آمیز لہجے میں کہا: جسے ولید پر حد جاری کرنے کا شوق ہو وہ آئے اور اس پر حد جاری کرے۔

حد جاری کرنے کے لئے کئی افراد اٹھے لیکن جو بھی کوڑا لے کر ولید کے پاس جاتا تو ولید اس سے کہتا: ''ذرا سوچ سمجھ کر حد جاری کرنا کہیں خلیفہ تجھ پر غضبناک نہ ہوجائے۔'' بیسے ہی لوگ اس کا یہ جملہ سنتے تھے تو حد جاری کئے بغیر واپس آجاتے تھے۔ جب کسی میں حد جاری کرنے کی جرأت نہ ہوئی تو امام علیؑ خود اٹھے اور آپ نے کوڑا ہاتھ میں لیا۔ آپ کو دیکھ کر ولید اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ حضرت نے اسے پکڑ کر زمین پر لٹایا اور فرمایا: اگر تجھ پر حد جاری کرنے کی وجہ سے قریش مجھے اپنا جلاد سمجھتے ہیں تو بے شک سمجھتے رہیں۔[1]

اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے ولید کو معزول کر کے سعید اموی کو کوفہ کا گورنر بنادیا۔

حضرت عثمانؓ کا محاصرہ اور امام علیؑ کی ہمدردی

حضرت عثمانؓ کے رشتہ داروں نے لوگوں پر بیحد ظلم کیا اور بیت المال کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھ کر اس سے خوب استفادہ کیا۔ لوگ بنی امیہ کے رویے سے بالآخر تنگ آگئے اور پورے عالم اسلام میں حضرت عثمانؓ کی حکومت کے خلاف ایک تحریک شروع ہوگئی۔ اس تحریک کے شروع کرنے میں طلحہ و زبیر نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے فوجی چھاؤنیوں میں اس طرح کے خطوط روانہ کئے: تم جہاد کے لئے کہاں جارہے ہو، تمہارا جہاد مدینے

۱۔ اغانی، ج ۴ ص ۱۷۸۔ انساب الاشراف، ج ۵، ص ۳۳۔ مروج الذہب، ج ۲، ص ۳۳۶۔

میں ہے۔تم مدینے آجاؤ اور عثمانؓ سے جہاد کرو۔

مسلمان جو کہ عثمانی حکام کے ہاتھوں سخت نالاں تھے، ان میں سے مصر، کوفہ و بصرہ کے چند سو افراد نے حج کے موقع پر ایک دوسرے سے ملاقات کی اور آپس میں معاہدہ کیا کہ آئندہ سال جب وہ حج کے لئے آئیں گے تو حضرت عثمانؓ کو معزول کردیں گے اور اگر انہوں نے معزول ہونے سے انکار کیا تو قتل کردیں گے۔

جب وعدہ کا سال آیا تو مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جمعیت مدینے آئی اور انہوں نے اہم ناکوں پر قبضہ کر کے ایک حد تک اہل شہر کو بے بس کردیا تھا۔ بالآخر جب حضرت عثمانؓ ان کے نرغے میں گھر گئے تو انہوں نے مغیرہ بن شعبہ کو ان لوگوں سے مذاکرات کے لئے بھیجا۔ جب مغیرہ ان کے پاس آیا تو لوگوں نے کہا: اے کانے! واپس چلاجا۔ اے فاجر! واپس چلاجا۔ اے فاسق! واپس چلاجا۔ (مغیرہ بن شعبہ کانا تھا اور جب وہ بصرہ میں گورنر تھا تو اس نے وہاں ام جمیل سے زنا کیا تھا)۔

اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے عمرو بن عاص کو مذاکرات کے لئے بھیجا اور اس سے کہا کہ تم ان لوگوں سے کہو کہ آئندہ میں کتاب اللہ کے مطابق عمل کروں گا اور انہیں جو تکالیف پہنچی ہیں ان کے لئے میں معذرت خواہ ہوں اور مستقبل میں ان کی تلافی کی جائے گی۔

عمرو بن عاص جب ان کے پاس آیا اور انہیں سلام کیا تو محاصرہ کرنے والوں نے کہا: خدا تجھ پر سلامتی نہ بھیجے۔ اے دشمن خدا! تو واپس چلاجا۔ فرزندِ نابغہ! تو واپس چلاجا۔ تو ہماری نظر میں امین اور قابلِ بھروسا نہیں ہے۔ (عمرو بن عاص کی ماں نابغہ تھی جو کہ اپنی بدکاری کی وجہ سے پورے مکے میں مشہور تھی)۔

جب عمرو بن عاص بھی ناکام لوٹا تو حضرت عثمانؓ نے کہا کہ اب صرف علیؑ بن ابی طالب ہی اس کام کو سرانجام دے سکتے ہیں، انہیں یہاں بلاؤ۔ الغرض امام علیؑ آئے تو حضرت عثمانؓ نے ان سے کہا: آپ ان لوگوں کے پاس جائیں اور انہیں کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کی دعوت دیں۔ یعنی آپ ان سے کہیں کہ ہم آئندہ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ پر عمل کریں گے۔

امام علیؑ نے کہا: میں اس شرط پر ان لوگوں کے پاس جاؤں گا کہ پہلے آپ یہ وعدہ کریں کہ جو کچھ اُن کے ساتھ طے ہوگا آپ اس کی پابندی کریں گے۔

حضرت عثمانؓ نے کہا: ہاں! ایسا ہی ہوگا۔

اس کے بعد امام علیؑ نے ان سے پختہ عہد لیا۔ پھر آپ بلوائیوں کے پاس تشریف لے گئے۔ بلوائیوں نے آپ سے بھی کہا کہ آپ واپس چلے جائیں۔

امام علیؑ نے فرمایا: میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہیں کتاب اللہ کے تحت

تمام حقوق دیئے جائیں گے اور جو تمہاری حق تلفی ہوئی ہے اس کی بھی تلافی کی جائے گی۔

بلوائیوں نے کہا: کیا آپ ضمانت دیتے ہیں؟

امام علیؑ نے فرمایا: ہاں! میں ضامن ہوں۔

بلوائیوں نے کہا: اب ہم راضی ہیں۔

اس کے بعد امام علیؑ بلوائیوں کے سرکردہ افراد کو حضرت عثمانؓ کے پاس لے گئے اور ان سے مذاکرات کئے۔ مذاکرات کے نتیجے میں یہ طے پایا کہ ان کے مطالبات منظور کئے جاتے ہیں اور ان کے تلف شدہ حقوق کی تلافی کی جائے گی۔ مصر کے گورنر عبداللہ بن ابی سرح کو معزول کر کے محمد بن ابی بکر کو حکومت مصر کا پروانہ دیا گیا۔

مصری اپنے مطالبات منوا کر خوش خوش اپنے وطن روانہ ہوگئے۔ راستے میں انہوں نے دیکھا کہ حضرت عثمانؓ کا ایک غلام اونٹ پر سوار ہو کر بڑی تیزی کے ساتھ مصر کی طرف جا رہا ہے۔ انہوں نے اس کو روکا اور کہا کہ تمہارے پاس کوئی سرکاری حکم نامہ ہے تو دکھلاؤ۔ غلام نے کسی بھی حکم نامہ سے انکار کیا۔ جب اس کی تلاشی لی گئی تو کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔

آخر کار اس کی مشک کی تلاشی لی گئی تو مصری یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پانی میں ایک شیشی تھی جس کا منہ تختی سے بند کیا گیا تھا۔ جب انہوں نے اس شیشی کا منہ کھولا تو اس میں سے موم جامہ کیا ہوا ایک خط برآمد ہوا۔ یہ خط گورنر مصر عبداللہ بن ابی سرح کے نام تھا اور اس میں لکھا تھا کہ مصری شریر آرہے ہیں۔ جیسے ہی یہ تمہارے پاس پہنچیں تو محمد بن ابی بکر سمیت ان کے سرغنوں کو قتل کر دو۔ خط کے آخر میں سرکاری مہر ثبت تھی۔

مصریوں نے آپس میں کہا کہ عثمانؓ نے ہم سے بدعہدی کی ہے لہٰذا ہمیں مصر جانے کی بجائے واپس مدینے جانا چاہئے۔ چنانچہ یہ لوگ مدینے واپس آئے اور انہوں نے آتے ہی حضرت عثمانؓ کے گھر کا دوبارہ محاصرہ کر لیا اور اس اثناء میں بی بی عائشہؓ طلحہ اور زبیر بلوائیوں کو قتل عثمانؓ پر برانگیختہ کرتے رہے۔

امام علیؑ نے اس کڑے وقت میں بھی حسنین کریمینؑ کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر مامور کیا۔ (اسی لئے قاتلین عثمانؓ نے دروازے کی بجائے عقبی دیوار پھاند کر انہیں قتل کیا تھا) جب بلوائیوں کی طرف سے محاصرے میں شدت پیدا ہوئی تو حضرت عثمانؓ نے اپنی چھت سے پکار کر کہا: کیا کوئی ایسا نہیں جو میری طرف سے علیؑ کو یہ پیغام پہنچائے کہ ہم پیاسے ہیں اور وہ ہمیں پانی بھجوائیں۔ جب امام علیؑ کو یہ پیغام ملا تو آپ نے بعجلت تمام حسنین کریمینؑ اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے ان کے لئے پانی روانہ کیا۔

حضرت عثمانؓ کے متعلق امام علیؑ کا طرز عمل یہ تھا اور اس وقت ان کے دوسرے حریف بالخصوص طلحہ وہاں تک پانی بھجوانے کا شدید مخالف تھا۔ طلحہ نے بیت المال کے خازن سے خزانے کی چابیاں چھین کر اپنے

قبضے میں لے لی تھیں اور مسلمان اپنا وظیفہ حاصل کرنے کے لئے اس کے پاس جمع ہو چکے تھے۔

اس دوران امام علیؑ مدینے سے باہر اپنے باغات کی دیکھ بھال کے لئے گئے ہوئے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے امام علیؑ کے نام ایک مختصر سا خط لکھا جس میں انہوں نے یہ تحریر کیا: ہمارا تمہارا قبیلہ عبدمناف ہے۔ تمہارے ہوتے ہوئے قبیلۂ بنی تیم کا ایک شخص (طلحہ) آ کر مجھ سے ایسا ناروا سلوک کرے۔ اور آخر میں یہ شعر لکھا:

اِنْ کُنْتَ مَاْکُوْلاً فَکُنْ خَیْرَ آکِلٍ

وَاِلاَّ فَاَدْرِکْنِیْ وَ لِمَا اُمْزَقٖ

یہ خط ملتے ہی امام علیؑ طلحہ کے پاس آئے اور فرمایا: تو نے یہ کیا کیا ہے؟

اس نے کہا: اے ابوالحسن! ایک تیز و تند سیلاب آیا اور سب کچھ بہا کر لے گیا۔

امام علیؑ نے طلحہ سے مزید گفتگو کرنا مناسب نہ جانا۔ آپ بیت المال تشریف لائے اور بیت المال کے خزانے کے کوٹھے کا دروازہ توڑ دیا۔ آپ نے لوگوں کو ان کے وظائف دینے شروع کر دیئے۔ ہر شخص آتا اور آپ سے اپنا حصہ لے کر چلا جاتا۔

جیسے ہی اس واقعے کی اطلاع طلحہ کے گھر پہنچی تو جو لوگ وظیفہ کی آس لگائے اس کے گرد جمع تھے وہ اسے چھوڑ کر چل دیئے اور اپنے اپنے وظائف لے کر گھروں کو روانہ ہوگئے۔ طلحہ اکیلا رہ گیا۔ پھر وہ عذر خواہی کے لئے حضرت عثمانؓ کے پاس گیا اور ان سے معذرت طلب کی مگر انہوں نے اس کی معذرت قبول نہ کی۔

طلحہ نے کہا: یہ علی بن ابی طالبؑ کا کارنامہ ہے۔

مخالفینِ عثمانؓ پر سرسری نظر ڈالی جائے تو بی بی عائشہؓ ان میں سرِفہرست دکھائی دیتی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے درمیانی عرصے میں ان کے تعلقات میں سرد مہری پیدا ہوگئی تھی۔ پھر بی بی عائشہؓ کی مخالفت کا گراف آہستہ آہستہ بلند ہونے لگا اور حضرت عثمانؓ کے آخری ایام میں انہوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح سے عثمانؓ کا کانٹا نکل جائے تو ان کا چچازاد بھائی طلحہ خلیفہ ہو جائے۔

جس زمانے میں حضرت عثمانؓ محصور تھے اور انہوں نے ابن عباسؓ کو امیرِ حج مقرر کر کے مکے جانے کا حکم دیا تو بی بی عائشہؓ نے ابن عباسؓ سے ملاقات کی اور کہا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں فصیح زبان عطا کی ہے۔ لوگ طلحہ کے گرد جمع ہو چکے ہیں اور وہ عنقریب خلیفہ بننے والا ہے۔ اگر طلحہ خلیفہ بن گیا تو وہ اپنے ابن عم ابوبکرؓ کی سنت پر عمل کرے گا۔ لہٰذا تم لوگوں کو عثمانؓ پر حملہ کرنے سے منع نہ کرنا اور حالات کو اس کے منطقی نتیجے پر پہنچنے دینا۔

بی بی عائشہؓ کی گفتگو سن کر ابن عباسؓ ہنس دیئے اور کہا: اے ام المومنین! اگر خلافت کے منظرنامہ سے عثمانؓ ہٹ گئے تو میرے ابن عم علیؑ کے سوا کوئی بھی خلیفہ نہیں بنے گا۔

بی بی عائشہؓ نے کہا: خیر میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔ کم از کم میری خواہش تو یہی ہے۔

اس کے بعد وہ جہاں بھی جاتی تھیں لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف اکساتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ عثمانؓ نے لوگوں کو قتل کیا ہے، عثمانؓ نے یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے۔ اس نعثل کو قتل کر دو کیونکہ یہ کافر ہو چکا ہے۔

حج کے بعد انہوں نے کہا کہ جلد مدینے واپس چلو۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ لوگ طلحہ کی بیعت کر رہے ہیں۔

راستے میں ایک شخص مدینے سے آتا ہوا دکھائی دیا تو بی بی نے اس سے پوچھا: مدینے کی کیا خبر ہے؟

اس نے کہا: عثمانؓ مارے گئے۔

بی بی نے کہا: اچھا ہوا! اس کے بعد کیا ہوا؟

اس نے کہا: لوگوں نے علیؑ کی بیعت کر لی۔

بی بی سخت خفا ہو کر بولیں: مجھے مکہ لے چلو۔ عثمانؓ کی زندگی کا ایک دن علیؑ کی پوری زندگی سے بہتر تھا۔

اس نے کہا: بی بی خیر تو ہے؟ آپ ہی نے تو قتلِ عثمانؓ کا حکم دیا تھا اور آپ انہیں کافر کہا کرتی تھیں۔ اب جب لوگوں نے انہیں قتل کر دیا ہے تو آپ خفا کیوں ہیں؟

بی بی نے کچھ نہ کہا اور راستے سے ہی مکہ لوٹ گئیں۔ وہاں پہنچ کر وہ امام علیؑ کے خلاف خروج کی تیاری میں مصروف ہو گئیں اور آخر کار انہوں نے امام علیؑ سے بصرہ کے قریب جنگِ جمل لڑی۔

میں جانتا ہوں پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ نہیں

امام علیؑ اپنی خلافت میں

حضرت عثمانؓ کے قتل کے سلسلے میں ہم بتا چکے ہیں کہ وہ اقرباء پروری اور اپنے اقرباء کی بداعمالیوں کی بھینٹ چڑھے تھے۔ ان کے رشتہ دار عامۃ المسلمین پر ظلم وتشدد کرتے تھے اور جب مظلوم اپنی شکایات لے کر مرکز میں جاتے تھے تو وہاں ان کی اشک شوئی نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے اس رویئے کی وجہ سے لوگ ان سے سخت نالاں تھے۔ اسی لئے لوگوں نے ایک طویل محاصرے کے بعد انہیں ان کے گھر میں قتل کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کے بعد لوگ صرف امام علیؑ کی طرف دیکھ رہے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس وقت صرف علیؑ ہی کتاب وسنّت اور عدالتِ اجتماعی کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے بعد لوگ گروہ درگروہ امام علیؑ کے دروازے پر آئے اور آپ سے بیعت لینے کی درخواست کی اور انہوں نے امام علیؑ کے مقابلے پر بی بی عائشہؓ اور طلحہ وزبیر کے منصوبوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

اسلامی خلافت کی پوری تاریخ میں امام علیؑ ہی وہ تنہا فرد ہیں جن کی بیعت ہر قسم کے جبر کے بغیر برضا ورغبت کی گئی ہے۔ امام علیؑ کے علاوہ جتنے بھی خلفاء گزرے ہیں ان میں سے کسی کی بھی آزادانہ بیعت نہیں ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت چند افراد کی مرہونِ منت تھی۔ جب چند افراد نے بیعت کرلی تو باقی لوگوں کو لالچ اور جبر کے ذریعے ان کی بیعت پر مجبور کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت حضرت ابوبکرؓ کی وصیت کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ حضرت عثمانؓ چھ رکنی شوریٰ کے ذریعے برسراقتدار آئے۔ معاویہ نے فوجی طاقت کے بل بوتے پر حکومت حاصل کی۔ معاویہ کے بعد خلافت خالصتاً موروثی حکومت میں تبدیل ہوگئی۔ جہاں بھائی کے بعد بھائی یا باپ کے بعد بیٹا تخت نشین ہوتا تھا۔

یہاں یہ بتانا برمحل ہے کہ امام علیؑ کے برسراقتدار آنے سے احیائے دین میں بڑی مدد ملی۔ عموماً مکتبِ اہلبیتؑ کے پیروکار حکومت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حکومت کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ امام برسراقتدار ہے کہ نہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر امام کو حکومت ملے تب بھی اور اگر نہ ملے

تب بھی وہ امام، خلیفۃ اللہ، وصیِ پیغمبرؐ، مُبَیِّنِ احکام، مبلّغِ شریعت اور واجب الاطاعت ہے جبکہ مکتبِ خلفاء میں ایسا نہیں ہے۔ مکتبِ خلفاء میں صرف اہلِ حکومت کی اطاعت واجب ہے اور جب تک کوئی شخص صاحبِ اقتدار نہ ہو تو وہ یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کا مصداق قرار نہیں پاتا۔ اسی لئے اگر امیرالمومنینؑ کو ظاہری حکومت نہ ملتی تو مکتبِ خلفاء میں انہیں باقی صحابہؓ پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہوتی اور مکتبِ خلفاء کے عقیدے کے تحت ان کے قول وفعل کا کوئی وزن نہ ہوتا۔ خلافت قبول کرنے کے بعد مکتبِ خلفاء کی نظر میں امام علی علیہ السلام کو ولی الامر اور خلیفۂ راشد کا درجہ نصیب ہوا۔ (جبکہ آپ کے بعد کے حکمرانوں مثلاً یزید، مروان، عبدالملک اور ولید کو فسق و فجور کی وجہ سے خلفائے راشدین کی فہرست میں شمار نہیں کیا جاتا)۔

مکتبِ خلفاء میں مقامِ صحابیت کو بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ امام علیؑ پہلے تو صرف صحابی شمار ہوتے تھے۔ جب آپ نے خلافت قبول کی تو ان کی نظر میں آپ کے مقام میں اضافہ ہوگیا اور اس طرح آپ اسلام کی عظیم خدمات سرانجام دینے میں کامیاب ہوئے۔

امام علیؑ کی اسلامی خدمات کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

امام علیؑ کی فراست اور آپ کے تدبّر کو ہمارا سلام۔ اگرچہ آپ جانتے تھے کہ حضرت عمرؓ نے مجلسِ شوریٰ کچھ اس طرح سے تشکیل دی ہے جس کے تحت آپ کو خلافت کا ملنا ناممکن ہے لیکن اس کے باوجود آپ نے اس میں شرکت کر کے اپنے آپ کو خلافت کے امیدوار کی حیثیت سے متعارف کرایا اور شوریٰ میں آپ کی شرکت کا مقصد رسمی اقتدار کا حصول نہیں تھا بلکہ آپ اسلام کے مفاد اور اس کی بقاء کے لئے شامل ہوئے تھے۔ اگر بالفرض آپ نے شوریٰ میں شرکت نہ کی ہوتی تو حکومتی مشینری آپ کے متعلق دن رات یہی پروپیگنڈہ کرتی کہ آپ تارک الدنیا ہیں اور آپ کو اقتدار سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ امام علیؑ نے شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کر کے اور وہاں قائدانہ کردار ادا کر کے حکومت کو اس کا موقع ہی نہ دیا۔ آپ نے شوریٰ کی کارروائی سے پہلے ہی اپنے چچا عباس بن عبدالمطلبؓ کو بتادیا تھا کہ خلافت کا رخ ان سے موڑ دیا گیا ہے اور مستقبل کی خلافت بنی امیہ کو ملنے والی ہے۔ مگر اس کے باوجود آپ نے فراست اور دوراندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اس میں شرکت کی اور عالَم اسلام کے سامنے اپنے آپ کو خلافت کے اہل کے طور پر پیش کیا۔ اگر آپ نے شوریٰ میں شرکت نہ کی ہوتی تو حضرت عثمانؓ کے بعد لوگ آپ کے پاس بیعت کی درخواست لے کر ہی نہ آتے۔

اس کے علاوہ آپ نے شوریٰ میں شرکت کر کے بنی ہاشم کو اقتدار سے دور رکھنے کی حضرت عمرؓ کی پالیسی ناکام بنادی۔

امام علیؑ نے حضرت عثمانؓ کے قتل کے موقع پر مدینہ نہیں چھوڑا۔ آپ ان پرآشوب حالات میں بھی

مدینے میں ہی رہے کیونکہ بالفرض اگر آپ مدینے سے باہر چلے جاتے تو صفین کی وہ جنگ جو بعد میں ہوئی وہ بہت پہلے ہوجاتی اور مدینے میں ہی لڑی جاتی۔ معاویہ، عثمانؓ کے خون کا طلبگار بن کر مدینے پر حملہ کردیتا۔ اگر آپ مدینے میں نہ ہوتے تو لوگ طلحہ کی بیعت کر لیتے اور طلحہ کے متعلق ساری دنیا جانتی تھی کہ وہ حضرت عثمانؓ کا شدید ترین دشمن تھا اور اگر طلحہ خلیفہ بن جاتا تو معاویہ ایک بھاری لشکر لے کر مدینے کو تاراج کردیتا۔ مدینے پر قبضہ کرنا کسی بھی دور میں مشکل نہیں تھا کیونکہ مدینے کا محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ اس کا زیادہ دیر تک دفاع نہیں کیا جاسکتا۔ معاویہ کے بعد یزید نے ایک قلیل فوج کی مدد سے مدینے پر دوبارہ قبضہ کرلیا تھا اور اس کی فوج نے مدینے میں داخل ہوتے ہی قتل و غارت اور عصمت دری کے شرمناک ریکارڈ قائم کئے تھے۔

اگر امام علیؑ مدینے میں نہ ہوتے اور آپ کی عدم موجودگی کی وجہ سے طلحہ خلیفہ بن جاتا تو شامی لشکر طلحہ کے ساتھ دوسرے ہزاروں صحابہ کو بھی تہ تیغ کرڈالتا اور طلحہ کے قتل ہوتے ہی معاویہ خلیفہ بن جاتا۔

اگر امام علیؑ قتلِ عثمانؓ کے موقع پر مدینے میں نہ ہوتے اور آپ حکومت نہ سنبھالتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آج اسلام ایک قصۂ پارینہ سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔

امام علیؑ کے مخالفین

پچیس سال کی طویل گوشہ نشینی کے بعد لوگوں کے اصرار پر امام علیؑ نے خلافتِ ظاہری کا منصب قبول کیا۔ جب لوگوں نے آپ کی بیعت کی تو آپ نے اپنے خطبے میں حکومتی پالیسی کے خدوخال واضح کرتے ہوئے صاف لفظوں میں بتادیا کہ آپ صرف قرآن وسنّت پر عمل کریں گے اور پھر آپ نے اسی کے مطابق عمل شروع کردیا۔ آپ نے برسرِاقتدار آتے ہی معاشرے کے محروم اور مستضعف طبقے کے زخموں پر تسلی کا مرہم رکھا اور تمام مسلمانوں کے یکساں وظائف مقرر کئے۔

امام علیؑ کی مساوات کی پالیسی سے مسرفانہ زندگی گزارنے والے طبقے کے مفادات متاثر ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس طرح ان کا اثر و رسوخ نہیں رہے گا اور خلیفہ ان سے ساری ناجائز دولت واپس لے لے گا اور ان کا ٹھاٹ باٹھ ختم ہوجائے گا۔ اس لئے اشرافیہ نے جب اپنے مفادات کو نقصان پہنچتے دیکھا تو انہوں نے آپ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ امام علیؑ کے پانچ سالہ دورِ حکومت میں آپ کو تین گروہوں ناکثین، قاسطین اور مارقین سے جنگ کرنا پڑی۔ آپ نے بالترتیب جَمَل، صفین اور نہروان کی جنگیں لڑیں۔

ذیل میں ہم امام علیؑ کے تینوں مخالف طبقات اور ان کی نفسیات کا کچھ جائزہ لیتے ہیں۔

جنگِ جمل کے محرکین

جنگِ جمل امام علیؑ کے مقابلے میں قریش کی طبقاتی جنگ تھی۔ اس جنگ کے اسباب وعلل کے لئے قریش کی خصوصیات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

قریش اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سمجھتے تھے۔ خانۂ کعبہ کی تولیت ان ہی کے پاس تھی۔ عام الفیل کے وقت جب اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں کے ذریعے ابرہہ کے لشکر کو نیست و نابود کیا تو اس واقعے سے عرب معاشرے میں قریش کی عزّت و احترام میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ قریش اپنے آپ کو باقی قبائلِ عرب سے ممتاز سمجھتے تھے اور اہلِ عرب انہیں خانۂ کعبہ کا متولّی سمجھ کر ان کا بیحد احترام کرتے تھے۔ اخلاقی طور پر قریش دیوالیہ پن کی انتہا پر پہنچے ہوئے تھے اور دنیا کی کوئی ایسی برائی نہیں تھی جو اُن میں موجود نہ ہو۔ وہ قمار بازی کے اتنے رسیا تھے کہ اپنی زندگی کا تمام اثاثہ جوئے میں لٹانے پر ہمیشہ آمادہ رہتے تھے اور اگر تمام اثاثہ لٹا کر بھی ہار جاتے تو اپنے آپ کو دوسرے کی غلامی میں دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

جنسی طور پر قریش پرلے درجے کے بدکار تھے۔ انہوں نے اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے "ذات الرایات" یعنی جھنڈے والی عورتوں کا ایک طبقہ بنا رکھا تھا۔ اس زمانے میں بدکار عورتیں اپنے گھروں پر جھنڈا لگاتی تھیں اور جھنڈا اس بات کی علامت ہوتا تھا کہ اس گھر کے دروازے ہر عام و خاص کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

بنی ہاشم کے پاکباز گھرانے کے علاوہ ان میں صحیح النسب افراد انتہائی قلیل تھے۔ اقتصادی لحاظ سے قریش بڑے دولتمند اور فضول خرچ تھے۔ وہ گرمیوں میں سامانِ تجارت لے کر ایران، شام اور روم جاتے تھے اور سردیوں میں ان کے تجارتی قافلے یمن اور حبشہ جاتے تھے۔ اس تجارت کی وجہ سے ان کے پاس سونا، چاندی، عود، بخور، ابریشم اور غلاموں اور کنیزوں کی بہتات تھی۔

جب پیغمبرِ اکرمؐ نے دعوتِ اسلام کا آغاز کیا تو سب سے پہلے قریش نے ہی آپؐ کی مخالفت کی اور قدم قدم پر آپؐ کی توہین و تذلیل کی اور آپؐ کو اذیت پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھوں سے جانے نہیں دیا۔

رسولِ اکرمؐ کی دعوتِ اسلام پر جن لوگوں نے لبیک کہا قریش نے ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیئے۔ اسی لئے حضورِ اکرمؐ نے بہت سے مسلمانوں کو مکے سے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ پیغمبرِ اکرمؐ اور آپؐ کے خاندان کا قریش نے معاشرتی اور اقتصادی بائیکاٹ کیا۔ آپؐ کے مشفق چچا حضرت ابوطالبؑ نے ہر ہر مرحلے پر آپؐ کا مکمل ساتھ دیا۔ رسولِ اکرمؐ اور آپؐ کا خاندان تین سال سے کچھ زائد عرصے تک شعبِ ابی طالب میں

محصور رہا۔ حضرت ابوطالبؑ و خدیجہؑ کی وفات کے بعد آنحضرتؐ نے مجبور ہو کر مکہ چھوڑا اور انصار کی دعوت پر مدینہ تشریف لے گئے۔ مدینے آنے کے باوجود بھی قریش نے آپؐ کو ایک لمحے کے لئے چین سے جینے نہیں دیا یہاں تک کہ بدر، اُحُد اور خندق کی خونریز جنگیں لڑیں۔ یہودی قبائل جو کہ مسلمانوں کے حلیف تھے انہیں بھی قریش نے آپؐ کے خلاف لا کھڑا کیا۔

قریش نے رسولِ اکرمؐ کو اتنا زیادہ ستایا کہ رحمتِ مجسمؐ کو ان پر دو بار لعنت کرنا پڑی۔ پہلی بار آپؐ نے قریش پر اس وقت لعنت کی جب آپؐ مسجد الحرام میں نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپؐ سجدے میں گئے تو عقبہ نے گائے یا گوسفند کی اوجھڑی آپؐ کے سرِ اقدس پر رکھ دی۔ یہ حادثہ اتنا تکلیف دِہ تھا کہ حضرت فاطمہؑ روتی ہوئی دوڑیں اور انہوں نے اپنے پدرِگرامی کے سر اور کمر سے گندگی ہٹائی۔ اس وقت رسولِ اکرمؐ نے سر بلند کر کے تین مرتبہ کہا: اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ.

دوسرے موقع پر آپ نے کہا تھا: اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ الْمَلَأَ مِنْ قُرَيْشٍ.

(مکتبِ خلفاء نے اپنی روایتی تاویل سے کام لیتے ہوئے اس کی یہ توجیہ بیان کی کہ پیغمبرِ اکرمؐ کے پیشِ نظر قریش کے صرف وہی سردار تھے جو بعد کی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔) [۱]

اللہ تعالیٰ کی مسلسل امداد سے اسلام کو کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ جب رسولِ اکرمؐ فاتحانہ شان سے مکے میں داخل ہوئے تو قریش کے سربرآوردہ افراد کو مجبوراً اسلام قبول کرنا پڑا۔ قبولِ اسلام کے باوجود اُن کے ذہنوں میں اپنے تفاخُر کے جذبات جوں کے توں موجود رہے۔ حسبِ ذیل واقعے سے اس مطلب کی تائید ہوتی ہے کہ ایک دفعہ حضرت سلمان، حضرت بلال اور حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہم بیٹھے ہوئے تھے کہ ابوسفیان کا وہاں سے گزر ہوا۔ جب ان اصحابِ باصفا نے اسے دیکھا تو آپس میں کہا کہ خدا کی تلواروں نے خدا کے اس بدترین دشمن کو چھوڑ دیا۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کی یہ بات سنی تو ناخوش ہو کر بولے: کیا تم شیخِ قریش کے خلاف ایسی بات کرتے ہو؟ پھر انہوں نے سوچا کہ اگر ان اصحاب نے میری یہ بات رسولِ اکرمؐ تک پہنچا دی تو اس سے میری سبکی ہوگی چنانچہ حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ خود ہی رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ آنحضرتؐ کے گوش گزار کیا۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: شاید تم نے ان الفاظ سے اپنے مسلمان بھائیوں کو ناراض کیا ہے۔ اگر وہ تم سے ناراض ہوگئے تو اللہ بھی تم پر غضبناک ہو جائے گا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ حضرت سلمانؓ اور ان کے دوستوں کے پاس گئے اور ان سے معذرت طلب کی۔ [۲]

۱۔ صحیح مسلم، ۱۴۱۸ و ۱۴۱۹۔ مفتاح کنوز السنۃ مادہ قریش۔ ۲۔ صحیح مسلم، ۱۹۴۷۔

رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں تو قریش کا طرزِ عمل ایسا تھا لیکن جب آپؐ کی وفات ہوئی تو اسی قریش نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں کہا: پیغمبرِ اکرمؐ ہم قریش سے تھے اور قریش کے سوا حکومت کسی کو زیب نہیں دیتی۔ اس طرح سے قریش خلافت پر قابض ہوگئے۔

حضرت عمرؓ کے عہدِ حکومت میں جب نئے شہر آباد ہوئے تو انہوں نے قبائلِ عرب کو ان شہروں میں آباد کیا لیکن قریش کو مدینے سے باہر نہیں جانے دیا۔ پھر انہوں نے مدینے کی اراضی بھی قریش میں تقسیم کی اور طبقاتی نظام قائم کر کے قریش کو دولت مند بنا دیا۔ زمین اور دولت کی فراوانی سے ان کے پاس باغوں، کھیتوں، مکانوں اور نوکروں چاکروں کی بہتات ہوگئی۔ قیصر و کسریٰ و مقوقس کی جگہ قریشی ان علاقوں کے حاکم بنائے گئے۔ ایران اور روم کے بادشاہوں کے خزانے مالِ غنیمت کی صورت میں مدینہ منتقل ہوئے تو خلافت سے وابستہ افراد جو غالباً قریش سے تھے نہال ہوگئے۔ دولت کی اس فراوانی سے قریش نے غلام خریدے جن سے بیگار لی جاتی تھی۔ یہ غلام ان کے مزارع تھے جو دن رات ان کی زمینوں پر کام کرتے تھے جس کے بدلے میں انہیں تو صرف دو وقت کی روٹی ملتی مگر ان کے قریشی آقاؤں کی جیبیں ان کی اُگائی ہوئی فصلوں کی آمدن سے بھر جاتیں۔

حضرت عثمانؓ کی خیبر، وادی القریٰ اور دوسرے علاقوں میں زمینیں تھیں جن کی نگرانی غلاموں کے سپرد تھی۔ طلحہ و زبیر نے مدینے کے علاوہ بصرہ، کوفہ اور مصر میں بھی جائیدادیں خریدی تھیں۔

حضرت عثمانؓ کے معتمد خاص مروان نے مدینے میں ایک وسیع و عریض اور شاندار محل بنوایا تھا۔ جب اہلِ مدینہ نے یزید کے عہدِ حکومت میں بنی امیہ کے خلاف خروج کیا تو بنی امیہ اور ان کے غلام جن کی تعداد ایک ہزار تھی سب کے سب اس محل میں سماگئے تھے۔

حضرت عثمانؓ کو خلافت پر فائز کرنے والے عبدالرحمٰن بن عوف زُہری نے اتنی دولت اکٹھا کی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد جب ان کا چھوڑا ہوا سونا اور چاندی تقسیم کے لئے خلیفہ عثمانؓ کے پاس لایا گیا تو سونے چاندی کا اتنا اونچا ڈھیر جمع تھا کہ ایک طرف بیٹھے ہوئے شخص کو دوسری طرف بیٹھا ہوا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔

عمرو بن عاص نے اپنے عہدۂ سالاری سے خوب فائدہ اٹھایا اور جزیہ و مالیات کے نام پر کثیر دولت جمع کی۔ جب اس نے براعظم افریقہ کا ایک علاقہ فتح کیا تو لوگوں پر بھاری جزیہ عائد کیا اور عہدنامہ میں لکھا: ''اگر یہ لوگ اپنی سالانہ کمائی سے مالیات ادا نہ کرسکے تو یہ لوگ اپنی عورتوں اور بچوں کو فروخت کر کے مذکورہ رقم ادا کرنے کے پابند ہوں گے۔''[1]

جب بیت المال کی دولت کا بڑا حصہ قریش کی تجوریوں میں چلا گیا تو امت اسلامیہ کے دوسرے طبقے

۱۔ فتوح، ابن عبدالحکم، ص ۳۴۔

فقر و تنگدستی میں مبتلا ہوگئے اور خاص طور پر قریشی حکومتوں نے انصار کو مفلس بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حضرت رسولِ اکرمؐ نے اس روزِ بد کی انصار کو پہلے ہی خبر دیدی تھی اور فرمایا تھا: میرے بعد عنقریب تم پیچھے دھکیل دیئے جاؤ گے اور دوسرے لوگ اپنے آپ کو تم پر مقدم سمجھتے ہوئے تمہیں جنگی غنائم اور حکومت و ریاست سے محروم کردیں گے۔ صبر کرنا یہاں تک کہ روزِ قیامت میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچو۔[1]

حسب ذیل واقعے سے انصار کی غربت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

معاویہ اپنی حکومت کے ایام میں شام سے مدینے آیا۔ مدینے کے لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کے استقبال کے لئے گئے۔ انصار کے پاس کوئی سواری نہیں تھی اس لئے ابوقتادہ انصاری کے سوا کوئی اس کے استقبال کے لئے نہ جاسکا۔ ابوقتادہ بھی پیدل ہی گئے تھے۔

معاویہ نے ابوقتادہ سے کہا: تم انصاریوں کے سوا باقی سب لوگ میرے استقبال کے لئے آئے ہیں۔

ابوقتادہ نے کہا: ہمارے پاس سواری نہیں تھی کہ ہم آتے۔

معاویہ نے طعنہ دیتے ہوئے کہا: تمہارے آب کش اونٹ کہاں گئے؟ (انصار کھیتی باڑی کے لئے اونٹ کنوئیں پر جوتا کرتے تھے)۔

ابوقتادہ نے معاویہ کو انتہائی خوبصورت جواب دیا اور کہا: جب ہم نے رسولِ اکرمؐ کی معیت میں کافروں سے جنگِ بدر لڑی تھی تو ہمارے اونٹ اس جنگ میں ختم ہوگئے تھے اور پیغمبرِ اکرمؐ نے ہم سے کہا تھا کہ میرے بعد کچھ لوگ حکومت حاصل کریں گے جو مال و منصب میں اپنے آپ کو تم پر مقدم رکھیں گے۔

معاویہ نے کہا: رسولِ اکرمؐ نے تمہیں اس صورتِ حال کے متعلق کیا حکم دیا تھا؟

ابوقتادہ نے کہا: آنحضرتؐ نے ہمیں صبر کرنے کا حکم دیا تھا۔

معاویہ نے کہا: پھر تم صبر کرو۔

پھر اس نے مدینے پہنچ کر وہاں کے تمام قبائل کو بذل و عطا سے نوازا مگر انصار کو کچھ بھی نہ دیا۔[2]

خلاصہ یہ کہ قریش بت پرستی کے زمانے سے ہی اپنے آپ کو کعبہ کا متولی اور اولادِ ابراہیمؑ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اسلام کے اوائل میں رسولِ اکرمؐ کو بہت اذیتیں دیں مگر جب اسلام کو جزیرۂ عرب میں کامیابی نصیب ہوئی تو انہوں نے بظاہر اسلام قبول کرلیا اور پھر انہوں نے مکہ چھوڑ کر مدینے میں رہائش اختیار کرلی۔ وہاں انہوں نے اپنی ایک مضبوط جمعیت قائم کرلی اور اپنے آپ کو اسلام کے نمائندے کے طور پر متعارف کرایا۔

۱۔ صحیح بخاری، ج۲، ص۲۰۷۔ صحیح مسلم، ۳، ۱۴۷۴۔ سَتَلْقَوْنَ الْاَثَرَةَ مِنْ بَعْدِیْ اصْبِرُوْا حَتّٰی تَرِدُوْا عَلَیَّ الْحَوْضَ.

۲۔ ابن واضح کاتب، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۲۲۳۔

اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب شوریٰ کے اجلاس کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان ہونے کو تھا تو حضرت عمار یاسرؓ نے اٹھ کر تقریر کی اور کہا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اکرمؐ کے ذریعے سے ہمیں افتخار بخشا اور اپنے دین کے ذریعے سے ہمیں عزت دی۔ تم لوگ اس امر (حکومت) کو خاندانِ پیغمبرؐ سے پھیر کر کہاں لے جانا چاہتے ہو؟

حضرت عمارؓ نے جیسے ہی یہ گفتگو کی تو قریش کی شاخ بنی مخزوم کے ایک شخص نے حضرت عمارؓ سے کہا: (واضح رہے کہ حضرت عمارؓ کے والد اسی قبیلے کے آزاد کردہ تھے اور ان کی والدہ سمیہ اسی خاندان کی کنیز تھیں) اے فرزندِ سمیہ! اپنی حد سے آگے نہ بڑھو۔ اگر قریش اپنے لئے حاکم مقرر کر رہے ہیں تو تمہیں مداخلت کا حق کس نے دیا ہے؟ [۱]

قریش کی من مانیاں یہیں تک ہی محدود نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنی سیادت کے لئے کچھ احادیث وضع کر کے انہیں پیغمبرِ اکرمؐ سے منسوب کر دیا تھا۔ مشتے از خروارے چند احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ لَا یُقْتَلُ قُرَشِیٌّ صَبْرًا بَعْدَ هٰذَا الْیَوْمِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ. آج (فتح مکہ) کے بعد قیامت کے دن تک کوئی قریشی قتل نہیں کیا جائے گا۔ [۲]

۲۔ مَنْ اَهَانَ قُرَیْشًا اَهَانَهُ اللّٰهُ. جو بھی قریش کی توہین کرے گا خدا اسے ذلیل کرے گا۔ [۳]

۳۔ اَلنَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَیْشٍ فِیْ هٰذَا الشَّاْنِ مُسْلِمُهُمْ تَبَعٌ لِمُسْلِمِهِمْ وَ کَافِرُهُمْ تَبَعٌ لِکَافِرِهِمْ. لوگ امر حکومت میں قریش کے تابع ہیں۔ سرداری قریش کا مقدر ہے۔ اس امت کے مسلمان، قریش کے مسلمانوں کے اور اس کے کافر قریش کے کافروں کے پیروکار ہیں۔ [۴]

۴۔ لَا یَزَالُ هٰذَا الْاَمْرُ فِیْ قُرَیْشٍ مَا بَقِیَ فِی النَّاسِ اثْنَانِ. اگر زمین پر صرف دو آدمی بھی رہ جائیں تب بھی حکومت قریش ہی کے پاس رہے گی۔ [۵]

۵۔ خُذُوْا بِقَوْلِ قُرَیْشٍ وَ دَعُوْا فِعْلَهُمْ. تم قریش کا حکم مانو اور ان کے کاموں سے مطلب نہ رکھو۔ [۶]

۱۔ طبری، تاریخ، ج۶، ص۳۷۔ اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اَکْرَمَنَا بِنَبِیِّهٖ وَ اَعَزَّنَا بِدِیْنِهٖ فَاَنّٰی تُصْرِفُوْنَ هٰذَا الْاَمْرَ عَنْ اَهْلِ بَیْتِ نَبِیِّکُمْ؟ فَقَالَ رَجُلٌ مِنْ بَنِیْ مَخْزُوْمٍ: لَقَدْ عَدَوْتَ طَوْرَکَ یَا ابْنَ سُمَیَّةَ وَمَا اَنْتَ وَ تَاْمِیْرُ قُرَیْشٍ لِاَنْفُسِهَا.

۲۔ صحیح مسلم، ۱۴۰۹۔ سنن دارمی، ج۲، ص۱۹۸۔ مسند احمد، ج۳، ص۴۱۲ اور ج۴، ص۲۱۳۔

۳۔ مسند احمد، ج۱، ص۶۴۔۱۷۱۔۱۷۶۔۱۸۳۔ مسند طیالسی، حدیث۲۰۹۔

۴۔ صحیح بخاری، ج۲، ص۱۷۶۔ صحیح مسلم، ۱۳۱۵۔ مسند احمد، ج۱، ص۱۰۱۔ اور ج۲، ص۲۴۳۔ مسند طیالسی، ص۳۱۳، حدیث۲۳۸۰۔

۵۔ صحیح بخاری، ج۴، ص۱۵۵۔ مسند احمد، ج۲، ص۲۹۔۹۳۔۱۲۸۔ صحیح مسلم، ۱۳۵۲۔ مسند طیالسی، ص۲۶۴، حدیث۱۹۵۶۔

۶۔ مسند احمد، ج۴، ص۲۶۰۔ مسند طیالسی، حدیث۱۱۸۵۔

اس طرح کی خودساختہ روایات کے ذریعے سے قریش نے اپنی حکومت کو جواز فراہم کیا اور قیامت تک کے لئے اپنے خون کو محفوظ کیا اور حکومت کو اپنا پیدائشی حق قرار دیا۔ ایسی ہی روایات کے بل بوتے پر عمرو بن عاص نے افریقہ، سعد بن ابی وقاص نے ایران اور معاویہ نے شام کو زیرنگیں کیا۔ چنانچہ تمام اسلامی ملکوں کے فرمانروا قریش ہی سے ہوئے۔

قریش کے متعلق یہ خودساختہ روایات بنی اسرائیل کی ان روایات کے مشابہ ہیں جن میں یہودیوں کی سرداری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قریش کی نسلی برتری کے نظریے سے وہی نتیجہ نکلتا ہے جو اس غلط عقیدے سے برآمد ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اور یہودی دنیا کی سب سے ممتاز نسل ہیں اور انہیں ساری دنیا پر حق حکمرانی حاصل ہے۔

امام علیؑ نے برسرِاقتدار آتے ہی سب سے پہلے اسی طبقاتی بت کو مٹی میں ملا دیا اور بیت المال سے تمام لوگوں کو یکساں وظیفہ جاری کر کے حضرت رسولِ اکرمؐ کے دوَر کی یاد تازہ کردی۔ آپ نے بیت المال سے ہر شخص کو تین دینار عطا فرمائے۔ حد یہ ہے کہ باقی مسلمانوں کی طرح آپ کے غلام قنبر کو بھی تین دینار ملے اور خود آپ کو بھی تین دینار ملے۔

قرشیت کے بت پر دوسری ضرب اس وقت لگی جب صوبوں کے غیر قریشی گورنر بنائے گئے۔ مثلاً امام علیؑ نے عثمان بن حنیف انصاری کو بصرہ اور ان کے بھائی سہل بن حنیف کو مدینے کا گورنر مقرر فرمایا جبکہ مصر میں قیس بن سعد بن عبادہ کو تعینات فرمایا۔ قیس کے بعد مالک اشتر نخعیؒ کو مصر میں اور ایک دوسرے غیر قریشی کو اسکندریہ میں گورنر متعین فرمایا۔ اس کے ساتھ آپ نے معاویہ کو بطور گورنر شام معزول کیا اور جب طلحہ و زبیر نے آپ سے کوفہ و بصرہ کی حکومت کے لئے درخواست کی تو آپ نے ان کی درخواست رَد کردی۔

آپ نے قریش میں سے صرف دو افراد کو اہلیت (Merit) کی بنیاد پر گورنر نامزد فرمایا۔ آپ کی حکومت کا دارو مدار قریش پر نہیں تھا۔ آپ نے قریش کو کلیدی مناصب سے ہٹا کر لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کردیا کہ حکومت میں قریش کا حق فائق ہے۔

جب لوگوں نے امام علیؑ کی بیعت کی تھی تو شاید انہوں نے یہی سمجھا ہو کہ یہ بھی قرشی حکومت کا تسلسل ہے لیکن آپ نے برسرِکار آتے ہی جھوٹے قرشی تفاخر کو غارت کردیا اور ان کی نام نہاد قیادت کو مسترد کردیا۔ اس کا اندازہ عمرو بن عاص کے اُس خط سے ہوتا ہے جس میں اس نے معاویہ بن ابی سفیان کو لکھا تھا:

''امابعد! تیار ہو جا کیونکہ علیؑ تجھ سے تیری ساری دولت واپس لینے والا ہے۔ علیؑ تجھے درخت کی اس شاخ کی طرح سے بنانے والا ہے جس کے تمام پتّے موسم خزاں میں جھڑ چکے ہوں۔''[۱]

۱۔ علی بن حسین مسعودی، مروج الذہب، ج ۲، ص ۳۵۴۔

امام علیؑ کے ان ہی اقدامات کی وجہ سے قریش نے آپ کے خلاف جنگ چھیڑی اور طلحہ و زبیر نے بیعت کرنے کے بعد اس وقت آپ کی بیعت توڑ دی جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ علیؑ کے ہاتھوں ان کے مالی مفادات کو خطرہ لاحق ہے چنانچہ وہ آپ کو چھوڑ کر مخالف کیمپ میں چلے گئے۔

امام علیؑ کے مخالفین خونِ عثمانؓ کے انتقام کو بہانہ بنا کر بی بی عائشہؓ کو متفقہ طور پر میدان میں لے آئے۔ آپ کے مخالفین نے اپنی قیادت کے لئے بی بی عائشہؓ کا انتخاب نہایت سوچ سمجھ کر کیا تھا کیونکہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں بی بی کو ایک قدآور شخصیت بنا دیا گیا تھا اور دونوں حکومتوں نے انہیں اسلام کی مثالی خاتون کا درجہ دیا تھا جبکہ رسولِ خداؐ کی حیاتِ طیبہ میں آیۂ تطہیر اور آیۂ مباہلہ حضرت زہراؑ کے شان میں نازل ہوئی تھیں اور بی بی عائشہؓ کے متعلق سورۂ تحریم نازل ہوئی تھی مگر حکومت کی مسلسل تبلیغات نے بی بی کی عظمت کا ایسا امیج تراشا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو بی بی سے ایک والہانہ عقیدت پیدا ہوگئی تھی اور عوام میں بی بی کا اثر اتنا بڑھ چکا تھا کہ انہوں نے کھلے عام حضرت عثمانؓ کی مخالفت کی اور یہ کہہ کر ان کے قتل کا فتویٰ دیا کہ ''عثمانؓ کو قتل کردو یہ کافر ہو چکا ہے۔''[1]

الغرض مفاد پرست قریشی طلحہ، زبیر اور مروان کی قیادت میں جمع ہوئے۔ انہوں نے بی بی کو اپنا رہبر تسلیم کرلیا اور پھر ایک لشکرِ جرار بنا کر بصرہ میں عثمان بن حنیف کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ عثمان بن حنیف نے ان سے کہا: خودتم ہی نے قتلِ عثمانؓ کا فتویٰ دیا تھا اس لئے تمہیں قصاص کی ابتدا اپنے آپ سے کرنی چاہئے۔

مگر بیعت شکن افراد نے ان سے جنگ کی اور جب سامنے سے سخت مزاحمت ہوئی تو انہوں نے صلح کا نعرہ بلند کیا اور ایک صلح نامہ لکھا گیا جس میں یہ تحریر کیا گیا کہ: ''امام علیؑ کے بصرہ آنے تک عثمان بن حنیف اپنے عہدے پر قائم رہیں گے اور سرکاری فرائض انجام دیتے رہیں گے اور یہ بھی اس وقت تک بصرہ میں ہی رہیں گے اور کوئی فریق کسی کے خلاف کارروائی نہیں کرے گا۔''

اس صلح نامے کے بعد عثمان بن حنیف مطمئن ہوگئے لیکن طلحہ و زبیر نے عہد شکنی کرتے ہوئے دارالحکومت پر شب خون مارا اور عثمان بن حنیف اور کچھ دیگر افراد کو قید کرلیا اور بیت المال کے ستر محافظوں کو شہید کر کے سارا خزانہ لوٹ لیا۔ یہ لوگ عثمان بن حنیف کو بھی قتل کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے یہ دھمکی دی کہ میرا بھائی مدینے کا حاکم ہے اگر تم نے مجھے قتل کیا تو وہ مدینے میں تمہارے مکانات مسمار کردے گا۔ عثمان بن حنیف کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور انہوں نے اس کے قتل کا ارادہ ترک کردیا لیکن ان کے سر اور داڑھی کے تمام بال مونڈ دیئے اور پھر انہیں رہا کردیا۔

۱۔ بی بی عائشہؓ کی شخصیت جاننے کے لئے ہماری کتاب ''نقشِ عائشہؓ در تاریخ اسلام'' دیکھیں۔

عثمان بن حنیف انصاری حالات کی خبر دینے کے لئے مدینے روانہ ہوگئے۔ دریں اثناء اہلِ بصرہ نے باہر کے شورش پسندوں سے ایک اور جنگ لڑی جس میں انہیں ناکامی ہوئی اور یوں شورش پسند پورے بصرے پر قابض ہوگئے۔[۱]

ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے امام علیؑ صحابہ کا لشکر لے کر مدینے سے بصرہ کی طرف روانہ ہوئے اور آپ نے راستے میں اپنے ساتھیوں کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

خدا کی قسم! میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو کفر کے خلاف انقلاب اسلام برپا کر رہے تھے یہاں تک کہ ہم نے کفر کو شکست فاش دیدی۔ اُس وقت بھی میں نے نہ کوئی کمزوری دکھائی اور نہ ہی کسی بزدلی کا مظاہرہ کیا اور اب بھی میں جنگ کے لئے اُسی مقصد سے نکلا ہوں جس طرح رسولِ اکرمؐ کے ہمرکاب کفارِ قریش سے لڑنے نکلا کرتا تھا۔ میں اتنا بے بس نہیں کہ باطل کو چیر کر حق کو اس کے پہلو سے نکال نہ سکوں۔ میرا اس کے سوا قریش سے جھگڑا ہی کیا ہے۔ خدا کی قسم! میں تو اس وقت بھی ان سے برسرِ پیکار تھا (یعنی بدر، اُحد و خندق میں) جب وہ کافر تھے اور اب بھی برسرِ پیکار ہوں کیونکہ وہ آمادۂ فتنہ و فساد ہیں۔ جس شان سے میں کل ان کا مدمقابل تھا ویسا ہی آج ثابت ہوں گا۔[۲]

آپ نے اپنے بھائی عقیل کے نام ایک خط میں دردِ دل کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

فَدَعْ عَنْكَ قُرَيْشًا وَ تَرْكَاضَهُمْ فِي الضَّلَالِ وَ تَجْوَالَهُمْ فِي الشِّقَاقِ وَ جِمَاحَهُمْ فِي التِّيْهِ فَإِنَّهُمْ قَدْ اَجْمَعُوْا عَلٰى حَرْبِيْ كَاِجْمَاعِهِمْ عَلٰى حَرْبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ -صلى اللّٰه عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ- قَبْلِيْ فَجَزَتْ قُرَيْشًا عَنِّي الْجَوَازِيْ! فَقَدْ قَطَعُوْا رَحِمِيْ.

تم قریش کے گمراہی میں دوڑ لگانے، سرکشی میں جولانیاں کرنے اور ضلالت میں منہ زوریاں دکھانے کی باتیں چھوڑ دو۔ انہوں نے مجھ سے جنگ کرنے میں اسی طرح ایکا کیا ہے جس طرح وہ مجھ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے لڑنے کے لئے ایکا کئے ہوئے تھے۔ خدا کرے ان کی کرنی ان کے سامنے آئے۔ حتیٰ کہ انہوں نے میرے رشتے کا کوئی لحاظ نہ کیا۔[۳]

ایک اور مقام پر امام علیؑ خدا کے حضور قریش کی شکایت کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْتَعْدِيْكَ عَلٰى قُرَيْشٍ وَمَنْ اَعَانَهُمْ فَاِنَّهُمْ قَدْ قَطَعُوْا رَحِمِيْ وَاَكْفَؤُوْا اِنَائِيْ وَ اَجْمَعُوْا عَلٰى مُنَازَعَتِيْ حَقًّا كُنْتُ اَوْلٰى بِهٖ مِنْ غَيْرِيْ.

۱۔ نقشِ عائشہؓ در تاریخ اسلام، ج۲، ص ۱۱۵ تا ۱۳۰۔

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۳۳ سے اقتباس۔

۳۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۳۶ سے اقتباس۔

خدایا! میں قریش سے انتقام لینے پر تجھ سے مدد کا خواستگار ہوں کیونکہ انہوں نے میری قرابت اور عزیز داری کے بندھن توڑ دیئے اور میرے ظرف (عزت وحرمت) کو اوندھا کر دیا اور اس حق میں کہ جس کا میں سب سے زیادہ اہل ہوں، جھگڑا کرنے کے لئے ایکا کرلیا ہے۔[۱]

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام فوج لے کر بصرہ پہنچے اور آپ نے طلحہ، زبیر اور بی بی عائشہؓ کے لشکر کے سامنے صف بندی کی۔ حضرت چاہتے تھے کہ جنگ نہ ہو اور معاملہ صلح وصفائی سے طے پا جائے۔ اسی لئے آپ نے زبیر کو بلا کر فرمایا: کیا تجھے وہ وقت یاد ہے جب رسولِ اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ''اے زبیر! ایک دن تو علیؑ سے جنگ کرے گا اور تو باطل پر ہوگا۔''

زبیر نے کہا: مجھے آنحضرتؐ کا یہ فرمان یاد نہیں رہا تھا۔ اگر یاد ہوتا تو میں آپ کے ساتھ جنگ کے لئے کبھی نہ آتا۔

زبیر کا خفتہ ضمیر تھوڑی دیر کے لئے بیدار ہوا اور وہ جنگ پر پشیمان ہوا اور اس نے چاہا کہ میدانِ جنگ سے چلا جائے مگر اس کے بیٹے عبداللہ نے باپ کو جوش دلایا اور یوں زبیر نے جنگ نہ کرنے کا عہد توڑ ڈالا اور امام علیؑ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ جب فریقین میں گھمسان کا رن پڑا تو زبیر موقع پا کر وہاں سے چل دیا۔ راستے میں ابن جرموز نے اسے قتل کر دیا۔[۲]

جنگ میں بی بی عائشہؓ کے لشکر نے بی بی کے اونٹ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ جب انہوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی تو حضرت امیرالمومنینؑ نے مجبور ہو کر اپنے لشکر کو حملے کا حکم دیا۔[۳]

اس جنگ میں طلحہ مارا گیا۔ بصرہ کے قبائل بالخصوص بنی ضبہ بڑی جانفشانی سے ام المومنین کے اونٹ کی حفاظت کرتے رہے۔ جب ان میں سے ایک قتل ہوتا تو دوسرا آگے بڑھ کر اونٹ کی مہار پکڑ لیتا تھا۔ آخرکار حضرت کی فوج نے اونٹ کو پے کر دیا۔ جب اونٹ گرا تو مخالف لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ ان میں سے کچھ افراد قید ہوئے۔ جنگ کے اختتام پر امام علیؑ کا یہ فرمان پڑھ کر سنایا گیا:

''زخمیوں کو قتل نہ کیا جائے اور بھاگنے والوں کا تعاقب نہ کیا جائے۔ دشمن کے جو سپاہی اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیں اور ہتھیار ڈال دیں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ جو دشمن اپنے گھروں میں ہوں انہیں امان ہے۔ ان کا مال تمہارے لئے حلال نہیں ہے اور تم ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی نہیں بنا سکتے۔ البتہ ان کے

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۲۱۵۔

۲۔ طبری، ج۵، ص۱۹۹۔ کنز العمال، ج۶، ص۸۲ تا ۸۵۔ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۱۵۸۔

۳۔ جنگ جمل کی تفصیل کے لئے ''نقش عائشہؓ در تاریخ اسلام'' ج۲، صفحہ ۲۱ سے ۲۶۶ دیکھیں۔

وہ اونٹ اور گھوڑے جن پر سوار ہو کر وہ میدانِ جنگ میں آئے تھے تمہارے لئے حلال ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے مال کا تعلق ان کے وارثوں سے ہے۔ وہ غلام جو لشکر گاہ سے باہر ہیں، تم انہیں غلامی میں نہیں لے سکتے۔ اگر لشکر میں وہ اپنے ساتھ ایسی کنیز لائے ہوں جو اپنے آقا سے حاملہ ہوئی ہو تو تم اسے بھی کنیزی میں نہیں لے سکتے۔ اس جنگ میں جن عورتوں کے شوہر قتل ہوئے ہیں ان عورتوں کو چار ماہ اور دس دن کی عدت گزارنی ہوگی اس کے بعد وہ نیا عقد کر سکیں گی۔ (کیونکہ یہ مسلمان ہیں)۔

امام علیؑ کی یہ تعلیمات آپ کے بہت سے اہلِ لشکر کے لئے بڑی گراں تھیں۔ اسی لئے انہوں نے اس پر اعتراضات کئے۔ عمار یاسرؓ نے ان کے اعتراضات حضرت کے گوش گزار کئے اور کہا: لوگ فے اور غنائم کی باتیں کر رہے ہیں اور ان کا گمان یہ ہے کہ جو لوگ ان کے مقابلے پر آئے ہیں وہ خود اور ان کی بیوی بچے اور ان کے اموال پر مجاہدین کو تصرف کی اجازت ہونی چاہئے اور مزید یہ کہ لڑنے والے خود اور ان کے غلام اور ان کی عورتیں مجاہدین کی کنیزی میں آنی چاہئیں۔

حضرت نے اپنی فوج سے خطاب فرمایا۔ دورانِ خطاب کئی سپاہی کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے: امیرالمومنینؑ! آپ نے عجیب فیصلہ کیا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کا خون تو ہمارے لئے حلال ہو اور ان کی بیویاں ہمارے لئے حرام ہوں اور وہ ہماری کنیزی میں نہ آسکیں؟

حضرت نے اپنے سپاہیوں سے فرمایا: اہلِ قبلہ اور مسلمانوں کی جنگ کے متعلق رسولِ اکرمؐ کی سیرت اور اسلام کا حکم یہی ہے۔

حضرت امیر کے اہلِ لشکر نے آپ کے اس فرمان کو قبول نہ کیا اور زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ اس اثناء میں قبیلۂ بکر بن وائل کا ایک شخص جس کا جسم مضبوط اور آواز بھاری تھی اٹھا اور بولا: اے امیرالمومنینؑ! خدا کی قسم، آپ نے مساوی تقسیم نہیں کی اور آپ نے رعیت کے ساتھ عدل کا سلوک روا نہیں رکھا۔

امام علیؑ نے فرمایا: تجھ پر افسوس! میں نے عدل کے تقاضوں پر کیسے عمل نہیں کیا؟

اس نے کہا: آپ نے ہمارے اندر ان کا وہ مال تو تقسیم کیا جو میدانِ جنگ میں موجود تھا لیکن آپ نے ان کے اس مال پر جو کہ بصرے میں ہے اور ان کی بیوی بچوں پر ہمیں تصرف کرنے کی اجازت نہیں دی۔ کیا یہ بات عجیب نہیں کہ یہاں تو ان کی جانیں اور ان کے مال حلال ہوں لیکن ان کا جو مال بصرہ میں ہے وہ اور اس کے علاوہ ان کی عورتیں ہمارے لئے حرام ہوں؟

امام علیؑ نے فرمایا: اے مردِ بنی بکر! تمہاری سوچ بہت پست ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہم بڑوں کے گناہ میں چھوٹوں کو نہیں پکڑتے؟ بصرے میں ان کا جو مال موجود ہے وہ اُنھیں کی ملکیت ہے اور اُن کی بیویاں

بھی شریعت اسلام کے تحت اُنھیں کی زوجیت میں آئی ہیں اور ان کی اولاد مسلمان ہے۔ تم لشکرگاہ کے مال کو غنیمت سمجھ کر لے سکتے ہو اور اس کے مالک بن سکتے ہو۔ البتہ جو کچھ ان کے گھروں میں ہے وہ ان کے ورثاء کا حصہ ہے۔ اگر کوئی ہمارے خلاف بغاوت کرے گا تو ہم اس کی گرفت کریں گے اور جو ہمارے خلاف اقدام نہیں کرے گا اس کے عوض ہم اس کے باپ، شوہر اور بھائی کو نہیں پکڑیں گے۔ میں نے ان کے متعلق وہی فیصلہ کیا ہے جو رسولِ اکرمؐ نے اہلِ مکّہ کے لئے کیا تھا۔ جو کچھ لشکر کا مال تھا آپؐ نے اسے تقسیم کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ آپؐ نے کسی چیز سے تعرض نہیں کیا تھا۔ اس سلسلے میں میں نے بھی رسولِ اکرمؐ کی پیروی کی ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ جو چیز کفر کی جنگ کے دوران موقع پر موجود ہے وہ مسلمان مجاہدین کے لئے حلال ہے؟ لیکن اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو مغلوب گروہ کے اموال غالب گروہ کے لئے حرام ہوتے ہیں لہٰذا آرام سے رہو، خدا تمہاری مغفرت فرمائے۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ امام علیؑ کی سپاہ نے خلیفۂ اول کی سنّت کو مدنظر رکھ کر آپ کے طرزِ عمل پر اعتراض کیا تھا کیونکہ امام علیؑ کی فوج کے اکثر سپاہی خلیفۂ اول کے دوَر میں یہ دیکھ چکے تھے کہ انہوں نے اپنے جتنے بھی کلمہ گو مخالفین سے جنگیں کی تھیں ان کے ساتھ کفار کا سا سلوک کیا تھا۔ مخالفین کو جی کھول کر قتل کیا گیا، ان کا مال و اسباب لوٹ لیا گیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر کنیز اور غلام کا درجہ دیدیا گیا اور خریدا و بیچا گیا۔

الغرض حضرت ابوبکرؓ کے دوَر میں مسلمان مخالفین سے وہی سلوک کیا گیا جو زمانۂ جاہلیت میں کیا جاتا تھا یا جو رسولِ اکرمؐ نے حربی کافروں کے ساتھ رَوا رکھا تھا۔ فوج کے اس اقدام کو حضرت ابوبکرؓ کی حمایت حاصل تھی، لوگ اس طرح کے عمل کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ مسلمانوں کے گھروں کو لوٹنا جائز سمجھتے تھے اور ان کی عورتوں کو حلال سمجھتے تھے۔

امام علیؑ نے حکومت سنبھالنے کے بعد پہلی جنگ اہلِ بصرہ سے لڑی تھی اور اتفاق سے اہلِ بصرہ مسلمان تھے۔ امام علیؑ کے لشکر کو توقع تھی کہ جنگ کے خاتمے پر آپ اپنے مخالفین کے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جو حضرت ابوبکرؓ اپنے مسلمان مخالفین کے ساتھ کرتے تھے مگر آپ نے فتح حاصل کرنے کے بعد سیرتِ شیخین خصوصاً سیرتِ ابوبکرؓ کے خلاف فیصلہ کیا جو لشکر کی توقعات کے بالکل برعکس تھا اسی لئے اس نے آپ پر اعتراضات کئے تھے۔

آپ نے ان کے اعتراضات کے جواب میں بہت سے دلائل دیئے لیکن انہوں نے آپ کی کسی دلیل کو قبول نہیں کیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ آپ کے سپاہی آپ کی کسی دلیل سے مطمئن نہیں ہو رہے تو اس وقت آپ نے حضرت عائشہؓ کی شخصیت کے حوالے سے استفادہ کیا اور آپ کی اس دلیل سے تمام لوگ مطمئن ہو گئے۔

آپؑ نے فرمایا: اگر تم میری بات قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو تو اپنے قرعہ اندازی کے تیر لے آؤ اور بی بی عائشہؓ کے نام کا قرعہ ڈالو۔ پھر دیکھو کہ کس کے حصے میں اس کی ماں عائشہؓ آتی ہے اور اسے کون لے جاتا ہے اور اپنی کنیز بناتا ہے۔ (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ)

امام علیؑ نے جیسے ہی یہ ارشاد فرمایا تو تمام مسلمانوں کو اپنے غلط موقف کا اندازہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی اور سب یک زباں ہو کر کہنے لگے کہ ہم میں سے کوئی بھی یہ کام نہیں کرسکتا۔ آپ نے بالکل صحیح کہا تھا اور ہم غلطی پر تھے۔ آپ اس مسئلے سے واقف تھے اور ہم اس مسئلے سے ناواقف تھے۔ ہم خدا سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے ہمیں سیدھی راہ دکھائی ہے۔[۱]

جی ہاں! امام علی علیہ السلام نے اسلام پر عمل کیا، ایک اسلامی حکم کو زندہ کیا اور لوگوں کو سیدھی راہ پر ڈال دیا۔ چنانچہ مکتبِ خلفاء سے وابستہ ایک فقیہ کو یہ لکھنا پڑا کہ:

''اگر حضرت علیؑ جنگِ جَمَل میں اپنے مخالفین سے یہ سلوک نہ کرتے تو ہمیں اہلِ قبلہ سے جنگ کے حکمِ شرعی کا علم تک نہ ہوتا اور ہم یہ جان نہ سکتے کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہوں میں جنگ ہو جائے تو کس حد تک غنیمت جائز ہے اور فریقِ مخالف کے کس طرح کے افراد کو قیدی بنایا جاسکتا ہے؟''

قارئینِ کرام! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ امام علیؑ کے برسرِ اقتدار ہونے سے کیا فرق پڑا۔ اگر امام علیؑ حاکم نہ ہوتے تو آپ کے اس اقدام کا کوئی اثر ہی مرتب نہ ہوتا اور اسلام کا ایک حکمِ واقعی ہم تک نہ پہنچ پاتا۔

دنیائے اسلام امام علیؑ کی اِحسان مند ہے کہ آپ نے مسلمان مخالفین کے متعلق اسلامی حکم واضح فرمایا۔ اگر بالفرض آپؑ نے یہ حکم واضح نہ کیا ہوتا تو لشکرِ یزید جنگِ حرّہ کے بعد اہلِ مدینہ کی بہو بیٹیوں کو کنیز بنا کر بازارِ شام میں بیچ دیتا۔ اسی طرح لشکرِ شام عبداللہ بن زبیر کے قتل کے بعد اہلِ مکہ کی بہو بیٹیوں کو کنیز بنا کر بیچ دیتا۔ (اور یوں صحابہ و تابعین کی عصمتیں سرِ عام نیلام ہوجاتیں) اور اگر امام علیؑ کا فیصلہ موجود نہ ہوتا تو جب بھی دو مسلمان گروہ آپس میں جنگ کرتے تو وہی مفتوح گروہ کی ناموس کو کنیزیں بناتے اور ان کے اموال کو لوٹ لیتے۔

امام علی علیہ السلام نے جنگِ جَمَل کے وقت یہ سنّت قائم کر کے ہزاروں مسلمانوں کو قتل ہونے سے اور ان کی عورتوں کو کنیزیں بننے سے بچالیا اور مسلمان معاشرے کو فساد سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا۔ آپ کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر زیارتِ جامعہ کے ان فقروں کی صداقت واضح ہوجاتی ہے: بِمُوَالَاتِکُمْ عَلَّمَنَا اللّٰہُ مَعَالِمَ دِیْنِنَا وَ اَصْلَحَ مَا کَانَ فَسَدَ مِنْ دُنْیَانَا. یعنی آپ کی دوستی اور ولایت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہمارے دین کی باتیں سکھائیں اور ہمارے بگڑے ہوئے دنیاوی امور کی اصلاح فرمادی۔

۱۔ تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۸۳ تا ۸۵۔ کنز العمال، ج۸، ص۲۱۵ تا ۲۱۷۔ شرح نہج البلاغہ، ج۱، ص۲۳۔

معاویہ کی زیرِ قیادت جنگِ صفّین

امام علی علیہ السلام نے اپنی حکومت کے آغاز میں ہی معاویہ کو شام کی حکومت سے معزول کر دیا تھا۔ اسی لئے معاویہ خم ٹھونک کر حضرت کے مقابلے پر آیا اور جنگِ صفّین بر پا ہوئی۔

ابن عباسؓ اور مغیرہ بن شعبہ کا خیال تھا کہ اس وقت معاویہ کو معزول کرنا مناسب نہیں ہے۔ ان کے نزدیک یہ قرینِ مصلحت نہیں تھا چنانچہ انہوں نے حضرت سے کہا: آپ اس وقت معاویہ کو کچھ نہ کہیں۔ جب آپ کی حکومت مستحکم ہو جائے تو پھر بے شک اسے معزول کر دیں۔

امام علیؑ کی حکمت کا جائزہ لینے کے لئے پہلے ہم معاویہ کے حالات کا تجزیہ کریں گے تاکہ یہ بات اچھی طرح سے واضح ہو جائے کہ معاویہ کا معزول کرنا امام علیؑ کی شرعی اور الٰہی و سیاسی ذمہ داری تھی۔

فتحِ مکہ کے بعد اسلام کے بدترین دشمن جن میں معاویہ کا باپ ابوسفیان بھی شامل تھا اسلام لے آئے۔ فتح مکہ کے وقت معاویہ اور اس کا ایک ساتھی مکہ سے بھاگ کر کچھ عرصہ مکہ کے اطراف میں پھرتے پھراتے رہے۔ معاویہ نے وہاں سے اپنے باپ ابوسفیان کو چند اشعار لکھ بھیجے جس میں اس نے اپنے باپ سے اسلام قبول کرنے پر احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا: تو کیونکر اسلام لے آیا حالانکہ تو جانتا ہے کہ مسلمانوں نے جنگِ بدر میں میرے نانا، میرے ماموں اور میرے بھائی کو قتل کیا ہے؟[1]

جب کچھ عرصے بعد معاویہ نے دیکھا کہ پورے جزیرۃ العرب پر اسلام غالب آ چکا ہے تو وہ نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کا اظہار کیا۔

آگے جو واقعہ ہم نقل کر رہے ہیں اس سے آپ کسی حد تک معاویہ کے اسلام کی حقیقت جان سکیں گے۔

معاویہ کی مغیرہ کو نصیحت

طبری لکھتے ہیں کہ جب معاویہ نے مغیرہ بن شعبہ کو گورنر کوفہ مقرر کیا تو اسے اپنے پاس بلایا اور کہا: ویسے تو میں تجھے بہت سی باتوں کی نصیحت کرنا چاہتا تھا لیکن تیری فہم و فراست مجھے اس بات سے مانع ہے۔ میں تمام معاملات کو تیری صوابدید پر چھوڑ رہا ہوں لیکن ایک بات کی سفارش میں ہرگز فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہ:

''علیؑ کی بدگوئی اور برائی کبھی نہیں بھولنا۔ عثمانؓ کے لئے ہمیشہ اللہ سے رحمت اور مغفرت طلب کرتے رہنا۔ دوسرے یہ کہ علیؑ کے ساتھیوں کی عیب جوئی سے پس و پیش نہ کرنا اور ان کے ساتھ سختی برتنا۔

۱۔ شرح نہج البلاغہ، ج ۲، ص ۱۰۲۔ تذکرۃ الخواص، ۱۱۵۔

اِن فرائض کی بجا آوری میں کبھی کوئی کوتاہی نہ کرنا۔ شیعیانِ علیؑ کے برعکس دوستانِ عثمانؓ کو اپنے قریب جگہ دینا اور ہمیشہ ان پر مہربانی کرتے رہنا۔"

مغیرہ نے کہا: میں پہلے بھی اس طرح کے امتحان دے چکا ہوں اور میں اس کا وسیع تجربہ رکھتا ہوں۔ آج تک کسی بھی حکمران کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اب تو بھی امتحان لے لینا۔ اگر تجھے میرا کام پسند آئے تو تعریف کرنا اور اگر میرا کام پسند نہ آئے تو پھر میری مذمت کرنا۔

معاویہ نے جواب میں کہا: نہیں! انشاء اللہ میں تیری تعریف ہی کروں گا۔

معاویہ اور وضعِ حدیث

مدائنی اپنی کتاب "احداث" میں لکھتے ہیں کہ معاویہ نے خلیفہ بنتے ہی اپنے تمام اہلکاروں کو لکھا کہ: "جو شخص ابوتراب (ع) یا اس کے خاندان کے بارے میں فضیلت کی کوئی بات روایت کرے تو اس کا خون مباح ہے اور اس کے مال کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔" اس فرمان کے جاری ہونے کے بعد اہلِ کوفہ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

اس کے بعد معاویہ نے دوسرا حکم یہ جاری کیا کہ: "علی (ع) اور اس کے خاندان کے شیعوں میں سے کسی کی گواہی قبول نہ کی جائے۔"

اور یہ کہ "تمہارے علاقے میں عثمانؓ کے جو دوست اور ان کے فضائل روایت کرنے والے بستے ہیں ان کا کھوج لگاؤ اور انہیں اپنے نزدیک کرو اور ان کا احترام بجالاؤ۔ وہ لوگ عثمانؓ کی فضیلت میں جو کچھ نقل کریں وہ مجھے لکھ بھیجو۔ راوی کا نام اور اس کی ولدیت اور اس کے خاندان کے کوائف بھی تحریر کرو۔"

اس فرمان کے صادر ہوتے ہی دنیا طلب افراد نے فضائلِ عثمانؓ میں جھوٹی احادیث کے انبار لگا دیئے کیونکہ معاویہ اس سلسلے میں خلعتیں اور زمینیں عطا کرتا تھا اور خوب داد و دہش سے کام لیتا تھا۔ جو بھی غیر معروف اور بے قیمت شخص معاویہ کے کسی کارندے کو ملتا اور فضائل عثمانؓ میں کوئی روایت نقل کرتا تو اس کا نام لکھ لیا جاتا اور یوں اسے بنوامیہ کے دربار میں رسائی حاصل ہو جاتی۔

اس فرمان کے بعد معاویہ نے ایک اور فرمان جاری کیا جس میں لکھا: "فضائلِ عثمانؓ کی احادیث بہت زیادہ ہو چکی ہیں اور بلادِ اسلامیہ میں پھیل چکی ہیں لہٰذا جب تمہیں یہ خط ملے تو لوگوں کو دعوت دو کہ وہ صحابہ اور پہلے دو خلفاء کے فضائل کی احادیث روایت کریں۔ مزید برآں ابوتراب (ع) کے متعلق جو احادیث موجود ہیں ان سے ملتی جلتی احادیث صحابہ کے بارے میں تیار کراؤ کیونکہ اس سے مجھے بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے اور یہ بات ابوتراب (ع) اور ان کے شیعوں کے دلائل کا اچھا توڑ ہے اور ان کیلئے فضائلِ عثمانؓ سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔"

معاویہ کے اس فرمان کے بعد صحابہ کی فضیلت میں ایسی ایسی احادیث نقل کی گئیں جن میں حقیقت کی ذرّہ برابر خوشبو نہیں تھی۔ سادہ لوح لوگوں نے ان کو حدیثِ رسولؐ سمجھ کر قبول کرلیا اور ان احادیث کو آہستہ آہستہ اتنی شہرت ملی کہ انہیں منبروں پر بیان کیا جانے لگا۔ ایسی بہت سی احادیث لکھ کر اساتذہ کے ہاتھوں میں تھما دی گئیں اور وہ اپنے شاگردوں کو یہ احادیث پڑھاتے رہے۔ نوجوان ان احادیث کو قرآن کی طرح ذوق وشوق سے پڑھتے اور حفظ کرتے تھے۔ پھر یہ احادیث مردوں کے مدارس سے نکل کر عورتوں کے مدرسوں میں جا پہنچیں یہاں تک کہ لوگ اپنے نوکروں کو بھی یہ احادیث یاد کرانے لگے۔ سالہا سال تک اسلامی معاشرہ اسی ڈگر پر چلتا رہا اور نسلاً بَعْدَ نسلٍ فقیہوں، دانشوروں، قاضیوں غرضیکہ تمام طبقوں نے اس جھوٹ کو سچ سمجھ کر یاد کیا اور اس کا یقین کرلیا۔

ابن عَرَفہ المعروف بہ نفطویہ نے جو کہ علمِ حدیث کے مشہور علماء اور بڑے محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں اپنی تاریخ میں ویسی ہی باتیں لکھی ہیں جو مضمون کے لحاظ سے مدائنی نے کہی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''بیشتر جھوٹی احادیث جن میں صحابہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں بنی امیہ کے دور میں گھڑی گئی ہیں۔ ان احادیث کو گھڑنے اور نقل کرنے والے اس ذریعے سے دربارِ ملوکیت تک رسائی کے خواہش مند تھے۔ وہ اموی حکومت کی توجہ اور مہربانی چاہتے تھے اور اموی بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ اس کام کے ذریعے سے جتنا ممکن ہو بنی ہاشم کو نیچا دکھائیں۔''[1]

اس سلسلے میں معاویہ نے جتنے جتن کئے آج تک ان کی مکمل تفصیل معلوم نہیں ہوسکی ہے۔ معاویہ یوں کرتا کہ کسی شخص کو شام کے دور افتادہ دیہاتوں میں بھیج دیتا تھا جو وہاں لوگوں کو بتاتا تھا کہ: ''علی بن ابی طالبؑ جماعت منافقین کا فرد تھا (اَلْعَیَاذُ بِاللہ)۔ اس پر لعنت کرو کیونکہ اس نے شبِ عقبہ رسولِ اکرمؐ کو شہید کرنے کی غرض سے آپؐ کے اونٹ کو ڈرایا تھا۔ لوگ بھی اس کی بات مان کر حضرتؑ پر لعنت بھیجتے تھے۔''[2]

(ایک جنگ سے رسولِ اکرمؐ واپس آرہے تھے تو کچھ منافقین آپؐ کو شہید کرنے کیلئے ایک پہاڑی گھاٹی میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ وہاں سے پہاڑی راستہ انتہائی ناہموار اور ڈھلوان تھا۔ جب آنحضرتؐ کا اونٹ وہاں پہنچا تو انہوں نے اونٹ کو ہراساں کیا تاکہ اونٹ بدک کھڑا ہو اور آنحضرتؐ اونٹ سے گرجائیں لیکن اللہ تعالٰی نے اپنی قدرتِ کاملہ سے آپ کی حفاظت فرمائی۔ یہ واقعہ اس زمانے میں بھی لوگوں میں مشہور تھا۔)[3]

۱۔ ابن ابی الحدید معتزلی، المتوفی ۶۵۵ھ، شرح نہج البلاغہ، ج۳، ص۱۵۔ نقش عائشہؓ در تاریخ اسلام، ج۳، ص۲۶۶ تا ۲۶۸۔

۲۔ ابراہیم بن محمد بن سعید ثقفی، المتوفی ۲۸۲ھ کتاب الغارات، ص۳۹۷۔

۳۔ یاقوت بن عبداللہ حموی، المتوفی ۶۲۶ھ، معجم البلدان مادہ عقبہ ہرشیٰ۔

معاویہ نے شام میں امام علیؑ پر سبّ وشتم کو رائج کیا تھا اور تمام خطیبوں کو حکم دیا تھا کہ وہ نماز جمعہ کے خطبے میں امام علیؑ پر سبّ وشتم کریں۔ ایک عرصے تک لوگوں کو یہی تربیت دی جاتی رہی جس کے نتیجے میں بغضِ علیؑ دلوں میں پیدا ہوا۔[1]

معاویہ کی ریاست طلبی

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ خلیفۂ دوم نے یہ منصوبہ تیار کیا تھا کہ ان کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ بنیں اور ان کے بعد عبدالرحمٰن اور عبدالرحمٰن کے بعد معاویہ خلیفہ بنے۔ اسی لئے حضرت عمرؓ معاویہ کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے اور اسے عرب کا کسریٰ کہہ کر پکارتے تھے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہدِ حکومت میں معاویہ نے بڑا اثر و رسوخ قائم کرلیا تھا اور وہ خلافت پر قبضہ جمانے کی فکر میں غلطاں رہتا تھا۔

جس زمانے میں حضرت عثمانؓ کے مخالفین نے ان کا محاصرہ کیا تو انہوں نے اپنے چند حکام کو جن کے پاس فوج موجود تھی اور معاویہ بھی ان میں شامل تھا، یہ خط لکھا:

''میری اولاد اور میری جان بچانے کے لئے مدینے لشکر روانہ کرو۔''

جب یہ خط معاویہ کو ملا تو اس نے شام سے ایک فوجی دستہ روانہ کیا اور اس سے کہا: ''مدینے سے ایک منزل ادھر ''ذوخشب'' میں پڑاؤ ڈالنا اور میرے حکم کا انتظار کرنا اور یہ نہ کہنا کہ جو کچھ حاضر دیکھتا ہے وہ غائب نہیں دیکھتا۔ خیال رکھنا کہ مجھے حاضر سمجھنا اور اپنے آپ کو غائب سمجھنا۔''

معاویہ کا بھیجا ہوا لشکر ذوخشب آکر رک گیا اور انہوں نے مدینے میں آکر کوئی کارروائی نہیں کی یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ قتل کردیئے گئے اور جب وہ قتل ہوگئے تو شامی فوجی دستہ واپس چلا گیا۔[2]

خدارا سوچئے! معاویہ نے ایسا کیوں کیا تھا؟

اصل بات یہ ہے کہ معاویہ دلی طور پر چاہتا تھا کہ حضرت عثمانؓ قتل ہوجائیں اور وہ خونِ عثمانؓ کے بہانے خلافت حاصل کرسکے۔ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ اگر ''مدینہ پلان'' کے تحت خلافت طلحہ کو مل جاتی تو معاویہ فوراً خونِ عثمانؓ کا بہانہ بنا کر مدینے پر یلغار کردیتا اور طلحہ اور دیگر صحابہ کو قتل کرکے خلافت پر قبضہ جمالیتا لیکن حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ لوگوں نے طلحہ اور زبیر کی بجائے امام علی علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان غیر متوقع حالات میں معاویہ نے طلحہ اور زبیر کو امام علیؑ کے ساتھ جنگ کرنے کی ترغیب دی۔ کیونکہ معاویہ جانتا تھا کہ جب طلحہ اور زبیر، امام علیؑ سے جنگ کریں گے تو ان میں سے یقیناً ایک فریق شکست کھائے گا اور

۱۔ معالم المدرستین، ج۱، ص ۳۵۸ تا ۳۷۱، طبع چہارم۔ ۲۔ نقشِ عائشہؓ در تاریخِ اسلام، ج۳، ص۹۰۔

دوسرا کمزور ہو جائے گا اور جو فاتح قرار پائے گا وہ اس کی بہ نسبت کمزور ہو گا۔

معاویہ کا منصوبہ یہ تھا کہ علیؑ میدان میں قتل ہو جائیں اور اقتدار طلحہ اور زبیر میں سے کسی ایک کے ہاتھ آئے اور پھر موقع پا کر وہ ان سے اقتدار چھین کر خود خلیفہ بن جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے طلحہ اور زبیر ہر دو کو علیحدہ علیحدہ خطوط روانہ کئے اور لکھا کہ: ''میں تمہاری خلافت کے لئے بیعت لے رہا ہوں۔ تم جلد از جلد اپنا کام سرانجام دو اور علیؑ سے جنگ شروع کر دو۔''

امام علیؑ نے اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں جریر کو شام بھیجا تا کہ وہ معاویہ سے آپ کے لئے بیعت لے سکے۔ معاویہ نے جریر سے کہا: ''اپنے ساتھی کو لکھو کہ وہ شام و مصر میرے قبضے میں رہنے دیں اور ان کا خراج میرے لئے مختص کر دیں اور اپنی وفات کے وقت میری گردن میں کسی کی بیعت کا قلادہ نہ ڈالیں۔ اگر وہ ایسا کرنے پر آمادہ ہوں تو میں ان کی خلافت کو تسلیم کرنے پر تیار ہوں۔''

جریر نے معاویہ کے مطالبات لکھ کر حضرت کو بھیج دیئے۔ آپؑ نے اس کے جواب میں لکھا:

''معاویہ اپنی گردن میں میری بیعت کا قلادہ ڈالنے کا خواہش مند ہی نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے تمام معاملات میں کھلی آزادی حاصل رہے۔ وہ اس وقت تک تمہیں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے جب تک اہلِ شام اس کی مٹھی میں نہ آ جائیں۔ مدینے میں مغیرہ نے بھی مجھے ایسی ہی پیشکش کی تھی لیکن میں نے اسے قبول نہیں کیا تھا کیونکہ میں یہ نہیں چاہتا کہ اللہ مجھے معاویہ جیسے گمراہ لوگوں کا مددگار بنتے ہوئے دیکھے۔ اگر یہ شخص میری بیعت قبول کرے تو بہتر ورنہ تم واپس آ جاؤ۔''[۱]

معاویہ کی ان خصوصیات کو دیکھ کر انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ معاویہ کو شام جیسے وسیع و عریض صوبے کی حکومت پر باقی رہنے دینا شرعی لحاظ سے صحیح نہیں تھا۔ اگر امام علیؑ ایسا کرتے تو ہمیشہ کے لئے ظالم گورنروں کو مقرر کرنے کا جواز پیدا ہو جاتا جبکہ امام علیؑ حق کا محور تھے۔ وہ کسی بھی قیمت پر باطل کی تائید نہیں کر سکتے تھے۔ سیاسی لحاظ سے بھی معاویہ کو شام کی حکومت پر باقی رہنے دینا کوئی صحیح کام نہیں تھا کیونکہ اگر حضرتؑ ایسا کرتے تو معاویہ لوگوں سے کہتا: میں عمرؓ و عثمانؓ کی طرف سے شام کا گورنر رہ چکا ہوں اور اب علیؑ نے بھی مجھے اسی عہدے پر باقی رکھا ہے۔ علیؑ تو مجھے قبول کر چکا ہے لیکن میں علیؑ کو قبول نہیں کرتا۔

شام کے محل وقوع کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک بہت بڑی چھاؤنی تھی اور مکہ و مدینہ کی غذائی ضروریات بھی اسی صوبے سے پوری ہوتی تھیں۔[۲]

۱۔ نصر بن مزاحم بن سیار منقری کوفی المتوفی ۲۱۲ھ، وقعۃ صفین، ص ۵۸۔ ابن ابی الحدید معتزلی، شرح نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۲۵۰۔

۲۔ اس وقت دمشق، حمص، کوفہ، بصرہ اور اسکندریہ بڑی چھاؤنیاں تھیں لیکن غذائی لحاظ سے وہ شہر خود کفیل تھے جبکہ مکہ، مدینہ غذائی لحاظ سے شام کے دست نگر تھے۔

اگر معاویہ کو اس کے منصب پر بحال رکھا جاتا تو مرکز کو ہر وقت امیرِ شام کی بغاوت کا اندیشہ رہتا جیسا کہ بعد میں اس اندیشے نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔

بہرنوع معاویہ نے امام علیؑ کی بیعت نہ کی اور امام علیؑ نے اسے گورنری سے معزول کر دیا لیکن اس نے مرکز کے خلاف بغاوت کی اور معزول ہونے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد بھی امام علیؑ اور معاویہ کے درمیان کئی تند و تیز خطوط کا تبادلہ ہوا اور جب معاویہ کو اپنی کامیابیوں کا یقین ہوگیا تو اس نے امام علیؑ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور یوں جنگِ صفّین واقع ہوئی۔

جنگِ صفّین کا خلاصہ

معاویہ نے ۳۷ھ ماہ صفر کی پہلی تاریخ کو تین لاکھ کا لشکر ترتیب دیا اور امام علیؑ سے جنگ کے لئے شام سے روانہ ہوا۔ امام علیؑ کوفہ سے ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر لے کر اس کے مقابلے کے لئے روانہ ہوئے۔ صفّین کے مقام پر دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ یہ جنگ تقریباً چار مہینے جاری رہی اور آخر میں جب مالک اشترؒ ایک شدید حملہ کر کے معاویہ کے خیمے کے قریب پہنچ گئے اور امام علیؑ کی فوج کی فتح کے آثار ظاہر ہونے لگے تو معاویہ کے وزیر عمرو بن عاص نے اپنی فوج سے کہا کہ تم قرآن نیزے کے سروں پر باندھ کر بلند کرو اور آواز دے کر کہو:

''اے اہلِ عراق! جنگ سے باز آجاؤ۔ ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن فیصلہ کرے گا۔''[1]

عمرو بن عاص کی یہ ترکیب کامیاب ہوگئی اور امام علیؑ کی فوج کے ایک دستے نے کہا: یاعلیؑ! ہم قرآن کے مقابلے میں جنگ نہیں کریں گے لہٰذا آپ جنگ روک دیں۔ امام علیؑ نے اپنے نادان ساتھیوں کو بہتیرا سمجھایا اور انہیں بتایا کہ یہ معاویہ اور عمرو بن عاص کی چال ہے اور تم ان کے اس جال میں نہ پھنسو مگر آپ کے ساتھی اپنی بات پر اَڑ گئے اور انہوں نے آپ کو دھمکی دی کہ اگر آپ نے قرآن کے فیصلے کو نہ مانا تو ہم آپ کو بھی ویسے ہی قتل کر دیں گے جیسے ہم نے عثمانؓ کو قتل کیا تھا۔

امام علیؑ نے مالک اشترؒ کو پیغام بھیجا کہ جنگ روک دیں اور واپس آجائیں۔

حضرت مالک اشترؒ نے جو کہ فیصلہ کن جنگ کرنے میں مصروف تھے اور کامیابی کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے آپ کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ مجھے ایک گھنٹے کی مہلت دے دیں تو میں معاویہ کو قتل کر کے خود بخود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

۲۔ علی بن حسین مسعودی، مروج الذہب، ج ۲، ص ۳۹۰۔

ادھر حضرتؑ کے نادان فوجیوں کا دباؤ بڑھ گیا۔ چنانچہ حضرتؑ نے مالک اشترؒ کو پیغام بھیجا کہ اگر تم نے جنگ نہ روکی تو یہ لوگ مجھے قتل کردیں گے چنانچہ مالک اشترؒ کو مجبور ہوکر جنگ روکنا پڑی۔

اس کے بعد طے پایا کہ ایک شخص امام علیؑ کی طرف سے اور ایک شخص معاویہ کی طرف سے حَکَم ہوگا اور وہ دونوں متفقہ طور پر فریقین کے تنازعات کا فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ معاویہ کی طرف سے عمرو بن عاص حَکَم مقرر ہوا۔ امام علیؑ نے ابن عباسؓ کا نام تجویز کیا لیکن تند مزاج فوجیوں نے آپ کی تجویز نہیں مانی اور آپ کو مجبور کردیا کہ آپ ابوموسیٰ اشعری کو حَکَم بنائیں۔ حالانکہ آپؑ اس سے مطمئن نہیں تھے۔

تین دن بعد جب دونوں حَکَم دومۃ الجندل میں مل کر بیٹھے تو عمرو بن عاص نے ابوموسیٰ اشعری سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اس معاملے میں کیا صورت مناسب ہوگی؟ اس نے کہا "میرے خیال میں ہم ان دونوں حضرات کو معزول کردیں اور امیر کے انتخاب کو مسلمانوں پر چھوڑ دیں۔" عمرو بن عاص نے کہا: "آپ کا خیال درست ہے۔" اس کے بعد دونوں حَکَم مجمع عام میں آئے جہاں دونوں طرف کے لاکھوں آدمی موجود تھے۔ عمرو بن عاص نے ابوموسیٰ اشعری سے کہا کہ آپ لوگوں کو بتا دیجئے کہ ہم ایک رائے پر متفق ہوگئے ہیں۔ ابن عباسؓ نے ابوموسیٰ اشعری سے کہا: "اگر آپ دونوں ایک رائے پر متفق ہوگئے ہیں تو اس متفقہ فیصلے کا اعلان عمرو بن عاص کو کرنے دیجئے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ دھوکہ کھاگئے ہیں۔" ابوموسیٰ نے کہا: "مجھے اس کا کوئی خطرہ نہیں۔ ہم نے بالاتفاق ایک فیصلہ کیا ہے۔"

پھر وہ تقریر کرنے کے لئے اٹھے اور بولے کہ "میں اور میرے دوست (یعنی عمرو بن عاص) نے بالاتفاق فیصلہ کیا ہے کہ ہم علیؑ اور معاویہ کو الگ کردیں اور لوگ باہمی مشورے سے جس کو پسند کریں اپنا امیر بنالیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی انگوٹھی اتار کر کہا کہ جس طرح سے میں نے اس انگوٹھی کو اپنی انگلی سے جدا کیا ہے اسی طرح سے میں علی بن ابی طالبؑ کو خلافت سے جدا کرتا ہوں۔"

اس کے بعد عمرو بن عاص نے کہا: "ان صاحب نے جو کچھ کہا وہ آپ لوگوں نے سن لیا۔ انہوں نے اپنے آدمی (حضرت علیؑ) کو معزول کردیا ہے۔ پھر اس نے اپنی انگوٹھی اتارتے ہوئے کہا: ابوموسیٰ کی طرح میں بھی علیؑ کو خلافت سے یوں جدا کرتا ہوں جیسے میں نے اس انگوٹھی کو اپنی انگلی سے جدا کیا ہے۔ پھر اس نے انگوٹھی پہنتے ہوئے کہا: "جس طرح سے میں نے یہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہنی ہے اسی طرح سے میں معاویہ کو منصبِ خلافت پر قائم رکھتا ہوں۔"[1]

فیصلہ کرنے والوں کا یہ اندھا فیصلہ دیکھ کر امام علیؑ کے فوجی چیخ اٹھے اور انہیں معلوم ہوگیا کہ ان سے

۱۔ وقعۂ صفین، ص ۴۹۰ تا ۴۹۳۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۲، ص ۲۸۲۔ نقش عائشہؓ در تاریخ اسلام، ج ۳، ص ۹۴ تا ۱۰۱۔

دھوکا کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ افراد امام علیؑ کے پاس آئے اور کہنے لگے: یا علیؑ! ہم نے اور آپ نے حَکَم مقرر کر کے گناہ کیا ہے اور ہم کافر ہو گئے ہیں۔ ہم اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور آپ بھی توبہ کریں۔

امام علیؑ نے انہیں ہر طرح سے سمجھایا کہ حَکَم مقرر کرنا ہرگز کفر نہیں ہے لیکن انہیں نہیں ماننا تھا اور وہ نہیں مانے اور آپؑ کو چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ یہ لوگ اپنے عقیدے پر قائم رہے اور انہوں نے امام علیؑ کے خلاف لشکر کشی کی۔ امام علیؑ کو ان خارجی لوگوں سے نہروان کے مقام پر جنگ کرنا پڑی۔

جنگِ نہروان

جنگِ نہروان کے تاریخی واقعات بیان کرنے سے پہلے خوارج کی شناخت کے لئے ان کی خصوصیات اور پس منظر کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے۔ جب بھی کسی عقیدے کا مطالعہ کیا جائے تو بعض لوگ اِفراط اور بعض تفریط کا شکار دکھائی دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔ انسان کو چاہئے کہ عقل کی مدد سے درمیانی راستا تلاش کرے۔

عقیدے کی طرح زندگی کے مختلف معاملات اور معمولات میں بھی بعض لوگ اِفراط یا تفریط سے کام لیتے ہیں جبکہ اسلام اِعتدال اور میانہ رَوی کا دین ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ... اور اسی طرح ہم نے تم کو امتِ معتدل بنایا ہے تاکہ تم تمام انسانوں پر گواہ بنو۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۴۳)

جہاں تک دین کا تعلق ہے تو وہ نہ دائیں بازو کی تائید کرتا ہے اور نہ ہی بائیں بازو کی بلکہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ امام علیؑ فرماتے ہیں: اَلْيَمِيْنُ وَالشِّمَالُ مَضَلَّةٌ وَالطَّرِيْقُ الْوُسْطٰى هِيَ الْجَادَّةُ. دائیں بائیں گمراہی کی راہیں ہیں اور درمیانی راستا صراطِ مستقیم ہی ہے۔[1]

انسان کو تمام کاموں میں میانہ روی اختیار کرنی چاہئے۔ کھانے پینے، سونے جاگنے، ورزش، تفریح، مطالعہ، کام کاج حتیٰ کہ عبادت میں بھی اِفراط اور تفریط سے بچنا چاہئے۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: لَا تَرَى الْجَاهِلَ اِلَّا مُفْرِطًا اَوْ مُفَرِّطًا. جاہل کو یا تو حد سے بڑھا ہوا پاؤ گے یا پھر حد سے بہت پیچھے پاؤ گے۔[2]

کچھ لوگ روزِ اول سے لے کر آج تک اسلام کے متعلق اِفراط یا تفریط کا شکار چلے آ رہے ہیں اور خوارج کا تعلق بھی ان ہی لوگوں سے ہے۔ گروہِ خوارج میں بہت سے قاریانِ قرآن اور حافظ شامل تھے۔ اس زمانے میں قاری قرآن کا لقب ان لوگوں کو دیا جاتا تھا جو تمام اسلامی علوم کے ماہر ہوتے تھے۔ اس زمانے میں

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶۔ ۲۔ نہج البلاغہ، حکمت ۷۰۔

قرآن اور علمِ قرآن کے سوا اور کوئی علم تھا ہی نہیں اور اُس وقت کے قاری آج کے فقہاء کی مانند ہوتے تھے۔[1]

دَورِ خلفاء میں نقلِ حدیث پر پابندی لگا دی گئی تھی اور جن صحابہ کے پاس رسولِ خداؐ کی بیان کردہ تفسیر والے مصَاحِف موجود تھے، ان سے مصَاحِف لے کر جلا دیئے گئے۔ گروہِ خوارج جنہیں نہ حدیثِ رسولؐ کی کچھ خبر تھی اور نہ ہی وہ رسولِ خداؐ کی بیان کردہ تفسیر سے آشنا تھے انہوں نے تفہیمِ قرآن کے لئے قرآن کے حقیقی مفسر امام علی علیہ السلام سے بھی رجوع نہیں کیا۔ وہ قرآن کے حافظ ضرور تھے مگر تفسیرِ قرآن کے معاملے میں اپنی ذہنی اُپج پر انحصار کرتے تھے۔

خوارج کی یہ صِفَت بڑی نمایاں تھی کہ وہ لوگ دین کے ظاہری احکام اور عبادت پر بہت زور دیتے تھے اور دین کی حقیقت اور دین کی روح سے کوسوں دور تھے۔ ان میں کچھ لوگ اتنے بڑے عابد تھے کہ کثرتِ رکوع و سجود کی وجہ سے ان کی پیشانیوں اور گھٹنوں پر گٹے پڑ گئے تھے۔ یہ ان کی بدبختی تھی کہ انہوں نے معاویہ کو چھوڑ کر امام علیؑ سے لڑائی شروع کر دی تھی۔[2]

تفسیر بالرائے کے متعلق یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا: مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ. جس نے اپنی رائے کے مطابق قرآن کی تفسیر کی اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالیا۔[3]

آج کل بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو نہ تو علومِ قرآن پر کامل دسترس رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی

۱۔ مثلاً عبدالرحمٰن بن ملجم کو خلیفۂ ثانی نے اسکندریہ میں قرآن کے معلّم اور قاری کی حیثیت سے متعین کیا تھا۔ بعدہٗ وہ خوارج میں شامل ہوگیا اور اس نے امام علی علیہ السلام کو شہید کردیا۔

۲۔ آج کی وہّابیت بھی خوارج کے افکار و اعمال سے مماثل ہے۔ مسئلۂ توحید میں وہابی بھی متشدد ہیں۔ ان کی نظر میں اولیاء اللہ کی زیارت کرنا اور ان کی قبروں کو چومنا نیز ان کی شفاعت کا عقیدہ رکھنا شرک ہے۔ انہوں نے بھی خوارج کی طرح ہزاروں سنّی اور شیعہ مسلمانوں کو قتل کیا ہے۔ وہابیت کی کفار (اور استعمار) سے تو صلح ہے لیکن مسلمانوں سے جنگ ہے۔

اِفراط کا دوسرا رویّہ ان لوگوں کا ہے جو ہر وقت طہارت اور نجاست کے وسوسوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ رسولِ خداؐ نے تو فرمایا ہے کہ میں تمہارے لئے آسان شریعت لے کر مبعوث ہوا ہوں بُعِثْتُ بِالْحَنِيفِيَّةِ السَّهْلَةِ السَّمْحَةِ۔ (تفسیر قرطبی، ج۱۹، ص۳۹۔ ابن کثیر، ج۱، ص۳۱۲)۔ ایسے افراد خدانخواستہ اگر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں ہوتے تو ان پر بھی فتویٰ لگانے سے حیا نہ کرتے کیونکہ آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ میں پانی کی بڑی قلت ہوتی تھی اور کنویں سے آبِ قلیل نکال کر ہی کپڑے دھوئے جاتے تھے اور اسی طرح وضو اور غسل کیا جاتا تھا۔ یہ یقینی بات ہے کہ وسواسی افراد کی نظر میں اس سے پاکیزگی کا حصول ناممکن ہے۔ یاد رکھیں حد سے بڑھا ہوا وسوسہ کبھی کبھی دین سے خروج کا سبب بن جاتا ہے۔ لہٰذا بہت زیادہ وسوسوں میں پڑنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وسواسی افراد اپنے آپ کو پاک اور دوسروں کو نجس سمجھتے ہیں۔ خوارج بھی اسی طرح اپنے آپ کو مومن اور دوسرے مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے۔ بالفاظ دیگر وہ لوگ دیندار ضرور تھے مگر دین شناس ہرگز نہیں تھے۔

۳۔ المغنی عن حمل الاسفار عراقی، ج۱، ص۳۸۔

عالم دین سے رجوع کرتے ہیں۔ بس انہوں نے عربی ادب کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد قرآن کی تاویل وتفسیر کی دقیق بحثیں شروع کر رکھی ہیں۔ خود بینی اور علمی غرور کا شکار یہ لوگ خود کو علامۃ الدہر سمجھتے ہیں حالانکہ ان میں سے اکثر عربی کا ایک صفحہ بھی صحیح طرح سے نہیں پڑھ سکتے۔

یہ مصیبت دوسرے اسلامی ممالک کی بہ نسبت ایران میں (اور پاکستان میں بھی) زیادہ پائی جاتی ہے۔ مغرب کی یونیورسٹیوں سے ڈگری یافتہ ''نام نہاد دانشور'' علمائے دین اور حوزۂ علمیہ کے مدرسین سے رجوع کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں اور خود ہی مفسّر و محدّث بن کر اسلام شناسی پر اپنے ''خیالاتِ عالیہ'' کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ یہ روشن فکر اور جدیدیت پسند مفکّر اور دانشور اپنے آپ کو دین اور احکامِ دین کا ماہر جبکہ علمائے دین کو جاہل اور قدامت پسند سمجھتے ہیں۔ علماء پر طنز کرنا اور انہیں ہدفِ تنقید بنانا ان کا وطیرہ ہے۔ ان کی جسارت اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ اپنی ناقص فکر کو ''فکرِ معصومؑ'' کے مقابلے میں بھی پیش کرنے سے باز نہیں آتے۔

ایسے ہی ایک بے توفیق ''ممتاز دانشور'' نے ایک آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہا تھا: ''اس آیت کے بارے میں حضرت علیؑ کی رائے کچھ اور تھی لیکن میری رائے یہ ہے کہ...''

یقیناً اس دانشور کی رائے اس وہابی مُلا کی رائے سے ملتی جلتی ہے جس نے مجھ سے کہا تھا: ''محمدؐ کیا ہے؟ وہ بھی میری طرح ایک انسان تھا جو مرگیا۔'' (نعوذ باللہ)

دل مُلا گرفتار غمے نیست
نگاہے ہست در چشمش نمے نیست (اقبال)

(مُلا کا دل آپؐ کے غمِ عشق میں مبتلا نہیں ہے۔ اس کے پاس نگاہ تو ہے لیکن وہ نگاہ نہیں جو سوزِ محبت سے نمناک ہوتی ہے)۔

خوارج کا اندازِ فکر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ اپنے زمانے کے امام کے زیرِ احسان ہونا نہیں چاہتے تھے۔ یہ غرور و تکبر ابلیس کی میراث ہے۔ اس نے بھی اپنے ''امام زمانہ'' حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سر جھکانے سے انکار کردیا تھا۔ شیطان کی یہ روش طول تاریخ میں مسلسل دکھائی دیتی ہے۔

خوارِج کے متعلق پیغمبر اکرمؐ کی پیشگوئی

رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں ایک شخص حرقوص بن زہیر تمیمی رہتا تھا جو ذُوالْخُوَیْصَرہ یا ذُوالثَّدِیَہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ امام علی علیہ السلام نے یمن سے صدقات کی ایک خطیر رقم رسولِ اکرمؐ کے پاس مدینے روانہ

کی اور رسولِ اکرمؐ نے اس میں سے کچھ مُؤَلَّفَۃُ القلوب قسم کے لوگوں کو زیادہ حصہ عطا فرمایا۔ ذوالخویصرہ نے رسولِ خداؐ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا: اے محمدؐ! خدا سے ڈرو اور عدل کرو۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: اگر میں بھی خدا کی نافرمانی کرنے لگ جاؤں تو پھر خدا کی فرمانبرداری اور کون کرے گا؟ خدا نے تو مجھے روئے زمین پر اپنی وحی کا امین قرار دیا ہے لیکن تم مجھے امین نہیں سمجھتے؟

جب وہ آنحضرتؐ کے پاس سے اُٹھ کر چلا گیا تو آپؐ نے فرمایا: اس شخص کی صنف سے ایک گروہ پیدا ہوگا جو قرآن زیادہ پڑھیں گے لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا اور ان کے دلوں تک نہیں پہنچے گا۔ وہ اسلام سے ایسے باہر نکل جائیں گے جیسے تیر نشانے سے گزر جاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کریں گے اور انہیں قتل کریں گے لیکن کفار سے کوئی واسطہ نہ رکھیں گے۔ وہ کفار کے دوست ہوں گے۔ ان کی نماز اور روزے کے مقابلے میں تم اپنی نماز اور روزے کو حقیر سمجھو گے۔ جب مسلمانوں کے دو گروہ ہوں گے، (جنگِ صفّین کی طرف اشارہ ہے) تو اس زمانے میں یہ نمودار ہوں گے۔ وہ سر منڈواتے ہوں گے۔ لوگوں میں بدترینِ خلائق ہوں گے۔ ان دو گروہوں میں سے جو حق پر ہوگا وہ ان کو قتل کرے گا۔ وہ دین میں بہت زیادہ وسواس کرنے والے ہوں گے۔[1]

رسولِ اکرمؐ نے خوارج کے متعلق ایک اور پیشگوئی کرتے ہوئے اپنے اصحاب سے فرمایا تھا کہ تم تین گروہوں سے جنگ کرو گے۔

ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے: رسول اکرمؐ نے ہمیں ناکثین (اصحاب جَمَل)، قاسطین (اصحابِ صفّین) اور مارقین (اصحابِ نہروان) کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا تھا۔

میں نے پوچھا: یارسول اللہؐ! ہم کس کے ہمرکاب ہو کر جنگ کریں گے؟

آپؐ نے فرمایا: علی بن ابی طالبؑ کے ہمرکاب ہو کر۔ اور عمّار بن یاسرؓ بھی ان کے ہمراہ ہوں گے۔[2]

حضرت ابوایوب انصاریؓ جنگِ صفّین میں شریک تھے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد وہ کوفہ آئے۔ علقمہ اور اسود نے ان سے ملاقات کی اور کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کو آپ کے گھر مہمان ٹھہرا کر آپ کو عزت بخشی اور اب آپ کی حالت یہ ہے کہ آپ تلوار اٹھا کر لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے والوں کو قتل کر رہے ہیں۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ نے کہا: رہنما اپنے ساتھیوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔[3] رسول اللہؐ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم علیؑ کے ساتھ تین گروہوں — ناکثین، قاسطین اور مارقین — سے جنگ کریں۔ ناکثین وہ ہیں

۱۔۲۔۳۔ ابن کثیر نے جنگِ نہروان کے واقعات کے ضمن میں مسند احمد اور صحیح بخاری کے حوالے سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ دیکھیں حافظ ابن کثیر شافعی کی تاریخ البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۲۸۹۔۳۰۶۔

جنہوں نے بیعت کرنے کے بعد امام علیؑ کی بیعت توڑ دی تو ہم نے ان (اہلِ جمل) سے جنگ کی۔ قاسطین وہ ستمگر ہیں جن سے صفّین میں لڑکر ہم آرہے ہیں۔ اور مارقین — دین سے نکلنے والے — وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ ہم جنگ کریں گے لیکن ابھی مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ کون ہیں اور کہاں ہیں؟

ایک مرتبہ صحابۂ کرامؓ نے رسولِ اکرمؐ کے سامنے ذُوالثدیہ کی عبادت اور دینداری کی بڑی تعریف کی۔ آپؐ نے فرمایا: میں اسے نہیں جانتا۔

پھر ایک بار آپؐ صحابہ کے درمیان مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ مسجد میں داخل ہوا۔ اصحاب نے آپ سے عرض کیا: یارسول اللہؐ! یہ وہ شخص ہے جس کی ہم نے آپ کے سامنے اس دن تعریف کی تھی۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: تم اس شخص کی تعریف کررہے ہو جس کے چہرے پر شیطان کی علامت دکھائی دیتی ہے۔ وہ شخص مسجد میں آیا مگر اس نے رسولِ اکرمؐ اور آپ کے پاس بیٹھے ہوئے صحابہ کو سلام نہ کیا۔

رسولِ اکرمؐ نے اسے بلایا اور فرمایا: تجھے خدا کی قسم! سچ سچ بتانا، جب تو مسجد میں داخل ہوا تو کیا اس وقت تو نے اپنے دل میں یہ نہیں کہا تھا کہ اس مجمع میں مجھ سے بہتر کوئی شخص موجود نہیں ہے۔

اس نے کہا: ہاں! یہ سچ ہے۔ پھر وہ وہاں سے چل پڑا اور نماز پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔

رسولِ اکرمؐ نے صحابہ سے پوچھا: تم میں کون ہے — جو اس شخص کو جو اپنے آپ کو پیغمبرؐ سے بہتر سمجھتا ہے اور اس وجہ سے کافر ہوچکا ہے — قتل کرے؟

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: یارسول اللہؐ! میں اسے قتل کروں گا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ اس کو قتل کرنے کے لئے اٹھے اور جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز میں مصروف ہے۔ انہوں نے اپنے آپ سے کہا کہ سبحان اللہ! میں نماز پڑھنے والے کو کیسے قتل کرسکتا ہوں؟ جبکہ رسولِ اکرمؐ نے نماز پڑھنے والوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔

پھر حضرت ابوبکرؓ واپس آئے تو رسولِ اکرمؐ نے پوچھا: کیا کرکے آئے ہو؟

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: میں نے اسے حالتِ نماز میں قتل کرنا پسند نہیں کیا کیونکہ آپ نے نمازگزاروں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اس کے بعد رسولِ اکرمؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: تم میں سے کوئی ہے جو اس شخص کو قتل کردے؟

حضرت عمرؓ نے کہا: یارسول اللہؐ! میں اسے قتل کروں گا۔ حضرت عمرؓ اس کو قتل کرنے کی غرض سے گئے اور جب اس کے پاس پہنچے تو اسے سجدے کی حالت میں پایا۔ انہوں نے اپنے آپ سے کہا کہ ابوبکرؓ مجھ سے دین کو بہتر جانتے ہیں، انہوں نے تو اسے قتل نہ کیا، اب میں بھی اسے قتل نہیں کروں گا۔

حضرت عمرؓ واپس آئے تو رسولِ اکرمؐ نے دریافت فرمایا: تم کیا کرکے آئے؟

انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! وہ خدا کے حضور سربسجود تھا اس لئے میں نے اسے قتل نہیں کیا۔
رسول اکرمؐ نے پھر اپنے اصحاب سے پوچھا: تم میں سے کوئی ہے جو اسے قتل کرے؟
امام علیؑ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! میں اسے قتل کروں گا۔
رسول اکرمؐ نے فرمایا: اگر تم نے اسے پالیا تو اسے قتل کردو گے۔
امام علیؑ جب وہاں پہنچے تو وہ وہاں سے جاچکا تھا۔
امام علیؑ دربارِ رسالت میں واپس آئے تو رسولِ اکرمؐ نے پوچھا: تم کیا کر کے آئے؟
امام علیؑ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! وہ جاچکا تھا۔
رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: اگر وہ مارا جاتا تو میری امت میں کبھی اختلاف نہ ہوتا۔
(یہی ذو الثدیہ جنگِ نہروان کے محرکین میں شامل تھا)۔
اب ہم امام علیؑ سے خوارج کے تنازعے کا پس منظر بیان کرتے ہیں۔
اس فرقے کی شروعات اس وقت ہوئی جب جنگِ صفین کے آخری مرحلے پر لشکرِ شام ہارنے کو تھا اور عمرو بن عاص کی تجویز پر قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کیا گیا تھا۔ اور اہلِ شام دہائی دے رہے تھے کہ اے اہلِ عراق جنگ بند کرو اور قرآن کے مطابق تنازعات کا فیصلہ کرو۔

چند ظاہر بین نگاہیں قرآن کے تقدس کی وجہ سے دھوکہ کھا گئیں اور انہوں نے امام علیؑ کے اصرار کے باوجود جنگ کرنے سے انکار کردیا۔ وہ بعد میں خوارج کے نام سے موسوم ہوئے۔ انہوں نے امام علیؑ کو تحکیم پر مجبور کردیا۔ جب حضرت مجبور ہو کر تحکیم پر رضامند ہوگئے اور دو افراد حَکَم مقرر ہوئے تو ان ہی میں سے کچھ افراد نے "اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہِ" (سورۂ انعام: آیت ۵۷ اور سورۂ یوسف: آیت ۴۰ اور آیت ۶۷) کا نعرہ بلند کیا اور کہا کہ فیصلے کا حق صرف خدا کو ہے اور خدا کے سوا کسی کو لوگوں میں فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے اور حَکَم مقرر کرنا گناہ اور کفر ہے۔ انہوں نے پہلے اپنے گناہ سے توبہ کی اور پھر امام علیؑ اور دوسرے مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اور حضرت سے مطالبہ کیا کہ وہ بھی توبہ کریں۔

چنانچہ ذو الثدیہ اور جرثہ بن برج طائی، امام علیؑ کے پاس آئے اور کہا: لَا حُکْمَ اِلاَّ لِلّٰہِ.
امام علیؑ نے فرمایا: لَا حُکْمَ اِلاَّ لِلّٰہِ.
ذو الثدیہ نے کہا: آپ اپنے گناہ سے توبہ کریں اور پھر ہمیں اپنے دشمن معاویہ کے مقابلے پر لے جائیں۔ ہم قتل ہونے تک اس سے جنگ کریں گے۔

۱۔ انعام: آیت ۵۷ اور یوسف: آیات ۴۰۔ ۶۷۔

امیرالمومنینؑ نے فرمایا: میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ قرآن مجید اٹھانا اہلِ شام کا فریب ہے اور تم جنگ جاری رکھو لیکن تم نے اس وقت میری بات ماننے سے انکار کردیا تھا اور اب جبکہ یہ معاہدہ ہوچکا ہے کہ حَکَمَین کا فیصلہ آنے تک ہم جنگ نہیں کریں گے تو معاہدے کی پابندی انتہائی ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ. جب معاہدہ کروتو اس کی پابندی کرو۔ (سورۂ نحل: آیت ۹۱)

ذوالشدیہ نے کہا: حَکَم مقرر کرنا گناہ ہے۔ آپ کو اس گناہ سے توبہ کرنی چاہئے۔

امام علیؑ نے فرمایا: حَکَم مقرر کرنا ہرگز گناہ نہیں ہے۔ میں نے تو تمہیں پہلے ہی منع کیا تھا لیکن تم نے کوتاہ فکری کے سبب تحکیم پر اصرار کیا تھا۔

جریہ نے کہا: اگر آپ حَکَم مقرر کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے تو خدا کی قسم میں آپ سے جنگ کروں گا اور اس جنگ سے میں خدا کی رحمت اور خوشنودی طلب کروں گا۔

امام علیؑ نے فرمایا: تجھ پر افسوس! تو کتنا بڑا بدبخت ہے، میں گویا دیکھ رہا ہوں کہ تو قتل ہوچکا ہے اور ہوا تجھ پر خاک اُڑا رہی ہے۔

جریہ نے کہا: میری بھی خواہش یہی ہے۔

امام علیؑ نے فرمایا: شیطان نے تجھے کفر میں داخل کردیا ہے۔

اس گفتگو کے بعد یہ دونوں امام علیؑ کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے اور کوفے میں اپنے غلط عقائد کی تبلیغ شروع کردی۔ بہت سے لوگ ان کے ہم عقیدہ بن گئے اور انہوں نے امام علیؑ کے سامنے جسارتیں شروع کردیں۔

ایک بار امام علیؑ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک خارجی ان کے قریب سے گزرا اور بلند آواز سے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی: وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ○ اے رسولؐ! تمہاری طرف اور ان پیغمبروں کی طرف جو تم سے پہلے ہوچکے ہیں یہی وحی بھیجی گئی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل برباد ہوجائیں گے اور تم زیاں کاروں میں سے ہوجاؤ گے۔ (سورۂ زمر: آیت ۶۵) اس آیت سے اس نے امام علیؑ کی طرف کنایہ کیا تھا کہ تم مشرک ہوگئے ہو اور جو کچھ اسلام کی پہلے خدمت کرچکے ہو وہ سب برباد ہوگئی ہے۔

امام علی علیہ السلام نے اس خارجی کے جواب میں یہ آیت پڑھی: فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ○ اے رسولؐ! تم صبر کرو بے شک خدا نے (تمہاری مدد کا) جو وعدہ کیا ہے وہ سچا ہے۔ اور دیکھو جو لوگ (آخرت پر) یقین نہیں رکھتے وہ تمہیں اوچھا نہ بنادیں۔ (تم ہر حال میں اپنے عظمت و وقار کو برقرار رکھو)۔ (سورۂ روم: آیت ۶۰)

خوارج اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ سے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کسی کو حَکَم مقرر کرنا گناہ ہے۔ چنانچہ امام علیؑ نے انہیں سمجھانے کی غرض سے جمع کیا اور درمیان میں قرآن رکھ کر کہا: قرآن فیصلہ کر۔

قرآن مجید نے نہ بولنا تھا نہ بولا تو امام علیؑ نے فرمایا: تم نے دیکھا کہ قرآن تو نہیں بولتا لہذا لوگوں کے فیصلوں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستا نہیں ہے کہ لوگ قرآن کے مطابق فیصلہ کریں۔ کیا تم نے قرآن میں یہ نہیں پڑھا: وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَکَمًا مِّنْ اَهْلِهَا۔ اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں اَن بَن ہے تو صلح صفائی کے لئے ایک حَکَم مرد کے خاندان میں سے اور ایک حَکَم عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو۔ (سورۂ نساء: آیت ۳۵)

سیدھی سی بات ہے کہ میاں بیوی کے جھگڑوں کو طے کرنے کے لئے خدا تو نہیں آتا انسان ہی دونوں کے تنازعات کا فیصلہ کریں گے۔

حضرت امیر علیہ السلام نے ایک اور موقع پر فرمایا:

کَلِمَةُ حَقٍّ یُرَادُ بِهَا بَاطِلٌ نَعَمْ اِنَّهٗ لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰهِ وَلٰکِنَّ هٰؤُلَآءِ یَقُوْلُوْنَ: لَا اِمْرَةَ اِلَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّهٗ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِیْرٍ بَرٍّ اَوْ فَاجِرٍ یَعْمَلُ فِیْ اِمْرَتِهِ الْمُؤْمِنُ وَیَسْتَمْتِعُ فِیْهَا الْکَافِرُ...[1] یعنی ان کی بات صحیح ہے لیکن اس سے ان کی مراد غلط ہے۔ ہاں بے شک حُکم اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے مگر یہ لوگ تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حکومت بھی اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں ہوسکتی حالانکہ لوگوں کے لئے ایک حاکم کا ہونا ضروری ہے خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ (اگر اچھا ہوگا تو) مومن اس کی حکومت میں اچھے عمل کرسکے گا۔ اور (اگر برا ہوگا تو) کافر اس کے عہد میں لذائذ سے بہرہ اندوز ہوسکے گا۔

آپ نے اپنے ایک اور خطبے میں فرمایا:

اِنَّا لَمْ نُحَکِّمِ الرِّجَالَ وَاِنَّمَا حَکَّمْنَا الْقُرْاٰنَ. هٰذَا الْقُرْاٰنُ اِنَّمَا هُوَ خَطٌّ مَسْتُوْرٌ بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ لَا یَنْطِقُ بِلِسَانٍ وَلَا بُدَّ لَهٗ مِنْ تَرْجُمَانٍ وَ اِنَّمَا یَنْطِقُ عَنْهُ الرِّجَالُ. وَلَمَّا دَعَانَا الْقَوْمُ اِلٰی اَنْ نُحَکِّمَ بَیْنَنَا الْقُرْاٰنَ لَمْ نَکُنِ الْفَرِیْقَ الْمُتَوَلِّیَ عَنْ کِتَابِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی وَقَدْ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" فَرَدُّهٗ اِلَی اللّٰهِ اَنْ نَحْکُمَ بِکِتَابِهٖ وَ رَدُّهٗ اِلَی الرَّسُوْلِ اَنْ نَاْخُذَ بِسُنَّتِهٖ فَاِذَا حُکِمَ بِالصِّدْقِ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ فَنَحْنُ اَحَقُّ النَّاسِ بِهٖ وَاِنْ حُکِمَ بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ فَنَحْنُ اَحَقُّ النَّاسِ وَ اَوْلَاهُمْ بِهَا...[2] یعنی ہم نے آدمیوں کو نہیں بلکہ قرآن کو حَکَم قرار دیا تھا۔ چونکہ یہ قرآن دو جلدوں کے درمیان ایک لکھی ہوئی کتاب ہے جو زبان سے بولا نہیں کرتی۔ اسی لئے ضرورت تھی کہ اس

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۴۰۔ ۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۵۔

کے لئے کوئی ترجمان ہو اور وہ آدمی ہی ہوتے ہیں جو اس کی ترجمانی کیا کرتے ہیں۔ جب ان لوگوں نے ہمیں یہ پیغام دیا کہ ہم اپنے درمیان قرآن کو حَکَم ٹھہرائیں تو ہم ایسے لوگ نہ تھے کہ اللہ کی کتاب سے منہ پھیر لیتے جبکہ حق سبحانہٗ کا ارشاد ہے ''اگر تم میں کسی بات پر نزاع ہوجائے تو (اس کا فیصلہ نپٹانے کے لئے) اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو'' اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی کتاب کے مطابق حکم لگائیں اور رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم ان کی سنت پر چلیں۔ چنانچہ اگر کتاب اللہ کے مطابق سچائی کے ساتھ حکم لگایا جائے تو اس کی رو سے سب لوگوں سے زیادہ ہم (خلافت کے) حقدار ہوں گے اور اگر سنتِ رسولؐ کے مطابق حکم لگایا جائے تو بھی ہم اُن سے زیادہ اس کے اہل ثابت ہوں گے...

امام علیؑ نے معاویہ کے نام اپنے ایک خط میں تحکیم کے متعلق لکھا تھا:

وَقَدْ دَعَوْتَنَا اِلیٰ حُکْمِ الْقُرْآنِ وَ لَسْتَ مِنْ اَهْلِهِ وَ لَسْنَا اِیَّاکَ اَجَبْنَا وَ لٰکِنَّا اَجَبْنَا الْقُرْآنَ فِیْ حُکْمِهِ[1] تم نے ہمیں قرآن کے فیصلے کی طرف بلایا حالانکہ تم قرآن کے اہل نہیں ہو۔ ہم نے تمہاری آواز پر نہیں قرآن کے حکم پر لبیک کہی۔

خوارج اپنے ناقص فہم کے تحت سمجھتے تھے کہ وہ قرآن سے وابستہ ہیں اس لئے انہوں نے اپنے زمانے کے امام کی بات ماننے سے انکار کردیا تھا اور کہا تھا کہ حَکَم مقرر کرنا خدا کی نافرمانی ہے اور نافرمانی کفر کا موجب ہے۔ ہم اور تم گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں اور ہم نے تو توبہ کرلی ہے اب تم بھی اپنے کفر کا اقرار کرتے ہوئے توبہ کرو ورنہ ہم تم سے جنگ کریں گے۔

ان بدبختوں کے جواب میں حضرتؑ نے فرمایا:

اَبَعْدَ اِیْمَانِیْ بِاللّٰهِ وَجِهَادِیْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ اَشْهَدُ عَلٰی نَفْسِیْ بِالْکُفْرِ؟ لَقَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ۝[2] کیا خدا پر ایمان لانے اور رسولِ مقبولؐ کے ساتھ جہاد کرنے کے بعد میں اپنے آپ پر کفر کی گواہی دوں؟ اگر میں نے ایسا کیا تو میں گمراہ ہو جاؤں گا اور میں ہدایت پانے والوں میں سے قرار نہیں پاؤں گا۔

آپؑ نے اپنے ایک اور خطبے میں ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

فَاِنْ اَبَیْتُمْ اِلاَّ اَنْ تَزْعُمُوْا اَنِّیْ اَخْطَاْتُ وَ ضَلَلْتُ فَلِمَ تُضَلِّلُوْنَ عَآمَّةَ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ بِضَلاَلِیْ وَ تَاْخُذُوْنَهُمْ بِخَطَئِیْ وَ تُکَفِّرُوْنَهُمْ بِذُنُوْبِیْ سُیُوْفُکُمْ عَلٰی عَوَاتِقِکُمْ تَضَعُوْنَهَا مَوَاضِعَ الْبُرْءِ وَالسُّقْمِ وَ تَخْلِطُوْنَ مَنْ اَذْنَبَ بِمَنْ لَمْ یُذْنِبْ... فَاِنَّمَا حُکِّمَ الْحَکَمَانِ لِیُحْیِیَا مَا اَحْیَا الْقُرْآنُ

۱۔ نہج البلاغہ، خط ۴۸۔ ۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۵۸۔

وَيُمِيتَا مَا اَمَاتَ الْقُرْآنُ... فَاِنْ جَرَّنَا الْقُرْآنُ اِلَيْهِمُ اتَّبَعْنَاهُمْ وَاِنْ جَرَّهُمْ اِلَيْنَا اتَّبَعُوْنَا فَلَمْ آتِ —لاَ اَبَا لَكُمْ— بُجْرًا وَلاَ خَتَلْتُكُمْ عَنْ اَمْرِكُمْ وَلاَ لَبَّسْتُهُ عَلَيْكُمْ اِنَّمَا اجْتَمَعَ رَأْىُ مَلَئِكُمْ عَلَى اخْتِيَارِ رَجُلَيْنِ اَخَذْنَا عَلَيْهِمَا اَلاَّ يَتَعَدَّيَا الْقُرْآنَ فَتَاهَا عَنْهُ وَ تَرَكَا الْحَقَّ وَهُمَا يُبْصِرَانِهِ وَكَانَ الْجَوْرُ هَوَاهُمَا فَمَضَيَا عَلَيْهِ...[1] اگر تم اس خیال سے باز آنے والے نہیں ہو کہ میں نے غلطی کی اور گمراہ ہو گیا ہوں تو میری گواہی کی وجہ سے امتِ محمدؐ کے عام افراد کو کیوں گمراہ سمجھتے ہو اور میری غلطی کی پاداش انہیں کیوں دیتے ہو اور میرے گناہوں کے سبب سے انہیں کیوں کافر کہتے ہو۔ تلواریں کندھوں پر اٹھائے ہر موقع و بے موقع جگہ پر وار کئے جا رہے ہو اور بے گناہوں کو خطا کاروں کے ساتھ ملائے دیتے ہو... اور وہ دونوں حَکَم (ابوموسیٰ اور عمرو بن عاص) تو صرف اس لئے ثالث مقرر کئے گئے تھے کہ وہ ان ہی چیزوں کو زندہ کریں جنہیں قرآن نے زندہ کیا ہے اور ان ہی چیزوں کو نابود کریں جنہیں قرآن نے نیست و نابود کیا ہے... اب اگر قرآن ہمیں ان لوگوں کی اطاعت کی طرف لے جاتا ہے تو ہم ان کے پیرو بن جاتے اور اگر انہیں ہماری طرف لائے تو پھر انہیں ہمارا اتباع کرنا چاہئے۔ تمہارا برا ہو میں نے کوئی مصیبت تو کھڑی نہیں کی اور نہ کسی بات میں تمہیں دھوکا دیا ہے اور نہ اس میں فریب کاری کی ہے اور تمہاری جماعت کی ہی رائے قرار پائی تھی کہ دو آدمی چن لئے جائیں جن سے ہم نے یہ اقرار لیا تھا کہ وہ قرآن سے تجاوز نہ کریں گے لیکن وہ اچھی طرح دیکھنے بھالنے کے باوجود قرآن سے بہک گئے اور حق کو چھوڑ بیٹھے اور ان کے جذبات بے راہ روی کے مقتضی ہوئے چنانچہ وہ اس رَوش پر چل پڑے۔

امام علیؑ کی اس مدلل گفتگو نے بھی خوارج پر کوئی اثر نہ کیا اور خوارج حضرتؑ کے لشکر سے جدا ہو کر آپ سے جنگ کے منصوبے بنانے لگے اور انہوں نے افراد اور ہتھیار اکٹھے کئے اور جب امام علیؑ کو ان کے منصوبوں کی اطلاع ملی تو آپؑ نے فرمایا:

جب تک وہ فتنہ برپا نہ کریں اور خون نہ بہائیں اس وقت تک مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہوگا اور میں بیت المال سے ان کا وظیفہ بھی بند نہیں کروں گا۔

خوارج عبداللہ بن وہب راسبی کے گھر میں جمع ہوئے اور انہوں نے وہاں تقریریں کیں۔ تقریر کرنے والوں میں ذو الثدیہ بھی شامل تھا اور اس اجلاس میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں امام علیؑ سے باقاعدہ جنگ کرنی چاہئے۔ اجلاس میں شریک چند افراد نے ذو الثدیہ کو امیر بنانے کی تجویز پیش کی لیکن اس پر سب کا اتفاق نہ ہوسکا اور اس کی بجائے عبداللہ بن وہب راسبی کی قیادت پر سب نے اتفاق کرلیا اور اس کی بیعت کرلی۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۷۔

اس اجلاس کے بعد ان کی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی اور انہوں نے بصرہ اور دوسرے شہروں میں رہنے والے اپنے ہم مزاج افراد کو اپنے ساتھ شمولیت کے خط لکھے اور نہروان کے قریب "جوخاء" میں جمع ہوئے۔

وہاں انہوں نے چند مسلمانوں کو ناحق قتل کیا جن میں عبداللہ بن خباب بن ارت بھی شامل تھے۔ امام علیؑ نے انہیں ایک جگہ کا والی مقرر کیا تھا۔ خوارج انہیں اور ان کی حاملہ بیوی کو قید کر کے اپنے ہیڈ کوارٹر لے جارہے تھے کہ راستے میں کسی ذمی کا خنزیر انہیں دکھائی دیا۔ ایک خارجی نے اس خنزیر پر تلوار کا وار کیا تو دوسرے خارجی نے اس سے کہا کہ تو نے بہت غلط کیا۔ یہ ایک ذمی کا جانور تھا۔ تم اس کے پاس جاؤ اور اس سے معافی طلب کرو اور اسے راضی کرو۔

ابھی یہ جارہے تھے کہ راستے میں ایک کھجور کا پکا ہوا دانہ زمین پر گرا۔ ایک خارجی نے وہ دانہ اٹھا کر منہ میں ڈالا تو دوسرے نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ مالک کی اجازت یا قیمت کی ادائیگی کے بغیر تو نے کھجور کا دانہ کیوں اٹھا کر منہ میں ڈالا؟ جس نے وہ دانہ اٹھایا تھا اس نے دانہ فوراً منہ سے اُگل دیا۔

عبداللہ بن خبّاب نے جب ان کی یہ پرہیزگاری دیکھی تو کہا: تم دیندار لوگ ہو ہمیں تم سے کوئی خطرہ نہیں ہے یعنی ہمیں تم سے کسی ظلم کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

جب عبداللہ کو خوارج کے مرکز میں لایا گیا تو خوارج نے کہا: ابوبکرؓ اور عمرؓ کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ خوارج شیخین کے مداح تھے اسی لئے عبداللہ نے ازروئے تقیہ ان کی تعریف کی۔ پھر انہوں نے کہا کہ علیؑ نے حکم قبول کر کے کفر کیا ہے لہٰذا تم اس کے کفر کا اقرار کرو۔

عبداللہ نے ان کی یہ بات ٹھکرا دی۔ ان ظالموں نے کسی گوسفند کی طرح نہر کے کنارے انہیں شہید کر دیا۔ پھر انہوں نے ان کی حاملہ بیوی کا پیٹ چاک کر کے اس کے شکم سے بچہ برآمد کیا اور بچے کو ذبح کر دیا۔

حکمین کی خیانت کے بعد امام علیؑ دوبارہ معاویہ کے ساتھ جنگ کرنا چاہتے تھے اور آپ نے ساٹھ ہزار کا لشکر مرتب کیا اور صفّین کی طرف جانے لگے تو آپ کے سپاہیوں نے عرض کی: اگر ہم صفّین کی طرف چلے گئے تو ہمارے بعد خوارج لوگوں کا قتل عام کریں گے۔ اس لئے پہلے ان سے نمٹ لینا چاہئے اور پھر صفّین کی طرف روانہ ہونا چاہئے۔

جب امام علیؑ نے اپنی فوج کا اصرار ملاحظہ کیا تو آپ نے خوارج کی طرف پیش قدمی کی اور آپ نے خوارج کے نام ایک خط لکھا جس میں انہیں ان کی غلط حرکات پر تنبیہ فرمائی۔ آپ کے خط کے جواب میں خوارج نے لکھا: اگر تم اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کرلو تو پھر ہم تمہارے ہمرکاب ہو کر معاویہ سے جنگ کرنے پر غور کریں گے ورنہ ہم تم سے جنگ کریں گے۔ خدا خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

پھر آپ نے ابن عباسؓ کو سمجھانے بجھانے کی غرض سے ان کے پاس بھیجا لیکن ابن عباسؓ کے سمجھانے کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ چنانچہ اتمام حجّت کے لئے آپ خود ان کے پاس گئے اور بڑے مدلّل طریقے سے اپنا موقف پیش کیا۔ آپ کے دلائل کی وجہ سے کچھ لوگ گروہ خوارج سے الگ ہوگئے اور آپ کے لشکر میں شامل ہوگئے۔ پھر آپ نے فرمایا: ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے البتہ جنہوں نے عبداللہ بن خبّاب اور دیگر مسلمان بھائیوں کو قتل کیا ہے اور عبداللہ کی بیوی کا شکم چاک کر کے اس کے بچے کو ذبح کیا ہے وہ آدمی ہمارے حوالے کردو۔ ہم ان سے قصاص لیں گے۔

خوارج نے کہا: ہم سب تمہارے بھائیوں کے قاتل ہیں۔ ہم ان کے ساتھ تمہارے خون کو بھی حلال سمجھتے ہیں۔

حضرت نے انہیں نصیحت فرمائی اور عذاب الٰہی سے ڈرایا اور مسلمانوں کی مخالفت نہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا: تمہارے نفسِ امّارہ نے تمہارے برے کاموں کو تمہارے لئے مزیّن کر کے دکھایا ہے۔ تم مسلمانوں کو قتل کرتے ہو جبکہ خدا کے ہاں ایک پرندے کو بھی ناحق مارنا جرم ہے مگر تم مسلمانوں کے قتل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے؟

خوارج کے پاس حضرت کی دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا انہوں نے ایک دوسرے کو آواز دے کر کہا: ان سے کوئی بات نہ کرو اور انہیں کوئی جواب نہ دو اور اپنے پروردگار کی ملاقات کیلئے آمادہ ہو جاؤ اور بہشت جانے کی تیاری کرو اور جہاد کے لئے صفیں بنالو اور جنگ پر آمادہ ہو جاؤ۔ امام علیؑ ان کی یہ بات سن کر واپس آگئے۔

جنگ سے پہلے کسی نے آکر کہا کہ خوارج نہر پار کر کے ہماری طرف آرہے ہیں۔ امام علیؑ نے فرمایا کہ یہ ناممکن ہے وہ نہر عبور کر کے ہماری طرف نہیں آسکتے۔ پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے آکر یہ خبر دی کہ خوارج نہر عبور کر چکے ہیں اور ہماری طرف آرہے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا کہ نہیں ان کی موت نہر کے اس کنارے پر ہی واقع ہوگی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی افراد آئے اور سب نے وہی ایک خبر دہرائی۔

امام علیؑ نے فرمایا: مَصَارِعُهُمْ دُوْنَ النُّطْفَةِ وَاللهِ لَا يُفْلِتُ مِنْهُمْ عَشَرَةٌ وَلَا يَهْلِكُ مِنْكُمْ عَشَرَةٌ. ان کے مرنے کی جگہ تو پانی کے اسی طرف ہے۔ خدا کی قسم! ان میں سے دس بھی بچ کر نہیں جاسکیں گے اور تم میں سے دس بھی ہلاک نہ ہوں گے۔[1]

سید رضی فرماتے ہیں: اس خطبے میں نطفہ سے مراد نہر کا پانی ہے۔

آخرالکلام امام علیؑ نے ان کے سامنے اپنے لشکر کی صف بندی کی اور میمنہ اور میسرہ ترتیب دیا۔ پھر

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۵۹۔

آپ نے ایک جگہ مقرر کی اور ابوایوب انصاریؓ کو پرچم عطا کیا اور فرمایا کہ ندا کریں کہ خوارج کو چھوڑ کر جو بھی اس پرچم تلے آجائے اسے امان ہے۔ یہ سنتے ہی بہت سے لوگ خوارج کے لشکر کو چھوڑ کر آپ کے پرچم تلے آگئے اور یوں عبداللہ بن وہب راسبی کی قیادت میں کم وبیش چار ہزار کا لشکر رہ گیا۔

جنگ شروع ہوئی اور امام علیؑ کی پیشگوئی کے مطابق سارے خارجی میدانِ جنگ میں مارے گئے البتہ دس سے کچھ کم افراد بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔

ذُوالشدیہ کی تلاش

جنگ ختم ہونے کے بعد آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: جاؤ اور ذُوالشدیہ کو تلاش کرو۔

آپ کے اصحاب گئے اور ذُوالشدیہ کی لاش کو تلاش کرتے رہے مگر انہیں اس کی لاش نہ مل سکی۔ وہ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں اس کی لاش نہیں ملی۔

آپ نے فرمایا: دوبارہ جاؤ اور اس کی لاش کو تلاش کرو۔ اس کی لاش یقیناً یہیں ہے۔

حضرت کے اصحاب دوبارہ گئے اور اچھی طرح سے تلاش کیا مگر اس کی لاش کہیں دکھائی نہ دی۔ انہوں نے آ کر کہا کہ اس کی لاش ہمیں نہیں ملی۔

حضرت نے فرمایا: اس جگہ کا کیا نام ہے؟

لوگوں نے کہا: یہ نہروان ہے۔

آپ نے فرمایا: خدا کی قسم نہ تو میں نے جھوٹ بولا اور نہ ہی پیغمبرؐ نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا۔ ذوالشدیہ ان ہی مقتولین میں موجود ہے جاؤ اور اس کو تلاش کرو۔

اس بار امام علیؑ خود بھی اپنے اصحاب کے ساتھ نہر کے کنارے آئے جہاں کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے۔ جب وہاں سے پچاس یا اس سے کچھ زیادہ افراد کی لاشیں ہٹا کر ایک طرف رکھی گئیں تو ذُوالشدیہ کی لاش ان سب کے نیچے کیچڑ میں سے برآمد ہوئی۔

اس کی لاش برآمد ہوتے ہی امام علیؑ نے تکبیر کہی اور سجدے میں گر گئے اور آپ نے طولانی سجدہ کیا۔ پھر سجدے سے سر اٹھا کر آپ نے فرمایا: اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ تم پیغمبرِ اکرمؐ کے وعدے پر انحصار کر کے نیک اعمال سے ہاتھ اٹھالو گے تو میں تمہیں بتاتا کہ رسولِ خداؐ نے خوارج سے جنگ کرنے والوں کو کیا خوش خبری سنائی تھی۔[1]

۱۔ حافظ ابن کثیر، تاریخ البدایہ والنہایہ، ج ۷ ص ۲۸۹ تا ۳۰۶۔

ایک اور راوی کا بیان ہے کہ میں اپنے آقا و مولا کے ساتھ نہروان کی جنگ میں شریک تھا اور میں نے محسوس کیا کہ لوگ ان کے قتل سے ہچکچا رہے تھے کیونکہ ان میں قاریانِ قرآن کی کثرت تھی۔ جب حضرت نے اپنی فوج کو متذبذب دیکھا تو فرمایا: اے لوگو! رسولِ خداؐ نے ہمیں خبر دی تھی کہ ہم کئی گروہوں سے جنگ کریں گے اور ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو دین سے نکل جائیں گے اور پھر دین میں داخل نہیں ہوں گے اور اس گروہ کی علامت یہ ہوگی کہ ان میں ایک ایسا شخص موجود ہوگا جس کا ایک ہاتھ نہیں ہوگا اور اس کے کولہے پر پستان کی طرح سے گوشت ہوگا اور پستان میں سوراخ ہوگا اور اس پستان پر سات بال اُگے ہوئے ہوں گے۔ لہٰذا تم جاؤ اور اس قسم کے مقتول کو ان میں تلاش کرو۔

لوگ گئے اور اس کی لاش کو بہت سی لاشوں کے نیچے کیچڑ میں سے تلاش کر کے لائے۔ جب امام علیؑ نے اس کی لاش دیکھی تو آپ نے تکبیر کہی اور فرمایا: خدا اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا تھا۔

جب حضرت کے ساتھیوں نے ذوالثدیہ کو دیکھا تو سب نے تکبیر کہی اور ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور سب خدا کے حضور سجدۂ شکر بجالائے۔[1]

ذوالثدیہ (پستان والے) کے متعلق رسولِ خداؐ کی پیشگوئی صحابہ میں بڑی مشہور تھی اور حد یہ ہے کہ عمرو بن عاص نے اپنی ایک جنگ کے متعلق یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس نے ذوالثدیہ کو قتل کیا ہے اور اس نے اس مضمون کا خط لکھ کر بی بی عائشہؓ کے پاس روانہ کیا: ''میں نے ذوالثدیہ اور اس کے گروہ کو مصر میں دریائے نیل کے کنارے قتل کر دیا ہے۔''

بی بی عائشہؓ نے مسروق سے جو کہ کوفے کا رہائشی تھا پوچھا: کیا تمہیں کچھ علم ہے کہ علیؑ نے جنگ نہروان میں ذوالثدیہ کو قتل کیا تھا؟

مسروق نے کہا: مجھے کوئی علم نہیں ہے۔

بی بی عائشہؓ نے اس سے کہا: جو لوگ نہروان کی جنگ میں شریک تھے ان سے ملاقات کرو اور ذوالثدیہ کے قتل کے متعلق ان کی گواہی تحریر کر کے میرے پاس روانہ کرو۔

مسروق کا بیان ہے کہ میں بی بی کے حکم پر کوفہ آیا اور اس وقت کوفہ میں سات قبائل آباد تھے اور میں نے ہر قبیلے میں سے دس دس افراد سے جو کہ جنگ کے عینی گواہ تھے ملاقات کی اور ان سے گواہی طلب کی تو سب نے مل کر ایک گواہی نامہ تیار کیا جس میں انہوں نے یہ لکھا: ''ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ علیؑ نے دوسرے خوارج کے ساتھ نہروان میں ذوالثدیہ کو قتل کیا۔''

۱۔ حافظ ابن کثیر، تاریخ البدایہ والنہایہ، ج ۷ ص ۲۸۹ تا ۳۰۶۔

اور گواہی نامہ کے آخر میں تمام افراد نے اپنے اپنے دستخط ثبت کئے اور میں ستر افراد کا تیار کردہ گواہی نامہ لے کر بی بی کے پاس گیا اور انہیں وہ گواہی نامہ پڑھ کر سنایا تو بی بی نے کہا: کیا ان تمام افراد نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ علیؑ نے خود ذو الثدیہ کو قتل کیا تھا؟

میں نے کہا: میں نے ان تمام لوگوں سے یہی سوال کیا تھا اور سب نے مجھے یہی بتایا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے علیؑ کے ہاتھوں ذو الثدیہ کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

بی بی عائشہؓ نے کہا: خدا عمرو بن عاص پر لعنت کرے اس نے مجھے لکھا تھا کہ اس نے دریائے نیل کے کنارے خوارج کے ساتھ جن میں ذو الثدیہ شامل تھا جنگ کی اور انہیں قتل کر دیا۔

عمرو بن عاص نے جھوٹا خط اس لئے تحریر کیا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ تمام صحابہ کو آنحضرتؐ کی وہ پیشنگوئی یاد ہے جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا تھا: مسلمانوں میں عنقریب دو گروہ ہو جائیں گے اور وہ آپس میں جنگ کریں گے —جنگِ صفین کی طرف اشارہ ہے— پھر ان دو گروہوں میں سے جو گروہ سچا ہوگا وہ خوارج کے ساتھ حق پر لڑائی کرے گا اور ان پر فتح یاب ہوگا اور علامت یہ ہوگی کہ خوارج میں وہ شخص قتل ہوگا جس کے کولہے پر ایک پستان ہوگا جس میں سوراخ ہوگا اور اس پستان پر بال ہوں گے۔

عمرو بن عاص نے اس ذریعے سے یہ تأثر دینے کی کوشش کی کہ رسول خداؐ کے فرمان کے مطابق جس گروہ نے ذو الثدیہ کو قتل کرنا تھا وہ ہمارا گروہ ہے اور اس پیشنگوئی کے تحت ہمارا ہی گروہ حق کا علمبردار ہے۔

جب بی بی نے گواہی نامہ دیکھا تو بے اختیار اُن کے آنسو جاری ہوگئے اور وہ بولیں: خدا علیؑ پر رحمت نازل کرے۔ وہ حق پر تھے اور جس طرح سے عورتیں اپنے شوہر کے خاندان سے جھگڑا کرتی ہیں اسی طرح سے میں نے بھی علیؑ سے جھگڑا کیا تھا۔[1]

امام علیؑ کی جنگوں کے نتائج

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ قریش نے طاقت حاصل کر کے قریشی حکومت قائم کی اور اس کے بعد انہوں نے اپنے خاندان میں دولت جمع کی اور انتظامی، سیاسی اور فوجی عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی قیادت و برتری کے لئے جھوٹی احادیث بھی تیار کرائیں۔ قریش کے ان تمام اقدامات کے نتیجے

۱۔ حافظ ابن کثیر، تاریخ البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۳۰۴۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ محمد بن ابی بکرؓ کے قتل کے بعد پیش آیا کیونکہ اس دوٗر میں اپنے بھائی کے قتل کی وجہ سے بی بیؓ کے معاویہ سے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں "نقش عائشہ در تاریخ اسلام"۔

میں اسلام کا مستقبل تاریک ہونے لگا اور دین کے نام پر ایک قبیلہ کی موروثی قسم کی حکومت قائم ہوگئی۔ اس حکومت میں صرف اسلام کا نام باقی تھا اور نام کے علاوہ کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ لوگ حقیقتِ اسلام کی شناخت سے اتنے دور ہوگئے تھے کہ جب لوگوں نے طلحہ، زبیر اور بی بی عائشہؓ کو امام علیؑ کے مقابلے پر دیکھا تو شبہہ میں مبتلا ہوگئے اور وہ حق و باطل میں تمیز نہ کرسکتے تھے۔ جنگِ جمل کے موقع پر حضرت کی فوج کے ایک سپاہی نے حضرت سے گزارش کی: اے امیرالمومنینؑ! یہ عائشہؓ پیغمبر اسلامؐ کی زوجہ اور مومنین کی ماں ہیں اور یہ طلحہ و زبیر ہیں اور یہ دونوں مہاجرین کی جماعت کے بزرگ ہیں۔ ہم ان سے جنگ کیسے کریں؟

امیرالمومنینؑ نے فرمایا: اِنَّہٗ مَلْمُوْسٌ عَلَیْکَ وَاِنَّ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ لَا یُعْرَفَانِ بِالنَّاسِ وَلٰکِنِ اعْرِفِ الْحَقَّ تَعْرِفْ اَھْلَہٗ وَ اعْرِفِ الْبَاطِلَ تَعْرِفْ مَنْ اَتَاہُ۔ تمہیں مغالطہ ہوا ہے۔ شخصیات حق اور باطل کا معیار نہیں ہیں۔ پہلے حق کو سمجھو، تمہیں اہلِ حق سمجھ آجائیں گے اور باطل کو سمجھو، تمہیں اہلِ باطل کا پتا چل جائے گا۔[۱]

امام علیؑ کو حکومت پر فائز کرنے میں خدا کی تقدیر اور حکمت یہ تھی کہ عالمِ اسلام میں صرف علیؑ ہی وہ واحد شخصیت تھے جو قریش کے فتنے کو ختم کرکے اسلام کو نئی زندگی دے سکتے تھے۔ امام علیؑ اپنی تین خصوصیات یعنی (۱) ذاتی فضائل و کمالات (۲) خدمتِ اسلام کیلئے درخشاں کردار اور (۳) مشہور صحابہ کی حمایت کی وجہ سے قریش کے فتنے کا ڈٹ کر مقابلہ کرسکتے تھے۔

رسولِ خداؐ کے پردہ فرمانے کے بعد قریش برسرِاقتدار آئے تو انہوں نے انصار کو ہمیشہ دبانے کے لئے اپنے خاندان کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں جس کی وجہ سے انہیں لوگوں میں ایک خاص مقام حاصل ہوگیا تھا۔ لہٰذا اگر قریشی ہونا کچھ بھی باعث فضیلت تھا تو یہ بات امام علیؑ میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی کیونکہ آپ شیخ بطحا حضرت ابوطالبؑ کے فرزند، سردارِ مکہ حضرت عبدالمطلبؑ کے پوتے اور حضرت ہاشم کے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کا حَسَب نَسَب اتنا بلند تھا جس کا باقی خلفاء کے متعلق تصور تک بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

خلافت پر فائز ہونے والے افراد ''جماعتِ صحابہ'' کے فرد تھے اسی لئے انہوں نے صحابہ کے مناقب کی روایات نشر کرنے کی اجازت دی تھی (بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مناقبِ صحابہ میں جعلی احادیث کی سرپرستی بھی کی تھی)۔

صحابیت اگر کسی کے لئے وجہ افتخار ہوسکتی تھی تو امام علیؑ سے بڑھ کر رسولِ خداؐ کا اور کوئی صحابی نہیں تھا۔ آپ کا رسولِ خداؐ سے عرصۂ صحبت باقی تمام صحابہ سے کہیں زیادہ تھا۔ آپ صرف رسول خداؐ کے صحابی ہی نہیں بلکہ چچازاد بھائی اور داماد بھی تھے۔ اور آپ نے خدا کی راہ میں ہجرت بھی کی تھی اور شبِ ہجرت بسترِ رسولؐ پر سوکر آنحضرتؐ کی جان بچائی تھی۔ علاوہ ازیں رسولِ خداؐ نے ہر مناسب موقع پر آپ کی فضیلت میں احادیث ارشاد

۱۔ ابن واضح کاتب، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۱۰۔

فرمائی تھیں۔ اگرچہ صدرِ اول کی خلافتوں میں انہیں چھپانے کی بہتیری کوششیں کی گئیں مگر اس کے باوجود دنیا آپ کے فضائل سے واقف تھی۔

آپ اسلامی خدمات کا طویل اور زرین ریکارڈ بھی رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ ہی قریش کے فتنے سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ آپ نے صدرِ اول کے غزوات میں سیکڑوں مخالفین اسلام کو قتل کیا تھا۔ آپ نے جنگِ بدر میں قریش کے سرداروں اور جنگِ اُحُد میں ان کے علمداروں کو جہنم رسید کیا تھا۔ آپ نے عرب کے مشہور سورما عَمرو بن عَبدِوَد کو جنگِ خندق میں اور یہودیوں کے مردِ میدان مَرحب کو خیبر میں قتل کیا تھا اور جب جنگِ حُنین میں رفاقت کا دعویٰ کرنے والے رسولِ خداؐ کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے تو اس مشکل وقت میں آپؑ ہی رسولِ خداؐ کی حفاظت کر رہے تھے۔ صدرِ اول کے اکثر غزوات کی فتح کا سہرا آپ ہی کے سر تھا۔

امام علیؑ کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ مشہور صحابہ آپ کے ہمرکاب تھے جن کی وجہ سے آپ کو طلحہ و زبیر جیسے قریشیوں نیز خارجیوں کے فتنے کو ختم کرنے میں مدد ملی۔ ان مشہور صحابہ میں اولادِ پیغمبر یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ سرفہرست تھے۔ جنگِ جَمل میں پندرہ سو مشہور صحابہ آپ کے ہمرکاب تھے۔[1]

جنگِ صِفّین میں آپ کے ساتھ سترّ بدری صحابہ تھے اور ان کے علاوہ آپ کے پرچم کے سائے میں سات سو وہ صحابی بھی تھے جنھوں نے آنحضرتؐ کے ہاتھ پر بیعتِ رِضوان کی تھی۔[2] ان کے علاوہ چار سو مہاجرین

۱۔ بحار الانوار، ج ۳۲، ص ۱۹۶۔

۲۔ رسولِ خداؐ ۶ھ میں چودہ سو صحابہ کی معیت میں عمرہ ادا کرنے مکہ روانہ ہوئے یہاں تک کہ آپؐ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے۔ اس زمانے میں قریش کی یہ روایت تھی کہ وہ کسی کو بھی حج و عمرہ سے منع نہیں کرتے تھے اور اپنے بدترین دشمن بلکہ باپ کے قاتل کو بھی زیارتِ کعبہ سے نہیں روکتے تھے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہؐ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کرنے آرہے ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آنحضرتؐ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ ادھر آنحضرتؐ نے حضرت عثمانؓ کو سلسلہ جنبانی کے لئے مکہ بھیجا تو اہلِ مکہ نے انہیں روک لیا اور جنگ کے لئے تیار ہوگئے۔ اس موقع پر رسولِ خداؐ نے اپنے صحابہ سے جنگ کی صورت میں نہ بھاگنے پر بیعت لی تھی اور یہ بیعت ایک درخت کے نیچے لی گئی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ بیعت کرنے والوں میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بھی شامل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت میں سورۂ منافقون نازل فرمائی تھی۔ بہرنوع جیسے ہی وہ بیعت مکمل ہوئی تو یہ آیت نازل ہوئی: لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا○ جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا۔ اور جو (خلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کرلیا تو ان پر سکون نازل فرمایا اور انہیں جلد فتح (یعنی فتح خیبر) عنایت کی۔ (سورۂ فتح: آیت ۱۸)

چونکہ یہ بیعت ایک درخت کے نیچے ہوئی تھی اس لئے اسے بیعت الشجرة اور بیعت کرنے والوں کو اصحاب بیعة الشجرة کہا جاتا ہے۔ اور یہ بات ان صحابہ کے لئے فخر و مباہات کا باعث ہے کہ خدا ان سے راضی ہوا (اسی نسبت سے یہ بیعت کتابوں میں بیعتِ رِضوان کے نام سے زیادہ مشہور ہے) لیکن یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ صرف مومنین سے راضی ہوا لہٰذا اگر بیعت میں کوئی منافق مثل عبداللہ بن ابی شامل ہوگیا ہو تو اسے خدا کی رضا حاصل نہیں ہوئی اور وہ اس آیت میں مدح کا مصداق نہیں ہے۔

وانصار بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ الغرض حضرت کے لشکر میں دوہزار آٹھ سو صحابہ شریک تھے جبکہ معاویہ کے لشکر میں صرف دو صحابی تھے۔ ایک نعمان بن بشیر اور دوسرے مسلمہ جو سابقین میں سے نہیں تھے۔[1]

امام علی علیہ السلام کے وفادار ساتھیوں میں حضرت عمار یاسرؓ کا نام سرفہرست ہے۔ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عمار یاسرؓ کو حق و باطل کی پہچان کے لئے معیار مقرر کیا تھا اور فرمایا تھا: یَاعَمَّارُ تَقْتُلُکَ الْفِئَۃُ الْبَاغِیَۃُ وَاَنْتَ مُذْ ذَاکَ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَکَ یَاعَمَّارَ بْنَ یَاسِرٍ اِنْ رَاَیْتَ عَلِیًّا قَدْ سَلَکَ وَادِیًا وَ سَلَکَ النَّاسُ غَیْرَہٗ فَاسْلُکْ مَعَ عَلِیٍّ. اے عمارؓ! تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ اس وقت تم حق پر ہوگے اور حق تمہارے ساتھ ہوگا۔ اے عمار بن یاسرؓ! اگر علیؑ ایک وادی میں چلے اور دوسرے لوگ دوسری وادی میں چلیں تو تم علیؑ کے ساتھ چلنا۔[2]

عمار بن یاسرؓ قریشی نہیں تھے۔ ان کی والدہ کنیز تھیں اس لئے قریش انہیں اپنی خلافت میں رکاوٹ تصور نہیں کرتے تھے اور ان کے فضائل چھپانا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ صحابہ کے اذہان میں رسولِ خداؐ کا فرمان مسلسل گردش کر رہا تھا کہ عمّارؓ حق کے ساتھ ہے اور حق عمّارؓ کے ساتھ ہے اور عمّارؓ کو باغی گروہ قتل کرے گا۔ حضرت عمّارؓ جنگِ جمل اور صفّین میں امام علیؑ کے ساتھ تھے۔ لوگ انہیں حضرت کے ساتھ دیکھ کر ہی سمجھ جاتے تھے کہ امام علیؑ حق پر ہیں اور ان کے مخالف باطل پر ہیں۔ امام علی علیہ السلام کے ساتھ عمّارؓ کی موجودگی کتنی مؤثر تھی اس کا اندازہ حسبِ ذیل واقعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ایک دن زبیر کے اردگرد بڑی تعداد میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص نے آکر کہا: علی بن ابی طالبؑ ہماری طرف آرہے ہیں اور ان کے لشکر میں عمّارؓ بھی ہیں۔

زبیر نے کہا: عمّارؓ ان کے ساتھ نہیں ہوسکتے۔

اس شخص نے کہا: میں عمّارؓ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔

زبیر نے کہا: نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔

پھر زبیر نے تحقیق کے لئے ایک اور شخص کو بھیجا۔ جب وہ شخص واپس آیا تو اس نے کہا: ہاں! میں بھی عمّارؓ کو علیؑ کے ساتھ دیکھ آیا ہوں۔

یہ سنتے ہی زبیر پر کپکپی طاری ہوگئی اور اسے رسولِ خداؐ کا وہ فرمان یاد آگیا کہ عمّارؓ حق کے ساتھ ہے اور اسے ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔

۱۔ ابن واضح کاتب، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۸۸۔

۲۔ اسد الغابہ، درحالات عمار یاسر از روایت ابوایوب انصاریؓ۔

زبیر کے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص نے جب زبیر کی یہ حالت دیکھی تو اس نے اپنے آپ سے کہا: وائے ہو مجھ پر! میں تو ان لوگوں کو حق پر سمجھ کر ان کے ساتھ شامل ہوا تھا جبکہ خود انہیں اپنے حق پر ہونے میں شک ہے۔ میں حق کی طرف ـــ یعنی لشکرِ علیؑ کی طرف ـــ جا رہا ہوں۔[1]

مسعودی لکھتے ہیں: عمّار، مہاجرین و انصار اور ان کی ایک ہزار اولاد کے ساتھ بصرہ میں وارد ہوئے۔

جنگِ صفّین کے موقع پر امام علیؑ کی فوج کا ایک سپاہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں کوفہ سے بصیرت و اعتقاد کے ساتھ آپ کے لشکر میں شامل ہو کر یہاں تک آیا لیکن یہاں پہنچتے ہی میں نے دیکھا کہ ہم نے اذان دی تو انہوں نے ـــ لشکرِ معاویہ نے ـــ بھی اذان دی۔ ہم نے نماز پڑھی تو انہوں نے بھی نماز پڑھی۔ یہ چیز دیکھ کر میں شک میں پڑ گیا ہوں۔

حضرت نے اس سے فرمایا: تم عمّار سے ملے ہو؟

اس نے کہا: نہیں۔

حضرت نے فرمایا: جاؤ۔ جا کر عمّار سے ملو اور جو وہ کہیں اس پر عمل کرو۔

نصر بن مزاحم نے اپنی سَنَد سے اسماء بن فزاری سے روایت کی ہے کہ ہم صفّین میں حضرت عمار بن یاسرؓ کے دستے میں شامل تھے۔ ہم نے سرخ چادر نیزوں پر تانی ہوئی تھی اور اس کے سائے میں آفتاب کی تپش سے پناہ لے رکھی تھی کہ ناگاہ ایک شخص لشکر کی صفوں کو چیرتا ہوا ہمارے پاس آیا اور پوچھا کہ تم میں عمّار بن یاسرؓ کون ہیں؟ حضرت عمارؓ نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے کہا: اے ابویقظان! مجھے ایک بات کہنی ہے سب کے سامنے کہوں یا تنہائی میں؟

حضرت عمارؓ نے کہا: سب کے سامنے کہو تو بہتر ہے۔

اس شخص نے کہا: جب میں اپنے گھر سے چلا تھا تو مجھے یقین تھا کہ معاویہ اور اس کے ساتھی گمراہی کے راستے پر ہیں مگر یہاں آیا تو دیکھا کہ وہ بھی ہماری ہی طرح اذان دیتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں۔ ان کی کتاب بھی قرآن ہے۔ ان کے اور ہمارے رسولؐ ایک ہی ہیں۔ جب میں نے یہ صورت دیکھی تو مجھے تعجب ہوا اور بے چینی ہونے لگی۔ صبح کو میں امیرالمومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صورتِ حال بیان کی تو آپ نے فرمایا: کیا تم عمّار بن یاسرؓ سے ملے ہو؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ان سے ضرور ملاقات کرو اور جو وہ کہیں مان لو۔ اب میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ دیکھوں آپ کیا کہتے ہیں۔

عمار بن یاسرؓ نے کہا: وہ سامنے صاحبِ سیاہ پرچم دیکھ رہے ہو۔ یہ عمرو بن عاص ہے۔ میں نے تین

۱۔ نقش عائشہ در تاریخ اسلام، ج۲، ص۷۸۔ تاریخ طبری، ج۵، ص۲۵۰۔

مرتبہ بدر، احد اور حنین میں رسولِ خداؐ کی معیت میں جنگ میں حصہ لیا ہے۔ اب یہ چوتھی بار جنگ میں شرکت کر رہا ہوں اور اس دفعہ حالت کچھ پہلے سے بدتر ہی ہے۔

کیا جنگِ بدر، احد اور حنین میں تم نے یا تمہارے والد نے شرکت کی تھی؟

اس شخص نے کہا: نہیں۔

عمارؓ نے کہا: آج ہماری یہ جگہ ایسے ہی ہے جیسے پیغمبرؐ کی جگہ ہوا کرتی تھی اور ہمارے دشمن کی جگہ ایسے ہی ہے جیسے دشمنانِ پیغمبرؐ کی ہوا کرتی تھی۔ اگر یہ لوگ ہمیں مارتے ہوئے خلیج و بحرین تک بھی کیوں نہ پہنچا دیں پھر بھی ہمیں اس بات کا یقین ہوگا کہ ہم حق پر ہیں اور یہ باطل پر۔[1]

پرچم کا واقعہ یہ ہے کہ رسولِ خداؐ جب بھی جنگ کے لئے لشکر روانہ کرتے تو اپنے دستِ مبارک سے سپہ سالار کو پرچم عطا فرماتے تھے۔ ایک بار رسولِ اکرمؐ نے ایک سیاہ پرچم باندھ کر اس کے پھریرے کو لہرایا اور فرمایا: کوئی ہے جو مجھ سے یہ پرچم لے کر اس کا حق ادا کرے؟

لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! اس کا حق کیا ہے؟

آپ نے فرمایا: اس کا حق یہ ہے کہ اس کو اٹھانے والا کفار کے سامنے پشت نہ دکھائے اور زندگی میں کبھی بھی یہ پرچم مسلمانوں کے مقابلے میں نہ لہرائے ورنہ اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ عمرو بن عاص نے آنحضرتؐ کی شرط کو تسلیم کر کے آپ سے وہ پرچم لیا تھا۔ رسولِ اکرمؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس کی زیرِ قیادت روانہ کیا تھا۔

جنگ کے بعد عمرو بن عاص نے اس پرچم کو اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا اور جب وہ معاویہ کی مدد اور امام علیؑ کے مقابلے کے لئے صفین میں آیا تو اس نے اس پرچم کو امام علیؑ کے مقابلے میں لہرایا اور جیسے ہی اس نے وہ پرچم لہرایا تو دونوں لشکروں میں شور سا مچ گیا۔

یہ وہ پرچم ہے جو رسولِ خداؐ نے اپنے ہاتھوں سے باندھ کر عمرو بن عاص کو دیا تھا۔

عمار یاسرؓ نے اس وقت کہا: جی ہاں! پرچم تو وہی ہے لیکن یہاں لہرانے کی وجہ سے عمرو بن عاص خدا اور رسولؐ کی لعنت کا حقدار بن گیا ہے کیونکہ رسولِ خداؐ نے جب اسے یہ پرچم عطا کیا تھا تو فرمایا تھا کہ اسے مسلمانوں کے مقابلے پر کبھی مت لہرانا اور جو بھی اسے مسلمانوں کے مقابلے پر لہرائے گا تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔[2]

حضرت عمارؓ کی وجہ سے عمرو بن عاص کی ترکیب کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ پھر عمرو بن عاص نے چاہا کہ

۱و۲۔ نصر بن مزاحم، وقعۃ صفین، ص ۳۲۱ تا ۳۲۲۔

ایک اور طریقے سے اہلِ شام کو ترغیب دی جائے۔ چنانچہ اس نے عمّار سے کہا: تم عثمانؓ کے متعلق کیا کہتے ہو؟

حضرت عمّار نے کہا: تم پر فتنہ کا دروازہ سب سے پہلے عثمانؓ نے کھولا تھا۔[1]

الغرض رسولِ خداؐ نے عمّار کو حق کا معیار قرار دیا تھا اس لئے بہت سے لوگ جنگِ صفّین میں عمّار کے اردگرد جمع تھے اور اس کی زیرِ قیادت دشمن سے جنگ کر رہے تھے۔[2]

جب جنگِ صفّین میں عمّار زخمی ہوئے اور انہوں نے پانی مانگا تو انہیں لسّی پیش کی گئی۔ لسّی کو دیکھتے ہی انہوں نے کہا: رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ تیری آخری غذا لسّی کا ایک گھونٹ ہوگا۔ لاؤ مجھے دو۔ پھر انہوں نے لسّی کا جام پیا اور میدانِ کارزار کی طرف چلے گئے اور وہاں رجز پڑھا:

اَلْيَوْمَ اَلْقَى الْاَحِبَّه   مُحَمَّدًا وَّ حِزْبَه

آج میں اپنے دوستوں یعنی محمد مصطفیٰؐ اور ان کی جماعت سے ملاقات کروں گا۔

پھر انہوں نے جنگ کی یہاں تک کہ وہ شہید ہوگئے۔ عمّار کے قتل کے بعد لشکرِ معاویہ کے دو سپاہی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ اسے میں نے قتل کیا ہے اور دوسرا کہتا تھا کہ نہیں یہ میرا کارنامہ ہے۔

دونوں سپاہی جھگڑ رہے تھے کہ وہاں سے عمرو بن عاص کا گزر ہوا۔ اس نے پوچھا: کس چیز پر لڑ رہے ہو جہنم میں جانے پر؟

معاویہ نے عمرو بن عاص کو ملامت کرتے ہوئے کہا: تو نے اپنے سپاہیوں سے یہ بات کیوں کہی تھی؟ عمّار کے شہید ہوتے ہی لشکرِ شام میں شور مچ گیا کہ ہم باطل پر ہیں۔

معاویہ نے اپنے سپاہیوں کو گمراہ کرنے کے لئے کہا: ہم نے تو عمّار کو قتل نہیں کیا۔ عمار کو تو اس نے قتل کیا ہے جو انہیں ہمارے نیزوں کے آگے لے آیا۔ یعنی اسے امام علیؑ نے قتل کرایا کیونکہ اگر علیؑ اسے میدان میں نہ لاتے تو عمّار قتل نہ ہوتے۔

معاویہ کا یہ فریب سن کر امام علیؑ نے فرمایا تھا: اس طرح کی تاویل سے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت حمزہؓ کے قاتل خود رسولِ اکرمؐ تھے کیونکہ اگر آپؐ حضرت حمزہؓ کو جنگ میں نہ لاتے تو وہ شہید نہ ہوتے۔

حضرت عمّار کی شہادت سے نبی اکرمؐ کی یہ پیشگوئی تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ پوری ہوئی۔

جی ہاں! یہ امام علی علیہ السلام کے ذاتی کمالات، ان کی اسلامی خدمات اور ان کے وفاشعار دوستوں کی برکت تھی کہ آپ نے قریش کے خلاف کامیاب جنگ لڑی اور میدانِ جمل میں ان کی قوت کو توڑ کر رکھ دیا۔

۱۔ نصر بن مزاحم، وقعۃ صفّین، ص ۱۳۷۔

۲۔ تاریخ طبری، ج ۶، ص ۳۷۔ اسد الغابہ، ج ۴، ص ۴۶۔

خوارج کا اِبطال

خوارج قریشی نہیں تھے اور وہ قریش کی سیادت و قیادت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی پوری تاریخ میں قریش کے خلاف شورش کرتے رہے۔ وہ لوگ ظاہری طور پر بڑے عابد و زاہد اور پارسا تھے۔ قریش کی سرکشی اور ان کی زر اندوزی پر ہمیشہ تنقید کیا کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے طلحہ، زبیر اور ام المومنین کے کہنے پر حضرت عثمانؓ کا محاصرہ کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی وفات کے بعد یہ افراد امام علیؑ کے لشکر میں شامل ہوگئے تھے اور جنگِ جَمل کے وقت بھی وہ آپ کے لشکر میں تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے قبیلۂ بکر بن وائل کے ایک شخص کی بیعت کی اور اس کی اقتدا میں نماز پڑھی۔ اس نماز میں کوئی ایک آدھ قریشی بھی شامل تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر خوارج کے شاعر شبیل بن عزرہ نے یہ شعر کہا تھا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّزَ دِيْنَهُ صَلَّتْ قُرَيْشٌ خَلْفَ بَكْرِ بْنِ وَائِلِ [1]

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اپنے دین کو عزت دی اور قریش نے بکر بن وائل کے پیچھے نماز پڑھی۔

یہی وجہ تھی کہ جب معاویہ نے عمرو بن عاص کو اور امام علیؑ نے ابن عباسؓ کو اپنی طرف سے صفّین میں حَکَم مقرر کیا تو اس وقت خوارج نے بگڑ کر کہا تھا: ہماری تقدیر کا فیصلہ دو قریشی نہیں کریں گے۔

پھر انہوں نے امام علیؑ کو مجبور کر کے ابوموسیٰ اشعری کو بطورِ حَکَم نامزد کرایا۔

امام علیؑ نے برسرِ اقتدار آتے ہی قریش نواز پالیسیوں کو یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ آپ نے بیت المال کے وظائف میں قریش اور غیر قریش کا فرق ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے جنگِ جَمل و صفّین میں قریش کی قیادت کا مقابلہ کیا اسی لئے اصولی طور پر خوارج کے پاس حضرت کی مخالفت کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن ان کی بدبختی نے انہیں یہ روزِ بد دکھایا اور حضرت نے انہیں جتنی بھی نصیحت کی انہوں نے اس پر کان نہ دھرے آخر کار آپ کو مجبور ہو کر نہروان میں ان کے خلاف کارروائی کرنی پڑی۔

اگر امام علیؑ کی بجائے معاویہ ان سے جنگ کرتا تو مسلمانوں کی نظر میں خوارج کی گمراہی کا تصور کبھی بھی پیدا نہ ہوتا۔ عامۃ المسلمین انہیں صالح مسلمان ہی سمجھتے رہتے۔ اگر امام علی علیہ السلام خوارج پر ہاتھ نہ ڈالتے تو تمام عبادت گزار اور دیندار مسلمان آہستہ آہستہ خارجیت کو قبول کر لیتے اور اگر لوگ خارجی ہو جاتے تو آج نہ تشیّع کا اسلام ہوتا اور نہ تسنّن کا اسلام۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت نے جنگِ نہروان کے بعد اپنے ایک خطبے میں حمد و ثناء کے بعد یہ فرمایا تھا:

۱۔ تاریخ طبری، ج۹، ص۶۳ در ذکر حوادث ۱۳۷۔

يَا اَيُّهَا النَّاسُ فَاِنِّيْ فَقَأْتُ عَيْنَ الْفِتْنَةِ وَلَمْ يَكُنْ لِيَجْتَرِیءَ عَلَيْهَا اَحَدٌ غَيْرِيْ. یعنی اے لوگو! میں نے فتنہ وشر کی آنکھیں پھوڑ ڈالی ہیں۔ میرے علاوہ کسی میں اس کام کو سرانجام دینے کی جرأت نہیں تھی۔[۱]

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے

بے روح اور بے معرفت لمبی لمبی نمازیں پڑھنے والے تقدس مآب ظاہر بین عابدوں کی سرکوبی اتنا بڑا کام تھا کہ امام علیؑ اور صرف امام علیؑ ہی اسے انجام دے سکتے تھے۔ حد یہ ہے کہ یہ کام کرگزرنا حسنین کریمینؑ کے بس میں بھی نہیں تھا۔

امام علیؑ نے اپنے ان اقدامات سے مٹتے ہوئے اسلام کو بچالیا اور رہتی دنیا تک لوگوں کو بتادیا کہ قریش اور خوارج کے اسلام کے علاوہ ایک حقیقی اسلام بھی موجود ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۹۳۔

امام علیؑ کی اپنی حکومت میں اسلامی خدمات

اسلام کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں۔ اسلام تقویٰ کے علاوہ کسی بھی چیز کو وجہِ تکریم قرار نہیں دیتا جیسا کہ ارشادِ باری ہے: یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ○ اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ خدا کے ہاں تم میں سے زیادہ عزّت والا وہی ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔ (سورۂ حجرات: آیت ۱۳)

سیرتِ رسول مقبولؐ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ عرب اور غیر عرب میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتے تھے اور بیت المال سے تمام مسلمانوں کو برابر حصہ عطا فرماتے تھے۔

رسولِ مقبولؐ کی وفات کے بعد خلفائے ثلاثہ نے آپؐ کی مساوات کی پالیسی کو بدل دیا تھا۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ نے انصار میں سے کسی کو بھی سالارِ لشکر مقرر نہیں کیا تھا۔ انصار نے مجبور ہو کر ان سے احتجاج کیا تو انہوں نے چاروناچار ثابت بن قیسؓ کو ایک مرتبہ سپہ سالار مقرر کیا[1] ورنہ تمام انتظامی اور عسکری عہدے صرف اور صرف قریش کے لئے مخصوص تھے۔

خلیفۂ دوم نے بھی اپنے پورے عہدِ حکومت میں اپنے پیشرو کی پالیسیوں پر عمل کیا یہاں تک کہ انہوں نے اپنی وفات کے وقت انتخابِ خلیفہ کے لئے جو کونسل تشکیل دی تھی اس کے تمام اراکین بھی قریشی تھے جبکہ اس وقت طلحہ و زبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف سے زیادہ باصلاحیت انصار موجود تھے۔ خلیفۂ دوم نے قریش کو عرب پر اور عرب کو غیر عرب پر فوقیت دی تھی اور ایک ایسا قانون بنایا تھا جس کی رو سے کوئی عرب، قریشی عورت سے اور کوئی غیر عرب، عرب عورت سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔ انہوں نے اپنے مسلسل اقدامات سے اسلامی معاشرے کو نسل پرست معاشرے میں تبدیل کردیا تھا۔ پھر جب انہوں نے بیت المال سے وظائف کا سلسلہ شروع کیا تو

۱۔ ابن واضح کاتب، تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۴۹۔ ابراہیم بن محمد بن سعید ثقفی، کتاب الغارات، ص۳۲۔

اس میں بھی طبقات بندی سے کام لیا تھا۔ بدریوں کے لئے پانچ ہزار درہم، اُحد میں لڑنے والوں کے لئے چار ہزار درہم اور جنگِ خندق میں حصہ لینے والوں کے لئے تین ہزار درہم مقرر کئے اور عام افراد کے لئے سالانہ دوسو درہم کا وظیفہ مقرر کیا تھا۔ رسولِ خداؐ کی ہر بیوی کے لئے دس ہزار درہم اور بی بی عائشہؓ کے لئے بارہ ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا گیا تھا۔

ان کے بعد خلیفۂ ثالث نے بھی اس پالیسی کو جاری رکھا البتہ انہوں نے یہ ضرور کیا کہ اپنے خاندان بنی امیہ کو قریش پر مقدم رکھا اور تمام کلیدی عہدوں پر اپنے عزیز واقارب کو متعین کیا۔

خلفائے ثلاثہ کی رَوِش کی وجہ سے اسلامی حکومت قریشی حکومت میں تبدیل ہوگئی اور قریش اس وقت کے بڑے سرمایہ دار بن گئے اور اسلامی معاشرہ نسلی اور طبقاتی معاشرے میں تبدیل ہوکر رہ گیا۔ اس دوُر میں افریقہ، روم اور ایران کے جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے انہیں اس اسلامی نظام میں کہیں بھی اپنے لئے کوئی مقام دکھائی نہیں دیتا تھا اور قدم قدم پر انہیں طبقاتی نظام کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

طبقاتی نظام کا خاتمہ اور سماجی انصاف کا قیام

جب امام علی علیہ السلام برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے خلفائے ثلاثہ کی سیرت کے بجائے سیرتِ رسولؐ پر عمل کیا اور ایسے اقدامات کئے جن سے قریشی، غیر قریشی اور عربی و عجمی کی تفریق ختم ہوگئی۔ جیسے ہی آپ کی بیعت مکمل ہوئی تو آپ نے بیت المال کے دروازے کھول دیئے اور تمام افراد کو یکساں وظیفہ دیا اور ہر شخص کے حصے میں تین تین دینار آئے۔

امام علیؑ کے آزاد کردہ غلام قنبر کو تین دینار ملے اور خود امام علیؑ کے حصے میں بھی تین دینار آئے۔

امام علی علیہ السلام نے اپنے دوُرِ حکومت میں غیر قریشیوں کو بھی اعلیٰ عہدے دیئے۔ چنانچہ آپ نے عثمان بن حنیفؓ کو گورنرِ بصرہ، ان کے بھائی سہل بن حنیفؓ کو گورنرِ مدینہ اور مالک اشترؓ کو گورنرِ مصر مقرر کیا جبکہ حضرت کی حکومت سے پہلے قبیلۂ انصار ان عہدوں کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ آپ نے قریش اور بالخصوص بنی ہاشم کے باصلاحیت افراد کو بھی کلیدی عہدے دیئے۔

امام علیؑ نے اپنے کردار سے طبقاتی اور نسل پرستی پر مبنی نظام کو ختم کیا۔ اس امر کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ آپ مسجدِ کوفہ میں تشریف فرما تھے اور اس وقت غیر عرب موالی آپ کے گرد جمع تھے۔ قبیلۂ کندہ کے سردار اشعث بن قیس کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اس نے آپ سے کہا: امیرالمومنین! سرخ فام[1] لوگوں

1۔ عرب عام طور پر صحرانشین تھے اور گرم موسم کی وجہ سے ان کے رنگ سانولے اور سیاہ ہوتے تھے جبکہ ایرانی اور رومی سرد علاقوں کے رہنے والے تھے اس لئے ان کی رنگت سرخ وسفید ہوتی تھی اور عرب انہیں سرخ فام کہا کرتے تھے۔

نے ہمارے اور آپ کے درمیان فاصلہ پیدا کر دیا ہے۔

اشعث کی اس بات سے آپ ناراض ہوئے اور فرمایا: مَنْ یَعْذِرُنِیْ مِنْ هٰؤُلَاءِ الضَّیَاطِرَة. ان جیسے بدماغ افراد کے متعلق کون میرا عذر قبول کرے گا۔[1]

حضرت نے سابقہ خلفاء کی پالیسی کو ترک کر کے غیر عرب افراد کی حوصلہ افزائی کی جبکہ آپ سے پہلے انہیں تیسرے درجے کا شہری تصور کیا جاتا تھا۔ آپ سے قبل خلفاء کے اردگرد صرف اشعث بن قیس جیسے عرب شیوخ ہی بیٹھا کرتے تھے۔

قبائل عرب کے سرداروں کو حضرت کی یہ رَوِش پسند نہیں تھی۔ طلحہ و زبیر کا تعلق صحابہ کرامؓ کی جماعت سے تھا اور وہ بھی خلفائے ثلاثہ کے مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدا میں وہ حضرت کے مخالف نہیں تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے مفادات کو خطرہ لاحق ہو چکا ہے اور ان کی سب مراعات ختم ہونے کو ہیں تو انہوں نے آہستہ آہستہ حضرت سے علیحدگی اختیار کرنی شروع کر دی۔ وہ مسجد میں اپنا علیحدہ حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے اور بنی امیہ کے مراعات یافتہ لوگ بھی انہیں اپنا آخری سہارا سمجھ کر ان کے اردگرد جمع ہونے لگ گئے تھے۔ آخرکار ان کے دلوں کی بات ان کی زبان پر آ ہی گئی اور انہوں نے حضرت سے کہا: کیا یہی آپ کا انصاف ہے۔ ہم مہاجرینِ اوّلین ہیں۔ جو لوگ ہماری تلوار کے ذریعے سے مسلمان ہوئے اور وہ بھی جو کل تک ہمارے غلام تھے اور ہم نے انہیں آزاد کیا آج ہمارے برابر حقوق حاصل کرنے لگے ہیں۔

حضرت نے ان کے جواب میں فرمایا: میرے بھائیو! رسولِ خداؐ کا طور طریقہ ہم سب نے دیکھا ہوا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ آنحضرتؐ بیت المال کو کس طرح سے تقسیم فرمایا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ بیت المال کی دولت کو فوراً تقسیم کر دیتے تھے اور کل کے لئے کچھ بھی بچا کر نہیں رکھتے تھے۔ ابوبکرؓ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ عمر بن خطابؓ نے ایک اور رَوِش اپنائی۔ وہ بیت المال کی رقم کو سال میں ایک بار تقسیم کرتے تھے۔ یعنی دولت پورا سال بیت المال میں پڑی رہتی تھی۔ سال گزرنے کے بعد وہ اسے لوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں رسولِ خداؐ کی سنت پر عمل کرتا ہوں۔[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ امام علیؑ ہر جمعہ کے جمعہ بیت المال کی رقم لوگوں میں تقسیم کر دیتے اور پھر بیت المال کے کمرے میں جھاڑو دلا دیتے اور پانی کا چھڑکاؤ کرا دیتے تھے۔ پھر وہاں مصلی بچھا کر دو رکعت نماز ادا کر کے بیت المال سے خطاب کر کے کہتے تھے: قیامت کے دن گواہی دینا کہ میں نے مسلمانوں کا مال تجھ

۱۔ ابراہیم بن محمد بن سعید ثقفی، کتاب الغارات، ص۳۴۱۔ (تَاجُ الْعُرُوْس: الضِّیْطِرُ: الضَّخمُ الْمُکْتَنِزُ)

۲۔ ایضاً، ص۳۲۔

میں ذخیرہ کر کے نہیں رکھا تھا۔[1]

ایک مرتبہ اصفہان سے کچھ مال آپ کے پاس کوفہ لایا گیا جس میں ایک روٹی بھی تھی۔ اس وقت کوفہ میں سات قبائل رہائش پذیر تھے۔ آپ نے اس مال کے سات حصے کئے اور اس کے ساتھ آپ نے روٹی کے بھی سات حصے کئے۔ پھر ہر قبیلے کو ۱/۷ حصہ عنایت فرمایا اور ہر حصے کے ساتھ روٹی کا ساتواں حصہ بھی رکھا۔

اسی طرح ایک بار آپ کے پاس کچھ رقم لائی گئی۔ آپ نے سات قبیلوں کے شیوخ کو جمع کیا اور رقم کے سامنے ایک طناب کھینچ کر فرمایا کہ اس طناب کو کوئی عبور نہ کرے۔ راوی کہتا ہے کہ ہم طناب کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ حضرت بھی طناب کے دوسری طرف بیٹھ گئے اور فرمایا کہ رؤسائے قبائل کہاں ہیں؟ شیوخ اٹھے اور اپنی بوریاں لے آئے۔ حضرت نے ہر ایک کی بوری میں اس کے قبیلے کا حصہ بھرا اور ان سے کہا: اسے اپنے قبائل میں تقسیم کر دو۔[2]

شعبی بیان کرتے ہیں:

میں مسجدِ کوفہ میں گیا۔ میں نے وہاں امیر المومنینؑ کو سونے چاندی کے دو ڈھیروں پر بیٹھا ہوا دیکھا۔ اس وقت آپ ایک لکڑی کے ذریعے سے لوگوں کو ہٹا رہے تھے۔ آپ اس ڈھیر کو تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد آپ نے مٹھی بھر بھر کر قبائلِ کوفہ کے شیوخ کے درمیان اس سونے چاندی کو تقسیم کر دیا۔ یہاں تک کہ اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد آپ اٹھ کر اپنے گھر کو چل دیئے اور اس خزانے میں سے اپنے لئے کچھ بھی حصہ نہ اٹھایا۔

راوی کہتا ہے کہ اس وقت میں کم سن تھا۔ میں اپنے باپ کے پاس آیا اور اس سے کہا: آج میں دنیا کے بہترین شخص یا احمق شخص کو دیکھ کر آیا ہوں۔

میرے باپ نے کہا: تو نے کسے دیکھا ہے؟

میں نے کہا: میں نے امیر المومنین علیؑ کو دیکھا۔ پھر میں نے جو واقعہ گزرا تھا کہہ سنایا۔

میرے والد یہ سن کر رو پڑے اور کہا: تو نے دنیا کے بہترین شخص کو دیکھا ہے۔[3]

راوی کہتا ہے کہ ایک دن میں نے امام علیؑ کو تلوار اٹھائے ہوئے دیکھا۔ آپ فرما رہے تھے: کوئی مجھ سے یہ تلوار خریدے گا؟ اگر میرے پاس ایک پیراہن کی رقم ہوتی تو میں اسے کبھی فروخت نہ کرتا۔

ایک شخص نے کہا: میں آپ کو قرض دیتا ہوں۔

آپ نے اس سے کچھ رقم قرض لے کر پیراہن خریدا اور تلوار فروخت نہیں کی۔[4]

۱۔ کتاب الغارات، ص ۳۱ و ۳۳۔ ۲۔ ایضاً، ص ۳۴ و ۳۵۔ ۳۔ ایضاً، ص ۳۶۔ ۴۔ ایضاً، ص ۴۰۔

کوفہ کی ایک عورت کا بیان ہے کہ بیت المال میں کچھ خورد و نوش کا سامان آیا۔ امام علیؑ نے چھوٹے چھوٹے تھیلے بنا کر اسے ہمارے درمیان تقسیم کر دیا۔[1]

ایک بار بیت المال کی تقسیم کے وقت دو عورتیں حضرت کی خدمت میں آئیں۔ ان میں سے ایک عرب اور دوسری غیر عرب تھی۔ آپ نے ان دونوں کو پچیس پچیس درہم اور ایک ایک کُر[2] غلّہ عنایت فرمایا۔

عرب عورت نے کہا: اے امیرالمومنینؑ! یہ غیر عرب ہے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا: ان اموال کے متعلق مجھے یہ کہیں دکھائی نہیں دیا کہ اسحاقؑ کی اولاد پر اولادِ اسماعیلؑ کا حق فائق ہے۔[3]

حضرت علیؑ نے یہ الفاظ اس لئے کہے تھے کہ عرب اپنے آپ کو اولادِ اسماعیلؑ اور ایرانیوں کو اولادِ اسحاقؑ سمجھتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے مالک اشترؓ سے اس بات کا شکوہ کیا کہ لوگ مجھے چھوڑ کر معاویہ کے پاس جا رہے ہیں۔ مالک اشترؓ نے عرض کیا:

يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! اِنَّا قَاتَلْنَا اَهْلَ الْبَصْرَةِ بِاَهْلِ الْكُوْفَةِ وَالرَّاْىُ وَاحِدٌ وَ قَدِ اخْتَلَفُوْا بَعْدُ وَتَعَادَوْا وَ ضَعُفَتِ النِّيَّةُ وَقَلَّ الْعَدَدُ وَاَنْتَ تَاْخُذُهُمْ بِالْعَدْلِ وَ تَعْمَلُ فِيهِمْ بِالْحَقِّ وَ تُنْصِفُ الْوَضِيْعَ مِنَ الشَّرِيْفِ وَلَيْسَ لِلشَّرِيْفِ عِنْدَكَ فَضْلُ مَنْزِلَةٍ عَلَى الْوَضِيْعِ فَضَجَّتْ طَائِفَةٌ مِمَّنْ مَعَكَ مِنَ الْحَقِّ اِذَا عُمُّوْا بِهِ وَاغْتَمُّوْا مِنَ الْعَدْلِ اِذْ صَارُوْا فِيْهِ وَصَارَتْ صَنَائِعُ مُعَاوِيَةَ عِنْدَ اَهْلِ الْغِنٰى وَالشَّرَفِ فَتَاقَتْ اَنْفُسُ النَّاسِ اِلَى الدُّنْيَا وَقَلَّ مِنَ النَّاسِ مَنْ لَيْسَ لِلدُّنْيَا بِصَاحِبٍ... فَاِنْ تَبْذُلُ الْمَالَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ تَمِلْ اِلَيْكَ اَعْنَاقُ النَّاسِ وَ تَصِفُ نَصِيْحَتُهُمْ وَ تَسْتَخْلِصُ وُدُّهُمْ صَنَعَ اللّٰهُ لَكَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ كَبَتَ عَدُوَّكَ وَ فَضَّ جَمْعَهُمْ وَ اَوْهَنَ كَيْدَهُمْ وَ شَتَّتَ اُمُوْرَهُمْ اِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ. فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَقَالَ: اَمَّا مَاذَكَرْتَ مِنْ عَمَلِنَا وَ سِيْرَتِنَا بِالْعَدْلِ فَاِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ "مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيْدِ" وَاَنَا مِنْ اَنْ اَكُوْنَ مُقَصِّرًا فِيْمَا ذَكَرْتَ اَخْوَفُ وَ اَمَّا مَاذَكَرْتَ مِنْ اَنَّ الْحَقَّ ثَقُلَ عَلَيْهِمْ فَفَارَقُوْنَا لِذٰلِكَ فَقَدْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّهُمْ لَا يُفَارِقُوْنَا مِنْ جَوْرٍ وَلَمْ يَلْتَمِسُوْا اِلَّا دُنْيَا زَائِلَةً عَنْهُمْ كَاَنْ قَدْ فَارَقُوْهَا. اَمَّا مَاذَكَرْتَ مِنْ بَذْلِ الْاَمْوَالِ وَاصْطِنَاعِ الرِّجَالِ فَاِنَّا لَا يَسَعُنَا اَنْ نُعْطِيَ امْرَءًا مِنَ الْفَيْءِ اَكْثَرَ مِنْ حَقِّهِ.

۱۔ کتاب الغارات، ص ۳۸۔ ۲۔ کُر ساٹھ قفیز اور قفیز آٹھ کیل اور ہر کیل ۱/۵ صاع اور ہر صاع چار مُد کا ہوتا ہے۔

۳۔ کتاب الغارات، ص ۴۶۔

ہم اہلِ بصرہ کے مقابلے میں اہلِ کوفہ کو جنگ میں لے گئے تھے۔ اس وقت سب یک رائے تھے۔ جنگِ جمل کے بعد لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا اور ہمارے متعلق دشمنیاں پیدا ہوئیں اور ارادوں میں کمزوری آ گئی اور تعداد کم ہونے لگی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ عدل کے مکمل تقاضوں کو ہر وقت ملحوظ رکھتے ہیں اور آپ حق پر عمل کرتے ہیں اور کمزور کو طاقتور سے انصاف دلاتے ہیں اور کسی مراعات یافتہ شخص کی آپ کے پاس کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔ آپ اسے بھی عام شخص کے برابر رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کے ساتھی چیخنے لگے کیونکہ ان پر عدل گراں گزرا اور اس کے برعکس معاویہ اثر و رسوخ رکھنے والے لوگوں کو انعام و اکرام سے نواز رہا ہے۔ لوگوں کے دل دنیا کی طرف مائل ہو چکے ہیں اور ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہیں دنیا سے عشق نہ ہو... امیرالمومنینؑ! اگر آپ دولت خرچ کریں تو لوگ آپ کی جانب مائل ہوں گے، وہ آپ کی خیرخواہی کریں گے، آپ سے دوستی رکھیں گے، اس سے آپ کا دشمن رسوا ہوگا، ان کی جمعیت ٹوٹ جائے گی، ان کے منصوبے کمزور پڑ جائیں گے اور ان کے امور کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ جو کچھ لوگ کر رہے ہیں اللہ کو اس کی پوری خبر ہے۔

مالک اشترؓ کے اس مشورے کے جواب میں امام علیؑ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی اور پھر فرمایا:

تم نے جو کچھ ہماری عادلانہ رَوِش کے متعلق کہا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''جو کوئی نیکی کرے گا وہ اپنے لئے کرے گا اور جو کوئی بُرائی کرے گا وہ بھی اپنے لئے کرے گا۔ تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔'' اگر میں نے عدل میں کوئی کوتاہی کی تو مجھے زیادہ خوف ہوگا اور تم نے جو یہ کہا کہ ''لوگوں پر حق گراں گزرا ہے اس لئے انہوں نے ہمیں چھوڑا ہے'' خدا نے دیکھ لیا کہ یہ لوگ ہمارے کسی ظلم کی وجہ سے ہمیں نہیں چھوڑ رہے۔ یہ لوگ تو جلد زائل ہونے والی دنیا کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں چھوڑ رہے ہیں۔ اور جو تم نے یہ کہا کہ ''اثر و رسوخ رکھنے والوں کو مال و دولت عطا کروں'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بیت المال سے کسی کو بھی اس کے حق سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے۔[1]

ایک اور روایت میں مذکور ہے کہ امیرالمومنینؑ کے کچھ اصحاب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے امیرالمومنینؑ! آپ غلاموں اور غیر عرب افراد کی بہ نسبت اشرافِ عرب اور قریش کو زیادہ رقم دیا کریں اور ان کے علاوہ آپ کو جن لوگوں کی مخالفت اور چھوڑ جانے کا اندیشہ ہو انہیں زیادہ رقم دیا کریں۔

حضرت کے ساتھیوں نے یہ گزارش اس لئے کی تھی کہ معاویہ یہی کچھ کر رہا تھا۔

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

اَتَامُرُوْنِّی اَنْ اَطْلُبَ النَّصْرَ بِالْجَوْرِ؟ وَاللّٰہِ لَا اَفْعَلُ مَا طَلَعَتْ شَمْسٌ وَمَالَاحَ فِی السَّمَآءِ نَجْمٌ

۱۔ کتاب الغارات، ص ۴۶۔

وَاللّٰہِ لَوْکَانَ مَالُھُمْ لِیْ لَوَاسَیْتُ بَیْنَھُمْ فَکَیْفَ وَاِنَّمَا ھِیَ اَمْوَالُھُمْ۔ کیا تم مجھ سے یہ مطالبہ کرتے ہو کہ میں لوگوں پر ظلم کر کے مدد حاصل کروں؟ خدا کی قسم! جب تک سورج طلوع ہوتا رہے گا اور جب تک آسمان پر ستارے جھلملاتے رہیں گے اس وقت تک میں ایسا نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم! بیت المال کی دولت اگر میری ذاتی ملکیت بھی ہوتی تب بھی میں اسے انصاف سے تقسیم کرتا جبکہ حالت یہ ہے کہ یہ مال میرا ذاتی نہیں بلکہ عوام الناس کا اپنا مال ہے (بھلا میں غیر منصفانہ تقسیم کیوں کروں)[1]

ایک اور روایت میں مذکور ہے کہ امام علی علیہ السلام نے ایک سال میں تین مرتبہ بیت المال تقسیم کیا۔ اس کے بعد اصفہان کا خراج آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے فرمایا: اے لوگو! کل آنا اور اپنا حصہ لے جانا۔ خدا کی قسم! میں تمہارا خزینہ دار نہیں ہوں۔

بیت المال کی تقسیم کے بعد آپ نے خزانے میں جھاڑو پھروایا اور وہاں نماز ادا کی۔[2]

امام علیؑ مدینے میں رہ کر یہ کام نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہاں قریش کی اکثریت تھی۔ مدینے کی بجائے یہ کام کوفے میں بہتر طریقے سے سرانجام دیا جاسکتا تھا کیونکہ کوفے میں غیر عرب اور غیر قریش کی تعداد زیادہ تھی۔

حضرت نے ایک نابینا شخص کو لوگوں سے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تو پوچھا: یہ کون ہے؟

لوگوں نے کہا: یہ عیسائی ہے۔

حضرت نے فرمایا: جب تک یہ تندرست تھا تم نے اس سے کام کرایا اور جب یہ معذور ہوگیا تو تم نے اسے لاوارث چھوڑ دیا۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ اس کی ضروریات بیت المال سے پوری کی جائیں۔[3]

اس طرح امام علی علیہ السلام نے اپنے نتیجہ خیز سیاسی اقدامات سے طبقاتی نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا اور اسلامی معاشرے میں سماجی انصاف کو رواج دیا۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو لوگ یہی سمجھتے کہ قریشیوں کی حکومت کا نام اسلام ہے۔

معارفِ اسلام کی نشر و اشاعت

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اوصیائے رسولؐ کی اصل ذمہ داری خدا کے دین کی حفاظت اور تبلیغ ہے۔ اس حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اوصیاء یعنی ائمۂ اہلبیت علیہم السلام کی بنیادی ذمہ داری اسلام کی حفاظت اور تبلیغ تھی۔ چنانچہ امام علی علیہ السلام نے اقتدار میں آ کر اسلام کے عقائد، اخلاق اور احکام کی تبلیغ و حفاظت فرمائی اور اپنی اس ذمہ داری کو بطریقِ احسن انجام دیا۔

۱۔ کتاب الغارات، ص۴۸۔ ۲۔ ایضاً، ص۵۴۔ ۳۔ وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص۴۹۔

کفارِ مکہ کی ایذا رسانیوں کی وجہ سے رسولِ خداؐ مکے میں پوری طرح سے اسلام کی تبلیغ نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی مکے میں اسلامی حکومت تشکیل دے سکتے تھے حتیٰ کہ جب وہاں آپؐ کی جان کو خطرہ درپیش ہوا تو آپؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی۔ آپؐ کے بعد آہستہ آہستہ آپؐ کے دوست اور مددگار بھی آپؐ سے آملے۔

مدینے میں قریش کا اثر ونفوذ نہیں تھا اس لئے آپؐ نے وہاں اسلامی حکومت قائم کی اور یوں مدینے سے پورے عرب میں اسلام کی آواز گونج اٹھی اور بالآخر آپ کے فرض رسالت کی تکمیل ہوگئی۔ اگر آپؐ مدینہ ہجرت نہ فرماتے تو شریعت اسلام مکے میں ہی دم توڑ دیتی اور دنیا میں کہیں بھی اس کا نام ونشان نہ ہوتا۔

رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحلت کے بعد وہی قریش جو مکہ میں اسلام کے سخت ترین مخالف تھے مدینہ میں رسولِ اسلامؐ اور ان کی شریعت کے وارث بن بیٹھے۔ انہوں نے سقیفہ میں کہا: محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سلطنت کے متعلق ہم سے کون جھگڑا کر سکتا ہے؟ ہم قریشی ہیں اور پیغمبر اکرمؐ کا تعلق بھی قریش سے تھا۔[1]

حکومت اور جنگی غنائم کی گنگا میں ہاتھ دھونے کی وجہ سے قریش نے بہت زیادہ دولت جمع کرلی تھی اور مدینے کی زمینوں کو بھی آپس میں بانٹ لیا تھا۔ ان زمینوں کی آبادکاری کے لئے حضرت ابوبکرؓ کے حامی انصار سے مدد حاصل کی گئی اور ان سے ہاریوں اور مزارعین کا کام لیا گیا۔ قریش نے جس طرح سے مکے میں پیغمبر اکرمؐ کو تبلیغ نہیں کرنے دی اسی طرح یہاں مدینے میں بھی انہوں نے اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد پیغمبر اکرمؐ کی احادیث پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کردیں۔ پھر قریش نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قرآن مجید کو نبی اکرمؐ کی تفسیر سے الگ کردیا اور احکامِ اسلام میں متعدد تبدیلیاں کیں۔ اسلامی معاشرے کو طبقاتی اور نسلی معاشرے میں تبدیل کردیا۔ اپنے آپ کو ارفع و اعلیٰ اور انصار کو ماتحت اور زیردست طبقہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس میں خاصے کامیاب بھی رہے۔

حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد پہلی مرتبہ مسلمان اپنی تقدیر کے خود مالک بنے اور پوری آزادی کے ساتھ انہوں نے امام علیؑ کی بیعت کی اور رسولِ خداؐ کی بیعت کے بعد اسلام میں یہ پہلی صحیح بیعت تھی جس میں کسی طرح کے زور زبردستی اور لالچ کو دخل نہیں تھا۔ جب امام علیؑ اس بیعت کے نتیجے میں برسرِ اقتدار آئے اور آپ نے اپنی اصلاحات کا عمل انصار کے لائق افراد کو عہدے دے کر شروع کیا تو قریش نے آپ کے خلاف شورش برپا کردی اور بی بی عائشہؓ اور طلحہ و زبیر کی زیرِ قیادت حضرت سے خونریز جنگ کی۔[2] اسی لئے امام علیؑ مدینے میں اپنی اصلاحات کے عمل کو جاری نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ مدینہ سابقہ خلفاء کی حکومت کا مرکز رہ چکا تھا۔

۱۔ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۴۵۶۔ معالم المدرستین، ج ۱، ص ۱۴۸۔

۲۔ اس نکتے کی وضاحت کیلئے دیکھیں نقش عائشہ در تاریخ اسلام، ج ۲، ص ۲۰۵ تا ۲۷۴ اور ج ۲، ص ۲۱ تا ۲۳۱۔

چنانچہ آپ نے مدینے کی بجائے کوفے کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا کیونکہ کوفے میں قریش کے علاوہ عربوں کے دوسرے قبائل بھی آباد تھے اور وہاں نومسلم ایرانی بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے جو کہ حقیقی اسلام سمجھنے کے شدید خواہش مند تھے۔

آپ نے اپنی چار سالہ مختصر حکومت میں اسلام کی نشرواشاعت کے لئے تین طرح کے اقدامات کئے۔
(۱) اپنے خطبات سے تبلیغ (۲) اچھے شاگردوں کی تربیت (۳) نقلِ حدیث کے لئے صحابہ کو ترغیب دینا۔

(۱) اپنے خطبات سے تبلیغ

آپ نے رسولِ خداؐ سے جس حقیقی اسلام کی تعلیم پائی تھی کوفے میں اسی اسلام کی تبلیغ کی اور یوں آپ نے قرآن کے احکام اور سنتِ رسولؐ کا تحفہ اسلامی معاشرے کو واپس لوٹایا۔

ہم یہاں قرآن وسنت کے متعلق حضرتؑ کی خدمات کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیتے ہیں:

(ا) قرآن کریم کی خدمت: امام علی علیہ السلام نے بچپن میں رسولِ خداؐ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی تھی اور رسولِ خداؐ نے آپ کی تربیت کی تھی۔ آپ اکثر اوقات رسولِ خداؐ کے ساتھ رہتے تھے اور براہِ راست ان سے معارفِ اسلام حاصل کرتے تھے۔ جب پہلی بار غارِ حرا میں قرآن مجید نازل ہوا تو اس وقت بھی آپ رسولِ خداؐ کے ہمراہ غارِ حرا میں موجود تھے۔ آپ نے وہاں پہلے فرشتے کی آواز اور پھر شیطان کی چیخ سنی تھی۔ آپ نے خطبۂ قاصعہ میں رسولِ خداؐ کے ساتھ اپنی طویل مصاحبت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اَرٰی نُوْرَ الْوَحْیِ وَ الرِّسَالَةِ وَ اَشُمُّ رِیْحَ النُّبُوَّةِ. وَلَقَدْ سَمِعْتُ رَنَّةَ الشَّیْطَانِ حِیْنَ نَزَلَ الْوَحْیُ عَلَیْهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ فَقُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذِهِ الرَّنَّةُ؟ فَقَالَ: هٰذَا الشَّیْطَانُ اَیِسَ مِنْ عِبَادَتِهٖ. اِنَّکَ تَسْمَعُ مَا اَسْمَعُ، وَ تَرٰی مَا اَرٰی، اِلَّا اَنَّکَ لَسْتَ بِنَبِیٍّ، وَلٰکِنَّکَ لَوَزِیْرٌ وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خَیْرٍ.
میں وحی و رسالت کا نور دیکھتا تھا اور نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا۔ جب آپ پر (پہلے پہل) وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کی ایک چیخ سنی جس پر میں نے پوچھا یارسول اللہ! یہ آواز کیسی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ شیطان ہے جو اپنے پوجے جانے سے مایوس ہوگیا ہے۔ جو میں سنتا ہوں وہی تم سنتے ہو اور جو میں دیکھتا ہوں وہی تم دیکھتے ہو۔[1]

آپ نے رسولِ خداؐ سے اپنے علمی استفادے کو یوں بیان کیا:

کَانَتْ لِیْ مَنْزِلَةٌ مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ لَمْ تَکُنْ لِاَحَدٍ مِّنَ الْخَلَائِقِ فَکُنْتُ اٰتِیْهِ کُلَّ سَحَرٍ وَاَقُوْلُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ فَاِنْ تَنَحْنَحَ انْصَرَفْتُ اِلٰی اَهْلِیْ وَاِلَّا دَخَلْتُ عَلَیْهِ. یعنی

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲۔

رسولِ اکرمؐ کے ہاں مجھے ایک خاص مقام حاصل تھا جو کہ میرے علاوہ خلائق میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں تھا۔ میں روزانہ صبح آپؐ کے گھر جاتا اور دروازے پر کھڑا ہو کر سلام کرتا تھا۔ اگر رسولِ اکرمؐ مصروف ہوتے تو کھنکھارتے اور میں اپنے گھر واپس چلا جاتا تھا۔ ورنہ میں آپؐ کے حجرے میں داخل ہو جاتا تھا۔[1]

امام علیؑ، رسولِ اکرمؐ سے قرآن مجید کی شرح، بیان، تفسیر اور آیات کا شانِ نزول سن کر یاد کر لیتے تھے اور پھر اسے لکھ لیتے تھے۔ آپؑ نے اس کے متعلق فرمایا:

وَاللهِ مَا نَزَلَتْ آيَةٌ اِلاَّ وَقَدْ عَلِمْتُ فِيْمَا نَزَلَتْ وَ اَيْنَ نَزَلَتْ وَ عَلٰى مَنْ نَزَلَتْ اِنَّ رَبِّيْ وَهَبَ لِيْ قَلْبًا عَقُوْلاً وَّلِسَانًا نَاطِقًا. خدا کی قسم! میں ہر آیت کے متعلق جانتا ہوں کہ وہ کس کے متعلق نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ پروردگار نے مجھے سمجھنے والا دل اور بولنے والی زبان عطا فرمائی ہے۔[2]

سنن ابن ماجہ میں مذکور ہے کہ امام علیؑ ایک دن میں دو مرتبہ رسولِ خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ شب کے پہلے حصے میں اور دوسری مرتبہ صبح کے آخر میں۔[3]

چنانچہ حضرت نے اپنی نشستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِذَا سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ اَجَابَنِيْ وَاِنْ فَنِيَتْ مَسَائِلِيْ ابْتَدَاَنِيْ فَمَا نَزَلَتْ عَلَيْهِ آيَةٌ فِيْ لَيْلٍ وَّلَانَهَارٍ وَّلَا سَمَاءٍ وَّ لَا اَرْضٍ وَّ لَا دُنْيَا وَلَا آخِرَةٍ وَّلَا جَنَّةٍ وَّلَا نَارٍ وَّلَا سَهْلٍ وَّلَا جَبَلٍ وَّلَا ضِيَاءٍ وَّلَا ظُلْمَةٍ اِلاَّ اَقْرَاَنِيْهَا وَ اَمْلَاهَا عَلَيَّ وَ كَتَبْتُهَا بِيَدِيْ وَ عَلَّمَنِيْ تَاْوِيْلَهَا وَ تَفْسِيْرَهَا وَ مُحْكَمَهَا وَ مُتَشَابِهَهَا وَ خَاصَّهَا وَ عَامَّهَا... میں جب بھی رسولِ خداؐ سے کوئی سوال کرتا تھا تو آپؐ مجھے جواب دیتے تھے اور اگر میرے سوالات ختم ہو جاتے تو آپؐ خود ہی ابتدا فرماتے تھے۔ آپؐ پر رات، دن، آسمان، زمین، دنیا، آخرت، جنّت، جہنّم، میدان، پہاڑ، روشنی اور تاریکی کے متعلق جو بھی آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے وہ آیت میرے سامنے پڑھی اور مجھ سے لکھوائی جسے میں نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور آپؐ نے مجھے ہر آیت کی تأویل، تفسیر، محکم، متشابہ، خاص اور عام کی تعلیم دی۔[4]

امام علیؑ کا رسولِ خداؐ سے علمی و معنوی استفادے کا سلسلہ آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہا۔ وفات کے وقت آنحضرتؐ کا سرمبارک امام علیؑ کے زانو اور سینہ پر تھا اور آپؐ نے آخری لمحات میں

۱۔ سنن نسائی، ج ۱، ص ۱۷۸۔ مسند احمد، ج ۱، ص ۸۰، ۸۵، ۱۰۷۔

۲۔ معالم المدرستین، ج ۲، ص ۳۰۴۔ بحوالہ طبقات ابن سعد۔

۳۔ معالم المدرستین، ج ۲، ص ۳۰۵۔ سنن ابن ماجہ، حدیث ۳۷۰۸۔

۴۔ معالم المدرستین، ج ۲، ص ۳۰۴۔ بصائر الدرجات، ۱۹۸۔

بھی کچھ وقت تک حضرتؐ سے سرگوشی کی اور اللہ کی آخری تعلیمات بھی منتقل فرمائیں۔ اور یوں امام علیؑ نے قرآن مجید کی تفسیر وبیان کو رسولِ خداؐ سے حاصل کر کے لکھ لیا تھا اور رسولِ خداؐ نے اپنی وفات کے وقت انہیں حکم دیا تھا: ''میری وفات کے بعد جب تک قرآن مجید کو جمع نہ کر لینا اس وقت تک گھر سے باہر نہ نکلنا۔''

امام علیؑ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دفن کے بعد رسولِ خداؐ کے گھر سے قرآن مجید کے اجزا اٹھائے جو کہ کھال، ہڈیوں اور ایسی ہی اشیاء پر لکھے ہوئے تھے اور پھر آپؑ نے رسولِ خداؐ کی بیان کردہ ترتیب سے سورتوں کو تفسیر اور شانِ نزول سمیت جمع کیا اور اسے ترتیب دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر آپؑ نے وہ نسخہ حکومت وقت کے سامنے پیش کیا لیکن قرآن کے اس نسخے کی تفسیر اور اس میں آیات کے متعلق لکھا ہوا شانِ نزول قریش اور حکومت کے مقرب افراد کے مزاج کے مطابق نہیں تھا اس لئے حکومت نے قرآن مجید کے اس نسخے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر حضرتؑ اس مصحف کو اپنے گھر لے گئے اور اسے اپنے پاس محفوظ رکھا۔

آپؑ کے بعد یہ مصحف ائمۂ ہدیٰ کے پاس منتقل ہوتا رہا اور ائمۂ ہدیٰ اس کی شرح وتفسیر سے استفادہ کر کے لوگوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ اس وقت وہ مصحف حضرت حجّت علیہ السلام کے پاکیزہ ہاتھوں میں ہے اور آپؑ ظہور کے بعد اسے عوام الناس کے سامنے پیش کریں گے اور اس کی تدریس کا حکم دیں گے۔[1]

امام علی علیہ السلام نے پیغمبر اکرمؐ سے جو تفسیر حاصل کی تھی آپؑ اپنے زمانہ حکومت میں اسے خطبات کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچاتے تھے اور اہل کوفہ کے تابعین نے اس تفسیر کو حضرتؑ کی زبانی سنا اور دوسروں تک پہنچایا۔ چنانچہ شیعہ وسنّی کی اکثر تفسیر جو آنحضرتؐ سے منقول ہے وہ اس ذریعے سے منتقل ہو کر کتبِ تفسیر تک پہنچی ہے۔ اگر آپؑ کو خلافت نہ ملتی اور آپؑ مدینے سے کوفہ ہجرت نہ کرتے اور اپنے خطبات میں تفسیرِ قرآن بیان نہ کرتے تو آج دنیا میں کوئی تفسیر موجود نہ ہوتی۔

وہ تفسیر جو خلفاء کے دَور میں ممنوع قرار دے دی گئی تھی آپؑ کے اقدامات سے دوبارہ متعارف ہوئی اور آپؑ نے اسلامی معاشرے کو تفسیر کا تحفہ واپس لوٹایا۔ زیارتِ جامعۂ میں ائمۂ ہدیٰ کو لفظ ''حَمَلَةُ كِتَابِ اللهِ'' (حاملین کتاب اللہ) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ یقیناً امیر المومنینؑ کتابِ خدا کے ان حاملین میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں اور یہ لقب آپ پر بدرجۂ اتمّ صادق آتا ہے۔

امام علیؑ نے مسجدِ کوفہ میں فرمایا تھا: قبل اس کے کہ میں تمہارے درمیان نہ رہوں مجھ سے پوچھ لو۔ خدا کی قسم! میں زمین کے راستوں کی بہ نسبت آسمان کے راستوں کو زیادہ جانتا ہوں۔ میں ہر آیت کے متعلق

۱۔ قرآن مجید کے متعلق کتبِ اہلبیتؑ اور کتبِ خلفاء کے نظریات کے تقابلی مطالعے کیلئے ہماری کتاب القرآن الکریم وروایات المدرستین دیکھیں۔

جانتا ہوں کہ یہ پہاڑ پر نازل ہوئی یا صحرا میں، رات کے وقت نازل ہوئی یا دن میں۔

جب حضرتؑ نے سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ کا دعویٰ کیا تو بعض جاہل اور نادان لوگوں نے اٹھ کر حضرت کو لاجواب کرنے کے لئے ازراہِ تمسخر کچھ بیہودہ سوالات بھی کئے تھے جن کا حضرتؑ نے مناسب جواب دیا تھا۔ مثلاً انس نے کھڑے ہوکر کہا: میرے چہرے اور سر پر کتنے بال ہیں؟

آپؑ نے فرمایا: پیغمبرِ اکرمؐ نے تیرے سوال کا مجھے جواب بتایا تھا۔ تیرے ہر بال کی جڑ میں ایک شیطان ہے جو تجھے گمراہ کرتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تیرے گھر میں ایک پلاّ (بیٹا) موجود ہے جو میرے بیٹے حسینؑ کو قتل کرے گا۔[1]

ابن الکواء نے بھی جو بعد میں خوارج سے جاملا تھا آپ سے کچھ سوالات کئے تھے۔ اس کا گمان تھا کہ جس طرح حضرت عمرؓ کو وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا کا مطلب معلوم نہیں تھا شاید اسی طرح امام علیؑ کو بھی معلوم نہیں ہوگا چنانچہ اس نے پوچھا: یا علیؑ! وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا کا مطلب کیا ہے؟

حضرتؑ نے فرمایا: سمجھنے کے لئے پوچھو، اعتراض کرنے کے لئے نہیں۔

پھر حضرتؑ نے فرمایا: وَالذّٰرِیٰتِ کا مطلب ہوائیں ہیں۔

اس نے پوچھا: اَلْحٰمِلٰتِ وِقْرًا کا کیا مطلب ہے؟

حضرتؑ نے فرمایا: اس کا مطلب وہ بادل ہیں جو پانی کا بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔

پھر اس نے پوچھا: اَلْجٰرِیٰتِ یُسْرًا کا کیا مطلب ہے؟

حضرتؑ نے فرمایا: اس کا مطلب کشتیاں ہیں جو آسانی سے چلتی ہیں۔

اس نے پوچھا: اَلْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا کا کیا مطلب ہے؟

حضرتؑ نے فرمایا: اس کا مطلب فرشتے ہیں۔

پھر اس نے پوچھا: اَلَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتارا۔ سورۂ ابراہیم: آیت ۲۸) کا کیا مطلب ہے؟

حضرتؑ نے فرمایا: اس کا مطلب منافقینِ قریش ہیں۔[2]

تفسیرِ قرآن کی اشاعت کا یہ ایک نمونہ تھا۔ حضرتؑ کے اس اقدام سے دوسرے صحابہ کو رسولِ خداؐ کی بیان کردہ تفسیر بیان کرنے کی جرأت نصیب ہوئی۔

امام علی علیہ السلام نے اپنے زمانۂ حکومت میں قرآن مجید کی مزید دو خدمات سرانجام دی تھیں:

۱۔ معالم المدرستین، ج ۳، ص ۱۳۵۔ سنان بن انس نے شمر بن ذی الجوشن کے ساتھ مل کر حضرت امام حسینؑ کو شہید کیا تھا۔

۲۔ فتح الباری، ج ۱۰، ص ۲۲۱۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۲۳۱۔ کنز العمال، ج ۲، ص ۳۵۷۔

۱۔ قرآن کے الفاظ کو تحریف سے تحفظ دینا۔
۲۔ قرآن کے معانی سمجھنے کے لئے علم نحو کی تدوین کرنا۔
اس خدمت کو سمجھنے کے لئے پہلے ہم ایک تمہید بیان کرتے ہیں۔

دنیا کی باقی تمام زبانوں کی طرح عربی زبان کا بھی ایک گرامر ہے جسے علم نحو کہا جاتا ہے۔ لغت کو ہر طرح کی تحریف سے بچانے کے لئے اور صحیح مفہوم کی ادائیگی کے لئے اس علم کی بڑی اہمیت ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زیر کی جگہ زبر پڑھنے سے الفاظ کے معانی بدل جاتے ہیں اور قرآن مجید میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں زیر زبر کی تبدیلی سے کفر لازم آتا ہے۔

حضرت کے زمانۂ حکومت تک علم نحو کے قواعد کی تدوین عمل میں نہیں لائی گئی تھی۔ عربی کلام اعراب کے بغیر لکھا جاتا تھا۔ قرآن مجید اور دیگر مکتوبات پر اعراب نہیں لگائے جاتے تھے۔ لوگوں کو زبر زیر لگانے کا علم تک نہیں تھا۔ البتہ جس ماحول میں خالص عربوں کی آبادی ہوتی تھی وہاں انہیں گرامر پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اور یہ کام فطری تقاضوں کے مطابق انجام پاتا تھا۔ مثلاً ایک عرب بچہ جب گفتگو کرنا سیکھتا تو وہ اپنے گرد و پیش سے اس کے سادہ قواعد آسانی سے سیکھ لیتا تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام سے قبل عربوں کی زندگی خالص صحرا نشینی کی زندگی تھی اور انہیں پیچیدہ مطالب و اصطلاحات کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان کی زندگی ایک خاص نہج کے تابع تھی جس میں پانی، روٹی، اونٹ، صحرا، تلوار، نَسَب، جنگ، قبیلہ یا ایسے ہی الفاظ کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

نزولِ قرآن کے بعد عربی زبان کے افق میں وسعت پیدا ہوئی اور عربی زبان اسلامی نظریات کی ترجمان قرار پائی اور اس میں مختلفُ النوع ابعاد پیدا ہوئے جن میں صفاتِ ربوبیت، معرفتِ انبیاء، احوالِ قیامت، اخلاق و احکام کو اولیت حاصل تھی۔ عربی زبان میں ایسے تمام مفاہیم کے لئے الفاظ وضع ہوئے اور عربی نے ان تمام مفاہیم کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ جب تک اسلام اور مسلمان سرزمینِ عرب میں رہے تو اس وقت تک کوئی خاص مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب عربوں نے غیر عرب علاقوں کو فتح کیا اور بہت سے غیر عرب، عرب شہروں میں آ کر آباد ہوئے مثلاً ایرانی کوفہ میں بڑی تعداد میں آ گئے جنہیں حمراء کہا جاتا تھا اور سندھ و ہند کے رہنے والے بصرہ میں آئے جنہیں عربی میں سبابجہ اور زط[1] کہا جاتا تھا اور اسی طرح سے بہت سے قبطی اسکندریہ میں آ کر آباد ہوئے اور لوگوں کی ایک دوسرے سے معاشرت بڑھی تو اس معاشرت کی وسعت سے عربی زبان خالص نہ رہ سکی اور عرب بچے اکثر اوقات غیر عرب بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے تھے تو وہ غیر عرب بچوں

۱۔ تاج العروس میں لفظ سبج اور زط دیکھیں۔

کے اختلاط کی وجہ سے خالص عربی سے محروم ہونے لگ گئے اور بعض بچوں کی مائیں غیر عرب تھیں تو جب بچہ پیدا ہوتا تو مائیں اپنے بچوں کو سب سے پہلے اپنی مادری زبان سکھاتی تھیں اور یوں اس اختلاط کے سبب عربی زبان مختلف زبانوں کا ملغوبہ بننے لگ گئی تھی اور اس کے متعلق یہ امکان پیدا ہونے لگا تھا کہ کچھ ہی عرصے بعد یہ زبان دنیا سے رخصت ہو جائے گی اور پھر آنے والے ادوار میں علم تحریر کے ماہرین ہی اسے پڑھ سکیں گے۔ عربی زبان کے متعلق پہلی ہجری کے نصف قرن اول میں ہی یہ خطرات پیدا ہو چکے تھے۔

اس تمہید کے بعد ہم یہ کہیں گے کہ ان حالات میں جبکہ خالص عربی زبان مختلف اقوام کی معاشرت و اختلاط کی وجہ سے رختِ سفر باندھنے کو تھی امام علیؑ نے علمِ نحو کو مدوّن کر کے قرآن مجید کو کیسے محفوظ کیا اور اعراب گزاری کے قانون کو کیسے ترتیب دیا؟

(ب) علمِ نحو کی تدوین: امام علی علیہ السلام کے ایک شاگرد ابوالاسود دوئلی علمِ نحو کی تاسیس کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ ایک دن میں امام علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

آپ نے مجھ سے فرمایا: تمہارے شہر کوفہ کے لوگ قرآن غلط پڑھتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسا کام کروں جس کی وجہ سے عربی زبان اس مشکل سے محفوظ ہو جائے۔

میں نے کہا: امیر المومنینؑ! اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ عربی زبان کو زندہ کر دیں گے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے ایک دستاویز میرے حوالے کی۔ اس میں علمِ نحو کے قوانین مدوّن کئے گئے تھے جس میں آپ نے کلمہ کو اسم، فعل اور حرف میں تقسیم کیا تھا اور ان کی تعریف لکھی تھی۔

پھر حضرت نے مجھ سے یہ جملہ فرمایا: اُنْحُ نَحْوَهُ یعنی اس طرح سے آگے بڑھو۔ (اسی وجہ سے اس علم کا نام علمِ نحو پڑ گیا)۔

ابوالاسود کہتے ہیں کہ میں نے گھر آ کر حضرت کے بتائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں قواعد و اصول وضع کئے۔ پھر میں نے چند قواعد جمع کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کئے تو آپ نے ان میں موجود اشکالات کو دور فرمایا۔ مثلاً اسماءِ مشبّہ بالفعل کے متعلق فرمایا: تم نے ان میں کَانَّ کو کیوں نہیں لکھا؟

میں نے عرض کیا: مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بھی ان ہی میں سے ہے۔

حضرتؑ نے فرمایا: یہ بھی ان ہی مشبّہ بالفعل میں سے ایک ہے۔

یہ قواعد ابوالاسود کے پاس کتابی شکل میں موجود تھے لیکن انہوں نے اپنے بخل کی وجہ سے کسی کے سامنے ان کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

ابوالاسود دوئلی چونکہ عربی ادبیات کے ماہر تھے اس لئے تمام حکام ان کا احترام کرتے تھے۔ زیاد بن ابیہ بھی ابوالاسود کے قدردانوں میں سے تھا۔ یہ وہی زیاد ہے جسے معاویہ نے رسم جاہلیت کو زندہ کرتے ہوئے اپنا بھائی بنایا تھا اور پھر اسے عراق کا والی مقرر کیا تھا۔

زیاد نے ایک مرتبہ اپنے بیٹے کو معاویہ کے پاس شام بھیجا۔ ابن زیاد کی عربی بولنے کی صلاحیت محدود تھی اور وہ الفاظ کا غلط تلفظ کرتا تھا لیکن اس کی زبان کی غلطیاں اتنی باریک تھیں کہ خود زیاد کو بھی اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ معاویہ کی پرورش مکہ میں ہوئی تھی اور اس کا تعلق قریش سے تھا جو کہ عرب کا فصیح ترین قبیلہ تھا اسی لئے ابن زیاد کی عربی کی غلطیاں اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکیں۔[1]

چنانچہ معاویہ نے زیاد کو لکھا کہ اپنے بیٹے کو عربی کی تعلیم دلاؤ کیونکہ اس کا تلفظ صحیح نہیں ہے۔[2]

زیاد نے ابوالاسود کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ وہ امام علیؑ کے تعلیم کردہ قواعد کی اس کے بیٹے کو تعلیم دے۔ ابوالاسود نے زیاد کی درخواست مسترد کردی۔ زیاد نے حیلہ سے کام لیا اور ایک شخص سے کہا کہ وہ ابوالاسود کے سامنے آیت اَنَّ اللّٰہَ بَرِیۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ وَرَسُوۡلُہٗ میں رَسُوۡلُہٗ کو رَسُوۡلِہٖ پڑھے۔

چنانچہ ابوالاسود بیٹھے ہوئے تھے کہ اس شخص نے ان کے سامنے مذکورہ آیت کو لام کی زیر سے پڑھا۔ ابوالاسود نے جیسے ہی یہ غلط اعراب سنا جس سے عبارت کا پورا مفہوم ہی الٹ گیا تھا تو انہیں بہت تکلیف ہوئی۔[3] اور انہوں نے قرآن مجید کو لوگوں کے تغیّر و تبدّل سے محفوظ رکھنے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے دل میں ٹھان لیا کہ وہ لوگوں کو علم نحو کے قواعد و اصول کی باقاعدہ تعلیم دیں گے۔

ابوالاسود نے اپنے ہدف کو حاصل کرنے کے لئے دو کام کئے:

۱۔ قرآن مجید پر اعراب لگوائے تاکہ عام لوگ اعراب کی مدد سے اسے صحیح صحیح پڑھ سکیں۔

۲۔ انہوں نے ادبائے لغت کو علم نحو کے قواعد کی باقاعدہ تعلیم دی۔

اس مقصد کے لئے ابوالاسود دوئلی زیاد کے پاس گئے اور اس سے کہا: قبیلۂ عبدالقیس کے دس پڑھے لکھے آدمی مجھے دو تاکہ میں یہ کام سرانجام دے سکوں۔

۱۔ جس طرح سے اہلِ کوفہ کا غلط قرآن پڑھنا حضرت علیؑ کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا تھا اور آپ نے ان کا مستقل بنیادوں پر حل تلاش کیا۔

۲۔ جب عرب ماحول میں پلنے والے جوان کے اعراب صحیح نہیں تھے تو اس دور میں جو عرب افریقہ، ایران اور روم میں رہتے تھے ان کی اور ان کی اولاد کی کیا کیفیت ہوگی؟

۳۔ لفظ رَسُوۡلُہٗ میں لام پر پیش ہے اور اگر اس لام کے نیچے زیر پڑھی جائے تو اسکے معنی نعوذ باللہ یہ ہوتے ہیں کہ ''اللہ، مشرکین اور اپنے رسولؐ سے بیزار ہے۔'' جبکہ پیش پڑھنے کی صورت میں معنی یہ ہیں کہ ''اللہ اور اس کا رسولؐ، مشرکین سے بیزار ہیں۔''

زیاد نے دس افراد فراہم کیے۔ ابوالاسود نے ان لوگوں سے کہا: تم قرآن مجید تحریر کرو اور جب تم اسے لکھ لو گے تو میں اُسے غور سے پڑھوں گا اور تم اس وقت غور سے میرے منہ کو دیکھنا۔ جب میں منہ کھولوں تو تم لفظ کے آخری حرف پر ایک نقطہ لگا دینا یعنی زبر لگا دینا۔ جب میں اپنے لبوں کو نیچے حرکت دوں تو تم لفظ کے آخر میں ایک نقطہ یعنی زیر لگا دینا۔ جب میں اپنے لبوں کو جمع کروں تو تم لفظ کے آخر میں ایک نقطہ یعنی پیش لگا دینا۔

جب ان افراد نے قرآن مجید لکھ لیا تو ابوالاسود نے ان کے سامنے قرآن پڑھا اور وہ اس کے لبوں کی حرکت اور جنبش کو دیکھ کر اِعراب لگاتے گئے۔

ابوالاسود نے اپنے استاد امام علیؑ سے جو علم سیکھا تھا اس کے ذریعے سے انہوں نے قرآن کی خدمت کی اور اس پر اِعراب لگوائے جس کی وجہ سے تمام لوگ قرآن کو صحیح طریقے سے پڑھنے لگے۔ طبقۂ سوم میں ان کے ایک شاگرد خلیل بن احمد فراہیدی نے زُبر کو اوپر اور زیر کو نیچے اور پیش کو اوپر موجودہ شکل میں ترتیب دیا۔ خلیل کے بعد آج تک قرآن مجید اسی طریقے سے لکھا جاتا ہے۔

ابوالاسود نے جن لوگوں کو علمِ نحو کی تعلیم دی ان میں سے چند نام یہ ہیں:

عطاء، ابوالحارث اور ابوحرب (یہ تینوں ابوالاسود کے فرزند تھے)۔ عنبسہ بن معدان المعروف الفیل، میمون بن اقرن، عبدالرحمٰن بن ہرمز، یحیٰ بن یعمر اور نصر بن عاصم۔ یہ نحویوں کا پہلا طبقہ کہلاتا ہے۔

نحویوں کے دوسرے طبقے میں عبداللہ بن اسحٰق حضرمی، عیسیٰ بن عمر ثقفی اور ابوعمرو بن علاء الحارثی کے نام سرِفہرست ہیں۔ انہوں نے یحیٰ بن یعمر سے علمِ نحو کی تعلیم حاصل کی تھی اور نحویوں کے طبقۂ سوم میں خلیل بن احمد فراہیدی کا نام بڑا مشہور ہے۔ کتاب کے آخر میں ہم نے علمِ نحو اور قرآن پر اِعراب لگانے کا جدول پیش کیا ہے۔

پیغمبرِ اکرمؐ کے وصیٔ برحق امام علیؑ نے علمِ نحو کے قواعد کو مدوّن و مرتّب کیا اور حضرت کی اس کاوش کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم کی وجہ سے ہر شخص قرآن مجید اور دیگر عربی کتابوں کو اعراب کے بغیر پڑھنے کے قابل ہوگیا۔

اگر امام علیؑ یہ خدمت بجا نہ لاتے تو قرآن و حدیث سے معارفِ اسلام کو سمجھنا ناممکن ہو جاتا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ربوبیت کے تقاضوں سے امام علیؑ کو ترغیب دی اور انہوں نے ہجرت کی چوتھی دہائی میں علمِ نحو کے اصول وضوابط وضع فرمائے اور اپنے شاگرد ابوالاسود دوئلی کو ان کی تعلیم دی۔ پھر ابن زیاد اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی مشیت سے علمِ نحو کی افادیت کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے ابوالاسود سے فرمائش کی کہ وہ عوام کی سہولت کے لئے علمِ نحو کو باقاعدہ مرتب کرے۔ یوں امام علیؑ کا تعلیم کردہ یہ علم آپ کے دشمن کے ذریعے سے دنیا میں متعارف ہوا اور لوگوں کو عصرِ پیغمبرؐ کی زبان سے آگاہی حاصل ہوئی۔ الحمدللہ کہ آج کروڑوں مسلمان کسی دِقت کے بغیر صحیح طریقے سے قرآن مجید پڑھنے میں مصروف ہیں۔

علم نحو کی تدوین سے صرف جزیرۃ العرب میں ہی عربی زبان کو زندگی نہیں ملی بلکہ یہ زبان افریقہ اور دنیا کی دیگر اقوام کی سرکاری اور عوامی زبان بن گئی۔ اللہ تعالی نے اپنے نبیؐ کے ذریعے سے اسلام اور قرآن لوگوں تک پہنچایا اور ان کے وصی امام علیؑ کے ذریعے سے قرآن کو قیامت تک کے لئے محفوظ کردیا۔ اگر امام علیؑ یہ کام نہ کرتے تو بعد میں یہ عظیم کام کسی سے بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ امام علیؑ نے علم نحو کے ذریعے سے قرآن مجید کے الفاظ کو تحفظ فراہم کیا اور آپ کے بعد آپ کی اولاد میں سے باقی ائمۂ ہدیٰ نے لوگوں کے سامنے قرآن مجید کی تفسیر اور اسلام کے معارف کو بیان کیا۔

(ج) **سنّتِ رسولؐ کی خدمت:** امام علیؑ نے رسولِ خداؐ کے زیرِ سایہ تربیت پائی تھی اور آپ اکثر و بیشتر آنحضرتؐ کے ساتھ رہا کرتے تھے اور رسولِ خداؐ نے آپؑ میں اپنے اخلاق و کردار کو منعکس کیا تھا۔ امام علیؑ نے اپنی داستان بیان کرتے ہوئے خطبۂ قاصعہ میں فرمایا تھا: وَلَقَدْ کُنْتُ اَتَّبِعُهُ اتِّبَاعَ الْفَصِیْلِ اَثَرَ اُمِّهٖ یَرْفَعُ لِیْ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ مِنْ اَخْلَاقِهٖ عَلَمًا وَیَاْمُرُنِیْ بِالْاِقْتِدَاءِ بِهٖ. جس طرح سے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے اسی طرح سے میں بھی آپؐ کے نشانِ قدم پر چلا کرتا تھا اور آپؐ میرے لئے اپنے اخلاقِ عالیہ میں سے ہر روز نیا نمونہ پیش کرتے تھے اور مجھے اس کی پیروی کا حکم دیتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی رسولِ خداؐ نے نبوت کا اعلان کیا تھا تو امام علیؑ نے سب سے پہلے ان کی تائید و تصدیق کی تھی اور زندگی کے آخری لمحات تک رسولِ خداؐ اور اسلام کے یاور و مددگار رہے۔ آپ نے قرآن مجید کی خدمت کی اور اس کی تفسیر بیان فرمائی۔ اس کے علاوہ آپؑ نے "ارشاداتِ رسولؐ" پر ایک کتاب مدوّن کی تھی جس کا نام جامعۃ تھا۔ اس کتاب کے مطالب وحی الٰہی پر مشتمل تھے۔ رسولِ خداؐ نے امام علیؑ کو ان تمام مطالب کی تعلیم دی تھی اور ان کے مطالب تحریر کروائے تھے۔

امام علیؑ نے معاشرے میں سنّت کو ازسرِنو رواج دیا اور آپ نے اپنے عملی اقدامات کو خطبوں کی شکل میں بیان کیا۔ آپ کے خطبات سنتِ پیغمبرؐ اور اسلام کے عقائد و احکام پر مشتمل ہوتے تھے۔ آپ کے خطبات فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہوتے تھے اس لئے لوگ انہیں ذوق و شوق سے حفظ کرتے تھے۔ بعد میں کچھ علماء نے آپ کے خطبات کو کتابی شکل میں مرتب کیا۔

مسعودی نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے حالات کے آخر میں لکھا:

لوگوں کو اس وقت حضرت کے چارسو اسی خطبات سے کچھ زیادہ خطبے زبانی یاد ہیں۔[1]

۱۔ علی بن حسین مسعودی، مروج الذہب، ج ۲، ص ۴۱۹۔

سید رضی علیہ الرحمہ نے نہج البلاغہ میں حضرت کے کچھ خطبات یکجا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اگر ان میں سے مکررات کو حذف کر دیا جائے تو نہج البلاغہ کے خطبات کی تعداد ۲۳۶ بنتی ہے۔ سید رضیؒ نے خطبات کا انتخاب صرف بلاغت کے حوالے سے کیا تھا۔

حضرتؑ کے جو خطبات سید رضیؒ نے نہج البلاغہ میں جمع نہیں کئے کچھ دیگر علماء نے انہیں جمع کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے کچھ خطبات ناقدریٔ زمانہ کی وجہ سے ضائع ہو گئے۔

اگر ہم نہج البلاغہ کا جائزہ لیں تو دنیائے اسلام کی اس عظیم کتاب میں ہمیں توحید، صفاتِ خداوندی، نبوت، اِمامت، معَاد اور اسلامی آداب کے جواہر پارے دکھائی دیں گے۔[1]

اگر حضرت امیرالمومنینؑ سریرآرائے مسندِ خلافت نہ ہوتے تو ہم تک آپ کے حکیمانہ خطبات بھی نہ پہنچتے اور ہم بھی آج خدا کو مجسّم مان رہے ہوتے اور خدا کے لئے انسانوں کی طرح سے ہاتھ، پاؤں، پنڈلی اور آنکھ و چہرے کا عقیدہ رکھتے۔ اگر آپ کے خطباتِ عالیہ نہ ہوتے تو آج اسلامی دنیا میں صرف کعب الاحبار اور تمیم داری کی تحریف شدہ توریٰت سے ماخوذ روایات باقی ہوتیں۔

اگر ہمیں فرقۂ مجسمہ کے مقابل فرقۂ معتزلہ کے توحید کے متعلق نظریات دکھائی دیتے ہیں تو یہ آپ کے خطبات ہی کا فیض ہے کیونکہ معتزلہ نے آپ کو چوتھا خلیفہ سمجھتے ہوئے آپ کے خطبات سے رہنمائی حاصل کی۔ اگر آپ خلافت کا عہدہ قبول نہ کرتے تو پوری اسلامی دنیا آج گمراہی میں مبتلا دکھائی دیتی۔ حضرت امیرالمومنینؑ نے خلافت کا منصب قبول کر کے اسلامی معاشرے کو صحیح عقائد اور قرآنی توحید کا نظریہ واپس لوٹایا۔

''دِیات'' کے احکام پر آپ نے کتاب جامعۂ کی مدد سے ایک دستاویز ''اصل ظریف'' تیار کی تھی۔ حضرت کی وہ دستاویز آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ آپ نے حُدود و دیات کے اجراء کے لئے مذکورہ دستاویز تحریر فرما کر اپنے والیوں اور لشکر سالاروں کو روانہ فرمائی تھی۔ اس دستاویز میں آپ نے تمام اعضائے بدن مثلاً انگلی، ہاتھ، پاؤں، آنکھ، نطفہ، علقہ اور مضغہ کی دِیۃ تفصیل سے بیان فرمائی تھی۔ اتنی تفصیل مکتبِ اہلبیتؑ کے علاوہ کسی بھی فقہی مذہب کے پاس موجود نہیں ہے۔ امام علیؑ کی تحریر کردہ دستاویز کو امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا: جی ہاں! یہ امیرالمومنینؑ کا فتویٰ ہے۔[2]

۱۔ گورنر مصر مالک اشترؒ کے نام دستاویز میں آپ نے اجتماعی، اقتصادی اور حکومتی امور پر انتہائی اہم نکات بیان کئے ہیں۔

۲۔ معالم المدرستین، ج ۳، ص ۲۰۷ تا ۳۲۳۔ ائمہ علیہم السلام کے شاگردوں نے ان سے روایات سن کر چھوٹے چھوٹے رسالے مرتب کئے تھے جن کو اصول کہا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں ان اصول کی تعداد چار سو تک جا پہنچی تھی۔ بعد میں محدثین نے ان اصول کو اپنی کتب اربعہ اور حدیث کی دیگر کتابوں میں جمع کر دیا۔

(۲) اچھے شاگردوں کی تربیت

آپ نے بہت سے شاگردوں کی پرورش کی اور انہیں اسلامی معارف کی تعلیم دی۔ آپ کے شاگردوں میں ابن عباسؓ، کمیل بن زیادؓ، مالک اشترؓ، میثم تمارؓ، ابوالاسود دوئلیؓ، رُشید ہجریؓ اور حُجر بن عدیؓ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے شاگرد بھی ہیں جو آپؑ سے خصوصی استفادہ کرتے تھے۔[1]

حضرتؑ کے کچھ شاگرد بعض علاقوں کے حاکم مقرر ہوئے۔ انہوں نے ان علاقوں میں جا کر حضرتؑ کی تعلیمات کی نشرو اشاعت کی۔ یہی لوگ شیعی نظریات کے لئے بنیادی پتھر ثابت ہوئے۔

(۳) نقلِ حدیث کیلئے صحابہؓ کو ترغیب دینا

جنگِ جمل میں آپ کی زیرِ قیادت پندرہ سو صحابہؓ بصرہ آئے تھے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد آپ ان صحابہ کو اپنے ساتھ کوفہ لے آئے اور کوفہ کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔ آپ نے دوسرے خلفاء کی رَوش کے برعکس صحابۂ کرام کو حدیثِ رسولؐ بیان کرنے کی ترغیب دی اور ان سے کہا کہ وہ لوگوں کو احادیث سے مستفید کریں۔

حضرتؑ کی اس رَوش کو سمجھنے کے لئے اس مثال پر توجہ فرمائیں:

ایک دن مسجد کوفہ کے صحن میں آپ نے صحابہؓ کو قسم دی کہ تم میں سے جو بھی حجۃ الوداع کے موقع پر پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ تھا اور اس نے حدیثِ غدیر کو آنحضرتؐ کی زبانی سنا تھا وہ کھڑا ہو جائے اور اس حدیث کو بیان کرے۔ یہ سن کر بہت سے صحابہؓ کھڑے ہوگئے اور انہوں نے خطبۂ غدیر کو لوگوں کے سامنے بیان کیا۔[2] اور گواہی دی کہ ربِ کائنات کے حکم سے سَرورِ کائناتؐ نے مولائے کائناتؑ کی ولایتِ عامّہ کا اعلان فرمایا تھا۔

(ا) **کوفہ مرکزِ تشیّع:** امام علی علیہ السلام کی ترغیب کے نتیجے میں ایک ہزار سے زائد اصحابِ رسولؐ نے ان احادیث کو جو وہ مدت سے اپنے ذہنوں میں محفوظ کیے ہوئے تھے اور پابندی کی وجہ سے بیان نہیں کر پا رہے تھے بے خوف وخطر بیان کیا۔ اس کے نتیجے میں کوفہ ایک اسلامی یونیورسٹی اور امام علی علیہ السلام کے دوستوں اور محبّوں کا مرکز بن گیا اور یہیں سے مذہبِ تشیّع کے نظریات پھیل کر ایران اور دنیائے اسلام کے دوسرے مقامات تک پہنچے۔

۱۔ کمیل بن زیاد کے نام حضرتؑ کا خطبہ اس امر کی دلیل ہے کہ آپؑ نے ان کو کچھ حقائق ومعارف کی تنہائی میں تعلیم دی تھی۔

۲۔ معالم المدرستین، ج۱، ص۴۲۰۔ تاریخ ابن کثیر، ج۵، ص۲۱۱۔ مسند احمد، ج۱، ص۱۱۸ اور ج۴، ص۳۷۰۔

(ب) **قم میں تشیع کا فروغ:** معجم البلدان میں حموی لکھتے ہیں کہ ۸۳ھ میں یہ شہر اتفاقاً وجود میں آیا۔ ہوا یوں کہ حجاج بن یوسف کے گورنر سیستان عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث نے اس کے خلاف بغاوت کردی۔ اس وقت اس کے لشکر میں سترہ افراد ایسے بھی تھے جن کا تعلق علمائے عراق سے تھا۔

حجاج نے بغاوت کو فرو کرنے کے لئے فوج روانہ کی۔ عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کو شکست فاش ہوئی اور اس کی جماعت قم کے علاقے میں آگئی۔ اس جماعت میں سعد بن مالک بن عامر اشعری کے پانچ بیٹے عبداللہ، احوص، عبدالرحمٰن، اسحاق اور نعیم موجود تھے۔ انہوں نے چند بستیوں پر بزور شمشیر قبضہ کرلیا۔ ان بستیوں میں سے مرکزی بستی کا نام ''کمندان'' تھا۔ ان کے تسلط کے بعد ان کے خاندان کے دیگر افراد عراق سے یہاں آگئے اور انہوں نے تمام بستیوں کو ایک دوسرے سے متصل کر کے سب کا نام کمندان رکھ دیا اور پھر کمندان کا نام تبدیل کر کے قم رکھ دیا گیا۔ اس شہر میں وارد ہونے والوں میں عبداللہ بن سعد کا ایک بیٹا تھا جس نے کوفے میں نشوونما پائی تھی اور اس نے اہل کوفہ سے تشیع کے نظریات حاصل کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس نے قم میں شیعہ نظریات کو راسخ کیا۔ اسی لئے آج قم میں کوئی سنی نظر نہیں آتا۔[1]

اس دور سے لے کر آج تک قم شہر تشیع کا مرکز رہا ہے۔ اس شہر نے اپنے دامن میں بہت سے علماء و محدثین کی پرورش کی اور قدیم الایام سے یہاں محبان اہلبیتؑ آباد ہیں۔ جب ۲۰۰ھ کے لگ بھگ امام موسیٰ کاظمؑ کی بیٹی حضرت فاطمۂ معصومہ نے خراسان کا سفر اختیار کیا اور ساوہ پہنچ کر بیمار ہوئیں اس وقت ساوہ کے لوگ متعصب سنی ہوا کرتے تھے۔[2]

بی بی معصومہ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ وہ انہیں قم لے چلیں۔ جب وہ قم تشریف لائیں تو اہل قم نے ان کا شایان شان استقبال کیا۔ پھر وہ چند روزہ علالت کے بعد قم میں ہی انتقال کرگئیں۔

ایران میں قم کے بعد کاشان اور کاشان سے دوسرے شہروں میں شیعیت کو فروغ نصیب ہوا اور تشیع کے فروغ کا ایک سبب یہ تھا کہ بنی عباس کے خلفاء سادات پر ظلم کرتے تھے اور انہیں شہید کرنے کے درپے رہتے تھے۔ سادات کرام حجاز اور عراق سے نکل کر ایران آجاتے تھے اور یہاں کے لوگ انہیں پناہ دیتے تھے۔ سادات کرام یہاں پہنچ کر تشیع کی تبلیغ کرتے تھے اور جب ثامن الائمہ امام علی رضا علیہ السلام ایران تشریف لائے تو آپ کی آمد سے ایران میں تشیع کی تکمیل ہوگئی۔

۱۔ معجم البلدان لفظ قم۔

۲۔ ساوہ کے لوگوں نے شاہان صفوی کے عہد میں مذہب تشیع قبول کیا کیونکہ ایک صفوی بادشاہ نے سبزوار کے ایک عالم کو ساوہ کا شیخ الاسلام مقرر کیا۔ ان کی اور ان کے ساتھ ایک اور شیعہ عالم دین کی کوششوں سے اہل ساوہ نے مذہب تشیع قبول کیا تھا۔

بہرصورت امیر المومنین علیہ السلام نے کوفہ کو دارالسلطنت قرار دے کر اسے مرکز تشیع بنایا تھا۔ بنی عباس کی خلافت کے ابتدائی ایام تک امام جعفر صادق علیہ السلام اسی کوفے کی جامع مسجد میں بیٹھ کر آزادی سے احادیث رسولؐ بیان کرتے تھے اور ہزاروں افراد آپ سے استفادہ کی غرض سے جمع ہوتے تھے۔

ایک شخص کا بیان ہے کہ میں تین دن تک مسلسل امام جعفر صادقؑ تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ میں آپ تک نہ پہنچ سکا۔[1]

اس دور سے لے کر آج تک کوفہ علویوں اور شیعوں کا مرکز رہا ہے جبکہ شام قدیم الایام سے امویوں کا مرکز ہے اور مکہ و مدینہ شیخین کے چاہنے والوں کے مرکز رہے ہیں۔ ان شہروں کی مذہبی خصوصیات ونفسیات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس دور میں بنی عباس اپنی دعوت کو خفیہ طور پر پھیلانے میں مصروف تھے تو خلافت عباسیہ کے ایک مؤسس نے اپنے مبلغین سے کہا تھا:

''خراسان اور دور دراز مقامات پر جانا اور وہاں سے اپنی دعوت کا آغاز کرنا کیونکہ شام امویوں کا مرکز ہے اور مکہ و مدینہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کے چاہنے والوں کے مرکز ہیں اور کوفہ علویوں کا مرکز ہے۔''

اسی کوفہ شہر کے رہنے والوں نے امام حسین علیہ السلام کو خطوط لکھ کر اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی اور انہوں نے آپ کے نمائندے حضرت مسلم بن عقیلؑ کے ہاتھوں پر حضرت کی بیعت کی تھی۔ اگرچہ ابن زیاد کے آنے سے حالات بدل گئے تھے اور ابن زیاد نے کوفے کے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر کے اہل کوفہ کو امام حسین علیہ السلام کی مدد کرنے سے روک دیا تھا لیکن امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد جونہی اہل کوفہ کو موقع ملا تو انہوں نے ''توابین'' کے نام سے ایک بہت بڑی جماعت تشکیل دی اور اس جماعت کے ہزاروں افراد امام حسین علیہ السلام کی قبر مطہر پر گئے اور وہاں بیٹھ کر مدد نہ کرنے پر خدا سے معافی مانگی اور پھر انہوں نے ابن زیاد اور اہل شام سے جنگ کی یہاں تک کہ سب کے سب شہید ہوگئے۔ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم)

مختار ثقفی نے بھی کوفے سے ہی قیام کیا تھا اور اس نے ایک شخص کے علاوہ جو اس کے پاس سے فرار ہوگیا تھا سارے قاتلان امام حسین علیہ السلام کو تہہ تیغ کیا۔

مختار کے بعد حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے فرزند زید شہید نے بھی کوفے سے قیام کیا تھا۔

الغرض امام علیؑ نے کوفے کو دارالحکومت بنایا جس کے بڑے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ آپ نے کوفے میں صحابہ کو نقل حدیث کی اجازت دے کر اور خصوصی شاگردوں کو تربیت دینے کے بعد مختلف علاقوں میں بھیج کر نیز اپنے خطبات و بیانات کے ذریعے سے اسلامی معاشرے میں قرآن وسنت کو زندہ کیا۔

۱۔ بحارالانوار، ج ۴۷، ص ۹۳۔

حضرت نے نشر حدیث پر عائد پابندیاں ختم کیں تو اس کے نتیجے میں بہت زیادہ محدثین پیدا ہوئے اور انہوں نے روایات کو مکتب اہلبیتؑ اور مکتب خلفاء کی کتب حدیث میں جمع کیا اور اس طرح شیعوں کی کتب اربعہ اور سنیوں کی صحاح ستہ منظر عام پر آئیں۔ البتہ ان میں دور معاویہ کی وضعی روایات بھی دَر آئیں لیکن اس کے باوجود بہت سی صحیح احادیث بھی ان کتابوں میں مذکور ہیں۔ مکتب خلفاء کی کتب حدیث کو جھوٹ کا پلندہ نہیں کہا جاسکتا۔ ان میں آنحضرتؐ کی بہت سی صحیح احادیث موجود ہیں۔ لہٰذا اگر آج شیعوں اور سنیوں کے پاس حدیث کی کتابیں موجود ہیں تو یہ سب امام علی علیہ السلام کی حکومت کی برکت ہے کہ آج دونوں مکاتب فکر کے پاس کتب حدیث دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کتابیں امام علیؑ کی ''خدمت حدیث'' کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

آج اسلام کی جو ثقافت بھی مسلمانوں کے پاس ہے خواہ وہ شیعہ ہوں یا سنی، یہ سب امام علی علیہ السلام کی حکومت کا فیضان ہے اور آپ کی مدینہ سے کوفہ ہجرت اور آپ کی اسلامی خدمات کا ثمر ہے۔

انبیاءؑ و اوصیاء ملکوں اور زمینوں پر قبضہ کرنے کیلئے حکومت کے طالب نہیں رہے۔ وہ حکومت کو اس لئے پسند کرتے تھے کہ اس کے ذریعے دین کو تحفظ فراہم کریں اور دین زیادہ سے زیادہ پھیلے۔

(ج) سیرت خلفاء کی حُجیت سے انکار اور مکتب تشیع کی تاسیس: انبیائے کرامؑ نے ہر دور میں دین خدا کو بیان کیا، دین کے عقائد و احکام کی تعلیم دی اور باطل کی نفی بھی کی۔

حضرت آدم علیہ السلام خدا کے پہلے پیغمبر تھے۔۔ آپؑ نے خدا کی توحید بیان فرمائی لیکن آپؑ کے بعد آپ کی نسل نے بت پرستی شروع کر دی تھی اور حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں بت پرستی اتنے عروج پر تھی کہ معدودے چند لوگوں نے عقیدۂ توحید اختیار کیا اور اکثریت بت پرستی پر قائم رہی۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا اور وہ غرق کر دیئے گئے۔ اگرچہ حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں اہل ایمان کو نجات حاصل ہوئی تھی مگر ان کی نسل میں بت پرستی دوبارہ رائج ہوگئی تھی۔

شیخ الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دور میں بت پرستی کے خلاف جہاد کیا اور خود اپنے ہاتھوں سے بت توڑے۔ انہوں نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ کی تجدید فرمائی لیکن اُنؑ کے بعد اُن کی نسل میں بھی بت پرستی دَر آئی اور مرکز توحید خانہ کعبہ میں بت نصب کر دیئے گئے۔

جب بت پرست حج کے لئے آتے تو وہ تلبیہ میں یہ الفاظ کہا کرتے تھے:

لبیک اللّٰھم لبیک لا شریک لک الا شریک ھو لک تملکہ وما ملک. خدایا! میں تیرے حضور لبیک کہتا ہوں۔ تیرا شریک بس وہی شریک ہے جس کا تو مالک ہے اور اس کی تمام ملکیت کا بھی تو ہی مالک ہے۔

جب نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میں مبعوث برسالت ہوئے اس وقت سارا جزیرۃ العرب بت پرستی میں مبتلا تھا۔ پھر جب آپؐ نے مکہ فتح کیا تو آپؐ نے بھی اپنے دست مبارک سے کعبہ میں نصب بت توڑ دیئے۔

انبیائے کرامؑ کی سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ اسلام کے لئے بت شکنی اور باطل کی نفی اشد ضروری ہے کیونکہ توحید، شرک کے ساتھ اور حق، باطل کے ساتھ اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ انبیائے کرامؑ کے اوصیاء تبلیغ رسالت کے نگہبان تھے اسی لئے انہوں نے بھی ہر دور میں بت شکنی اور ابطال باطل کا شرعی فریضہ انجام دیا۔

وصی رسولؐ امام علی علیہ السلام نے نہ صرف یہ کہ معاشرے کو حقیقی اسلام اور قرآن وسنت لوٹایا بلکہ آپ نے اپنے سے پہلوں کی غلط روش سے بھی لوگوں کو آگاہ کیا اور بتایا کہ اسلام کا سرچشمہ صرف قرآن وسنت ہے۔ قرآن وسنت کے علاوہ اسلام میں کسی اور سیرت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ایسی سیرت کی تو بالکل بھی گنجائش نہیں جو قرآن وسنت کے خلاف ہو۔

سیرت شیخین پر امام علیؑ کے خیالات بتانے کے لئے ہم قارئین کو دو مواقع یاد دلانا چاہتے ہیں۔

پہلا موقع وہ تھا جب حضرت عمرؓ کی تشکیل کردہ مجلس شوریٰ کے اجلاس میں عبدالرحمٰن بن عوف نے ان سے کہا تھا: علیؑ! آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں۔ میں اس شرط پر آپ کی بیعت کرتا ہوں کہ آپ کتاب وسنت اور سیرت شیخین پر عمل کریں گے۔

آپؑ نے فرمایا تھا: کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے ساتھ کسی ''سیرت'' کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پھر عبدالرحمٰن نے یہی شرائط حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش کیں۔ انہوں نے یہ تینوں شرائط مان لیں۔ پھر عبدالرحمٰن نے یہی شرائط دوبارہ امام علی علیہ السلام کے سامنے پیش کیں۔ اس کے جواب میں آپؑ نے اپنا پہلا قول دہرایا۔ الغرض عبدالرحمٰن نے تین مرتبہ اپنی شرائط دہرائیں اور امام علی علیہ السلام نے تینوں مرتبہ سیرت شیخین کا انکار کیا جبکہ حضرت عثمانؓ نے تینوں بار اس شرط کو قبول کیا۔ آخرکار عبدالرحمٰن نے حضرت عثمانؓ کی بیعت کی۔

وہ سیرت شیخین پہ چلنے پہ مُصر ہیں　　　میں سیرت نبویؐ پہ، یہاں بات اڑی ہے

جیسے ہی حضرت عثمان بن عفانؓ کی بیعت ہوئی تو امام علی علیہ السلام اجلاس سے اٹھ کر جانے لگے۔ عبدالرحمٰن نے امام علی علیہ السلام سے کہا: اگر تم نے بیعت نہیں کی تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے کیونکہ عمر بن الخطابؓ نے پچاس آدمیوں کی یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ اہل شوریٰ میں سے جو کوئی عبدالرحمٰن کے منتخب کردہ خلیفہ کی بیعت سے انکار کرے اس کا سر قلم کر دیں۔ مجبور ہو کر حضرت امیر علیہ السلام کو بیعت کرنا پڑی۔[1]

۱۔ احمد بن یحییٰ بن جابر بلاذری، انساب الاشراف، ج۵، ص۱۶۔ معالم المدرستین، ج۱، ص۱۷۳۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت نے خلافت کے عہدے کو چھوڑنا قبول کیا تھا لیکن سیرت شیخین پر عمل کرنا قبول نہیں کیا تھا۔ آپ نے سیرت شیخین پر عمل کرنے سے انکار کر کے عملی طور پر عالم اسلام کو یہ پیغام دیا تھا کہ احکام الٰہی کا ماخذ صرف اللہ کی کتاب اور رسول اللہؐ کی سنت ہے، شیخین کی سیرت نہیں۔

جب آپ کو حکومت ملی تو آپ نے اپنے پورے عرصۂ اقتدار میں صرف قرآن وسنت پر عمل کیا۔ آپ نے کسی بھی موقع پر سیرت شیخین پر عمل کرنا گوارا نہیں کیا تھا۔ آپ نے اپنے خطبات سے باطل کے چہرے سے نقاب ہٹا کر حق کو آشکار کیا۔ ذیل میں ہم بطور تبرک آپ کے دو خطبے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

۱۔ خُطبۂ شِقشِقیّہ

اَمَا وَاللّٰهُ لَقَدْ تَقَمَّصَها اِبنُ اَبِیْ قُحافَة وَاِنَّهُ لَیَعْلَمُ اَنَّ مَحَلِّیَ مِنْها مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحٰی یَنْحَدِرُ عَنِّی السَّیْلُ وَلا یَرْقٰی اِلَیَّ الطَّیْرُ فَسَدَلْتُ دُوْنَها ثَوْبًا... فَصَبَرْتُ وَفِی الْعَیْنِ قَذًی وَفِی الْحَلْقِ شَجًا اَرٰی تُراثِیْ نَهْبًا حَتّٰی مَضَی الْاَوَّلُ لِسَبِیْلِهٖ فَاَدْلٰی بِها اِلَی ابْنِ الْخَطَّاب بَعْدَهٗ... فَیا عَجَبًا! بَیْنا هُوَ یَسْتَقِیْلُها فِیْ حَیاتِهٖ اِذْ عَقَدَها لِاٰخَرَ بَعْدَ وَفاتِهٖ لَشَدَّ ما تَشَطَّرا ضَرْعَیْها! فَصَیَّرَها فِیْ حَوْزَةٍ خَشْناءَ یَغْلُظُ کَلْمُها وَ یَخْشُنُ مَسُّها وَیَکْثُرُ الْعِثارُ فِیْها... فَصَبَرْتُ عَلٰی طُوْلِ الْمُدَّةِ وَ شِدَّةِ الْمِحْنَةِ حَتّٰی اِذا مَضٰی لِسَبِیْلِهٖ جَعَلَها فِیْ جَماعَةٍ زَعَمَ اَنِّیْ اَحَدُهُمْ فَیا لَلّٰهِ وَلِلشُّوْرٰی! مَتَی اعْتَرَضَ الرَّیْبُ فِیَّ مَعَ الْاَوَّلِ مِنْهُمْ حَتّٰی صِرْتُ اُقْرَنُ اِلٰی هٰذِهِ النَّظائِرِ...! اِلٰی اَنْ قامَ ثالِثُ الْقَوْمِ... وَقامَ مَعَهٗ بَنُوْ اَبِیْهِ یَخْضَمُوْنَ مالَ اللّٰهِ خِضْمَةَ الْاِبِلِ نِبْتَةَ الرَّبِیْعِ اِلٰی اَنِ انْتَکَثَ عَلَیْهِ فَتْلُهٗ وَ اَجْهَزَ عَلَیْهِ عَمَلُهٗ وَکَبَتْ بِهٖ بِطْنَتُهٗ... فَما راعَنِیْ اِلَّا وَالنَّاسُ یَنْثالُوْنَ عَلَیَّ مِنْ کُلِّ جانِبٍ حَتّٰی لَقَدْ وُطِیءَ الْحَسَنانِ وَشُقَّ عِطْفایَ مُجْتَمِعِیْنَ حَوْلِیْ کَرَبِیْضَةِ الْغَنَمِ فَلَمَّا نَهَضْتُ بِالْاَمْرِ نَکَثَتْ طائِفَةٌ وَ مَرَقَتْ اُخْرٰی وَ قَسَطَ اٰخَرُوْنَ... خدا کی قسم! فرزند ابوقحافہ نے پیراہن خلافت پہن لیا حالانکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا خلافت میں وہی مقام ہے جو چکی کے اندر اس کی کیلی کا ہوتا ہے۔ میں وہ کوہ بلند ہوں جس پر سے سیلاب کا پانی گزر کر نیچے گر جاتا ہے اور مجھ تک پرندہ پر نہیں مار سکتا اس کے باوجود میں نے خلافت کے آگے پردہ لٹکا دیا... میں نے صبر کیا حالانکہ آنکھوں میں غبار اندوہ کی خلش تھی اور حلق میں غم و رنج کے پھندے لگے ہوئے تھے۔ میں اپنی میراث کو لٹتے دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ پہلے نے اپنی راہ لی اور اپنے بعد خلافت ابن خطاب کو دے گیا... تعجب ہے کہ وہ زندگی میں تو خلافت سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا لیکن اپنے مرنے کے بعد اس کی بنیاد دوسرے کے لئے استوار کرتا گیا۔ بے شک ان دونوں نے سختی کے ساتھ خلافت کے تھنوں کو آپس میں بانٹ لیا۔ اس نے خلافت کو ایک سخت

اور درشت محل میں رکھ دیا جس کے چرکے کاری تھے اور جس کو چھو کر بھی درشتی محسوس ہوتی تھی۔ جہاں بات بات میں ٹھوکر کھانا تھا... میں نے اس طویل مدت اور شدید مصیبت پر صبر کیا یہاں تک کہ دوسرا بھی اپنی راہ لگا اور خلافت کو ایک جماعت میں محدود کر گیا اور مجھے بھی اس جماعت کا ایک فرد خیال کیا۔ اے اللہ! مجھے اس شوریٰ سے کیا لگاؤ؟ ان میں کے سب سے پہلے کے مقابلے میں ہی میرے استحقاق وفضیلت میں کب شک تھا جو اب میں ان لوگوں میں بھی شامل کرلیا گیا ہوں...؟ یہاں تک کہ اس قوم کا تیسرا شخص کھڑا ہوا... اور اس کے ساتھ اس کے بھائی بند اٹھ کھڑے ہوئے جو اللہ کے مال کو اس طرح نگلتے تھے جس طرح اونٹ فصل ربیع کا چارہ چرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب اس کی بٹی ہوئی رسی کے بل کھل گئے اور اس کی بداعمالیوں نے اس کا کام تمام کردیا اور شکم پری نے اسے منہ کے بل گرادیا۔ اس وقت مجھے لوگوں کے ہجوم نے دہشت زدہ کردیا جو میری جانب بجو کے ایال کی طرح ہر طرف سے لگاتار بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ عالم یہ ہوا کہ حسنؑ وحسینؑ کچلے جارہے تھے اور میری ردا کے دونوں کنارے پھٹ گئے تھے۔ وہ سب میرے گرد بکریوں کے گلے کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ مگر جب میں امر خلافت کو لے کر اٹھا تو ایک گروہ نے بیعت توڑ ڈالی اور دوسرا دین سے نکل گیا اور تیسرے گروہ نے فسق اختیار کرلیا۔[1]

۲۔ حضرت کا ایک اور خطبہ

حضرت کے اس خطبے کا ابتدائی حصہ نہج البلاغہ میں اور مکمل خطبہ روضۂ کافی میں موجود ہے۔

انما بدء وقوع الفتن من اهواء تتبع و احكام تبتدع يخالف فيها حكم الله يتولى فيها رجال رجالا الا ان الحق لو خلص لم يكن اختلاف ولو ان الباطل خلص لم يخف على ذى حجى لكنه يؤخذ من هذا ضغث ومن هذا ضغث فيمزجان فيجللان معًا فهنالك يستولى الشيطان على اوليائه و نجا الذين سبقت لهم من الله الحسنى... ثم اقبل بوجهه وحوله ناس من اهل بيته و خاصته و شيعته فقال: قد عملت الولاة قبلى اعمالا خالفوا فيها رسول الله صلى الله عليه وآله متعمدين لخلافه ناقضين لعهده مغيرين لسنته ولو حملت الناس على تركها وحولتها الى مواضعها والى ما كانت فى عهد رسول الله صلى الله عليه وآله لتفرق عنى جندى حتٰى ابقى وحدى او قليل من شيعتى الذين عرفوا فضلى و فرض امامتى من كتاب الله عزوجل و سنة رسول الله صلى الله عليه وآله... و اعلمتهم ان اجتماعهم فى النوافل بدعة فتنادىٰ بعض اهل عسكرى ممن يقاتل معى:

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۳۔

یااهل الاسلام غیرت سنة عمر ینهانا عن الصلاة فی شهر رمضان تطوعا ولقد خفت ان یثوروا فی ناحیة جانب عسکری، ما لقیت من هذه الامة من الفرقة و طاعة ائمة الضلالة والدعاة الی للنار.

فتنوں کے وقوع کا آغاز وہ نفسانی خواہشیں ہوتی ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے اور وہ نئے ایجاد کردہ احکام کہ جن میں قرآن کی مخالفت ہوتی ہے اور جنہیں فروغ دینے کے لئے کچھ لوگ دین الٰہی کے خلاف باہم ایک دوسرے کے مددگار ہو جاتے ہیں۔ اگر حق، باطل کی آمیزش سے خالی ہوتا تو اس میں اختلاف نہ ہوتا اور اگر باطل خالص شکل میں نمایاں ہوتا تو کسی بھی اہل عقل پر مخفی نہ رہتا لیکن ہوتا یہ ہے کہ کچھ اِدھر سے لیا جاتا ہے اور کچھ اُدھر سے اور دونوں کو آپس میں خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر شیطان اپنے دوستوں پر چھا جاتا ہے اور صرف وہی لوگ بچے رہتے ہیں جن کے لئے پہلے سے توفیق الٰہی اور عنایت ربانی موجود ہوتی ہے...

پھر آپؑ نے سامعین کی طرف رخ کیا۔ اس وقت آپ کے گرد آپ کے افراد خانوادہ اور آپؑ کے خواص وشیعہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؑ نے فرمایا:

مجھ سے پہلے حکام نے کچھ ایسے کام کئے ہیں جس میں انہوں نے جان بوجھ کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی اور ان کے عہد کو توڑا اور ان کی سنت کو تبدیل کیا اور اگر میں لوگوں کو ان خودساختہ کاموں کے چھوڑنے پر مجبور کروں اور انہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے احکام کی طرف واپس لے جانا چاہوں تو میرا لشکر مجھے چھوڑ جائے گا اور پھر میں اکیلا بچ جاؤں گا اور میرے ساتھ میرے تھوڑے سے وہ شیعہ بچ جائیں گے جو میری فضیلت کو پہچانتے ہیں اور جو کتاب خدا اور سنت رسولؐ کے تحت میری امامت کو واجب سمجھتے ہیں...

میں نے لوگوں کو بتایا تھا کہ ماہ رمضان کے نوافل کو جماعت سے ادا کرنا بدعت ہے تو میرے ہی لشکر میں سے میرے ہمرکاب ہو کر لڑنے والوں میں سے کچھ لوگ چیخ اٹھے کہ اے اہل اسلام! سنت عمرؓ کو تبدیل کیا جارہا ہے۔ علیؑ ہمیں تراویح سے روک رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں لشکر میں بغاوت ہی نہ پھوٹ پڑے۔ بارالٰہا! تو گواہ رہنا کہ اس امت کے تفرقے اور گمراہ کرنے والے رہنماؤں کی اطاعت سے مجھے کیا کیا دکھ اٹھانے پڑے ہیں۔[۱]

امام علی علیہ السلام نے اپنے ان خطبات میں کھل کر اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح آپ نے بت توڑے اور اسلام حقیقی اور مکتب تشیع کی بنیاد رکھی اور واضح کیا کہ تشیع — اوصیائے پیغمبرؐ سے دین خدا کے معارف اور سنت پیغمبرؐ کو حاصل کرنے کا دوسرا نام ہے۔ دین اسلام میں سیرت خلفاء حجت نہیں ہے اور نہ ہی وہ

۱۔ نہج البلاغہ، از ابتدا تا من اللہ الحسنی. خطبہ ۵۰۔ مکمل خطبہ روضہ کافی کے صفحہ ۵۸ سے ۶۳ تک موجود ہے۔

اسلامی احکام کا سرچشمہ ہے۔

مولا امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے دوسرے خطبے میں واضح کیا ہے کہ اہلبیت علیہم السلام سے محبت (تولا) کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کو حقیقی اسلام کا تحفہ دیا اور ان کے مخالفین سے لاتعلقی (تبرا) کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے جان بوجھ کر احکام اسلام اور سنت رسولؐ میں تبدیلی کی۔

اسی خطبے میں امام علیؑ نے انتہائی خوبصورت پیرائے میں مکتب خلفاء اور مکتب اہلبیتؑ کی سرحدوں کو یوں واضح کیا کہ سنی سابقہ خلفاء اور امام علیؑ کی خلافت کو "بیعت" کی وجہ سے تسلیم کرتے ہیں جبکہ شیعہ ائمہ علیہم السلام کی اطاعت کے لئے قرآن اور پیغمبرؐ کے فرمان پر انحصار کرتے ہیں اور ان کی نظر میں لوگوں کی "بیعت" کرنے یا نہ کرنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اگر امام علی علیہ السلام خطبات کے ذریعے اپنا موقف واضح نہ فرماتے اور رخ باطل سے پردہ نہ ہٹاتے تو حقیقت یوں نکھر کر سامنے نہ آتی۔ لوگ یہی سمجھتے کہ خلیفۂ چہارم نے گزشتہ خلفاء کی روش سے ہٹ کر عدل و انصاف اور حق کے تقاضوں پر جو عمل کیا وہ بھی ایک اجتہاد تھا جو سابقہ خلفاء کے اجتہاد کے علی الرغم تھا۔ ایسے اختلافی اجتہاد تو پہلے سے موجود تھے۔ مثلاً خلیفۂ ثالث نے شیخین کے برخلاف اجتہادات کئے تھے اور حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے برخلاف کئی اجتہادات کئے تھے اور حضرت ابوبکرؓ نے بھی رسول خداؐ کی سنت کے برخلاف کئی اجتہادات کئے تھے۔ مگر اجتہادات کے اختلاف کے باوجود مکتب خلفاء سے وابستہ افراد کا طول تاریخ میں یہ نظریہ رہا ہے کہ ان میں سے کسی کے اجتہاد پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے۔

اگر ہر خلیفہ کے اجتہاد کو حجت مان لیا جائے تو پتا نہیں پھر دین میں کیا باقی رہ جائے گا؟

امام علی علیہ السلام نے خلفائے ثلاثہ کی طرح سے اجتہاد نہیں کیا بلکہ آپؑ نے ان کے اجتہاد کو یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ وہ اصلاً اجتہاد ہی نہیں تھا بلکہ کتاب خدا اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کھلم کھلا اور دانستہ خلاف ورزی تھی۔

امام علی علیہ السلام کے خطبات سے آپ کے ماننے والوں نے یہ نکتہ اخذ کرلیا کہ اسلام کا سرچشمہ صرف اور صرف خدا کی کتاب اور رسول اکرمؐ کی سنت ہے۔

اسلام میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان اس لئے حجت ہے کہ آپؐ معصوم عن الخطا ہیں اور آپؐ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ آپ کا ہر فرمان وحی الٰہی پر مبنی ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى ○ (ہمارا نبی) اپنی خواہش نفس سے کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو اُن کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔ (سورۂ نجم: آیت ۳و۴)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دین کے محافظ آپ کے بارہ وصی ہیں جو اللہ کے منتخب کردہ ہیں۔ خود آنحضرتؐ نے ان کا امت سے تعارف کرایا تاکہ وہ اسلامی معاشرے میں دین خدا کی حفاظت کریں، سنت رسولؐ کی تبلیغ کریں اور اسلام کو تحریف اور بربادی سے بچائیں۔

سلام آخر

احیائے اسلام کے متعلق ہمیں امام علی علیہ السلام کے اعلیٰ و ارفع مقام کی جو پہچان نصیب ہوئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم آخر میں ان کی خدمت میں زیارت جامعہ کے الفاظ میں یوں سلام عقیدت پیش کریں:

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ بَيْتِ النُّبُوَّةِ... وَ مَهْبِطَ الْوَحْيِ...

وَ خُزَّانَ الْعِلْمِ...

وَ حَمَلَةَ كِتَابِ اللّٰهِ...

وَ اَوْصِيَآءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ...

وَ الْاَدِلَّاءِ عَلٰى مَرْضَاتِ اللّٰهِ...

وَ الْمُظْهِرِيْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ وَ نَهْيِهِ...

وَ رَضِيَكُمْ خُلَفَآءَ فِيْ اَرْضِهِ وَ حُجَجًا عَلٰى بَرِيَّتِهِ وَ اَنْصَارًا لِدِيْنِهِ... وَ خَزَنَةً لِعِلْمِهِ وَ مُسْتَوْدَعًا لِحِكْمَتِهِ وَ تَرَاجِمَةً لِوَحْيِهِ... وَ اعْلَامًا لِعِبَادِهِ... وَ جَاهَدْتُمْ فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ حَتّٰى اَعْلَنْتُمْ دَعْوَتَهُ وَ بَيَّنْتُمْ فَرَائِضَهُ وَ اَقَمْتُمْ حُدُوْدَهُ وَ نَشَرْتُمْ شَرَايِعَ اَحْكَامِهِ وَ سَنَنْتُمْ سُنَّتَهُ وَ صِرْتُمْ فِيْ ذٰلِكَ مِنْهُ اِلَى الرِّضَا...

فَالرَّاغِبُ عَنْكُمْ مَارِقٌ وَاللَّازِمُ لَكُمْ لَاحِقٌ...

مَنْ وَالَاكُمْ فَقَدْ وَالَى اللّٰهَ وَمَنْ عَادَاكُمْ فَقَدْ عَادَى اللّٰهَ...

مَنْ اَتَاكُمْ نَجَا وَ مَنْ لَّمْ يَأْتِكُمْ هَلَكَ...

اِلَى اللّٰهِ تَدْعُوْنَ وَ عَلَيْهِ تَدُلُّوْنَ وَ بِهِ تُؤْمِنُوْنَ وَلَهُ تُسَلِّمُوْنَ وَ بِاَمْرِهِ تَعْمَلُوْنَ وَ اِلٰى سَبِيْلِهِ تُرْشِدُوْنَ وَ بِقَوْلِهِ تَحْكُمُوْنَ...وَ عِنْدَكُمْ مَا نَزَلَتْ بِهِ رُسُلُهُ وَ هَبَطَتْ بِهِ مَلَائِكَتُهُ وَ اِلٰى اَخِيْكَ بُعِثَ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ...

بِمُوَالَاتِكُمْ عَلَّمَنَا اللّٰهُ مَعَالِمَ دِيْنِنَا وَ اَصْلَحَ مَا كَانَ فَسَدَ مِنْ دُنْيَانَا...

سلام ہو آپ پر — اے کاشانہ نبوت کے مکینو جہاں پیغام الٰہی نازل ہوا۔

سلام ہو آپ پر — اے علم و معرفت کے خزینہ دارو!

سلام ہو آپ پر — اے کتاب خدا کے پاسبانو!

سلام ہو آپ پر اے رسول خداؐ کے اوصیاء!

سلام ہو آپ پر اے خوشنودیٔ خدا کی طرف رہنمائی کرنے والو!

سلام ہو آپ پر اے خدا کے امرونہی کو ظاہر کرنے والو!

خدانے زمین پر خلافت کیلئے آپ کو پسند کیا اور لوگوں پر آپ کو حجت قرار دیا تاکہ آپ اسکے دین کے مددگار بنیں! خدانے آپ کو اپنے علم کا گنجینہ، اپنی حکمت کا خزینہ اور اپنی وحی کا ترجمان بنایا اور اپنے بندوں کیلئے نشان قرار دیا۔ آپ نے خدا کی راہ میں جہاد کرنے کا حق ادا کیا یہاں تک کہ اس کی دعوت کو ہر طرف عام کردیا۔ آپ نے اس کے مقرر کردہ فرائض کو بیان کیا، اس کی حدود کو نافذ کیا، اس کی شریعت کے احکام کو پھیلایا، اس کی راہوں کو روشن کیا اور اس مقصد کے لئے خود کو راضی برضا رکھا۔

جس نے آپ سے روگردانی کی وہ دین سے نکل گیا اور جو آپ کے ساتھ رہا وہ حق تک پہنچا۔

جس نے آپ سے محبت رکھی اس نے اللہ سے محبت رکھی اور جس نے آپ سے دشمنی رکھی اس نے اللہ سے دشمنی رکھی۔

جو آپ کے پاس آیا نجات پا گیا اور جو آپ کے پاس نہ آیا ہلاک ہوگیا۔

آپ خدا کی طرف بلاتے ہیں اور اسی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ آپ اُسی پر ایمان رکھتے ہیں اور اُس کے سامنے سرتسلیم خم کرتے ہیں۔ اُسی کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور اُسی کے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور اُسی کے فرمان کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ جو کچھ رسول اللہؐ لے کر آئے اور جو کچھ فرشتوں نے پہنچایا وہ سب آپ کے پاس محفوظ ہے۔ آپ کے ابن عم (رسول پاکؐ) کے پاس روح الامینؑ آتے رہے۔

آپ کی ولایت کے طفیل اللہ نے ہمیں ہمارے دین کی بنیادی باتیں سکھائیں اور ہمارے بگڑے ہوئے دنیاوی کاموں کو سنوارا۔

دعاء ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں خدا مجھے آپ سے دوستی، آپ کی محبت اور آپ کے دین پر ثابت قدم رکھے۔ مجھے آپ کی اطاعت کی توفیق دے اور آپ کی شفاعت نصیب کرے۔

مرتضٰی عسکری عفی عنہ

علم نحو کی تاسیس و تعلیم کا جدول

مؤسس علم نحو وصی پیغمبر علی بن ابی طالب علیہ السلام

وصی پیغمبرؐ کا پہلا بلافصل متعلم ابوالاسود دوئلی (م ۶۹ھ)

تعلیم علمی و نظری

طبقہ اول[1]

نصر بن عاصم (م ۸۹ھ)
عبدالرحمٰن بن ہرمز (م ۱۱۷ھ)
یحییٰ بن یعمر (م ۱۲۹ھ)
میمون بن الاقرن
عنبسہ بن معدان (الفیل)
ابوالاسود کے تین بیٹے
عطا، ابوالحارث اور ابوحرب

طبقہ دوم

عبداللہ بن اسحاق حضرمی (م ۱۱۷ھ)
عیسیٰ بن عمر ثقفی (م ۱۴۹ھ)
ابوعمرو بن العلاء الحارثی (م ۱۵۴ھ)

طبقہ سوم

خلیل بن احمد (م ۱۷۵ھ)

طبقہ چہارم

اس دور سے لے کر آج تک کے[2] تمام علماء نحو

تعلیم عملی با اعراب قرآن

طبقہ اول

قبیلہ عبدالقیس کے دس دانا افراد

طبقہ دوم

جن لوگوں نے دور خلیل تک قرآن لکھا

طبقہ سوم

خلیل بن احمد نے (م ۱۷۵ھ) کسرہ اور فتحہ کے نقطوں کو خط کوتاہ میں اور ضمہ کو چھوٹی واؤ کی شکل میں تبدیل کیا

طبقہ چہارم

قرآن مجید کے تمام لکھنے والے بشمول دور حاضر کے لکھنے والے اور ان کے علاوہ کچھ عربی متون اور غیر متون کو ضبط کلمات سے لکھنے والے

۱۔ یہ طبقہ بندی اعراب لگانے کے حوالے سے ہے۔ طبقات افراد کے لئے نہیں ہے۔

۲۔ طبقات علمائے نحو کی ذکر کردہ ترتیب میں مصادر کا اختلاف ہے۔ تفصیل کے لئے زبیدی کی کتاب طبقات النحوین دیکھیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام سے قریش تک کا سلسلۂ نسب یوں ہے

فہر (یعنی قریش) بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان بن اسماعیل علیہ السلام

قریش میں سلسلۂ امامت
اور سلسلۂ خلافت ایک نظر میں

مرتبہ: رضا رضوانی

اِحیائے دِین میں

مولا امیرالمومنین علیہ السلام کی نسلِ پاک سے ہونے والے

ائمہ اہلبیت علیہم السلام کا کِردار

جلد ۳ میں ملاحظہ فرمائیں
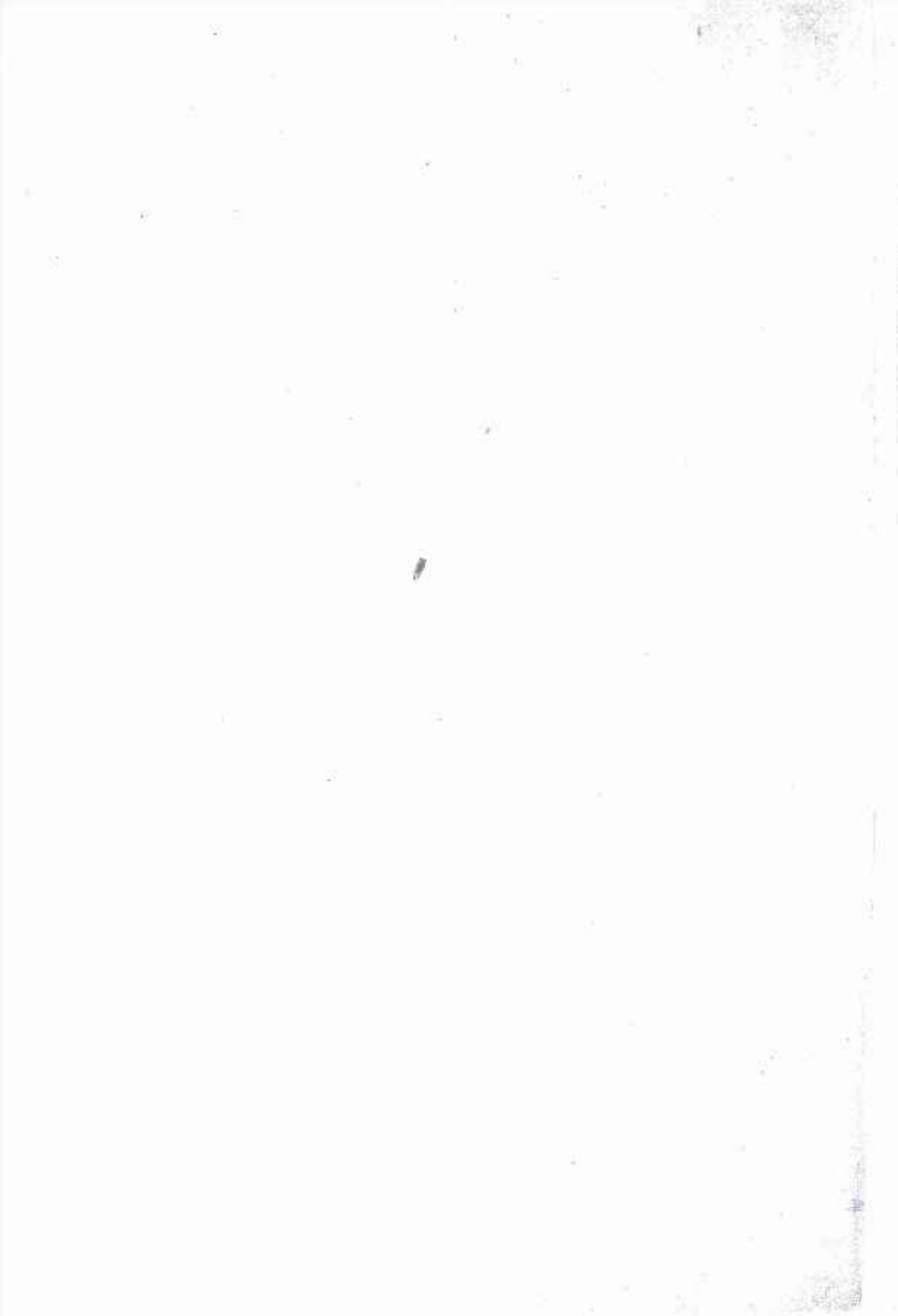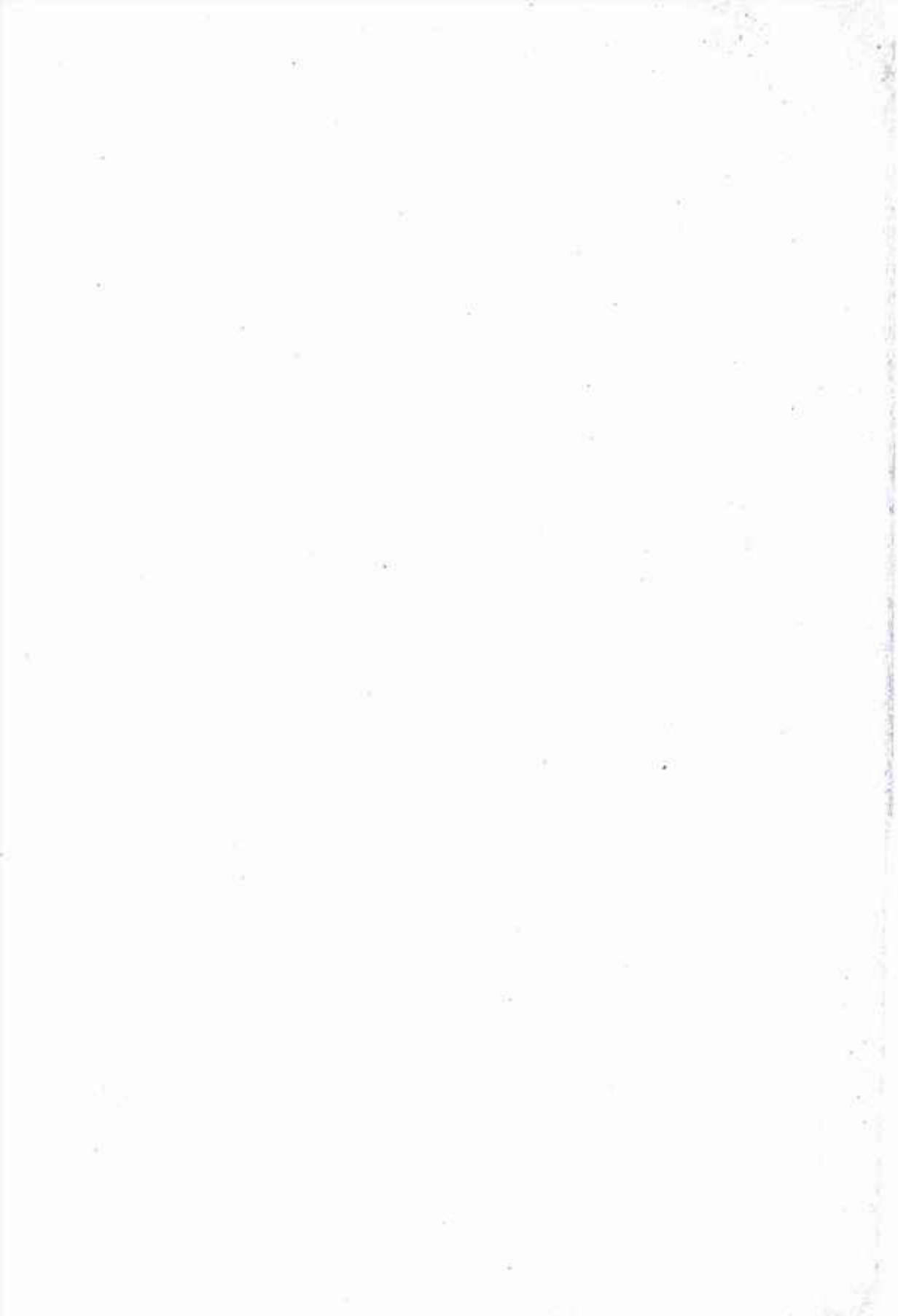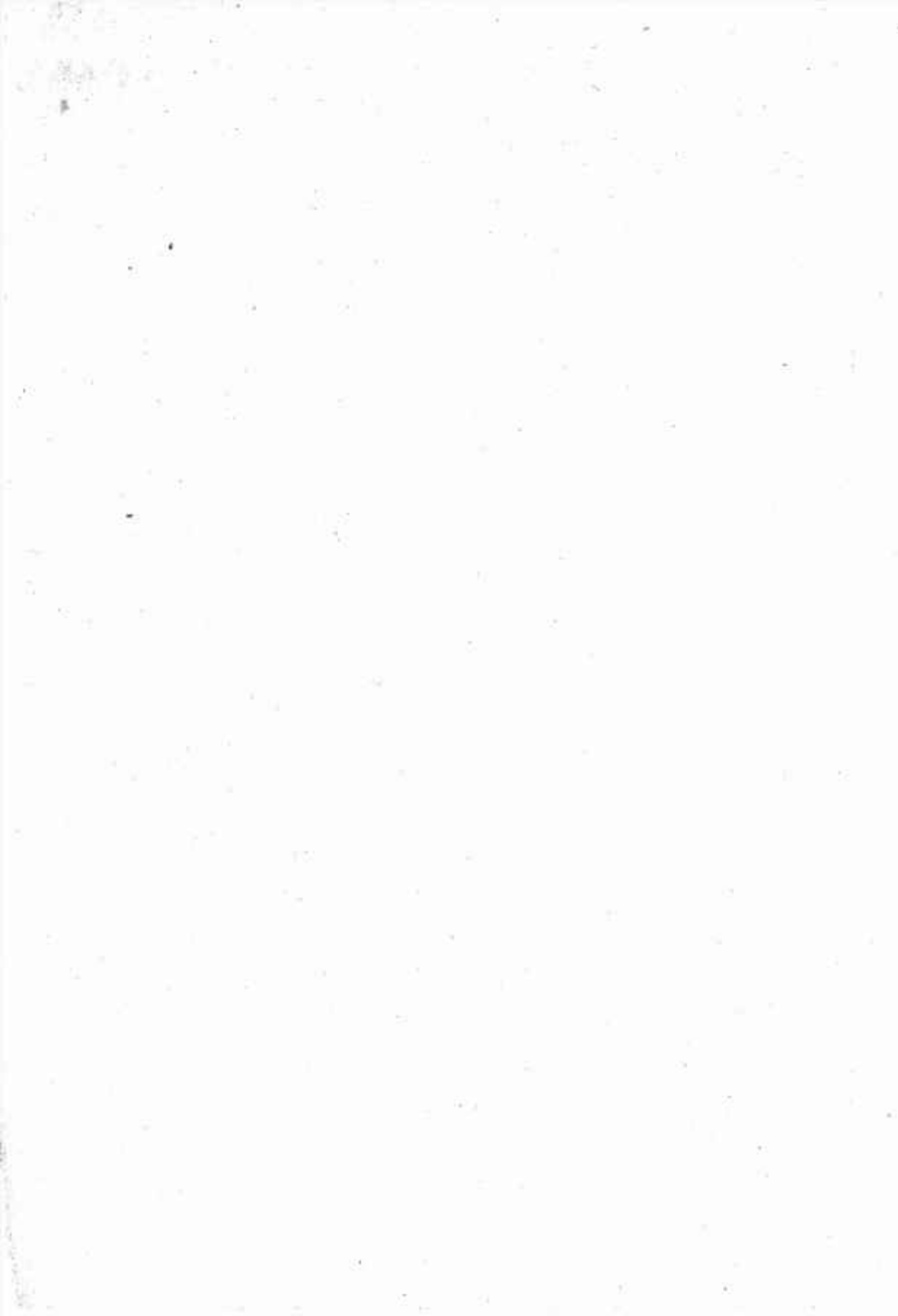
مجمع علمی اسلامی کی ایمان افروز تحقیقی کتابیں